جدید تصحیح شدہ ایڈیشن

فاعتبروا یا اولی الابصار — القرآن

نمبر ۱ تا ۵

سوانح

برکۃ العصر شیخ الحدیث قطب العالم

حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی

ثم المہاجر المدنی قدس سرہ

نام کتاب .... آپ بیتی (جلد اوّل)
مؤلف .... حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہٗ
اشاعت دوم .... جدید تصحیح شدہ ایڈیشن
ضخامت 576
قیمت ....
ناشر .... فیاض احمد 021-4594144-8352169
موبائل 0334-3432345
مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی نمبر ۴، کراچی نمبر ۲۵

قارئین کی خدمت میں

کتاب ہٰذا کی تیاری میں تصحیحِ کتابت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، تاہم اگر پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو التماس ہے کہ ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان اغلاط کا تدارک کیا جاسکے۔

۔جزاء کم اللّٰہ تعالیٰ جزاءً جمیلاً جزیلاً۔

''آپ بیتی نمبر ۱'' و ''سوانحِ یوسف''

''آپ بیتی نمبر ۲'' یا ''یادِ ایام نمبر ۱''

بابِ اول

باب دوم

’’آپ بیتی نمبر۳‘‘ یا ’’یادِ ایام نمبر۲‘‘

باب سوم

باب چہارم

''آپ بیتی نمبر۴'' یا ''یادِ ایام نمبر۳''

باب پنجم

باب ششم

آپ بیتی نمبر ۵ یا یادِ ایام نمبر ۴

باب ہفتم

باب ہشتم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم ط

یہ کوئی مستقل رسالہ ہے اور نہ کوئی مستقل مضمون جب عزیزی مولوی محمد ثانی سلمہٗ نے عزیزم مولانا محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہم ورحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح شائع کی تو اپنی محبت اور علی میاں کی شفقت کی وجہ سے اس کا باب اول اس ناکارہ کے متعلق تھا، وہ علی میاں سے لکھوایا، جس پر میں نے ذیل کا خط عزیز محمد ثانی کو لکھا تھا کہ جو باتیں لکھنے کی تھیں۔ وہ چھوڑ دیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں۔

جب رسالہ اشتراک طباعت کے واسطے دیا تو مجھے خیال ہوا کہ طلبہ پر تنبیہات کے ساتھ یہ ناکارہ مثال کے طور پر ان تنبیہات کو بھی ذکر کردے جو اس ناکارہ پر میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی طرف سے ہوئیں تاکہ طلبہ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان ناکارہ خیالات میں جو جمود اور تنگ نظری ہے وہ بڑی تنبیہات کے بعد پیدا ہوئی اور دوسروں کے عیوب کے ساتھ اپنے عیوب بھی ظاہر کردوں تاکہ اعتدال پیدا ہو جائے:

میں ہوں کرتا ہوں گلہ اپنا، نہ غیروں کی بات
وہ یہی آخر کہیں گے اور کیا کہنے کو ہیں

فقط:

زکریا

تنقید بر سوانح یوسفی

صلاح کار کجا و من خراب کجا، ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

عزیز گرامی قدر ومنزلت! عافاکم اللہ وسلم، بعد سلام مسنون تمہاری کتاب سے بہت ہی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دونوں جہاں میں بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کے منافع دینی و دنیوی سے بھرپور متمتع فرمائے۔ امید سے زیادہ بہتر لکھی اگرچہ اس کے بہت سے اجزاء متفرق میں سن چکا تھا لیکن مسلسل سننے میں جو لطف آیا وہ پہلے نہیں آیا تھا، کاش میری آنکھیں قابل نظر ہوتیں تو ایک دو شب ہی میں نمٹا دیتا۔ مجھے اکابر کی سوانح پڑھنے کا ساری عمر سے شوق ہے۔ شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، دن میں تو کبھی فرصت نہیں ملی، عشاء کے بعد ضروری مطالعہ سے فراغت کے بعد شروع کیا کرتا تھا اور اکثر صبح بھی کر دی اس لیے کہ مجھے شباب کے زمانہ میں تمام رات جاگنا بہت آسان تھا۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ اکثر اخیر شب میں تشریف لاتے، تین چار بجے پہنچتے اور تشریف آوری کے تار کا بہت اہتمام تھا اور چونکہ ایک عیب مجھ میں رہ رہا ہے کہ سوکر اٹھنا میرے بس کا نہیں تھا، اس لیے عشاء کے بعد سے اپنا کام شروع کر دیتا تھا اور دو تین بجے پاپیادہ ریل پر پہنچ جاتا تھا کہ میں معذوری سے پہلے کبھی ریل پر سواری میں نہیں گیا، اسی بناء پر اکابر کی سوانح ہمیشہ ایک شب یا دو شب میں پوری کی، حضرت گنگوہی، حضرت سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، حضرت تھانوی، حضرت مدنی اور حضرت سید صاحب، چچا جان وغیرہم نور اللہ مراقدہم کی سوانح اور مکاتیب اسی ذوق وشوق سے پورے کیے لیکن اب آنکھوں کی معذوری نے دوسرے کا محتاج بنا دیا اور دوسروں کے لیے

وصل ہو یا فراق ہو غالب جاگنا ساری رات مشکل ہے

کی بناء پر مہمانوں سے فراغ کے بعد ایک دو گھنٹہ ہوتا رہا۔ اس لیے کئی شب لگ گئیں۔ ایک باب کے سوا جو تم نے علی میاں سے لکھوایا ساری کتاب میں بہت لطف آیا۔ البتہ یہ باب تم نے گلاب کے حوض میں ایک بوتل پیشاب کی ڈال کر یا مہذب الفاظ میں نہایت نفیس مخمل میں پرانے ٹاٹ کا پیوند لگا کر کتاب کو بدنما کر دیا۔ اس کے باوجود اس باب میں بہت سی خامیاں رہ گئیں۔ اگر میں اس کا مسودہ پہلے سن لیتا تو بہت سی اصلاحیں کراتا۔ جو باتیں نہ لکھنے کی تھیں ان میں اطناب ممل کر دیا اور جو لکھنے کی تھیں ان میں ایجازِ مخل کر دیا۔

''دو (۲) نازک امتحان وتوفیق الٰہی'' کے لکھنے میں مجھے کوئی بار نہیں، محض اس وجہ سے کہ شاید کسی

اللہ کے بندے کو اس نوع کی توفیق نصیب ہو جائے لیکن علی میاں نے صرف دو لکھے اور وہ بھی بہت مجمل (۱) اور اس سے زائد کی نفی بھی فرمادی۔

(۱) پہلے خیال تھا کہ میرا یہ خط سوانح یوسفی کے ساتھ شائع ہوگا، اس لیے میں نے ان دونوں امتحانات کو مجمل ہی چھوڑ دیا تھا، لیکن اب جب کہ یہ مستقل شائع ہو رہا ہے اس لیے خیال ہوا کہ اس کو مفصل لکھ دوں، میں نے یہ واقعہ تفصیل سے لکھوایا تھا۔ لیکن لکھوانے کے بعد میرے کاتب عزیز مولوی شاہد سلمہٗ نے بتایا کہ یہ تو آپ بیتی میں آچکا ہے بڑا قلق ہوا کہ لکھوانے میں بڑا وقت خرچ ہوا تھا۔ یہ واقعات تفصیل سے آپ بیتی جلد دوم میں بعنوان علی گڑھ کی ملازمت کی تجویز میں لکھا جا چکا ہے۔

دوسرا واقعہ جس کو علی میاں نے مختصراً لکھا ہے میں تو اس کو بھی مفصل لکھوا رہا تھا کیونکہ مجھ کو ضعف و پیری اور میرے حافظہ کی وجہ سے یہ یاد نہیں رہتا کہ کون سا واقعہ کہاں لکھا گیا، لیکن عزیز موصوف نے بتایا کہ یہ واقعہ بھی آپ بیتی میں گزر چکا ہے، مگر اس وقت متعدد احباب کے تلاش کرنے کے نہیں ملا، اس لیے اس واقعہ کو عزیز مولوی یوسف مرحوم کی سوانح سے نقل کرا رہا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ نقل کراؤں اور پھر وہ کہیں مطبوعہ مل جائے...... علی میاں کہتے ہیں:

اس (علی گڑھ کے واقعہ) سے بڑا امتحان چند دنوں کے بعد پیش آیا۔

کرنال میں نواب عظمت علی خاں مظفر نگر کے مشہور وقف کی جانب سے ایک بڑا تبلیغی دار العلوم قائم کیا گیا۔ جس کی خصوصی غرض و غایت یہ تھی کہ اسلام کی تبلیغ اور اس کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے نیز جدید شبہات اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے جو اس وقت اپنی تبلیغی کوششوں میں بہت سرگرم تھے، ایسے فضلاء تیار کیے جائیں جو عربی و انگریزی دونوں سے واقف ہوں اور علوم قدیم و جدید دونوں کے جامع ہوں۔ اس کے لیے یہ تجویز ہوئی کہ بڑے بڑے وظائف و دیگر مستند عربی مدارس کے فضلاء کو انگریزی اور کالجوں و یونیورسٹیوں کے فارغین کو عربی پڑھائی جائے۔ مولانا سر رحیم بخش صاحب مرحوم جو ریاست بہاولپور کے صدر کونسل اور ایجنٹ تھے اس تحریک کے بڑے سرپرستوں میں سے تھے۔ ان کا تعلق گنگوہ، رائے پور اور سہارنپور سے خادمانہ اور مخلصانہ تھا اور وہ مظاہر علوم کے بھی سرپرستوں میں سے تھے۔ انہوں نے ابتدائی مدرس حدیث کے لیے شیخ کا انتخاب کیا اور اس کے لیے سہارنپور کا مستقل سفر کیا، ضابطہ کی تین سو ماہوار تنخواہ کے علاوہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کا وعدہ فرمایا۔ مثلاً رمضان کی چھٹی (اور) حضرت کی خدمت میں رہنے کے لیے ہر سال تین ماہ کی چھٹی بلا وضع تنخواہ، اجناس کی سہولت، ان سب کے ساتھ ساتھ ان کی صرف ایک شرط یہ تھی کہ حضرت پر یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ مدرسہ کے مدرس کو کسی اور جگہ کے لیے آمادہ کریں، انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دو سال کی چھٹی لے لو اور یہ کہو کہ قرض کا بار زیادہ ہے، شادی بھی ہو چکی ہے اور بچے بھی ہیں، مدرسہ کی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا، اس وقت شیخ کی تنخواہ بیس روپے تک پہنچی تھی، مولانا سر رحیم بخش صاحب کے دیرینہ تعلقات ان کی بزرگانہ، مخدومانہ حیثیت ان کا پر خلوص اصرار، قرض کا بار، تنخواہ کی قلت اور ترقی کے امکانات کا فقدان یہ سب وہ حقائق تھے جو اس پیش کش کو قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے اور ان کے لیے شرعی اخلاقی علمی دلائل بھی پیش کرتے تھے۔ یہ ایک نوجوان عالم کے لیے جو ذہانت کے جوہر سے آراستہ اور حدیث و ادب میں شہرت یافتہ تھا ایک بڑی آزمائش تھی۔ شیخ اس وقت حقیقۃً ایک دوراہے پر کھڑے تھے، اگر وہ اثبات میں فیصلہ کرتے تو ان کی زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا اور آج شاید ان سطور

حالانکہ اس نوع کے وقائع بہت کثرت سے پیش آئے اور مجھے تعجب ہے کہ اس قسم کے واقعات تو تذکروں میں علی میاں کے سامنے متعدد بار آئے ہوں گے۔ ان میں کا سب سے پہلا واقعہ جو میری عمر اور حالات کے اعتبار سے زیادہ اہم تھا، وہ تھا جو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے انتقال سے تیسرے دن پیش آ گیا۔ بڑے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اس سیہ کار کے ساتھ جو محبت تھی، وہ اسی کا عکس اور آئینہ تھا جس کو حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے شیخ کے اتباع میں پورا فرمایا وہ سب تو آپ کے سامنے ہے۔ یہ درحقیقت حضرت رائے پوری ثانی کا اپنے شیخ کا کمال اتباع تھا۔ میرے والد صاحب قدس سرہٗ سے بڑے حضرت رائے پوری کو اس سے بھی زیادہ تعلق تھا۔ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد میری ابتداءِ یتیمی میں وہ دلداریاں اور شفقتیں فرمائی ہیں کہ ان کی تفاصیل تمہاری پوری سوانح یوسفی بن سکتی ہے۔ میرے والد صاحب کے انتقال سے دوسرے ہی دن میرے بچپن اور والد صاحب کے بارِ قرض کی بناء پر حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نے یہ ارشاد فرمایا کہ امور بالا بہت قابل فکر ہیں تم ابھی بچے ہو، تجارت سے واقفیت نہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کو تجارت میں بہت مہارت ہے اور حضرت نے صحیح فرمایا کہ مولانا مرحوم کو اس لائن میں بہت مہارت تھی اس لیے تم اپنا کتب خانہ لے کر میرٹھ منتقل ہو جاؤ اور مولانا عاشق الٰہی صاحب کی زیر نگرانی تجارت کرو تو انشاء اللہ قرضہ بھی جلدی ادا ہو جائے گا اور متعلقین کی کفالت کا انتظام بھی سہولت سے ہو جائے گا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بہت ہی شفقت اور طویل تقریر سے یہ مضمون

کے لکھنے کی نوبت نہ آتی کہ عرصہ ہوا وہ اسکیم فیل ہو چکی، مدرسہ کا نام ونشان باقی نہیں رہا، اس کے لائق مدرسین کچھ تو پیوند خاک ہو گئے اور کچھ گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں، نظر بہ اسباب ظاہر شیخ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا، لیکن توفیق الٰہی نے دستگیری فرمائی اور جس کو شیخ الحدیث کے لقب سے مقبول خاص وعام ہونا تھا اور جس سے خدا کو حدیث کی خدمت طلبۂ علوم دینیہ کی تربیت اور ایک عالمگیر دینی تحریک (تبلیغ) کی سرپرستی اور مشائخ عصر کی جانشینی کا اہم کام لینا تھا اس کو اس معاملہ میں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطاء فرمائی گئی۔ شیخ کے الفاظ میں سنیے، فرماتے ہیں:

''اس ناکارہ نے مولانا مرحوم سے کہا کہ آپ کے احسانات مجھ پر بہت زیادہ ہیں ان احسانات کے مقابلے میں مجھے آپ سے معذرت کرنی نہایت ہی نامناسب ہے لیکن ان سب کے باوجود آپ تو مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت سے اجازت لوں لیکن آپ کے براہِ راست کہنے پر اگر حضرت مجھے حکم بھی فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں۔'' عزیمت کا یہ جواب سن کر مولانا رحیم بخش صاحب جو بڑے جوہر شناس اور جہاں دیدہ تھے کبیدہ خاطر نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے جواب کی بڑی قدر کی اور فرمایا کہ میں تمہارا معتقد تو پہلے سے تھا لیکن اس جواب سے میں اور زیادہ معتقد ہو گیا۔

ارشاد فرمایا جس کو میں نے مختصر نقل کیا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ میں نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت اگر یہ حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر یہ مشورہ ہے تو میری تمنا تو یہ ہے کہ حضرت سہارنپوری تو انشاء اللہ تشریف لے ہی آئیں گے (حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ اس وقت نینی تال جیل میں بمد تفتیش محبوس تھے جس کا قصہ تذکرۃ الخلیل میں مفصل موجود ہے) میری تمنا ہے کہ حضرت سہارنپوری کی زندگی میں کسی دوسری جگہ نہ جاؤں۔ حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ نے میرا جواب سن کر فرمایا کہ بس بس! اور انتہائی مسرت اور انتہائی اخلاص کے ساتھ مجھے اس قدر دعائیں دیں کہ آج بھی وہ دعائیں میرے لیے انتہائی موجب لذت ہیں اور ان کی برکات ہر وقت محسوس کرتا ہوں اور ارشاد فرمایا کہ میری بھی یہی خواہش تھی۔ مگر مولانا عاشق الٰہی صاحب نے بہت اصرار کیا تھا کہ زکریا میرے کہنے کو مانتا نہیں آپ اس کو حکم فرمائیں کہ وہ میرٹھ منتقل ہو جائے اور جو وجوہ مولانا نے بتلائی تھیں وہ ظاہر تھیں، اس لیے میں نے مشورہ دیا تھا۔ یہ جواب سن کر اللہ مجھے معاف کرے مجھے مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اتنا غصہ آیا کہ حد نہیں۔ اگرچہ مولانا میرٹھی نے ازراہِ شفقت فرمایا تھا۔ مگر میری حماقت کہ تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے مولانا کی شفقت کا بدلہ بہت ہی گرانی کے ساتھ دیا۔ اگر اس وقت کوئی لفظ گستاخی کا مولانا مرحوم کی شان میں نکل گیا تو اللہ ہی معاف فرمائے اور مولانا کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

دوسرا(۱) تیسرا ابتلاء وہی ہے جس کو علی میاں نے تحریر فرمایا، گو بہت مختصر لکھا، بہر حال صحیح لکھا۔

چوتھا ابتلاء، وہ اس ناکارہ کے سفر حج سے واپسی کے تین چار سال بعد جن کی تاریخیں تو صحیح مل ہی جائیں گی کہ وہ خطوط میرے کباڑ خانہ میں کسی بستہ کے اندر ضرور موجود ہوں گے، یہ پیش آیا کہ سفر حج سے واپسی، ۴۶ھ سے، دورہ شریف کے اسباق مستقل میرے یہاں ہونے لگے اور چونکہ والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ابوداؤد کا سبق مستقل اور مسلسل رہا اور پھر ''بذل'' میں اس ناکارہ کا اشتغال بھی مسلسل اسی کے ساتھ رہا اس لیے یہ کتاب تو ۷۳ھ جب تک حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سابق ناظم کا انتقال نہیں ہوا، مسلسل اور مستقل میرے ہی پاس رہی، اس کے علاوہ دوسری کتابیں نسائی شریف، بخاری شریف جلد اول وغیرہ بھی ہوتی رہیں، لیکن ابوداؤد شریف کو اہل مدرسہ نے ہمیشہ میری ہی سمجھا اور میں نے بھی اس کو ہمیشہ اپنی ہی سمجھا اس لیے جو طلبہ ابوداؤد پڑھ کر جاتے تھے وہ اپنی محبت سے اس کے ذکر، تذکرہ اور جیسا کہ لوگوں کی عادت ہے اِطْرَاءُ الْمَادِح کے ساتھ کرتے رہا کرتے تھے۔ ان ہی مَادِحِین میں سے میرے

(۱) یہ دوسرا واقعہ علی گڑھ کا اور تیسرا کرنال کا ہے۔

مخلص دوست مولوی عادلِ قدوسی گنگوہی بھی تھے، جنہوں نے ۴۲ھ میں دورہ سے فراغت حاصل کی، یہ تو مجھے یاد نہیں کہ حدیث کی کیا کتاب مجھ سے پڑھی، لیکن یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ دائرۃ المعارف حیدر آباد میں تصحیح کے کام پر ملازم ہوگئے اور وہاں کے مطبع کے اکابر میں وہ اونچی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، انہوں نے نہ معلوم اہلِ مطبع کو کیا جھوٹی سچی باتیں سنائی کہ دو تین سال بعد ان کا ایک بہت ہی طویل خط یاد پڑتا ہے کہ سات آٹھ ورق کا بہت ہی دل لبھانے والا پہنچا، جس میں لکھا تھا کہ دائرہ میں بیہقی کے اسماء رجال کی تالیف کا مشورہ طے ہوا اور یہاں مجلس نے دو آدمیوں کا انتخاب کیا ہے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اور تیرا اور ان دو میں بھی تجھے ترجیح ہے، اس لیے کہ کام بہت لمبا ہے اور حضرت شاہ صاحب کی مشیخت وضعف و پیری اور تیرے شباب وجوانی کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے زمانہ میں پوری نہ ہو سکے۔ تنخواہ آٹھ سو روپے اور ایک موٹر تیرے استعمال کے لیے سرکاری، جس کا پٹرول اور ڈرائیور کی تنخواہ وغیرہ جملہ چیزیں سرکاری ہوں گی تا کہ تو جہاں جس وقت جانا چاہے جا سکے، مکان بھی سرکاری ہوگا۔ ان میں تو کوئی چیز اللہ کے احسان سے دل لبھانے والی نہیں تھی، جس کو میں نے لبھانا لکھا وہ یہ تھی دائرہ کی ملازمت صرف چار گھنٹہ ہوگی، باقی میں تو مختار ہوگا کہ جو چاہے کرے، دائرہ کے کتب خانے پر تو تیرا اختیار ہوگا ہی کہ جس وقت چاہے تو آئے اور جس وقت چاہے لکھے، کتب خانہ آصفیہ کے اوپر تجھے یہ اختیار ہوگا کہ جتنی دیر چاہے بیٹھ کر کتابیں دیکھے اور جو چاہے کتابیں منگا لے اور تو چونکہ ''اوجز المسالک'' لکھ رہا ہے اس لیے اس کی تالیف میں جتنی آسانی یہاں ہو سکتی ہے وہ مظاہر علوم میں نہیں اور دائرہ تجھ سے جو کام لینا چاہتا ہے وہ بھی علم حدیث کا ہی ہے اور بہت ہی اوجز کی تالیف کی سہولتیں لکھی تھیں۔ جس کے جواب میں اس نا کارہ نے صرف ایک کارڈ لکھا تھا کہ جس میں نہ القاب نہ آداب:

''مجھ کو جینا ہی نہیں بندۂ احساں ہو کر''

فقط: زکریا

صرف یہ مصرعہ لکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ عزیز کا خط آیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، اس نے بہت ہی شفقت ومحبت سے لکھا تھا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر۔ ''اَوجز'' کی تالیف جتنی بہتر یہاں ہو سکتی ہے سہارنپور میں نہیں ہو سکتی، لیکن اس وقت تو مجھ پر ملازمت سے وحشت کا ایسا اثر مسلط تھا کہ نظر ثانی کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ مگر بعد میں کبھی کبھی اس ابتلاء کے متعلق اب تک یہ خیال آتا رہتا ہے کہ معلوم نہیں میں نے اچھا کیا یا برا کیا۔ اس زمانہ میں ملازمت سے طبعیت کو وحشت ہی بہت تھی، لیکن اوجز کی تالیف میں بہت سی سہولتیں اور مواد ملتا۔

اس کے بعد پانچواں ابتلاء تقسیم ہند سے دوتین سال پہلے پیش آیا۔ وہ یہ کہ اسی ابوداؤد شریف کی برکت سے بنگالی طلبہ (جن کی تقسیم ہند سے پہلے تک بہت ہی کثرت سے آمد تھی، ان میں سے اب بھی مشرقی پاکستان کے مدارس میں صدر مدرس یا شیخ الحدیث ہیں) نے نہ معلوم کیا کیا کہا اور کس کس سے کہا۔ وہاں سے چاٹگام یا ڈھاکہ کے مدرسہ عالیہ کے منتظمین کا ایک بہت لمبا خط آیا۔ نام میں اس وقت تردد ہے جس میں وہاں کی مشیخت حدیث کے لیے اور صرف ترمذی، بخاری شریف پڑھانے کے لیے بارہ سو روپے تنخواہ پر اس ناکارہ کو بہت ہی اصرار سے بلایا تھا اور ایک تار ارجنٹ اس مضمون کا کہ خط کے جواب کا شدت سے انتظار ہے، مگر اس وقت تک خط نہیں پہنچا تھا اور دو روز بعد دوسرا ارجنٹ جوابی تار ''خط کے جواب کا سخت انتظار ہے'' ملا۔ اس وقت خط پہنچ چکا تھا۔ تار کا جواب تو میں نے صرف یہ لکھ کر کہ ''معذوری ہے''۔ مفصل خط میں ان کو میں نے لکھا کہ ''جن دوستوں نے آپ سے میرا نام لیا ہے انہوں نے محض حسن ظن سے غلط روایت پہنچائی ہیں، یہ ناکارہ نہ اس کا اہل ہے اور نہ متحمل''۔

اس کے بعد البتہ اللہ کا احسان ہے کہ پھر کوئی واقعہ اس قسم کا پیش نہیں آیا اور بجز حیدرآباد والے واقعہ کے اور سب پر اللہ کا بہت ہی شکر ادا کیا کہ اللہ نے بہت ہی کرم واحسان فرمایا۔ اگر ان میں سے کسی ایک میں پھنس جاتا تو صورۃ جو ایک ڈھونگ بنا رکھا ہے یہ بھی نہ رہتا۔

البتہ حیدرآباد والے واقعہ میں یہ ضرور خیال آتا ہے کہ شاید ''لامع'' ''اَوجز'' خوب اچھی لکھی جاتی اور چونکہ مدرسہ کا قصہ بھی نہ ہوتا اس لیے فراغت بھی خوب ملتی اور جلدی لکھی جاتی۔ لٰکِنَ الْخَیْرَ فِیْمَا وَقَعَ۔

یہ چند واقعات اس زمانے کے ہیں جب عرفاً شعور کا زمانہ سمجھا جاتا تھا۔ حقیقی شعور تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوا لیکن جو زمانہ عرفی بے شعوری کا تھا اور اگر یوں کہوں کہ ابتدائی ابتلاء کا تھا تو بے محل نہ ہوگا۔ مرزا ثریا جاہ مرحوم کا ذکر تو میرے چچا جان نوراللہ مرقدہٗ اور عزیز مولوی یوسف مرحوم کی سوانحوں میں کثرت سے گزر چکا، ان کو میرے دادا صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے بہت ہی عقیدت اور محبت تھی انہوں نے میرے دادا نوراللہ مرقدہٗ سے باصرار یہ خواہش اور تقاضا کیا کہ میں اپنی عمر کی قیصر جہاں بیگم کا نکاح عزیز مولوی محمد یحییٰ صاحب سلمہٗ سے کرنا چاہتا ہوں، دادا صاحب پسند تو نہ کرتے تھے مگر مرزا صاحب کے شدید اصرار پر انہوں نے میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے اِسْتِمْزَاج کیا، والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے معذرت کردی، جس کا صاحبزادی مرحومہ کو بھی بہت قلق تھا۔ مگر اس خاندان سے میرے والد صاحب اور چچا جان نوراللہ مرقدہما اور اس ناکارہ کے بھی ابتدائی دور میں ایسے تعلقات وابستہ تھے جیسے گھر والوں کے ہوتے ہیں۔ میرے والد

صاحب اور چچا جان نور اللہ مرقدہما کی کثرت سے آمدورفت قیصر جہاں مرحومہ کے مکان میں ہوتی تھی۔ جب کبھی میرا جانا ہوتا تو مرحومہ باوجود اپنی انتہائی نفاست، نزاکت کے مجھے۔ اپنے پاس سلایا کرتیں اور بہت لپٹ کر سویا کرتی تھیں، میری عمر اس وقت ۶، ۷ سال کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے۔ مرحومہ نے کئی مرتبہ میرے سامنے والد صاحب سے اصرار کیا کہ مجھے تو آپ نے قبول نہ کیا مگر زکریا میرا بچہ ہے میں اس کو اپنا بیٹا بناؤں گی، اپنے پاس رکھوں گی اور اپنی لڑکی سے اس کا نکاح کروں گی۔ والد صاحب کا جواب تو ہوتا تھا کہ جس چیز کو میں نے اپنے لیے پسند نہ کیا اس کے لیے کیسے پسند کروں؟ مگر ان کا شدید اصرار از خود رفتہ تھا کی بناء پر ایک مرتبہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے امتحاناً مجھ سے دریافت فرمایا، میں نے عرض کیا کہ "پاندان لیے لیے پھرنا میرے بس کا نہیں"۔ اس کی شرح یہ ہے کہ مرحومہ کے شوہر مرزا محمد شاہ کو مرحومہ سے عشق تھا، وہ نہایت نفیس مسہری پر بیٹھی رہتی تھیں اور مرزا شاہ مرحوم پاندان ان کے پاس لا کر رکھتے اور یہ کہتے تھے کہ "بیگم ایک پان کھلا دو"۔ مجھے یہ چیز اس قدر ناگوار ہوتی کہ اپنے خاندان کے بالکل ضد، ہمارے گھر کا تعامل بیوی گویا محکومہ خادمہ ہے خاوند کا منصب ہے بیوی سے یہ کہے کہ ایک پان بنا لا۔

والد صاحب کا امتحان اور میرا جواب:

میرے اس جواب پر والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے خود اپنا قصہ مجھے سنایا۔ یہ ارشاد فرمایا کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی مجھ سے بچپن میں قیصر جہاں کے نکاح کے متعلق دریافت فرمایا تھا تو میں نے یہ جواب دیا تھا کہ ان شہزادی سے نکاح کے بعد بوریے پر لیٹنا تو کبھی نصیب نہیں ہوگا اور یہ قصہ سنا کر یہ فرمایا کہ میرے اور تیرے جواب میں آسمان زمین کا فرق ہے، تیرے جواب سے تکبر کی بو ٹپکتی ہے۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے کہ بہت ہی باریک نگاہ سے میری ہر حرکت کو دیکھا کرتے تھے۔

یہ ساری باتیں تو ایک ابتلاء کے دور کی ہیں اور یہ بھی چند واقعات ذکر کیے ورنہ ان جزئیات کے لیے ایک "الف لیلہ" چاہیے۔ اللہ جل شانہٗ نے ہر ہر موقع پر انتہائی کرم اور لطف اور مدد فرمائی۔

انوکھی تربیت:

اس سے زیادہ اہم اور نہایت ہی اہم عنوان "تربیت" کا تھا، جس کو علی میاں نے بالکل ہی اڑا دیا، ضمناً کہیں کہیں ایک دو واقعے آ گئے ہیں، یہ عنوان بھی بہت طویل ہے، جس طرح میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اس سیہ کار کی تربیت فرمائی وہ درحقیقت بہت ہی اہم اور بہت ہی دقیق اور شدید نگرانیوں کے ساتھ ہوئی۔ اگر مجھ میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تو میں یقیناً آج کچھ بنا

ہوا ہوتا، مگر مثل مشہور ہے کہ کتے کی دم بارہ سال نلکی میں رکھی مگر وہ سیدھی ہو کر نکلی۔

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں سب سے زیادہ شدت ترک تعلقات پر تھی، ان کا مقولہ جو بار بار انہوں نے ارشاد فرمایا یہ تھا کہ ’’آدمی چاہے کتنا ہی غبی اور کند ذہن ہو اگر اس میں تعلقات کا مرض نہیں تو وہ کسی وقت ذی استعداد بن کر رہتا ہے اور آدمی چاہے جتنا بھی ذی استعداد، ذہین اور علم کا شوقین ہو اگر اس کو تعلقات کا چسکہ ہے تو وہ اپنے جوہروں کو کھو کر رہے گا۔‘‘

اس کے ساتھ ساتھ ابتداءِ عمر میں امردوں کا کسی سے میل جول ان کے نزدیک خطرناک تھا، اس کو علی میاں نے تحریر تو فرمایا، جیسا کہ (صفحہ ۷۹) پر لکھا ہے، لیکن اس کو الٹا کر دیا، یہ تو میری مجال ہی نہ تھی کہ میں کسی کو سلام کروں یا میں از خود کسی ایسے شخص کے پاس جماعت کی نماز میں کھڑا ہوں جس کے پاس اس سے پہلے کی نماز میں کھڑا ہو چکا ہوں۔ اگر کوئی دوسرا اجنبی مجھے سلام کر لیتا تھا تو مجھ سے جواب طلب ہو جاتا کہ یہ کون ہے؟ اور اگر کوئی ایسا شخص جو پہلی نماز میں بھی میرے برابر ہوتا تھا، اتفاقاً میرے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا تو مجھے ڈر کے مارے نیت توڑ کر جانا پڑ جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس کو بھگتنا تو مجھے پڑتا تھا اور اس خیال سے کہ پاس والے کو یہ خیال ہوگا کہ کیا بات ہوئی، کبھی کھانسنے کا بہانہ کرتا تھا اور کبھی ناک پکڑ کر کہ گویا نکسیر آگئی ہے، وہاں سے نکلتا تھا اور ان دونوں چیزوں کا ردِ عمل اب اس زور سے ہو رہا ہے کہ سلام کا تو کہنا ہی کیا میری معذوری کی وجہ سے دونوں طرف اٹھانے والے گویا متعین ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میرے والد صاحب کی نگاہ میں بڑی اہم چیز صاحبزادگی کا مسئلہ بھی تھا، ان کا بار بار کا سینکڑوں دفعہ کا سنا ہوا مقولہ کہ یہ صاحبزادگی کا سُوَر بہت دیر میں نکلتا ہے، اس ناکارہ کے متعلق اگر کبھی ان کو کسی فعل سے اس کا شبہ بھی ہو جاتا تھا تو پھر خیر نہیں ہوتی تھی۔ ابھی ایک واقعہ اس سلسلہ میں لکھوں گا۔

میرے پیارے دوست! لکھنے کی چیزیں تو یہی تھیں علی میاں نے ایران، توران اور فضول باتیں لکھ دیں، ان سے کسی کو کیا فائدہ ہوگا اور میری نگاہ میں تو مبالغہ بھی بہت ہے، مختصراً اپنی تربیت کے چند واقعات ضرور لکھوں گا، اگرچہ یہ چیزیں بعد از وقت ہیں، اگر میں مسودے کو پہلے دیکھ لیتا تو امید تو نہیں تھی کہ علی میاں ان کو میرے الفاظ میں چھاپ دیں گے لیکن میں تو اصرار کر ہی دیتا۔ میں تو حدیث پاک کے سبقوں میں ہمیشہ انہی واقعات کو بہت لطف اور مزے سے نقل کرتا ہوں اور بڑی دعائیں دیتا ہوں کہ ان کے جوتوں ہی کی برکت سے دینداری کی ظاہری صورت بنائے بیٹھا ہوں اور ان کی ہر مار پر بڑی دعائیں دیتا ہوں، گو اس وقت بتقاضائے عمر اور نافہمی جتنا بھی رویا ہوں یا رنج و غضب کیا ہو ظاہر ہے۔

چندواقعات ضرور سنو تم کو لطف آئے یا نہ آئے مجھے تو لکھنے میں لطف آئے ہی گا:

(۱)......میری عمر تین چار سال کی تھی، اچھی طرح سے چلنا بھی بے تکلف نہیں سیکھا تھا، سارا منظر خوب یاد ہے اور ایسی باتیں ''اَوْقَعُ فِی الذِّھْن'' ہوا کرتی ہیں، میری والدہ نور اللہ مرقدھا کو مجھ سے عشق تھا، ماؤں کو محبت تو ہوا ہی کرتی ہے، مگر جتنی محبت ان کو تھی اللہ ان کو بہت بلند درجے عطا فرمائے، میں نے ماؤں میں بہت کم دیکھی، اس وقت انہوں نے میرے لیے ایک خوبصورت تکیہ چھوٹا سا سِیا تھا، ایک بالشت میری موجودہ بالشت سے چوڑا اور ڈیڑھ بالشت لمبا، اس کی ہیئت بھی کبھی نہیں بھولوں گا، اس کے اوپر گوٹہ، گوکھرو، کرن بنت وغیرہ سب کچھ ہی جڑا ہوا تھا، نیچے لال قند کا غلاف اور اس پر سفید جالی کا جھالر، بہت ہی خوشنما، وہ مجھے اتنا محبوب تھا کہ بجائے سر کے میرے سینے کے اوپر رہا کرتا تھا، کبھی اس کو پیار کرتا، کبھی سینے سے چمٹایا کرتا، والد صاحب نے آواز دے کر فرمایا کہ ''زکریا مجھے تکیہ دے دے''۔ مجھ میں پدری محبت نے جوش مارا اور اپنے نزدیک ایثار اور گویا دل پیش کردینے کی نیت سے میں نے کہا کہ ''میں اپنا تکیہ لے آؤں''۔ فرمایا کہ ''ورے آ'' میں انتہائی ذوق وشوق میں کہ ابا جان اس نیاز مندی اور سعادت مندی پر بہت خوش ہوں گے، دوڑا ہوا گیا، انہوں نے بائیں ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اور داہنے ہاتھ سے منہ پر ایسا زور سے تھپڑ رسید کیا کہ آج تک تو اس کی لذت بھولا نہیں اور مرتے وقت تک امید نہیں کہ بھولوں گا اور یوں فرمایا کہ ''ابھی سے باپ کے مال پر یوں کہتا ہے کہ اپنا لاؤں، کچھ کما کر ہی کہنا کہ اپنا لاؤں''۔ اللہ ہی کا فضل وکرم ہے اور محض اس کا ہی لطف واحسان ہے کہ اس کے بعد سے جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو دل میں یہ مضمون پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ اپنا اس دنیا میں مال نہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ دن بہ دن یہ مضمون پختہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

(۲)......میری عمر آٹھ سال کی تھی، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وصال کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا، حضرت کے وصال کے بعد والد صاحب نے خانقاہ شریف ہی میں بچوں کو تعلیم دینا شروع کردیا تھا اور جس وقت یہ واقعہ لکھ رہا ہوں خوب یاد ہے کہ اسّی (۸۰) لڑکے تھے، ان میں قاعدہ بغدادی پڑھنے والے بھی تھے اور حماسہ اور ہدایہ اولین پڑھنے والے بھی۔ اوپر کے اسباق تو والد صاحب اور چچا جان پڑھایا کرتے تھے اور ہر اونچی جماعت والے کے ذمہ اس سے نیچے والی جماعت کے اسباق ہوتے تھے کہ اپنے پڑھے اور ان کو پڑھائے اور والد صاحب کے سامنے یہ اسباق پڑھائے جاتے تھے۔ خانقاہ کی مسجد میں اس وقت تک والد صاحب ہی نماز پڑھاتے تھے۔ نماز شروع ہوگئی اور میں خانقاہ کی مسجد میں ایک طاق تھا، اس پر ہاتھ رکھ کر لٹکنے کی کوشش میں تھا مگر

اس پر میرا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ ان شاگردوں میں ایک شخص مولوی صغیر احمد تھے جو معلوم نہیں اب حیات ہیں یا نہیں مگر گنگوہ کے رہنے والے اور بعد میں بمبئی کے بڑے واعظوں میں ہو گئے تھے، وہ وضو کر کے جلدی سے آئے اور ادھر رکوع شروع ہو گیا، انہوں نے تیزی سے آ کر محبت کی بناء پر مجھے طاق پر لٹکا دیا، مجھے غصہ آ گیا کہ میری مساعی جمیلہ میں اس نے ٹانگ کیوں اڑائی۔ جب سب سجدہ میں گئے تو میں نے مولوی صغیر کی کمر میں زور سے ڈُکّ مارا، چوٹ تو ان کو کیا لگتی مگر آواز بہت ہوئی۔ نماز پڑھتے ہی مقدمہ قائم ہو گیا، خانقاہ میں گولر کے نیچے سارا مجمع اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی سہ دری کے آخری در کے سامنے ابا جان اور مطالبہ یہ ''کہ کس نے مارا تھا اور کس کے مارا تھا؟'' مگر ڈر کی وجہ سے کوئی بولا نہیں۔ دس بارہ منٹ کے بعد فرمایا کہ اچھا اب تو سبق کا حرج ہو رہا ہے سبق کے بعد سب کی چھٹی بند، جب تک کہ تحقیق نہ ہو جائے۔ عصر کے بعد دوبارہ میدان حشر قائم ہوا، ان کا مطالبہ اور جواب میں سکوت۔ انہوں نے فرمایا کہ کسی ایک کو بھی جانے کی اجازت نہیں، چاہے صبح ہو جائے اور میں اپنے دل میں یہ دعائیں کر رہا تھا کہ جو ہونا ہو گا ہو جائے گا مولوی صغیر جلدی سے بتا دیں خواہ مخواہ سب پھنس رہے ہیں۔ بالکل میدانِ حشر کا منظر تھا جس کی بناء پر سب پریشان پھر رہے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد مولوی صغیر نے دبی ہوئی اور مری ہوئی آواز زبان سے کہا کہ ''میرے مارا تھا''۔ اب تو مقدمہ کا بہت سا حصہ گویا طے ہو چکا۔ اس پر سختی سے مطالبہ ہوا کہ ''کس نے؟'' مگر وہ چپ۔ جب اس نے دیکھا کہ ''ضَرَبَ یَضْرِبُ'' ہونے کو ہے تو اس نے میری طرف اشارہ کیا کہ ''اس نے''۔ اس پر والد صاحب نے فرمایا کہ ''اِس نے؟'' انہوں نے کہا جی پھر فرمایا کہ ''اس نے؟'' اس وقت والد صاحب کا دستور عصر کے بعد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر حاضری کا تھا، یہ نابکار بھی ساتھ ہوتا اور میری ایک چھوٹی سی چھتری تھی جو ٹوٹ گئی تھی اور اس کی ڈنڈی کو لکڑی بنا لیا تھا جو مزار پر جانے کے وقت میں میرے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی، میرے ہی ہاتھ سے چھین کر اتنا مارا کہ وہ چھوٹی سی لکڑی بھی دو جگہ سے ٹوٹ گئی اور صرف ایک لفظ ان کی زبان پر ہر مار پر ہوتا تھا ''ابھی سے صاحبزادگی کا یہ سُوَر''۔ انہیں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ بدصاحبزادگی باپ کے شاگرد کو مار دیا۔ سردی کا زمانہ تھا اور میں روئی کا انگرکھا پہنا کرتا تھا مگر اس وقت نہیں تھا، اس لیے کہ صبح اور عشاء کے وقت پہنا کرتا تھا اور عصر کے وقت چونکہ سردی نہیں ہوتی تھی، اس وقت صرف ایک ہی کرتہ بدن پر تھا۔ میرے بازو اتنے سُوج گئے تھے کہ پندرہ دن تک انگرکھا بالکل نہیں پہن سکا۔ اس وقت تو نہیں مگر ان کا ایک خاص مقولہ جو کئی دفعہ مجھ سے فرمایا، یہ تھا کہ ''اگر تو پٹتے پٹتے مر گیا تو تُو شہید ہو گا، مجھے ثواب ہو گا''۔ آپ خود سوچیں کہ جس کا یہ نظریہ ہو وہ کیا کسر چھوڑے گا۔

(۳)......اسی زمانے کا قصہ ہے کہ اس نابکار کو بزرگی کا جوش ہوا اور مغرب کے بعد حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے حجرے کے سامنے لمبی نفلوں کی نیت باندھ لی، ابا جان نے آ کر زور سے تھپڑ مارا اور فرمایا کہ ''سبق یاد نہیں کیا جاتا'' میرے چچا جان ''اس زمانے میں بڑی لمبی نفلیں پڑھا کرتے تھے، بعد مغرب سے عشاء کی اذان کے قریب فارغ ہوا کرتے تھے، لیکن والد صاحب کے یہاں مختصر سے نوافل کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا، اس وقت تو مجھے بہت غصہ آیا کہ خود تو پڑھی نہیں جاتی، دوسرے کو بھی پڑھنے نہیں دیتے، مگر جلدی ہی سمجھ میں آ گیا کہ بات صحیح تھی، وہ نفلیں بھی شیطانی حربہ علم سے روکنے کے واسطے تھا، اس لیے کہ جب نفلیں پڑھنے کا دور آیا تو اب نفس بہانے ڈھونڈتا ہے۔

(۴)......میری عمر دس سال تھی، میری والدہ گنگوہ سے رامپور جا رہی تھیں، بہلی میں اور بھی چند مستورات تھیں اور میں بھی تھا، ایک ٹٹو (گھوڑی) جس کے ساتھ اس کا چلانے والا بھی تھا، اس پر والد صاحب تشریف فرما تھے۔ والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو گھوڑے کی سواری کی عادت نہ تھی مگر معمولی سا ٹٹو جس کے ساتھ چلانے والا بھی ہو اس پر دو دفعہ بیٹھنے کی نوبت آئی، راستہ میں ایک جگہ والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے از راہِ شفقت ارشاد فرمایا کہ ''تو گھوڑی پر بیٹھے گا؟'' میں نے بہت شوق سے کہا ''جی'' اور شوق سے کود پڑا اور گھوڑی پر بیٹھ کر شوق سے عزت میں گھوڑا کو بہلی کے سامنے لایا، میری والدہ نے اور دوسری مستورات نے جب میں قریب پہنچا، کچھ زبان سے اور کچھ اشارے سے کہ بُری بات ہے ابا تو پیدل جا رہے ہیں اور تو گھوڑی پر بیٹھا ہے۔ میں نے ابا جان سے عرض کیا کہ عورتیں یوں کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے بہت غصہ میں فرمایا کہ ''اندھی کے تجھے نظر نہیں آتا، عورتیں ہی کہہ رہی ہیں تیری آنکھیں پھوٹ گئیں ہیں''۔ مابدولت بیک بینی و دو گوش گھوڑی سے اتر کر گاڑی میں بیٹھ گئے، اس بات پر مجھے اللہ کا شکر ہے کہ کوئی گرانی نہیں ہوئی اور میرے ذہن میں تھا کہ تو نے برا کیا۔

(۵)......میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اس کا بھی بہت اہتمام تھا کہ میرے پاس پیسہ نہ رہے، کسی دوسرے سے پیسہ لینا تو درکنار کسی کھانے پینے کی چیز کا لینا بھی ناممکن تھا بلکہ اس کے شبہ پر بھی سخت تحقیقات ہوتی تھیں، جیسا کہ اگلے نمبر پر مستقل ایک واقعہ ذکر کروں گا، البتہ خود پیسے دینے کا معمول تھا اور ساتھ یہ کہ میرے پاس پیسہ نہ رہیں، اس لیے جب مجھے کچھ دینے کا ارادہ فرماتے تو پہلے والدہ سے فرما دیتے کہ زکریا کو اتنا پیسہ یا روپیہ دینا ہے اور والدہ نور اللہ مرقدھا اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی اونچے درجے عطا فرمائے، مجھ سے محبت بے انتہا تھی، اسی وقت سے مجھے قرض دینے کے فضائل اور ثواب اتنے لَا تُعَدّ وَلَا تُحصٰی سناتیں اور آخرت میں کارآمد ہونے کی

ترغیبیں اور دنیا میں جو خرچ ہو اس کی لغویت بتلاتیں اور اس کے بعد پھر فرماتیں کہ ''تیرے پاس کچھ پیسے ہوں تو دے دے تجھے ثواب ہوگا''۔ کچھ تو واقعی والدہ کی محبت اور کچھ ثواب کی اہمیت تو اس وقت کہاں ہوتی، البتہ ''مَنْ نُوْقِشَ فِی الْحِسَابِ فَقَدْ عُذِّبَ'' کا نقشہ بغیر حدیث پڑھے ہی سامنے تھا اس لیے کہ ان پیسوں کا حساب دینا تو کارے دارد تھا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ اب تک پیسہ جیب میں رکھنے کی عادت نہیں۔ اللہ نے دوست واحباب ایسے مہیا کرر کھے ہیں کہ وہ ہر وقت میری فرمائشیں پوری کرتے رہتے ہیں اور دو چار دن میں ایک بل مجھے دے دیتے ہیں اور یہ وہی دستِ غیب کا نسخہ ہے جو کسی تبلیغی اجتماع میں صوفی عبدالرب صاحب کو بتلایا تھا۔

(۶)......اس سے پہلے نمبر میں لکھا تھا کہ شبہ پر تحقیقات ہوتی تھیں ایک واقعہ مثال کے طور پر لکھ رہا ہوں، مدرسہ قدیم (دفتر مدرسہ مظاہر علوم) کی چھت پر والد صاحب کا قیام اور پیشاب کی جگہ اسی چھت پر اس کے بالمقابل تھی، والد صاحب پیشاب کے لیے تشریف لے گئے، راستہ میں ایک جگہ سے کباب کی خوشبو آئی جو مولانا ظفر احمد صاحب پاکستانی شیخ الاسلام پاکستان نے کسی طالب علم سے بعد مغرب یہ کہہ کر کہ ایک کباب لا کر یہاں رکھ دینا میں نفلوں کے بعد لے لوں گا، نماز کی نیت باندھ لی۔ والد صاحب کے بعد میں پیشاب کو گیا۔ والد صاحب کو یہ شبہ ہوا کہ وہ کباب اس نے منگائے تھے اور پیشاب کے بہانے سے یہ کھا کر آیا ہے، مجھ سے مطالبہ فرمایا کہ ''وہ کباب کس کے ہیں؟'' میں نے لاعلمی ظاہر کی، اول تو سختی سے فرمایا، پھر جا کر ان کو دیکھا تو وہ وہیں رکھے تھے۔ چونکہ مولانا ظفر احمد صاحب زمانے میں شریکِ دسترخوان تھے۔ جب سب حضرات کھانے کے واسطے بیٹھے تو مولانا ظفر احمد صاحب نے کسی طالب علم سے فرمایا کہ وہاں کباب رکھے ہیں وہ اٹھا لاؤ تو والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اطمینان ہوا۔

(۷)......پیسوں کے سلسلے میں ایک عجیب واقعہ سناؤں، ان کی تعلیم کا طرز تو عجیب ونرالا تھا، ان کے یہاں اہم کتاب کے شروع پر یا ختم پر مٹھائی کے نام سے کچھ پیسے ملنے کا بھی دستور تھا جو میرے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ مخصوص شاگردوں میں سب ہی کے ساتھ تھا۔ لیکن میرے ساتھ یہ خصوصیت تھی کہ ان پیسوں کی مٹھائی کھانا سخت معیوب تھا، بلکہ نہایت سنگین جرم تھا کہ یہ ان کے یہاں چٹورپن تھا، بلکہ ان پیسوں کا مصرف کوئی ضرورت کی چیز کتاب وغیرہ یا والدہ کے توسط سے کوئی مقوی دماغ چیز تھی۔ جب میرا فقہ شروع ہوا اور ان کے یہاں تعلیم میں بھی جدت تھی، جس کا اثر چچا جان کی تعلیم میں بھی تھا کہ ان کے یہاں درس نظامی کی پابندی نہیں تھی بلکہ ہر شخص کی حیثیت کے موافق کتاب تجویز ہوتی تھی ''الفیہ ابن مالک'' کا سبق روزانہ حفظ سنا کرتے تھے۔ ان کے یہاں ہدایۃ النحو اور کافیہ ساتھ ہوا کرتا تھا، کافیہ کی ترتیب پر جتنا سبق شام کو کافیہ کا مناسب ہوتا اس کی

بقدر صبح کو ہدایۃ النحو ہوتی تاکہ وہ کافیہ کے لیے مطالعہ کا کام دے، اسی طرح قدوری اور کنز ساتھ ہوتی کنز کی کی ترتیب پر۔ جب میرا فقہ شروع ہوا یعنی قدوری اور کنز کی بسم اللہ ہوئی تو مجھے بیس روپے انعام ملے تھے اور دینے کے بعد فرمایا کہ ''ان کا کیا کروگے؟'' میں چونکہ بھیڑیے کی آنکھ سے سبق پڑھے ہوئے تھا، میں نے کہا کہ میرا یوں جی چاہتا ہے کہ اپنے چاروں بزرگ حضرت سہارنپوری، حضرت دیوبندی، حضرت رائے پوری، حضرت تھانوی کو پانچ پانچ روپے کی مٹھائی پیش کروں، یہ میری تجویز کسی اخلاق پر تو مبنی تھی ''مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ'' کے ڈر سے تھی، بڑی شاباش ملی اور میری فہم ودانش پر مبارکبا، پھر فرمایا کہ ''مٹھائی کیا دے گا؟'' اس کے بعد لکھنے والے نے کہا کہ یہ قصہ الخ علی میاں سوانح میں حاشیہ، صفحہ نمبر ۹۷ پر لکھ چکے ہیں، اس لیے اسی جگہ پر ختم کردیا۔ البتہ ابتدائی حصہ کی ترتیب اور میری تجویز کی وجہ اس میں نہیں ہے۔

(۸)......کاندھلہ کی عید کا واقعہ بھی علی میاں نے صفحہ نمبر ۴۷ پر لکھا تو ہے مگر بہت مختصر۔ رمضان المبارک ۲۸ھ میں جب کہ میری عمر تیرہ سال کی تھی اور سہارنپور آنے کے بعد پہلی عید تھی، کاندھلہ اس سے پہلے شاید تین چار سال کی عمر میں ایک عید کی تھی، اس کی چہل پہل، عیدگاہ میں بچوں کے ساتھ جانا اور عیدگاہ کے مناظر خوب یاد تھے، ۱۵ رمضان کے آس پاس والد صاحب نے ازراہِ شفقت ومراحم خسروانہ فرمایا کہ ''تیرا کاندھلہ عید کرنے کو جی چاہتا ہے؟'' میں نے بڑے زور سے کہا کہ ''جی'' فرمایا کہ ''اچھی بات ہے ۲۹ کو بھیج دوں گا''۔ خوب یاد ہے کہ یہ پندرہ دن خوشی کے اند رہر روز عید تھا اور ہر رات شب قدر، کبھی خوشی میں اچھل بھی پڑتا تھا اور ایک ایک دن بڑی مشکل سے گزارتا تھا اور جب ۲۹ کی رات آئی تو پھر کیا پوچھنا، سوچتا تھا کہ اب کس کے ساتھ جانا طے ہوگا ۲۹ کی صبح کو میں تو ہر آن:

''چون گوش روزہ دار بر اللہ اکبر است''

اس آواز کا منتظر تھا کہ یہ فرمائیں کہ ''جا فلاں کے ساتھ چلا جا''، انہوں نے دس گیارہ بجے کے قریب نہایت رعب دار منہ بنا کر فرمایا کہ ''بس کیا کرے گا جا کر؟'' آواز سے تو ہم رو ہی نہیں سکتے تھے، آنسوؤں پر قابو ہی نہیں تھا، بے اختیار نکل پڑے اور حجرہ میں جا کر پھر جو ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کیا، اللہ بہت ہی معاف فرمائے جو منہ میں آیا سب کچھ کہہ دیا۔ بھلا اس جھوٹے وعدہ کی کیا ضرورت تھی؟ بزرگ ہو کر بھی مکاری کرتے ہیں، میں نے کون سی درخواست یا منت کی تھی، اپنے آپ خود ہی تو وعدہ کیا اور وہ دن اور دوسرا عید کا دن میرے لیے محرم تھا اور وہ میری لال آنکھوں اور آنسوؤں کو خوب دیکھ رہے تھے مگر ایک لفظ نہیں کہہ کردیا۔ عید سے دوسرے دن یوں فرمایا کہ ''میرا جی تو چاہتا تھا تیرے بھیجنے کو اور میرا ارادہ بھی تھا مگر جتنی خوشی تو نے جانے کی کی وہ مجھے اچھی نہیں

لگی۔'' اس وقت تو بھلا آپ کیا جانیں کہ کیا سمجھ آتی مگر اب واقعی سمجھ میں آ گئی کہ ''لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰکُمْ'' کی داغ بیل پڑ گئی۔

(۹)...... مجھے کبھی بچپن میں اچھا پہننا یاد نہیں، اپنے ہوش سے پہلے والدہ نے پہنائے ہوں تو یاد نہیں، ان زمانے میں ہر جمعہ کو سر منڈانا بھی ضروری تھا کہ بال بھی زینت ہیں، کاندھلہ میرا وطن ہے لیکن عمر بھر میں کبھی بھی تین مرتبہ کے علاوہ ایک دو شب سے زیادہ قیام یاد نہیں، بلکہ ہوا ہی نہیں، پہلی دفعہ ان تین میں سے والد صاحب کی حیات میں ہے جس کا قصہ لکھ رہا ہوں اور دو (۲) دفعہ ان کے وصال کے بعد۔ ان میں سے پہلی مرتبہ ۳۶ھ میں جب کہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سہارنپور سے دہلی منتقل ہوئے، روانگی سے قبل بیماری یہیں شروع ہو گئی تھی، کاندھلہ دو چار روز بعد علاج ٹھہرنے کا ارادہ تھا مگر مرض نے اتنا طول پکڑا کہ ہر روز ان کی حیات کا آخری دن تھا۔ اس کی سرگزشت بھی بڑی عجیب ہے اور بڑے عجیب واقعات اس میں پیش آئے جو بڑی لمبی داستانیں ہیں اس بیماری میں چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے جنات کی بیعت ہوئی۔ یہ قیام سب سے زیادہ طویل ہوا۔ تیسری مرتبہ ۴۲ھ میں جب کہ میری حقیقی پھوپھی مرحومہ سخت علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔ ان کے انتقال کا بھی بڑا عجیب واقعہ ہے۔ بہت سخت بیمار تھیں، اشارہ سے نماز پڑھتی تھیں۔ اسہال کبدی کئی دن سے تھے کہ بوقت صادق یوم دوشنبہ ''مجھے جلدی بٹھا، مجھے جلدی بٹھا تو پیچھے سہارا لگا دے'' مجھے خیال ہوا کہ اذان کا وقت ہو گیا ہے مبادا اس میں دیر ہو جائے، میں نے ایک دوسرے عزیز کو اشارہ کیا وہ جلدی سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے جلدی میں فرمایا کہ تو بیٹھ حضور تشریف لے آئے اور ہاتھ سے کوٹھے کی طرف اشارہ کیا کہ حضور تشریف لے آئے اور یہ کہتے ہی گردن پیچھے کو گر گئی۔ رَحِمَهَا اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً.

ایک اہم واقعہ:

اس جگہ جس واقعے کو لکھنا ہے وہ بہت ہی اہم ہے اور بہت ہی عجیب ہے، اوائل ۳۰ھ میں جب کہ میری عمر ۱۵ برس کی تھی، میری والدہ مرحومہ کاندھلہ میں نہایت ہی سخت علیل ہوئیں اور ایسی علیل ہوئیں کہ ہر دن ان کی زندگی کا آخری تھا (اگرچہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوا) والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو جب اس شدت مرض اور مایوسی کی حالت اور میری یاد کی خبر پہنچی تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ پانچ سات دن کا قصہ ہے مجھے کاندھلہ بھیج دیا اور اتنا لمبا چوڑا کام میرے سپرد کر دیا کہ پندرہ سولہ گھنٹے تک بھی پورا نہ ہو سکے۔ روزانہ تاریخ وار مقامات کے سو (۱۰۰) لغت لکھنا اور صراح وغیرہ دوسری کتب کی مدد سے ان کا ترجمہ بھی لکھنا۔ پھوپھا مرحوم (پھوپھا رضی الحسن صاحب) سے سلم

العلوم کا سبق پڑھنا۔ ایک منزل روزانہ قرآن کی دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد دادی صاحبہ (جو حافظۂ قرآن تھیں) کو سنانا اور تین سبق فارسی کے گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، حاجی محسن مرحوم کو پڑھانا۔

چونکہ مجھے کبھی اچھا کپڑا پہننے کی نوبت نہ آئی تھی اور میری والدہ کی انتہائی خواہش اور تمنا یہ تھی کہ وہ مجھے کبھی اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھیں، مگر والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے وہ بھی نہیں بنا سکتی تھیں، چونکہ وہ ان کی مایوسی کی حالت تھی اور ہر دن کو وہ اپنا آخری دن سمجھتی تھیں، اس لیے انہوں نے میری خالہ و پھوپھیوں سے اپنی خواہش کا اظہار فرمایا اور چونکہ ہر رشتہ دار اس وقت ان کی ہر دل جوئی کا متمنی تھا، اس لیے سب نے مل کر نہایت نفیس جوڑا میرے لیے سِیا، والدہ نے یہ بھی کہا کہ اگر میں زندہ رہی تو اس کے دام ادا کردوں گی۔ سب نے کہا کہ ایسے لفظ مت کہو کیا یہ تمہارا ہی بچہ ہے ہمارا نہیں، بہرحال ان کی عجلت پر نہایت عمدہ جوڑا سلا۔ جو اب تک نظروں میں ہے۔

نہایت ہی نفیس حسین ایک گلابی بنیان، اس پر نہایت ہی باریک اچکن کا کرتہ اور نہایت ہی عمدہ ''سیلے کا عمامہ'' اور چونکہ اس وقت میرے تمام عزیز علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور سب سلیپر پہنتے تھے گو اس سے پہلے میں نے نہ کبھی پہنے اور نہ پسند آیا۔ ساری عمر دھوڑی کا جوتہ اور وہ بھی بغیر پھول کے، مگر ماحول کا تو اثر ہوتا ہی ہے۔ بھائی اکرام، ظہیر الحسن مرحوم، ماسٹر محمود، یہ سب لوگ سلیپر پہنتے تھے مگر معمولی اور اس وقت ہمارے اور والدہ مرحومہ کے شوق سے خریدا جا رہا تھا، اس لیے باٹا کا نہایت ہی مضبوط سولہ روپے کا سلیپر خریدا اور اس وقت کے سولہ آج کے پچاس روپے سے کم تو نہ ہوں گے، دو تین دن میں بڑی محنت اور بہت عجلت سے میری خالہ اور پھوپھیوں نے بہت ہی نفیس جوڑا سِیا۔ درمیان میں مکان کا انداز بھی سنئے۔ اس زمانے میں یہ نوعیت ہوتی تو تھی۔ بہت سے قصبات میں، مگر ہمارے مکانوں کی نوعیت یہ تھی کہ صدر دروازے کے متصل تو مردانہ بیٹھک تھی اور دروازہ (۲) ایسا تھا کہ اگر اس کو بند کر دیا جائے تو اندر کے مکانات میں جن کے اندر کھڑکیاں اور دروازے تھے ایک مکان میں گھس کر بغیر پردہ کرائے عورتیں ایک دوسرے کے مکانات میں آ جا سکتی تھیں اور چور کھڑکی (۳) میں اور صدر دروازے میں تقریباً دو (۲) فرلانگ کا فرق ہے اور اندر سب مکانات ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ مکانات کا تحفظ بھی اور غالباً غدر کے زمانے میں اس نوعیت کے بنائے گئے تھے کہ اگر فوج کی یورش صدر دروازے کی طرف سے چلے تو مستور کھڑکی کی طرف کو فوراً نکل جائیں۔ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ بھی کئی دن تک ان مختلف مکانات میں مستور رہے۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ والدہ کی اور میری دونوں کی خیر خبر لینے کے واسطے کاندھلہ تشریف لے گئے اور صدر دروازہ سے نہیں گئے کہ ان کے پہنچنے کا شور ہو جائے گا، چور کھڑکی میں ایک گھر سے دوسرے گھر میں پردہ کراتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ

ابھی آ کر ملوں گا، اس دروازے پر پہنچے جو میری والدہ کے گھر کے بالکل سامنے تھا، مابدولت اس شاہی جوڑے کو پہن کر اور اس کی نمائش کرنے کے واسطے دروازے سے نکل رہے تھے۔

ایک دم ایک کی نگاہ دوسرے پر پڑی، ان کی نگاہوں میں شیر ببر کی طرح سے خون کی لہر دوڑ گئی اور میں لنگور کے سامنے بندر ایسی حالت میں تھا کہ پاؤں کے نیچے زمین نہیں تھی اور انہوں نے للکار کر فرمایا کہ ''آ گے آ''۔ تعمیل کے سوا چارہ کیا تھا اور وہ نہایت ہی نفیس اور مضبوط جوتا جو چار پانچ منٹ پہلے ہی پاؤں میں ڈالا تھا وہ ان کے ہاتھ میں تھا اور بجائے پیر کے سر پر پڑا پڑ پڑ رہا تھا اور ایک لفظ زبان پر تھا کہ ''تجھے معشوق بننے کے واسطے بھیجا تھا؟'' اور دروازہ ایک دم بند کرا دیا گیا اور سارے گھروں کی مستورات مجھے چھڑانے کے واسطے وہاں جمع ہو گئیں، ابا جان نے ایک ڈانٹ پلائی کہ جو چھڑائے گا اس کے جوتا ماروں گا۔ بلا مبالغہ سو (۱۰۰) کے قریب تو سر پر پڑے ہوں گے۔ یہ اس اللہ کا احسان تھا کہ ایڑی کی طرف نہیں پڑے بلکہ نیچے کی طرف سے پڑے، جس سے سر نہیں پھٹا۔ البتہ صبغ کی طرح سے دماغ کا بہترین علاج ہو گیا۔

وہ عمامہ تو اسی وقت تہ کر کے چھوٹی ہمشیرہ کے نکاح کے لیے رکھا گیا اور اچکن کے کُرتے کی بھی دو (۲) کرتیاں بہن کی شادی کے لیے بنا کر رکھ دی گئیں اور وہ بنیان اور سلیپر عزیز ظہیر الدین مرحوم کو نذرانہ ہو گیا اور عمدہ لٹھے کا پاجامہ اس وقت تو جھک مار کر اتارنا ہی پڑا اور ہم پھر وہی کرپا وہی جالی۔

اچھے کپڑوں سے نفرت:

اللہ کے فضل وانعام واحسان سے اچھے کپڑے سے جو نفرت اس وقت دل میں بیٹھی تھی اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور اب واقعی اس کے اندر تصنع نہیں کہ اب اچھے کپڑے سے کچھ اس قدر نفرت سی ہو گئی ہے کہ اپنے ہی نہیں دوسرے کے بدن پر بھی اچھا نہیں لگتا اور اب دماغ میں یہ چیز جم گئی کہ اچھے کپڑے کے اندر کیا فائدہ اگر اچھی غذا کھائی جائے تو خیر دماغ وجسم کو طاقت دیتی ہے مگر اچھے کپڑے سے نہ رنگ وروپ میں فرق پڑے اور نہ بدن میں طاقت آئے پندرہ بیس دن میں وہ اس سے زیادہ میلا ہو جاتا ہے جتنا کہ کھدر بھی نہیں ہوتا میرے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بارہا اچھے اچھے کپڑے عنایت فرمائے اور بارہا فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے اچھے کپڑوں میں دیکھوں، مگر اپنی نالائقی وحماقت سے وہ اچھے اچھے کپڑے جو حضرت کے پاس ہدایا میں آئے تھے اپنی بچیوں کی شادیوں میں دے دیے۔

کرنل اقبال کا ساٹھ روپے گز کا جوڑا اسلوانا:

کرنل اقبال بھوپالی میرے بہت ہی کرم فرما اور مخلصوں میں تھے اور محسن بھی تھے، بار بار کثرت

سے مکہ جاتے تھے اور ہر دفعہ میں کوئی مادی ہدیہ مصلّی، رومال وغیرہ ضرور لاتے تھے حالانکہ میں سختی سے ہر دفعہ ان سے لڑتا، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، ایک مرتبہ انہوں نے عزیزان مولوی یوسف مرحوم اور مولوی انعام سلمہٗ سے یہ کہا کہ میرا ارادہ بہت دنوں سے شیخ کے لیے بہت بہترین کُرتہ سینے کا ہو رہا ہے۔ عزیزان نے بہت زور سے ان کو منع کر دیا کہ بغیر اجازت نہ بنوانا وہ پہنے گا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں ساٹھ روپے گز کے حساب سے پانچ گز کپڑا ان کے لیے خرید کر لایا ہوں۔ تم شیخ کا کُرتہ چپکے سے مجھے دے دو، میں سلوا کر خود پہنا کر آؤں گا۔ عزیز مولوی انعام سلمہٗ نے کہا کہ بالکل نہیں وہ سلا ہوا بھی پھاڑ دے گا، پہلے پوچھ لو...... مرحوم کو بار بار کی لڑائی سے تجربہ ہو چکا تھا اس لیے یہ کہا کہ پوچھنے کی تو ہمت نہیں مگر میرا خیال تھا کہ جب وہ سل جائے گا تو اس کا کُرتہ کسی دوسرے کو تو آئے گا نہیں اس لیے وہ پہن ہی لے گا۔ اللہ کا بڑا ہی احسان ہے اور ایک دو نہیں بیسیوں واقعات اس نوع کے پیش آ چکے ہیں۔ کچھ اچھے کپڑے کی نفرت سر پر سلیپر نے دل میں ایسی پیدا کر دی کہ اب دوسروں پر بھی اچھا کپڑا برا لگتا ہے۔

جہیز میں کیا دیا جائے:

شادیوں میں عمدہ کپڑوں سے اِس قدر نفرت ہوگئی کہ اِس کا اظہار نہیں کر سکتا، جہیز اور بری کے نام سے اِس قدر روپیہ ضائع کیا جاتا ہے جو محض بے کار ہے یہ شاہانہ جوڑے جو جہیز اور بری میں دیے جاتے ہیں اور کئی کئی سو میں تیار ہوتے ہیں وہ بالکل بے کار اور اضاعت مال ہے وہ اِس قابل نہیں ہوتے کہ گھروں میں پہنے جا سکیں، ایک دو مرتبہ عمر بھر میں کسی کی شادی میں دکھلاوے کے لیے پہننے کے علاوہ کوئی مصرف اِن کا نہیں، پھر وہ رکھے رکھے گل جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مر جائے تو مدرسوں کے اندر جا کر کوڑیوں کے بھاؤ نیلام ہوتے ہیں۔

میں لڑکیوں کو دینے کا مخالف نہیں ہوں بلکہ بڑا مُعین ہوں، مگر کپڑے اور لمبی چوڑی دعوتوں کا بہت مخالف ہوں، ان دونوں لغویات میں جس قدر روپیہ خرچ ہوتا ہے اتنی رقم کا زیور اگر لڑکیوں کو دے دیا جائے تو کس قدر اُن کے لیے وقت پر کام آنے والی چیز ہے، زیوروں میں بھی ایسے زیوروں کا مخالف ہوں جن کے اندر گھڑائی تو بہت جائے اور مالیت کچھ نہ ہو کہ اگر بہ وقتِ ضرورت فروخت کیا جائے تو گھڑائی کی تو قیمت ہی نہیں، اگر ایسے زیور جن کے اندر گھڑائی تو نہ ہو اور مالیت زیادہ ہو جیسے کڑے وغیرہ تو ان بیچاریوں کے وقت پر کام آ جائے، اللہ تعالیٰ کسی کو حج کی سعادت عطا فرمائے تو کرایہ تو تیار ملے، کہاں سے کہاں پہنچ گیا، یہ میری ضربات کی آخری ضرب تھی، اس کے بعد ایک آدھ تھپڑ تو شاید کبھی لگا ہو ورنہ قابلِ یاد کوئی مار نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم

سے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو ان ضربات کی بہتر سے بہتر جزائے خیر عطا فرمائے اور ہر مار پر لاکھوں رحمتیں ان پر نازل فرمائے، آمین ثم آمین! کہ یہ ناکارہ سیاہ کار کتے کی دم کی طرح سے جس کو اس کے مالک نے بارہ سال تک نلی میں اس لیے رکھا کہ وہ سیدھی ہو جائے اور بارہ سال کے بعد وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی تھی۔ حالت تو اپنی خراب ہی رہی لیکن ان تنبیہات اور تربیت اور اللہ کے فضل واحسان کی وجہ سے آدمیوں میں شمار ہونے لگا۔ ورنہ نہ معلوم کس جون میں ہوتا۔

(۱۰)...... مار خوب یاد رہا کرتی ہے۔ مار تو نمبر ۹ پر ختم ہو گئی۔ البتہ تنبیہات ضرور باقی رہ گئی تھیں۔

والد صاحب کا طرزِ تعلیم "دسواں واقعہ":

جس طرح میں لکھ چکا ہوں کہ ان کا طرزِ تعلیم بالکل الگ تھا۔ مشکوٰۃ شریف میں نے ترجمہ سے نہیں پڑھی، ساری بلا ترجمہ پڑھی۔ اس میں یہ اجازت تھی کہ جس لفظ کا جی چاہے ترجمہ پوچھ لوں اور وہ امتحاناً کبھی کبھی پوچھتے رہتے تھے۔ ترجمہ مظاہر حق کا دیکھنا تو جرم تھا، ہدایہ اور طحاوی کا دیکھنا ضروری تھا اور صحاح کی کتابوں میں سے جس کتاب کی حدیث ہو اس کو نکال کر اس کے حواشی دیکھنے کی اجازت تھی۔ قانونِ تعلیم یہ تھا کہ ہر حدیث کے بعد یہ بتانا ضروری تھا کہ حنفیہ کے موافق ہے یا خلاف، اگر خلاف ہے تو حنفیہ کی دلیل اور حدیث پاک کا جواب، یہ تمام گویا حدیث کا جزو لازم تھا جو میرے ذمہ تھا۔ اپنی دلیل نہ بتانا تو یاد نہیں، اس لیے کہ ہدایہ اور اس کی شروح اور حواشی اور فقہ کی دوسری کتابیں دیکھنے کی نوبت کثرت سے آتی رہتی تھی۔ البتہ حدیث کا جواب کبھی کبھی نہیں دے سکتا تھا تو وہ خود بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک وعید کی حدیث کی توجیہ میں بندہ نے یوں کہہ دیا کہ "تشدد پر محمول ہے"۔ اتنی ڈانٹ پڑی کہ کوئی حد نہیں۔ اچھی طرح یاد نہیں شاید تھپڑ بھی لگا اور یہ ارشاد فرمایا کہ "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈرانے کے واسطے جھوٹ بول دیا۔ کچھ سوچ کر بھی کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ بول سکتے ہیں تیرے ڈرانے کے واسطے؟" اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ "تشدید کی توجیہ احکام میں ہوا کرتی ہے، جیسا کہ شارب خمر کے بارے میں چوتھی مرتبہ پینے کی صورت میں قتل کا حکم ہے اور اسی قسم کے تشدیدی احکام اور اخبار کی حدیث میں تشدید نہیں ہو سکتی" اس کے بعد جب کبھی اکابر شراح کے کلام میں اخبار کی حدیث میں تشدید کا لفظ دیکھتا ہوں تو ڈانٹ یاد آجاتی ہے۔

ان کو یہ بھی اہتمام تھا کہ شاگرد سے استاذ کی بے ادبی نہ ہو، میں نے چونکہ مشکوٰۃ شریف اِس طرز سے پڑھی جو اوپر گزرا اور مدرسہ کے اندر مشکوٰۃ اور حدیث کی کتب لمبی لمبی تقریروں سے ہوتی تھی، میں نے کئی دفعہ اجازت چاہی کہ حدیث کی فلاں کتاب کی سماعت کرلوں۔ بڑی شدت سے

منع فرمایا کہ حدیث کی کتاب اپنے اور حضرت قدس سرہٗ کے علاوہ کسی سے نہیں پڑھنی، البتہ مَنطِقْ وَنُطِقْ کی کتاب کسی اور سے پڑھے تو مضائقہ نہیں اور ارشاد فرمایا کہ ''تو چونکہ بے ادب گستاخ ہے، منطق فلسفہ وغیرہ کے اساتذہ میں سے اگر کسی کی گستاخی کرے گا تو وہ کتابیں جاتی رہیں گی، بَلا سے جاتی رہیں لیکن حدیث کے اساتذہ میں سے اگر کسی کی تو نے گستاخی کی تو یہ گوارا نہیں کہ تیری حدیث ضائع ہو''

''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا''

میرے ہی قلم سے تحریر:

(۱۱)......یہ سارے افسانے خواب ہی ہوگئے اور یہ سارے مراحل والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ختم ہوگئے، اس کے بعد گویا نگرانی ختم ہوگئی۔ انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے یا اس سے بھی کچھ زائد، حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کا شدید اصرار والد صاحب کے بار بار بلانے پر رہتا تھا، ان کے خط کے جواب میں والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے ہی قلم سے تحریر فرمایا کہ ''اب تک عزیز زکریا کی بیڑی میرے پاؤں میں ایسی زنجیر بنی ہوئی تھی کہ میں اس کی وجہ سے کہیں آجا نہیں سکتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو چونکہ بہت اشتیاق رہتا تھا اسی لیے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رائے پور طویل قیام کے لیے تشریف لے گئے اس ناکارہ نے ان کی تشریف بری کے بعد مکاری سے ان کی یاد اور ان کی غیبت سے اپنے نقصان کا اظہار کیا تو جواب میں تحریر فرمایا ''بڑوں کی نگرانی کی حاجت اس وقت تک رہتی ہے جب تک تعلق مَعَ اللہ پیدا نہ ہوا اور اس کے بعد ضرورت نہیں رہتی، اللہ کا شکر ہے کہ اس کے فضل سے تمہارے اندر پیدا ہوگیا اب میری ضرورت نہیں رہی۔''

کاش اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور لطف و احسان سے والد صاحب کے اس حسن ظن کو ان کے بعد میرے دوسرے اکابر اور احباب واصاغر کے حسنِ ظن کو ''اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ'' کے عالی شان فرمان کے وجہ سے صحیح فرمادے تو اس کے لطف و کرم اور ان احساناتِ عظیمہ سے بعید نہیں جو ہمیشہ ہی میری ناپاکیوں کے باوجود رہے ہے۔

فقط

یہ تو آپ کی سوانح کے صرف ایک باب پر تنقیدی استدراک تھا، اس کے علاوہ بھی کچھ نشانات سننے میں لگائے ہیں، ان کو بھی درج کرتا ہوں، تاکہ طبع ثانی میں ان کی رعایت ہو جائے۔

محمد زکریا

مظاہر علوم۔ سہارنپور

بروز جمعہ ۶ شعبان ۸۷ھ

دوسرے نشانات چونکہ کتاب کی طباعت کے متعلق تھے اس لیے ان کی تصحیح کے لیے کتاب ہی بھیج دی گئی۔

☆......☆......☆

اِن نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے

عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ، کے پاس جو مضمون میں نے بھیجا تھا وہ صرف اوپر والا تھا، جب اس کی اشاعت کا خیال ہوا تو بعض دوستوں کا اصرار ہوا کہ میں نے چند روز ہوئے جو مضمون مدرسین و ملازمینِ مدرسہ مظاہر علوم کی خدمت میں بھیجا تھا وہ بھی اس کے ساتھ شائع ہونا ضروری ہے، مجھے بھی مناسب معلوم ہوا کہ اپنے ساٹھ سالہ قیام مظاہر علوم کے دوران جو کچھ دیکھا اور اکابر کے متعلق سُنا وہ بھی کچھ حذف واضافے کے ساتھ اجمالاً دوستوں کے سامنے آجائے کہ یہ واقعات اب سے کچھ پہلے تو سب کو معلوم اور زبان پر جاری تھے مگر اب ان واقعات کے دیکھنے اور سننے والے بھی ختم ہوتے جارہے ہیں، آیندہ کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ اکابر کا معمول مدارس کے سلسلے میں کس قدر احتیاط اور شدت کا رہا۔ یہ ناکارہ طلب علم کے زمانے میں ۱۳۲۸ھ میں آیا تھا جب کہ میری عمر تیرہ سال سے کم تھی اور اب ربیع الآخر ۱۳۸۸ھ شروع ہوگیا، تقریباً ساٹھ سال اس مدرسہ کے اندر ہوگئے ہیں، دیکھا اور سنا تو بہت کچھ اور ان سب کا احصاء دشوار بھی اور بڑی طویل کتاب چاہتا ہے، لیکن نمونہ کے طور پر چند واقعات اہلِ مدراس کی خدمت میں ضرور پیش کرنے کا دل چاہتا ہے کہ شاید کسی اللہ کے بندے کو ان اکابر کے اتباع کی توفیق نصیب ہوجائے۔ بہت اختصار کے ساتھ صرف نمونہ کے طور پر چند واقعات ذکر کرتا ہوں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کا مشہور مقولہ:

(۱) ......قدوۃ الاتقیاء حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ سرپرست دارالعلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور کا یہ مقولہ بہت ہی مشہور تھا اور سنا بھی ہے کہ مجھے مدارس کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی سے نہیں لگتا۔ اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ملازم ہو وہ مالک کے کام میں کوتاہی کرے، خیانت کرے، کسی قسم کا نقصان پہنچائے، ملازمت سے علیحدہ ہوتے وقت یا مرتے وقت مالک سے معاف کرالے تو معاف ہوسکتا ہے لیکن مدرسوں کا روپیہ جو عام غرباء اور اور مزدوروں کے دو دو پیسے ایک ایک آنے کا چندہ ہوتا ہے، ہم سب سرپرستانِ مدرسہ اس کے مالک تو نہیں، امین ہیں۔ اگر اس مال کے اندر افراط وتفریط ہو تو ہم لوگوں کے معاف کرنے سے معاف تو ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ دوسرے کے مال میں ہم کو معافی کا کیا حق ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ہم اگر

بمصالح مدرسہ چشم پوشی کریں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگزر فرمالے۔ لیکن اگر اپنے ذاتی تعلقات سے ہم لوگ تسامح کریں تو ہم بھی جرم کے اندر شریک ہیں۔لیکن جرم کرنے والے سے کسی حال میں بھی معاف نہیں ہوسکتا کہ حقوق العباد ہے اور جن کا مال ہے وہ اتنے کثیر ہیں کہ ان سے معاف نہیں کرایا جاسکتا۔

حضرت اقدس مولانا الحاج احمد علی صاحب کا کمال تقویٰ:

(۲)......حضرت اقدس شیخ مشائخ المحدثین مولانا الحاج احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، بخاری، ترمذی کتب حدیث کے محشی اور مشہور عالم محدث ہیں۔ جب مظاہر علوم کی قدیم تعمیر کے چندہ کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لے گئے تو وہاں مولانا کا اکثر قیام رہا ہے اور وہاں کے لوگوں سے وسیع تعلقات تھے تو مولانا مرحوم نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کی آمد وخرچ کا مفصل حساب مدرسہ میں داخل کیا تو وہ رجسٹر میں نے خود پڑھا۔اس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ کلکتہ میں فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔اگرچہ وہاں چندہ خوب ہوا لیکن میری سفر کی نیت دوست سے ملنے کی تھی چندہ کی نہیں تھی۔اس لیے وہاں کی آمد ورفت کا اتنا کرایہ حساب سے وضع کرلیا جائے۔

(۳)......حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہٗ (جو گویا مظاہر علوم کے بانی ہیں) کا یہ معمول میری جوانی میں عام طور سے مشہور اور لوگوں کو معلوم تھا کہ مدرسہ کے اوقات میں جب کوئی مولانا قدس سرہٗ کا عزیز ذاتی ملاقات کے لیے آتا تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر کتاب میں ایک پرچا رکھا رہتا تھا اس پر تاریخ وار ان منٹوں کا اندراج فرمالیتے تھے اور مہینہ کے ختم پر ان کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم تو آدھ روز کی رخصت اور اگر نصف یوم سے زیادہ ہوتا تو ایک یوم کی رخصت مدرسہ میں لکھوادیتے۔ البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے آتا تھا یا مدرسہ کے کسی کام سے آتا تو اس کا اندراج نہیں فرمالیتے تھے۔

(۴)......حضرت اقدس سیدی مولانا خلیل احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ جب یکسالہ قیام حجاز کے بعد آخر ۳۴ھ میں مظاہر علوم میں تشریف لائے تو میرے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا شروع ذیقعدہ میں انتقال ہوچکا تھا۔حضرت نے مدرسہ سے تنخواہ لینے سے یہ تحریر فرما کر انکار کردیا تھا کہ ''میں اپنے ضعف وپیری کی وجہ سے کئی سال سے مدرسہ کا کام پورا نہیں کرسکتا لیکن اب تک مولانا محمد یحییٰ صاحب میری نیابت میں دورہ کے اسباق پڑھاتے تھے اور تنخواہ نہیں لیتے تھے وہ میرا ہی کام سمجھ کر کرتے تھے اور میں وہ دونوں مل کر ایک مدرس سے زیادہ کام کرتے تھے،اب چونکہ ان کا انتقال ہوچکا ہے اور میں مدرسہ کی تعلیم کا پورا کام نہیں کرسکتا اس لیے قبولِ تنخواہ سے معذور ہوں۔'' اس پر حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے بڑی طویل تحریرات ہوئیں۔

حضرت رائپوری نے لکھا کہ آپ کے وجود کی مدرسہ کو سخت ضرورت ہے، آپ کے وجود سے مدرسہ کا سارا نظام باحسن وجوہ قائم ہے اس لیے آپ کو مدرسہ اب تعلیم کی تنخواہ نہیں دے گا بلکہ ناظم مدرسہ کی تنخواہ دے گا۔ حضرت کے مدرسہ میں تشریف نہ رکھنے سے مدرسہ کا نقصان ہے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت رائپوری کی بڑی تائید فرمائی۔ اس پر حضرت سہارنپوری نے تنخواہ لینی قبول فرمائی۔

حضرت سہانپوری کا تنخواہ سے انکار:

اس سے قبل کا قصہ تو بہت مشہور ہے کہ حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی تنخواہ چالیس روپے تھی اور عرصہ تک یہی رہی اور جب بھی ممبرانِ مدرسہ کی طرف سے حضرت کی ترقی کا مسئلہ پیش ہوتا تو حضرت ارشاد فرماتے کہ میری حیثیت سے یہ بھی زائد ہے۔ مگر جب ماتحت مدرسین کی تنخواہ چالیس تک پہنچ گئی تو ممبران نے اصرار کیا کہ آپ کی وجہ سے نیچے کے مدرسین کی ترقی رک جائے گی کہ صدر مدرس سے دوسروں کی تنخواہ بڑھ جائے اس پر حضرت نے اضافہ قبول فرمایا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے متعلق بھی اس نوع کا قصہ معروف ہے کہ حضرت نے پچاس سے زیادہ کے اضافے کو قبول نہیں فرمایا۔ لیکن عرصہ کے بعد اسی اشکال کی وجہ سے حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اضافہ قبول فرمایا۔

مدرسہ کی اشیاء ذاتی استعمال کے لیے نہیں:

(۵)...... میں نے خود تو یہ واقعہ نہیں دیکھا مگر دو (۲) واسطوں سے سنا ہے کہ حضرت اقدس سہارنپوری کی خدمت میں ایک صاحب عزیزوں میں سے جو بڑے مرتبہ کے آدمیوں میں سے تھے ملاقات کے لیے تشریف لائے، حضرت سبق پڑھا رہے تھے، اختتام سبق تک تو حضرت نے توجہ بھی نہ فرمائی۔ ختم سبق کے بعد حضرت ان کے پاس تشریف لائے، انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت اسی جگہ تشریف رکھیں، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مدرسہ نے یہ قالین اسباق پڑھانے کے لیے دیا ہے ذاتی استعمال کے لیے نہیں۔ اس لیے اس قالین سے علیحدہ بیٹھ گئے۔

البتہ یہ واقعہ میرا ہمیشہ کا دیکھا ہوا ہے کہ مدرسہ قدیم (دفتر مدرسہ) میں حضرت کی ہمیشہ دو (۲) چارپائی رہتی تھیں، ان ہی پر حضرت آرام فرماتے تھے ان ہی پر بیٹھتے تھے، مدرسہ کی اشیاء کو میں نے استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مہتمم اور مدرسین مظاہر جلسہ کے موقع پر بھی اپنے گھر سے کھانا کھاتے:

(۶)...... مظاہر علوم کا جب سالانہ جلسہ ہوتا تھا، میں نے اکابر مدرسین وملازمین میں سے کبھی

کسی کو جلسہ کے کھانے یا چائے یا پان کو کھاتے نہیں دیکھا۔ جملہ حضرات مدرسین اپنا اپنا کھانا کھاتے تھے جب بھی وقت ملے۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ مدرسہ کے خصوصی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے، لیکن حضرت کے مکان سے دس بارہ آدمیوں کا کھانا آتا تھا جو متفرق مہمانوں کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا۔ اسی میں سے حضرت تناول فرماتے تھے۔ مدرسہ کی کوئی چیز کھاتے نہیں دیکھا۔ مولانا عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ شب و روز مدرسہ کے اندر رہتے اور ظہر کے وقت یا رات کے بارہ (۱۲) بجے اپنے دفتر کے کونے میں بیٹھ کر ٹھنڈا اور معمولی کھانا تنہا کھا لیتے تھے۔

مولانا ظہور الحق صاحب مدرس مدرسہ اس زمانے میں مطبخ طعام کے منتظم ہوتے تھے اور چوبیس گھنٹے مطبخ کے اندر رہتے تھے لیکن سالن چاول وغیرہ کا نمک کسی طالب علم سے چکھواتے تھے، خود نہیں چکھتے تھے۔ جب وقت ملتا اپنے گھر جا کر کھانا کھا آتے۔ اسی طرح سے دیگر اکابر مدرسین کو میں نے کوئی شے مدرسہ کی چکھتے نہیں دیکھا۔

ان سب احتیاطوں کے باوجود حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ جب ۴۴ھ میں مستقل قیام کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے تو اپنا ذاتی کتب خانہ یہ فرما کر مدرسہ کے اندر وقف کر گئے تھے کہ نہ معلوم، مدرسہ کے کتنے حقوق ذمہ رہ گئے ہوں گے۔

(۷)......میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے زمانے میں مدرسہ کا مطبخ جاری نہیں ہوا تھا نہ مدرسہ کے قریب کسی طباخ کی دوکان تھی، گھر والوں کے نہ ہونے کے زمانے میں جامع مسجد کے قریب ایک طباخ کی دکان تھی جس کا نام اسماعیل تھا۔ اس کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا۔ سردی کے زمانے میں وہاں سے آتے آتے خصوصاً شام کو ٹھنڈا ہو جاتا تھا، تو سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں بلکہ باہر رکھوا دیتے تھے، اس کی تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہو جاتا تھا، تو یہ فرما کر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے اندر داخل فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے۔ تنخواہ تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے سات سالہ قیام مدرسہ میں کبھی لی ہی نہیں۔

حضرت مولانا عنایت الٰہی کے دو قلمدان اور پنشن کا واقعہ:

(۸)......حضرت مولانا الحاج عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، مدرسہ کے مہتمم بھی تھے، مفتی بھی تھے اور عدالتی تمام کاروبار ان ہی کے ذمہ تھے اور اس معنیٰ میں محصل چندہ شہر بھی تھے کہ محصل چندہ شہر جب کسی کے متعلق یہ کہتا کہ فلاں صاحب نے چندہ نہیں دیا، دو مرتبہ جا چکا ہوں تو حضرت مہتمم صاحب اپنے گھر آتے جاتے اس کے گھر جاتے اور خوشامد فرماتے کہ تمہارا چندہ نہیں آیا۔ ان کی خوبیوں کا بیان تو اس مختصر تحریر میں نہیں آ سکتا۔ لیکن دفتر کے اندر ان کے پاس دو قلمدان رہتے تھے، ایک ذاتی، ایک مدرسہ کا۔ ذاتی قلمدان میں کچھ

ذاتی کا غذر ہتے۔اپنے گھر کوئی ضروری پرچہ بھیجنا ہوتا تو اپنے قلمدان سے لکھتے، مدرسہ کے قلمدان سے کبھی نہیں لکھتے تھے۔گرمیوں میں سات بجے کے قریب اور سردیوں میں آٹھ بجے کے قریب آتے اور عصر کے بعد واپس تشریف لے جاتے۔ساری دوپہر کام کرتے اور آتے ہوئے اہلِ چندہ کے گھر ہوتے ہوئے آتے۔لیکن حضرت سہارنپوری نوراللہ مرقدہٗ نے ایک مرتبہ دوسرے ملازمین کی ترقی کے ساتھ یہ کہہ کر ان کی ترقی روک دی تھی کہ مدرسہ کے اندر دیر میں تشریف لاتے ہیں۔میں نے ہر چند عرض کیا کہ حضرت چھ گھنٹے سے زیادہ کام کرتے ہیں بار بار سفارش اور اصرار بھی کیا، لیکن حضرت فرماتے رہے کہ مدرسہ کے اوقات کی پابندی ملازم کے لیے ضروری ہے۔

(۹)......حضرت مہتمم صاحب کی جدوجہد اور جانفشانی، ہمہ تن مدرسہ کے امور میں اشتغال اتنے کثیر واقعات ہیں جو اس قابل تھے کہ ان کی مکمل سوانح لکھی جاتی۔

آخر زمانۂ حیات میں امراض کی کثرت اور ضعف کی وجہ سے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت مہتمم صاحب کی پنشن ہو جائے۔مہتمم صاحب مدرسہ کے ابتدائی قیام کے وقت میں ابتدائی طالب علموں میں تھے،اس کے بعد مُعین مدرس ہوئے اور ترقی فرماتے مدرس دوم تک جا پہنچے، دورے کے اسباق بھی اس زمانے میں مرحوم کے یہاں ہوئے۔۲۳ھ سے باوجود مرحوم کے شدید انکار کے بضرورتِ مہتمم مقرر رہے ہوئے اور اسی عہدے پر ۴۷ھ ۲۰ جمادی الثانیہ کو انتقال ہوا۔غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ.

اخیر زمانہ میں ضعف و پیری کے علاوہ شدید امراض کا ابتلاء رہا۔صبح کو ڈولی میں بیٹھ کر مدرسہ آتے اور بعد عصر ڈولی میں بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے۔اس مشقت کو دیکھ کر مجھے ترس آتا تھا۔میں نے تفصیلی حالات لکھ کر حضرات سرپرستانِ مدرسہ کی خدمت میں مرحوم کی خدماتِ جلیلہ کے پیش نظر خصوصی طور پر پنشن کی تجویز پیش کی تھی۔حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سرپرست مدرسہ نے یہ تحریر فرمایا کہ ''مدرسہ کے موجودہ چندہ سے پنشن جائز نہیں ہے،اس کے لیے آپ ایک مستقل مد قائم کر کے چندہ کریں،اس میں سے پنشن دی جاسکتی ہے،مہتمم صاحب کے متعلق جو لکھا وہ بالکل صحیح ہے،میں اس سے زیادہ واقف ہوں،ان کے لیے جو تم مناسب سمجھو تنخواہ تجویز کر کے مخصوص احباب سے چندہ مقرر کرالو۔پانچ روپیہ ماہانہ میں اپنی ذات سے دوں گا۔''

حضرت سہانپوری کی اسباق کی نگرانی:

(۱۰)......حضرت سہارنپوری نوراللہ مرقدہٗ کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ مدرسین اسباق کے اوقات کی بہت پابندی فرماویں۔حضرت کا قانون یہ تھا کہ گھنٹے کے پانچ منٹ بعد فوراً سبق شروع ہو جائے،اس سے پہلے شروع نہ ہو اور گھنٹے سے پانچ منٹ پہلے ختم ہو جائے تا کہ طلبہ کو ایک درس گاہ

سے دوسری درس گاہ جانے میں دقت نہ ہو اور سبق کا حرج نہ ہو۔ اس کے خلاف اگر کسی مدرس کی شکایت ہوتی تو حضرت کے یہاں سے مدرس سے جواب طلب ہوتا۔ حضرت قدس سرہٗ کا رعب جملہ مدرسین پر اتنا زیادہ تھا کہ بجائے سخت لفظ کہنے کے صرف پوچھ لینا ہی مدرس کے لیے کافی تھا۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو اس کا بھی بہت اہتمام تھا کہ اسباق اعتدال سے ہوں۔ حضرت اس کے نہایت شدید مخالف تھے کہ شروع میں لمبی چوڑی تقریریں ہوں اور آخر میں کتاب رمضانی تراویح کی طرح سے جلدی جلدی پڑھائی جائے، اس کی شکایت پر بڑے سے بڑے مدرس کو بھی تنبیہ سے گریز نہیں فرماتے تھے۔ اسی نظریہ کے ماتحت اور حضرت قدس سرہٗ کے آخری سہ سالہ زمانۂ تعلیم کے نقشوں کے موافق وہ نقشۂ تعلیم تیار کیا گیا جو عرصہ سے مدرسہ مظاہر علوم میں معمول بہ ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں تعلیم کی نگرانی کا بھی ایک خاص معمول تھا جب طلبہ کی طرف سے کسی مدرس کی شکایت گزرتی تو حضرت قدس سرہٗ کی اپنی سہ دری میں جہاں حضرت تشریف فرما ہوتے تھے، عین سبق کے وقت مدرس کے پاس یہ پیغام پہنچتا کہ فلاں سبق گھنٹہ کے نیچے ہوگا۔ یہ ایک اصطلاحی لفظ اس زمانے میں بن گیا تھا، جس کی شرح یہ ہے کہ حضرت کہ سہ دری میں ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا جو آج بھی ہے، مدرس گھنٹہ کے نیچے بیٹھتا اور طلبہ جن کی جماعت اس وقت چھوٹی ہوتی تھی مدرس کے تینوں طرف اور حضرت قدس سرہٗ اپنی جگہ حجرے کے سامنے تشریف فرما رہتے اور پورے گھنٹہ وہاں سبق ہوتا اور حضرت ساکت سنتے رہتے، سبق کے بعد اس وقت حضرت کچھ نہ فرماتے۔ اس کے بعد اگر طلبہ کی شکایت صحیح ہوتی اور معمولی ہوتی تو مدرس کو تنبیہ فرماتے اور اگر شدید ہوتی تو دو چار روز کے بعد وہ دوسرے مدرس کے یہاں منتقل کر دیتے اور اگر طلبہ کی شکایت غلط ہوتی تو معمولی سرغنوں کا کھانا بند اور اگر سخت ہوتی تو ان کا اخراج فرما دیتے۔ اس کا اثر ہمیشہ یہ رہا کہ مدرسین کو فکر رہتا کہ نہ معلوم سبق کب گھنٹہ کے نیچے پڑھانا پڑ جائے اور طلبہ کو بھی شکایت کے اندر بہت غور و فکر کی ضرورت ہوتی، کہ اگر حضرت کے نزدیک شکایت غلط ہوئی تو کھانا بند ہو جانا معمولی بات ہے اور اخراج کا امکان۔

اس کے علاوہ حضرت قدس سرہٗ کا یہ بھی معمول تھا کہ خصوصی مہمانوں کو مدرسہ دکھلانے کے لیے خود تشریف لے جاتے اور مہمان کو درس گاہ کے سامنے گشت کراتے ہوئے جس درس گاہ کے سامنے دل چاہے دس پندرہ منٹ کھڑے رہتے۔ اس ناکارہ کو گھنٹے والے قصے سے تو کبھی سابقہ نہیں پڑا، لیکن دوسرے مرحلے سے بارہا گزرنا پڑا۔ اس ناکارہ کو اپنی جوانی میں بخار وغیرہ امراض کی وجہ سے سبق ناغہ کرنے کی عادت نہیں تھی۔ ایک دفعہ مشکوٰۃ شریف کا سبق نہایت شدتِ بخار کے اندر پڑھا رہا تھا، مُصَرَّاۃ کی بحث تھی اور میں اپنے بخار کے دوران میں زوروں پر تھا۔ اس زمانے کے

سفیر ہند مقیم جدہ مدرسہ میں تشریف لائے حضرت ان کو مدرسہ دکھلانے خود تشریف لے گئے اور دارالحدیث کے سامنے جہاں مشکوٰۃ ہو رہی تھی تقریباً پندرہ منٹ سے زیادہ قیام فرمایا، مجھے حضرت کے کھڑا ہونے کا بالکل علم نہ ہو سکا، دفعۃً حضرت قدس سرہٗ پر نظر پڑی اور زبان لڑکھڑا گئی اور حضرت فوراً آگے بڑھ گئے۔ بعد میں طلبہ نے بتایا کہ حضرت تقریباً پندرہ منٹ سے کھڑے تھے۔

اخبار بینی سے نفرت:

(۱۱)......اس ناکارہ کی ابتدائی مدرسی کے زمانے میں مظاہر علوم کا کوئی طالب علم اخبار دیکھنا جانتا ہی نہیں تھا۔ دارالعلوم کے بھی دو چار طالب علموں کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا کہ اخبار کیا چیز ہے، اس زمانے میں ہم لوگوں کے تفریحی معمولات اکابرِ سلسلہ کی کتب بینی تھی۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصانیف گویا ہم لوگوں کے لیے اخبار تھے۔ عام طور سے مدرسین اور اوپر کے طلبہ کے شوق و ذوق ان اکابر کی کتابوں کا مطالعہ تھا۔

اب اس مبارک مشغلہ کے بجائے اخبارات، لغویات، دوستوں کا مشغلہ رہ گیا ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تابہ کجا

صاحب کے طالب علمی کے واقعات:

(۱۲)......حضرت اقدس مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی طالب علمی کے واقعات بہت ہی کثرت سے سنائے یہ ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ سردی میں کوئی کپڑا سردی کا نہیں تھا، کسی سے اظہار کو غیرت مانع تھی۔ اس کی انتہائی کوشش میں رہتا تھا کہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو۔ جب تک مسجد کے کواڑ کھلے رہتے حمام کے سامنے سینکنے کے بہانے سے بیٹھا رہتا اور جب سب چلے جاتے تو مسجد کے اندر زنجیر لگا کر مسجد کی صف کے ایک کونے پر لپٹ کر کروٹیں بدلتا ہوا دوسرے کونے تک پہنچ جاتا، وہی صف اوڑھنا بچھونا بن جاتی تھی۔ سر اور پیروں کی طرف سے خوب ہوا لگتی رہتی تھی۔ تہجد کے وقت اسی طرح کروٹیں بدلتا ہوا دوسری جانب آجاتا صف بچھ جاتی۔ پھر ارشاد فرمایا وہ سردی تو گزر گئی لیکن اللہ کے فضل سے اس کے بعد کوئی سال ایسا نہیں گزرا کہ مالک کی طرف سے ایک دو لحاف عمدہ ہدیہ کے اندر نہ آئے ہوں۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی طالب علمی کی جدوجہد اور رائپور کی ابتدائی حاضری کے واقعات اتنی کثرت سے سنائے کہ ان کے لکھنے کے واسطے بڑا دفتر چاہیے۔

حضرت نے ارشاد فرمایا کہ سہارنپور کی طالب علمی کے دور میں داخلہ بند ہو چکا تھا مطبخ تو

مدرسہ کے اندر اس وقت تک قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ طلبہ کو وظیفہ ملا کرتا تھا، دار الطلبہ بھی نہیں بنا تھا، اس لیے طلبہ کا قیام مساجد میں رہتا تھا۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ایک مسجد میں ہمارا پانچ آدمیوں کا قیام تھا، ایک طالب علم امام تھا، اس کا کھانا محلّہ سے آتا تھا اور دو کا وظیفہ مدرسہ سے تھا، وہ اسباق سے فارغ ہونے کے بعد اپنی روٹی خود ہی پکایا کرتے تھے، کبھی دال بھی پکا لی ورنہ چٹنی، تین آدمیوں کا کھانا ہم پانچ آدمی کھایا کرتے تھے۔ پیٹ صرف اس دن بھرتا تھا جب کہ محلّہ میں کسی جگہ دعوت ہوتی تھی یا جمعرات وغیرہ کو مسجد میں کوئی اور کچھ دے جائے ورنہ آدھی بھوک ہی اکثر کھانے کی نوبت آتی تھی۔

حضرت نے موجودہ طلبہ کے ہنگاموں پر کئی مرتبہ ارشاد فرمایا کہ یہ تم لوگوں نے مطبخ جاری کر کے کیا ہے۔ دونوں وقت پکی پکائی بے فکری سے ملتی ہے، اس لیے کبھی روٹی کچی مل جاتی ہے، کبھی سالن ناپسند ہو جاتا ہے۔ ہم لوگوں کو اسباق کے بعد اس زمانے میں اپنی اپنی روٹی پکانے کی فکر پڑ جاتی تھی اپنے ہی ہاتھ سے طلبہ عام طور سے پکاتے تھے، کچی پکی جیسے پک جاتی تھی اسی کو غنیمت سمجھتے تھے، اپنی پکائی ہوئی ہوتی تھی اس میں عیب نہیں نکلتا تھا اب مطبخ سے پکی پکائی ملے ہے، سینکڑوں عیوب اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور شکم سیر روٹی کھا کر لغویات کی سوجھے ہے، ہم لوگوں کو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ خرافات کی سوجھے۔ حدیث پاک کے اندر بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

”اَلَا یُوْشَکُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَقُوْلُ عَلَیْکُمْ بِھٰذَا الْقُرْاٰنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِیْہِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْہُ فَمَا وَجَدْتُمْ فِیْہِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْہُ وَاِنَّمَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ کَمَا حَرَّمَ اللّٰہُ۔“ (الحدیث)

ترجمہ: ”عنقریب ایک زمانہ آئے گا کہ ایک آدمی پیٹ بھرا اپنے مزین تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ بس قرآن پاک کو مضبوط پکڑو، ہم صرف اسی کو مانیں گے جو حلال وحرام قرآن میں ہے۔ حالانکہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ ایسی ہی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔“ (مشکوٰۃ بروایت ابی داؤد)

ارشاد مبارک، ان لوگوں کے بارے میں ہے جو حدیث شریف کا انکار کرتے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا کہ یہ ساری باتیں پیٹ بھرائی اور پیسے سے پیدا ہوتی ہے۔ فقرو فاقہ میں لغویات اور خرافات کی نہیں سوجھتی۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ اپنے رائپور کی حاضری کے ابتدائی دور کے قصے بھی بہت ہی لطف اور مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے، کیونکہ اپنے شیخ حضرت اقدس مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کے خادم خاص تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کو لٹانے کے بعد

جب دو پہر کو حضرت آرام فرماتے تو میں کواڑ بند کر کے مہمانوں کے کھانے پکنے کی جگہ جاتا، معز الدین مرحوم جو بڑے حضرت کے مہمانوں کے کھانے پکانے کے منتظم تھے وہ سب مہمانوں کو کھلا کر مطبخ بند کر کے اپنے گھر چلے جاتے، میں وہاں جا کر دیکھتا کبھی ایک آدھ روٹی بچی ہوئی ہوتی، سالن کی دیگچیوں سے پونچھ کر کھالیتا اور کبھی کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہوتا تھا تو سوکھے ہوئے ٹکڑے طاقوں وغیرہ میں رکھے ہوئے مل جاتے تھے ان کو پیالے میں ڈال کر پانی میں بھگو کر نمک ڈال کر اور اگر نمک نہ ملتا تو بغیر نمک ہی کے کھالیا کرتا تھا، کبھی پیٹ بھرتا کبھی نہ بھرتا کسی دوسرے سے تو کیا کہتا میں نے کبھی معز الدین مرحوم سے یہ بھی نہیں کہا کہ تم نے میرے واسطے روٹی نہیں رکھی اور بھی اس قسم کے واقعات سنا کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے خدام کے لیے اگر کھانا نہ بچے تو منتظم کی جان کو آجائیں۔

لکھنے کا واقعہ حضرت حاجی صاحب کا:

(۱۳)...... میرے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے مجھے ایک مرتبہ کارڈ لکھا کہ کئی دن سے تم کو ایک ضروری خط لکھنے کا تقاضا تھا، مگر میرے پاس کوئی پیسہ نہ تھا، قرض لینے کو دل نہ چاہا۔ آج اللہ نے پیسے عطا فرمائے ہیں تم کو خط لکھ رہا ہوں۔

اور سید الطائفہ حضرت الحاج مولانا امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک قصہ تو مشہورِ عالم ہے کہ مکہ مکرمہ میں کئی دن کے فاقوں کے بعد ایک ایسے مخلص دوست سے جس سے بڑے تعلقات بھی تھے دو ہلل قرض مانگے تھے اس نے عذر کر دیا، اس پر حضرت کو بہت ہی رنج و قلق ہوا کہ کیوں مانگے تھے۔ اس کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے خواب میں دیکھا کہ ابتلاء کا دور ختم ہو گیا اب فتوحات کا دور ہے، پھر جو فتوحات ہوئیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ ہم لوگوں سے ذرا بھی تکلیف برداشت نہیں ہوئی۔

(۱۴)...... یہ واقعہ جو آگے لکھوا رہا ہوں میرے سامنے کا تو نہیں ہے مگر میرے ایک عزیز مرحوم نے کئی بار سنایا کہ وہ دہلی کی کسی مسجد میں امام تھے اور چچا جان قدس سرہٗ کا ابتدائی دور تھا، وہ ایک مرتبہ رمضان میں یہ سمجھ کر کہ چچا جان دلی کے پیر ہیں رمضان میں بہت فتوحات ہوتی ہوں گی وہ ظہر کے بعد عصر کے وقت نظام الدین پہنچے۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا معمول عصر کے بعد سے مغرب تک ذکر بالجہر کا تھا، عین افطار کے وقت خدام سے پوچھتے کہ کوئی چیز افطاری کو ہے؟ جو ماحضر ہوتا خدام پیش کر دیتے اور جو کچھ کھانا ہوتا مغرب کے وقت ہی تناول فرما لیتے، وہی افطاری ہوتی اور وہی افطاری کے بعد کا کھانا۔ جب افطار کا وقت ہو گیا اور چچا جان نے حسبِ معمول پوچھا کہ لاؤ بھائی کچھ ہے کسی نے کہا کہ حضرت کچھ اور تو ہے نہیں کل کے گولر بچے ہوئے ہیں۔ چچا جان

نے فرمایا کہ واہ واہ، واہ واہ ضرور لاؤ میرے عزیز بھی شریک ہوگئے چچا جان نے چار پانچ گولر کھا کر اور پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا، مغرب کی نماز پڑھائی اور نفلوں کے اندر مشغول ہوگئے۔ عشاء کی اذان تک حسب معمول نفلیں پڑھتے رہے، اذان کے قریب فارغ ہو کر تھوڑی دیر لیٹے، پھر عشاء اور تراویح بڑے اطمینان سے پڑھائیں۔ وہ غریب عزیز سوچتا ہی رہا کہ کھانے کا نمبر کب کو آئے گا۔ نظام الدین رکے رہنے والے طلبہ اپنا کھانا خود پکاتے تھے اور پکانے کے بعد ایک ایک دو دو روٹی ان کو تقسیم ہو جاتی تھی، وہ اپنے ہاتھ پر رکھ کر کھا لیتے تھے، چچا جان کو تو کیا احساس ہوا ہوگا مگر ان عزیز نے رات بڑی مشکل سے گزاری۔ سحر کے وقت پھر وہی افطاری والا منظر تھا اور وہی گولروں کا لوٹا تھا اور وہی سحری اور وہی شکر۔ صبح کی نماز کے بعد اس عزیز نے دلی آنے کی اجازت چاہی۔ چچا جان بہت ہنسے اور فرمایا کہ بالکل اجازت نہیں ہے۔ اس نے اپنی ضروریات کا بہت اظہار کیا مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ غریب نے سارے دن روزہ پر روزہ چند گولروں کے سحر و افطار کے ساتھ رکھا تھا، کہا کرتا تھا کہ جو کچھ میرے اوپر گزری تھی میں ہی جانتا تھا۔ دوسرے دن عصر کے بعد وہی ذکر کا منظر تھا اور مرحوم عزیز کہا کرتا تھا کہ میری جان کو بن رہی تھی کہ اب پھر وہی گولر آئیں گے۔ قبیل المغرب دہلی سے ریڑھی پر رکھی ہوئی نہایت لذیز مرغن بریانی کی ایک دیگ آئی جس کی خوشبو سے ساری مسجد مہک رہی تھی۔ چچا جان نے افطار کے وقت فرمایا کہ ”آؤ بھائی لطیف! یہ بریانی تمہارے ہی واسطے آئی ہے۔“ مرحوم کہا کرتا تھا کہ دوسرے دن افطار وسحر میں اتنی رغبت اور لذت سے پیٹ بھر کر کھائی کہ عمر بھر یاد رہے گی۔

صرف روٹی پہ گزارا کرنا:

(۱۵)...... میری دادی کے نانا حضرت مولانا مظفر حسین صاحب قدس سرہٗ کے نام نامی سے ابھی تک ہندو پاک کے ہزاروں آدمی واقف ہیں، ان کی طالب علمی کا ابتدائی دور دہلی میں گزرا، بازار سے کھانا خرید کر کھایا کرتے تھے لیکن صرف روٹی خریدتے تھے، سالن کبھی نہیں خریدتے تھے اور بغیر سالن کے خشک روٹی کھایا کرتے تھے، اس لیے کہ اس زمانے میں دہلی کی دکانوں میں جو سالن پکتا تھا اس میں اچور کا ڈالنا لازم تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ آموں کے باغوں کی بیع قبل از بدوّ صلاح ہوتی ہے جو جائز نہیں ہے، اس لیے سالن سے کبھی روٹی نہ کھاتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ کسی مشتبہ مال کو حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کا معدہ قبول نہیں کرتا تھا، اگر کسی جگہ غلطی سے بھی مشتبہ مال کھانے کی نوبت آجاتی تو فوراً قے ہو جاتی تھی۔ بہت سے واقعات اس سلسلہ کے حضرت مرحوم کے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت مرحوم کے کچھ حالات ”تذکرۃ الخلیل“ میں، جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کی سوانح ہے، جس میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب، حضرت

اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری، حضرت شیخ الہند، مولانا محمود الحسن صاحب اور میرے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی خلیفہ حضرت گنگوہی قدس سرہم کے حالات بھی مختصر طور پر ذکر کیے گئے ہیں مذکور ہیں۔ ان بزرگوں کے حالات نیز حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی قدس سرہما، حضرت شیخ الہند، حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مراقدہم کی سوانح مستقل شائع ہو چکی ہیں جن سے ان حضرات کے مجاہدات، تقویٰ وطہارت، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کے اندر ہمہ تن مشغولی مفصل موجود ہے۔ احباب کو ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، ان اکابر کے حالات سے سبق لینا چاہیے کہ دنیا کی زندگی چاہے جتنی بھی زیادہ ہو جائے بہرحال ختم ہونے والی ہے، موت سے کسی کو چارہ نہیں ہے اور آخرت کی زندگی دائمی ہے کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ سمجھدار اور عقلمند کا کام ہے دائمی زندگی کے لیے جو کچھ کرسکتا ہو کر لے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"خدا کی قسم! میں تم لوگوں پر فقیر کا اندیشہ نہیں کرتا، مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ دنیا تم پر پھیل جائے گی جیسا کہ پہلوں پر پھیل چکی ہے اور تم اس میں دل لگا بیٹھو گے جیسا کہ وہ لوگ لگا بیٹھے ہیں اور یہ دنیا تم کو بھی ایسے ہی ہلاک کر دے گی جیسے ان لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔" (مشکوۃ بروایت شیخین)

ان حضرات اکابر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشادات کو دل میں جگہ دے رکھی تھی اور ان پر عمل کر کے دکھلا دیا۔ ہم لوگوں کو نہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کی توفیق، نہ ان اکابر جن کے ہر قول وفعل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، کے اتباع کی امنگ اور شوق۔

فالی اللہ المشتکیٰ

اُولٰئِکَ اٰبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ
اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

خدا یاد آئے جن کو دیکھ کر وہ نور کے پتلے
نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظلِّ رحمانی
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انہیں کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انہیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انہیں کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں

پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگرخلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

لکھنے کو بہت جی چاہتا ہے مگراس کے لیے تو بڑے دفتر چاہیں، نمونہ کے لیے یہ بھی کافی ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

فقط
محمد زکریا
مظاہر علوم سہارنپور
۱۵ ربیع الآخر ۸۸ھ

اضافات برحواشی وغیرہ یکم شعبان المعظم ۱۳۹۶ھ جمعۃ المبارک

آپ بیتی نمبر ۲
یا
یادِ ایام نمبر ۱
جس میں
حضرت اقدس شیخ الحدیث، عارف کبیر
مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ کے
طفولیت تعلیم، تدریس، تالیف کے حالات
تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں۔
ناشر
مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم ط

یہ رسالہ جیسا کہ اس کی تمہید سے معلوم ہوگا آپ بیتی نمبر۲ تجویز تھا اور لکھتے وقت ابتداءً خیال یہی تھا کہ جس طرح اس کے حصہ نمبر۱ کے درمیان مختصراً واقعات آئے ہیں ایسے ہی اس میں بھی آجائیں گے اور اسی کے برابر آپ بیتی نمبر۲، و نمبر۳ میں علی گڑھ کے قیام میں جتنے واقعات متفرق یاد آتے رہیں گے لکھواتا رہوں گا۔ مگر اس کے شروع ہی میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مضامین کو الگ الگ فصول اور ابواب میں تقسیم کر دیا جائے اور شروع ہی میں آٹھ باب ذہن میں آگئے تھے اور علی گڑھ کے چند روزہ قیام میں آٹھوں بابوں پر کچھ اجمالی اور کچھ تفصیلی واقعات لکھے جا چکے تھے یہاں آکر جب اس کو صاف نقل کرایا تو وہ مستقل ایک طویل رسالہ بن گیا۔ اس لیے متعدد دوستوں بالخصوص مولوی عبدالرحیم متالا سلمہٗ کا اصرار ہے کہ اس کو اول کا جزء نہ بنایا جائے بلکہ اس کو مستقل ایک رسالہ یادِ ایام کے نام سے شائع کرایا جائے کہ اس کے مضامین اول سے بہت مختلف ہیں۔ اس لیے اس کا نام آپ بیتی نمبر۲ یا یادِ ایام نمبر۱ سے موسوم کرتا ہوں اور چونکہ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اس لیے خیال ہے کہ ہر نمبر میں دو دو باب آجائیں گے جو معتدل اور مناسب رسالوں کی شکل میں شائع ہوسکیں گے۔

فقط والسلام

محمد زکریا کاندھلوی

۱۵ شعبان المعظم ۱۳۹۰ھ

بسم اللہ الرَّحمٰن الرَّحیم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

باب اول

اعمال کا مدار نیتوں پر ہے

[فَاعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ] [لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَ لٰکِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ] ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ، وَ اِنَّمَا لِامْرِیءٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُهَا اَوْ اِلَی امْرَاَةٍ یَنْکِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰی مَا هَاجَرَ اِلَیْهِ''

ترجمہ: اللہ جل شانہ، کا پاک ارشاد ہے کہ ''اس کی عبادت اخلاص کے ساتھ کرو اور یہ کہ اس کے پاس قربانی کا گوشت یا اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ اس کے پاس تقویٰ اور پرہیز گاری پہنچتی ہے۔''
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی وہ نیت کرے۔ جس کی ہجرت اپنی نیت کے اعتبار سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی۔ اللہ کے نزدیک اور مال کے اعتبار سے بھی اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے ہوگی اس کی ہجرت بھی اسی کی طرف ہوگی جس کی نیت کی ہو۔''
یہ حدیث پاک بڑی جامع ہے۔ بعض علماء نے اس حدیث کو آدھا علم کہا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو تصوف سارا کا سارا یہی ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔
حدیث پاک میں دو جملے ارشاد فرمائے گئے ہیں کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی نیت کرے۔ دوسرا مرحلہ پہلے کی تائید بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ اکثروں نے کہا ہے اور مستقل دوسرا مضمون بھی ہوسکتا ہے اور یہ زیادہ اچھا ہے اور وہ یہ کہ آدمی کسی نیک کام میں جتنی نیتیں کرلے اللہ تعالیٰ سب ہی کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ مولانا نواب قطب الدین صاحب نے مظاہر حق میں اس کی بہت سی مثالیں لکھی ہیں۔ مثلاً مسجد کے جانے میں بہت سی نیتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ نیت اعتکاف کی کرے اور اس کے ساتھ اس کی بھی نیت کرے کہ رب کریم کے گھر حاضری ہے اور کریم اپنے یہاں آنے والوں کا اکرام کرتا ہی ہے۔ اسی سے نماز کے انتظار میں جتنی

دیر بیٹھے گا اس کا مستقل ثواب ہوگا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص نماز کے انتظار میں رہتا ہے وہ نماز ہی میں رہتا ہے اور یہ کہ اس مقام پر آنکھ، کان اور دیگر اعضاء کی معاصی سے حفاظت کا مقام ہے کہ بازار وغیرہ میں یہ سب اعضاء کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا رہتے ہیں، ان سے حفاظت کی نیت کرے کہ اس کا مستقل ثواب ہوگا اور یہ نیت کرے کہ اس پاک جگہ میں دعا درود پڑھتا رہوں گا اس کا مستقل ثواب ہے اور یہ نیت بھی کرلے کہ یہاں یکسوئی اور کمال توجہ الی اللہ نصیب ہوگی جس کا مستقل ثواب ہے اور یہ بھی نیت کرلے کہ وضو کرکے نماز کے لیے جانے کا ثواب حج اور عمرہ کا ہوتا ہے اور یہ بھی نیت کرلے کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور علم حاصل کرنا اور علم سکھانا مجمع کی وجہ سے مسجد میں میسر ہوتا ہے اور یہ بھی نیت کرے کہ مسلمانوں سے ملاقات ہوگی کہ مستقل عبادت ہے اور انہیں سلام کرنے کا موقع ملے گا اور آخرت کے امور میں اللہ کی بارگاہ میں مراقبہ اور فکر کا موقع ملے گا اور اسی طرح سے بہت سے امور پیدا ہوسکتے ہیں اور جتنے امور کی آدمی نیت کرلے گا ان کا مستقل ثواب ملے گا۔ مالک کے یہاں عطا میں کوئی کمی نہیں ہے:

تو وہ داتا ہے کہ دینے کے لیے
در تری رحمت کے ہیں ہر دم کھلے

تقریباً تین سال ہوئے عزیز مولوی سید محمد ثانی ندوی لکھنوئی نے عزیز گرامی قدر و منزلت مولانا الحاج محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح لکھی تھی، اس کا ایک باب اس سیہ کار کے متعلق تھا، مکرم محترم مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب نے خود اپنے دستِ مبارک سے لکھا تھا۔ ساری کتاب کا مسودہ تو طباعت سے پہلے وقتاً فوقتاً مجھے دکھایا گیا، لیکن اس باب کا مجھ سے اخفا کیا جو طبع ہونے کے بعد دیکھا، جس پر میں نے عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ کو لکھا کہ تم نے اس باب کا اضافہ کرکے ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگا کر ساری کتاب ہی کو بدنما کر دیا اور میں نے اس پر تنقید کے طور پر ایک خط لکھا، جس میں لکھا کہ جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ تو آپ نے لکھی نہیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں وہ بھی مختصر اور اجمال کے ساتھ اور میں نے چند واقعات جو میرے نزدیک قابلِ تحریر تھے لکھ کر عزیز موصوف کو دیے، جن کو سن کر بعض دوستوں کا اصرار ان کی طباعت پر ہوا۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ مستقل چھپتی لیکن دوستوں کے شدید اصرار پر میں نے دو سال ہوئے اسے اپنے رسالہ اسٹرائک کا جزء بنا کر آپ بیتی کے نام سے شائع کر دیا۔

اس وقت سے دوستوں کا برابر تقاضا ہے کہ وہ بہت مختصر ہے، اس پر کچھ مزید اضافہ ضرور کیا جائے، بالخصوص گزشتہ سال سفر حجاز سے واپسی میں رائے ونڈ کے طلبہ عزیز نے تو بہت ہی زیادہ اصرار کیا اور یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس رسالہ کو اساتذہ سے سبقاً سبقاً بار بار پڑھا اور ان

کے اساتذہ نے بھی اس کی تصدیق وتوثیق کی۔ لیکن یہ کوئی علمی مشغلہ نہیں تھا، جس کے لیے بہر حال وقت نکالنا ضرور ہوتا کہ مجھے اپنی آنکھوں کی معذوری کے باوجود رسالہ ''جزء الحج والعمرۃ'' کا زیادہ اہتمام ہو رہا تھا اور اسے اکثر اوقات پڑا پڑا سنتا تھا کہ مجھے ۱۰ جمادی الثانی ۹۰ھ مطابق ۱۲۲ اگست ۷۰ء کو علی گڑھ کے ہسپتال میں اپنی آنکھ کے علاج کے سلسلے میں دوبارہ جانا پڑا کہ پہلی مرتبہ ۲۹ ذی الحجہ ۸۹ھ مطابق ۸ مارچ ۷۰ء کو آپریشن کے لیے جانا ہوا تھا اور ۱۴ مارچ کو آپریشن ہوا تھا، لیکن اس وقت تو بات کرنے کی اور خط وکتابت کی بھی ممانعت تھی، مگر آنکھ میں صفائی نہ آنے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ تین دن کے لیے بلایا تھا کہ تین دن کے معائنہ کے بعد وہ بتلائیں گے کہ مزید قیام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ چنانچہ ڈاکٹروں نے، اللہ ان سب ہی کو جزائے خیر دے، تین چار دن تک ہر جزء بدن کے معائنے کیے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے دس بارہ دن یہاں قیام کرنا ضروری ہے، ان ایام میں خالی پڑے پڑے مجھے خیال ہوا کہ دوستوں کی اس فرمائش کو پورا کر دوں اور جو کچھ ان ایام میں ہو سکے ان کو لکھ کر آپ بیتی نمبر۲ بنادوں، پھر اگر کبھی مقدر میں ہوا تو نمبر۳ کی بھی گنجائش ہے۔ اس لیے آج ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۹۰ھ بمطابق ۱۲۶ اگست ۷۰ء چہار شنبہ کو بسم اللہ کرادی۔

چونکہ ہر ایک گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد ڈاکٹروں کی آمد ہوتی ہے اور انجکشنوں اور معائنوں کا سلسلہ رہتا ہے اس لیے مسلسل وقت ملنا تو یہاں بھی دشوار ہے تاہم چونکہ یہ خیال ہے کہ خبر نہیں یہاں کتنا قیام ہے اس لیے جو وقت بے کار جائے اس میں کوئی کام کی چیز آجائے۔

اگر چہ ڈاک نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، کل ایک مہمان جو سہارنپور سے آئے ہیں وہ ایک دن کی ڈاک باون (۵۲) خطوط ہندی، پاکی، مکی، مدنی، لندن اور افریقی وغیرہ لے کر آئے ہیں، جن کے سننے میں بھی کئی دن لگیں گے اور آج رات کو ایک اور صاحب آرہے ہیں، دیکھئے وہ کتنے خط لاویں۔ اس کے باوجود جتنا بھی وقت ملتا رہا دن میں اور رات میں اس کا مسودہ لکھا گیا۔ چونکہ رات کو نیند بہت کم آتی تھی اس لیے رات کو وقت زیادہ ملتا تھا اللہ تعالیٰ دوستوں کو جزائے خیر دے کہ وہ بھی میری وجہ سے اپنی نیند ضائع کرتے تھے۔

وہاں کے اٹھارہ روز کے قیام میں جو اس کی ابتداء کے بعد سے ۱۳ ستمبر تک ہوئے، آٹھ بابوں کا مسودہ تقریباً تیار ہو گیا، جن میں سے بعض ابواب کے مضامین تو پورے آگئے اور بعض ابواب کے مضامین بطورِ فہرست جو یاد آتے رہے وہ لکھے گئے، تکمیل سہارنپور آنے کے بعد ہوئی۔

ان میں سب سے پہلا باب ''حسنِ نیت'' کے متعلق ہے۔ دوسرا ''درس وتدریسِ مظاہر علوم وتالیفات'' کے متعلق ہے۔ تیسرا ''اپنی چند بری عادتوں کا بیان'' ہے۔ چوتھا جو درحقیقت تیسرے باب ہی کا جزء ہے ''حوادث اور شادیوں میں اپنا معمول''۔ پانچواں ''تحدیث بالنعمۃ'' ہے۔ چھٹے

میں ''اپنے حجوں کی کچھ تفصیلات''، جو درحقیقت میں پانچویں ہی باب کا جز ہے۔ ساتواں باب ''تقسیم ہند'' اور آٹھواں باب ''متفرقات''۔ ان میں بعض اجمالاً اور بعض تفصیلاً علی گڑھ میں لکھے جاچکے تھے، شاید کبھی موقع ہوتو ان پر اضافہ بھی ہوجائے۔

پہلا باب جس کے متعلق قرآن پاک کی دو آیتیں اور ایک حدیث پاک بھی لکھی جاچکی ہے وہ ایمان واسلام، احسان وسلوک سب ہی کا لُبِّ لُباب ہے اور خلاصہ ہے۔ چند واقعات اس سلسلے میں یاد آگئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا سوال اور بندہ کا جواب:

(۱)......مولانا حبیب الرحمٰن رئیس الاحرار کے دیکھنے والے تو ابھی بہت ہوں گے اور نام سننے والے تو بہت زیادہ۔ منتہاء میں تو مرحوم کو مجھ سے بہت زیادہ محبت ہوگئی تھی اور تعلق اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ وہ بجائے دہلی کے سہارنپور میرے پاس رہنے کی تمنائیں بڑی کثرت سے کیا کرتے تھے بلکہ اصرار بھی اور میں اپنے بے کار اور ان کے باکار ہونے کی وجہ سے اس کو کبھی قبول نہیں کرتا تھا۔ لیکن ابتداء میں میرے اور مرحوم کے تعلقات بہت ہی خراب تھے۔ ان کی تو مظاہر میں کبھی ان زمانے میں آمد نہیں ہوتی تھی۔ لیکن مجھے دیوبند کبھی کبھی حضرت قدس سرہٗ کا فرستادہ بن کر کتب خانے سے کسی کتاب کی تلاش میں یا محترمین مہتممین رحمہم اللہ تعالیٰ سے کسی بات پر مشورہ کے لیے جانا ہوتا تھا۔ ایک بجے والی سے جانا ہوتا تھا اور ہمروزہ واپسی کے ارادہ سے جانا ہوتا تھا۔

رئیس الاحرار صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مجھ سے بہت واقف تھے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں۔ مدرسہ کا مدرس ہوں اور میں ان سے صرف اتنا واقف تھا کہ لدھیانہ کا کوئی طالب علم جس کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی تعلق نہیں لیڈری کرتا تھا، وہ چونکہ گھومتے رہتے تھے اس واسطے میری دیوبند کی ہر مرتبہ کی آمد پر دو تین مرتبہ ان کا سامنا ہوتا اور وہ بہت ہی چلا کر مجھے سنا کر بہت ناراضی کا اظہار کیا کرتے تھے، اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ میں سیاست سے بالکل بے تعلق، اخبار بینی کا دشمن ہوں اور اس زمانے میں دیوبند، سہارنپور میں اخبار بینی آئی بھی نہیں تھی۔ سہارنپور کا کوئی طالب علم یا مدرس تو اخبار بینی جانتا ہی نہ تھا کہ کیا بلا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ کی چارپائی پر عصر کے بعد دو چار اخبار پڑے رہتے تھے جن کو کوئی باہر کا مہمان اٹھا کر دیکھ لیتا تھا۔ دیوبند میں مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے ہمنوا تو نہایت مخالف اور اخبار بینی کے دشمن۔ لیکن مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ مدرسین کوئی ایک آدھ دیکھ لیتا تھا۔ رئیس الاحرار صاحب مرحوم جب مجھے دیکھتے، دور سے چلا کر کہتے ''ایسے شخص کا وجود زمین پر بوجھ ہے، یہ مرکیوں نہیں جاتے، ان کے لیے زمین کا اندرون زمین کے بیرون سے بہتر ہے۔'' وغیرہ وغیرہ اور اس ناکارہ کی اتنی جرأت تو نہیں ہوتی

تھی کہ پکار کر کچھ کہتا۔ مگر ایک دو طالب علم جو مجھے دیکھ کر میرے ساتھ ہو لیتے تھے ان سے پیاماً کہلوا دیتا تھا کہ ''اس شخص کو مدرسہ کی روٹی کھانا حرام ہے، مدرسہ کا چندہ لیڈری کے واسطے نہیں آتا۔ جس شخص کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی واسطہ نہ ہو، مطالعہ سبق سے کوئی کام نہ ہو اس کو مدرسہ کی روٹی کھانا حرام ہے۔ مدرسہ کے اندر قیام ناجائز ہے۔ مدرسہ کی ہر قسم کی اعانت حاصل کرنا گناہ ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ اس پیام پر مرحوم اور بھی زیادہ برافروختہ ہوا کرتے۔ کئی سال یہی قصہ رہا۔

مگر اللہ جل شانہٗ نے مرحوم کی دستگیری فرمائی کہ اعلیٰ حضرت قدوۃ الاتقیاء فخر الاولیاء حضرت مولانا الحاج شاہ عبد الرحیم رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے اخیر زمانہ حیات میں حضرت قدس سرہٗ سے حضرت الحاج شاہ عبد القادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے کہ اس زمانے کا دستور یہی تھا کہ اعلیٰ حضرت سے جو شخص بیعت ہونا چاہتا تھا، ضعف و نقاہت کی وجہ سے حضرت خود تو نہ فرماتے تھے، حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ بیعت کے الفاظ کہلا دیتے تھے۔ بڑوں کے ہاتھ میں ہاتھ دینا اثر سے خالی نہیں جاتا۔ چنانچہ یہ تعلق رنگ لائے بغیر نہیں رہا اور اخیر میں تو رئیس الاحرار کو حضرت مولانا عبد القادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے عشق کا تعلق ہو گیا تھا اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے اس سیہ کار سے بھی، لیکن شروع کے چند سال ایسے گزرے کہ مرحوم اپنی سیاحت میں رہتے۔ کلکتہ، بمبئی اور پشاور وغیرہ ان کی روزمرہ کی گزرگاہ تھی اور سہارنپور ہر جگہ کا جنکشن۔ اس لیے جب سہارنپور سے گزر رہوتا تو ہر وزہ واپسی یا ایک شب قیام کے لیے رائے پور بھی جاتے۔

اس کے دیکھنے والے تو آج بھی سینکڑوں ہیں کہ حضرت اقدس شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس سیہ کار کے ساتھ عشق کا سا تعلق تھا، جملہ معترضہ کے طور پر ایک واقعہ لکھتا ہوں کہ میرے مخلص دوست صوفی اقبال پاکستانی ثم المدنی جو پاکستان میں ملازم تھے جب حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ پاکستان جاتے اور صوفی اقبال مجھے خط لکھتے تو بہت اصرار سے مجھے لکھا کرتے کہ میرے خط کے جواب میں حضرت رائے پوری کو سلام ضرور لکھ دیجیو۔ اس لیے کہ جب میں عصر کے بعد کی مجلس میں یوں کہہ دیتا ہوں کہ شیخ کا خط آیا ہے حضرت کو سلام لکھا ہے تو فوراً چارپائی کے قریب بلایا جاتا ہوں اور فوراً خیریت وحالات وغیرہ دریافت کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے مغرب تک چارپائی کے قریب بیٹھنا نصیب ہو جاتا ہے۔

اس تعلق کی بناء پر جب کوئی شخص رائے پور حاضر ہوتا تو حضرت کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ شیخ سے مل کر آئے یا نہیں؟ اگر وہ کہتا کہ مل کر آیا ہوں تو بڑی بشاشت سے بات پوچھتے، خیریت پوچھتے، کیا کر رہے تھے؟ کوئی پیام دیا وغیرہ وغیرہ اور اگر وہ کہتا کہ نہیں مل کر آیا تو زیادہ التفات نہ فرماتے، بلکہ جیسا تعلق ہوتا ویسا ہی برتاؤ کرتے۔ اس مجبوری کو بہت سے ایسے لوگ جن میں رئیس الاحرار

بھی تھے باوجود دل نہ چاہنے کے نہایت گرانی کے ساتھ کھڑے کھڑے مصافحہ کرنا ضروری سمجھتے تا کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ہو کر آیا ہوں اور سلام عرض کیا ہے اور میں بھی اس قسم کے لوگوں سے باوجود جی نہ چاہنے کے چاہے کتنی ہی مشغولی کا وقت ہو اور کتنا ہی ضروری کام کر رہا ہوتا ضرور بلا کر حضرت کی خدمت میں سلام عرض کر دیتا۔ مبادا وہ جا کر کہہ دیں کہ میں تو حاضر ہوا تھا باریابی نہ ہوئی۔

رئیس الاحرار مرحوم سے کئی سال سے صرف اس نوع کی ملاقات رہی۔ ایک مرتبہ ۱۰ بجے صبح کو میں اوپر اپنے کمرے میں نہایت مشغول تھا، مولوی نصیر نے اوپر جا کر کہا کہ ''رئیس الاحرار آئے ہیں رائے پور جا رہے ہیں صرف مصافحہ کرنا ہے۔'' میں نے کہا ''جلدی بلاؤ'' مرحوم اوپر چڑھے اور زینے پر چڑھتے ہی سلام کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا کہ ''رائے پور جا رہا ہوں اور ایک سوال آپ سے کر کے جا رہا ہوں اور پرسوں صبح واپسی ہے اس کا جواب آپ سوچ رکھیں، واپسی میں جواب لے لوں گا۔ یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے؟'' میں نے مصافحہ کرتے کرتے یہ جواب دیا کہ ''صرف تصحیح نیت۔'' اس کے سوا کچھ نہیں۔ جس کی ابتداء اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ سے ہوتی ہے اور انتہا ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ'' ہے۔ میرے اس جواب پر سکتہ میں طاری ہو گئے اور کہنے لگے ''دلی سے یہ سوچتا آ رہا ہوں کہ تو یہ جواب دے گا تو یہ اعتراض کروں گا اور یہ جواب دے گا تو یہ اعتراض، اس کو تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' میں نے کہا کہ جاؤ تانگے والے کو بھی تقاضا ہو گا، میرا بھی حرج ہو رہا ہے، پرسوں تک اس پر اعتراض سوچتے رہنا۔ اس کا خیال رہے کہ دن میں لمبی بات کا وقت نہیں ملنے کا، دو چار منٹ کو تو دن میں بھی کر لوں گا۔ لمبی بات چاہو گے تو مغرب کے بعد ہو سکے گی۔'' مرحوم دوسرے ہی دن شام کو مغرب کے قریب آ گئے اور کہا کہ ''کل رات کو تو ٹھہرنا مشکل تھا، اس لیے مجھے فلاں جلسہ میں جانا ہے اور رات کو تمہارے پاس ٹھہرنا ضروری ہو گیا، اس لیے ایک دن پہلے ہی چلا آیا۔'' اور یہ بھی کہا کہ ''تمہیں معلوم ہے مجھے تم سے کبھی نہ عقیدت ہوئی نہ محبت۔'' میں نے کہا ''علی هذا القياس۔'' مرحوم نے کہا ''مگر تمہارے کل کے جواب نے مجھ پر تو بہت اثر کیا اور میں کل سے اب تک سوچتا رہا۔ تمہارے جواب پر کوئی اعتراض سمجھ میں نہیں آیا۔'' میں نے کہا ''انشاء اللہ مولانا اعتراض ملنے کا بھی نہیں۔''

''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' سارے تصوف کی ابتداء ہے اور ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ'' سارے تصوف کا منتہا ہے۔ اسی کو نسبت کہتے ہیں، اسی کو یادداشت کہتے ہیں، اسی کو حضوری کہتے ہیں۔

حضوری گر ہمی خواہی، ازو غافل مشو حافظ
مَتٰى مَا تَلْقَ مَنْ تَهْوٰى دَعِ الدُّنْيَا وَ اَمْهِلْهَا

میں نے کہا ’’مولوی صاحب سارے پاپڑ اسی کے لیے پیلے جاتے ہیں۔ ذکر بالجہر بھی اسی واسطے ہے، مجاہدہ اور مراقبہ بھی اسی واسطے ہے اور جس کو اللہ جل شانہٗ اپنے لطف وکرم سے کسی بھی طرح یہ دولت عطاء کردے اس کو کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیاء اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہوجاتے تھے اور ان کو کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد اکابر اور حکماء امت نے قلبی امراض کی کثرت کی بناء پر مختلف علاج جیسا کہ اطباء بدنی امراض کے لیے تجویز کرتے ہیں، روحانی اطباء نے روحانی امراض کے لیے ہر زمانے کے مناسب اپنے تجربات جو اسلاف کے تجربات سے مستنبط تھے نسخے تجویز فرمائے ہیں جو بعضوں کو بہت جلد نفع پہنچاتے ہیں، بعضوں کو بہت دیر لگتی ہے۔‘‘

پھر میں نے مرحوم کو متعدد قصے سنائے، جن میں سے ایک قصہ تو میں نے اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا اور کئی مرتبہ سنا اور میں نے بھی حدیث کے اسباق میں اور دوستوں کی مجالس میں ہزاروں مرتبہ اس کو سنایا ہوگا وہ یہ کہ:

قصبہ پانی پت کا ضلع کرنال ہے، ان دونوں کے درمیان جمنا چلتی تھی، معلوم نہیں اب بھی ایسا ہے یا نہیں، جمنا کا ہر جگہ دستور یہ ہے کہ خشکی کے زمانے میں لوگ جوتے ہاتھ میں لے کر پار ہوجاتے ہیں، جہاں پانی زیادہ ہو وہاں کشتیاں کھڑی رہتی ہیں، ملاح دو چار پیسے لے کر ادھر سے ادھر پہنچا دیتے ہیں، لیکن جب جمنا طغیانی پر ہو تو پھر عبور نا ممکن ہوتا ہے۔

ایک شخص پانی پت کا رہنے والا، جس پر خون کا مقدمہ کرنال میں تھا اور جمنا میں طغیانی اور نہایت زور۔ وہ ایک ایک ملاح کی خوشامد درآمد کرتا رہا، مگر ہر شخص کا ایک جواب کہ اس میں تیرے ساتھ اپنے آپ کو ڈبوئیں گے۔ وہ بیچارہ غریب پریشان روتا پھر رہا تھا۔ ایک شخص نے اس کی بدحالی دیکھ کر کہا کہ اگر میرا نام نہ لے تو ترکیب بتاؤں، جمنا کے قریب فلاں جگہ ایک جھونپڑی پڑی ہوئی ہے اس میں ایک صاحب مجذوب قسم کے پڑے رہتے ہیں، ان کے جا کر سر ہوجا، خوشامد، منت سماجت (خوشامد پر ایک قصہ کیمیاء کا یاد آگیا، وہ باب ہشتم میں یاد رہا تو انشاء اللہ لکھواؤں گا) جو کچھ تجھ سے ہوسکے کسر نہ چھوڑنا اور جتنا بھی برا بھلا کہیں حتیٰ کے اگر تجھے ماریں بھی تو منہ نہ موڑنا۔ چنانچہ یہ شخص ان کے پاس گیا اور ان سے خوشامد درآمد کی، انہوں نے اپنی عادت کے موافق خوب ملامت کی کہ میں کوئی خدا ہوں، میں کیا کرسکتا ہوں؟ مگر جب یہ روتا ہی رہا (اور رونا تو بڑے کام کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرماوے) تو ان بزرگ نے کہا کہ ’’جمنا سے کہہ دے کہ اس شخص نے جس نے نہ عمر بھر کچھ کھایا نہ بیوی کے پاس گیا، اس نے بھیجا ہے کہ مجھے راستہ

دے دے۔'' چنانچہ یہ گیا اور جمنا نے راستہ دے دیا۔ اس کا تو کام ہو گیا۔
اس میں کوئی استبعاد نہیں، پہلے انبیاء کے معجزات اس امت کی کرامات ہیں اور پانی پر چلنے کے قصے تو صحابہ کرام کے بھی تواریخ میں منقول ہیں اور کراماتِ صحابہ رضی اللہ عنہ تو مستقل ایک رسالہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھا گیا تھا، جس میں علاء بن الحضرمی صحابی رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں ایک جہاد میں جو کسریٰ سے ہوا تھا۔ سمندر میں گھوڑے ڈال دینا اور سمندر کو پار کر دینا جس میں زینیں بھی نہ بھیگیں، نقل کیا گیا ہے۔ عاملِ کسریٰ یہ دیکھ کر ایک کشتی میں بیٹھ کر یہ کہہ کر بھاگ گیا کہ ان سے ہم نہیں لڑ سکتے۔ اس واقعے کو ابن عبدالبر اور تاج الدین سبکی نے بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔
اس جھونپڑی میں ان بزرگ کے بیوی بچے بھی تھے۔ دینداروں کی بیویاں ڈیڑھ خصم ہوتی ہیں، یہ بیچارے اس فکر میں رہتے ہیں کہیں زیادتی نہ ہو جائے۔ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھا کر سر پر چڑھ جاتی ہیں، ان بزرگ کی بیوی نے رونا شروع کیا کہ ''عمر بھر کبھی کچھ کھایا نہیں، بغیر کھائے ہاتھی بن رہا ہے، اس کو تو تُو جانے تیرا خدا۔ مگر تُو نے جو یہ کہا کہ میں بیوی کے پاس کبھی نہیں گیا، یہ ستہ کی دھاڑ میں کہاں سے لائی؟'' انہوں نے ہر چند سمجھایا کہ ''یہ میری ہی اولاد ہے، میں نے ان کی اولاد ہونے سے انکار نہیں کیا۔'' مگر اس نے اتنا رونا چلانا شروع کیا کہ ''تو نے میرا منہ کالا کر دیا، وہ ساری دنیا میں جا کر کہے گا کہ پیر صاحب تو بیوی کے پاس گئے نہیں، یہ اولاد کہاں سے آ گئی؟'' ہر چند پیر صاحب نے سمجھانا چاہا مگر اس کی عقل میں نہیں آیا اور جتنا جتنا وہ کہتے وہ روتی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو ان پیر صاحب نے یوں کہا کہ میں نے ساری عمر خوب کھایا اللہ کا شکر ہے اور تیرے سے صحبت بھی ہمیشہ خوب کی، تجھے بھی معلوم ہے لیکن بات یہ ہے کہ میں نے بچپن میں ایک مولانا سے وعظ میں بات سنی تھی۔ وہ یہ کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے وہ دنیا نہیں دین بن جاتا ہے اور عبادت بن جاتا ہے اور ثواب بن جاتا ہے، اس وقت سے میں نے جب بھی کوئی چیز کھائی یا تو اس نیت سے کھائی کہ اس سے اللہ کی عبادت پر قوت حاصل ہو یا اس نیت سے کھائی کہ لانے والے اور کھلانے والے کا دل خوش ہو۔ اسی طرح سے میں شادی کے بعد سے تیرے پاس خوب گیا، لیکن یہ قصہ پہلے سے سنا ہوا تھا اس لیے جب بھی میں تیرے پاس گیا تیرا حق ادا کرنے کی نیت پہلے سے کر لی کہ اللہ نے بیوی کا حق رکھا ہے۔
میں نے تو یہ قصہ اپنے والد صاحب سے بار بار ایسے ہی سنا۔ مگر مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب دام مجدہم نے حضرت الحاج شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی نقشبندی بھوپالی کے جو ملفوظات جمع کیے ہیں اس کے صفحہ ۳۵۶ پر یہ قصہ دوسری نوع سے نقل کیا ہے۔ جو حسبِ ذیل ہے:
حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ ایک بزرگ دریا کے کنارے پر تھے، دوسرے

بزرگ دوسرے کنارے پر۔ ایک بزرگ نے جو متاہل اور صاحب اولاد تھے، اپنی بیوی سے کہا کہ ''کھانے کا ایک خوان لگا کر دریا کے دوسرے کنارے پر جو دوسرے بزرگ رہتے ہیں ان کے پاس لے جاؤ اور ان کو کھانا کھلا کر آؤ۔'' بیوی نے کہا کہ دریا گہرا ہے، میں اس کو کس طرح پار کر کے دوسرے کنارے جاؤں گی؟'' فرمایا کہ ''جب دریا میں قدم رکھنا تو میرا نام لے کر کہنا کہ اگر میرے اور میرے شوہر کے درمیان وہ تعلق ہو جو زن وشوہر میں ہوا کرتا ہے تو مجھے ڈبو دے ورنہ میں پار ہو جاؤں۔'' اس نے یہی کہا۔ یہ کہنا تھا کہ دریا پایاب ہو گیا اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں وہ دریا کے پار ہو گئیں۔ انہوں نے کھانے کا خوان ان دوسرے بزرگ کو پیش کیا انہوں نے اس کو اکیلے تناول فرمالیا (یعنی ختم کر دیا) جب واپس ہونے کا وقت ہوا تو ان کو فکر ہوئی کہ آنے کا وظیفہ تو مجھے معلوم ہو گیا، اب جاتے وقت کیا کہوں؟ ان بزرگ نے ان کی پریشانی دیکھی تو ان سے دریافت کیا، انہوں نے کہا کہ ''میں دریا کیسے پار کروں'' انہوں نے فرمایا کہ ''پہلی مرتبہ دریا کو کس طرح پار کیا تھا؟'' انہوں نے کہا کہ ''میرے شوہر نے مجھے یہ ہدایات کی تھی کہ میں اس طرح کہوں انہوں نے فرمایا کہ اب جائے تو میرا نام لے کر کہنا کہ ''اس نے ایک لقمہ بھی کھایا ہو تو میں ڈوب جاؤں ورنہ پار ہو جاؤں۔'' چنانچہ وہ پار ہو گئیں۔

اب انہوں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ آپ نے صاحب اولاد ہو کر خلاف واقعہ بات کیوں کہی؟ اور ان بزرگ نے آنکھوں کے سامنے پورا کھانا تناول کرنے کے باوجود ایک لقمہ بھی کھانے سے انکار کیوں کیا؟'' تو ان بزرگ نے جواب دیا کہ ''میں نے جو کچھ کیا امرِ الٰہی سے کیا اپنے نفس کی خواہش سے نہیں کیا اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ امرِ الٰہی سے کیا نفس کا اس میں کچھ حصہ نہ تھا اور دنیا جو کچھ کرتی ہے اور جس کا رواج ہے وہ نفس کے تقاضے کو پورا کرنا ہے امرِ الٰہی پیش نظر نہیں ہوتا، اس لیے دنیا جس کو ازدواجی تعلق اور شکم پُری اور نا و نوش سمجھتی ہے، ہم دونوں میں سے کوئی اس کا مرتکب نہیں ہوا۔''

لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ واقعہ وہ پہلا ہو۔ اس قسم کے واقعات متعدد ہو سکتے ہیں۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس قسم کے واقعات پانی پر چلنا، دریا میں گھوڑوں کا اتار دینا مشہور ہیں۔

یہاں تک پہنچا تھا کہ عصر کے بعد کی مجلس میں شاہ علم اللہ صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے حالات سنائے جا رہے تھے۔ اس میں ایک قصہ کان میں پڑا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ شاہ علم اللہ صاحب نے حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ فرمایا کہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں ایک نہر حائل تھی، اس کے قریب پہنچتے ہی اچانک اس میں صاف راستہ بن گیا۔ حضرت خواجہ صاحب نے یہ دیکھ کر فرمایا ''ھٰذَا مَکْرُ اللّٰہِ ھٰذَا مَکْرُ اللّٰہِ''۔ اس کے بعد انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ ''یہ نہر اسی حالت میں ہو جائے بندہ لوٹ جائے گا، یا کوئی دوسرا

راستہ اختیار کرلے گا لیکن تیری اس آزمائش سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔''

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ جب سلطان العارفین کو کرامات سے اس درجہ خوف اور گریز تھا اور خدا کی شانِ بے نیازی سے وہ اس قدر ترساں ولرزاں رہتے تھے تو دوسرے کس شمار میں ہیں۔ طالبِ حق کو چاہیے کہ اللہ جل شانہٗ کے سامنے حضور در حضور کے سوا کسی اور چیز کے طلب گار نہ ہو''کُلُّ مَا شَغَلَکَ عَنِ اللّٰہ فَھُوَ صنمک''جو چیز تمہیں اللہ سے مشغول کردے وہی تمہارا بت ہے۔ فقط

اس قصہ پر مجھے میرے حضرت، میرے محسن، میرے ماوئی، میرے ملجا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا ایک عجیب واقعہ یاد آیا۔ میرے جملہ اکابر کے یہاں تصرفات کی کوئی وقعت کبھی نہیں ہوئی، بلکہ ان کے روکنے کی کوشش ہوئی۔ میرے ایک مخلص دوست، جو عمر میں مجھ سے بہت بڑے مولوی حافظ عبدالرحمٰن صاحب گنگوہی میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بہت خاص شاگردوں میں تھے اور یہ بہت بڑی پارٹی تھی بیس پچیس لڑکوں کی جو عربی پڑھتے تھے، فارسی اور قرآن پڑھنے والے تو سو سے زائد تھے، یہ گنگوہ میں والد صاحب سے پڑھا کرتے تھے۔ جب ۲۸ھ میں میرے والد صاحب قدس سرہٗ مستقل قیام کے ارادے سے مظاہر میں آگئے تو یہ سب خدام بھی آگئے اور علوم کی تکمیل ان سب کی مظاہر میں ہوئی اور پھر علوم ظاہریہ کی تکمیل کے بعد یہ سب میرے حضرت مرشدی مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت بھی ہوئے۔ ان میں سے مولوی عبدالرحمٰن صاحب شملہ کے قریب کسولی ایک جگہ ہے وہاں کے امام ہوگئے اور بڑے اونچے اونچے حالات خطوط میں لکھا کرتے تھے اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی ڈاک بھی میں ہی لکھتا تھا اس لیے دوستوں کے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن مرحوم کا، اللہ تعالیٰ ان کو بہت بلند درجات عطا فرماوے، ایک بہت ہی طویل عجیب خط لکھا جس میں اپنے بہت سے مکاشفات، تصرفات، خوارِق بہت ہی لمبے لکھے تھے اور میں حضرت قدس سرہٗ کو خط سنا رہا تھا اور باغ باغ ہو رہا تھا کہ لونڈا چوتھے آسمان پر پہنچ گیا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب خط کے جواب میں میرے حضرت قدس سرہٗ نے یہ لکھوایا کہ فرائض اور نوافل مسنونہ کے سوائے جملہ نوافل، جملہ اذکار واوراد ایک قلم موقوف رکھیں۔'' میں بالکل حیرت میں رہ گیا کہ یہ کیا ہوا؟

اور بھی متعدد قصے، ہمارے اکابر کے اس قسم کے پیش آئے۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہ قدس سرہٗ کے متعدد خطوط میں بھی جب خوارق اور تصرفات یا مکاشفات ہوتے تھے تو میرے حضرت بجائے حوصلہ افزائی کے اس قسم کے الفاظ لکھوایا کرتے تھے: ''ان چیزوں کی طرف التفات ہرگز نہ کریں کہ یہ ترقی سے مانع ہیں۔''

ہر نیکی صدقہ ہے بیوی سے صحبت بھی صدقہ ہے:

میں نے مولانا رئیس الاحرار صاحب سے یہ بھی کہا کہ بچپن میں اس قسم کے قصے، کہانیوں کے ذیل میں سنے جاتے تھے، یا والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اسباق میں سناتے تھے کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اسباق میں قصے سنانے کا معمول ہو گیا تھا، جس کا ایک واقعہ ان حالات میں فتح القدیر کے سلسلے میں بھی آوے گا لیکن جب مشکوٰۃ شریف پڑھانے کی نوبت آئی تو یہ مضمون حدیث پاک میں تشریح سے ملا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے جو مشکوٰۃ شریف کے باب صلوٰۃ الضحیٰ میں منقول ہے کہ آدمی میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، جب آدمی صبح کو صحیح و سالم تندرست اٹھتا ہے تو ہر جوڑ کی صحت و سلامتی کے بدلے اس کے ذمہ ایک صدقہ (شکرانہ) واجب ہوتا ہے ایک دفعہ ''سبحان اللہ'' کہنا ایک صدقہ ہے، ''الحمدللہ'' کہنا صدقہ ہے، لاالٰہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے، اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، راستہ میں سے کوئی تکلیف دہ چیز کانٹا وغیرہ ہٹا دینا صدقہ ہے، آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرے یہ بھی صدقہ ہے اور دو رکعت چاشت کی نماز ان سارے ۳۶۰ صدقوں کا قائم مقام ہے (اس لیے کہ نماز میں ہر جوڑ سے کام پڑتا ہے، اس لیے نماز کی دو رکعت سب کے قائم مقام ہو جاتی ہے) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا، یارسول اللہ! آدمی اپنی بیوی سے شہوت پوری کرتا ہے، اس میں بھی صدقہ ہے؟ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اللہ جل شانہٗ بہت ہی درجاتِ عالیہ اپنی اور ان کی شایانِ شان عطا فرماوے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا ذرا سی بات پر دریافت کر کے امت کے لیے بہت کچھ ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اشکال پر یوں فرمایا کہ اگر اس پانی کو بے محل رکھے یعنی حرام کاری کرے تو کیا گناہ نہیں ہوگا؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا، ضرور ہوگا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر یعنی اگر حرام سے بچنے کی نیت سے اپنی بیوی سے صحبت کرے تو کیوں ثواب نہ ہو''

اس کی تائید بہت سی روایات اور مضامین سے بھی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کا لطف واحسان اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برکتیں تو لَا تَعُدّ وَ لَا تُحصٰی ہیں مگر ہم لوگ اپنی ناقدری سے ان قیمتی جواہرات اور موتیوں کو پاؤں سے روندتے ہیں، ان کی طرف التفات نہ کریں تو اپنا ہی نقصان ہے:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اخلاص سے آگ لینے جانے میں بھی پیمبری مل جاتی ہے۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مشہور مقولہ جو سینکڑوں دفعہ سنا ہوگا کہ ''اتباع سنت کے ساتھ اتباع کی نیت سے بیت الخلاء

میں جانا خلافِ سنت نفلیں پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔'' یہی وہ چیز ہے جس سے میں نے اس مضمون کی ابتداء کی تھی۔

تنبیہ

صاحبزادوں کی تربیت کے لیے درخواست:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق میں نے جو اپنی ابتدائی لڑائی لکھی اور بہت سخت تھی، بڑی ناشکری ہوگی اگر اس کا تکملہ اور منتہا نہ لکھوں آخر میں تو مرحوم کو حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ علیہ کی برکت سے اتنی محبت ہوگئی تھی جس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ مولانا مرحوم مستقل میرے پاس قیام پر اصرار فرماتے رہے۔ مولانا نے ازراہِ محبت یہ بھی اصرار کیا کہ وہ اپنے چھوٹے لڑکوں کو میری تربیت میں رکھیں، میں نے باوجود ان کی شفقت ومحبت واصرار کے معذرت کر دی۔ انہوں نے حضرت اقدس سیدی ومولائی شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے اصرار بہت زور سے کرایا تو میں نے حضرت سے کہا کہ یہ رئیس الاحرار کے صاحبزادے ہیں، میرا ان کا جوڑ نہیں کھانے کا۔ مولانا مرحوم نے کہا کہ تیری ساری شرائط منظور ہوں گی اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے ضامن ہوں گے، تو قرعۂ فال عزیز گرامی قدر ومنزلت مولوی رئیس الرحمٰن ناظم مدرسہ والی مسجد خالصہ کالج لائلپور کے نام نکلا کہ ان کی تعلیم اس وقت ایسی تھی کہ میرے پاس جوڑ کھا سکتی تھی، میں نے چار شرائط لگائیں۔

(۱)......اخبار دیکھنے کی بالکل اجازت نہیں ہوگی۔ اگر کوئی شکایت کسی وقت اخبار دیکھنے کی مجھ تک پہنچی تو سلام علیک۔

(۲)......کسی جلسے میں جانے کی اجازت نہ ہوگی، چاہے ابا جان کی تقریر ہو چاہے شاہ بخاری کی، چاہے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی، چاہے اس تقریر میں میں خود بھی شریک ہوں، چاہے میں کسی لحاظ ملاحظہ سے اجازت بھی دے دوں۔

مولانا مرحوم نے ان دونوں شرائط کو بہت ہی بشاشت سے قبول فرمایا اور فرمایا کہ میری اور شاہ جی کی تقریر میں جانے کی ہرگز اجازت نہیں، سیاست ہمارے گھر کی لونڈیاں ہے، ہم اس سے نمٹنے کے بعد سیاست دو مہینے میں سکھلا دیں گے۔

(۳)......تیسری شرط یہ رکھی کہ مدرسہ سے بغیر اجازت باہر نکلنا نہ ہوگا۔

(۴)......چوتھی شرط یہ کہ طلبہ سے تعلقات نہ رکھنے ہوں گے نہ دوستی کے، نہ دشمنی کے، نہ محبت کے، نہ مخالفت کے۔

عزیز موصوف کو اللہ بہت ہی جزائے خیر دے، میں ہمیشہ اس کی اس ادا کا ممنون رہوں گا کہ پہلی دو شرطوں پر تو اس نے میری امید سے بہت زیادہ عمل کر کے دکھلا دیا، حتی کہ ایک دو سال بعد جب میں نے مَضَرَّت نہ سمجھ کر اکابرِ ثلاثہ مذکور کی تقریر میں جانے کی اجازت بھی دی اور دل سے دی، اخلاص سے دی تب بھی عزیز موصوف نے کہہ دیا کہ اب تو وعدہ پورا کرنا ہی ہے۔

اسی کا وہ ثمرہ تھا کہ حضرت اقدس سیدی و مولائی حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی نگاہ میں بھی عزیز موصوف منظور نگاہ بن گیا اور حضرت اقدس سرہٗ کی طرف سے خلافت بیعت عطا ہوئی۔ اللہ جل شانہٗ اپنے فضل و کرم سے عزیز موصوف کو نیز عبدالجلیل کو بھی دونوں ایک ہی سال کے مظاہر کے فارغ التحصیل ہیں، یعنی ۶۰ ھ کے اور دونوں کو ہی حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دونوں سے اپنی مخلوق کی ہدایت کا کام لے۔

البتہ تیسری چوتھی شرط پر وہ پختگی نہ دکھا سکا جو پہلی دو شرطوں پر دکھلائی اگر میں یہ کہوں کہ اس میں میری ہی کمزوری کو دخل تھا تو بے محل نہ ہوگا۔

مولوی انیس الرحمٰن و مولوی عبدالجلیل صاحبان کا ذکر جمیل:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے اصرار میں کچھ عزیز عبدالجَلیل کو بھی دخل تھا جو حضرت قدس سرہٗ کا بھتیجا میرے ہی پاس رہتا تھا، مدرسہ میں پڑھتا تھا، بہت ہی یکسو قابل رشک زندگی گزارتا تھا، اس کی ایک ادا اس وقت کی مجھے بہت ہی پسند تھی کہ جب حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کی آمد پر حضرت کا قیام یا دعوت کسی جگہ ہوتی تو یہ کبھی کھانا کھائے بغیر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس میں نہیں جاتا تھا، میرے یہاں سے کھانے سے نمٹ کر جاتا تھا اور لوگوں کے اصرار پر بھی شدت سے انکار کر دیتا تھا کہ ''میں کھا کر آیا ہوں۔'' حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ بھی فرماتے اور میں تقاضے کرتا مگر یہ ہمیشہ ہی عذر کرتا کہ میں کھا کر آیا اور عذر جھوٹا نہیں ہوتا تھا قبل از وقت بھی گھر سے کھانا لے کر وہ کھا کر جاتا، بلکہ بعض دفعہ تو پہلے سے دعوت کرنے والوں کو بھی یہ کہہ کر عذر کر دیتا تھا کہ اس وقت آنے میں سبق کا حرج ہوگا یا مطالعہ کا حرج ہوگا۔

☆......☆......☆

باب دوم

درس وتدریس اور مظاہر علوم وتالیفات:

اس ناکارہ کی پیدائش ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ کی شب میں رات کو ۱۱ بجے تراویح کے بعد ہوئی، جیسا کہ معروف ہے اس سیہ کار کا نسب نامہ مع اپنی ساری شاخوں کے اور سارے شجرۂ خاندان کے میری تاریخِ کبیر میں بہت مفصل مشرح موجود ہے، مگر تیس برس سے پہلے پہلے کے تو سارے بچے کچے اس میں موجود ہوں گے، اس کے بعد کچھ مشاغل اور کچھ آنکھوں کی مجبوری سے اب بیس پچیس سال سے اس کا سلسلہ چھوٹ گیا ورنہ وہ بہت مفصل ہے کوئی دیکھنا چاہے تو شوق سے دیکھ لے۔ نیز اس کا کچھ حصہ حالات مشائخ کاندھلہ میں مولوی احتشام صاحب بھی شائع کر چکے ہیں۔

ڈھائی برس کی عمر تک یہ ناکارہ کاندھلہ رہا۔ سنا ہے کہ اس قدر نالائق تھا کہ میرا کھیل توڑ پھوڑ تھا، میری نانی میرے لیے بہت سے برتن ڈول چھوٹی موٹی مٹی کی پیالیاں جو اس زمانے میں بہت کثرت سے کمہاریاں بنایا کرتی تھیں اور گھروں میں بچوں کو کھیلنے کے واسطے قیمتاً دے جایا کرتی تھیں، جس مکان میں اس ناکارہ کی پیدائش ہوئی تھی اس میں ایک چبوترہ بہت اونچا تھا جو اب تک خوب یاد ہے، یہ ناکارہ اس چبوترے کے اوپر بیٹھ کر ان پیالیوں اور ڈول وغیرہ کو زور سے نیچے پھینکتا اور جب وہ ٹوٹ جاتیں تو خوب خوش ہوتا اور جب نہ ٹوٹتیں تو بچوں کی طرح نیچے اتر کر بڑی مشقت سے اس کو اوپر لے جا کر پھر نیچے پھینکتا۔ سنا ہے کہ میری والدہ نور اللہ مرقدہا میری اس ناپاک حرکت پر مجھے ڈانٹا کرتیں تو میری نانی مرحومہ میری والدہ پر خفا ہوتیں کہ میری زندگی میں اگر تو نے میرے بچے کو کچھ کہا تو تیری خیر نہیں جب اس کا دل برتن پھوڑ کر خوش ہوتا ہے تو مجھے تو اس کی خوشی چاہیے۔

ڈھائی برس کی عمر میں گنگوہ حاضری ہوئی تو وہاں حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کے سب خدام کے یہاں والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وجہ سے لاڈ ہی لاڈ اور پیار تھا۔ یہ منظر تو مجھے اب تک یاد ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے بھائی حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ واعلی اللہ مراتبہٗ اس سیہ کار کو اپنی گردن پر دن بھر بٹھائے رکھتے ایک ٹانگ سینے کے ایک طرف دوسری ٹانگ دوسری طرف لٹکائے ہوئے میں گردن پر سوار رہتا، وہ اسی حالت میں اپنے کام میں مشغول رہتے، بازار جاتے یا کسی کام کو جاتے تب بھی میں ان کی گردن پر سوار رہتا، نماز کے وقت البتہ اتار دیتے تھے۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ ۲۰ھ میں گنگوہ حاضر ہوئے تھے اور اوائل ۲۴ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد مدینہ منورہ واپس

چلے گئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی خود نوشت سوانح نقشِ حیات کے صفحہ ۶۵ پر اسی طرح موجود ہے، مگر میری تاریخ کبیر میں ۲۶ھ میں ان کا ہندوستان ہونا مذکور ہے۔

ہمارے خاندان میں عموماً چوتھے یا پانچویں برس بچہ پڑھنے بیٹھ جاتا تھا مگر میں سات برس کی عمر یا اس سے زائد پر بھی پڑھنے نہیں بیٹھا۔ میری دادی صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ میرے والد صاحب پر خوب خفا ہوتیں، مجھے ان کی خفگی کے الفاظ بھی خوب یاد ہیں کہ ''یحییٰ! اولاد کی محبت سب کو ہوا کرے مگر اولاد کی محبت میں اندھے نہیں ہو جایا کرتے۔''

میرے والد صاحب دودھ پینے کے زمانے میں پاؤ پارہ یاد کر چکے تھے اور سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر چکے تھے اور اس کے ساتھ میرے دادا سے مخفی اپنے چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ سے فارسی سکندر نامہ، زلیخا، بوستان وغیرہ سب کو پڑھ چکے تھے اور میرے دادا صاحب نے ان کو سات برس کی عمر میں یوں کہہ دیا تھا کہ ''ایک قرآن روز پڑھ لیا کرو باقی سارا دن چھٹی، چھ ماہ کے بعد عربی شروع کروائیں گے۔'' میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز پڑھتے ہی اپنی چھت پر بیٹھتا، وہ اپنی نانی صاحبہ کے مکان کی چھت بھی دکھلایا کرتے اور ظہر سے پہلے قرآن شریف ختم کر کے پھر اتر کر روٹی کھایا کرتے تھا اور شام کو اپنے شوق سے ابتدائی عربی شروع کر دی تھی۔ اس لیے میری دادی صاحبہ کو اور بھی زیادہ غصہ آتا وہ فرماتیں کہ ''یہ بیل آسمان پر جا رہا ہے تو آخر اس سے کیا کرائے گا؟ جوتے گٹھوائے گا، چمار بناوے گا، پاخانہ کمواوے گا، بھنگی بناوے گا، آخر تو نے کیا سوچ رکھا ہے؟'' ان کی شدید خفگی مجھے خوب یاد ہے اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک جواب کہ ''آیا جو دن کھیلنے کو ملیں کھیلنے دو، ایک دفعہ جب اوکھل میں سر دے گا تو پھر قبر میں جاتے ہوئے نکلے گا۔'' اس جواب پر بہت ناراض ہوتیں کہ ''آخر اوکھل میں سر دینے کا کوئی وقت آوے گا یا مرنے کے بعد دے گا؟'' مجھ پر براہِ راست بھی خفا ہوتیں کہ ''فلاں بچے کے اتنے سپارے ہو گئے فلاں کے اتنے ہو گئے، تیرے کتنے ہوئے اندھے؟''

ساتواں یا آٹھواں سال تھا۔ گنگوہ میں جناب الحاج ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مظفر نگری جو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وہ اور ان کے اہلیہ عاشق زار۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے لیے بڑے اہتمام سے پلاؤ پکایا کرتے تھے، مجھے بھی خوب یاد ہے، ان کا پکانا بھی اور حضرت اقدس گنگوہی قدس سرہٗ کے ساتھ کھانا بھی معلوم نہیں روزانہ ایک مرغ تو ضرور کٹتا تھا اور اس میں نہ معلوم کتنی چیزیں پڑتی تھیں، مرغے بھی ڈاکٹر صاحب نے بہت پال رکھے تھے اور ان کو بھی نہ معلوم کیا کیا کھلایا جاتا تھا۔

انہی ڈاکٹر صاحب کے متعلق تذکرۃ الرشید میں ایک قصہ یاد پڑتا ہے بچپن کا پڑھا ہوا ہے کہ

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ ڈاکٹر صاحب یہاں کیا کرتے ہیں؟ مطلب یہ تھا کہ ذکر شغل سلوکی مشاغل جس میں خانقاہ کے سارے خدام ہر وقت مشغول رہتے تھے، ڈاکٹر صاحب ان میں زیادہ مشغول نہ رہتے تھے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بے ساختہ فرمایا کہ ''مجھے پلاؤ کھلانے کے لیے۔''

ان کی اہلیہ محترمہ سے ہمارا قاعدہ بغدادی شروع ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کا تو ہمیں کچھ یاد نہیں، دو باتیں ضرور یاد ہیں، ابا جان کی یہاں کتابوں کی دکان تھی، قاعدہ بغدادی کی گڈی ہمیں معلوم تھی، تین چار دن میں پہلا پھاڑ کر دوسرا لے آیا کرتے تھے، دوسری بات یہ خوب یاد ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی اہلیہ مرحومہ، اگر یہ ناکارہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتا تھا تو اس پلاؤ میں سے میرا حصہ ضرور نکالتے تھے۔ اس کے علاوہ بادام اور کشمش اور کھویا، یہ تین چیزیں بھی خوب یاد ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دن بھر کھانے میں گزرتا تھا، یاد نہیں قاعدہ بغدادی کتنے دنوں میں پڑھایا نہیں پڑھا، اس کے بعد ہمارا سیپارہ لگ گیا۔

کسی مکتب میں یا کسی با قاعدہ حافظ صاحب کے پاس تو پڑھنے کی نوبت کبھی آئی نہیں، اس واسطے کہ آپ بیتی نمبر۱ میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے یہاں پڑھنے سے زیادہ اہم اختلاط سے حفاظت تھی۔ اسی واسطے قرآن پاک اب تک بھی فارسی میں پڑھ رہا ہوں۔

میرے ابا جان کے خاص شاگردوں میں ایک صاحب حافظ ابراہیم صاحب رسولپوری بھی تھے جو گنگوہ میں ابا جان کے پاس پڑھا کرتے تھے، قرآن اچھا پڑھتے تھے حافظ تھے، ایک دن کے واسطے ہماری شاگردی ان حافظ صاحب کے حوالہ ہوئی اور سر منڈواتے ہی اولے پڑ گئے۔ ہوا یہ کہ اس دن میری اپنی والدہ صاحبہ سے لڑائی ہوگئی، ایک پیسہ کہیں سے آ گیا تھا، اس میں ایک طرف تو سکہ تھا دوسری طرف تلوار کا نشان تھا، مجھے بہت اچھا لگتا تھا، میں نے والدہ مرحومہ نور اللہ مرقدہا کے پاس امانت رکھوایا تھا، ان کو کچھ اہمیت نہ ہوئی، انہوں نے خرچ کر ڈالا، ایک دن پہلے اس سیہ کار نے ان سے مانگا، انہوں نے فرمایا کہ وہ خرچ ہوگیا، کہیں سے آوے گا تو دے دوں گی، اس زمانے میں اس قسم کے اکثر سکے آتے رہتے تھے، اپنے غصہ سے تو یہ سیہ کار اب تک بھی عاجز ہے۔ غصہ میں رات کو روٹی نہ کھائی، صبح کو والدہ صاحبہ نے جدید استاد حافظ صاحب مرحوم سے کہلوا دیا کہ اس نے رات غصہ میں روٹی نہیں کھائی۔ حافظ صاحب مرحوم نے فرمایا کہ جا روٹی کھا کر آ، میں نے کہا کہ ''جی میرا پیسہ مل جاوے گا تو کھالوں گا۔'' انہوں نے فرمایا، ''اچھا تو کان پکڑ لے اور جب روٹی کھاوے گا چھوڑ دیجیے۔'' پکڑ لیے، جب حافظ صاحب سبق کے لیے گئے جو آدھ پون گھنٹے کا تھا اس وقت چھوڑ دیئے، جب دور سے آتے دیکھا تب پکڑ لیے، دو ایک گھنٹہ کے بعد پھر وہ

ابا جان کے پاس سبق کے لیے گئے پھر چھوڑ دیئے، پھر وہ ظہر کی نماز کے لیے تشریف لے گئے پھر چھوڑ دیئے، عصر کی نماز تک یہی قصہ رہا۔ رات بھی روٹی نہ کھائی تھی اس واسطے ماں پر جو گزرنی چاہیے تھے گزری۔ دوپہر کو والدہ کو معلوم ہوا کہ حافظ جی نے چھٹی بند کر رکھی ہے جب تک روٹی نہ کھاوے گا چھٹی نہیں ملے گی اور میری ایک درخواست تھی کہ "تلوار کا پیسہ مل جاوے تو کھالوں گا۔"

عصر کے بعد جب ابا جان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو ہماری یہ ایک روزہ شاگردی ختم ہوگئی۔ ابا جان نے حافظ صاحب کو فرمایا کہ "حافظ جی تربیت کے لیے تو میں خود کافی ہوں، آپ کے سپرد تو اس وجہ سے کیا تھا کہ آپ کے سامنے بیٹھ کر یہ یاد کرتا رہے گا۔"

ہماری شاگردی تو اس وقت سے ختم ہوگئی، مگر یہ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرماوے، بعد میں بہت اصرار سے اس سیہ کار سے بیعت بھی ہوگئے۔ جب وہ میرے جوتے کو ہاتھ لگاتے تو میں ان سے کہتا "ایسا ہرگز نہ کیجئے آپ میرے استاد ہیں۔" وہ مرحوم بہت ہی شرمندہ ہوتے۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو اس حرکت سے روکنے کے لیے جواباً ان کے جوتے کو سیدھا کر کے رکھ دیا، اس پر وہ بیچارے بہت ہی پشیمان ہوئے۔ میں نے کہا کہ "جب آپ میرے جوتے کو ہاتھ لگادیں گے اس کا ردعمل میں یہی کروں گا۔"

حافظ صاحب کی ولادت تقریباً ۱۳۰۲ھ میں ہے اور وصال ۵ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۳ اگست، ۱۹۳۷ء شبِ جمعہ۔ حافظ صاحب نے رائپور کے مدرسہ میں قرآن پاک حفظ کیا اور وہیں اردو وغیرہ پڑھی۔

اس کے علاوہ ایک عرصہ کے بعد عالی جناب حافظ محمد صالح صاحب نکور در ضلع جالندھر کے اصل رہنے والے تھے، جو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے، نہایت بزرگ، نہایت نیک، نہایت متواضع، نہایت خاشع خاضع، بڑی کثرت سے نفلیں پڑھنے والے، وہ جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تبرکاً میرے والد صاحب نے مجھے ان کی شاگردی میں بھی حصول برکت کے لیے چند روز رکھا، جب تک حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا گنگوہ میں قیام رہا۔

اس کے علاوہ جب بھی کاندھلہ جانا ہوتا تو ہمارے کاندھلہ کے مشہور معروف حافظ، استاذ الکل حافظ رحیم بخش صاحب ابن حافظ خدا بخش عرف "حافظ منگتو" میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے معاصرین اور ان سے چھوٹی پیڑھی میرے بعد تک کی ساری ہی حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد ہیں۔ وہ قوم کے نیل گر تھے اور نیل کا کام ان کے گھر میں ہوتا تھا۔ مرحوم چھٹی لینا بیماری یا کسی اور حرج میں جانتے ہی نہ تھے۔ ایک دفعہ بہت شدید بیماری میں چند روز کے لیے جب اٹھنے

کے قابل نہ تھے، گھر پر رہے تو ہم شاگردوں کو مکان ہی میں بلالیا تھا، وہیں پڑے پڑے پڑھاتے تھے۔ بہت ہی بزرگ اور نیک تھے۔ چائے وغیرہ تو اس زمانے میں کاندھلہ میں دوا کے لیے تلاش سے بھی نہ ملتی تھی اس لیے یہ مد تو تھا ہی نہیں، اپنے محلّہ کی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کے بعد اور وظائف پڑھتے ہوئے کاندھلہ کے مشہور مدرسہ قرآنیہ میں تشریف لاتے جو جامع مسجد کے بالکل مقابل تھا، آتے ہی پہلے جامع مسجد میں تشریف لے جاتے، اشراق کی نماز پڑھتے، نماز پڑھ کر مکتب میں آتے اور متسابقین جس میں یہ ناکارہ بھی کبھی ہوتا جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوجاتے اور حافظ صاحب کے سلام پھیرتے ہی جہاں انہوں نے جوتے پہنے دوتین ایک دم سبق سنانا شروع کردیتے تھے۔ مرحوم جو پہلے بسم اللہ کردیتا اس کا شروع کردیتے باقی کو کہہ دیتے کہ ''چشت'' جو ہمارے یہاں ڈانٹ کا ایک فقرہ ہے۔ اس مکتب میں ایک انار کا چھوٹا سا درخت تھا۔ گرمی سردی ہر موسم میں جب اس انار کے درخت کی جڑ میں دھوپ آجاتی تو حافظ صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے، نہایت اطمینان سے جامع مسجد تشریف لے جاتے، تجدید وضو فرماتے، چاشت کی نماز بہت اطمینان سے پڑھتے اور ان کے اٹھتے ہی سارے مکتب کے بچے اپنے اپنے قرآن جزدان میں بند کردیتے مگر کیا مجال تھی کہ کوئی لڑکا پہلے جاسکے، حالانکہ اگر دوچار بھی چلے جاتے تو کیا پتہ چلتا۔ مگر ایک بچے کی بھی ہمت نہ ہوتی، چاہے کتنا چھوٹا ہو کہ حافظ صاحب سے پہلے جاسکے۔ چاشت کی نماز پڑھ کر حافظ صاحب مکتب میں آتے اور جوتا نکالنے سے پہلے ہی کسی لڑکے سے کہتے کہ ''لا میری لنگی اٹھادے۔'' یہ اعلان چھٹی کا تھا۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فرمانا اور لڑکوں میں ایک دم بھگدڑ مچنا، اخیر میں حافظ صاحب ہی تنہا مدرسہ سے نکلا کرتے۔ حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مارتے کم تھے، مگر ان کا رعب اس قدر سخت تھا کہ اب تک بھی اس کے تصور سے خوف سا آجاتا ہے۔ دوسرے مدرس دوم حافظ عبدالسبحان مرحوم تھے۔ وہ اتنا سخت مارتے تھے کہ ان کے درجہ میں ہر وقت کہرام مچا رہتا۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی پہلی تنبیہ یہ ہوا کرتی ''یاد نہیں کرتا سبحان کے پاس بھیج دوں گا۔''

یہ ناکارہ جب کاندھلہ دو چار دن کو جاتا حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شاگردی میں داخل ہوجاتا، شاید دوڈھائی سپارے پوری مقدار مختلف سالوں کی ہوگی۔ حافظ صاحب کو میرے دادا نور اللہ مرقدہٗ نے اس مدرسہ میں دوروپے پر مدرس رکھا تھا، پندرہ بیس برس بعد معے ہوگئے تھے۔ ہمارے کاندھلہ کے اکابر جب علی گڑھ سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے بہت ہی کوشش کی کہ حافظ صاحب کو کالج میں قرآن کا مدرس بنا کر ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۱۰۰ تک لے جایا جاوے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ایسے کا بٹھایا ہوا ہوں کہ ۷۰۰ پر بھی نہیں جاسکتا۔

سنا گیا ہے کہ حافظ صاحب مرحوم پہلے پہلوانی کرتے تھے اور کسی پہلوان کے پچھاڑنے کے لیے میرے دادا کے پاس تعویذ لینے گئے۔ ان کو پسند آگئے، انہوں نے حال دریافت کیا۔ ''کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟'' نیل گر ہوں!، پہلوانی کرتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا، ''کچھ اور بھی آتا ہے؟'' انہوں نے کہا قرآن حفظ کیا ہے۔ دادا نے قرآن سنا اور اس کے بعد پہلوانی سے توبہ کرائی، بیعت کیا اور فرمایا کہ ۲ روپے مہینہ میں دے دوں گا تم بچوں کو قرآن پڑھایا کرو اور نیل گروں کی مسجد میں ان کو بٹھا کر محلّہ کے بچوں کو سپرد کر دیا۔ دادا صاحب کے جانے کے بعد شرفائے قصبہ نے اس میں اپنی توہین سمجھی کہ ان کے بچے نیل گر سے پڑھیں، انہوں نے اپنے بچوں کو اٹھالیا، چند ماہ بعد جب دادا صاحب دوبارہ آئے اور حال معلوم کیا تو بہت ناراض ہوئے اور ان کے لیے جامع مسجد کے سامنے منہدمہ مسجد میں مدرسہ بنا دیا۔

میرے دادا صاحب کے انتقال کے بعد میرے تایا صاحب مولانا محمد صاحب سے بھی نیاز مندانہ تعلق رہا اور میرے چچا تو ان کے شاگرد تھے، میں نے بارہا دیکھا کہ چچا جان جب کاندھلہ جاتے تو حافظ صاحب کی بہت ادب سے اہتمام سے دست بوسی کرتے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حکیم صدیق احمد صاحب کاندھلوی یکے از خلفاء قطب عالم گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے قرآن شریف کا لفظی ترجمہ حرفاً حرفاً پڑھا۔

مشہور ہے کہ حافظ صاحب کی چالیس سال تک تکبیرِ تحریمہ ایک دفعہ کے علاوہ فوت نہیں ہوئی۔ ۱۳۴۷ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ان کے حافظ کردہ ۴۰۰ کے قریب ہیں اور کیرانہ کے راستے میں اپنی باغیچی میں مدفون ہیں۔ (کذا فی مکتوب الحاج صوفی افتخار الحسن کاندھلوی) حضرت حافظ صاحب کو فارسی بہت اچھی آتی تھی۔ اپنے صاحبزادوں کو خود فارسی پڑھایا کرتے تھے۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ کسی سے قرآن پاک پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ نقل نظامی قرآن جس میں میں نے پڑھا اور اس کا ہر صفحہ آیت پر ختم ہوتا ہے ایک صفحہ کے متعلق میرے والد صاحب کا حکم یہ تھا کہ ''اس کو ۱۰۰ دفعہ پڑھ دو پھر چھوڑ دو، یاد ہونے کے ذمہ دار نہیں۔'' کبھی سو ۱۰۰ دفعہ پڑھا ہو تو یہ بھی اندازہ ہو کہ کتنی دیر میں سو دفعہ ہوتا ہے۔ اپنی ایک حماقت ساری عمر یاد رہے گی کہ دس پندرہ منٹ میں آکر کہہ دیتا کہ سو دفعہ ہو گیا اور اپنے کلام کو موثق اور مؤکد بنانے کے واسطے یا اپنی حماقت کے اظہار کے واسطے خود ہی کہہ دیتا کہ آج بالکل صحیح صحیح ہوا کل تو کچھ گڑبڑ بھی تھی اور ابا جان کا یہ مقولہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا کہ ''آج کا بالکل صحیح صحیح کل تو معلوم ہو جاوے گا'' سمجھ تو اب تک بھی نصیب نہ ہوئی اس وقت تو عمر بھی سمجھ کی نہ تھی کبھی ابا جان کے اس ارشاد کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آیا کہ آج کا بالکل صحیح کل کو معلوم ہو جاوے گا۔ سارا قرآن پاک اسی طرح پڑھ کر ختم کر دیا اور حافظ ہو گئے۔

میری دادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا حافظہ تھیں اور بہت اچھا یاد تھا۔ سال بھر کا معمول خانگی مشاغل، کھانے پکانے کے علاوہ ایک منزل روزانہ کا تھا اور رمضان میں چالیس پارے روزانہ کا تھا۔ ان کے کچھ حالات تذکرۃ الخلیل میں بھی ہیں۔ جب وہ گنگوہ میں ہوتیں تو میرا سبق ان کے ذمہ تھا، وہ نہ ہوتیں تو والد صاحب کبھی اپنے سامنے کسی بچے کو بٹھا کر سنوا دیتے۔ جن میں میرے مخلص دوست مولوی عبدالرحمٰن صاحب گنگوہی جن کا ذکر اس میں پہلے گزر چکا ہے یا میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے محبوب شاگرد مولوی سعید مرحوم گنگوہی ہوا کرتے تھے اور گویا قرآن شریف ختم ہو، جانے کے بعد مولوی سعید مرحوم کے ذمہ میرا سپارہ سننا بھی تھا۔ اس میں ایک پارہ میں سو۱۰۰ غلطیاں معاف تھیں اور والد نور اللہ مرقدہٗ بھی کبھی سفر میں سنا کرتے تھے مگر اس میں تو جو یاد تھا وہ بھی بھول جاتا تھا۔

رمضان المبارک میں قرآن کا ابتدائی معمول:

قرآن شریف کی یاد تو کما حقہ، اب تک بھی نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ۳۸ھ سے ماہ مبارک میں ایک قرآن روزانہ پڑھنے کا معمول شروع میں ہوا تھا جو تقریباً ۸۰ھ تک رہا ہوگا، بلکہ اس کے بھی بعد تک۔ ابتدائی معمول یہ تھا کہ سوا پارہ جس کو عموماً حکیم اسحاق صاحب کی مسجد میں سنانے کی نوبت آتی تھی یا میرے حضرت نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ کے گھر میں، اس کو تراویح کے بعد شب میں قرآن پاک دیکھ کر اور اکثر ترجمہ کے ساتھ سحر تک چار (۴) پانچ (۵) دفعہ پڑھتا تھا، گرمیوں کی شب میں کچھ کم، سردیوں میں کچھ زائد۔ اس کے بعد تہجد میں اس کو دو مرتبہ اس کے بعد سحر کھانے کے بعد سے لے کر صبح کی نماز تک اور نماز کے بعد سونے تک ایک دفعہ اور پھر صبح کو سونے کے بعد اٹھ کر جو عموماً دس بجے ہوا کرتا تھا، چاشت کی نماز میں سردیوں میں ایک مرتبہ، گرمیوں میں دو دفعہ۔ اس کے بعد ظہر کی اذان سے پندرہ منٹ پہلے تک ایک یا دو مرتبہ دیکھ کر پھر ظہر کی سنتوں میں ابتداء دو مرتبہ، اول کی سنتوں میں ایک دفعہ اور آخر کی دو سنتوں میں دوسری دفعہ اور بعد میں ہر دو سنتوں میں ایک ہی مرتبہ رہ گیا۔ ظہر کے بعد دوستوں میں سے کسی کو ایک مرتبہ سنانا اور پھر عصر تک موسم کے اختلاف کی وجہ سے ایک یا دو دفعہ پڑھنا۔ عصر کے بعد کسی دوسرے اونچے آدمی کو سنانا۔ ابتداء حضرت کی حیات تک حافظ محمد حسین صاحب اجراڑوی کو، اس کے بعد دو تین سال تک مولوی اکبر علی صاحب مدرس مظاہر علوم کو، اس کے بعد بہت عرصہ تک مفتی محمد یحییٰ کو اور ان ہی کے ساتھ ان کے دونوں بھائی حکیم الیاس، مولوی عاقل بھی شریک ہونے لگے۔ مغرب کے بعد نفلوں میں ایک دفعہ پڑھنا اور نفلوں کے بعد تراویح تک ایک دفعہ پڑھنا۔ تراویح کے بعد یہ پارہ ختم ہو جاتا تھا اور اگلے کا نمبر شروع

ہو جاتا تھا۔ ۲۴ گھنٹے میں اس کی تشکیل ضروری تھی کہ ۳۰ پارے پورے ہو جائیں۔ اللہ کے انعام و فضل سے سالہا سال یہی معمول رہا، اخیر زمانے میں بیماریوں نے چھڑا دیا۔

اس زمانے کا ایک لطیفہ بھی یاد آ گیا، جو کئی سال تک بہت مشہور رہا۔ میرے عزیز مخلص دوست طیب رامپوری، میرے دوسرے مخلص مولوی عامر سلمہ کے والد، اس زمانے میں ان کی آمد و رفت بہت کثرت سے تھی اور چونکہ بہت مختصر وقت کے لیے آتے تھے اور سیاست کی خبریں بہت مختصر الفاظ میں جلدی جلدی سنا جاتے تھے، اس لیے ان کی آمد میں میرے یہاں کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ رمضان میں ۸۔۹ بجے صبح کو آئے مولوی نصیر سے کہا کہ کواڑ کھلوا دو۔ اس نے کہا رمضان ہے خود زنجیر کھڑ کھڑانے کا ارادہ کیا، اس نے منع بھی کیا اور یہ بھی کہا کہ ''یا تو وہ سو رہا ہوگا نیند خراب ہوگی اور اگر اٹھ گیا ہوگا تو نفلوں کی نیت باندھ لی ہوگی، کھڑ کھڑاتے رہو۔'' اس پر خفا ہو کر مدرسہ میں چلے گئے۔ راستہ میں مولوی منظور احمد خاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ملے، انہوں نے کہا، ''حکیم جی تم کہاں آ گئے؟ شیخ کے یہاں تو رمضان ہے۔'' اس پر کچھ سوچ پیدا ہوئی اور نصیر پر سے کچھ غصہ کم ہوا۔ اس کے بعد حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پہنچے، وہ ڈاک لکھوا رہے تھے، فرمایا ''حکیم جی کہاں آ گئے، شیخ کے یہاں تو رمضان ہے۔'' وہاں سے اٹھ کر مفتی محمود صاحب کے حجرے میں گئے، مفتی صاحب کا قیام اس زمانے میں مدرسہ قدیم ہی کے حجرہ میں تھا، مفتی جی نے بھی یہ فقرہ دہرا دیا۔ حکیم جی نے پوچھا ''آخر رمضان میں کوئی وقت بات کا ملاقات کا ہو سکتا ہے یا نہیں؟'' مفتی جی نے کہا تراویح کے بعد آدھ گھنٹہ۔ حکیم جی نے کہا مجھے تو رامپور واپس جانا ہے۔ تب مفتی جی نے کہا کہ ظہر کی نماز سے پندرہ منٹ پہلے تشریف لائیں گے اس وقت مل لینا ظہر کی نماز کے بعد گھر جاتے ہوئے راستے میں مل لینا وہ ظہر سے پہلے مسجد میں آئے تو میں نیت باندھ چکا، ظہر کی نماز کے بعد میں نے پھر سنتوں کی نیت باندھ لی، بڑی دیر تک انہوں نے انتظار کیا، مگر جب دیکھا کہ رکوع کا ذکر ہی نہیں، اس لیے کہ اس زمانے میں سنتوں میں دو دفعہ پارہ پڑھنے کا معمول تھا، وہ بڑی دیر انتظار دیکھ کر مٹر گشت میں چلے گئے، وہ واپس آئے تو میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر قرآن پاک سنانے میں مشغول ہو گیا تھا، وہ بہت کھٹ کھٹ کر کے اوپر چڑھے اور جاتے ہی بہت زور سے ''بھائی جی سلام علیکم، بات نہیں کرتا صرف ایک فقرہ کہوں گا، رمضان اللہ کے فضل سے ہمارے یہاں بھی آتا ہے مگر یوں بخار کی طرح کہیں نہیں آتا۔ سلام علیکم جا رہا ہوں، عید کے بعد ملوں گا۔'' میں نے کہا ''وعلیکم السلام'' اور پھر قرآن سنانے میں مشغول ہو گیا۔

بندہ کی ابتدائی فارسی:

۲۵ھ سے میری فارسی اردو اس حالت میں شروع ہوگئی کہ قرآن پاک تو گویا پڑھا بے پڑھا

برابر تھا، مگر ہم حافظوں میں شمار ہونے لگے۔ میں نے فارسی زیادہ تر اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے پڑھی۔ ان پر اس زمانے میں بزرگی کا بہت ہی غلبہ تھا، مجاہدات سلوک کا بہت زور تھا، خانقاہ قدوسیہ کے پیچھے ایک بہت مختصر آب چک تھی، اس میں ایک بوریے پر آنکھ بند کیے ہوئے دوزانون بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں سبق کے لیے جاتا تو قانون یہ تھا کہ ایک کتاب چچا کے سامنے کھول کر رکھ دیتے، ایک ساتھی میرا اور تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں، ہم دونوں دوسری کتاب میں پڑھتے۔ بیٹھنے کے بعد بسم اللہ کر کے سبق شروع کر دیتے، اگر اس میں ذرا دیر ہوتی تو چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ایک انگلی سے اپنے سامنے کی کتاب بند کر دیتے اور گویا تاخیر کے عتاب میں سبق بند، ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آتے اور کبھی دوبارہ شروع کرتے اور کتاب کھول کر دوبارہ ان کے سامنے رکھتے تو موج تھی کبھی پڑھا دیتے کبھی ''چشت'' فرما کر اٹھا دیتے۔ سبق میں اپنے ہی مطالعہ پر مدار تھا۔ معمولی غلطی پر ''چشت'' کہتے یا ''ہوں'' اور فحش غلطی پر پھر وہی ایک انگلی سے کتاب بند کر دیتے۔

اس سیہ کار میں اس زمانے میں بولنے کا مرض بہت زیادہ تھا، چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے مجھ سے فرمایا کہ ''اگر تو چھ ہفتے چپ رہے تو میں تجھے ولی کر دوں۔'' اس زمانے میں چھ ہفتے تو درکنار چھ دن بھی چپ رہنا مصیبت تھا۔ میں نے بڑے ہو کر نظام الدین می ایک مرتبہ ان کو یہ ارشاد یاد دلایا ان کو یاد آ گیا، میں نے کہا کہ ''آپ نے اس وقت میں چھ ہفتے کو فرمایا تھا۔ اب میں چھ ماہ کامل چپ رہ کر دکھلاؤں۔'' چچا جان نے فرمایا کہ ''وہ بات تو گئی، وہ تو اس وقت کی تھی۔''

اس زمانے میں چچا جان دن میں سارا دن مراقبہ کرتے، نہ معلوم کیا سوچا کرتے اور مغرب سے عشاء تک نفلیں پڑھتے۔ اس زمانے میں چچا جان کو جَو کی روٹی کا اتباع سنت میں کھانے کا شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ ہم نے بھی زور دکھلائے، تقریباً چھ ماہ چچا جان کا یہ دستور رہا۔ اس کے بعد کسی بیماری کی وجہ سے حکیم صاحب نے اس کو منع کر دیا، جس پر میرے والد صاحب نے بھی ان کو روک دیا اور وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ ورنہ تین چار روٹی جَو کی پکنا خوب یاد ہے اور چچا جان کے ساتھ اپنا کھانا بھی۔

گنگوہ سے سہارنپور میں آمد:

رجب ۲۸ھ میں یہ ناکارہ سہارنپور آ گیا، اس لیے کہ دو تین ماہ قبل میرے والد صاحب قدس سرہٗ مستقل قیام کے ارادے سے گنگوہ سے سہارنپور منتقل ہو گئے۔ دار العلوم کا جلسہ دستار بندی، اس میں تقریباً کتب خانہ کا بہت سا حصہ گنگوہ سے دیوبند منتقل ہوا تھا کہ اکابر دیوبند نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی تالیفات کی اشاعت کی وجہ سے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اصرار کیا تھا کہ اپنا کتب خانہ اور اپنی دکان دار العلوم کے جلسۂ دستار بندی میں لگا دیں۔ اس سے فراغ پر وہ سارا کتب خانہ دیوبند سے سہارنپور منتقل ہوا اور چونکہ جھگڑوں میں آیا اور دیوبند بھی جھگڑوں میں ہی گیا

تھا۔ اس لیے کتابیں خراب بہت ہوئیں۔ ہزاروں کتابوں کی سلائی ٹوٹی۔

سہارنپور آکر باقاعدہ عربی تعلیم شروع ہوئی اور اس سے پہلے ابتدائی عربی اور فارسی زیادہ تر چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے اور کم والد صاحب قدس سرہٗ سے پڑھنے کی نوبت آئی، لیکن سہارنپور آنے کے بعد باقاعدہ ہماری ایک مستقل جماعت بنی، جس کے دوسرے ساتھی میرے حضرت قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہ کے عزیز مظہر علی خاں راجو پوری تھے اور تیسرے ساتھی سید محفوظ علی گنگوہی جو بعد میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے سالے بن گئے تھے اور اس کے بعد دیوبند منتقل ہوگئے تھے۔ جب مرحوم کی ہمشیرہ کی شادی حضرت شاہ صاحب سے ہوگئی، اس وقت تک وہ سہارنپور ہی میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس مقیم رہے اور اس سے پہلے گنگوہ میں بھی میرے والد صاحب ہی کے پاس پڑھتے تھے۔ یہاں آکر باقاعدہ میرے ساتھی بن گئے تھے اور مستقل جماعت ہماری تین آدمیوں کی خصوصی جماعت شمار ہونے لگی۔ سید محفوظ صاحب کے دیوبند جانے کے بعد ہم دو ہی رہ گئے۔

صرف پڑھانے کا والد صاحب کا ایک خاص طریقہ تھا۔ وہ الفاظ لکھوا دیا کرتے تھے اور کچھ قواعد لکھوا دیتے تھے۔ مثلاً اجوف، ناقص وغیرہ کے۔ میں نے میزان منشعب معروف و متداول نہیں پڑھی۔ اس زمانے میں میرے ہی لیے غالباً ایک میزان منشعب خاص تصنیف ہوئی تھی جو دو دو ورق کی تھی آسی مدراسی پریس میں چھپی تھی اس میں میرے مقدر سے گردان بھی بجائے فَعَلَ یَفْعِلُ کے ضَرَبَ یَضْرِبُ کی تھی، میزان میں بھی وہی تھی منشعب میں بھی وہی تھی جو دو دو ورق کی تھی اسی مدراسی پریس میں چھپی تھی اس میں میرے مقدر سے بھی وہی تھی اور عمل میں بھی وہی اور اس کے بعد وہ ایسی کہیں گم ہوگئی کہ تلاش سے بھی نظر نہ پڑی۔

والد صاحب کا طرزِ تعلیم:

میرے والد صاحب کے یہاں پہلے قواعد زبانی یاد کرائے جاتے تھے اور اس کے بعد ان قواعد کا اجراء تختی یا ردی کاغذوں پر کرایا جاتا تھا، اس کے بعد پھر مجھے یاد ہے کہ صرف میر اور پنج گنج تین تین چار چار دن میں سنادی تھیں ان میں وقت نہیں خرچ ہوا۔ اس واقعہ کی کچھ تفصیل اِکمال الشیم کے مقدمہ میں بھی گزر چکی ہے۔ البتہ فصول اکبری میں بہت وقت خرچ ہوا۔ رمضان میں تعطیل نہیں ہوتی تھی، البتہ رمضان کی کتابیں علیحدہ ہوجایا کرتی تھیں۔ میری صرف صغیر کی کاپی پر جو ابتدائی زمانہ کی مشق کی ہوئی ہے، میری طالب علمی کی کتابوں کا بھی ایک نقشہ جو مقدر سے مل گیا وہ اس جگہ درج کراتا ہوں، اتفاق سے بہت پرانی کاپی غالباً ۲۸ھ کی ہے، جس پر نقشہ ملا، شروع کے تین سال کا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ اس زمانے میں رمضان کی کتابیں بالکل الگ ہوتی تھیں پہلے

رمضان میں نحو میر ہوئی تھی اسی کے ساتھ جملوں کی ترکیب نحو میر کے قواعد کے مطابق بنوائی گئی۔نحو کے چند سبق میں نے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی شیخ الاسلام حال پاکستان سے بھی پڑھے ہیں۔مولانا سے میں نے صرف نحو میر ہی کے چند سبق پڑھے اور کچھ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔اس لیے کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ زیادہ تر خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔مولانا ظفر احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا حال اکمال الشیم کے مقدمہ میں خود ان کے گرامی نامے سے لکھا جاچکا ہے۔ان کی پیدائش ان کی تحریر کے موافق ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ ہے۔مدرسہ مظاہر علوم میں ۵ جمادی الثانی ۲۹ھ کو مدرس مقرر ہوئے۔۳۵ھ میں طویل رخصت لے کر اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے۔اَطَالَ اللّٰہُ بَقَائَہٗ

وہ نقشہ یہ ہے

سال اول از رمضان ۲۸ھ تا شعبان ۲۹ھ:

نحو میر تمام۔شرح مأتہ مع ترکیب تمام۔ہدایۃ النحو تمام۔کافیہ کبری تمام۔ایساغوجی تمام۔مرقاہ (تمام) شرح تہذیب (نصف)۔مفید الطالبین (باب اول) نفحۃ الیمن (دو قصیدہ از باب دوم)۔الفیہ (تمام)۔ابن مالک (نصف)۔فصول اکبری (ثلث)۔ترجمہ پارۂ عم (تمام)۔تبارک الذی (نصف)۔مجموعہ چہل حدیث (یہ پانچ چہل حدیثوں کا مجموعہ، شاہ ولی اللہ صاحب اور ملا جامی کا اس زمانے میں بہت مشہور اور شائع تھا)۔

سال دوم رمضان ۲۹ھ تا شعبان ۳۰ھ:

بقیہ الفیہ۔بقیہ شرح تہذیب۔قطبی تصدیقات وتصورات مع میر۔تلخیص فن اول۔مقامات ۲۳ مقامے۔حساب تا کسورِ عام۔بقیہ ترجمہ تبارک الذی۔نفحۃ الیمن باب اول، باب ثانی، باب خامس۔قصیدہ بردہ۔بانت سعاد۔قصیدہ ہمزیہ۔

سال سوم رمضان ۳۰ھ تا شعبان ۳۱ھ:

مختصر۔نور الانوار۔متنبی۔سبعہ معلقہ۔حسامی۔شرح جامی ۲، احصہ۔کنز۔قدوری۔میبذی۔سلّم۔

سال چہارم رمضان ۳۱ھ تا شعبان ۳۲ھ:

کاپی میں اس کی تفصیل نہیں، مدرسہ کی روئداد میں صفحہ ۱۰۱ پر اس سال کی کتب مُمتَحَنَہ یہ ہیں: مشکوٰۃ شریف۔ہدایہ اولین۔متنبی۔حماسہ۔طحاوی۔شرح نخبہ۔الفیہ عرفی۔مگر اس کا امتحان نہیں دیا۔

سال پنجم رمضان ۳۲ھ تا شعبان ۳۳ھ:

کاپی میں اس سال کی کتب بھی درج نہیں ہیں۔ مدرسہ کی روائد سے نقل کررہا ہوں:
ملاحسن۔ حمد اللہ۔ میر زاہد۔ امورِ عامہ۔ میر زاہد ملا جلال۔ میر زاہد رسالہ غلام یحیٰ۔ مؤطاً محمد۔ طحاوی۔ اقلیدس۔ شمس بازغہ۔ مگر اقلیدس، شمس بازغہ کا امتحان نہیں دیا۔ مؤطا امام مالک کا امتحان بغیر پڑھے دیا تھا، ممتحن کو یہ علم ہوگیا تھا کہ بغیر پڑھے دیا ہے، اس لیے انہوں نے بغیر پڑھے کی رعایت کی کہ فیل کردیا اور کرنا چاہیے تھا۔

سال ششم رمضان ۳۳ھ تا شعبان ۳۴ھ:

کتب مقروءہ از والد صاحب:
اس سیہ کار نے حدیث کی کتابوں کا امتحان نہیں دیا۔
ترمذی شریف۔ بخاری شریف۔ ابوداؤد شریف۔ ہدایہ ثالث (ابتدائی حصہ)۔ نسائی شریف (تمام)۔

سال ہفتم رمضان ۳۴ھ تا محرم ۳۵ھ:

نزد حضرت اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ: بخاری شریف (دوسری مرتبہ)۔ ترمذی شریف۔ شروع سال میں حضرت اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ نینی تال جیل میں تھے۔ آخر ذی الحجہ میں تشریف آوری ہوئی تھی۔

شوال ۳۵ھ تا شعبان ۳۶ھ:

نزد حضرت قدس سرہٗ۔ ابوداؤد شریف۔

شوال ۳۶ھ تا شعبان ۳۷ھ:

نزد حضرت قدس سرہٗ۔ مسلم شریف۔ نسائی شریف۔
میں اِکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص شاگردوں کے پڑھانے میں مجتہد تھے، کسی نصاب کے پابند نہیں تھے، ان کے یہاں زبانی تعلیم زیادہ اہم تھی بہ نسبت کتابی تعلیم کے۔ ادب کے درمیان میں بہت زور تھا، نحو میر کے ساتھ ہی عربی سے اردو، اردو سے عربی بنوانے کا اہتمام تھا۔ ادب میں چہل حدیثوں کا بہت دستور تھا۔ ایک چہل حدیثوں کا مجموعہ تھا۔ جس میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، ملا جامی، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ کی چہل حدیث پڑھائی جاتی تھیں۔
ان کے یہاں کافیہ ہدایۃ النحو ساتھ پڑھانے کا معمول تھا۔ جتنی شام کو کافیہ پڑھائی ہوتی صبح کو

اتنی ہدایۃ النحو ہو جاتی، گویا ہدایۃ النحو کافیہ کی جگہ مطالعہ ہوتا۔ اسی طرح سے کنز اور قدوری ساتھ ہوتی، اس طرح پر کہ کنز اصل ہوتی اور قدوری بمنزلہ مطالعہ کے ہوتی، جتنی شام کو کنز ہوتی اس کی ترتیب کے موافق صبح کو قدوری ہو جاتی۔

ادب کی کتابوں میں وہ محشیٰ کتابوں میں پڑھانے کے مخالف تھے۔ میں نے مقامات جو پڑھی وہ کلکتہ کی مطبوعہ میرے لیے خاص طور سے وی پی منگائی گئی تھی۔ جس میں نہ کوئی حاشیہ تھا نہ اعراب۔ سبعہ معلقہ انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر پڑھایا اس لیے کہ موجود، سبعہ معلقہ سب محشی تھے۔ اسی طرح متنبی بھی ان کے دست مبارک کی لکھی ہوئی پوری موجود ہے۔

کسی کتاب کا پورا ہونا حدیث کے علاوہ ان کے یہاں ضرور نہ تھا بلکہ ہر کتاب کا نصاب یہ تھا کہ جب آٹھ سبق ایسے پڑھ لو کہ استاد جو چاہے پوچھ لے اور شاگرد کچھ نہ پوچھے وہ کتاب گویا پڑھ لی، اس کے بعد ختم کرنا ضروری نہ تھا۔ اگر شاگرد کا جی چاہتا تو دوبارہ کی طرح سے فرفر سنا کر ختم کر دیتا، نہ جی چاہتا تو کچھ ضروری نہ تھا۔ البتہ حدیث پاک کے ختم کا ضرور اہتمام تھا۔

الفیہ ابن مالک اس ناکارہ نے پورا پڑھا اور اس کا سبق حرفاً حرفاً سنا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر ہر شعر کا ابتدائی کلمہ لکھ لیتا تھا، پھر سارا شعر یاد آ جاتا تھا۔ پڑھنے کے زمانے میں اس کی ایک اردو شرح بھی لکھی تھی۔ تالیفات میں اس کا ذکر آئے گا۔

شرح جامی کے متعلق نقشہ میں ۱۶ لکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ الفیہ کے بعد ایک دفعہ کاندھلہ جاتے وقت سہارنپور کے اسٹیشن پر شرح جامی شروع ہوئی تھی، کاندھلہ کے اسٹیشن تک بغیر ترجمہ کے میں پڑھتا چلا گیا۔ ابا جان نے کہیں کہیں مطلب پوچھا، میں نے بتلا دیا۔ کاندھلہ جا کر ایک دن قیام رہا، وہاں بھی ایک گھنٹہ سبق ہوا، تیسرے دن واپسی پر کاندھلہ کے اسٹیشن سے سبق شروع ہوا تھا سہارنپور کے اسٹیشن تک ختم ہو گیا تھا۔ ان تین دن میں مرفوعات تو ساری ہو گئی تھیں منصوبات کا بھی بہت سا حصہ ہو گیا تھا۔ میری شرح جامی بھی قسمت سے نہ معلوم کہاں سے آئی تھی، بہت ہی مختصر حاشیہ۔ مجھے اس وقت پتہ نہیں چلا کہ اس میں حاصل محصول کیا چیز ہوتی ہے؟ جب مدرسی کے زمانہ میں ایک مرتبہ شرح جامی بحث اسم پڑھانے کی نوبت آئی، اس کے حواشی دیکھنے شروع کیے تو میں دیکھتا دیکھتا تھک گیا، تحریر، سنبٹ، سوال کابلی، سوال باسولی، حاشیہ عبدالرحمٰن، حاشیہ عبدالغفور، نہ معلوم کتنے حواشی دیکھے، مگر یہ حاصل محصول ختم ہو کر نہ دیا جب پتہ چلا کہ یہ بھی کوئی معرکۃ الآراء چیز ہے۔

اسی طرح اکثر کتابوں کی تعلیم میری ناقص ہی رہی۔ عبارت تیز اور صاف پڑھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایسی تیز اور صاف پڑھتا تھا کہ استاذ کو بھی خیال ہوتا کہ خوب سمجھ کر پڑھ رہا ہے، اسی وجہ سے اب تک بھی جاہل کا جاہل رہا۔

البتہ حدیث پاک کا مجھے بھی اہتمام رہا، وہ میں نے بھی بڑی محنت سے پڑھی، اس میں بھی کئی معرکے ہیں جو عنقریب آنے والے ہیں۔

مولانا ماجد علی صاحب اُستاذ منطق:

میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے منطق سُلّم تک پڑھا کر چھڑا دی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے رفیق درس حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے میں مولانا ماجد علی صاحب مانی کلاں ضلع جونپور کے رہنے والے، منطق کے امام، استاذ الاساتذہ، ان کے زمانے میں معقول و منطق شہرۂ آفاق تھی۔ انہوں نے میرے والد صاحب قدس سرہٗ سے وعدہ لے رکھا تھا کہ زکریا کو منطق میں پڑھاؤں گا اور میرے والد نے وعدہ کرلیا تھا، اس لیے انہوں نے سُلّم تک منطق پڑھا کر چھڑا دیا اور ان کا ارادہ تھا کہ دینیات سے فارغ ہونے کے بعد ایک سال کے لیے مینڈھو بھیجوں گا جہاں مولانا مرحوم مدرس تھے۔ مولانا ماجد علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مناطقہ کے امام تھے ان کی صفات مناطقہ کی صفات ہونا ہی چاہیے تھا۔ مرحوم کا مشہور مقولہ تھا کہ ترمذی تو مولوی محمود یعنی شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کچھ پڑھا لیتے ہیں اور ابوداؤد مولوی خلیل صاحب یعنی میرے حضرت قدس سرہٗ اسی بناء پر انہوں نے اپنے ایک خاص شاگرد مولوی فضل الرحمٰن ٹونکی کو جنہوں نے بارہ برس تک ان سے منطق پڑھی تھی۔ ابوداؤد پڑھنے کے واسطے میرے حضرت کے پاس بھیجا تھا اور میرے حضرت قدس سرہٗ نے بھی ان کو تنہا بڑے اہتمام سے ابوداؤد پڑھائی، لیکن بخاری کے متعلق مولانا ماجد علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ تھا کہ ''اس میں تو کچھ کہہ سکتا ہوں تو میں ہی کہہ سکتا ہوں۔'' اسی وجہ سے مولانا مرحوم میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بار بار یہ اصرار کرتے تھے کہ ''زکریا کو جلدی بھیج دو میری خواہش یہ ہے کہ بخاری بھی میں ہی پڑھاؤں۔'' میرے والد صاحب کہتے تھے کہ منطق کا تو میرا وعدہ ہے، لیکن دینیات سے فارغ ہونے کے بعد بھیجوں گا مرحوم کا یہ مقولہ میں نے خود بھی سنا جو میرے سامنے میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے کہا کہ ''مولوی صاحب آپ اس کا حرج کر رہے ہیں، یہ میرے پاس آنے کے بعد یوں کہے گا کہ میں بخاری بھی تم سے ایک دفعہ دوبارہ پڑھنا چاہوں۔'' میرے والد صاحب کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا تھا کہ ''منطق کا تو وعدہ ہے مگر بخاری کے متعلق تم اگر یوں نہ کہہ دو کہ مولوی زکریا تمہاری اس میں کیا رائے ہے تو کوئی بات نہیں۔'' اور اس پر کچھ خوش نہ ہوتے تھے۔

میرے حضرت قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ ''زکریا نے منطق کہاں تک پڑھی؟'' تو میرے والد صاحب نے مولانا ماجد علی صاحب سے اپنا وعدہ ذکر کردیا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے بڑے زور سے لاحول پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ ''منطق کے

واسطے کہیں بھیجنا نہیں۔'' اس بناء پر اپنی طبیعت کے خلاف میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو مجھے منطق پڑھوانی پڑی۔ اسی لیے اس نقشہ میں میرا ایک سال خالص منطق کا ہے۔

میری منطق کا سال:

میرے منطق کے تین استاذ ہیں۔ قطبی میر تک تو میں نے اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے مدرسہ کے اوقات میں پڑھی۔ البتہ شرح تہذیب حضرت ناظم صاحب مولانا عبد اللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے قطبی سے پہلے خارج میں عصر کے بعد پڑھی تھی۔ وہ میرے والد صاحب کے حجرے میں تشریف لایا کرتے تھے، میرے والد صاحب کا حجرہ کتب خانے کا غربی حصہ تھا اور اس کے باہر کا حصہ جہاں اب تک کتب خانہ کی جدید عمارت آ گئی اس وقت بالکل خالی تھا اسکی منڈیر پر بیٹھ کر پڑھایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے۔ سلم، میبذی اور میر زاہد، امورِ عامہ حضرت مولانا عبد الوحید صاحب سنبھلی مدرس دوم مظاہر علوم سے دو سالوں میں پڑھیں۔ اس کے علاوہ منطق کی ساری کتابیں میرے مشفق استاد حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سے اس طرح پڑھیں کہ میر زاہد، ملا جلال، ملا حسن تو مدرسہ کے گھنٹوں میں ان ہی کے یہاں ہوتی تھیں، اس کے علاوہ باقی سب کتابیں عشاء کے بعد پڑھیں۔ سردیوں کے بعد سے میرا سبق شروع ہوتا تھا، اس طرح پر کہ ایک چارپائی پر تو نیم دراز میں ہوتا تھا اور درمیانی چارپائی پر میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ بغیر کتاب کے لیٹے رہتے تھے، اس لیے کہ منطق انہوں نے بھی نہیں پڑھی تھی اور اگر میں یوں کہوں کہ منطق کی سب کتابوں میں، اپنے عمِ محترم، استاذ، نائب الشیخ چچا جان کا رفیق درس ہوں تو بے محل نہیں۔ تیسری چارپائی پر حضرت ناظم صاحب لحاف اوڑھے لیٹے ہوتے تھے۔ عشاء کے بعد سے سردیوں کے موسم میں بارہ بجے تک سبق ہوتا تھا اور حضرت ناظم صاحب کے اعزہ حکیم تقی اور مولوی عبد الوحید، اس زمانے میں مدرسہ میں پڑھتے تھے، میری اور چچا جان والی چارپائیاں ان ہی کی ہوتی تھیں، وہ دونوں زبان سے تو کیا کہہ سکتے تھے، دل دل میں جو کچھ کہہ سکتے ہوں وہ ظاہر ہے، مگر چونکہ طالب علم تھے اس واسطے حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید تھی کہ میرے سبق تک مطالعہ دیکھیں، وہ دونوں میرے کتاب کے سبق کے ختم ہونے تک کچھ اونگھتے ہوئے دیکھتے، بیچارے بارہ بجے تک صبر کرتے اور شاذ و نادر ہی ۱۲ بجے خلاصی ہوتی۔ بارہ بجے ہم تینوں استاذ شاگرد اٹھ کر بازار چلے جاتے اور ناظم صاحب ان دونوں سے کہہ دیتے کہ آگ جلا کر ذرا سا پانی چائے کا رکھ دو۔ غصہ تو دونوں کو بہت آتا، مگر ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' وہ چائے کا پانی رکھتے اور چائے دم کر کے رکھتے اور ہم تینوں بازار سے دودھ، شکر اور مٹھائی خرید کر لاتے، پیسے اکثر ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہوتے اور کبھی چچا جان

کے اور کبھی میرے والد صاحب قدس سرہٗ بھی نہایت ناراضی کے ساتھ غصہ کے ساتھ اس مد میں کچھ مرحمت فرما دیتے۔ میرے والدین کا قیام اس زمانے میں اس مختصر مکان میں تھا جو مدرسہ قدیم کی مسجد کے غربی جانب ہے۔ ابا جان بارہ بجے تک تو انتظار کرتے لیکن بارہ کے دس، بارہ منٹ بعد تحقیق کے لیے تشریف لاتے۔ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام اس زمانے میں اس مکان میں تھا جو اب ''گاڑہ بورڈنگ'' کے نام سے مشہور ہے اور میرے مکان کے بالکل متصل ہے، میں نے ساری منطق تقریباً اسی مکان میں پڑھی۔ اگر ابا جان کو آنے پر معلوم ہوتا کہ استاد شاگرد سب بازار گئے ہوئے ہیں تو واپس چلے جاتے اور اگر ہم واپس آجاتے تو کبھی ہلکی سی ڈانٹ بھی پڑتی ''ارے بھائی سبق کی تو مجبوری ہے، اس کے بعد کا وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔'' حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو بھی خطاب فرماتے کہ تم لوگوں کو بھی اٹھنا ہے حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہ کبھی ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت تکان ہو جاتا ہے اس لیے چائے کی ضرورت پیش آتی ہے۔'' ابا جان چپ ہو جاتے۔ حضرت ناظم ان پر بھی چائے کا اصرار کرتے مگر اکثر غصے میں نہیں پیتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ حمد اللہ اٹھارہ یا انیس دن میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نور اللہ مرقدہٗ کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالرحیم صاحب مرحوم بھی مدرسہ میں پڑھتے تھے اور وہ حمد اللہ کئی دفعہ پہلے پڑھ چکے تھے، انہیں حمد اللہ سے عشق تھا۔ میرا بہت مذاق اڑایا کرتے تھے کہ حمد اللہ بھی ایسی چیز ہے کہ آدمی اٹھارہ دن میں پڑھ لے، وہ اٹھارہ برس میں پڑھنے کی کتاب ہے۔ مجھے سنا کر لوگوں سے کہتے کہ ''آپ نے اٹھارہ دن میں حمد اللہ پڑھی ماشاء اللہ کیا کہنا۔'' مقدر کی بات کہ حمد اللہ کے امتحان میں دونوں شریک تھے، اس سیہ کار کے نمبر بڑھ گئے اور ان کے غالباً ان کے غرور کی وجہ سے گھٹ گئے۔ اس زمانہ میں اساتذہ پر بدگمانی کا کوئی نالائق سے نالائق بھی شبہ نہیں کر سکتا تھا، مگر وہ مرحوم بار بار یوں کہتے تھے کہ ''عقل میں نہیں آتا کہ تیرے نمبر کیسے بڑھ گئے؟'' میرا تو خیال یہ ہے کہ وہ مشکوٰۃ شریف پڑھتے وقت بھی حمد اللہ کا سبق سنا کرتے تھے، کہ دونوں سبقوں کے مدرس قریب قریب بیٹھتے تھے۔

مجھے اقلیدس پڑھنے کے زمانے میں اس سے بڑا شغف ہو گیا تھا، اس لیے کہ ابتدائی زمانہ میں صیغے بنانے کی مشق ابا جان نے بہت کرادی تھی، اس لیے اقلیدس کے زمانے میں اسکی شکلیں گھڑنے کا بہت شوق تھا، میرے پرانے کاغذات میں میری صَرف صغیر، صرف کبیر، اقلیدس کی کاپیاں بھی بہت پڑی ہوئیں ہیں۔ شمس بازغہ ہفتہ عشرہ تو متن وشرح دونوں پڑھیں مگر جب یہ اندازہ ہوا کہ متن اور شرح میں زیادہ فرق نہیں اس لیے وہ ایک ہفتہ صرف متن پڑھ کر چھوڑ دیا تھا۔

اس سال میں امتحان کی کتابوں میں مؤطا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ ہے، مگر میں نے اس کو بغیر پڑھے امتحان دے دیا تھا۔ اقلیدس شمس بازغہ کا پڑھنا تو خوب یاد ہے۔ اقلیدس کی کاپیاں بھی بہت پڑی ہیں حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے دونوں کتابیں پڑھیں مگر امتحان ان کتابوں کا نہیں ہوا اور تصریح شرح چغ مینی بھی تھوڑی تھوڑی حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہی پڑھی تھی۔ ان سب کے کفارہ کے لیے اخیر سال میں اپنے حضرت قدس سرہٗ سے مؤطا امام محمد اور طحاوی پڑھی تھی۔ طحاوی کا امتحان نہیں دیا کیونکہ اس سے پہلے سال دے چکا تھا۔

اساتذہ کرام کے احوال:

یہ غالباً میں لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بار بار ارشاد فرمایا کہ ''میں تجھے فقہ، حدیث اپنے اور حضرت کے علاوہ کسی سے پڑھنے نہیں دوں گا، منطق و نطق جس سے چاہے پڑھ لے، اس لیے کہ تو بے ادب اور گستاخ ہے، حدیث اور فقہ کے علاوہ کسی اور کتاب کے استاد کی بے ادبی کرے گا اور وہ علم ضائع ہو جائے گا۔ بلا سے۔ لیکن حدیث اور فقہ کی کوئی کتاب ضائع ہو جائے یہ مجھے گوارا نہیں۔'' اس لیے میں نے فقہ کی ابتدائی کتابیں تو اپنے چچا جان سے پڑھی ہیں اور انتہائی اپنے والد صاحب سے اور حدیث کی کتابیں صرف اپنے والد صاحب اور حضرت قدس سرہٗ سے۔

اس کے علاوہ میرے صرف تین استاذ ہیں۔ نحو میر کے چند سبق مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام پاکستان سے پڑھے ہیں جو اس وقت سہارنپور میں مدرس تھے۔ اپنے طلب کے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ مولانا نے اپنی پیدائش اور تعلیم وغیرہ خود اپنے گرامی نامے میں مفصل تحریر فرمائی جس کو میں اپنے اکمال الشیم کے مقدمہ میں پورا لکھ چکا ہوں، مولانا نے اپنی ولادت ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ لکھی ہے، جو پہلے گزر چکی۔ ان کی ابتدائی تعلیم تھانہ بھون میں ہوئی اور انتہائی کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں، جس کی تفصیل مولانا کے اپنے والا نامہ میں موجود ہے جو اکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھا جا چکا۔

ان کے علاوہ میرے منطق کے استاذ صرف دو ہیں: ایک مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی رحمہ اللہ تعالیٰ جن سے میں نے تین کتابیں مدرسہ کے اسباق کے ساتھ پڑھیں، سُلّم العلوم، میبذی، میر زاہد، امور عامہ اور ان تین کے علاوہ سب حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھیں حضرت مولانا عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ منطق و فلسفہ کے امام تھے علمِ ہیئت کی کتابیں کسرے کی مدد سے اتنی تفصیل سے سمجھاتے تھے کہ طالب علم کے ذہن میں ساری باتیں بہت وضاحت سے آجاتی تھیں۔ حضرت مولانا کی ولادت تقریباً ۱۲۹۰ھ میں سنبھل ضلع مراد آباد میں

ہوئی۔ ابتدائی عمر میں ان کے والد نے اردو اسکول میں تعلیم دلائی اور اس سے فراغ کے بعد دنیوی کاروبار میں لگالیا۔ مگر اللہ جل شانہٗ نے علم کا اعلیٰ درجہ مقدر فرمایا تھا، اس لیے ابتداء سرائے ترین ضلع مرادآباد کے مدرسہ عربیہ میں داخل ہوئے، مگر چونکہ وہ گھر سے ڈھائی میل دور کے فاصلہ پر تھا، آمدورفت میں وقت زیادہ خرچ ہوتا تھا، اس لیے حسن پور ضلع مرادآباد کے مدرسہ میں مولانا احمد الدین سرحدی کے پاس صَرف ونحو کی تعلیم پوری کی۔ اس کے بعد کسی ماہرِ فن سے علومِ عقلیہ پڑھنے کا شوق ہوا اور معلوم ہوا کہ مولانا غلام محمد صاحب ان فنون کے امام ہیں، چنانچہ ان کی خدمت میں حسن پور سے گھر والوں کو اطلاع کیے بغیر پیدل چل دیے، دو آنے صرف پاس تھے، ایک ماہ میں لاہور پہنچے، وہاں علومِ عقلیہ کی تکمیل اور خاص طور سے علمِ ہیئت میں تبحر حاصل کیا اور معلوم ہوا کہ لاہور کے قیام میں حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ رائپوری بھی مولانا موصوف کے رفیقِ درس رہے۔ علومِ آلیہ کی تکمیل کے بعد حدیث شریف کی تکمیل کے لیے دارالعلوم تشریف لائے اور فراغت کے بعد تقریباً پانچ برس مدرسہ سرائے ترین میں تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد نعمانیہ امرتسر میں صدر مدرس رہے، اس کے بعد مینڈھو ضلع علی گڑھ کے مدرسہ میں مدرس رہے، وہاں کے قیام میں جلسۂ دستار بندی ہوا، اس میں حضرت سہارنپوری، مولانا احمد حسن صاحب امروہی اور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری نے شرکت فرمائی اور حضرت سہارنپوری نے نواب صاحب سے جو مدرسہ کے سرپرست اور مربی تھے، مولانا مرحوم کو مظاہر علوم کے لیے طلب کیا، نواب صاحب مرحوم نے حضرت مولانا کے اصرار پر اجازت دے دی اور حضرت مولانا عبدالوحید صاحب ۱۹ ذی الحجہ ۲۸ھ کو مظاہر میں تشریف لائے۔ ذی قعدہ ۳۳ھ میں بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے استعفاء دے دیا اور ربیع الثانی ۳۵ھ میں دوبارہ تشریف لائے اور مظاہر سے پھر دوبارہ استعفاء دے کر اولاً مدرسہ شاہی مرادآباد میں اور پھر منڈھو میں چند سال مدرس رہ کر دارالعلوم مئو میں صدر مدرسی پر تشریف لے گئے اور وہاں سے علالت کی وجہ سے مکان تشریف لے گئے اور چند ماہ کی علالت کے بعد غرّہ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ میں بعمر ۶۳ سال داعی اجل کو لبیک کہا، مولانا مرحوم کی مستمرو مستقل عادت ہمیشہ نیچے نظر کر کے چلنے کی تھی۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت تھے۔

(منقول از مکتوب مولانا محمد حیات صاحب ناظم مدرسہ حیات العلوم مرادآباد مختصراً)

مولانا حیات صاحب نے ولادت تقریباً ۹۰ھ لکھی، لیکن وصال ۵۵ھ بعمر ۶۳ سال لکھا، اس حساب سے ولادت ۱۲۹۲ھ میں ہوتی ہے، بعد میں مولانا مرحوم کے صاحبزادے قاری مُعید صاحب نے لکھا ہے۔ مظاہر علوم میں آمد کا سال اپنی تاریخ کبیر سے لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا

گیا کہ چلنے میں اور سبق میں مولانا نیچی نظر رکھتے تھے، تقریر نہایت متانت سے آہستہ آہستہ فرمایا کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کا ایک مقولہ اس ناکارہ نے کئی بار سنا، نہایت نیچی نظر فرما کر متانت سے کئی دفعہ ہاتھ دائیں سے بائیں کر کے ارشاد فرماتے تھے کہ ''ہمیں اس کا یقین ہے، بالکل اعتراف ہے، اس میں نہ تواضع ہے اور نہ مبالغہ ہے کہ ہم لوگ ان کتابوں کے پڑھانے کے ہرگز قابل نہیں۔'' مختلف الفاظ سے اس مضمون کو دہراتے اور پھر ایک دم منہ اوپر کو اٹھا کر جماعت کی طرف اسی طرح سے ہاتھ سے اشارہ کر کے زور سے فرماتے کہ ''یہ جو بیٹھے ہیں یہ ہم سے بھی پڑھنے کے قابل نہیں ہیں۔'' سرمہ لگانے کی مولانا مرحوم کو بہت کثرت سے عادت تھی۔

حضرت استاذ مولانا الحاج الحافظ عبداللطیف صاحب سے تقریباً منطق و فلسفہ کی بندہ نے ساری ہی کتابیں پڑھیں جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا۔ مولانا کی ولادت، میری تاریخ کبیر میں خود مولانا کی ارشاد فرمودہ کہیں درج ہے، مگر چونکہ علی گڑھ میں ہوں، واپسی پر اگر کسی نے ڈھونڈ کر بتلادی تو درج کی جائے گی۔ قرآن پاک حضرت حافظ صاحب نے اپنے وطن پور قاضی ہی میں ایک بگھرے کے حافظ صاحب حافظ امانت علی صاحب سے پڑھا، جو مدرسہ تعلیم الاسلام جامع مسجد پور قاضی میں مدرس تھے اور اب تک یہ مدرسہ اسی نام سے قائم ہے۔ اس کے بعد ابتدائی فارسی اپنے والد صاحب مولانا جمعیت علی صاحب سے جو گورنمنٹ کالج بہاولپور میں شعبۂ عربی فارسی کے صدر تھے حاصل کی، پھر حضرت اقدس سہارنپوری کی بہاولپور تشریف بری کے موقع پر مولانا جمعیت علی صاحب نے حافظ صاحب کو مولانا کے سپرد کر دیا اور حضرت قدس سرہٗ مولانا کو سہارنپور لے آئے اور یہاں آ کر از ابتدا تا انتہا مظاہر علوم میں پڑھا۔ البتہ تین ماہ کے لیے شہر میں کچھ فتنہ کے خوف سے حافظ صاحب کو دیوبند بھیج دیا گیا اور وہاں صحت اور آب و ہوا کی موافقت نہ ہونے کی وجہ سے واپس تشریف لے آئے۔ عمر شریف تقریباً ۷۵ سال کی ہوئی۔

(منقول از مکتوب عزیز مولوی عبدالرؤف سلّمہٗ ابن حضرت مولانا عبداللطیف صاحب قدس سرہٗ)

حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۵ھ میں مدرسہ کے کتب خانہ سے بوستان، قال اقول، ایساغوجی، مراح وغیرہ لیں اور ۲۳ھ میں اعلیٰ حضرت رائپوری قدس سرہٗ کی تجویز سے جس کی تفصیل تحریر احکام سرپرستان میں موجود ہے، مدرس مقرر ہوئے اور مولانا عنایت الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مستقل اہتمام کی طرف منتقل ہوئے اور ان کے متعلقہ اسباق میں سے جلالین تو مہتمم صاحب ہی کے پاس رہی مگر شرح وقایہ، اصول الشاشی، تہذیب مولانا موصوف کی طرف منتقل ہوئی اور اس کے بعد کتب متفرقہ ہوئیں اور شوال ۳۹ھ سے مولانا موصوف کے یہاں ترمذی، بخاری پہلی مرتبہ درس میں ہوئی اس لیے کہ حضرت قدس سرہٗ کا صبح کا وقت بذل المجہود کے لیے

فارغ کرلیا گیا تھا۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں شوال ۲۳ھ میں حج کوتشریف لے گئے۔ ۱۳ صفر ۴۸ھ کو دہلی میں بضرورتِ مدرسہ تشریف لے گئے تھے وہاں شیخ رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی کوٹھی پر مرض ہیضہ ہوگیا، سب ڈاکٹروں نے اور طبیبوں نے جواب دے دیا۔ شیخ رشید احمد صاحب نے سو روپے پر ایک کار کرکے حضرت ناظم کو سہارنپور روانہ کیا۔ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو پچھلی سیٹ پر تکیوں کے سہارے لٹایا۔ یہ ناکارہ اور چچا جان قدس سرہٗ نیچے جوتوں کی جگہ بیٹھے۔ کسی کو امید نہ تھی کہ جمنا بھی پار کرسکیں گے بالکل آخری حالت تھی، مگر جمنا کا پار کرنے کے بعد جب حضرت ناظم کو افاقہ شروع ہوگیا تو پور قاضی (وطن) کی سڑک پر پہنچ کر شدت سے اصرار فرمایا کہ ''میں گھر ہوتا آجاؤں۔'' ہم لوگوں نے شدت سے انکار کیا، مگر اللہ کی قدرت کے کرشمے کہ میں اور چچا جان ان کو سہارا دے کر مکان پر لے گئے جو سڑک کے قریب ہی ہے، سہارنپور پہنچنے پر الحمدللہ مرض بہت تخفیف تھی لیکن ضعف اور مرض کا کچھ اثر کئی ماہ رہا۔ اس کے بعد ۲۲ صفر ۷۳ھ کو بضرورتِ مدرسہ رنگون تشریف لے گئے اور وہاں طبیعت ناساز ہوئی ۲۰ جمادی الثانی کو واپسی ہوئی اور واپسی کے بعد سے مرض کی شدت بڑھتی ہی چلی گئی، بالآخر ۲ ذی الحجہ ۷۳ دوشنبہ کی صبح ۱۰ بجے وصال ہوگیا اور ڈھائی بجے شام کو حاجی شاہ میں اس مجسمہ اخلاق کو سپرد خاک کردیا گیا۔

مؤطا امام محمد اپنے حضرت قدس سرہٗ سے میں نے کئی سال تک پڑھی اس لیے کہ جب حضرت قدس سرہٗ نے بذل کی مشغولی کی وجہ سے ترمذی، بخاری پڑھانی چھوڑ دی تھی تو اس زمانے میں کئی سال تک جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ مؤطا امام محمد ہوا کرتی تھی اور یہ سیہ کار سیہ کار ہی مستقل اس کا قاری تھا کہ جلدی اور صاف پڑھنے کی مشق تھی اور دوسروں کے پڑھنے میں دیر لگتی تھی۔ اس ناکارہ کے پڑھنے سے تین چار جمعہ میں ختم ہوجاتی تھی۔

نقشہ جو اوپر درج کیا گیا ان میں بعض کتابیں تو مدرسہ کے امتحان میں شامل ہوتی تھیں اور بعض نہیں ہوتی تھیں، اس لیے کہ جو کتابیں مدرسہ کے نصاب میں نہیں ہوتی تھیں یا امتحان کے زمانے میں یا امتحان کے بعد ہوتی تھیں وہ امتحان میں شامل نہیں ہوتی تھیں۔

میں نے اکمال کے شروع میں لکھوا دیا ہے اور بھی بعض تحریرات میں آچکا ہے کہ میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ مدارس کے موجود طرزِ تعلیم کے بہت ہی خلاف تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اس سے استعداد نہیں بن سکتی کہ مدرس تو رات بھر مطالعہ دیکھے اور سبق میں ساری تقریریں کرے اور طلبہ عظام کا احسان ہے کہ وہ سنیں یا نہ سنیں، ادھر ادھر مشغول رہیں۔'' ان کا مشہور و معروف طرزِ تعلیم جو انکے خاص شاگرد اُن مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی اور میرے چچا جان میں بھی رہا وہ یہ کہ سارا بار طالب علم کے اوپر رہے، وہ مطالعہ دیکھے، سبق کی تقریر کرے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ استاد

کا کام صرف یہ ہے کہ ''ہوں'' کرے یا ''اوں ہوں'' کرے۔ اگر طالب علم زیادہ لغو بات کہے تو طالب علم کے منہ پر کتاب پھینک کر مارے، چاہے کتاب کی جلد ٹوٹ جائے یا طالب علم کی ناک ٹوٹ جاوے۔'' یہ ان کا مقولہ مشہور ہے مگر اس پر عمل میں نے نہیں دیکھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شارب خمر کے بارے میں چوتھی بار قتل کرنے کا حکم فرمادیا، مگر اس پر عمل نہیں فرمایا گیا۔ اسی طرز سے میرے والد صاحب اور چچا جان نے پڑھایا۔

میری فارسی اور ابتدائی تعلیم عربی تو چچا جان سے ہوئی اور منطق بھی میر قطبی تک، اسکے بعد منطق کی تین کتابیں سُلّم، میبذی اور میر زاہد امور عامہ حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سے، جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ ساری منطق فلسفہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سے، ادب اور فقہ صرف والد صاحب سے، قدوری، نفحۃ الیمن وغیرہ کے بعض سبق چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور حدیث صرف والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ اور حضرت قدس سرہٗ سے۔ مدرسہ میں حدیث کی جو کتابیں دوسرے مدرسین کے یہاں ہوتی تھیں۔ ان میں بڑی لمبی تقریریں ہوتی تھیں۔ ان کو تقریر کرتے دیکھ کر بہت منہ میں پانی بھرتا۔ بار بار والد صاحب سے اجازت لے کر میں حدیث کا کوئی سبق مدرسہ میں سن لیا کروں مگر ہمیشہ نہایت سختی سے منع کرتے بلکہ ڈانٹ کر ہر دفعہ یہ فرمایا کرتے کہ ''تو بے ادب، گستاخ ہے۔ میرا ادب تو جوتے کے زور سے کرتا ہے اور اپنے حضرت کا دل سے کرتا ہے۔'' اور یہ ایک خاص واقع کی طرف اشارہ تھا جس کی طرف انہوں نے زبانی بھی کئی دفعہ فرمایا کہ ''اپنے حضرت کے حجرہ کی چھت پر بھی نہیں جاتا اور میری چھاتی پر بھی چڑھنے کو تیار رہتا ہے، جس کی شرح یہ تھی کہ میرے والد صاحب کا حجرہ کتب خانہ کا عربی کمرہ تھا جو اب کتب خانہ کا جزء بن گیا اور باہر کا حصہ بالکل خالی تھا جس کو میں شرح تہذیب کے سبق کے ذکر میں ذکر بھی کر چکا، والد صاحب کے حجرہ سے زینہ میں آنے کے لیے حضرت قدس سرہٗ کے حجرہ کی چھت پر آنا پڑتا تھا تو میں بجائے اس چھت کے برابر کی منڈیر پر سے ہمیشہ گزرتا تھا تھی تو ریاکاری، اس لیے کہ حقیقی ادب تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوا اس بناء پر میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ ''تو بے ادب اور گستاخ ہے، اگر منطق فلسفہ کے کسی استاذ کی بے ادبی کر دی اور وہ ضائع ہوگیا تو میری بلا سے لیکن اگر حدیث پاک کے کسی استاذ کی ذرا بھی تو نے بے ادبی کر دی تو مجھے یہ گوارا نہیں کہ تو حدیث پاک کی برکات سے محروم ہوجاوے۔'' اور بالکل ہی صحیح فرمایا ہے۔ مجھ سے تو حقیقی ادب اپنے کسی استاذ کا نہیں ہوسکا۔ اگرچہ میری بے ادبی کے باوجود میرے استاذ مذکورین کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے بہت ہی محبت اور شفقتیں فرمایا کرتے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے

علاوہ ہر استاذ کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا مساویانہ رہا جیسا کہ میں ان کا ہم عصر اور رفیقِ درس ہوں۔

ایک عجیب قصہ یا خواب:

جس دن میں نے یہ میبذی شروع کی اس کی رات کو دیکھا تھا کہ میں ہاتھی پر سوار ہوں۔ ابا جان سے عرض کیا، انہوں نے فرمایا کہ ہاتھی کی شکل سُور جیسی ہوتی ہے۔ تیرا میبذی کا پڑھنا یہ سور کے ہم شکل پر سوار ہونا ہے۔ اللہ جانے یہی تعبیر ہوگی یا کچھ اور۔ تعلیمی زمانے کی سرگزشتیں تو بہت لمبی ہیں، سب کا احاطہ بھی کرنا بہت مشکل ہے۔

یہ مختلف تحریرات میں پہلے گزر چکا اور یہ معروف چیز ہے کہ میری ابتدائی تربیت قیدیوں کی طرح ہوئی، بغیر والد صاحب اور چچا جان کے کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ میرا انتہائی کھیل یا ابتدائی کھیل یا پورا کھیل ''بیت بازی'' تھی، ہم تینوں ساتھی مظہر اور حکیم محفوظ گنگوہی ثم الدیوبندی، جب بھی ابا جان کی نگاہ سے ذرا اوجھل ہوتے تو بیت بازی شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ حماقت سوار ہوئی کہ بیت بازی کا کھیل قرآن پاک کی آیات سے شروع کر دیا۔ یعنی ایک شخص آیت پڑھے اور آیتِ شریف کا آخری حرف جو ہو دوسرا شخص وہ آیت پڑھے جس کے شروع میں یہ حرف ہو۔ میرے دونوں ساتھی حافظ نہیں تھے اور میں بھی صرف نام کا تھا۔ مگر خوب یاد ہے کہ نہ معلوم آیتیں کس طرح سوچ لیا کرتے تھے۔ یہ حماقت تین چار دفعہ ہوئی اور پھر بالکل چھوٹ گئی اور منشاء اس کا یہ ہوا کہ عجیب بات تھی کہ جس دن یہ حرکت ہوتی اس دن بلا کسی معقول وجہ کے پٹائی ہو جاتی۔ اس تجربہ نے دو تین دفعہ کے بعد ہی توبہ کرا دی۔

میری اصل محنت کا زمانہ منطق کے سال سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے محنت تو کم وبیش عربی کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی دوسرا مشغلہ تھا ہی نہیں۔ کہیں جانا آنا نہ تھا، لیکن منطق کے سال میں چونکہ کتابیں بھی بہت سی پڑھیں۔ حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سے جو کتابیں پڑھیں وہ تو مدرسہ کے سبق کے ذیل میں پڑھیں لیکن حضرت ناظم صاحب سے جو کتابیں پڑھیں وہ اپنے والد صاحب کے طرز کے موافق زیادہ تر بلا ترجمہ کے پڑھیں، لیکن مطالعہ ان کا دن میں دیکھنے کی خوب نوبت آتی تھی۔

ابتداءِ مشکوٰۃ:

۷ محرم الحرام ۳۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد میری مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ظہر کی امامت بھی کی تھی کہ اس زمانے میں نماز وہی پڑھایا کرتے تھے اور نماز کے بعد غسل فرمایا اور اس کے بعد اوپر کے کمرے میں جو آج کل مہمان خانہ ہے اس زمانے میں فارسی

خانہ تھا اور مدرسہ کے اوقات کے علاوہ میرے والد صاحب اور ہم سب کی گویا رہائش گاہ بھی تھا، اس میں اس در کی طرف جو مسجد کی طرف کھلتا ہے اور وہ مدرس اول فارسی کے بیٹھنے کی جگہ تھی ان کا گدہ وغیرہ وہاں بچھا رہتا تھا۔ اس پر کچھ بچھا کر دو رکعت نفل پڑھی، پھر میری طرف متوجہ ہوکر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ اور خطبہ مجھ سے پڑھوایا۔ پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر پندرہ بیس منٹ تک بہت ہی دعائیں مانگیں، مجھے معلوم نہیں کیا کیا دعائیں مانگیں، لیکن میں اس وقت ان کی معیت میں صرف ایک ہی دعا کرتا رہا کہ ''یا اللہ! حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا، اس کو مرنے تک اب میرے ساتھ وابستہ رکھیے۔'' اللہ جل شانہٗ نے میری ناپاکیوں، گندگیوں، سیئات کے باوجود ایسی قبول فرمائی کہ محرم ۳۲ھ سے رجب ۹۰ھ تک تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا کہ جس میں حدیث پاک کا مشغلہ نہ رہا ہو۔ اگرچہ دعا کے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، اگر میں نے پڑھ بھی لیا پھر مدرس بھی ہوگیا تو حدیث پاک پڑھانے تک دس بارہ برس تو لگ ہی جاویں گے کہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب جو یکم ۲۳۱ھ سے مدرس تھے اس وقت تک مشکوٰۃ تک نہیں پہنچے تھے، مگر اللہ جل شانہٗ مسبب الاسباب ہے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ فرماوے تو اسباب تو خود اس کی مخلوق ہے۔

۳۲ھ میں مشکوٰۃ پڑھی۔ ۳۳ و ۳۴ھ میں دورہ۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ ۳۵ھ سے بذل شروع ہوئی جو ۴۵ھ میں ختم ہوئی اور اس کے بعد اوجز کی تالیف شروع ہوئی جو ۵۷ھ میں ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے علم حدیث کے تالیفی سلسلے بھی شروع ہوتے رہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب تک ساتھ دے رہے ہیں اور شوال ۴۱ھ سے علم حدیث کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو ۸۸ھ تک رہا اور اس کے بعد نزول آب کی وجہ سے تدریس کا مبارک سلسلہ چھوٹ گیا۔ اللہ ہی کا شکر واحسان ہے کہ اب ۹۰ھ تک تو حدیث کی تالیف کا سلسلہ باقی ہے، دیکھیئے میری بداعمالیاں اس کو آگے باقی رہنے دیں گی یا نہیں۔

دورہ کا سال:

شوال ۳۳ھ میں میرے دورہ کا سال شروع ہوا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ نہ تو مجھے کہیں ملازمت کرنی ہے نہ مدرسی کا شوق، اس لیے دورہ کی کتابیں ایک سال میں پڑھنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ ابوداؤد شریف میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاص سبق تھا، جو میرے حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں بھی اہتمام سے میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہوتا تھا۔ شوال ۳۳ھ میں حضرت قدس سرہٗ نے حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کی معیت میں حجاز کا وہ مشہور ومعروف معرکۃ الآراء سفر کیا جس میں کابل کی طرف سے آکر ہندوستان پر حملے کا منصوبہ بنایا گیا

تھا اوراس کے قصے اب تو مشہور ومعروف ہو چکے ہیں، حضرت مدنی قدس سرہٗ کی مختلف تصانیف میں اور مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمیعۃ العلماء کی تصانیف میں مختصر ومطول آ چکے ہیں اور حضرت قدس سرہٗ کی غیبت میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے اسباق ترمذی، بخاری بھی میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آ چکے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں چونکہ سارے دورہ کی کتابیں ایک سال میں پڑھنا نہیں تھا، اس لیے میں نے صرف ابوداؤد میں شرکت کی اور والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو بہت خوشی سے انہوں نے اس کی اجازت دی۔ چند ہی روز بعد میرا کاندھلہ جانا ہوا تو میرے پھوپھا مولانا رضی الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ ''تو نے ترمذی بخاری یحییٰ سے کیوں نہیں پڑھی؟'' میں نے اپنا منصوبہ بتایا۔ انہوں نے فرمایا، ''میرا اندازہ یہ ہے انہیں اس بات کا احساس ہے کہ تو نے ان سے ترمذی نہیں پڑھی۔'' مجھے بڑی حیرت ہوئی، بڑا تعجب ہوا۔ میں اسی دن آنے والا تھا اس لیے کہ ایک ہی شب کے لیے گیا تھا، مگر میں نے کاندھلہ سے ہی ایک خط والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بہت زور کا لکھا کہ پھوپھا صاحب سے یہ معلوم ہو کر بڑی حیرت ہوئی، میں نے جو کچھ کیا جناب والا کی اجازت سے ہی کیا۔ وہ خط میری واپسی کے ایک دن بعد پہنچا۔ اس کو پڑھ کر میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''نہیں، میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی، میاں رضی کو کسی بات سے شبہ ہوا ہے۔'' مگر میں نے اندازہ یہ کیا کہ پھوپھا صاحب کی روایت صحیح ہے اور والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اس کا احساس ضرور ہے، اس لیے میں نے اپنی تجویز کے خلاف ابوداؤد شریف کے ساتھ ترمذی بھی شروع کر دی۔ ترمذی شریف کے بعد بخاری شریف اور ابوداؤد شریف کے بعد نسائی شریف والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہوئی اور چونکہ بخاری شریف پہلی دفعہ ہوئی تھی اس لیے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے نسائی شریف کا گھنٹہ بھی بخاری جلد ثانی کو دے دیا اور نسائی شریف جمعہ جمعہ پوری کرائی۔ بخاری شریف جلد ثانی میں کتاب، التفسیر میں آدھے صفحہ سے زیادہ ایک گھنٹہ میں سبق کسی دن میں نہ ہوتا تھا۔ آیات کا پڑھنا اور اس کے بعد امام بخاری کی تفسیر کے متعلق کلام فرمانا۔ حافظہ چونکہ ماشاء اللہ اچھا تھا اس لیے آیت کے پڑھنے میں تو ان کو دیر نہیں لگتی تھی، فوراً پڑھتے تھے۔ اس لیے کہ قرآن پاک بہت از بر تھا۔ البتہ آیات کی مشہور تفسیر اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر اور ان دونوں میں تطابق میں دیر لگتی تھی۔

میرے والد صاحب کی تدریس بخاری:

اس زمانے میں میرا ایک رفیقِ درس حسن احمد مرحوم سہارنپوری محلّہ کھالہ پار کا رہنے والا، نہایت ہی متین، نیک اور میرے والد صاحب قدس سرہٗ کا گویا عاشق زار، اتنا معتقد کہ حد نہیں۔ دورہ سے

پہلے تو میری مرحوم سے جان پہچان کچھ زیادہ نہ تھی، صرف ایک نیک طالب علم سمجھتا تھا۔ مگر دورہ میں اس کے جوہر کھلے۔ مرحوم میرے پاس ہی بیٹھتا تھا اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقریر نقل کرتا تھا۔ میں نے اس کو جوانی کے زمانے میں کبھی کوئی فحش مذاق کرتے نہ دیکھا نہ سنا۔ میرے اور مرحوم کے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے دورہ میں دو اہتمام تھے۔

حدیث کے سبق میں وضو کا اہتمام:

ایک یہ کہ کوئی حدیث ایسی نہ ہو کہ استاد کے سامنے پڑھنے سے رہ جائے، دوسرے یہ کہ بے وضو کوئی حدیث نہ پڑھی جائے۔ میرا اور مرحوم کا دستور یہ تھا کہ ہم میں سے جس کو وضو کی ضرورت پیش آجاتی، اس لیے کہ ۵، ۶ گھنٹے مسلسل سبق ہوتا، وہ دوسرے کو کہنی مار کر ایک دم اٹھ جاتا اور دوسرا ساتھی فوراً ابا جان پر کوئی اشکال کر دیتا اگر چہ اس کی نوبت تو بہت کم آتی تھی مہینے دو مہینے میں اس کی نوبت آتی تھی اس لیے کہ صحت اچھی تھی اس سیہ کار کا تو اس زمانے میں ظہر کے وضو سے عشاء پڑھنے کا معمول سالہا سال رہا پھر بھی کبھی نہ کبھی ضرورت پیش آجاتی والد صاحب پہلی ہی مرتبہ میں سمجھ گئے تھے کہ ایک دم ایک ساتھی اٹھا اور ایک منٹ میں آستینیں اتارتا ہوا بھاگا ہوا آرہا ہے اس سے ان کو بھی اندازہ ہو گیا تھا اور اس چیز سے ان کو مسرت بھی تھی ایک دفعہ حسن احمد مرحوم اللہ تعالیٰ اس کو بہت ہی درجے عطاء فرماوے میرے کہنی مار کر ایک دم اٹھا اور اس کے اٹھتے ہی میں نے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے عرض کیا کہ حضرت! فتح القدیر میں یوں لکھا ہے اور بالکل بے سوچ کہا، میرے بھی ذہن میں بالکل نہیں تھا کہ فتح القدیر میں کیا لکھا ہے، لیکن میرے اس فقرہ پر کہ "حضرت فتح القدیر میں یوں لکھا ہے۔" میرے والد صاحب بے ساختہ ہنس پڑے اور کتاب میں نشان رکھ کر اور اس کو بند کر کے مجھ سے فرمایا کہ "جب تک حسن احمد آئے میں تمہیں ایک قصہ سنا دوں، میں تمہاری فتح القدیر سے کہاں لڑتا پھروں گا۔" میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا دستور اسباق میں قصے سنانے کا بہت کثرت سے تھا اور میرے حضرت قدس سرہ کا بالکل نہ تھا اور میں نے حدیث پاک دونوں سے پڑھی۔ اس لیے سال کے شروع کے تین چار ماہ تو والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اتباع رہا اور اخیر سال میں حضرت قدس سرہٗ کا۔ بہر حال والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتح القدیر کی بحث کی جگہ ایک قصہ سنا دیا۔ ہم دونوں نے وضو میں آدھے منٹ سے زائد بھی نہ لگتا تھا، اس لیے کہ اوپر ہی لوٹوں میں پانی بھرا رہا کرتا تھا، آداب کی رعایت تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوئی اور وضو کے چار فرائض پر ہاتھ پھیرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ اس کے بعد والد صاحب قدس سرہٗ کا معمول یہ ہو گیا کہ ہم دونوں میں سے جو بھی اٹھتا، والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک قصہ

سنا دیتے تھے۔ لیکن حضرت قدس سرۂ کے دورہ میں اس کی پابندی تو رہی کہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہوئی کہ جو استاذ کے سامنے نہ ہوئی ہو۔ لیکن وضو کا یہ اہتمام نہ ہو سکا، اگرچہ حضرت قدس سرۂ کے یہاں صرف دو ہی گھنٹے سبق ہوتا تھا، اس لیے وضو کا ٹوٹنا بھی یاد نہیں اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ۵، ۶ گھنٹے ہوتا تھا۔ میری مسلم شریف اور ابن ماجہ والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ ہو سکی، اس لیے کہ مسلم شریف اس سال ناظم صاحب کے یہاں پہلی دفعہ گئی ہوئی تھی اور ابن ماجہ کئی سال سے مولانا ثابت علی صاحب کے یہاں ہوتی تھی اور یہ میں لکھوا چکا ہوں کہ والد صاحب نے طے کر رکھا تھا کہ حدیث کی کتاب میرے اور حضرت کے علاوہ کسی سے نہ ہوگی۔

دورہ کے ختم پر اس سیہ کار نے اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ہدایہ ثالث شروع کی، اس زمانے میں مطالعہ کا چسکا پڑ گیا تھا۔ حدیث کی کتابیں ہو چکی تھیں، دن بھر خوب مطالعہ دیکھتا تھا اور مغرب کے بعد موچیوں کی مسجد میں جہاں میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام اکثر رہتا تھا، ہدایہ کا سبق ہوتا تھا، میں تنہا ہی تھا، ہدایہ پر نقلی اور عقلی، احادیث کے اور کفایہ اور عنایہ کے، فتح القدیر کے خوب اعتراضات کیا کرتا تھا۔ والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے دو دن کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ''طالب علموں کی طرح پڑھنا ہو تو پڑھ مُدَرِسوں کی طرح پڑھنا ہو تو اپنے آپ جا کر اشکال جواب دیکھتے رہو۔''

مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے کسی استاذ پر کبھی دل میں اعتراض پیدا نہ ہوا، نہ یہ گھمنڈ پیدا ہوا کہ میرے اشکال کا جواب استاذ سے نہیں آیا، یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔

۱۰ ذی قعدہ کو میرے والد صاحب قدس سرۂ کا انتقال ہو گیا، یا تو ایک سال پہلے یہ جذبہ تھا کہ ترمذی شریف، بخاری شریف حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ ہی سے پڑھنی ہے اور ابا جان سے شروع نہ کی، لیکن ان کے انتقال کے بعد دستور یہی ہے کہ قدر اور محبت زندگی میں کم ہوتی، انتقال کے بعد بڑھ جاتی ہے، اب یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ترمذی شریف، بخاری شریف پڑھ لی، دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، ورنہ والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں یہ جذبہ تھا کہ حضرت کی واپسی پر دوبارہ پڑھوں گا۔ مگر والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد یہ خیال دل سے نہ یہ کہ نکل گیا، بلکہ اس کا عکس دل میں جم گیا۔

حضرت سے دوبارہ احادیث پڑھنا:

حضرت قدس سرۂ کی نینی تال سے واپسی پر ترمذی شریف جواب تک میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد سے بند تھی، حضرت کے یہاں شروع ہوئی اور حضرت نے تشریف

لاتے ہی اس سیہ کار کو اور میرے عزیز دوست مخلص اور رفیق حسن احمد مرحوم کو دونوں کو یہ حکم فرمایا کہ ''ترمذی شریف، بخاری شریف مجھ سے دوبارہ پڑھو۔'' انکار کی تو کیا مجال تھی اور اس کا شائبہ بھی کسی حرکت سے ظاہر نہیں کر سکتے تھے کہ دوبارہ پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ اسی زمانے میں اس سیہ کار نے خواب دیکھا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ ارشاد فرما رہے ہیں کہ ''مجھ سے دوبارہ بخاری شریف پڑھ۔''

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹا تشریف لے جاچکے تھے، بہت سوچتا رہا کہ خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟ حضرت قدس سرہٗ سے خواب عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کی تعبیر بھی یہی ہے کہ مجھ سے بخاری شریف دوبارہ پڑھو۔ اس وقت تو اپنی حماقت سے تعبیر سمجھ نہ آئی، لیکن بعد میں سمجھ میں آ گیا کہ اس وقت شیخ الہند فی الحدیث کا مصداق، حضرت قدس سرہٗ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ بہر حال، تعمیل ارشاد میں شروع تو ہم دونوں نے کر دیا، لیکن میرا رفیق حسن احمد مرحوم اس سال فنون کی کتابیں پڑھتا تھا اور وہ بخاری شریف کے نیچے کسی مطالعہ کی کتاب کو رکھتا تھا۔ میں اس پر شدت سے انکار کرتا تھا۔ کہ یہ تو بہت بے ادبی ہے، حدیث پاک کی بھی اور استاذ کی بھی، ایسا ہرگز نہ کر۔ مگر اس کو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے عشق تو ان کی زندگی میں ہی تھا اور ان کے انتقال کے بعد میری طرح یہ جذبہ اور بھی بڑھ گیا تھا کہ اب تو حدیث کسی سے نہیں پڑھنی۔ میں نے اس کے بالمقابل یہ کوشش کی کہ اتنے قوی اشکالات دمادم کروں کہ حضرت قدس سرہٗ تبحر علمی کو دیکھ کر یوں فرمادیں کہ تجھے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، تقریباً یہ سال میرا ایسا گزرا کہ رات دن میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ سونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لیے کہ مدرس ہو گیا تھا۔ جس کا قصہ آگے آرہا ہے اور دو سبق میرے دو استادوں کے یہاں سے اصول الشاشی چچا جان نوراللہ مرقدہٗ کے یہاں سے علم الصیغہ مولانا ظفر احمد صاحب کے یہاں سے منتقل ہوکر آئے تھے اور دونوں میری بے پڑھی کتابیں تھیں، جس کی تفصیل آئندہ تدریس میں آئے گی۔ اصول الشاشی کے مطالعے میں کئی گھنٹے خرچ ہوتے۔ لیکن عشاء کے بعد سے رات کے تین چار بجے تک میں ترمذی شریف، بخاری شریف کا مطالعہ دیکھا کرتا تھا اور فتح الباری، عینی، قسطلانی، سندھی کے ابواب بہت ہی بالاستیعاب اور غور سے دیکھتا اور جہاں کوئی اشکال پیش آتا، اس کو نوٹ کر لیتا۔ جواب نوٹ نہ کرتا اور صبح کو حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں، اللہ مجھے بہت ہی معاف فرمائے۔ دمادم اعتراضات کرتا، مگر اللہ کا بڑا ہی احسان ہے، اسی کا لطف و کرم ہے۔ اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ، مجھے اس کا کبھی واہمہ نہیں ہوا کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے میری بات کا جواب نہیں آتا۔ جب شیطان ذرا سا وسوسہ کا شبہ بھی ڈالتا تو میں اپنے دل سے کہتا ''بے غیرت ساری رات تو کتاب دیکھی تجھے

اعتراض کرتے شرم نہیں آتی۔'' دوڈھائی ماہ اسی مناظرے میں گزار دیے۔اس واقعہ کومولانا عاشق الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے تذکرۃ الخلیل میں بھی کچھ اجمالاً لکھا ہے۔

میرا اور حسن احمد مرحوم کا یہ معمول تھا کہ سبق کے بعد ہم دونوں حضرت کے پیچھے پیچھے دارالطلبہ سے مدرسہ قدیم تک آتے ،حضرت قدس سرہٗ ،دوماہ کے بعد حسبِ معمول دارالطلبہ سے تشریف لا رہے تھے اور ہم دونوں پیچھے تھے،مدرسہ قدیم کے قریب املی کی ٹال جہاں آج کل آرا مشین لگ گئی ہے،اس کے بالمقابل حضرت کھڑے ہوگئے اور ہم دونوں کی طرف متوجہ ہوکر یوں ارشاد فرمایا کہ ''ساری عمر سے یہ تمنا رہی کہ ابوداؤد شریف پر کچھ لکھوں اور کئی دفعہ شروع بھی کیا مگر پورا نہ ہوسکا۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں ہمیشہ تقاضا رہا کہ لکھوں اور جو اشکال ہوگا حضرت سے پوچھتا رہوں گا۔حضرت کے بعد طبعیت سرد ہوگئی۔لیکن پھر خیال ہوا ہمارے مولانا یحییٰ صاحب تو حیات ہیں جہاں اشکال ہوگا ان سے الجھتے رہیں گے۔مگر ان کے انتقال پر تو خیال بالکل ہی نکل گیا تھا۔اب یہ خیال ہے کہ اگر تم دونوں میری مدد کرو تو شاید لکھ سکوں۔'' حضرت کا ارشاد صحیح تھا اس لیے کہ میں نے خود حضرت کے مسودات میں ایک مسودہ دیکھا تھا جس پر ''حَلُّ الْمَعْقُودِ فِیْ اَبِیْ دَاوٗد مَرَّۃً ثَالِثَۃً'' کا لفظ لکھا ہوا تھا،مسودہ کو دیکھا جائے جو مدرسہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، نام میں کچھ اشتباہ ہے،علی گڑھ سے واپسی پر اگر وقت ملا تو میں خود دیکھ کر تصحیح کرادوں گا،اگر کوئی دیکھنا چاہے تو مدرسہ کے کتب خانہ میں دیکھ لے۔میں نے عرض کیا کہ ''حضرت!ضرور اور یہ میری دعا کا ثمرہ ہے۔'' حضرت نے فرمایا ''اس کا کیا مطلب؟'' میں نے مشکوٰۃ شریف کی ابتدائی دعا کا ذکر کرکے عرض کیا کہ ''حضرت اب تک اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی تھی،اب سمجھ میں آگئی کہ آٹھ دس برس تو حضرت کو اس شرح میں لگ ہی جائیں گے اور اس وقت انشاء اللہ یہ ناکارہ بھی حضرت کی برکت سے حدیث پڑھانے تک پہنچ ہی جائے گا۔'' حضرت کا چہرہ مسرت سے کھل گیا۔میرے حضرت قدس سرہٗ خوبصورت بہت تھے۔حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا مقولہ میرے حضرت کے متعلق کہیں طبع شدہ بھی میں نے دیکھا ہے اور سنا بھی ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب تو گلاب کا پھول ہیں۔اس لیے کہ حضرت قدس سرہٗ کے چہرے پر غصہ اور خوشی ایسی صاف نظر آیا کرتی تھی کہ بے تکلف محسوس ہوا کرتی تھی۔

ابتداء تالیف بذل المجہود:

حضرت قدس سرہٗ نے اگلے دن مجھے بلا کر کتب خانہ سے کتابوں کے نکالنے کی ایک فہرست مجھے لکھوائی۔چنانچہ ۲ ربیع الاول کو مدرسہ کے کتب خانہ سے کتابیں لی گئیں اور دارالطلبہ کے خزانے والے کمرہ میں بذل المجہود کی تالیف کی ابتداء ۳ یا ۴ ربیع الاول ۳۵ھ میں ہوئی۔اس کے بعد بھی

میں اسی جذبہ اور کوشش میں کہ حضرت دوبارہ نہ پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ میرے ساتھی میرے بے جا سوالات پر بہت ہی چیں بجیں ہوتے، خاص طور پر مجھے بخاری شریف میں اشکالات کی زیادہ سہولت پیدا ہوگئی، دو گھنٹے میں سبق ایک صفحہ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ جمادی الاول آگیا اور بخاری شریف کے چند پارے ہوئے۔ حضرت قدس سرہ، نے ایک دفعہ یوں ارشاد فرمایا کہ ''میں تو رجب میں بہاولپور کا وعدہ کر چکا ہوں، کتاب بہت باقی رہ گئی۔ میرے بعد مولوی ثابت علی صاحب، مولوی عبدالطیف سے پوری کرلیجیو۔'' اس فقرہ سے زمین پاؤں سے نکل گئی، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ جو آپ سے بھی پڑھنا نہ چاہتا ہو وہ اگلے سے کیا پڑھے گا۔

میرا اور حسن احمد کا معمول دارالحدیث میں حضرت قدس سرہٗ کے داہنی طرف بیٹھنے کا تھا، وہاں ایک الماری رکھی رہتی تھی، اس میں حضرت قدس سرہٗ کی اور میری اپنی کتابیں رہتی تھی، اس لیے کہ میرے مطالعہ کی کتاب دوسری میرے گھر پر تھی۔ یہ منظر بھی ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ حضرت قدس سرہٗ کا معمول ہمیشہ جنوبی زینہ کی طرف جانے کا تھا اور اوپر جاکر ہمیشہ دارالحدیث کے پہلے دروازے سے داخل ہوتے، طلبہ ایک دم کھڑے ہوجاتے، تپائیاں ہٹا دیتے، حضرت کے لیے ایک دم راستہ کھل جاتا۔ ارشادِ بالا کے بعد جب دوسرے دن حضرت سبق کو تشریف لے گئے اور دارالحدیث کے پہلے دروازے سے اندر قدم رکھا اور سامنے میں اپنی جگہ پر نہیں تھا تو وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے اندر گھوم رہا ہے کہ حضرت اپنی جگہ ششدر کھڑے رہ گئے، قدم آگے نہیں بڑھایا، اس لیے کہ شروع محرم سے آج پہلا دن تھا کہ میں اپنی جگہ نہیں تھا، میں یہ منظر دیکھ کر جہاں بیٹھا تھا وہاں سے کھڑا ہوا، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دیکھ لیا اور قدم آگے بڑھایا، اس لیے کہ آج یہ ناکارہ حضرت کے سامنے جماعت کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا اور حضرت کے بیٹھتے ہی رمضانی حافظوں کی طرح سے جو میں نے بخاری شریف پڑھنی شروع کی کہ نہ کوئی اشکال تھا، نہ کوئی شبہ تھا۔ کبھی آدھا پارہ، کبھی پون پارہ، دونوں گھنٹہ میں ہی پڑھتا تھا، کسی اور کو پڑھنے بھی نہیں دیا، جمادی الثانی میں بخاری شریف ختم کردی۔

ایک دفعہ احتیاطاً حضرت کے کان میں ڈال بھی دیا کہ ''حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا سفر تو تجویز ہوگیا اور بخاری شریف حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہی پوری کرنی ہے۔'' مگر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ''لا یا نعم'' نہیں فرمایا۔

تیسرا دور شروع ہوا:

میں نے شوال میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ ''حضرت! بذل کے لیے وقت بہت تھوڑا ملتا ہے، اس لیے بذل پہلے صرف تیسرے چوتھے گھنٹے میں ہوتی تھی، میرا خیال ہے کہ ترمذی

شریف حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے حوالے کر دیں اور بجائے صبح کے شام کو ابوداؤد شریف پڑھادیا کریں، میری ترمذی شریف، بخاری شریف تو حضرت کے پاس ہوگئی، میری تمنا یہ ہے کہ بقیہ کتابیں بھی ہر سال ایک ایک کتاب ہو کر پوری ہو جائیں۔'' حضرت نے بڑی مسرت سے اس کو قبول فرمالیا اور اس لیے کہ ایک تو اس میں بذل کے لیے زیادہ وقت ملتا تھا جو حضرت کے عین تمنا تھی، دوسرے اس سیہ کار کے اوپر حضرت کی شفقت بے پایاں کی وجہ سے ابوداؤد کے پڑھانے سے حضرت کو مسرت تھی، اس لیے شوال ۳۵ھ سے حضرت کے یہاں ابوداؤد ہوئی، شعبان تک اور شوال ۳۶ھ میں، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت کے یہاں اس سال مسلم شریف ہوگی، حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا اور اس سال مسلم شریف اور نسائی شریف حضرت کے پاس پڑھی، ابن ماجہ شریف دونوں بزرگوں کے پاس پڑھنے کی نوبت نہیں آئی، البتہ مدینہ پاک میں ۴۵ھ میں بذل المجہود ختم ہونے کے بعد ابن ماجہ حضرت قدس سرہٗ سے شروع کی تھی اور چند سبق پڑھے تھے۔ لیکن پھر ماہ مبارک آگیا اور پھر حضرت کی طبیعت ناساز ہوگئی اس لیے پوری نہ ہوسکی۔

طحاوی سے میرے والد اور انور کشمیری کا شغف:

طحاوی شریف اولاً میں نے اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے مشکوٰۃ کے ساتھ پڑھی۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اور حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کو طحاوی شریف سے بہت خصوصی تعلق تھا، اسی بناء پر گنگوہ کے قیام میں والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے طحاوی کا اردو ترجمہ بھی شروع فرمایا تھا۔ اس کا اشتہار بھی دیا گیا تھا۔ اس کا بہت سا حصہ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے بھی ابا جان کی تعمیل حکم میں لکھا، مگر مقدر سے پورا نہ ہوسکا۔ اَسانید کو چھوڑ کر متونِ حدیث کا خلاصہ اور امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظر کو تفصیل سے لکھنا یہ موضوع تھا۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ طحاوی کی دونوں جلدیں داخل درس ہوں، میں دارالعلوم میں اس پر قابو نہ پاسکا، تم مظاہرِ علوم میں مجھ سے زیادہ بااختیار ہو اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ صحیح فرمایا تھا، اس زمانے میں ایسا ہی تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تعمیل ارشاد میں، میں نے مظاہرِ علوم میں طحاوی شریف کا مستقل گھنٹہ کیا تھا، لیکن باوجود کوشش کے دونوں جلدیں پوری ہونے پر میں بھی قابو نہ پاسکا، کئی دفعہ تقسیم اسباق میں، میں نے یہ پیش کش کی ابوداؤد اور پھر بخاری شریف کی جگہ مجھے طحاوی دی جائے، مگر اہلِ مدرسہ نے ان دونوں کتابوں کو طحاوی سے زیادہ اہم سمجھا اور ایک سبق سے زائد یہ ناکارہ بھی اپنی تالیفی سلسلہ کی وجہ سے پڑھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ خدا کرے آئندہ کوئی طحاوی شریف کا شوقین اس کی دونوں جلدوں کو پورا کرادیا کرے۔ مشکوٰۃ والے سال میں

اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ سے تقریباً ایک جلد پوری اور دوسری کا کچھ حصہ پڑھا اور اس کے بعد مؤطأ امام محمد کے ساتھ کچھ حصہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں پڑھا۔ حضرت قدس سرہٗ کا معمول اول ترمذی شریف، اس کے بعد بخاری شریف اور اس کے ختم پر مؤطأ امام محمد اور طحاوی شریف پڑھانے کا سلسلہ چند سال رہا، اس لیے بندہ نے طحاوی شریف کا معظم حصہ اولاً اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے تقریباً ڈیڑھ جلد پڑھی اور اس کے بعد تبرکاً دوسرے سال میں کچھ حصہ حضرت قدس سرہٗ سے پڑھی۔

یہ تو طالب علمی کا دور تھا، جو بہت ہی عجلت میں چند واقعات لکھے۔

اب مدرسی کی سنو:

محرم ۳۵ھ کے شروع میں یہ ناکارہ مدرس ہوا۔ جب میری مدرسی کا اور میری طرف اسباق منتقل ہونے کا اعلان ہوا تو میرے عزیز محترم دوست مولوی ادریس صاحب کاندھلوی مؤلف التعلیق الصبیح، جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں اعلیٰ مدرسین میں شمار ہیں، حدیث وتفسیر کی کتابیں کثرت سے پڑھاتے ہیں انہوں نے بہت اخلاص ومحبت سے ایک نصیحت کی جس نے مجھے بہت کام دیا۔ انہوں نے کہا ''میاں صاحب! ایک بات غور سے سن لو، تم نے جس طرح خود پڑھا ہے، مدرسوں میں یہ طرز نہیں چلنے کا۔ طالبِ علم دمادم شکایتیں کریں گے اور نالائق بن کر مدرسہ سے الگ کر دیئے جاؤ گے، میری ایک نصیحت جو مدارس کے طرزِ تعلیم اور طلبہ کے مزاج کے موافق ہے اور جس سے تم طالب علم کی نگاہ میں محبوب بن جاؤ، تم اس کی ذرا پرواہ نہ کرنا کہ طالب علم نے مطالعہ دیکھا یا نہیں دیکھا، سبق یاد کیا یا نہیں۔ اگر تم نے طلبہ سے مطالعہ پر وہ گرفت کی جو تم سے کی گئی تو تمہارے خلاف طلبہ میں شور مچ جائے گا۔ وہ یہ نہیں کہنے کے کہ ہم سے مطالعہ کی گرفت کی جاتی ہے یا ہم سے گزشتہ سبق سنا جاتا ہے، وہ تمہیں نالائق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور تمہارے خلاف پڑھا نہ سکنے کی، سمجھا نہ سکنے کی شکایت کریں گے۔ اس لیے میری مخلصانہ نصیحت کو اہتمام سے سن لو کہ جو تمہارے منہ میں آئے کہتے چلے جانا، یہ نہ سوچنا کہ یہ طالب علم کی استعداد کے موافق ہے یا اس سے اونچی بات ہے۔ یہ بھی نہ پوچھنا کہ کل میں نے کیا کہا تھا، کس نے یاد کیا کس نے نہیں۔''

اس نصیحت نے مجھے اخیر تک بہت کام دیا۔ میری جہالت پر ان کی نصیحت نے بہت ہی پردہ ڈالے رکھا۔

میرے ابتدائی تقرر کے وقت جو محرم سے ہوا تھا، دو سبق ایک میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں سے اصول الشاشی کا اور دوسرا حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی حال شیخ الاسلام پاکستان جو اس وقت مظاہر علوم کے مدرس تھے علم الصیغہ منتقل ہو کر آیا اور دونوں کتابیں میری بے پڑھی

تھیں۔ علم الصیغہ کا کچھ زیادہ فکر نہ ہوا، البتہ اصول الشاشی اہم تھی۔ جماعت بھی اس کی کچھ بڑی تھی۔ میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے پوچھا کہ سبق کہاں سے ہوگا؟ تو انہوں نے بتایا کہ فَصْلٌ فِیْ الْاَمْرِ کے ایک ورق کے بعد سے ہے مگر میں نے اس لیے کہ مجھے طلبہ کا اندازہ تھا کہ طالب علم دھوکہ دیا کرتے ہیں۔ چچا جان سے امر کی بحث دو ورق پڑھ لیے، ایک طلبہ کا پڑھا ہوا اور دوسرا بے پڑھا، ان سے تو اپنے ہی ضابطے پر پڑھے کہ جلدی جلدی، لیکن چونکہ اعلان بدھ کو ہو گیا تھا اور شنبہ سے سبق شروع تھے، اس لیے دو تین دن میں کتب اصول میں اصول الشاشی کے شروح و حواشی، نورالانوار و منار، اس کی شرح کشف الاسرار، حسامی اور اس کی جتنی شروح مل سکیں، توضیح تلویح، دو دن میں اَمْر کی ابتدائی بحث سب میں نے خوب دیکھی اور درس گاہ میں پہنچنے کے بعد اجنبیانہ پوچھا، سبق کہاں سے ہے؟ سب نے متفق اللسان ہو کر کہا فَصْلٌ فِیْ الْاَمْرِ سے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ دھوکہ دیں گے، میں نے ایک گھنٹہ امر کی بحث میں خرچ کر دیا۔ معلوم نہیں کیا کیا کہا ہوگا۔ اتنا یاد ہے کہ پہلا دن تو فَصْلٌ فِیْ الْاَمْرِ پر خرچ ہوا تھا۔ اس کے بعد پورا ایک ہفتہ اس ایک ورق میں لگا جو چچا جان، ایک دو دن میں پڑھا چکے تھے۔ مولوی ادریس صاحب کو اللہ جزائے خیر دے، ان ہی کی نصیحت اور تجربہ کا یہ ثمرہ تھا۔

ایک ہفتہ بعد میرے پاس اصول الشاشی کی جماعت نہایت مئوکد تحریری اور زبانی درخواست لے کر پہنچی کہ ''ہم اصول الشاشی تجھ سے اول سے پڑھنا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہہ دیا ''مدرسہ کا سبق ہے میرا ذاتی سبق نہیں، مہتمم صاحب حکم دیں گے تو مجھے انکار نہیں۔'' چونکہ ایک بڑے مدرس کے یہاں سے منتقل ہو کر آئی تھی، اس لیے باضابطہ تحریری درخواست کی تو لوگوں نے ہمت نہیں کی، البتہ خصوصی لوگوں نے زبانی ان سے کہا، انہوں نے انکار کر دیا۔ البتہ یہ نفع ضرور ہوا کہ بعض اکابر مدرسین، نیز بعض طلبہ، بعض منتظمین کو میرے امرد اور کم عمر اور حسین وجمیل ہونے کی وجہ سے مدرسی پر اعتراض تھا۔ مگر اکابر کی طرف سے چونکہ تجویز تھی اور علی الاعلان اعتراض کا اس زمانے میں دستور نہیں چلا تھا، بالخصوص بڑوں کی طرف سے، اس لیے مہتمم صاحب کو بھی کچھ سوچ رہا تھا اس لیے اصول الشاشی کی جماعت کی اس درخواست نے مہتمم صاحب کو میری طرف سے مطمئن کر دیا۔ اللہ ان پڑھنے والوں کو بڑی جزائے خیر دے۔

میرا ابتدائی تقرر میرے حضرت قدس سرہٗ کی تجویز ص پر ہوا تھا۔ اعلیٰ حضرت رائے پوری حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''قرضہ بہت ہے، شادی بھی عنقریب ہونے والی ہے، کم سے کم تنخواہ ص ہونی چاہیے۔'' اس پر اصرار بھی فرمایا۔ مگر میرے حضرت نے فرمایا کہ ''مدرسہ کی روایت کے بھی یہ خلاف ہے، رعایت ہی رعایت ہے۔'' اس لیے کہ مولانا

منظور احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سہارنپوری میرے سے پانچ برس پہلے کے مدرس تھے اور اس وقت تنخواہ ترقیات ہوکرص تک پہنچتی تھی جو میرے تقرر کے ساتھ بھی میری وجہ سےص ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم کا ابتدائی تقرر شوال ۳۰ھ میں بلاتنخواہ معین مدرس کا ہوا تھا اور شوال ۳۲ھ سے دس روپے مشاہرہ پر تنخواہ دار ملازم ہوئے تھے اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے مدرس دوم تک پہنچے تھے اور ۳۲ھ جمادی الاول ۸۸ھ بوقت صبح انتقال فرما گئے اور حاجی شاہ میں مدفون ہوئے نوراللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مرتبہ۔

مولانا ظفر احمد صاحب کے پاس بھی سبق اس وقت میزان منشعب سے شروع ہوکر قدوری تک پہنچے تھے۔ یہ دونوں چیزیں بھی معترضین اور حاسدین کے لیے موجب تکدر اور گرانی تھیں۔ خود مولانا منظور احمد صاحب کو بھی فطرتاً خیال تو ضرور ہونا چاہیے تھا مگر انہوں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ البتہ مجھ سے یہ اصرار کیا کہ ''میں نے اصول الشاشی اب تک پڑھائی نہیں اور قدوری کئی دفعہ پڑھا چکا ہوں، اصول الشاشی تیری بے پڑھی ہے، قدوری تیری پڑھی ہوئی ہے، تجھے اس میں آسانی رہے گی۔'' میں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ ''بالکل صحیح فرمایا، بہت آسانی رہے گی۔ اصول الشاشی میری پڑھی ہوئی بھی نہیں ہے، لیکن میں مہتمم صاحب سے کہوں کہ آپ کو بدل دیجئے یہ دشوار ہے، اس لیے کہ مہتمم صاحب شروع ہی میں نالائق فرمادیں گے، آپ اگر مہتمم صاحب سے درخواست کر کے تبادلہ کرلیں گے تو مجھے کوئی گرانی نہ ہوگی۔'' مرحوم کو اس کی ہمت اس لیے نہ ہوئی کہ حضرت قدس سرہٗ کے دور میں اخیر دور تک کسی مدرس کا خود سبق مانگنا انتہائی عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز اس کے تکبر کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ اپنے کو بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ اس زمانے میں کسی مدرس کو کسی سبق کی خواہش ہوتی اور خواہش تو ہوتی ہی رہتی تھی، تو اس کا دستور یہ تھا کہ کوئی مدرس اپنے دوست کو اس پر آمادہ کرلیتا تھا کہ جب تقسیم اسباق کا وقت آئے اور کتاب کا نام لی جائے تو تو میرے نام پر تجویز کرادینا۔ اس لیے مولانا منظور صاحب کی اور بھی ہمت نہ ہوئی کہ مہتمم صاحب سے کہیں اور ان کی بات حضرت کے یہاں پہنچ جائے۔

کتب زیر تدریس زکریا عفی عنہ

ازمحرم ۳۵ھ تا شعبان ۳۵ھ:

علم الصیغہ۔ مائۃ عامل منظوم۔ شرح مائۃ۔ خلاصہ نحومیر۔ نفحۃ الیمن۔ مُنیۃ المصلی۔ صول الشاشی۔ قال اقول، تین سبق مستقل۔

ازشوال ۳۵ھ تا شعبان ۳۶ھ:

مرقاۃ۔قدوری۔شرح تہذی۔کافیہ۔نورالایضاح۔اصول الشاشی۔شرح جامی۔بحث فعل، بحث اسم نصف پر منتقل ہوگئی۔عجب العجاب۔نفحۃ الیمن۔

ازشوال ۳۶ھ تا شعبان ۳۷ھ:

مقامات۔سبعہ معلقہ۔قطبی میر۔کنز۔قدوری۔اصول الشاشی۔

ازشوال ۳۷ھ تا شعبان ۳۸ھ:

ہدایہ اولین۔حماسہ بعد عشاء۔بذل کی وجہ سے بعض سبق خارج میں ہوا کرتے تھے۔ایک سبق حضرت کی اشراق کی نماز تک اور ایک سبق عصر کی نماز کے بعد بھی اکثر پڑھانے کی نوبت آئی، شعبان ۳۸ھ میں حجاز چلا گیا اور محرم ۳۹ھ میں واپسی ہوئی،اس زمانہ کے سبق یاد نہیں،لیکن ہدایہ اولین تین دفعہ پڑھانے کی نوبت آئی اور قطبی میر تو لا تُعَدُّ وَلا تحصی ،شوال ۳۶ھ سے شعبان ۴۴ھ تک شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہوگا جس میں قطبی تصدیقات اور میر قطبی میرے یہاں نہ ہوئی ہو۔اکابر مدرسین منطق سے گھبراتے تھے،میر قطبی اور قطبی تصدیقات اور شرح تہذیب کی جماعت بھی اکثر میرے ہی یہاں رہتی تھی۔شرح تہذیب کی جماعت بھی میرے تک پہنچ جاتی تھی۔

اس زمانے کے مدرسین اتنی اعلیٰ تحقیق سے نہیں پڑھاتے تھے جیسا کہ اس زمانہ کے علماء کرام پڑھاتے ہیں کہ کوئی کتاب الا ماشاء اللہ نصاب تک نہیں پہنچتی۔میں نے تین سال ''نورالانوار'' پڑھائی اور ہر سال ''نورالانوار'' کے بعد اس کی جگہ حُسامی ہوا کرتی تھی۔بحث فعل کے بعد بحث اسم بھی اکثر تین ربع کے قریب ہوجاتی تھی۔دورہ کے سبق صرف تین گھنٹے ہوتے تھے۔دو میں ترمذی، بخاری اور ایک میں ابوداؤد، پھر مسلم پھر نسائی اور دورہ کے اسباق میں ایک سبق بیضاوی شریف کا تھا،اس کے بعد مَدَارِک۔اس کے بعد کشاف۔ایک گھنٹہ ہدایہ اخیرین کا تھا،اس کے بعد درمختار۔ایک گھنٹہ توضیح تلویح کا تھا۔اس کے بعد مسلم الثبوت۔اس کے بعد کوئی تیسری کتاب بھی اکثر ہوجاتی تھی۔سب سے پہلے دورہ میں سے توضیح نکلی تھی اور اس کا گھنٹہ مسلم شریف کو دیا گیا تھا۔پھر ہدایہ نکلا۔پھر بیضاوی نکلی۔اب ماشاء اللہ چھ گھنٹے دورہ شریف کو دیئے جارہے ہیں پھر بھی حضرات محققین عظام رات کو اور جمعہ کو پڑھاتے ہیں پھر بھی مشکل سے دورہ پورا ہوتا ہے اور اب تو محققین عظام جلالین وہدایہ وغیرہ بھی ماشاء اللہ رات کو پڑھاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کی تحقیقات میں اور اضافہ فرمادیں۔

میری طالب علمی اور ابتدائی مدرسی میں ۴۶ھ تک بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ حضرت قدس سرہٗ کے

دور میں رات کو پڑھانا مدرس کی نالائقی سمجھا جاتا تھا کہ کتاب پڑھانے پر قادر نہیں تو بالکل صحیح ہے۔

از شوال ۴۰ھ تا شعبان ۴۱ھ:

رجب ۴۱ھ سے بخاری کے تین پارے ناظم صاحب کے یہاں سے منتقل ہو کر آئے۔

از شوال ۴۱ھ تا شعبان ۴۲ھ:

مشکوٰۃ شریف ۱

از شوال ۴۲ھ تا شعبان ۴۳ھ:

مشکوٰۃ شریف ۲

از شوال ۴۳ھ تا شعبان ۴۴ھ:

مشکوٰۃ شریف ۳

از شوال ۴۴ھ تا صفر ۴۶ھ:

شوال ۴۴ھ میں سفر حجاز کو روانگی ۴۵ھ میں مدینہ طیبہ کا قیام اور وہاں مدرسہ شرعیہ میں مغربی طلبہ کو ابوداؤد شریف اور الحاج عبدالحمید کو مقامات عربی زبان میں پڑھائی اور بعض کتب کی تالیف، جو نقشہ تالیفات میں آ رہی ہیں۔

از ۱۸ صفر ۴۶ھ تا شعبان ۸۸ھ:

یہ ناکارہ ۱۸ صفر ۴۶ھ کو حجاز کے طویل سفر سے واپس پہنچا۔ ۱۸ صفر ۴۶ھ کو ابوداؤد صفحہ ۸۰ سے ناظم صاحب سے منتقل ہو کر آئی۔ اس کے ساتھ ہی نسائی شریف شروع ہوئی، اس کے بعد مؤطاً امام محمد، بخاری از جزء ۱۲ چار پارے، اس کے بعد سے ابوداؤد شریف تو مستقل ۷۵ھ تک اس ناکارہ کا سبق رہا۔ بخاری شریف کے متعلق حضرات سرپرستان نے ۴۶ھ میں یہ تجویز کر دیا تھا کہ ترمذی صدر مدرس مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے پاس ہو اور بخاری شریف زکریا کے پاس، اس لیے کہ حضرت ناظم صاحب کے پاس انتظامی کام بہت بڑھ گئے تھے۔ مگر ناظم صاحب کو اس پر بہت زیادہ تأثر قلق اور گرانی تھی اور ہونی بھی چاہیے۔ اس لیے زکریا نے سرپرستان کی اجازت سے یہ طے کر دیا کہ ترمذی تو مستقل صدر مدرس کے پاس رہے اور بخاری شریف کا افتتاح ناظم صاحب کرا دیا کریں اور بقرعید کے بعد وہ زکریا کے پاس منتقل ہو جایا کرے اور جلد ثانی ناظم صاحب بعد مغرب پڑھا دیا کریں۔

۷۳ھ میں ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا رنگون کا سفر ہوا، اس سال ابوداؤد کے ساتھ بخاری کی

دونوں جلدیں بھی زکریا کے پاس ہوئیں۔

۴۷ھ میں بھی ناظم صاحب کی مسلسل علالت کی وجہ سے دونوں جلدیں مع ابوداؤد کے زکریا کے پاس ہوئیں۔ ناظم صاحب کے انتقال کے بعد سے ابوداؤد مولانا اسعد اللہ صاحب کی طرف منتقل ہوکر بخاری شریف کی دونوں جلدیں زکریا کے پاس رہیں۔ تا شعبان ۸۸ھ۔

صفر ۴۶ھ کے بعد سے چونکہ زکریا کے اوقات زیادہ فارغ تھے، اس لیے دورہ کے مدرسین میں سے علالت یا طویل سفر کی وجہ سے جس کا سبق منتقل ہوتا ترمذی، مسلم وغیرہ وہ زکریا کے پاس منتقل ہوا کرتا تھا۔ شمائل تو کئی سال مسلسل رہی، جس کی تفصیل میں تطویل ہے، کاپی تقسیم اسباق میں تفاصیل موجود ہیں۔ مسلسلات کی ابتداء میں تو خصوصی احباب وقتاً فوقتاً اجازت لیتے رہتے تھے، لیکن ۵۳ھ سے باضابطہ زکریا کے سبق ختم ہونے کے بعد جمعہ کو ہونے لگی، جو ۸۸ھ تک رہی۔

۸۹ھ میں زکریا کا قیام حجاز میں رہا۔ اس لیے بخاری شریف مولانا یونس صاحب کی طرف منتقل ہوئی، اس لیے مسلسلات بھی انہی کے پاس ہوئی۔ ۲۳ رجب ۹۰ھ کو مسلسلات کا شور ہوگیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار کا مجمع ہوگیا، جس میں اکابر وخواص بھی بہت جمع ہوگئے تھے۔

ان خانوں میں کتابوں کا استیعاب نہیں۔ دو چار اہم کتابوں کی یادداشتیں ہیں، قطبی میر تو ہر سال دو تین دفعہ ہوجاتی تھی، اس لیے کہ منطق سے سب ہی گھبراتے تھے۔ چھوٹا مدرس میں ہی تھا، قطبی میر تو ہوتی ہی تھی۔ تہذیب اور شرح تہذیب کی جماعت بھی میرے یہاں قطبی تک پہنچ جاتی تھی۔ نور الانوار اور اس کے بعد حسامی تین سال مسلسل ہوئی۔ سالوں کی تعیین صحیح اندارج میں نہ ملی۔ اس زمانے کا نقشہ موجود تو ہے مگر اس وقت ملا نہیں، ممکن ہے بعد میں کسی کو ملے تو اضافہ ہوجائے۔

شوال ۳۶ھ میں ایک اہم واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ اوپر لکھ چکا ہوں، حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں کسی مدرس کی یہ ہمت نہ پڑی تھی کہ اپنے لیے کوئی کتاب مانگے۔ حضرت قدس سرہٗ کی موجودگی میں مہتمم صاحب اسباق کا نقشہ اور مدرسین کا نقشہ لے کر بیٹھتے تھے، کتاب کا نام پکارا جاتا اور اکابر مدرسین میں سے کوئی شخص کسی مدرس کا نام تجویز کردیتا، اگر کسی دوسرے مدرس کی طرف سے کوئی جرح نہ ہوتی تو حضرت کی منظوری پر اس کے نام لکھ دی جاتی۔ اکابر مدرسین میں سے اگر کسی کی طرف سے جرح ہوتی، مثلاً اونچی معلوم ہوتی یا اس سے نیچے کتاب ابھی نہیں پڑھائی، یا پوچھ لیجئے آپ کو اس کتاب کے پڑھانے میں کوئی اشکال تو نہ ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو پھر دوسرے مدرسین کی تائید کے ساتھ یا نکیر کے ساتھ حضرت قدس سرہٗ کا فیصلہ ناطق ہوتا۔

یہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ کوئی مدرس اپنے لیے کوئی کتاب نہیں مانگ سکتا تھا، البتہ جو کتاب کوئی مدرس کئی دفعہ پڑھا چکا ہو اس کے مانگنے میں کوئی تردد نہیں ہوتا تھا۔

کوئی مدرس نئی کتاب مانگنا چاہتا تھا تو آپس کے مدرسین میں یہ طے ہو جاتا تھا کہ جب فلاں کتاب کا نام آئے تو اس کے نام تجویز کرادی جائے۔

مجھے ادب سے کچھ شوق بھی تھا اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے پڑھایا بھی کچھ محنت سے تھا، شوال ۳۶ھ میں میں نے مہتمم صاحب سے عرض کیا ''اگر نامناسب نہ ہو تو مقامات تقسیم اسباق کے وقت میں میرے لیے تجویز فرمادیں۔'' مہتمم صاحب نے بہت ہی شفقت سے یہ فرمایا کہ ''ایک ہی سال تیری مدرسی کا ہوا ہے، ابھی تقاضا ہی کیا ہے؟ انشاء اللہ مقامات بھی پڑھائے گا اور حدیث بھی پڑھائے گا، جلدی نہ کر، ابھی ہرگز مناسب نہیں۔'' میرا خیال تھا کہ اگر مہتمم صاحب نیم راضی ہوں تو پھر کسی مدرس سے، چچا جان یا مولانا ظفر احمد سے کہوں کہ وہ مقامات میرے نام کرادیں۔ اس لیے کہ زیادہ جرح مہتمم صاحب یا مولانا ثابت علی صاحب مرحوم کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ادب کی سب کتابیں پہلے گھنٹے میں ہوتی تھیں اور اس گھنٹے میں جلالین شریف، مختصر المعانی، شرح جامی بحث اسم بھی ہوتی تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب کے یہاں امسال جلالین ان کے بڑے شوق پر میرے چچا جان نے تجویز کرائی تھی اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ان کی خواہش سے مختصر المعانی آئی تھی۔

سبعہ معلقہ کا سبق:

جب ادب کی کتابوں کا نمبر شروع ہوا تو متنبّی کا نام بولا گیا اور وہ مولانا ثابت علی صاحب کے یہاں لکھی گئی تھی، اس لیے کہ ادب کے سبق اس زمانے میں تین ہی مدرسوں کے یہاں ہوا کرتے تھے۔ مولانا ثابت علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا ظفر احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ متنبّی کے بعد سبعہ معلقہ کا نام بولا گیا۔ ادب کی کتابیں آدھ گھنٹہ بھی ہو جاتی تھیں، اس کے علاوہ دوسری کتابیں ایک گھنٹہ ہوتی تھیں یا دو گھنٹے۔ جب متنبّی کے بعد سبعہ معلقہ کا نام لیا گیا، ادب کے تینوں مدرسین کا گھنٹہ پر ہو چکا تھا اور مولانا ظفر احمد صاحب اور چچا جان اپنی اپنی کتاب بدلنا پسند نہیں کرتے تھے کہ پہلی دفعہ ہو رہی تھی اور جب ان سے کہا گیا کہ اپنی اپنی کتابیں بدل لو تو انہوں نے عرض کیا کہ پہلی پہلی دفعہ آئی ہیں اور ادب کی کتابیں یہ حضرات کئی دفعہ پڑھا چکے تھے۔ مہتمم صاحب نے مولانا ثابت علی صاحب پر اصرار کیا کہ متنبّی اور سبعہ معلقہ آدھا آدھا گھنٹہ پڑھا دیں مولانا ثابت علی صاحب نے ذرا شدت سے انکار کیا، جلدی بولنے کے مولانا بہت عادی تھے، فرمایا ''پہلے گھنٹہ میں آدھ گھنٹہ مشکل ہے، پہلے گھنٹہ میں آدھ گھنٹہ مشکل ہے'' یہ لفظ دو دفعہ دہرایا اور فرمایا کہ ''چائے بھی تو پینی ہوتی ہے۔'' مولانا مرحوم اپنی چائے خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اور بڑی لذیز ہوتی تھی۔ تین چار منٹ سکوت اور ردوقدح میں گزرے۔ مولانا عبد اللطیف

صاحب نے زکریا کا نام پیش کر دیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے بڑے زور سے تائید کی ''ضرور بہت اچھی پڑھائے گا۔'' میرے چچا جان نے بھی فرمایا کہ ''اچھی پڑھائے گا۔'' اس میں اگر مخالفت کرتے تو مولانا ثابت علی صاحب کرتے، مگر وہ بھی متنبّی کی وجہ سے دبے ہوئے تھے۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ''لکھ دو'' پھر کیا تھا، مجھے وہ منظر ہمیشہ یاد رہے گا اور بڑا لطف آتا ہے۔

مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ:

حضرت مہتمم صاحب کے ہاتھ میں قلم اور نقشے پر جھکے ہوئے اور بہت دبی ہوئی آواز سے فرمایا: ''میں نے تو مقامات کو بھی انکار کر دیا تھا۔'' مِـن مِـن تو سب نے سنی مگر مطلب میں ہی سمجھا۔ اس کے بعد مقامات کا نام لیا گیا، اب تو میری بھی زبان روز سے کھل گئی، میں نے عرض کیا ''میں تو دونوں کتابیں آدھے گھنٹے میں پڑھا دوں گا، بلکہ حضرت مہتمم صاحب اگر اعلان فرما دیں تو مقامات کا سبق آدھ گھنٹہ پہلے ہی شروع ہو جائے گا تو دونوں سبق پون پون گھنٹہ ہو سکتے ہیں۔ مجھے چائے پینی نہیں نہ میں چائے پیتا ہوں۔'' وہ بھی میرے نام لکھی گئی۔ مقامات پر تو کوئی شور شغب نہ ہوا، اس لیے کہ یہ جماعت مشکوٰۃ کی جماعت تھی لیکن سبعہ معلقہ کی جماعت دورے کے بعد کی جماعت تھی اور یہ وہ لوگ تھے جو گزشتہ سال دورے میں میرے ایک ساتھی بھی رہ چکے تھے، اس لیے معلقہ کی جماعت نے بہت زور و شور ابتداء میرے خلاف اسی طرح کیا کہ حضرت قدس سرہٗ تک نہیں پہنچا، البتہ مہتمم صاحب تک بڑی بڑی شکایات پہنچتی تھیں۔ اس زمانے میں مدرسہ کا قانون یہ تھا کہ مدرس ہر کتاب کو جس کو پڑھائے تو دو نسخے ایک مطبع کے بھی لے سکتا تھا، ایک گھر پر مطالعہ کے لیے، ایک درس گاہ میں پڑھانے کے لیے اور مختلف مطابع کی تو ہر کتاب کا ایک نسخہ مختلف حواشی کی وجہ سے بھی لے سکتا تھا۔ اس سیہ کار نے ایک تو مکاری یہ کی کہ کوئی نسخہ معلقہ کا مدرسہ سے نہیں لیا اور شرحیں بھی اپنے نام پر کوئی نہیں لی، ایک آدھ مولانا ظفر احمد صاحب سے کہہ کر ان کے نام پر لی، ایک چچا جان کے نام پر اور معلقہ کے چند نسخے مختلف مطابع کے میرے تجارتی کتب خانے میں بھی موجود تھے۔ جو لوگ میرے مخالف تھے اور وہ ابتدائی مدرسین بھی جن کو میرے معلقہ پر رشک وحسد فطری چیز تھی، انہوں نے ان طلبہ کی بہت مدد کی اور جو لوگ معلقہ پڑھ چکے تھے ان کو بھی پڑھا کر میرے سبق میں مجھے دق کرنے کے واسطے بھیجا کرتے تھے، مگر اللہ کے انعامات کا نہ یہ سیہ کار شمار کر سکتا ہے نہ شکر ادا کر سکتا ہے، جو لوگ مجھے دِق کرنے کے واسطے معاند بن کر معلقہ میں شریک ہوا کرتے تھے ان کی درخواستیں معلقہ میں داخلہ کی مہتمم صاحب کے پاس دمادم پہنچنی شروع ہوئیں۔

ایک صاحب نے جو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھی مخالفین میں سے تھے، مہتمم صاحب سے کہا کہ ''معلقہ والے بہت رو رہے ہیں ان کا ناس تو مار دیا، ان کو حضرت مولانا ذوالفقار

صاحب کی اردو شرح ''التعلیقات علی السبع المعلقات مدرسہ سے دے دو کہ ان کو کچھ تو پتہ چلے۔''
مہتمم صاحب نے فرمایا کہ اردو شرح ادب کی کتاب کی ملنے کی ممانعت ہے، مگر ان صاحب نے بہت زور دیا کہ ''معلقہ والے بہت رو رہے ہیں۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ''میرے پاس تو معلقہ میں داخل ہونے کی درخواستیں آرہی ہیں، تم کیوں رو رہے ہیں؟'' لیکن ان کے شدید اصرار پر مہتمم صاحب نے ایک تحریر میرے پاس بھیجی کہ ''معلقہ کے طلبہ تعلیقات مانگتے ہیں، تیری کیا رائے ہے؟'' میں نے اس پر لکھ دیا کہ ''میرا کوئی حرج نہیں، بڑے شوق سے دے دیں لیکن طلبہ کے لیے اردو ترجمہ مضر سمجھتا ہوں۔'' مولانا ادریس صاحب کی نصیحت نے یہاں بھی مجھے بہت کام دیا اور اس دن سے میں تعلیقات کو خاص طور سے دیکھ کر جاتا تھا اور کبھی کبھی اپنی حماقت سے یہ لفظ بھی کہہ دیتا تھا کہ ''تم میں سے کسی کے پاس تعلیقات ہو تو دیکھ لینا، مولانا نے یہ مطلب تحریر فرمایا مگر میرے نزدیک یہ مطلب زیادہ اچھا ہے۔'' اس پر اور بھی طلبہ میں شوق و ذوق پیدا ہوا اور معلقہ کی شرکت کی درخواستیں بھی بڑھ گئیں تو آخر میں ناظم کتب خانہ نے لکھا کہ ''معلقہ کا کوئی نسخہ کتب خانہ میں نہیں ہے، مزید خریدنے کی اجازت دی جائے، اس پر حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتب خانے سے دریافت کیا کہ ''زکریا کے پاس کتنے نسخے ہیں؟'' کتب خانے نے جواب دیا کہ اس کے پاس نہ کوئی متن ہے اور نہ کوئی شرح۔ مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس قاصد سے وہی اصل کتاب کی درخواست لانے والا تھا، دریافت فرمایا کہ وہ اپنی کتاب میں پڑھاتا ہے؟ طالب علم نے جواب دیا کہ اس کے پاس تو کوئی کتاب نہیں ہوتی، اشعار حفظ پڑھتا ہے اور حفظ ہی ترجمہ اور مطلب سب کچھ کہتا ہے۔'' لڑکپن تھا، زمانہ جاہلیت تھا، سبعہ معلقہ کے سارے ہی اشعار عشقیہ مضامین کے تھے، بالخصوص امرؤالقیس کا قصیدہ خوب یاد تھا۔ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے حضرت قدس سرہٗ کے یہاں درخواست لکھی کہ ''سبعہ معلقہ کتب خانہ میں ختم ہوگئی جماعت بڑھ رہی ہے، مزید خریداری کی اجازت دی جائے۔'' میرا اندازہ یہ ہے جو اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بھی مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس تحریر سے بڑی مسرت ہوئی، حضرت قدس سرہٗ نے لکھوا دیا کہ ''دس نسخے فوراً خرید لیے جائیں۔'' دوسری صبح کو میں اپنے مکان سے دارالطلبہ سبق پڑھانے کے لیے جارہا تھا اور مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کھالے پار کی طرف سے مدرسہ تشریف لا رہے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے اور بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، مرحوم کا مکان قاضی کے محلے میں تھا، لیکن نور اللہ مرقدہٗ کا دستور یہ تھا کہ گھر سے چلتے وقت ایک دن غربی نالے سے آتے اور ایک دن شہر کے بیچ بازار سے آتے اور ایک دن مشرقی نالہ کھالہ پار کی طرف سے آتے اور ان کے گھر سے مدرسہ تک

تینوں سڑکوں پر جن جن چندہ دینے والوں کے گھر پڑتے، چاہے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہوتے، ان کے گھر جا کر بہت خوشامدانہ لہجے میں کہتے، "بھائی تمہارا چندہ نہیں آیا، وہ بہت شرمندہ ہو کر یا تو اسی وقت پیش کرتا یا تھوڑی دیر بعد خود لے کر مدرسہ آتا۔

حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، وہ مہتمم مدرسہ بھی تھے، مفتی مدرسہ بھی وہی تھے کہ ان کے زمانہ میں کوئی مستقل مفتی اخیر زمانہ کے علاوہ نہیں تھے، خصوصی محصلِ چندہ شہر بھی وہی تھے کہ محصل شہر تو ایک اور صاحب تھے، لیکن جب وہ یہ کہتے کہ "فلاں کے یہاں گیا تھا اس نے چندہ نہیں دیا" تو مہتمم صاحب خود اس کے گھر جا کر تقاضا فرماتے جیسا کہ اوپر لکھا گیا اور مقدمات کی عدالتی کاروائی میں بھی خود جایا کرتے، کوئی ناظم اوقاف علیحدہ نہیں تھے جو عدالتی کام کرتا۔ اللہ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، جب میں مقابلہ سے سلام کرتے ہوئے آگے گزرا تو یہ منظر بھی ہمیشہ یاد رہے گا کہ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تسبیح جوان کے ہاتھ میں تھی وہ پڑھتے ہوئے آرہے تھے، میرے مونڈھے پر ماری اور فرمایا کہ "تیرے سبعہ معلقہ نے تو میری آنکھ نیچی کر دی، میں نے تو مقامات کو بھی انکار کر دیا تھا، بھائی معاف کر دیجئے۔" مجھے بھی بہت ندامت ہوئی اور اب بھی جب یہ قصہ یاد آتا ہے تو مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تواضع پر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ میں نے عرض کیا، حضرت اس میں معافی کی کوئی بات نہیں۔ جناب کا ارشاد ابتدائی مدرس ہونے کے لحاظ سے بالکل مناسب تھا۔" میں نے عرض کیا کہ معلقہ بالخصوص امرؤالقیس کا قصیدہ پڑھنے کے زمانے ہی سے یاد تھا اور یہ واقعہ تھا کہ مجھے معلقہ جتنا یاد تھا مقامات اتنی یاد نہیں تھی اور اس معلقہ کے ہنگامے نے:

خدا شرّے برانگیزد درو خیرے نہاں باشد

میری ادب دانی کو اتنی شہرت دی کہ مولانا بدرالحسن صاحب کا جو قصہ علی میاں نے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح کے صفحہ ۹۱ پر لکھا ہے وہ اسی کا ثمر تھا وہ بہت مختصر لکھا گیا ہے۔

مولانا بدرالحسن صاحب، جو اس زمانے میں لکھنؤ میں سب جج تھے کاندھلہ تشریف لے جاتے وقت سہارنپور آئے کہ راستہ ادھر سے بھی ہے، سہارنپور میں ان کا قیام خواجہ مظاہر حسن مرحوم کے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ وہاں قیام فرمایا اور دن کا زیادہ حصہ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں اور میری تعزیت میں مدرسہ میں گزرتا، انہوں نے نہایت خفیہ میری تحقیقات خوب کیں، اللہ جزائے خیر دے اور جب ہر شخص کی زبان سے میری ادب دانی سنی تو مرحوم کو بہت مسرت ہوئی اور مجھ سے ازراہِ شفقت فرمایا کہ "تیرے ادب کی بڑی تعریف سنی ہے، تیرے لیے مولوی فاضل کا امتحان دینا بہت آسان ہے، جلد از جلد امتحان کا فارم بھیج دے، اس میں تیری کامیابی یقینی ہے، اس کے بعد

میں تجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے جاؤں گا اور چند مہینے انگریزی پڑھا کر زبان کا امتحان بی اے کا دلوا دوں گا، اس کے بعد علی گڑھ کالج کے ناظم دینیات کی ملازمت جو صرف میری ایک تحریر پر مل سکتی ہے، تین سو روپے تنخواہ ہے تجھے مل جائے گی۔" میں نے معذرت کردی۔ وہ خاندان میں بڑے شمار ہوتے تھے، ان کے سامنے سب اہلِ خاندان ادب کی وجہ سے چپ رہتے تھے، بہت کم گو تھے، میں نے بہت ادب سے معذرت کردی کہ سہارنپور چھوڑنے کا تو ارادہ نہیں ہے، انہیں گراں ہوا، فرمایا: "بے وقوف ہے۔" ایک آدھ لفظ اور بھی کہا، مگر میں ساکت رہا۔ انہوں نے اگلے دن کاندھلہ جاکر میرے والد کے حقیقی ماموں اور میری اہلیہ مرحومہ کے حقیقی تایا مولانا شمس الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو جو خاندان میں نہایت غصیارے مشہور معروف تھے اور ان کے سامنے بھی خاندان کے بڑوں کی ان کے غصہ کی وجہ سے بولنے کی ہمت کم ہوتی تھی، مجھے سمجھانے کو بھیجا، مرحوم کو حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے مجھ پر شفقت تھی اس لیے وہ حضرت قدس سرہٗ سے بیعت ہوچکے تھے۔ مرحوم کی عادت یہ تھی کہ جس بات کو وہ بہت اہتمام سے کہنا چاہا کرتے تھے تو ابتداء کلام اس طرح ہوا کرتی تھی "اے کہے تو ایک بات کہہ دوں۔" اس سے اہمیت مقصود ہوتی تھی اور اس جملہ کو دو دو دفعہ کہا کرتے تھے۔ وہ عصر کے وقت تشریف لائے، میرے یہاں چائے کا دور چل رہا تھا۔ فرمایا کہ "تیرے پاس آیا ہوں۔" میں سمجھ گیا۔ مرحوم میرے باپ کے حقیقی ماموں اور اہلیہ مرحومہ کے حقیقی تایا تھے۔ میں نے چائے پیش کی اور عرض کیا کہ اب تو وقت بہت قریب ہوگیا، وقت تھوڑا ہی ہے، مغرب کی نماز پڑھتے ہی حاضر ہوجاؤں گا۔ نماز پڑھتے ہی میں ان کو لے کر زنانہ مکان کی چھت پر چلا گیا۔ سردی کا موسم تھا، مغرب سے لے کر عشاء کی اذان ہوگئی، وہ مجھے سمجھاتے رہے اور میرے لڑکپن پر بعض مرتبہ چہرے پر غصہ بھی آجاتا تھا۔ ان کے ارشاد کا خلاصہ یہ تھا کہ شادی ہوچکی ہے، گھر ولادت بھی قریب تھی، سب سے بڑی بچی اہلیہ مولوی یوسف مرحوم کی ولادت کا زمانہ قریب تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمشیرہ کی شادی بھی کرنی ہے، آٹھ ہزار قرضہ بھی ہے، پندرہ روپے تنخواہ میں کیا کیا کرے گا؟

میرے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ "یہ تو ہمیشہ سنا اور پڑھا ہے، جناب کو اس سے بھی انکار نہ ہوگا کہ مقدر میں جو ہے وہ تو مل کر رہے گا اور جو مقدر میں نہیں ہے وہ کہیں نہیں مل سکتا۔ میں جس ماحول میں ہوں اس میں اگر اپنی گندگیوں سے محفوظ رہوں یہ بھی اللہ کا احسان ہوگا، اس کم عمری میں عنفوان شباب میں علی گڑھ کے ماحول میں میرا محفوظ رہنا بہت ناممکن ہے، وہ فرماتے تھے دنیا دارالاسباب ہے اسباب کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے، محض مقدر پر نہیں رہا جاسکتا۔" میں نے عرض کیا، بالکل صحیح فرمایا، ذرا اس میں تامل نہیں لیکن اسباب کے درجے میں دو سبب موجود ہیں،

ایک مدرسہ کی ملازمت، جو یقیناً محدود ہے، دوسرے کتابوں کی تجارت جس میں اللہ جل شانہٗ جتنا بھی عطا فرمائے، کوئی تحدید نہیں۔'' عشاء کی اذان پر میرے مخدوم ومکرم میرے والد صاحب کے ماموں رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ''اے کہے تو ایک بات کہہ دوں؟'' میں نے کہا ''ضرور'' تو نے جو کچھ کہا، اگر دل سے ہو تو تیرا منہ چوم لینے کے قابل ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ تو نے سب کچھ زبان زوری سے کہا ہے، میں نے عرض کیا ''دعا فرمائیں کہ اللہ جل شانہٗ اس کو دل سے بھی کردے۔'' وہ بھی تشریف لے گئے۔

میرے بعض معاصر عزیزوں کو جن کا نام لکھنا نہیں چاہتا، میری یہ حرکت اس قدر ناگوار ہوئی کہ چند ماہ بعد جب کاندھلہ گیا تو میرے بڑوں نے تو کوئی تعرض نہ کیا، مگر میرے معاصرین نے بہت ہی طعن وتشنیع سب وشتم کیا اور ایک عزیز مرحوم نے تو سب سے زیادہ غصے کا اظہار کیا، حتیٰ کہ چند معاصرین اعزہ کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے تو وہ مرحوم خفا ہوکر یہ کہہ کر اٹھ جاتا کہ میں ایسے کمینے لوگوں کے پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا، جو صدقے وزکوٰۃ کی روٹیوں کو عزت کی تنخواہ پر ترجیح دیتے ہوں۔'' اور مرحوم خوب خفا ہوا لیکن اللہ جل شانہ کا اس سیہ کار کے ساتھ ایک خاص معاملہ ہمیشہ رہا کہ جو ابتداء میں بہت زور سے خفا ہوئے وہ انتہا میں اتنے ہی زیادہ محبت، عقیدت اور اگر یوں کہوں کہ عشق میں مبتلا ہوئے تو غلط نہیں۔ مرحوم اخیر زمانے میں کئی سال بیمار رہا، اللہ بہت ہی مغفرت کرے، مجھے بار بار بلانے کے تار بھی دیتا، میرا بار بار جانا تو بہت مشکل تھا، کبھی کبھی چلا جاتا۔ وہ مرحوم اکثر یہاں آتا، کئی کئی دن رہتا اور اس کا اصرار یہ تھا کہ ''میرے سینے پر ہاتھ رکھ، اس سے سکون ہوتا ہے۔''

تقسیم جائیداد میں بڈھانہ کا سفر:

اس علی گڑھ والے قصہ کے چند سال بعد ایک واقعہ منجانب اللہ پیش آیا۔ ہمارے یہاں جدّی جائیداد نا معلوم کئی پشتوں سے مشترک چلی آرہی تھی، ایک دفعہ کاندھلوی اعزہ کا جرنیلی حکم پہنچا: ''تقسیم جائیداد میں تحصیل بڈھانہ میں سب افراد کو جانا ہے، سب کی شرکت نہایت ضروری ہے۔'' میں نے اول تو بڑی معذرت کی کہ وکالت نامہ جس کے نام کہو لکھ کر بھیج دوں۔'' مگر معلوم ہوا اور سارے ہی خاندان کا اصرار ہوا کہ بڈھانہ جانا بہت ضروری ہے۔ ایک شخص کے نہ ہونے سے سب کا معاملہ گڑبڑ میں پڑ جائے گا۔ بالجبوری جانا پڑا۔ بڈھانہ کے تحصیل دار صاحب، جناب الحاج احمد حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ جن کی ''مناجات احمد حسن'' مشہور ومعروف ہے، کے پوتے تھے، وہ صورت شناس تو نہ تھے مگر گنگوہ کی وجہ سے میرے والد صاحب اور میرے نام سے خوب واقف تھے کاندھلوی رؤسا سے ان کے اچھے تعلقات تھے، بڑی دعوتیں اور ڈالیاں ان کی خدمت میں پہنچا کرتی تھیں۔ اس لیے کہ روز کے مقدمات ان حضرات کے رہتے تھے اور باوجود

اس کے جیسا مقدمات میں ہوا کرتا ہے، بعض مقدمات میں کئی کئی دن لگ جاتے۔ تجویزیں یہ ہورہی تھیں کہ معلوم نہیں کتنے دن بڈھانہ میں ٹھہرنا پڑے گا، میں تو بڈھانہ سے بالکل ناواقف تھا، ان حضرات کی روز کی آمد ورفت تھی اور آپس میں اختلاف رائے ہورہا تھا کہ کس کے مکان پر ٹھہرا جائے؟ ہر شخص اپنے تعلق والے کو ترجیح دیتا تھا۔

علی الصباح کاندھلہ سے بہت سا کھانا دانا نہایت لذیذ، مرغن روٹیاں اور مرغے ساتھ تھے، کاندھلہ سے چل کر دس بجے کے قریب بڈھانہ پہنچے، تجویز یہ ٹھہری کہ پہلے سیدھے تحصیل میں چلیں۔ سامان کھانا وغیرہ سب ان بہلیوں میں چھوڑ دیا جو ان حضرات کی تھیں۔ ۲۵، ۳۰ آدمیوں کا مجمع سب روساء آگے آگے اور یہ ناکارہ کسمپرسی کی حالت میں پیچھے پیچھے، پیشکار صاحب نے دور سے مجھے دیکھا اور ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کر اور پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے کا اصرار کیا، میں نے شدت سے انکار کیا کہ میرے اعزہ ان میں بعض میرے اکابر بھی ہیں کھڑے ہیں اور میں بیٹھ جاؤں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ مگر پیشکار صاحب ہرگز نہ مانے اور زبردستی مجھے بٹھا دیا۔ یہ میرے سارے اعزہ نہایت سوچ میں پڑ گئے کہ کھلایا تو ساری عمر ہم نے، یہ کیا ہورہا ہے؟ ان کی زبردستی پر میں بیٹھ گیا اور انہوں نے کاغذات لے کر تحصیلدار صاحب سے کہا کہ حضور! سب سے پہلے ان کا کام ہوگا۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو انہوں نے میرے والد صاحبؒ کا نام لے کر کہا کہ ان کے صاحبزادے ہیں، مظاہر علوم میں مدرس ہیں۔ تحصیلدار صاحب نے کہا کہ اچھا اچھا، ان سے تو میں واقف ہوں۔ مگر میں بہت سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ یہ کہاں سے واقف ہیں۔ اللہ جل شانہ پیشکار صاحب اور تحصیلدار صاحب کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، اگر زندہ ہوں تو ترقیات عطا فرمائے اور عالم بقاء میں جا چکے ہوں تو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ تحصیلدار صاحب نے فوراً کاغذات لے کر گھنٹہ پون گھنٹہ تک بہت غور سے ان کو پڑھا، میں بیٹھا رہا اور یہ سب کھڑے رہے، ایک دو صاحب بینچ پر بیٹھ گئے اور تحصیلدار صاحب نے گھنٹہ پون گھنٹہ میں سب نمٹا کر دستخط کر کے کاغذات پیشکار کے حوالے کر دیے، میرے سب اعزہ کو حیرت ہورہی تھی اور سب سے زیادہ مجھے کہ یہ کیا ہورہا ہے؟

وہاں سے واپسی پر پیشکار صاحب میری مشایعت کو آئے اور تحصیل کے دروازے پر انہوں نے اپنی جیب سے بیس روپے نکال کر دونوں ہاتھوں سے مجھے پیش کیے میں نے بہت شدت سے انکار کیا، آپ کا تو یہی بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے ہمیں جلد فارغ کر دیا، ہم تو سوچ رہے تھے کہ رات کہاں ٹھہریں گے۔ میرے اعزہ نے میری تائید کی کہ پیشکار صاحب اس کی ضرورت نہیں، آپ نے تو بڑا احسان کیا، ہم سب کو جلدی نمٹا دیا، مگر وہ بہت اصرار کرتے رہے، میرے شدید انکار پر

انہوں نے یہ روپے جیب میں ڈال کر یہ کہا کہ ''یہ دو تین برس ہوئے میں نے آپ سے سہارنپور میں قرض لیے تھے، آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں فلانا ہوں۔'' ان کے تعارف پر مجھے یاد آیا کہ وہ مظاہر علوم کے کتب خانے میں ملازم رہ چکے ہیں اور اس زمانے میں مجھ سے قرض لیا تھا۔ ان کے اس کہنے پر میں نے کہا کہ ''پیشکار صاحب اب تو انکار کردیا سو کردیا، معاف ہیں۔'' پیشکار صاحب تو مصافحہ کر کے رخصت ہوگئے، میرے عزیز مرحوم نے جو علی گڑھ کے قصبے میں بہت زیادہ ناراض سال دو سال تک رہا، یہ کہا کہ آج تو تُو نے مجھے نیچا دکھلا دیا، میں تو قرض معلوم ہونے پر کبھی بھی واپس نہ کرتا اور الٹا ان کے سر ہوجاتا، کہ کئی برس کے قرض کی ادائیگی کو بھی ایسی طرح دے رہے تھے جیسے بڑا احسان کر رہے تھے، نذرانہ دے رہے تھے۔'' مجھے بھی حماقت سوار ہوئی، ایک چبھتا ہوا فقرہ کہہ دیا ''بھائی تم بڑے لوگ ہو، رؤسا ہو، میں فقیر، غریب، ذلیل زکوٰۃ کی روٹیاں کھانے والا، تمہارا مقابلہ کہاں کرسکوں۔'' جن دو چار کو پرانا واقعہ معلوم تھا وہ تو سمجھے کہ میں نے کیا کہا، لیکن مرحوم بہت شرمندہ ہوئے اور مجھے اس کے بعد سے بارہا قلق ہوا کہ کیوں حماقت کی؟ بات میں بات نکل جاتی ہے، کہیں سے کہیں بہک جاتا ہوں قصہ تو تھا معلقہ کا پہنچ گیا تحصیل بڈھانہ میں۔

آپ بیتی کے واقعات تو بہت ہی عجیب وغریب اور مالک کے ''لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی'' انعامات کے مظاہر ہیں۔

بہرحال معلقہ کا مرحلہ تو اللہ کے انعام واحسان سے ایسی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا کہ جس کا شکر ادا نہیں ہوسکتا، لیکن لوگوں پر گرانی بالخصوص ان پر جو اس کو بدلنا چاہتے تھے اور ناکام ہوئے، بلکہ ان کی کوششوں کا الٹا اثر ہوا اور ایک مخالفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس سلسلے کی جزئیات تو بہت لمبی چوڑی ہیں لیکن اس سلسلے کا اہم مسئلہ آئندہ سال شوال ۳۷ھ میں پیش آیا، میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ ''حضرت دل یوں چاہتا تھا کہ حضرت کے زیر سایہ فقہ کی کتابیں پڑھالیتا، ہدایہ ایک دو سال حضرت کے زیر تربیت پڑھالیتا تو پوچھنے میں سہولت رہتی۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا ''بہت اچھا۔'' میں نے عینِ تقسیم اسباق سے تھوڑی دیر پہلے حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا تھا۔ جب حضرت قدس سرہٗ، مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات تقسیم کے لیے بیٹھے تو بیٹھتے ہی حضرت قدس سرہٗ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ''تم نے ہدایہ اولین کو کہا تھا یا اخیرین کو؟'' میں نے عرض کی کہ حضرت! اولین کو۔ حضرت قدس سرہٗ نے مہتمم صاحب سے فرمایا ''ہدایہ اولین پہلے اس کے نام لکھ دو پھر آگے چلو۔'' اس پر سارے ہی مدرسین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں، حتیٰ کہ جو حضرات گزشتہ سال معلقہ میں میرے حامی تھے وہ بھی سوچ میں پڑ گئے کہ کُل صرف ایک سال ہوئی ہے اور اس وقت دستور یہ تھا کہ ہر مدرس کے پاس نئی

کتاب کم سے کم تین سال ہونا ضروری تھا اور شرح وقایہ پڑھانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مگر حضرت کے حکم کے بعد پھر کون بول سکتا تھا۔ ہدایہ اولین لکھا گیا اور جو گزشتہ سال معلقہ میں اپنی مساعی کو ناکام دیکھ چکے تھے، ان کو پھر اپنا غصہ نکالنے کا موقعہ ملا اور تقسیمِ اسباق کا نقشہ چسپاں ہوتے ہی ایک محاذ اس ناکارہ کے خلاف پیدا ہوا۔ مگر میرے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ تقسیم اسباق کے بعد اس خیال سے کہ مدرسین اور طلبہ کو کتابیں لینے میں کئی دن لگیں گے سیوہارہ وغیرہ کے سفر میں تشریف لے گئے اور یہاں حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ ہدایہ کے تبادلہ کی یورش ہوئی۔ مولانا ثابت علی صاحب تو مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر بات بات میں برسا ہی کرتے تھے اور خوب خفا ہوا کرتے تھے، ہدایہ کے متعلق مولانا عبداللطیف صاحب نے بھی مہتمم صاحب سے کہا کہ ''طلبہ میں شورش ہے اس کو بدل دینا چاہیے۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ''آپ کو معلوم ہے کہ حضرت نے بیٹھتے ہی کس اہتمام سے ہدایہ کو لکھوایا تھا، میں تو نہیں بدل سکتا، آپ تحریری حکم بھیجیں کہ صدر مدرس ہیں، مہتمم جزئیات ہیں، نگران دارالطلبہ ہیں، آپ کے حکم کی تعمیل میں بدل دوں گا۔'' اتنی ہمت تو مولانا عبداللطیف صاحب بھی نہ کرسکے کہ حضرت قدس سرہٗ کے حکم کو تحریری حکم سے منسوخ کرسکیں۔ اس ہدایہ میں مولانا عبدالشکور صاحب کاملپوری بھی تھے جو بعد میں کئی سال مظاہر میں مدرس رہے۔ تقسیم کے بعد راولپنڈی میں مدرس ہوگئے تھے اور حال ہی میں ۲۳ رجب ۹۰ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۷۰ء بروز جمعہ پونے چار بجے شام طویل بیماری کے بعد پنڈی میں انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ واعلی اللہ مرتبہ۔

طلبہ نے ہدایہ کی تبدیلی کی درخواست مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام لکھی اور سب نے اس پر دستخط کیے مگر مولوی عبدالشکور صاحب مرحوم نے دستخط کرنے سے انکار کردیا اور انہوں نے یہ کہا کہ حضرت سفر میں ہیں یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ بغیر حضرت کے کوئی نہیں بدل سکتا اور تمہارا سبق شروع کرنے سے پہلے یہ کہنا کہ ہم نہیں پڑھتے، اس کی کوئی وجہ نہیں، چند روز سبق پڑھ لو، تمہیں یہ کہنے کا حق ہوگا کہ سبق ہماری سمجھ میں نہیں آتا، ابھی سے کیا عذر کروگے؟ یہ بات طلبہ کی سمجھ میں آگئی اور سبق شروع ہوگیا اور معلقہ کے مخالفین نے یہاں بھی طلبہ کو شہ دی اور مولوی ادریس صاحب کی نصیحت نے یہاں بھی بہت کام دیا۔ میں نے دو تین دن تک تو مسلسل فقہ کی لغوی، اصطلاحی تعریفیں، ان کا درجہ، مصنف کے احوال اور جو جو سمجھ میں آیا سب کچھ کہا اور تین دن کے بعد بسم اللہ سے لے کر کتاب الطہارۃ تک ایک صفحہ پانچ دن میں پڑھایا۔ اس کے بعد بعض طلبہ تو ڈھیلے پڑگئے، لیکن بعض شری طلبہ نے پھر بھی درخواست کا ارادہ کیا، مگر اکثریت نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ''درخواست کا حشر معلوم ہے۔'' ''گھنٹہ کے نیچے سبق ہوگا۔'' یہ اس زمانے کی ایک خاص

اصطلاح تھی۔ وہ یہ کہ جس مدرس کے خلاف طلبہ کی طرف سے تبدیلِ سبق کی درخواست ہوتی تھی تو عین سبق کے وقت بلا پہلے سے کسی اطلاع کے حضرت قدس سرہٗ کا حکم مدرس کے پاس پہنچتا تھا کہ ''سبق گھنٹے کے نیچے ہوگا۔'' اور گھنٹہ سے مراد وہ گھنٹہ ہوتا تھا جو مدرسہ قدیم میں حضرت قدس سرہٗ کی سہ دری میں لگ رہا تھا۔ جواب تک اسی جگہ ہے مدرس گھنٹے کے نیچے بیٹھتا، طلبہ چاروں طرف اور حضرت نوراللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مرتبہٗ اپنے حجرہ مبارک کے دروازے پر اپنی مخصوص جگہ پر جو ہر وقت حضرت کے بیٹھنے کی تھی، تشریف رکھتے، طالب علم اس وقت میں مدرس کو خوب دق کرتے اور مدرس، حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے مرعوب بھی بہت ہوتا۔ ایک مصیبت عظمیٰ کا وقت ہوتا تھا۔ حضرت اس وقت کچھ نہیں فرماتے تھے، اگر حضرت کے نزدیک طلبہ کی شکایت بجا ہوتی تو مدرس کو خاص طور سے مطالعہ کی تنبیہ فرماتے، مگر تنہائی میں اور اگر طلبہ کی شکایت زیادہ قوی ہوتی اور مدرس کا نقص حضرت کے ذہن میں آجاتا تو پندرہ بیس دن بعد وہ کتاب کسی بہانے سے بدل دی جاتی اور اگر طلبہ کی شکایت غلط ہوتی تب تو نمبرا معمولی تنبیہ، نمبر۲ شری لوگوں کا حسب مناسب وقت کھانا بند، نمبر۳ شری لوگوں کا اخراج۔ یہ قانون سب لوگوں کو معلوم تھا، اس لیے اکثریت نے شدت سے انکار کیا کہ ہم دستخط نہیں کریں گے۔ درخواست کا حشر، گھنٹہ کے نیچے سبق ہوگا اور اس کا حشر معلوم ہے کہ اخراج اگر نہ ہوا تو کھانا تو کم از کم بند ہو ہی جائے گا۔ اس پر وہ درخواست رُل گئی۔

اس سیہ کار کے ساتھ یہ دو واقعے تو مخالفت کے پیش آئے، اللہ کے فضل سے ان دو کے علاوہ کوئی واقعہ ان چون (۵۴) سالہ مدرسی میں طلبہ کی طرف سے اعراض یا ناگواری کا پیش نہیں آیا۔ بلکہ طلبہ اور اس سیہ کار کی طرف اسباق کے منتقل ہونے کی مساعی کے پیش آتے رہے۔

بلکہ ۴۱ھ میں حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے ایک اہم واقعہ پیش آ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں شوال میں ترمذی دو گھنٹے ہوا کرتی تھی اور صفر کے آخر میں عموماً ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد اُنھی دو گھنٹوں میں بخاری شریف شروع ہوتی اور اوائل رجب میں ختم ہو جایا کرتی یہ ہمیشہ کا دستور تھا۔ حضرت قدس سرہٗ اس کے سخت مخالف تھے اور بار بار مدرسین پر نکیر بھی کرتے تھے کہ شروع سال میں لمبی لمبی تقریریں کی جائیں اور اخیر سال میں رمضانی حافظ کی طرح بلا تقریر کتاب پوری کرائی جائے۔ مولانا عبداللطیف صاحب کے یہاں چونکہ ترمذی، بخاری کی شروعات تھیں، اس لیے دوسرے مدرسین کی طرح ابتداء میں تقاریر کا زور ہوا اور جمادی الاخریٰ کے ختم تک بخاری کی ایک جلد بھی پوری نہ ہوئی۔ حضرت خوب ناراض ہوئے اور مہتمم صاحب سے فرمادیا کہ بخاری کے پارے دوسرے مدرسین پر منقسم کر دیئے جائیں۔ اس سیہ کار کا نام بھی خاص طور پر لیا۔ اس کو بھی کچھ پارے دے دینا۔ یہ فرما کر حضرت تو ایک دو دن کے لیے کسی سفر

میں بلند شہر وغیرہ کہیں تشریف لے گئے۔ مجھ پر اس قدر بوجھ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے مشکوٰۃ بھی اس وقت تک نہیں پڑھائی تھی۔ میں نے مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ ''بہت نامناسب ہوگا۔ آپ مجھے ہرگز نہ دیں۔ حضرت مولانا ثابت علی صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہی کو دیں۔'' مہتمم صاحب نے بھی موافقت کی۔ ان دونوں حضرات کو پانچ پانچ پارے دے دیئے گئے اور ساتھ آٹھ پارے مولانا عبداللطیف صاحب کے پاس بدستور رہے۔ تیسرے دن حضرت سفر سے واپس تشریف لائے، میں ڈاک لکھ رہا تھا۔ مہتمم صاحب سے دریافت کیا، ''پارے بانٹ دیئے؟'' مہتمم صاحب نے عرض کیا ''حضرت تقسیم کردیئے اس نے لینے سے انکار کردیا۔'' حضرت اس سیہ کار پر خوب ناراض ہوئے۔ فرمایا ''بہت اچھا۔ انکار کردیا تو ہماری پاپوش سے یوں چاہتے ہیں کہ ہماری خوشامد ہو۔''

حضرت قدس سرہٗ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ غصہ میں چہرہ سرخ ہوجاتا تھا۔ تھوڑی دیر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے سکوت فرمایا اور پھر نعلین شریفین اٹھا کر مکان تشریف لے جانے لگے۔ میں نے جلدی سے حضرت کے ہاتھ سے نعلین شریفین لے لیے اور پیچھے پیچھے دروازے تک گیا۔ دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہوکر میری طرف متوجہ ہوکر نہایت غصہ میں فرمایا: ''کچھ کہنا ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت تو ناراض ہی ہوگئے۔'' فرمایا ''ناراض نہ ہوں جب میرا کہنا نہ مانا۔'' میں نے کہا ''حضرت! توبہ توبہ مجھے تو یہ خیال ہوا کہ مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ دوسرے مدرسہ والے کیا کہیں گے کہ نوعمر لڑکے کو جس نے مشکوٰۃ بھی نہیں پڑھائی، بخاری دے دی۔'' حضرت نے فرمایا کہ ''نوعمر لڑکے کو میں کیا جانوں، دوسرے لوگ کیا جانیں، اگر کوئی الزام دے گا تو مجھے دے گا۔ تمہیں تو نہیں دے گا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت مجھے تعمیل ارشاد میں کیا انکار ہے۔'' حضرت نے فرمایا ''کہنا مان لوگے میں راضی ہوجاؤں گا۔'' میں وہاں سے آکر مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ ''آپ نے تو پٹوا ہی دیا۔'' آپ کو بحیثیت مہتمم کہنا چاہیے تھا کہ اس کے پاس مناسب نہیں تھا، اس لیے میں نے نہیں دی۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا ''ہاں مجھے پٹوانا چاہتا تھا۔'' اسی وقت از۱۳تا۱۵ پاروں کا اعلان اس سیہ کار کے نام ہوا۔ اس بخاری شریف میں قاری سعید مرحوم بھی تھے جو بعد میں مفتی اعظم مظاہر علوم ہوگئے تھے۔

ممکن تھا کہ اس بخاری پر کوئی معلقہ یا ہدایہ کی طرح خرخشہ اٹھتا، لیکن طلبہ میں میرے انکار اور حضرت قدس سرہٗ کی ناراضگی کا شہرہ قاری سعید مرحوم کے ذریعے اعلان سے پہلے ہی ہوگیا تھا، اس لیے اگر کوئی کہنا بھی چاہتا تو اس واقعے کے بعد کس کی ہمت پڑ سکتی تھی۔

اسٹرائک کی لعنت مدرسے میں نہیں تھی:

اسٹرائک کی لعنت اس وقت تک ہمارے مدارس میں نہیں آئی تھی۔ مدارس عربیہ والے اس منحوس لفظ کو جانتے ہی نہ تھے کہ کیا ہوتا ہے، اس وقت تک ہر بڑے چھوٹے کے نزدیک مدرسہ کے احسانات اہم اور قابل لحاظ تھے۔

ایک اصول جو میرے اکابر کے یہاں خاص طور سے تھا کہ دوسروں کے جو حقوق اپنے ذمہ ہوں ان کو ادا کرنا اپنا فریضہ ہے اور اپنے حقوق جو دوسروں کے ذمہ رہ جائیں، ان کی وصولی کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کا خاص طور سے اس قانون پر عمل تھا، وہ کسی بات میں یہ نہیں سوچتے تھے کہ دوسرا کیا کر رہا ہے، وہ ہر بات میں یہ سوچتے تھے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں بھی اور عزیز یوسف مرحوم کی تقاریر میں بھی یہ مضمون بہت کثرت سے ملے گا اور حدیث پاک سے بھی مستنبط ہوتا ہے:

"لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِي وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِيْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَ" ۔

"صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو برابر سرابر کا معاملہ رکھے، یعنی یوں کہے کہ جیسا وہ کرے گا ویسا میں کروں گا۔ بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کے ساتھ قطع رحمی کی جائے تو وہ قطع رحمی کرنے والے کے ساتھ بھی صلہ رحمی کرے۔" (مشکوٰۃ عن البخاری)

مدرسین کا مدرسہ کی خدمت:

مدرسہ کے معاملات میں نہ صرف اس ناکارہ کا، بلکہ اس زمانے کے تقریباً ہر مدرس اور ملازم کا یہ قانون اور اصول موضوعہ کے طور پر طے شدہ مفروضہ تھا کہ ہمارا کوئی حق مدرسہ پر نہیں، جو مدرسہ کی طرف سے مل رہا ہے وہ اللہ کا احسان اور اسی کا عطیہ ہے اور ثانیاً مدرسہ کا احسان ہے اور ہم لوگوں کا کوئی حق مدرسہ پر نہیں اور مدرسہ کا ہر کام چاہے کتنا ہی معمولی سا ہو حتیٰ کہ درس گاہ میں جھاڑو تک دینے سے بھی مدرس کو عار نہیں تھا۔

اس زمانے میں یاد نہیں کہ استنجاء کے ڈھیلوں کی اینٹوں کے لیے یا حمام کی لکڑیوں کے لیے کسی ملازم یا مزدور کو بلانے کی ضرورت کبھی پیش آئی ہو۔ میں نے دربان سے کہہ رکھا تھا کہ جب اینٹوں یا لکڑیوں کی گاڑی آئے اوپر درس گاہ میں مجھے اطلاع کر دے۔ میں گھنٹے کے ختم پر ایک طالب علم کو مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیتا تھا کہ "اینٹیں آئی ہوئی ہیں، میں نیچے جا رہا ہوں۔" مولانا مرحوم بھی فوراً نیچے پہلے پہنچ جاتے اور ہم دونوں کو جاتے دیکھ کر دونوں کے یہاں کی جماعتیں ایسی دوڑتیں کہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ جاتے۔ ہم دونوں کو ایک پھیرا بھی

مشکل سے کرنا ہوتا تھا کہ راستے میں کوئی طالب علم چھین لیتا تھا۔ لیکن اینٹیں ہوں یا لکڑیاں دو تین منٹ سے زائد گاڑیوں کے خالی ہونے میں نہ لگتے تھے، بہت سے طالب علموں کو ایک ہی پھیرا کرنا پڑتا تھا۔ نوعمر لڑکے اپنی جرأت دکھانے کیلیے ۲ پھیرے کر لیتے تھے۔

بہت سی جزئیات اس نوع کی ملیں گی۔ اب اس کے بالمقابل یہ منظر دیکھ کر کسی ملازم سے یوں کہیں کہ پنکھا اٹھا دے تو یہ سوچ کر کہ یہ میرا کام نہیں، اس کا معاوضہ کیا ہوگا۔ کسی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

ان نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

تعلیمی مخالفت کے متعلق لکھا جا چکا، معلقہ اور ہدایہ کے علاوہ کسی تعلیمی سلسلے میں مخالفت نہیں ہوئی۔ البتہ انتظامی سلسلے کے درمیان مختلف محاذ میرے خلاف شروع سے رہے اور بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ جتنا میں اس لائن سے بھاگا اتنا ہی میرے سر تھوپی گئی اور غور کے باوجود بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ مصیبت میرے کیوں لادی گئی؟

غالباً ۳۸ ھ یا ۳۹ ھ کا واقعہ ہے، میرے حضرت قدس سرہ اعلی اللہ مرتبہٗ بہاولپور تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نوراللہ مرقدہٗ بھی ہمرکاب تھے اور ہمارے مدرسہ کے ایک مدرس بھی ساتھ تھے، جو میرے بڑے مخلص، ان کا کھانا پینا اکثر میرے ساتھ، چائے تو مستقل میرے ساتھ پیتے ہی تھے، انہوں نے بہاولپور کے راستے میں بہت ہی اخلاص و محبت اور انتہائی راز میں ناظم صاحب سے کہا کہ ''میں آپ سے ایک بات بہت اخلاص سے راز میں کہتا ہوں، یہ مولوی زکریا جو حضرت کے ساتھ اتنی چاپلوسی ہر وقت کرتے ہیں، ان کا مقصد حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعد حضرت کی جگہ قائم مقام ہونے کا ہے، آپ کو گرانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔'' ناظم صاحب کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، انہوں نے کسی تصنع سے نہیں بہت اخلاص سے اس مرحوم سے یوں کہا: ''اگر مولوی زکریا کا ایسا ارادہ ہو تو وہ یقیناً اس کے بہت اہل ہیں، میں ان کے لیے کوشش کروں گا۔'' اور اتنا زور باندھا کہ وہ بیچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس کے بعد ناظم صاحب نے حضرت قدس سرہٗ سے ان کا یہ مقولہ نقل کر کے اپنی طرف سے بہت پرزور سفارش کی ''حضرت! مولوی زکریا اس کے بہت اہل ہیں، حضرت ان کو نائب ناظم بنا دیں، میں ان کی انتہائی مدد کروں گا۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا: ''وہ صاحب تو بے وقوف ہیں، اس سے تو میں واقف ہوں، اسے تو کوئی بنائے گا جب بھی نہیں بنے گا۔'' حضرت قدس سرہٗ نے بالکل صحیح فرمایا، مجھے اس سے ہمیشہ بہت ہی وحشت رہی۔

۴۴ھ میں میرا حج کا ارادہ بالکل نہیں تھا، شادی بھی ہو چکی تھی، دو بچیاں بھی ہو چکی تھیں اور ایک بچہ پیدا ہو کر انتقال کر چکا تھا، چوتھے کی امید تھی، قرضہ بدستور تھا۔ تعلیم میں اونچے مدرسوں میں شمار تھا، حدیث کے اسباق شروع ہو چکے تھے۔ شعبان ۴۴ھ میں حضرت قدس سرہٗ نے اپنی غیبت کے لیے جو انتظامات لکھوائے اس میں اس سیہ کار کو صدر مدرس بنایا اور حضرت عبداللطیف صاحب کو ناظم مدرسہ۔ وہ تحریر تھی تو بڑی راز میں، حضرت مہتمم صاحب لکھنے والے تھے، لیکن اس ناکارہ سے زیادہ راز نہیں تھا، اس لیے کہ وہ کاغذات اس ڈاک کے تھیلے میں رہتے تھے جو میرے پاس رہتا تھا اور جب میں نے یہ پڑھا کہ اس سیہ کار کا نام مدرس اول میں لکھا گیا تو میرا دماغ چکرا گیا، اس لیے میری نگاہ میں مدرس اول کے فرائض بہت سخت تھے سارے مدرسے کی تعلیم کا صدر مدرس واحد ذمہ دار، مدرسین کی تعلیم کی نگرانی بھی شرعاً عقلاً عرفاً اس کے ذمے۔ اس سے زیادہ مصیبت یہ تھی کہ جہاں کوئی علمی اجتماع یا کسی اونچی جگہ مدرسہ کا کوئی خصوصی احتفال ہوتا، صدر مدرسہ کے نام وارنٹ ہوتا کہ ''آپ آیئے۔'' میں نے حضرت قدس سرہٗ سے جب وہ اوپر پیشاب کے لیے تشریف لے جا رہے تھے اور یہ ناکارہ استنجاء کا لوٹا لے کر ریاکاری سے پیچھے پیچھے گیا اور جب حضرت استنجاء سکھلا رہے تھے، میں نے بہت سوکھا سا منہ بنا کر یوں عرض کیا ''حضرت بذل کا کیا ہوگا؟'' حضرت قدس سرہٗ نے بہت قلق کے ساتھ فرمایا کہ ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگا؟'' تمہارے بغیر تو میں لکھ نہیں سکتا اور تمہارے جانے کی کوئی صورت نہیں، اہل وعیال ساتھ ہیں، طویل قیام ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ حضرت اب تو یہ خیال ہے کہ ''میں حجاز چلوں۔'' حضرت قدس سرہٗ کا چہرہ اس وقت مجھے خوب یاد ہے خوشی سے کھل گیا۔ استنجاء پاک کر کے وضو کر کے نیچے تشریف لائے اور بیٹھ کر فرمایا، ''تمہارے خرچ کا کیا ہوگا؟'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت اس کا تو بالکل فکر نہیں کریں۔ میں ۳۸ھ میں بھی قرض لے کر گیا تھا، حالانکہ اس وقت ملنا بہت دشوار تھا اور اس وقت بہت آسان ہے، اب بھی لے لوں گا۔'' حضرت نے فرمایا ''تمہاری مدرسہ میں تنخواہ بھی کچھ جمع ہے۔''

اس کی شرح یہ ہے کہ ۳۵ھ میں جب میں ملازم ہوا تھا اور میری تنخواہ پندرہ روپے ہوئی تھی۔ اس وقت بڑے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالرحیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے مدرسہ میں تو سفارش کی تھی کہ ''پندرہ روپے تنخواہ بہت کم ہے، کم از کم پچیس روپے ہونی چاہیے۔'' اور مجھ سے یوں ارشاد فرمایا کہ ''جب اللہ توفیق دے مدرسہ کی تنخواہ چھوڑ دینا۔'' جس کا اثر یہ تھا کہ میرا حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ارشاد کی وجہ سے تو تنخواہ لینے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا، مگر میرے حضرت قدس سرہٗ لیتے تھے، اگرچہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کبھی نہیں لی، پھر بھی چونکہ میرے حضرتؒ لیتے تھے اس لیے نہ لینا بے ادبی سمجھتا تھا، اس لیے کسی ماہ میں اس کا غلبہ ہوتا تھا کسی ماہ

اسکا، البتہ نہ لینے کی وجہ سے میری ترقیاں رکتی رہیں، جب مدرسین کی ترقی کا وقت آتا اور دوسرے مدرسین کی ترقی ہوتی تو میں اس سے پہلے مہینوں میں تنخواہ لینے والا ہوتا تو میری بھی چار پانچ روپے ترقی ہوجاتی اور جس زمانے میں تنخواہ نہ لیتا، مہتمم صاحب فرمادیتے "وہ تو پہلے ہی سے نہیں لیتا، اس کی کیا ترقی؟"

بہرحال محرم ۳۵ھ سے شعبان ۴۴ھ تک نو سو پینتالیس روپے میری تنخواہ کے جمع تھے جو اس زمانے میں حج کے اخراجات سے بہت زائد تھے، حج کا خرچ اس زمانے میں زیادہ سے زیادہ کا چھ سو روپے تھے۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ تھا کہ بقدر اخراجات لے کر بقیہ اہل وعیال کے خرچ کے لیے دے دیئے جاویں۔ میں نے عرض کیا کہ "حضرت اس کا فکر نہ فرماویں، خرچ کا انتظام ہوجائے گا، اس تنخواہ کا لینا تو جائز نہیں۔" اکابر کی خدمت میں گستاخ تو ہمیشہ ہی رہا۔ حضرت نے فرمایا "کیوں؟" عرض کیا "حضرت جن مہینوں کی تنخواہ نہیں لی ان میں اس نیت سے پڑھایا کہ تنخواہ نہیں لوں گا، اب اس کے لینے کا کیا حق ہے؟" حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "تم نے کوئی درخواست مدرسہ کو دی؟ تم اجیر تھے، مدرسہ مُستأجِر، تمہیں یک طرفہ فسخ اجارہ کا کیا حق تھا؟ جب تک کہ ہم قبول نہ کریں۔" میں نے عرض کیا "حضرت اس میں اجارے کی تو کوئی بات نہیں، ایک شخص کام کرتے ہوئے یہ نیت کرلے کہ لوجہ اللہ کررہا ہوں اس کے بعد معاوضہ لینے کا کیا حق ہے؟" حضرت ناظم صاحب بھی تشریف فرما تھے انہوں نے حضرت سے عرض کیا "حضرت میں انہیں سمجھادوں گا۔" حضرت بہت خوش ہوئے اور میں بھی بہت خوش ہوا، حضرت کے سامنے تو میں بہت ادب سے ڈرتے ڈرتے کوئی لفظ کہوں گا اور ناظم سے خوب کھل کر مناظرہ ہوا، انہوں نے حضرت سے عرض کردیا کہ "حضرت یہ نہیں مانتا" حضرت تھانوی قدس سرہٗ بھی مدرسہ کے سرپرستوں میں تھے اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تھانہ بھون کے مفتی اعظم اور مجھ سے بے حد بے تکلفی، میں نے ان سے کہا کہ "مدرسہ کے کاغذات میری تنخواہ کے سلسلے میں حضرت کے پاس آویں گے، حضرت سے میری تنخواہ نامنظور کرادیجیو۔" انہوں نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے نہ معلوم کیا کہا، جب میری درخواست ڈیڑھ سال کی چھٹی کی اور مہتمم صاحب کی طرف سے اس پر یہ تحریر کہ اس کی تنخواہ بھی کچھ رکی ہوئی ہے اس کے دینے کی بھی اجازت دی جائے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے چھٹی بخوشی منظور فرمائی اور تنخواہ کے متعلق تحریر فرمایا کہ "اگر قبض الوصول میں تنخواہ درج ہے اور انہوں نے وصول نہیں کی تو اس میں سرپرستان سے اجازت کا کیا مطلب؟ دی جائے اور اگر اس میں کوئی اور اشتباہ ہے تو اس کو ظاہر کیا جائے تاکہ اس پر غور کیا جائے۔" مولانا عاشق الٰہی صاحب بھی اس وقت سرپرست بنائے گئے تھے، یہاں آئے، میں نے ان سے

بھی عرض کیا کہ ''تم سرپرست ہو اس تنخواہ کا لینا میرے لیے جائز نہیں، اسے نامنظور کر دیجئے۔'' لیکن حضرت قدس سرہٗ کی منظوری کے بعد حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ تو رد فرما سکتے تھے، خدام میں سے کس کو ہمت پڑتی؟ یہ گستاخیاں تو اللہ میاں نے اس ناکارہ کے حق میں رکھی تھیں، جو ہمیشہ کرتا رہا، مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اول تو مجھ سے مناظرہ کیا اور جب ناظم صاحب کی طرح وہ بھی مناظرے میں غالب نہ آئے تو انہوں نے بحیثیت سرپرست میرے کاغذ پر لکھا ''ڈیڑھ سالہ رخصت منظور ہے اور تنخواہ کے سلسلے میں جیسا کہ اس کی طرف سے رخصت کی درخواست ہے، اسی کی طرف سے یہ درخواست بھی ہونی چاہیے کہ میری تنخواہ مدرسہ سے دلوائی جائے۔'' حضرت قدس سرہٗ نے جب حضرت میرٹھی کی تحریر دیکھی تو سمجھ گئے کہ میرا ان سے بھی مناظرہ ہوا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے بہت ہی شفقت سے مجھ سے یوں فرمایا کہ ''بذل میرا ذاتی کام تو نہیں، مدرسہ ہی کا کام ہے، اگر میں سرپرستان کی منظوری کے بعد تمہیں بکارِ مدرسہ اپنے ساتھ لے جاؤں اور آمد و رفت کے خرچ کے علاوہ وہاں کے قیام کی تنخواہ مدرسہ سے دلواؤں تو تم کیا کہوگے؟'' میں نے عرض کیا ''حضرت! یہ عرض کروں گا بالکل جائز ہے ذرا تردد نہیں۔'' حضرت نے فرمایا ''تمہاری جمع شدہ تنخواہ تو بہت کم ہوگی جتنا کہ اس صورت میں مدرسہ تم کو دے گا۔'' میں نے کہا ''بالکل صحیح ہے۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا ''پھر تم یہی سمجھ لو۔'' اس پر میں نے تنخواہ تو لے لی، لیکن حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کچھ ایسا غالب تھا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر میں نے سب سے پہلے مہتمم صاحب کو ایک خط لکھا، جس میں اس تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ یہ لکھا کہ ''میرا ارادہ ایک عرصہ سے مدرسہ کے ان حقوق کے معاوضہ میں جو مجھ پر ہیں مدرسہ میں ایک بڑی رقم پیش کرنے کا ہو رہا ہے مگر آپ کو معلوم ہے کہ مجھ سے جمع ہونا ناممکن ہے، اس لیے بالفعل میری طرف سے صرف ایک ہزار روپے کا وعدہ اس طرح تحریر فرمالیں کہ اسی ماہ جمادی الاولیٰ سے مبلغ پانچ روپے ماہانہ میری واپسی تک میرے کارکن مولوی نصیر الدین سے اور بعد واپسی کے خود مجھ سے وصول فرماتے رہیں، اگر اس کے پورا ہو جانے سے قبل میرا انتقال ہو جائے تو اس وقت جس قدر رقم باقی ہو وہ میری وصیت ہے جو کہ متروکہ سے وصول کی جائے۔'' الخ محررہ از مدینہ طیبہ۔ ۵ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ۔

اللہ کے فضل سے جب یہ رقم ادا ہوگئی تو مجھے رائپوری جذبہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پہلے زمانہ میں جو تنخواہیں لی ہیں وہ بھی واپس کر دی جائیں۔ اللہ نے وہ بھی واپس کرا دیں۔

لِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّہٗ،

اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ، اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ۔

ذیقعدہ ۴۵ھ میں جب اس ناکارہ کی بذل کے اختتام کے بعد واپسی ہونے لگی تو حضرت مولانا سید احمد صاحب قدس سرہٗ بانی مدرسہ شرعیہ نے میرے وہاں مستقل قیام پر بہت ہی اصرار کیا اور میرے حضرت قدس سرہٗ سے بار بار درخواست کی ''مدرسہ شرعیہ کی صدر مدرسی کے لیے اس کو قیام کی اجازت دے دیں۔'' مگر میرے حضرت قدس سرہٗ نے یہ فرمایا کہ ''آپ کا مدرسہ ابھی ابتدائی ہے اور مظاہرِ علوم عروج پر ہے، اس کے لیے اس کے واپس جانے کی زیادہ ضرورت ہے، میری غیبت میں اس کا قیام وہاں ضروری ہے، اس کے نہ جانے سے مدرسہ کو نقصان کا اندیشہ ہے۔'' مولانا سید احمد صاحب کا ارشاد تھا جس کو انہوں نے حضرت سے بھی کئی بار عرض کیا کہ میں مولوی الیاس کے پاس اس کے بیوی بچوں کا کرایہ بھیج دوں وہ پہنچا دیں گے۔ مگر حضرت نے قبول نہ کیا اور میری واپسی کے وقت حضرت نے جب عارضی غیبت کے انتظامات کو مکمل فرمایا تو بڑی لمبی تحریر مدرسہ کے انتظامات کے سلسلہ میں حضرت مولانا سید احمد صاحب سے لکھوائی، اس میں سیہ کار کے متعلق دو نمبر لکھوائے۔

بندہ کی مشیر ناظم کی تجویز:

ایک یہ کہ زکریا کو حدیث سے جتنی مناسبت ہے، میں اسے خوب جانتا ہوں، اس لیے اس کو مدرسہ کا شیخ الحدیث تجویز کرتا ہوں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صدر مدرس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب ایک سال پہلے ہو چکے تھے، ان کو اس عہدہ سے ہٹانے کی کوئی وجہ نہیں تھی، اس عہدہ کی ابتداء اس سیہ کار سے ہوئی، ورنہ اس سے پہلے مدارس میں مدرسِ اول اور شیخ الحدیث ایک ہی عہدہ تھا۔ حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ نے کئی مرتبہ تفریحاً و مزاحاً یہ ارشاد بھی فرمایا کہ ''یہ نیا عہدہ آپ کی خاطر تصنیف کیا گیا ہے۔'' مگر پھر دارالعلوم کو بھی ایسی ہی مجبوری کی وجہ سے شیخ الحدیث اور مدرسِ اول دو عہدے بنانے پڑے۔ حضرت قدس سرہٗ کی یہ تحریر جب یہاں پہنچی اور حضرات سرپرستان کے یہاں منظوری کے لیے گئی تو اور تو کون انکار کرتا حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس پر ایک اشکال فرمایا کہ ''ان سے پہلے اکابر مدرسین مولانا ثابت علی صاحب، مولانا عبداللطیف صاحب وغیرہ موجود ہیں، ان کے لیے یہ تفوق موجبِ تکدر نہ ہو، اس کو غور کر لیا جائے۔'' حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی کا یہ اشکال میرے حضرت کو لکھا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے جواب میں لکھا کہ ''اگر اہلِ مدرسہ کو من حیث المدرسہ مدرسہ کی طرف سے اس میں کوئی تردد ہے تو میں اپنی طرف سے یہ خطاب اس کو دیتا ہوں۔'' حضرت قدس سرہٗ کی برکت سے اس نے ایسی شہرت پائی کہ نام سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

انگریزوں کے زمانے میں حضرت قدس سرہٗ کے تار بہت کثرت سے کراچی، لکھنؤ، کلکتہ وغیرہ

سے آتے تھے، ان میں پتہ صرف ''شیخ الحدیث صاحب سہارنپور رحمہ اللہ تعالیٰ'' ہوتا، مدرسہ کا نام بھی نہیں ہوتا تھا، مگر پہنچ جاتے تھے۔

دوسرا نمبر میرے حضرت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کے متعلق ''نائب ناظم مدرسہ'' کا لکھا۔ اس عہدے سے مجھے اس سے بھی زیادہ وحشت ہوئی جتنی ایک سال پہلے صدر مدرسی کے عہدے سے ہوئی تھی، میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ اس انتظامی جھگڑے میں پڑ کر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ تو جاتا رہے گا، ناظم صاحب کے مزاج میں پھیلاؤ بہت ہے، یہ ساری مصیبت مجھے بھگتنی پڑے گی۔ یہ تحریر حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے قلم کی تھی، میں نے حضرت مرحوم سے بہت ہی خوشامد لجاجت سے عرض کی کہ ''اس مصیبت کو میرے سے ہٹائیے۔'' انہوں نے کہا، حضرت کی تجویز ہے تمہیں خوش ہونا چاہیے۔'' چنانچہ میں نے بڑی خوشامد کی اور یاد پڑتا ہے کہ پاؤں بھی پکڑے اور آبدیدہ ہو کر ان سے درخواست کی، انہوں نے میری حالت دیکھ کر حضرت سے عرض کیا کہ حضرت میں نے اس تحریر کا زکریا سے ذکر نہیں کیا، مگر معلوم نہیں کہ اس نے کہاں سے دیکھ لی، وہ تو اس سے بہت ہی گھبرا رہا ہے اور رنجیدہ ہے، یوں کہتا ہے کہ میرا علمی حرج بہت ہو جائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ ''مجھے اس پر اطمینان ہے کہ وہ اپنا علمی حرج بالکل نہیں کرے گا، اس نے تو مجھے بھی کبھی رسید نہیں دی، وہ ان موجودہ سرپرستوں کے بس کا نہیں۔ یہ سرپرست اس سے کوئی ایسا کام نہیں لے سکتے جس میں اس کا حرج ہو۔''

حضرت مولانا سید احمد صاحب سے مایوس ہو کر میں نے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاؤں پکڑے کہ حضرت مولانا کو بھی حضرت قدس سرہٗ نے اپنی روانگی حجاز ۴۴ھ میں مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور شیخ رشید احمد صاحب کے ساتھ مدرسہ کا سرپرست بنایا تھا۔ میں نے حضرت رائپوری سے عرض کیا کہ ''وہ تحریر آپ کو بحیثیت سرپرست ضرور دکھائی جائے گی، اللہ کے واسطے اس کو منظور نہ کریں''۔ حضرت رائپوری نے فرمایا ''بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ حضرت ایک تحریر لکھیں اور میں اس پر انکار کروں۔'' چنانچہ جب وہ تحریر مکمل ہو گئی تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے حضرت رائپوری کو بحیثیت سرپرست وہ تحریر دکھلائی اور اس کی تاکید فرمائی کہ ''کوئی اشکال ہو تو ضرور کہیں، میرے لکھنے کی وجہ سے سکوت نہ فرماویں۔'' اور میں اس وقت، خوب یاد ہے، بڑی لجاجت سے اس دعا میں مشغول تھا کہ ''یا اللہ! یہ مصیبت مجھ سے ہٹا لے۔'' جب حضرت رائپوری اسے ملاحظہ فرما چکے اور حضرت قدس سرہٗ نے پوچھا ''کوئی اشکال تو نہیں'' تو حضرت رائپوری نے اپنی عادت کے موافق اول تو بڑی توبہ کی ''حضرت توبہ توبہ! حضرت کی تحریر میں کیا اشکال ہو گا؟'' مگر حضرت قدس سرہٗ کو بھی حضرت رائپوری کی عادت تواضع کی معلوم تھی،

اس لیے کئی دفعہ اصرار فرمایا کہ ''کوئی اشکال ہو تو فرمادیں۔'' اس پر حضرت نے پھر یہ کہہ دیا کہ ''حضرت بڑی بے ادبی ہے، گستاخی ہے، ایک خلجان توبہ توبہ یہ پیش آیا کہ مولوی زکریا کے متعلق حضرت نے دو نمبر لکھے پہلے نمبر میں تو ان کی حدیث دانی کو اور علو شان کو ایسا بڑھایا کہ مدرسہ میں کوئی ان جیسا حدیث داں نہیں ہے اور دوسرے نمبر میں حضرت نے ان کو نائب لکھا۔'' حضرت نے بے تکلف کاغذ اپنے دستِ مبارک میں لے کر ''نائب'' کے لفظ پر اپنے دستِ مبارک سے قلم پھیر کر اس کے اوپر ''مشیر'' کا لفظ لکھ دیا۔ ''مشیرِ ناظم'' کا عہدہ مدرسہ میں پہلے بھی تھا کہ کئی سال قبل حضرتِ اقدس تھانوی قدس سرہٗ نے سرپرستی کی ذمہ داریوں سے معذوری ظاہر کر کے سرپرستی سے استعفاء دیا تھا۔ اس وقت میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے والد مولانا جمعیت علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دونوں مشیرِ ناظم تجویز کیے گئے تھے۔

یہاں واپسی کے دو تین سال بعد حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، شیخ رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا سر رحیم بخش صاحب تینوں کا مشورہ بعض امور کی بناء پر یہ ہوا کہ نظامت کے دو حصے کیے جائیں، ایک ناظمِ تعلیمات اور دوسرا ناظمِ مالیات۔ ناظمِ مالیات کا عہدہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے سپرد رہے اور ناظمِ تعلیمات کا عہدہ اس ناکارہ کی [illegible]ف منتقل کیا جائے۔ اس تجویز کے وقت میں بھی اس ناکارہ نے بہت ہی شدت سے خلاف کیا، [illegible] ان تینوں بزرگوں نے میرے شدید اختلاف کے باوجود یہ تجویز مدرسہ میں پاس کر کے ''احکامِ [illegible]ستاں'' میں لکھ کر بقیہ حضرات سرپرستان سے بھی منظوری کرالی۔ ان کی تشریف بری کے بعد [illegible]ں نے الحاج شیخ رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو ایک زوردار خط لکھا، جس میں میں نے لکھا کہ [illegible]رے اور ناظم صاحب کے تعلقات اس قدر مضبوط اور بہتر ہیں کہ اگر ایک جان دو قالب کہا [illegible]ئے تو بے محل نہ ہوگا۔ ناظم صاحب میرا اس قدر لحاظ فرماتے ہیں کہ گویا مجھے بڑا بنا رکھا ہے اور وہ میرے استاذ ہیں، اس تجویز کے بعد تعلقات میں وہ خوشگواری ہرگز نہیں رہ سکتی جو پہلے تھی، یا تو اس تجویز کو منسوخ فرماویں، ورنہ انشاء اللہ آپ حضرات تلاش کرتے پھریں گے کہ زکریا نامی بھی کوئی شخص مظاہر علوم میں کبھی تھا۔'' شیخ صاحب کو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے، بہت ہی بلند درجے عطا فرماوے، بہت ہی مدبر، دوراندیش، مدرسہ کے معاملات میں اپنے جذبات کو ہمیشہ پسِ پشت ڈالا۔ مرحوم کے جملہ معترضہ کے بیسویں واقعات اس کے شاہد عدل ہیں اور بہت ہی لطف آمیز۔ جملہ معترضہ کے طور پر ایک واقعہ اس وقت شیخ صاحب کی علوِ شان، مدرسہ کی مصالح کو اپنی مصالح پر مقدم کرنے کا لکھواتا ہوں۔

سہارنپور میں جمعیۃ العلماء کا مشہور و معروف اجلاس ۴۵ء ہونے والا تھا، تین دن کا اجلاس تھا۔

میں نے حضرت ناظم صاحب سے کہا کہ جمعیۃ کے اجلاس کے دنوں میں مدرسہ میں تین دن کی چھٹی ہوگی۔ حضرت ناظم نے غصے سے فرمایا ''یہ کیسے ہوسکے گا؟ آج جمعیۃ کے واسطے چھٹی کردیں، کل کو لیگ والے کریں گے اس میں بھی چھٹی کرنی پڑے گی، پھر احرار، کانگریس، یہ تو روز کی بھرمار ہے اور مدرسہ کا تعامل بھی ان اجلاسوں میں چھٹی کا نہیں، یہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' بڑی مدلل تقریر فرمائی۔ میں نے ساری سن کر پھر کہہ دیا کہ ''جمعیۃ کے اجلاس کے درمیان مدرسہ میں چھٹی ہوگی۔'' ناظم صاحب کو غصہ آ گیا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے کہا، وہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اجل خلفاء میں تھے، انہوں نے اور بھی زیادہ شدت سے انکار کیا کہ ''چھٹی ہرگز نہیں ہوگی۔'' اتفاق سے شیخ رشید احمد صاحب آ گئے، حضرت ناظم صاحب نے بہت تعجب سے میری شکایت شیخ جی سے کی اور کہا کہ یہ تو روز کے قصے ہیں، جو مضمون اوپر گزرا۔

شیخ صاحب کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، بڑے ہی سمجھ دار تھے اور اس سے بڑھ کر کمال یہ تھا کہ مدرسہ کی مصالح اپنے جذبات پر ہمیشہ مقدم سمجھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''چھٹی ضرور کرنی ہے اور ہم سے اجازت ہرگز نہ لینا، ہم لوگ اس چھٹی کی بہت مخالفت کریں گے، بالخصوص حضرت تھانوی کے انکار کے بعد آپ کو چھٹی کرنی مشکل ہوجائے گی اور چھٹی کرنی ضروری ہے، بہت سے بہت یہ ہوگا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات پیش آئی تو میں اعتراض کروں گا کہ آپ نے ہماری بغیر منظوری کیسے کردی؟ آپ لکھ دیجئے گا کہ عین وقت پر شیخ الحدیث صاحب وغیرہ کی رائے یہی ہوئی، اس کی گنجائش نہ تھی کہ سرپرستان سے اجازت لی جائے، لہٰذا معاف فرماویں، آیندہ لحاظ رکھا جائے گا۔'' ناظم صاحب اور شیخ صاحب کی گفتگو میرے سامنے نہیں ہوئی لیکن اول شیخ جی مرحوم نے اور ان کے جانے کے بعد ناظم صاحب نے ایک ہی مضمون سنایا اور ناظم صاحب نے مجھ سے تعجب سے فرمایا کہ ''شیخ جی تو دلی کی لیگ کے صدر ہیں، مسٹر جناح کے بڑے دوست ہیں وہ بھی جمعیت کی چھٹی کی تائید کر گئے ہیں۔'' میں نے عرض کیا ''حضرت بڑی کھلی ہوئی بات ہے، دیوبند میں ایک ہفتے کی چھٹی ہے اور جلسہ لیگ، کانگریس کا نہیں جمعیۃ العلماء کا ہے، ایسی حالت میں مظاہر علوم سبق پڑھائیں، بہت مشکل ہوگا۔'' اس کے علاوہ شیخ صاحب کے اپنے جذبات کے خلاف مدرسہ کے مصالح کو مقدم رکھنے کے واقعات بہت ہیں۔

میرے اس خط پر جس کا نظامت کے دو ٹکڑوں کے متعلق اوپر ذکر آیا شیخ صاحب کو (اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرماوے) بہت غصہ آیا ان کا والا نامہ آیا کہ حکم نامہ پہنچا، ہم تو یہ سمجھے کہ سرپرست بھی آپ ہی ہیں ناظم بھی آپ ہی ہیں، جس سے جو کام لینا ہوا، حکم نامہ لکھ دیا، آپ کے حکم کی تعمیل کردی گئی اور میں نے مولانا عاشق الٰہی صاحب اور سر رحیم بخش صاحب کو لکھ دیا کہ یہ

تجویز بعض مصالح کی بناء پر ابھی قابلِ عمل نہیں، آیندہ اجتماع پر اس میں دوبارہ غور ہو جائے گا۔''

ان سب باتوں کے باوجود معلوم نہیں اس سیہ کار کے متعلق بعض احمقوں کو یہ خیال کیوں ہوتا تھا کہ میں نظامت پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات ضرور تھی کہ مدرسہ میں خواص اور صاحبزادوں کے خلاف میرا ہاتھ زیادہ چلتا تھا اور اس میں بھی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب، قاری سعید صاحب مرحوم مجھ کو زیادہ ابھارتے تھے، بلکہ تقریباً مجبور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بہت بڑے خاص بلکہ اخص الخواص نے مدرسہ میں ایک درخواست دی کہ مجھے فلاں حجرہ تنہا کو دے دیا جائے اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ان کی خصوصیات کی بناء پر اس پر سفارش بھی لکھ دی، لیکن میرے پاس فوراً خود ہی آئے اور فرمایا کہ ''فلاں نے حجرہ کی درخواست دی اور میں نے سفارش بھی کر دی، مگر تنہا حجرہ مانگنے والے کے لیے نہایت مضر ہے ہی، مدرسہ کے لیے بھی مضر ہے۔'' میں نے کہا ''پھر آپ نے مضر سمجھنے کے باوجود سفارش کیوں کی؟'' فرمایا کہ ''مجبوری تھی، مگر آخر منظوری تمہاری ہی ہوگی، اس لیے جلدی اطلاع کرنے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔'' حضرت ناظم صاحب کی خدمت میں جب وہ درخواست مع صدر مدرس صاحب کی سفارش کے پہنچی تو انہوں نے لکھ دیا کہ ''اگر شیخ الحدیث صاحب منظور کرلیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔'' میں نے انکار لکھ دیا۔ درخواست دینے والے کو اس ناکارہ پر جتنا بھی غصہ آئے وہ معذور ہے کہ صدر مدرس صاحب نے سفارش لکھ دی، ناظم صاحب نے منظوری دے دی اور میں نے انکار لکھ دیا۔

اس قسم کے قصے تقریباً روزانہ ہی پیش آتے تھے، اس وجہ سے خواص اکثر مجھ سے خفا رہتے اور ان کی خفگی بالکل برمحل تھی۔ حضرت ناظم صاحب کے خواص، مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے خواص اور دونوں سے بڑھ کر میرے حضرت قدس سرہٗ کے خواص، ان لوگوں کے خلاف میرا ہی ہاتھ زیادہ چلا کرتا تھا، اس لیے ان خواص کا مجھ سے ناراض رہنا یا ہونا، بالکل برمحل تھا۔

اخبار مدینہ کا غلط الزام:

۵۷ھ میں اخبار مدینہ کے ایڈیٹر بزمی صاحب مرحوم کے ایک عزیز مدرسہ میں پڑھتے تھے، انہوں نے چند خواص کی جن کی ناراضگی مجھ سے برمحل اور فطری تھی، میرے خلاف شکایت لکھ کر اور لکھوا کر اخبار مدینہ کے دفتر میں بھیج دی، ایڈیٹر مرحوم کو کیا خبر؟ انہوں نے مختلف خطوط ایک شخص کے خلاف شکایات کے دیکھے تو انہوں نے میرے خلاف اخبار مدینہ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ۹ جون ۳۸ء میں ایک مضمون بہت سخت لکھ دیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے جب اس کو پڑھا تو ایڈیٹر صاحب کو سخت خط لکھا کہ ''شیخ الحدیث صاحب کے خلاف آپ نے جو مضمون لکھا ہے، میں

ان سے اس وقت سے واقف ہوں جب کہ ان کی عمر بارہ برس کی تھی اور اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، ان کے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔'' حضرت کے ارشاد میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے، جب کہ ۱۳۲۷ھ میں حضرت قدس سرہٗ کا دو ماہ مسلسل گنگوہ میں قیام رہا، اس وقت میری عمر بارہ برس کی تھی اور وہی میرا ابتدائی تعارف حضرت مدنی قدس سرہٗ سے ہے، اس کی تفصیل شاید کہیں آجائے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رئیس الاحرار نے مجھ سے بیان کیا کہ میں لاہور میں ہوٹل میں چائے پی رہا تھا، جب میں نے مدینہ کا یہ مضمون دیکھا میں نے ہوٹل ہی میں بیٹھے ہوئے ایک کارڈ ایڈیٹر صاحب کو لکھا کہ ''میں شیخ الحدیث صاحب سے اس وقت سے واقف ہوں جب ان کی طالب علمی کا آخری دور تھا، میں اس وقت سے انتہائی واقفیت کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ اطلاعات جو آپ کو دی گئی ہیں انتہائی غلط ہیں۔'' مولانا الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند اور حضرت شاہ یٰسین صاحب نگینوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطوط کا تو مجھے علم ہے۔ سنا ہے کہ لکھے گئے بہت سے، لیکن ایڈیٹر مرحوم نے کسی اور کے خط کے جواب کی تو ضرورت نہیں سمجھی البتہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کو لکھا کہ میرے پاس اس کے خلاف شکایات کے خطوط کا انبار ہے آپ جب فرمائیں میں لے کر حاضر ہو جاؤں۔ حضرت نے لکھا ''یہاں لانے کی ضرورت نہیں، فلاں تاریخ میری خالی ہے، میں اس تاریخ پر سہارنپور پہنچ جاؤں گا، آپ بھی مولانا مجید حسن صاحب مالک خبار مدینہ کو لے کر سہارنپور پہنچ جائیں۔'' اور ایک کارڈ سے حضرت نے مجھے بھی اطلاع فرمادی کہ ''میں ان لوگوں کے ساتھ فلاں تاریخ کو ان شکایات کی تحقیق کرنے آؤں گا جو فلاں اخبار میں چھاپی گئی ہیں۔'' میں نے اپنے سرپرستان کو بھی اس کی اطلاع کردی، حضرت میرٹھی کو تو ناگوار ہوا کہ سرپرستان سے مشورے کے بعد تاریخ مقرر ہونا چاہیے، لیکن شیخ رشید احمد صاحب کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے انہوں نے لکھا کہ شوق سے آئیں میں بھی اس تاریخ پر سہارنپور پہنچ جاؤں گا۔ معلوم نہیں رئیس الاحرار صاحب کو کس طرح اطلاع ہوئی کہ وہ بھی تاریخ سے ایک دن پہلے پہنچ گئے۔

۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء مطابق ۱۸ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ کو یہ حضرات تشریف لے آئے اور صبح کے کھانے کے بعد سے لے کر دوپہر کو لیٹے بھی نہیں، رات کے بارہ بجے تک شا کی لوگوں کو ایک ایک کو بلایا جاتا اور ان کے بیانات قلمبند کیے جاتے تھے، مغرب کے بعد تک ان کا سلسلہ رہا۔ اس ناکارہ کے خلاف تو ایک شکایت سب کی مشترک تھی کہ نظامت کو مفلوج کر رکھا ہے، اس پر قبضہ کرلیا ہے، ناظم صاحب ایک عضو معطل بن گئے ہیں لیکن جب وہ اس کے کچھ جزئیات اور ثبوت مانگتے تو شا کی چپ ہو جاتا۔ ایڈیٹر صاحب کہتے کہ ''حضرت سے مرعوب ہیں۔'' حضرت فرماتے

''پھر تحقیق کی کیا صورت؟'' بعض ملازمین اور بعض مدرسین کے متعلق بھی کچھ شکایات انہوں نے کیں جس کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا، مجھ سے کوئی چیز دریافت نہیں کی، البتہ حضرت ناظم صاحب قدس سرہٗ سے میرے متعلق سوال کیا گیا اور حضرت مدنی قدس سرہٗ نے بلند آواز سے جس کو دور والوں نے بھی سنا، یہ فرمایا ''یہ آپ کے شاگرد یہ کہتے ہیں کہ مولوی زکریا نے آپ کو بالکل مفلوج کر رکھا ہے، آپ کو عضو معطل بنا دیا ہے۔'' حضرت ناظم صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا ''بالکل غلط، بے بنیاد، یہ شیخ الحدیث صاحب میرے دستِ راست، ان کے مشوروں اور رہنمائی سے مجھے بڑی سہولتیں ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو مجھے بڑی دقت ہو اور اگر یہ نظامت قبول کریں تو میں بڑی خوشی سے ان کے حق میں دستبردار ہوں۔'' حضرت مدنی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا ''اسے کہیں مدعی سست گواہ چست۔'' اس کے بعد جو فیصلہ لکھا وہ یہ تھا:

''مدینہ'' مورخہ ۹ جون ۳۸ء میں مدرسہ مظاہر علوم کے متعلق شکایات ونقائص کی جو تفصیل شائع ہوئی تھی ان کی ہم نے آج تحقیقات کی اور ہم اس امر کا اعتراف کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں کہ یہ شکایتیں بے اصل اور بے بنیاد ہیں، مدرسہ کے اربابِ اہتمام کے تمام کاموں میں نیک نیتی اور دیانت داری بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ یہ حضرات مدرسہ کی اصلاح اور درستگی کے کاموں کی طرف ہمیشہ متوجہ رہیں گے اور جو چیزیں اصلاح طلب ہوں گی ان کی اصلاح میں کامل انہماک اور شفقت کا ثبوت دیں گے۔

ابوسعید بزمی، ایڈیٹر مدینہ	ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ
محمد مجید حسن، مالک اخبار مدینہ	حبیب الرحمٰن لدھیانوی، صدر احرار
رشید احمد عفی عنہ	سرپرست مدرسہ

یہ تحریر ایڈیٹر ہی کے قلم کی تھی، آخر الفاظ بھی اس کے اصرار پر لکھے گئے، ورنہ حضرت قدس سرہٗ بعض الفاظ کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ایڈیٹر کو اس پر حیرت اور غصہ اور قلق تھا کہ اس ناکارہ کے خلاف کوئی شکایت، جو خطوط کے انبار میں تھی نہ مل سکی اور مجھے اس کی خوشی تھی کہ میرے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کے خلاف ۱۳۲۰ھ میں جو طوفان اٹھا اس سال کی روئدادوں میں اس کا ذکر بھی ہے، وہ بھی ممبروں کے خلاف مدرسہ پر جبر وقبضہ کا تھا۔ ۱۳۰۸ھ سے لے کر ۱۳۲۰ھ تک ایک ہنگامہ مدرسہ کے خلاف مدرسہ کے اندر اور باہر قائم رہا جو اس وقت کی روائدادوں سے کچھ نہ کچھ مترشح ہوتا ہے، اگرچہ حضرت قدس سرہٗ ۱۳۰۸ھ میں مدرسہ میں نہیں تھے، بلکہ ۱۳۱۴ھ میں آئے تھے، مگر اس فتنہ کی ابتداء ۱۳۰۸ھ سے ہی شروع ہوگئی تھی۔

۱۳۲۰ھ سے حضرت قدس سرہٗ کی برکات سے جو مدرسہ میں روحانی اور مادی ہر نوع کی ترقیات

ہوئی ہیں وہ آج دنیا کے سامنے ہیں۔ اللہ کی شان، اللہ کے کاموں کی حکمت کون پہچان سکتا ہے، شاید: ”الٓمٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ“ کا مظہر ہو۔

دارالعلوم دیو بند میں بھی ۱۳۰۴ھ سے لے کر ۱۳۱۸ھ تک اندرونی، بیرونی خلفشار کثرت سے ہوتا رہا، جس کی طرف اجمالاً حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے نقشِ حیات ص ۱۲۳ میں اشارہ بھی فرمایا ہے اور تذکرۃ الخلیل (ص ۱۷۳ طبع جدید) میں بھی اس کا کچھ مختصر حال ہے۔ اسی زمانے میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اور نواب چھتاری صاحب کو خلفشار مٹانے کے واسطے دیو بند تشریف لانا پڑا۔ اس زمانے کا ایک مکتوب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا اپنے دستِ مبارک کا لکھا ہوا، جس کا فوٹو تذکرۃ الرشید جلد دوم کے ختم پر چھپا ہوا ہے، جس کی عبارت یہ ہے:

از بندہ رشید احمد عفی عنہ

برادرانِ مکرمانِ بندہ، مولوی محمود حسن و مولوی خلیل احمد صاحب مد فیوضہما!

بعد سلام مسنون، مطالعہ فرمائید

آپ دونوں کے چند خطوط پہنچے، جس سے وہاں کا حال معلوم ہوتا رہا۔ آج مولوی خلیل احمد صاحب کا خط آیا، جس سے پریشانی مدرسین کی دریافت ہوئی، لہٰذا یہ تحریر ضروری ہوئی۔

میرے پیارے دوستو! تم کو کیوں اضطراب و پریشانی ہے؟ تم تو ”وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ“ پر قانع رہو اور مدرسہ سے آپ کو فقط اتنا تعلق ہے کہ درس دیئے جاؤ۔ اگر مدرسہ بند حق تعالیٰ کرا دے گا تم اپنے گھر بیٹھ رہنا، اگر مفتوح رہا درس میں مشغول رہنا۔ جو تم سے درس کرانا اہلِ شہر کو منظور نہ ہوگا تو دوسرا باب مفتوح ہو جائے گا، تم کس واسطے پریشان ہوتے ہو، خبر بھی مت ہو کہ کیا ہو رہا ہے، اپنا کام کیے جاؤ۔ تمہارے برابر تو کسی کے دست و پا نہیں چلتے، تم کیوں بے دست و پا اپنے آپ کو لکھتے ہو؟ جس کام کے تم ہو اس میں تکرار نہیں۔ اب فقط نزاع یہی ہے کہ اہلِ شوریٰ کی زیادت ہو، تمہارا کیا حرج ہے، تم اپنا کام کرو۔ حاجی صاحب مصلحت کا کام کرتے ہیں وہ اپنی تدبیر میں رہیں۔ خواہ کچھ ہو ہماری تمہاری مرضی کے موافق ہو یا مخالف اور اہلِ شوریٰ خود سب اختیار حاجی صاحب کو دے کر مطمئن ہو گئے، تم پر کیا بار ہے؟ پس تم جیسے لوگوں سے تردّد کا ہونا بے موقع ہے، تم کسی امر میں لب کشا مت ہو، کوئی پوچھے تو جواب دو درس کے بارے میں ہم سے پوچھو جو ہمارا کام ہے، انتظام وغیرہ کو نہ ہم جانیں نہ ہم دخل دیں اور اندیشۂ بدمعاشاں بھی کچھ مت کرو۔ شعر حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ کو مدِ نظر رکھو:

قصد ظالم بسوئے کشتن ما دلِ مظلومِ مابسوائے خدا
اودریں فکرتا بماچہ کند؟ مادریں فکر تا خدا چہ کند؟

اے عزیزان! بروز اول مقدر ہو چکا ہے، ذرہ ذرہ جو واقع ہوگا۔ مدرسہ کے امور میں بھی وہی واقع ہوگا اور ہو کر رہے گا، خواہ کوئی دفع کرے یا واقع کرے، پھر تم کیوں سرگشتہ ہوتے ہو؟

ہرچہ از محبوب رسد، شیریں بود

ہم کون ہیں؟ بے اختیارِ محض ہیں، اگرچہ بظاہر مختار ہیں، ہم پر جو گزرے گا وہ عین لطف ہوگا اور جو عالم میں صادر ہوگا وہ عین مصلحت ہوگا، خواہ خرابیٔ مدرسہ ہو یا بقا، خواہ عزت ونصب ہمارا تمہارا ہو، خواہ ذلت وعزل، تم یہ سب وقائع بازیگر کے سانگ سمجھ کر اپنے درس کے شغل میں بسر کرو، ایں وآں کو زید وعمر پر چھوڑو۔

ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

نہ کوئی مفسد کا کچھ کر سکے نہ کوئی مصلح کر سکتا ہے، سب فاعلِ مختار کرتا ہے۔

"وما تشآء ون إلا أن يشاء الله"

من از بیگا نگان ہر گز نہ نالم کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

"وهو ارحم الراحمين" بس تمام ہوا قصہ وہاں کی خبر کا مشتاق ہوں، بشر ہوں، اپنے دوستوں کا دعا گو، خیر طلب ہوں، تم کو کوئی گزند نہیں مطمئن رہو، نہ مدرسہ کہیں جارہا ہے۔ ہر شخص کو اپنے اپنے خیال پر نازاں جان کر کالائے بد بریش خاوند کرو اور دم بخود ہو کر می نوش و مے بنوش وچیز سے مخروش۔ فقط

سب عزیزوں کو بعد سلام مسنون یہ ہی مضمون جان بخش بعد سلام مسنون فرمادیں، جو دوستان اہل تدبیر ہیں۔ ان کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ مضمون شکر ورضا ان سے کہہ دیں اور جس کو چاہو سلام کہہ دینا۔
یہ وقت اور یہ خروش اہلِ فساد عین مصلحت ہے اس کا جس قدر غلغلہ ہوگا اسی قدر مفید ہوگا انجام خیر ہی خیر۔ واصب ودائم رہے گا۔

(......رشید احمد......)

جب مظاہر کا یہ ہنگامہ ختم ہو گیا تو ناظم صاحب اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن اور اکابر مدرسین کی خاص طور سے یہ رائے ہوئی کہ جن لوگوں نے جھوٹے الزامات مدرسہ پر لگائے اور وہ اب تک گمنام ہی چل رہے تھے اب کھل کر سامنے آگئے، ان کا اخراج اب بہت ضروری ہے۔ تین دن تک ان حضرات کا ان کے اخراج پر اصرار تھا اور یہ ناکارہ شدت سے مخالفت کر رہا تھا۔ حضرت ناظم صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمہما اللہ نے یہ کہہ کر میری مخالفت کو نظر انداز کر دیا کہ چونکہ

اس میں ان کی ذات کا معاملہ ہے اس لیے ان کی رائے اس میں معتبر نہیں، ان میں ایک صاحب ایسے تھے جن کے بڑوں سے حضرت ناظم صاحب کے بڑے تعلقات تھے اور وہ صاحب تھے جن کی وجہ سے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو دقت اٹھانا پڑتی۔ اس لیے میں بار بار عرض کرتا رہا کہ حضرت میں اپنی وجہ سے نہیں عرض کر رہا، آپ حضرات کی وجہ سے عرض کر رہا ہوں کہ آپ حضرات کو بڑی دقت اٹھانی پڑے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اخراج کے دوسرے ہی دن ناظم صاحب کی خدمت میں وہ صاحب آئے جن کے متعلق میں نے کہا تھا اور ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بہت صفائی سے بلا جھجک ان سے کہہ دیا کہ شیخ الحدیث صاحب سے بات کر لیجیے۔ وہ صاحب میرے پاس آئے، میں ان کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا اور سچ یہ ہے کہ اللہ مجھے معاف فرمائے کہ اس وقت ناظم صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ مگر چونکہ یہ تقریباً روز مرہ کا قصہ ہو گیا تھا کہ حضرت ناظم صاحب، جھگڑوں میں ہمیشہ اس سیہ کار کو آگے کر دیا کرتے تھے، یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے حضرت ناظم صاحب نے حضرت مدنی قدس سرہٗ کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے کہ ''اگر یہ نہ ہوں تو مجھے بڑی دقت ہو'' یہ بالکل صحیح کہا تھا۔ بہت سے مواقع پر اس کی نوبت آ چکی تھی کہ میری رائے کے خلاف کوئی بات اکابر مدرسہ نے تجویز کر دی اور میں سختی سے عرض کرتا رہا کہ فلاں مشکل پیش آئے گی اور جب وہ مشکل پیش آتی تو یہ سب حضرات اسی سیہ کار کے سر تھوپ دیتے، کئی اہم واقعات اس نوع کے بھی موقع ہوا تو لکھواؤں گا۔

سہارنپور کی جامع مسجد میں لیگ کا جلسہ، پٹنہ میں لیگ کا اجلاس وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے مدرسہ کے موجودہ اکابر خوب واقف ہیں۔ اگرچہ نئی امت کے لیے یہ بالکل غیر معلوم۔ میں نے اشارہ لکھ دیا، نہ معلوم لکھوانے کی نوبت آئے یا نہ آئے۔

مگر یہ واقعہ ابھی تک بہت سے دوستوں کو معلوم ہے، اسی وجہ سے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب قدس سرہٗ ناظم مدرسہ کا اس سیہ کار کے متعلق مشہور مقولہ تھا، وہ پچاس دفعہ کہا ہوگا کہ ''اس کی بات بے سمجھے مان لیا کرو، چھ مہینہ پہلے کی کہتا ہے''۔ میرے حضرت اقدس رائے پوری کا بھی اس قسم کا مقولہ میرے سلسلے میں بہت مشہور ہے۔

بہر حال جب وہ صاحب جن کے متعلق طلبہ کے اخراج کے سلسلے میں میں نے حضرت ناظم صاحب سے کہا تھا کہ وہ سب سے پہلے آپ کے پاس آئیں گے، وہ میرے پاس تشریف لائے اور آتے ہی مجھ سے یہ کہا کہ ان کے قصور میں تو کوئی انکار نہیں، لیکن اخراج میں نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ ''یہ اجتماعی مشورے سے طے ہوا ہے، اس میں انفرادی رائے نہ یہ ناکارہ کوئی دے سکتا ہے، نہ حضرت ناظم صاحب، آپ ایک درخواست حضرت ناظم

صاحب کی خدمت میں پیش کردیجئے، دوبارہ مشورہ میں نظر ثانی ہوسکتی ہے، انفراداً نہیں"۔ چنانچہ وہ درخواست دوبارہ شوریٰ میں آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو پہلے ہی مخالف تھا، اب بھی میرے نزدیک کوئی بات نہیں گئی اس پر لکھ دیا جائے کہ "فلاں صاحب کی سفارش سے اخراج ملتوی کردیا جائے"۔ البتہ اس میں ایک اشکال ہوگا، وہ یہ کہ ہر اخراج پر اس سے زیادہ زوردار سفارش آسکتی ہے، اس لیے اور کوئی اچھا عنوان اختیار کرلیا جائے، لیکن وہ حضرات اخراج کے التواء پر راضی نہ ہوئے، اس لیے دوبارہ بھی یہی لکھا گیا کہ غور وخوض کے بعد بھی اس اخراج کے التواء کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مدرسہ کو بہت شدید نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اس کے بعد جن جن مشکلات کی طرف اس سیہ کار نے اشارہ کیا تھا وہ ساری پیش آئیں اور سب کی نگاہوں میں یہ سیہ کار ہی مطعون رہا کہ چونکہ اس کا قصہ تھا اس واسطے اس نے نکلوادیا۔

واقعات تو اس سیہ کار کی پچپن سالہ مدرسی دور کے نہ معلوم کتنے ہیں، ان سب کا احصاء مشکل ہے، ہر باب میں نمونہ کے طور پر دو، چار لکھوا کر ختم کردیا کرتا ہوں، اس لیے اس مضمون کو ختم کرکے تالیفات کی یادداشت لکھواتا ہوں کہ وہ بھی اہم ہے۔

اس باب کے شروع میں درس وتعلیم اور تالیفات تین مضمون تھے، اب یہ تیسرا مضمون ہے۔

تالیفات:

لکھنے کی مشق تو بچپن ہی سے شروع ہوگئی تھی، گو خط تو اب تک اچھا نہ ہوا، مگر صحیح اور پختہ اتنا ہوگیا تھا کہ "بذل المجہود" کی تالیف کے زمانہ میں کئی مرتبہ حاسدین نے بذل کی کتاب اس بہانہ سے منتقل کرائی کہ فلاں صاحب بہت خوش خط لکھتے ہیں ان سے لکھوائی جائے۔ لیکن استاذ الکل منشی محبوب علی صاحب جنہوں نے بذل المجہود کی پہلی جلد لکھی اور وہ اس زمانے کے سارے ہی کاتبوں کے استاد یا استاد کے استاد تھے، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، انہوں نے میرے حضرت قدس سرہٗ سے یوں کہا کہ حضرت! میرے لیے تو ان بدخط سے ہی نقل کرادیا کریں، ان کے شوشے اور نقطے بہت صحیح ہوتے ہیں، مجھ جیسے جاہل کے لیے ایسی تحریر زیادہ کارآمد ہے۔ جس کے نقطے اور شوشے زیادہ صحیح ہوں خوشخط پڑی نہ ہو۔

بہرحال ابتداء تو تختی پر اب ت سے ہوئی، اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں بعد تختی پر قرآن شریف پڑھنے کے زمانے میں بہشتی زیور کی نقل شروع ہوئی اور اس کے بعد فارسی کی کتابوں کی نقل اور ترجمہ تختی پر شروع ہوا۔ اس کے بعد مستقل تالیف کا سلسلہ شروع ہوا جس میں سب سے پہلے ابا جان ایک دو لفظ بنا کر اور صرف کے قواعد بتا کر یوں فرمایا کرتے تھے کہ "اس کے صیغے بناؤ"۔ اس زمانے میں اس کی مشق ایسی بڑھی کہ رات دن اسی سوچ میں گزرتا تھا، "بت" کے تیس چالیس صیغے

بنانے تو اب بھی یاد ہیں اور اس کی کاپیاں بھی میرے کاغذات میں اب تک پڑی ہیں۔ جب دہلی جانا ہوتا تھا تو مظفر نگر سے اگلا اسٹیشن کھاتولی ہے دہلی تک اس کے صیغے بناتا جایا کرتا تھا۔

اس دور کے بعد پھر ادب کا ذوق شروع ہوا تو سہارنپور سے دہلی تک اشعار کا دور تھا۔ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر شعر پڑھتا جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد قرآن پاک کا دور شروع ہوا۔ سہارنپور سے دہلی تک ۱۵ اور ۲۰ تک کے درمیان میں پاروں کا ہمیشہ معمول رہا۔ اس زمانہ میں ریل کے سفر بذل کی طباعت کی وجہ سے بہت کثرت سے ہوا کرتے تھے۔

(۱) شرح الفیہ اردو:......غیر مطبوع

درس کے دوسرے سال میں جب الفیہ شروع کیا تو ساتھ ساتھ اس کی اردو شرح بھی شروع کی، جو کل تین جلدوں میں پوری ہوئی۔ پہلا جزء بہت مفصل شرح کے طور پر، اس کے بعد مختصر ہوتی چلی گئی اور ۱۸ شعبان ۲۹ھ پنجشنبہ کو پوری ہوئی۔ اس کا مسودہ الماری میں موجود ہے۔

(۲) اردو شرح سلم:......غیر مطبوع

جس سال میں سلم پڑھی یعنی ۳۲ھ میں حضرت مولانا عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بہت طویل تقریر فرماتے تھے اور میں سبق کے ساتھ پنسل سے لکھا کرتا تھا اور سبق کے بعد صاف کیا کرتا تھا۔

یہ دونوں مسودے چند سال ہوئے تو پورے تھے، اب چند سال سے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

(۳) اضافہ براشکال اقلیدس:......غیر مطبوع

۳۲ھ میں جب اقلیدس پڑھی تو کچھ اس وقت ایسا مزہ آیا کہ اس کے قواعد پر اپنی طرف سے شکلیں گھڑا کرتا تھا۔ اس کی کاپیاں اضافہ براشکال اقلیدس کے نام سے اب تک محفوظ ہیں۔

(۴) تقریر مشکوٰۃ:......غیر مطبوع

ابتداء زمانہ طالب علمی میں پڑھنے کے زمانہ میں بہت مختصر لکھی تھی، پھر شوال ۴۱ھ میں پہلی دفعہ مشکوٰۃ پڑھانی شروع کی تو اس کو سامنے رکھ کر اور حواشی کی مدد سے دوبارہ لکھی یہ تقریر طبع تو نہیں ہوئی مگر شاید سو سے زائد نقلیں طلبہ و مدرسین لے جا چکے ہیں۔

(۵) تقاریر کتب حدیث:......غیر مطبوع

اس ناکارہ نے کتب صحاح اولاً اپنے والد صاحب سے پڑھیں، ثانیاً حضرت قدس سرہٗ سے۔ ہر شیخ کی درس کی تقریروں کی نقل کا اہتمام تھا، مگر مکمل اور مرتب نہیں۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ کی نسائی شریف کی تقریر مختصر مکمل میری تالیف کی الماری میں ہے۔ مجھے خوب یاد ہے میرے حضرت

قدس سرہٗ اگر کوئی حرف ایسا فرماتے تھے جو بین السطور میں ہو اس کو بھی نقل کر لیتا تھا، یہ سمجھ کر کہ میرے حضرت کا فرمایا ہوا ہے۔

(۶) مشائخ چشتیہ:...... غیر مطبوع، (۷) احوالِ مظاہر علوم:...... غیر مطبوع

جب یہ ناکارہ پڑھنے سے فارغ ہو گیا تو ۳۵ھ مدرسی کے ابتدائی دور میں دو رسالے لکھنے شروع کیے تھے، ایک اولاً مشائخ چشتیہ، جس میں اپنے شیخ قدس سرہٗ سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جملہ مشائخ کے حالات تبرکاً لکھنا شروع کیے تھے، اکثروں کے پورے ہو گئے اور بعض کے پورے نہیں ہوئے۔

اسی طرح نظرِ بر اداءِ حقوق مظاہر علوم، اس کے پچاس سالہ حالات ابتداء بناء سے ۳۴ھ تک سن وار۔ اھ بنائی مطابق ۱۳۸۳ھ ہر سال کی آمد و خرچ کی میزان، فارغ التحصیل لوگوں کی تعداد اور تقرر، علیحدگی، ملازمین اور متفرق حالات، یہ بھی تقریباً حصہ اول تو پورا ہو گیا اور مدرسہ کے اکثر حالات جو مدرسہ کی روئدادوں وغیرہ اور اشتہاروں میں چھپے ہیں۔ وہ ۳۵ھ کے بعد سے اسی سے لیے گئے ہیں۔ ارادہ یہ تھا کہ دوسرے حصے میں ان سب اکابر کے مختصر حالات بھی لکھوں گا لیکن مدرسی کے اسباق کے علاوہ بذل کی مشغولیت بھی بڑھتی گئی۔ اس لیے یہ دونوں رسالے باوجود بہت بڑی مقدار میں ہو جانے کے ناقص ہی ہیں اور اب تو تکمیل کی کوئی صورت بھی نہیں۔

(۸) تلخیص البذل:...... غیر مطبوع

ربیع الاول ۳۵ھ جب سے بذل المجہود شروع ہوئی تھی اس ناکارہ کا معمول یہ رہا کہ حضرت قدس سرہٗ کے اٹھنے کے بعد سے لے کر اس دن کے لکھے کا ایک خلاصہ ساتھ ساتھ لکھتا رہتا تھا جس میں ابحاثِ طویلہ کے خلاصوں کو اپنی عبارت میں اپنی یادداشت کے واسطے نقل کر دیا کرتا تھا۔ یہ بھی تقریباً سب جلدوں کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ اسانید سے تو بحث نہیں کرتا تھا۔ الا یہ کہ کسی خاص سند پر کوئی بحث کرنی ہو۔

(۹) شذرات الحدیث:...... غیر مطبوع

ناکارہ کا معمول یہ رہا کہ بذل کے لکھنے کے زمانے میں شروع بخاری وغیرہ میں جب کسی دوسری کتاب کے متعلق کوئی مضمون نظر سے گزرتا تو میں نے ہر کتاب کی ایک کاپی بنا رکھی تھی اور اس کتاب کے نام سے اس کاپی پر لکھتا تھا: ”شخ“ (شذرات بخاری) اسی طرح شم، شت، شد وغیرہ۔ صحاح ستہ کی ہر کتاب اور مؤطائین اور طحاوی اور ہدایہ کی کاپیاں بنا رکھی تھیں۔ اس کو تفصیل سے اس واسطے لکھوا رہا ہوں کہ میری مطبوعہ تالیفات میں ”کذا فی الشذر و البسط فی

الشذر'' کے حوالے کہیں کہیں آ گئے ہیں۔

اس ناکارہ کی بذل کی تالیف کے زمانہ میں اس کی بہت خواہش رہا کرتی تھی کہ کوئی شخص حضرت سے دو چار منٹ کو بات کرنے کے واسطے آجائے تو میں جلدی جلدی وہ دیکھے ہوئے مضامین شذرات کی کاپیوں پر لکھ لوں۔ اگرچہ حضرت قدس سرہٗ کو اس وقت میں کسی کا بات کرنا بہت ناگوار ہوتا تھا۔ جس کو میں خوب سمجھتا تھا، مگر میں اپنی غرض کو چاہتا تھا کہ ایک دو منٹ کو کوئی آتا رہے۔ مجھے اس کا وقت صرف ڈاک کی آمد پر ملتا تھا کہ مدرسہ کی ڈاک اول حضرت قدس سرہٗ کے پاس آتی تھی، حضرت قدس سرہٗ اپنی ڈاک چھانٹ کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور میری میرے پاس ڈال دیتے تھے نہ تو حضرت اس وقت اپنی ڈاک پڑھتے تھے نہ یہ ناکارہ۔ البتہ اگر قلم سے یا مرسل کے نام سے کوئی اہم خط سمجھتے تو حضرت بھی سرسری دیکھ لیا کرتے تھے اور میں بھی۔

ایک لطیفہ اس جگہ کا بہت پرلطف یاد آ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ کی طرف کے کوئی عزیز جو کسی جگہ تھانیدار تھے اور اس زمانے کا تھانیدار اس زمانے کا وائسرائے ہوتا تھا۔ نہایت لحیم شحیم، وجیہ، تھانیداری سوٹ میں ملبوس آئے۔ میرا منہ چونکہ دروازے کی طرف ہوتا تھا اور حضرت قدس سرہٗ کی پشت، اس لیے میں ان کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا، اس لیے کہ میرے کئی شذرات جمع ہو رہے تھے اور مجھے یہ فکر ہو رہی تھی کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ انہوں نے آ کر حضرت قدس سرہٗ کو پشت کی طرف سے سلام کیا اور حضرت ادھر متوجہ ہوئے اور میں نے بذل کی کاپی ہاتھ سے رکھ کر جلد ہی سے اپنے شذرات اٹھا لیے۔ ہمارے مدرسہ کے ناظم کتب خانہ بھائی مظہر صاحب جو ابتدائی زمانہ میں میرے شریک درس بھی رہ چکے تھے، ان تھانیدار صاحب کے بہت قریب کے رشتہ دار تھے، وہ ساتھ تھے۔ چند منٹ وہ بیٹھے اور حضرت بڑی گرانی سے ان سے باتیں کرتے رہے اور میں نے جلدی جلدی اپنے شذرات پورے کیے۔ جب وہ واپس چلے گئے اور حضرت ادھر متوجہ ہوئے، میں نے بذل لکھنی شروع کر دی۔ وہ صاحب کے اٹھنے کے بعد مجھ پر بہت ہی ناراض ہوئے۔ باہر جا کر بھائی مظہر سے کہا کہ بزرگوں کے پاس بیٹھنے والوں کے بھی اخلاق ایسے خراب ہوا کرتے ہیں۔ یہ شخص جو حضرت کے پاس بیٹھا ہوا ہے اس قدر مغرور اور متکبر ہے کہ ''میں اتنی دیر بیٹھا رہا اور حضرت اس قدر شفقت سے مجھ سے باتیں کرتے رہے، لیکن اس مغرور اور بد دماغ نے ایک دفعہ بھی تو نگاہ اٹھا کر یوں نہیں دیکھا کہ یہ آدمی بیٹھا ہے، گدھا بیٹھا ہے، کتا بیٹھا ہے، سور بیٹھا ہے۔'' بھائی مظہر نے اس ناکارہ کی طرف سے بہت صفائی پیش کی کہ ''یہ بات نہیں بلکہ یہ مشغول بہت رہتا ہے۔'' لیکن ان کے دماغ میں یہ بات نہیں آسکی کہ ایسی بھی مشغولیت ہو سکتی ہے۔ وہ دیر تک خفا ہی ہوتے رہے۔ ان کی خفگی بجا تھی کہ ناواقف آدمی کو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ

اس قسم کی مشغولیت بھی ہوسکتی ہے اور اس ناکارہ کا وہ زمانہ درحقیقت طلب علم کا تھا۔ بسا اوقات رات دن میں ڈھائی تین گھنٹے سے زیادہ سونا نہیں ہوتا تھا اور بلا مبالغہ کئی مرتبہ بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ روٹی کھانی یاد نہیں رہی کہ مہمانوں کا ہجوم اس زمانے میں میرے پاس نہیں ہوتا تھا۔ البتہ طلبہ ساتھ کھانے والے ہوتے تھے، ان سے کہہ دیا تھا کہ تم کھالو میرا انتظار نہ کرو۔ عصر کے وقت جب ضعف معلوم ہوتا تھا اس وقت یاد آتا کہ دوپہر روٹی نہیں کھائی اور رات کو کھانے کا معمول تو اس سے پہلے چھوٹ گیا تھا تیس پینتیس گھنٹے روٹی کھائے ہوئے گزر جاتے تھے۔

(۱۰) جزءِ حجۃ الوداع والعمرات:......مطبوع

جب میں پہلی دفعہ مشکوۃ پڑھا رہا تھا جو شوال ۱۳۴۱ھ میں شروع ہوئی تھی تو ۲۲ ربیع الاول شب جمعہ ۱۲ بجے لکھنا شروع کیا تھا اور ایک دن ڈیڑھ رات میں شنبہ کی صبح کو پورا کر دیا تھا۔ اب تو مشائخ اکابر دیکھ کر تعجب فرماتے ہیں کہ ایک دن ڈیڑھ رات میں تو اس کی نقل بھی مشکل ہے۔ ہر سال یہ ناکارہ اور دیگر مدرسین جب کسی حدیث کی کتاب الحج پڑھاتے تھے تو دو چار دن اس کو مانگ لیتے تھے۔ متعدد اکابر مدرسین کے پاس اس کی نقلیں بھی تھیں، مگر طبع کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا، بلکہ بعض لوگوں نے جب طباعت کی فرمائش کی تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ تو یادداشتیں ہیں، طباعت کا ارادہ نہیں۔

لیکن گزشتہ سال مدینہ منورہ میں شعبان ۸۹ھ میں دفعۃً اس کی طباعت کا خیال پیدا ہوا اور آخر ذیقعدہ ۸۹ھ میں اس رسالہ کا سننا شروع کیا۔ نزولِ آب کی وجہ سے آنکھیں بے کار تھیں، اس لیے عزیزان مولوی عاقل، مولوی سلمان نے سنانا اور صاف کرنا شروع کیا اور ۲۶ ربیع الثانی ۹۰ھ پنجشنبہ اس کی تبییض پوری ہوئی اور اس کے چند روز بعد میں نے خواب میں دیکھا، کسی شخص نے مجھ سے یہ کہا کہ ''اس کی تکمیل حضور کے عمروں کے بیان کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس لیے ۱۷ جمادی الاولیٰ ۹۰ھ بروز بدھ ''جزءِ العمرات'' کی تالیف شروع ہوئی اور ۱۵ رجب ۹۰ھ یوم جمعہ کو ختم ہوگئی اور شعبان ۹۰ھ میں پہلی طباعت لیتھو میں ہوئی اور اسی وقت دوسری طباعت ندوہ لکھنؤ میں ٹائپ پر شروع ہوگئی۔

(۱۱) خصائلِ نبوی شرح شمائل ترمذی:......مطبوع

بذل کی طباعت کے لیے بار بار دہلی جانا ہوتا تھا۔ ہر پندرہ بیس دن میں ایک دو شب کو جانا ہوتا تھا، رات کو گاڑی ایک بجے رات سہارنپور سے چلتی تھی اور جب تک بذل کی طباعت کا سلسلہ رہا یہ گاڑی بدستور رہی اور دو یا تین دن دہلی میں قیام رہتا تھا، پروفوں کے دیکھنے کے بعد جتنا وقت

بچتا اس میں اس کو لکھا کرتا تھا۔ ۴۳ھ میں اس کی تالیف شروع ہوئی تھی اور ۸ جمادی الثانی ۴۴ھ شبِ جمعہ میں پوری ہوئی، اس کی تالیف دریبہ کلاں کی مسجد میں ہوئی کہ وہیں دن بھر میرا قیام ہوتا تھا اور جب واپس آتا تو اس کے سارے کے سارے کاغذات ایک صندوقچی میں بند کر کے حاجی عثمان خان صاحب مرحوم کی دکان پر رکھ آتا۔ خصائل کے شروع میں اس کا مختصر حال لکھا جا چکا ہے اور متعدد مرتبہ طباعت کے بعد ۶۰ھ میں اس میں اضافہ ہوا۔

(۱۲) حواشی بذل المجہود:......غیر مطبوع

بذل المجہود کی طباعت کے بعد سے اس پر حواشی کا سلسلہ اس ناکارہ کی طرف سے شروع ہوا اور اخیر زمانہ تک یعنی ۸۸ھ تک ابوداؤد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں جو نئی بات نظر پڑتی رہی، وہ بذل کے حاشیہ پر لکھتا رہا، وہ ایک مستقل ذخیرہ بن گیا۔

(۱۳) تحفۃ الاخوان:......مطبوع

(۱۴) شرح عربی جزری:......غیر مطبوع

(۱۵) رسالہ دراحوال قراء سبعہ۔ البدور مع نجومہم الاربعۃ عشر:......غیر مطبوع

۴۵ھ میں جب یہ سیہ کار مدینہ پاک ایک سالہ قیام کی نیت سے گیا اور وہاں کچھ تجوید پڑھنے کا شوق ہوا اور المقرئ الشہیر استاذ الاساتذہ القاری حسن شاعر جو اس زمانہ میں بھی معمر تھے اور مکہ اور مدینہ کے قراء کے مشہور استاد تھے، بڑا شہرہ ان کا تھا، ان سے شاطبی شروع کی، لیکن پہلے ہی سبق میں ان سے لڑائی ہوگئی، اس لیے کہ حضرت قاری صاحب نے یوں فرمایا کہ ”مطلب سمجھنے کی ضرورت نہیں، اشعار حفظ یاد کرلو۔“ اس ناکارہ نے عرض کیا اشعار تو ضرور حفظ کر کے سنایا کروں گا، مگر اتنے مطلب نہ سمجھوں اتنے قرآن کے الفاظ کی طرح سے اس کے اشعار کو یاد کرنے سے کیا فائدہ؟ میرے حضرت قدس سرہٗ کو کوئی ماہ بعد اس قصہ کی خبر ہوئی تو حضرت نے ارشاد فرمایا ”تو نے مجھ سے نہ کہا شاطبی تو تجھے سمجھا کے میں پڑھاتا قاری صاحب کی شاگردی تو اسی دن ختم ہوگئی تھی، لیکن ان کی شفقت ومحبت اب تک بھی رہی، چنانچہ گزشتہ سال ۸۹ھ میں جب مدینہ پاک حاضری ہوئی اس وقت بھی وہ زندہ تھے اور بہت ہی ضعیف، بہت ہی معمر، خبر سنتے ہی دو آدمیوں کے سہارے تشریف لائے اور ہر مجلس میں اس ناکارہ کے متعلق، سید محمود کے یہاں اور بڑوں بڑوں کے یہاں بہت فخر سے فرماتے رہے کہ یہ میرا تلمیذ رشید ہے اور ہمیشہ اسی لفظ سے تعارف کرایا کرتے اور میں ان کے ”رشید“ کہنے پر اس قدر شرمندہ ہوتا ہوں کہ نالائق سے لڑائی تو پہلے ہی دن ہوگئی تھی، پھر بھی میں رشید ہی رہا۔ لیکن ان کی شفقت اس سال بھی بہت رہی۔ ”تحفۃ

الاخوان فی بیانِ احکام تجوید القرآن'' ان کی عربی تالیف ہے، وہ چونکہ اردو سے واقف نہیں تھے اور ان کے ہندی شاگرد بہت کثرت سے ہر سال ان سے چندروزہ قیام میں بھی کچھ نہ کچھ ان کی عام شہرت کی وجہ سے ان سے پڑھتے تھے، اس لیے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اس کا اردو ترجمہ لکھوں، وہ میں نے ایک دو دن میں کر دیا اور ۸ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ کی تاریخ اس کے خاتمہ پر لکھی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق ایک بڑا لطیفہ بھی پیش آیا، جو عنقریب لکھوں گا اور بھائی الحاج احمد علی صاحب راجوپوری مہاجر مدینہ منورہ کی مساعی جمیلہ سے یہ ان کی حیات تک پندرہ بیس دفعہ چھپا، ان کی وفات کے بعد کا حال معلوم نہیں۔ لیکن مظاہر علوم کے کتب خانہ میں اس کا مطبوعہ ایک نسخہ تو یقیناً ہے جس کے متعلق بارہا لوگوں نے مجھے بتایا، زائد کی مجھے خبر نہیں۔

دوسرا رسالہ ''شرح عربی جزری'' غیر مطبوع بھی قاری صاحب موصوف کے تعمیل حکم میں عربی طلبہ کے واسطے لکھی تھی، اس کی طباعت کا حال مجھے معلوم نہیں، البتہ اس کی نقل میرے ساتھ ہندوستان بھی آئی تھی، جو میرے مسودات میں ہے۔

تیسرا رسالہ ''دراحوال قراء سبعہ'' بھی مدینہ پاک کے قیام میں لکھا، جس میں قراء سبعہ اور ان کے چودہ شاگردوں کے مختصر احوال لکھے تھے، یہ اپنے شوق سے لکھا تھا کہ بذل کے لکھنے کے بعد جو وقت بچتا وہ علمی ذوق کی وجہ سے ان ہی میں خرچ ہوتا۔ بالخصوص رات کا وقت کہ مسجد نبوی کے تو کواڑ لگ جاتے اور جلدی سونے کی کبھی عادت نہیں پڑی۔ بہت سی چیزیں تبرکاً تھوڑی تھوڑی نقل کر کے بھی لایا تھا، جس میں معجم کبیر، اوسط اور شرح طحاوی للعینی، جواب بحمد اللہ مولوی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی مساعی جمیلہ سے مدرسہ میں پوری کا عکس آ گیا ہے یہ مصر سے وہاں کے قیام میں نہایت حسین نہایت خوبصورت گیارہ جزء گیارہ اشرفیوں میں نقل کرائے تھے، مگر افسوس! یہاں آنے کے بعد جلدی ہی دو بزرگوں کی کشمکش سے کھوئی گئی، کہ وہ دونوں حضرات اس کے مشتاق تھے اور بار بار ایک دوسرے سے منگاتے تھے، میں تو مطمئن رہا کہ ان دونوں میں سے کسی کے پاس ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں کسی قاصد کو پسند آ گئی۔

جس لطیفہ کا اوپر ذکر ہوا وہ یہ ہے:

حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ نوراللہ مرقدہٗ کا دستور یہ تھا کہ اگر مجمع زیادہ ہوتا تب تو کھانا خانقاہ شریف میں آتا، لیکن ہم خدام میں سے اگر دو چار ہوتے تو حضرت قدس سرہٗ مکان ہی پر لے جاتے اور ہر دو اہلیہ میں سے جونسی اہلیہ کا نمبر ہوتا ان کے مکان پر کھانا کھانے کی نوبت آتی البتہ چھوٹی محترمہ کے یہاں کھانا کھانے کی زیادہ نوبت آئی، ایک مرتبہ چھوٹی اہلیہ کے زنانہ مکان پر چھت پر یہ ناکارہ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ صرف ہم دو کھانے میں تھے اور

حضرت قدس سرہٗ خود بنفسِ نفیس اندر سے کھانا لا رہے تھے، جس کی بڑی شرم آ رہی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ ہاتھ میں دو رکابیں لیے ہوئے اندر سے تشریف لا رہے، مستورات بھی قریب ہی کمرہ میں تھیں اور ہم صحن میں کھانا کھانے بیٹھے تھے، حضرت اندر سے بہت ہی ہنستے ہوئے تشریف لائے، وہ منظر بھی بہت آنکھوں میں کانوں میں اور دل میں گونج رہا ہے، حضرت نے فرمایا ''مولانا زکریا صاحب آج ایک عجیب بات معلوم ہوئی کہ آپ قاری بھی ہیں،'' میں نے عرض کیا ''حضرت بالکل نہیں، میں تو فارسی میں قرآن پڑھوں'' حضرت نے فرمایا ''مجھے بھی یہی معلوم تھا کہ آپ قاری نہیں ہیں، مگر یہ عورتیں بہت ساری جمع ہیں اور متفق اللسان اس پر اصرار کر رہی ہیں کہ آپ قاری ہیں اور آپ سے قرآن سننے کی میرے واسطے سے باصرار درخواست کر رہی ہیں''۔ مجھے معلوم تھا کہ بھائی احمد علی اس سال مع اہلیہ آئے ہوئے ہیں میں نے پوچھا کہ ''حضرت! بھائی احمد علی صاحب کی اہلیہ تو ان میں نہیں؟'' حضرت نے فرمایا ''کیسے سمجھا؟ وہ تو ہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ ''تو روایت صحیح ہے'' اور پھر میں نے تحفۃ الاخوان اور شرح جزری کا سارا قصہ سنایا اور میں نے کہا کہ ''حضرت! میں مدینہ میں تو قاری ہوں، ہندوستان میں نہیں''۔

(۱۶) اوجز المسالک شرح موطا امام مالک ۶ جلد:...... (مطبوع)

تالیف کا سلسلہ اور چسکہ تو ۳۵ھ سے بڑھتا ہی گیا ۴۵ھ میں مدینہ پاک میں جب بذل المجہود قریب الختم ہوئی اور یہ خیال تو طے شدہ تھا کہ حدیث پاک کا ہی مشغلہ رکھنا ہے، اگرچہ حدیث کے اسباق مدرسہ میں شروع ہو گئے تھے، پھر بھی تالیفی ذوق تو تھا ہی، مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ بذل کے بعد کوئی کتاب لکھنے کے لیے سوچنی چاہیے، میرے ذہن میں بہت مختصر مؤطا امام مالک آئی اور مدینہ پاک کی مناسبت سے موطا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی شرح ''اوجز المسالک'' کے نام سے غرۂ ربیع الاول ۴۵ھ کو اقدام عالیہ میں بیٹھ کر بسم اللہ لکھی اور بذل کے ختم ہونے تک تو دو چار سطریں لکھی جاتی تھیں اور بذل کے ختم کے بعد ۲۱ شعبان ۴۵ھ سے مدینہ پاک سے روانگی تک تقریباً تقریباً ڈیڑھ جلد کا مسودہ ہو گیا، لیکن ہندوستان واپسی کے بعد مشاغل کا ایسا ہجوم رہا اور اس کے درمیان میں دوسری تصانیف کا بھی سلسلہ رہا جیسا کہ آئندہ سالوں سے معلوم ہو جائے گا۔ تدریس کے علاوہ مدرسہ کے دوسرے مشاغل نے بھی بہت وقت لیا، اس لیے تیس سال سے زائد اس کی تالیف میں لگ گئے۔

میری سفر حجاز سے واپسی پر ۴۶ھ کے شروع میں میرے حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد آیا کہ بذل المجہود کی طرح میں ترمذی کی شرح لکھوں اور میرے ذہن میں یہ تھا کہ ایک آدھ سال میں اوجز ختم ہو جائے گی اس لیے کہ ڈیڑھ جلد اس کی مدینہ پاک میں دو تین مہینہ میں ختم ہو چکی تھی اور اس کے

بعد میری خواہش طحاوی کی شرح لکھنے کی تھی، اس لیے کہ مجھے طحاوی سے بہت بچپن سے محبت تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے طحاوی شریف کی شرح اردو لکھنی شروع کی تھی اور اس کا اشتہار بھی دے دیا تھا۔ بہر حال میں نے حضرت قدس سرہٗ کو لکھا کہ "میرا خیال طحاوی پر کچھ لکھنے کا ہے، آیندہ جیسے ارشاد ہو"۔ حضرت قدس سرہٗ نے لکھا کہ "طحاوی غیر متداول ہے اور ترمذی متداول ہے ہر مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کی زیادہ ضرورت ہے"۔ اسی خط و کتاب میں میرے حضرت قدس سرہٗ کا وصال ۱۵ ربیع الثانی ۴۶ھ میں ہوگیا، پھر میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے مشورہ کیا کہ ترمذی میں شروع کروں یا اوجز پوری کروں؟ چچا جان کی رائے بھی ہوئی کہ وہ درمیان میں ہے، پہلے اس کو پوری کر لی جائے۔ حضرت قدس سرہٗ کی حیات میں تو ارادہ کر لیا تھا کہ فوراً مدینہ منورہ حاضر ہو جاؤں اور حضرت ہی سے ابتداء کراؤں اور بذل کی طرح جب تک حضرت کی حیات رہے حضرت لکھواتے رہیں اور لکھتا رہوں، لیکن اوجز نے جوانی کا سارا زمانہ لے لیا، اس کے بعد ہمت بھی کچھ قاصر ہوگئی اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے شدید اصرار پر "لامع" شروع ہوگئی اور اس کے بعد "عد نفسک فی الاموات" میں داخل ہوگیا۔

(۱۷) فضائل قرآن:......(مطبوع)

حضرت شاہ یٰسین صاحب یکے از خلفاء قطب عالم گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ جو ہر سال مظاہر علوم کے جلسے میں آیا کرتے تھے اور ۲۷ ذیقعدہ ۴۸ھ کے جلسہ کے موقع پر بہت زور سے اصرار فرما کر گئے ان کے تعمیل ارشاد میں اوائل ذی الحجہ میں شروع ہوئی اور ۴۹ھ کو ختم ہوئی۔ فضائل کا یہ پہلا رسالہ ہے جو حضرت شاہ صاحب کی تعمیل حکم میں لکھا گیا اور فضائل کا سب سے آخری رسالہ "فضائل درود" بھی شاہ صاحب کے ارشاد سے لکھا گیا۔

(۱۸) فضائل رمضان:......(مطبوع)

رمضان ۴۹ھ میں چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے تعمیل ارشاد میں نظام الدین میں لکھی گئی اور ۲۷ رمضان المبارک میں ختم ہوئی۔

(۱۹) قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم:......(مطبوع)

۴۹ھ میں جبریہ تعلیم کا بہت زور ہوا، جس کے خلاف حضرت حکیم الامت تھانوی اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہما نے بہت زیادہ مساعی جمیلہ فرمائیں۔ چچا جان نے اس ناکارہ کی وساطت سے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی صدارت میں متعدد جلسے بھی کرائے۔ اس سلسلے میں بھی ایک لطیفہ ہے مگر طویل۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ ممبرانِ اسمبلی کے نام خطوط تحریر فرمایا کرتے تھے اسی سلسلے

میں اس ناکارہ نے یہ ایک خط جو تقریباً ۳۲ صفحات پر طبع ہوا ہے لکھ کر چھپوا کر ممبرانِ اسمبلی اور دیگر سربرآوردہ مسلمانوں کے پاس بھیجا تھا۔ ۱۳ محرم ۵۰ھ میں لکھا گیا۔

(۲۰) فضائل تبلیغ:......(مطبوع)

یہ بھی چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے تعمیل ارشاد میں لکھی گئی اور چند روز میں ۵ صفر شب دوشنبہ ۵۰ھ میں پوری ہوئی۔

(۲۱) الکوکب الدری:......(مطبوع)

یہ قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کی ترمذی شریف کی تقریر ہے جس کو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کے زمانہ میں عربی میں لکھا تھا اور مشائخ درس بہت کثرت سے اس کی نقلیں بہت گراں قیمت سے طلبہ سے کراتے رہے۔ نقلیں تو اس کی بہت ہوئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت میاں صاحب مولانا الحاج اصغر حسین صاحب دیوبندی نے پچھتر (۷۵) روپے میں نقل کرائی تھی۔ میں نے اس کی نقل دینے میں کبھی بخل نہیں کیا، اگرچہ بہت سے لوگوں نے مجھے بہت ہی منع کیا، بالخصوص منطقی علماء نے اور بہت سے احباب کا شدید اصرار اس کی طباعت پر رہا بالخصوص حضرت مدنی قدس سرہٗ کا، مگر میرے ذہن میں یوں تھا کہ وہ مسودہ ہے علماء میں سے جب تک کوئی نظر ثانی اور مختصر حواشی اس پر نہ لکھے نہ طبع کرائی جائے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ اور مولانا عبدالرحمن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے بار بار درخواست کی، بالخصوص مولانا مرحوم سے اس وجہ سے کہ انہوں نے ترمذی کی شرح لکھنی شروع کی تھی۔ لیکن مشاغل کی وجہ سے کوئی بھی راضی نہ ہوا۔

مجھے ۵۱ھ میں یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے اس کو بحالہ چھاپنا شروع کر دیا ہے اور کئی جزء چھاپ بھی لیے، جس پر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ غلط چھپ جائے گی، اس لیے اوجز کی تالیف چند سال کے لیے روک کر اس کا کام شروع کرنا پڑا اور جلد اول کے حواشی اور نظر ثانی سے وسط ربیع الاول ۵۲ھ میں فراغت ہوئی اور جلد ثانی سے ۱۶ رجب ۵۳ھ میں فراغت ہوئی۔ ان ہی وجوہ سے اوجز کی تالیف میں دیر ہوتی چلی گئی۔

(۲۲) حکایات صحابہؓ:......(مطبوع)

صفر ۵۷ھ میں اجڑارے جاتے ہوئے میرٹھ میں نکسیر کا شدید حملہ ہوا جو مغرب کے بعد سے شروع ہو کر صبح کو آٹھ بجے تک مسلسل رہا اور تقریباً دو گھڑے کے قریب خون ساری رات نہ معلوم کہاں سے پیدا ہوا اور نکسیر کی ابتداء بھی اپنی ایک حماقت سے جو حضرت مدنی قدس سرہٗ کی بے تکلفی کی بناء پر پیدا ہوئی تھی لمبا قصہ ہے۔

بہر حال علی الصباح یہ ناکارہ بجائے اجڑارے کے حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ فرسٹ کلاس ڈاکٹروں اور حکیموں کی طرف سے چند ماہ تک دماغی کام سے روک دیا گیا۔

میرے حضرت میرے مربی میرے محسن حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کا ارشاد تقریباً چار برس سے اس کی تالیف کا ہو رہا تھا۔ مگر اپنے مشاغل کے ہجوم کی وجہ سے تعمیل کا وقت نہ ملا، اس بیماری کے زمانے کو غنیمت سمجھ کر تعمیلِ ارشاد میں پڑے پڑے کچھ لکھتا رہا اور ۱۲ شوال ۵۷ھ کو پوری ہوگئی کہ کچھ دنوں بعد سبق کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا اور اسی کے ساتھ اعتدال کی تالیف بھی شروع ہوگئی تھی جو آگے آرہی ہے۔

(۲۳) الاعتدال فی مراتب الرجال:.......(مطبوع)

۵۶ھ اور اوائل ۵۷ھ کانگریس اور لیگ کے اختلافات نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ اکابر کی شان میں بے حد گستاخیاں اور بے ادبیاں ہوئیں اور بعض لوگوں نے دوسرے خیال کے امام کو فرائض جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں مصلّے سے بھی ہٹا دیا اور جس جگہ جس فریق کا غلبہ ہوا اس جگہ دوسرے خیال کے مُردوں کو قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا۔

اس سیہ کار کے پاس اس زمانے میں خطوط کی بڑی بھرمار تھی۔ علیٰحدہ علیٰحدہ جواب دینا مشکل تھا، اس کے باوجود لکھنا پڑتا تھا۔ ایک عزیز نے میرے بہت سے خطوط جمع کر کے سب اشکالات کو ایک خط کی صورت میں لکھ کر اس کے جواب کا مطالبہ کیا۔ میں نے بھی علیحدہ علیحدہ جواب لکھنے سے اس کو آسان سمجھا کہ ایک کاپی پر اس کو مفصل نقل کرالیا اور ۲۹ شعبان ۵۷ھ کو یہ جواب ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ہر شخص کو مختصر جواب لکھنے کے بعد یہ لکھتا ''تفصیلی گفتگو زبانی ہوگی، یہاں آجاؤ''۔ یہاں آنے پر اس کو کاپی دکھا دیتا۔

اتفاق سے میرے چچا جان اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہما کو اس کا علم ہوگیا، دونوں نے بہت اصرار اس کی اشاعت کا کیا، بلکہ حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے تو میر آل علی صاحب کو حکم دیا کہ وہ اور شاہ مسعود حسن صاحب مل کر اس کو طبع کرادیں، جس پر میں نے یہ کہہ کر شدت سے انکار کردیا کہ ''حضرت کسی دوسرے کے طبع کرانے کی ضرورت نہیں میں اس کو عوام میں پھیلانا نہیں چاہتا، مخصوص کو دکھاتا ہوں'' اور پھر ان دونوں بزرگوں کی تعمیل ارشاد میں چند روز میں اس کو طبع کرالیا۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ نے طبع کے بعد بہت پسند فرمایا اور ہمیشہ سفری بیگ میں اس کا نسخہ رکھا رہتا تھا۔ ان ہی بزرگوں کی برکت کا اثر تھا کہ یہ کتاب اندازہ سے زائد مقبول ہوئی، سنجیدہ طبقہ اور علماء نے بہت پسند کیا، بیس پچیس مطابع میں ہندوپاک کے کئی کئی مرتبہ طبع ہوئی اور گزشتہ سال اس

کے نمبر۴ کا ترجمہ عزیزم مولوی عبدالرحیم متالا نے گجراتی میں کر کے ''درداوردوا'' کے نام سے شائع کرایا اور اس سال بمبئی کے احباب کے تقاضوں پر اس نمبر کو ''مسلمانوں کی پریشانیوں کا بہترین علاج'' کے نام سے اردو میں ۲۵ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ کو شائع کرایا گیا۔

(۲۴) مقدمات کتب حدیث:......(غیر مطبوع)

اس ناکارہ نے مختلف ایام میں ۴۶ھ سے ۵۶ھ تک کے دوران ''ایک مقدمہ علم الحدیث'' لکھا تھا۔ جو ''مقدمہ اوجز'' میں طبع ہو گیا۔ اس کے علاوہ سب کتابوں کا ''مقدمۃ الکتاب'' بھی لکھا، جس میں اس کتاب کی خصوصیات، مصنف اور اس کے حالات اس کتاب کے مناسب جو چیزیں تھیں، ان میں سے ''مقدمۃ البخاری'' بہت سے اضافوں کے ساتھ ''مقدمہ لامع'' میں چھپ چکا ہے۔
مقدمہ بذل المجہود ابوداؤد بہت مفصل لکھا تھا اور بذل المجہود کے شروع میں اس کی طباعت کا بھی ارادہ تھا۔ مگر حضرت قدس سرہٗ نے خود اس کا مقدمہ مختصر لکھوا دیا۔ مجھے یہ عرض کرتے ہوئے شرم آئی کہ میں نے مفصل لکھ رکھا ہے، اس لیے طباعت کی نوبت نہ آئی۔
اسی طرح بقیہ کتب ستہ کی نیز شمائل ترمذی و نیز طحاوی وغیرہ کے مقدمۃ الکتب لکھے ہوئے میری المار ی میں موجود ہیں۔

(۲۵) فضائل نماز:......(مطبوعہ متعدد بار)

چچاجان کے تعمیل ارشاد میں لکھا گیا اور ۷ محرم ۵۸ھ شب دوشنبہ میں پورا ہوا۔

(۲۶) فضائل ذکر:......(مطبوعہ متعدد بار)

یہ بھی چچاجان قدس سرہٗ کے تعمیل ارشاد میں لکھا گیا اور ۲۶ شوال ۵۸ھ شب جمعہ میں پورا ہوا۔

(۲۷) فضائل حج:......(مطبوعہ متعدد بار)

عزیز مولانا یوسف مرحوم نے جب حجاج کا کام شدت سے شروع کیا تو مجھ پر تقاضہ کیا کہ فضائل حج میں ایک رسالہ ضرور لکھ دوں۔
۳ شوال ۶۶ھ کو اس کی ابتداء ہوئی اور ۱۴ جمادی الاول ۶۷ھ بروز جمعرات فراغت ہوئی۔
نفس رسالہ سے تو فراغت شوال ہی میں ہو گئی تھی۔ پس کچھ حکایات کا اضافہ سہارنپور واپسی پر ہوا۔
اس رسالہ کے متعلق ایک خواب۔ میرا تو جیہ نہ چاہتا تھا کہ لکھواؤں مگر بعض دوستوں کا جو اس وقت مسودہ لکھوانے کے وقت موجود تھے اصرار ہے کہ ضرور لکھواؤں۔
جب یہ رسالہ لکھا جا رہا تھا تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے ایک مخلص خادم

ذاکروشاغل نہایت متقی بزرگ نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور یہ ناکارہ دونوں مل کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کررہے ہیں۔ انہوں نے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے خواب عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا ''شیخ کو لکھ دو''۔ انہوں نے مجھے لکھا۔ اس ناکارہ نے جواب میں لکھا کہ ''تعبیر صاف ہے، اس ناکارہ نے ایک رسالہ فضائل حج میں لکھا ہے جو آج کل زیرِ طبع ہے، انشاء اللہ یہ رسالہ بیت اللہ شریف کی تعمیر روحانی میں معین ہوگا''۔ چنانچہ ہزاروں خطوط اس نوع کے پہنچے کہ اس رسالہ سے حج وزیارت میں بہت لطف آیا۔

(۲۸) فضائل صدقات:...... (مطبوع)

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی علالت کے زمانہ میں بار بار دو رسالوں کی تاکید فرمائی تھی، ایک فضائل زکوٰۃ اور ایک فضائل تجارت حتیٰ کہ ایک دن عصر کی نماز کی تکبیر ہورہی تھی تو صف میں سے آگے منہ نکال کر کہا ''دونوں رسالوں کو یاد رکھنا بھولنا نہیں''۔ مگر جیسا کہ فضائل حج اور فضائل صدقات کی تمہید میں تفصیل سے لکھا گیا۔ شوال ۶۶ھ میں ۴۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے چار ماہ سے زائد نظام الدین میں محبوس رہنا پڑا۔ لہٰذا فضائل حج کے ختم ہونے کے بعد اسی قیامت کے یاد دلانے والے ہنگامے میں نظام الدین میں اس کی ابتداء ہوئی اور سہارنپور واپسی کے بعد ۲۲ صفر ۶۸ھ کو ختم ہوئی۔

(۲۹) لامع الدراری تین جلد:...... (مطبوعہ)

اوجز کی فراغت کے بعد جیسا کہ لامع کے شروع اور خاتمہ پر لکھا گیا ہے کہ ۷ محرم ۱۳۷۶ھ یوم چہارشنبہ کو اس کی ابتداء ہوئی اور ۱۰ ربیع الاول ۸۸ھ کو کتاب مکمل ہوئی اور چونکہ اپنے ضعف اور امراض کی کثرت کی وجہ سے تالیف حدیث کے سلسلے کو ختم سمجھ رہا تھا اس لیے ۷ اربیع الاول ۸۸ھ مطابق ۱۴ جون ۶۸ء کو اس کے اختتام کی ایک دعوت کی، جو شروع میں تو بہت مختصر مدرسہ کے مدرسین اور مخصوص احباب، سوڈیڑھ سو کا اندازہ تھا، مگر نہ معلوم کس طرح اس کی ایسی شہرت عام ہوئی کہ دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، بمبئی تک خبریں پہنچ گئیں اور تقریباً ایک ہزار کا مجمع جمعہ کی شب اور صبح تک جمع ہوگیا۔ برابر دیگیں بڑھتی رہیں اور پلاؤ زردہ مولوی نصیر الدین، شیخ انعام اللہ، شیخ اظہار وغیرہ کی مساعی جمیلہ سے بہت جلد تیار ہوتا رہا اور اس غلط شہرت سے کہ آج عزیزان زبیر وشاہد کا نکاح ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی تذکرہ یہاں نہیں تھا۔ مقامی وبیرونی عورتوں کا مجمع بھی گھر میں بہت ہوگیا تھا۔

(۳۰) فضائل درود شریف:...... (مطبوع)

اس کی تالیف بھی حضرت شاہ یٰسین صاحب نگینوی کی وصیت کے موافق ہے، حضرت شاہ

صاحب کا وصال ۳۰ شوال ۶۰ھ شب پنجشنبہ میں ہوا تھا اور انہوں نے وصال کے وقت اپنے مخلص خادم اور اجل خلفاء عبدالعزیز صاحب دہلوی کو یہ وصیت کی تھی کہ ''زکریا سے کہہ دیجیو کہ جس طرح تو نے فضائل قرآن لکھی ہے، میرے کہنے سے فضائل درود بھی لکھ دے''۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے وصال کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم بار بار زبانی اور تحریری تقاضے شدت سے کرتے رہے۔ مگر بداعمالیوں نے مہلت نہ دی، لیکن ۸۳ھ کے حج میں مدینہ پاک حاضری پر شدت سے اس کا تقاضا شروع ہوا، واپسی پر بھی تساہل ہوتا رہا اور ۲۵ رمضان ۸۴ھ کو بسم اللہ کر ہی دی اور ۶ ذی الحجہ ۸۴ھ کو دفعۃً ختم کر دی کہ عزیزی مولوی یوسف مرحوم کے انتقال کے تار آنے پر اپنی زندگی سے کچھ ایسی مایوسی ہوئی کہ جتنی لکھی تھی اسی پر ختم کر دی۔

(۳۱) رسالہ اسٹرائک:...... (مطبوعہ)

مدارس عربیہ میں اسٹرائک کی روز افزوں وبا سے جتنی نفرت اس سیہ کار کو ہے اتنی شاید ہی کسی کو ہو اور اس میں میرے دو بزرگ حضرت تھانوی اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہما بھی بہت مخالف تھے۔ روز افزوں اسٹرائک کی مصیبت کی وجہ سے یہ رسالہ ۱۲ ربیع الاول ۸۸ھ کو لکھا گیا، جس میں اکابر مذکورین کے ارشادات بھی نقل کیے گئے۔

(۳۲) رسالہ آپ بیتی:...... (مطبوعہ)

عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ نے عزیز مولانا محمد یوسف مرحوم کی سوانح عمری لکھی اور اس میں ایک باب علی میاں نے عزیز یوسف کے مشائخ میں اس سیہ کار کا بھی اپنے قلم سے لکھ دیا۔ میں نے علی میاں کو لکھا کہ ''جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ تو آپ نے لکھی نہیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں''۔ اس پر ایک مضمون ان کو لکھا اور احباب کے اصرار پر اس میں کچھ اضافہ کے ساتھ ۱۵ ربیع الثانی ۸۸ھ کو آپ بیتی کے نام سے ایک رسالہ شائع کر دیا۔ یہ رسالہ جواب لکھوا رہا ہوں اسی کا دوسرا حصہ ہے، کل چھ حصے طبع ہو چکے ہیں۔

(۳۳) اصول حدیث علی مذہب الحنفیہ:...... (غیر مطبوعہ)

مسلکِ حنفیہ پر اصول حدیث کا ایک متن جو ۸ جمادی الاول ۴۲ھ کو شروع کیا تھا اور ۱۰ جمادی الاول کو ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس پر حواشی کا سلسلہ ۸۸ھ تک چلتا رہا، جو مضمون ذہن میں آتا اس کو لکھتا رہا۔

(۳۴) الوقائع والدھور:...... (غیر مطبوعہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور اس کے بعد خلفائے راشدین اور اس کے بعد

سلاطینِ بنی امیہ وغیرہم کے حالات۔ جلد اول میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، جلد ثانی میں خلفاء راشدین کے اور جلد ثالث میں ان کے بعد والوں کے۔ ۲۵ محرم ۴۲ھ یوم جمعہ کو ابتداء کی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک جو نیا واقعہ ملتا رہا اس سال کی جلد میں نکال کر لکھتا رہا۔ اس کا سلسلہ ۸۸ھ تک چلتا رہا۔

(۳۵) المؤلفات والمؤلفین:.......(غیر مطبوعہ)

معروف کتب حدیث وفقہ اور معروف مؤلفین کے حالات اور ان کے احوال کے مواضع جن جن کتابوں میں تھے، ان کے حوالے، اس کی ابتداء یکم جمادی الثانی ۷۴ھ کو ہوئی تھی۔ ۸۸ھ تک اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ ۸۸ھ اس ناکارہ کے علمی انہماک کا گویا خاتمہ ہے کہ آنکھوں نے بھی بالکل جواب دے دیا اور دماغ اور قویٰ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اب تو

ماہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم!

(۳۶) تلخیص المؤلفات والمؤلفین:.......(غیر مطبوعہ)

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں مؤلفین کے نام اور بہت مختصر سوالات جمع کیے گئے اور تفصیل کے لیے رسالہ بالا کا حوالہ لکھ دیا۔

(۳۷) جزء المعراج:.......(غیر مطبوعہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج شریف کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھنا شروع کیا تھا، جس کے کئی جزء تو ہو گئے مگر تکمیل کو نہیں پہنچا۔

(۳۸) جزء وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:.......(غیر مطبوعہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوصال کی ابتداء، دن اور تاریخ، ازواج مطہرات کے یہاں دورہ اور اخیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں تشریف آوری اور مرض کی شدت وغیرہ احوال کی روایات جمع کی گئیں مگر افسوس مکمل نہ ہو سکا۔

(۳۹) جزء افضل الاعمال:.......(غیر مطبوعہ)

افضل الاعمال کے بارے میں روایات بہت مختلف وارد ہیں اس لیے میں نے اس رسالہ میں ان سب روایات کو جمع کیا اور مشائخ نے ان میں جمع کے متعلق جو توجیہات کیں ان میں سے بھی اکثر نقل کی ہیں مگر رسالہ پورا نہ ہو سکا۔

(۴۰) جزء روایت الاستحاضہ:...... (غیر مطبوعہ)

استحاضہ کی روایات میں جو تعارض ہے وہ حدیث پڑھنے پڑھانے والوں سے مخفی نہیں۔ میرے حضرت قدس سرہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ نے بذل المجہود کا باب الاستحاضہ لکھوانے کے بعد یوں ارشاد فرمایا تھا کہ استحاضہ کے ابواب میں ہمیشہ ہی اشکال رہا۔ خیال تھا کہ بذل المجہود میں سمجھ میں آجائیں گے مگر اس میں بھی سمجھ میں نہیں آئے اور سچ فرمایا۔ کوکب لکھی، اوجز لکھی، لامع لکھی، لیکن پھر بھی حل نہ ہوئے۔ چنانچہ کوکب کے حاشیہ پر حمنہ بنت جحش کے قصہ میں بندہ نے اپنی ایک خاص رائے لکھی ہے جو سارے مشائخ اور شراح کی رائے کے خلاف ہے۔ میرے حضرت اقدس مدنی نوراللہ مرقدہٗ ایک دفعہ دیوبند سے صرف اس حدیث کی وجہ سے تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ ''صرف اس حدیث کی وجہ سے آیا ہوں، تم نے بات بہت معقول لکھی، مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کو یہ الہام سارے مشائخ سارے شراح کے خلاف کہاں سے ہوا، آپ کے حضرت نے بذل المجہود میں وہی لکھا جو سارے شراح لکھا رہے ہیں، ملا علی قاری شراح ترمذی سب ایک مضمون پر متفق ہیں، مگر آپ نے نیا مطلب کہاں سے نکالا، کوئی مستند اس کا آپ کے پاس ہے؟'' میں نے عرض کیا، مشکل الآثار طحاوی سے یہی مطلب مستنبط ہوتا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا، پھر تو بڑا قوی ماخذ ہے اور مشکل الآثار نکلوا کر دیکھی۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کوکب اور لامع کو قطب عالم حضرت گنگوہی کی وجہ سے اہتمام سے دیکھا کرتے تھے اور لوگوں کو ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بلکہ کئی دفعہ حضرت نے فرمایا: ''آپ نے کوکب کا حاشیہ لکھایا ہے، اوجز کا اشتہار دیا ہے، ہر مسئلہ میں والبسط فی الاوجز لکھتے ہیں، ایک دفعہ یہاں دیکھو، ایک دفعہ وہاں''۔

حدیث پاک میں چونکہ اس ناکارہ کی مرغے کی ایک ٹانگ بہت سی جگہ الگ رہی، اس لیے میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ ان پر اکثر مراجعت فرمایا کرتے تھے۔ اعلی اللہ مراتبہ''۔

(۴۱) جزء رفع الیدین:...... (غیر مطبوعہ)

رفع الیدین مشہور مسئلہ ہے، اس ناکارہ نے ان سب روایات کو ایک جگہ جمع کیا اور ان پر تفصیلی کلام کا بھی ارادہ تھا، مگر مقدر سے پورا نہ ہو سکا۔

(۴۲) جزء الاعمال بالنیات:...... (غیر مطبوعہ)

یہ تو بڑی جامع حدیث ہے اور بہت سے مسائل اس سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی ابتداء بھی اسی حدیث سے کی گئی ہے۔ جس میں نمونے کے طور پر کچھ ذکر کیا گیا ہے۔

اپنی زندگی کے زمانہ میں اس حدیث پر بھی بڑا تفصیلی کلام شروع کیا تھا، کچھ لکھا بھی مگر پورا نہ ہو سکا۔

(۴۳) جزء اختلافات الصلوٰۃ:...... (غیر مطبوعہ)

مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے زمانے میں میری تقریر کا خلاصہ یہ رہا کہ رفع یدین، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، وغیرہ تین چار مسائل کی کیا خصوصیت ہے کہ جس پر یہ معرکے، مناظرے مجادلے، ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں۔ اختلاف یہ ہے کہ رفع یدین سنت ہے یا عدم رفع، اسی طرح سے آمین بالجہر وغیرہ میں اسی نوع کے اختلاف ہیں۔ اس کے لیے میں نے نماز کی چار رکعتوں کے اختلاف جمع کرنے شروع کیے تھے۔ اس وقت دو سو سے زائد ہو گئے تھے، بعد میں ان پر اور اضافے بھی ہوئے۔

میں حدیث کے اسباق میں اولاً تو اجمالاً اسی فہرست سے یہ بیان کیا کرتا تھا کہ ان چار میں کیا خصوصیت ہے کہ یہ اعتقادیات کے درجہ میں ہو گئے اور اس کے بعد اسی رسالہ کی مدد سے ہر باب میں اس باب کے اختلافی مسائل کی تفصیل بیان کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے اس میں کچھ اضافہ بھی ہوتا رہا۔

(۴۴) جزء اسباب اختلاف الائمہ:...... (غیر مطبوعہ)

مظاہر علوم سے ایک رسالہ ''المظاہر'' کے نام سے مفتی جمیل احمد صاحب کی زیر ادارت نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں اس ناکارہ کا ایک مضمون اس سلسلے کا شروع ہوا تھا کہ ''ائمہ اربعہ میں اتنا وسیع اختلاف کیوں ہے جب کہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اقوال وافعال ہی سے استدلال کرتے ہیں''۔

اس رسالے کے مختلف پرچوں میں تقریباً اسی (۸۰) صفحے اس مضمون کے شائع ہو چکے تھے، اس کے بعد مضمون تو اور بھی لکھا ہوا تھا مگر رسالہ ''المظاہر'' بند ہو گیا اور وہ شائع نہ ہو سکا۔ بیسیوں احباب کے خطوط اس زمانہ میں آئے کہ ہم نے یہ رسالہ تیرے مضمون کی وجہ سے شروع کیا تھا، اگر یہ مضمون کسی اور رسالہ میں شروع ہو رہا ہو تو اس کا پتہ لکھ دیں، ورنہ اس کو ایک مستقل رسالہ میں شائع کر دیں۔

(۴۵) جزء المبہمات فی الاسانید والروایات:...... (غیر مطبوعہ)

احادیث کی اسانید میں بھی اور روایات میں بھی بہت سے نام مبہم آتے ہیں، اس ناکارہ نے ان سب کے نام دوسری احادیث سے تلاش کر کے لکھنے شروع کیے تھے اور اچھا خاصا ذخیرہ ہو گیا تھا،

ان میں ان مبہمات کو چھوڑ دیا گیا جو تہذیب، تقریب، تعجیل وغیرہ میں آ گئے ہیں۔

(۴۶) رسالہ التقدیر:......(غیر مطبوعہ)

ایک زمانے میں یہ مضمون رات دن دماغ میں چکر کھاتا تھا کہ آدمی کے مقدر میں جتنا ہوتا ہے اس سے زائد نہیں ملتا اور نہ اس سے کم ملتا ہے، مثلاً اگر کسی کے مقدر میں مرغیاں کھانا ہے وہ بہرحال مرغی کھائے گا۔ یا حضرت بن کر کھائے یا کما کر اپنے پیسوں کی کھائے یا لیڈر بن کر کھائے اور اگر کوئی ہنر بھی اس کے پاس نہیں تو وہ کسی رئیس یا اعلیٰ حاکم کا خانسامہ بنے گا۔ اس کی بہت سی جزئیات لکھی تھیں۔

جس کے مقدر میں جیل ہے وہ چوری یا ڈاکہ مار کر جیل میں جائے گا ورنہ سیاسی لیڈر بن کر جائے گا ہی، اکابر کے قصے بھی اس میں لکھے تھے اور تعویذوں کی بدولت ہر آنے والے کے گھر کے حالات بھی پوچھ لیتا تھا کہ کیا آمد ہے؟ کیا کھاتے ہو؟ اور وہ یہ سمجھ کر تعویز میں اسکی بھی ضرورت ہے سب بتا دیتا تھا۔ بڑی اونچی تنخواہوں والے بیماری کی وجہ سے حکیم ڈاکٹروں نے سب کچھ منع کر رکھا ہے۔ ابلی ہوئی دال یا بغیر گھی کا سالن وغیرہ وغیرہ۔ بغیر نام کے بہت سے قصے اس میں جمع کیے تھے۔

جس کے مقدر میں موٹر کی سواری لکھی ہے، وہ ہزار بارہ سو کما کر اپنی موٹر خریدے یا توفیق الٰہی سے حضرت جی بن جائے یا لیڈر یا پھر ڈرائیور۔ اس رسالہ کے پورا کرنے کا مجھے بھی ہمیشہ اشتیاق رہا، مگر مقدر نہ ہوا۔ اس میں واقعات بہت عبرت انگیز لکھے ہوئے ہیں جو اس زمانہ کے اخبارات سے بھی نقل کیے تھے۔

(۴۷) سیرت صدیق:......(غیر مطبوعہ)

یہ رسالہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سوانح میں رسالہ ''الصدیق'' والوں کے اصرار پر جو غالباً مظاہر علوم ہی سے نکلتا تھا، لکھنا شروع کیا تھا، مسودہ تو بہت سا ہو گیا تھا، لیکن طباعت کی نوبت شاید ایک ہی آدھ پرچہ میں آئی، پھر وہ پرچہ ہی بند ہو گیا تھا۔ اس وقت تو نہ پرچہ یاد ہے نہ غالباً کہیں ملے گا۔ جتنا یاد تھا اتنا لکھوا دیا۔

(۴۸) رسالہ فوائد حسینی:......(غیر مطبوعہ)

حضرت اقدس سیدی وسندی شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کی تشریف آوری پر بسا اوقات علمی تذکرہ بھی ہوتا رہتا تھا، اس میں جو مضامین عالیہ بندہ کے نزدیک قابل حفظ ہوتے تھے ان کو رسالہ میں جمع کرتا رہتا تھا، بڑے اچھے مضامین ہیں، مگر پورا ہونے کی اور طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

ان کے علاوہ اجزاءاور رسائل تو بہت سے ناقص وکامل لکھے ہوئے ہیں مگر علی گڑھ کے قیام میں جتنے ذہن میں آئے اور یاد رہے وہ تو لکھوادیئے، تاریخیں البتہ ان کی علی گڑھ میں چھڑا دی تھیں۔ وہ سہارنپور واپسی پر احباب نے اصل کتابوں سے دیکھ کر لکھ دیں، اس لیے کہ اس ناکارہ کو تو اب آنکھوں کی معذوری کی وجہ سے تلاش کرنا اور لکھنا مشکل ہے اور اسی وجہ سے بہت سے مسودات جو اس وقت یاد نہیں آئے رہ بھی گئے۔

اس کے بعد کاغذات میں سے عزیز عاقل سلمان اور مولانا یونس صاحب کو سرسری طور پر میرے جنگل میں سے جو ملے ان کو بھی نیچے درج کرارہا ہوں۔

(۴۹) حواشی کلام پاک:......(غیر مطبوعہ)

اسی تحریر میں کسی دوسری جگہ پر یہ گزر چکا ہے کہ اس ناکارہ کا معمول ۳۸ھ سے لے کر ۸۵ھ تک ماہ مبارک کی راتوں میں سونے کا نہیں تھا بغیر رمضان المبارک کے تو کلام مجید دیکھ کر پڑھنے کا وقت بہت ہی کم ملتا رہا، لیکن رمضان المبارک میں دو چار رمضانوں کے علاوہ تمام علمی کام سب بند ہوجاتے تھے اور قرآن پاک کے دیکھ کر پڑھنے کا معمول ماہ مبارک میں بہت اہتمام سے ہوجاتا تھا۔ تراویح کے بعد سے تہجد کے وقت ترجمہ کے تدبر و تفکر کے ساتھ پڑھنے کی نوبت آتی تھی اور اس میں جو اشکال پیش آتا تھا، اسی وقت تفاسیر سے مراجعت کرکے بین السطور کے حواشی پر لکھ لیتا۔ مگر افسوس کہ چار پانچ سال سے ان کے پڑھنے سے بھی معذور ہوں۔

(۵۰) حواشی الاشاعۃ ......(غیر مطبوعہ)

الاشاعۃ فی اشراط الساعۃ طلب علم کے زمانہ سے میرے پاس تھی اور میں نے اس کے ہر دو (۲) ورق کے درمیان میں ایک سادہ ورق لگوا کر جلد بندھوا رکھی تھی اور ۳۵ھ تک وقتاً فوقتاً اس پر حواشی کا اندراج اس کی مندرجہ روایات کا حوالہ اور فتح الباری وغیرہ سے جو کلام صاحب اشاعہ نے نقل کیا اس پر فتح الباری وغیرہ کے صفحات نیز اس کا کوئی مضمون کسی دوسری جگہ ملا تو اپنے حواشی پر لکھ دیا۔

(۵۱) حواشی وذیل التہذیب:......(غیر مطبوعہ)

حافظ ابن حجر کی تہذیب، تقریب، تعجیل وغیرہ پر حواشی تو سب ہی پر لکھتا رہا، لیکن تہذیب التہذیب پر کثرت سے لکھے گئے اور ذیل التہذیب کے نام سے مستقل بارہ جلدیں مجلد کرا کر تہذیب کے موافق اس پر صفحے ڈال دیئے تھے کہ اس پر تہذیب کا استدراک اور ذیل لکھا جائے، مگر تہذیب پر حواشی تو لکھنے کی زیادہ نوبت آئی مگر اس ذیل پر لکھنے کی نوبت کم آئی۔

(۵۲) حواشی اصول الشاشی، ھدایہ وغیرہ:......(غیر مطبوعہ)

اصول الشاشی اس ناکارہ نے ابتداء ۳۵ھ میں پڑھائی، جیسا کہ تدریس کے نقشے میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد بھی ایک دو دفعہ پڑھانے کی نوبت آئی اور ہدایہ ابتداء شوال ۳۷ھ میں پڑھایا تھا اور اس کے بعد بھی تین چار بار پڑھانے کی نوبت آئی۔ ہر دفعہ میں اس پر حواشی کا اضافہ ہوتا رہا۔ اس ناکارہ نے جتنی کتابیں بھی پڑھائیں وہ اپنی ذاتی کتابوں میں پڑھایا۔ مدرسہ کی کتاب میں کوئی کتاب نہیں پڑھائی اور چونکہ لکھنے کا مرض شروع ہی سے ہے، اس لیے میری ہر کتاب پر جو میں نے پڑھائی، قلیل وکثیر حواشی موجود ہیں۔

(۵۳) حواشی مسلسلات:......(غیر مطبوعہ)

مسلسلات کی ۶۴ھ سے تو مخصوص طلبہ دورہ حدیث کے بعد اجازت لیا کرتے تھے، لیکن ۵۳ھ سے وہ دورہ کے بعد ایک مستقل باضابطہ سبق بن گیا۔ اسی وقت سے بندہ نے اس کے حواشی بھی شروع کیے جو مسلسل بالصوفیہ میں آرہی تھیں۔ نقشہ بنا کر دوبارہ سہ بارہ طبع کرایا۔ حواشی کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی اور اس کے رجال پر مستقل کلام علیحدہ لکھا جس کو رجال المسلسلات کے نام سے موسوم کیا۔

(۵۴) جزء مکفرات الذنوب:......(غیر مطبوعہ)

احادیثِ شریفہ میں جن جن اعمال کو کفارہ ذنوب بتایا ہے ان سب کا مجموعہ احادیث کو اختصاراً اجمالاً جمع کیا گیا ہے، تفصیل کا وقت نہیں ملا۔

(۵۵) جزء ملتقط المرقاۃ:......(غیر مطبوعہ)

شوال ۴۱ھ میں جب پہلی مرتبہ مشکوٰۃ المصابیح مستقل پڑھانی شروع کی تو ۲۹ ذی الحجہ یوم الاثنین سے اس رسالہ کی ابتداء کی۔ اس میں مرقاۃ کو دیکھتے ہوئے جو خصوصی قابل حفظ مضمون ہوتے تھے، ان کو شذرات کے طور پر جو نمبر ۹ میں گزرے نوٹ کرتا رہتا تھا۔

(۵۶) جزء ملتقط الرواۃ عن المرقاۃ:......(غیر مطبوعہ)

یہ رسالہ بھی اسی زمانہ میں ذیقعدہ ۴۱ھ کے آخری جمعہ کو شروع کیا تھا، اس میں ان رواۃ کو جمع کیا تھا، جن پر ملا علی قاری نے مرقاۃ میں کلام کیا ہے۔ پہلے جزء کا التقاط ۲۹ ذی الحجہ ۴۱ھ بروز دوشنبہ کو پورا ہوا۔

(۵۷) معجم المسند للامام احمد:......(غیر مطبوعہ)

مسند امام احمد کی روایات ترتیب صحابہ پر ہیں جس میں حدیث کا تلاش کرنا بڑا مشکل ہے، اس

رسالہ میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ان سب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایات کی فہرست لکھی گئی ہے جس میں ہر صحابی کی احادیث مع جلد وصفحہ درج کی گئی ہے، بہت مفید رسالہ ہے، جس سے احادیث کا نکالنا بہت آسان ہے۔

(۵۸) جزء المناط:......(غیر مطبوعہ)

احادیث میں مناط کا مسئلہ بہت اہم ہے اور ائمہ اربع کے اختلافات کا زیادہ مدار مناط ہی پر ہے، جس میں تنقیح المناط اور تحقیق المناط اور تخریج المناط کے ابحاث اور فروع ذکر کیے گئے ہیں۔

(۵۹) رسالہ مجدّد دین ملت:......(غیر مطبوعہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ میری امت میں ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوگا۔ جس کے متعلق ہر زمانہ کے محققین نے اپنی اپنی تحقیق کے موافق اکابر امت میں جو مجدد کہے گئے ہیں ان کی فہرست لکھی ہے۔ اس رسالہ میں ان سب اکابر کے اقوال جو مختلف زمانوں میں مختلف اکابر نے لکھے ہیں، چودھویں صدی تک کے جمع کیے گئے ہیں۔

(۶۰) جزء صلوٰۃ الاستسقاء:......(غیر مطبوعہ)

(۶۱) وجزء صلوٰۃ الخوف:......(غیر مطبوعہ)

(۶۲) وجزء صلوۃ الکسوف:......(غیر مطبوعہ)

ان تینوں مسئلوں میں روایت میں بھی اختلاف اور تواریخ میں بھی اختلاف ہے کہ ان تینوں نمازوں کی ابتداء کب ہوئی اور کتنی مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی، کہاں کہاں پڑھی؟
ان تینوں رسالوں میں تینوں نمازوں کی روایت بھی جمع کی گئی ہیں اور اپنی طرف سے بعض روایات کو ترجیح بھی دی گئی ہے جن کا خلاصہ اوجز میں بھی آ گیا ہے۔

(۶۳) جزء ما قال المحدثون فی الامام الاعظم:......(غیر مطبوعہ)

یہ کئی جز کا رسالہ ہے جس میں حضرات امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی شان میں ائمہ محدثین کے اقوال جرح وتعدیل اور ان پر کلام نقل کیا گیا ہے۔

(۶۴) جزء تخریج حدیث عائشہؓ فی قصۃ بریرہؓ:......(غیر مطبوعہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے قصہ میں مختلف وارد ہوئی ہیں۔ اس رسالہ میں ان سب کو جمع کیا گیا ہے تا کہ دیکھنے والے کو بیک نظر سب اختلافات معلوم ہو جائیں۔

(۶۵) تقریر نسائی شریف:......(غیر مطبوعہ)

یہ بہت مفصل تقریر ہے جو اس ناکارہ نے ۴ ربیع الثانی ۶۱ھ میں لکھنی شروع کی تھی اور ساعۃ مبارکہ آخر ساعت من یوم الجمعہ جمادی الثانی ۶۱ھ میں ختم ہوئی۔ اس میں وہ تقریر بھی آ گئی جو میں نے حضرت قدس سرہ سے پڑھنے کے زمانے میں نقل کی تھی اور میرے والد صاحب کی دو تقریریں جو نہوں نے اپنے حضرت گنگوہی قدس سرہ سے نقل کی تھیں، ان کے علاوہ حضرت امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قال ابوعبدالرحمٰن کی شرح مفصل آ گئی ہے۔ نیز اس کے لیے زہرالربی اور سندھی علی النسائی بالاستیعاب دیکھی اور مدرسہ میں ابتداء میں احادیث کی کتابوں کے متعلق ہر کتاب کا ایک نسخہ برائے مدرس مخصوص ہوتا تھا، اسی میں حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نے پڑھایا اور ان ہی میں حضرت سہارنپوری اور دیگر مدرسین نے پڑھایا۔ نسائی شریف کے اس نسخہ پر قلمی حواشی بھی بہت ہیں، ان میں سے ما یتعلق بالکتاب کو بھی بندہ نے اپنی اس تقریر میں جمع کر دیا ہے اور دیگر اکابر کی تقریریں جو مجھے ملیں ان سے بھی ما یتعلق بالکتاب کو اس تقریر میں جمع کیا گیا ہے۔ اس تقریر کو اکثر مدرسین نے نسائی شریف پڑھانے کے زمانے میں نقل بھی کیا ہے۔

(۶۶) جزء أمراء المدینہ:......(غیر مطبوعہ)

اکثر روایات میں امیرِ مدینہ کی عبارت سے واقعات نقل کیے گئے ہیں: قال امیر المدینہ کذا۔ فعل امیر المدینہ کذا۔ اس رسالہ میں امراءِ مدینہ کے ناموں کی تعیین اور ان کے امارت کے زمانہ کی ابتداء وانتہا جمع کی گئی ہے تاکہ واقعات میں امیر کی تعیین ہو سکے۔

(۶۷) جزء طرق المدینہ:......(غیر مطبوعہ)

مدینہ منورہ سے مکہ کی طرف آنے کے لیے چار راستے مشہور ومعروف ہیں، سلطانی، فرعی، غائر اور شرقی۔ اس رسالہ میں ان چاروں راستوں کی تفصیل اور ان کے منازل ذکر کیے گئے ہیں اور ان کے مختصر حالات بھی افسوس کہ رسالہ حجۃ الوداع کی تالیف کے وقت یہ رسالہ مل نہ سکا بعد میں ملا ورنہ اس سے بہت مدد ملتی۔

(۶۸) جزء ما یشکل علی الجارحین:......(غیر مطبوعہ)

ائمۂ جرح وتعدیل کے کلام میں بعض رجال کے متعلق جارحین کے کلام پر کچھ اشکالات پیش آتے ہیں اس رسالے میں ان اشکالات کو جمع کیا ہے۔

(۶۹) جزء الجہاد:......(غیر مطبوعہ)

جہاد کی تعریف، اس کے شرائط، امارت اور خلیفۂ شرعی کی شرائط بیان کیے گئے ہیں۔

(۷۰) جزءالنکحتہ :......(غیر مطبوعہ)

امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے نکاحوں کی تفصیل اور ان کے احوال اور ان عورتوں کا ذکر جن کے نکاح میں اختلاف ہے اور جن عورتوں سے خطبہ ہوا مگر نکاح نہیں ہوا ان کی تفاصیل اور آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کا ذکر ہے۔

(۷۱) مشائخ تصوّف:......(غیر مطبوعہ)

اکابر صوفیہ کے مختصر حالات۔ یہ رسالہ مشائخ چشتیہ کے علاوہ ہے۔ وہ تو مشائخ چشت کے ساتھ مخصوص تھا اور اس میں معروف صوفیاء کے حالات درج ہیں۔

(۷۲) اوّلیات القیامۃ :......(غیر مطبوعہ)

اس رسالہ میں وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اول ما یسئل یا اول مایفعل) فرمایا جیسے ''اول ما یحساب العبد یوم القیامہ الصلوۃ'' اور ''اول ما یقضی فی الدماء۔ اول الناس یقضی علیہ یوم القیامہ رجل استشھد الحدیث'' وغیرہ وغیرہ۔

(۷۳) مختصات المشکوٰۃ:......(غیر مطبوعہ)

مرقات میں یا دوسری شروح میں جو مضامین مشکوۃ شریف کی کتاب کے حل سے تعلق رکھتے تھے وہ اس رسالہ میں جمع کیے گئے ہیں، یعنی جو مضامین احادیث سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس میں نہیں لیے گئے، بلکہ خاص وہ مضامین جو نفس کتاب سے متعلق ہیں، ان کو جمع کیا گیا ہے۔

(۷۴) رسالہ ردمودودیت:

۷۰ھ میں مودودیت کی کتابیں بہت ہی کثرت سے پڑھنے کی نوبت آئی۔ تقریباً تین رسائل اور کتب مودودی صاحب اور ان کی جماعت کی شب و روز جاگ کر پڑھیں اور یادداشتیں ایک رسالہ کی صورت میں جمع کی تھیں اور یہی رسالہ حضرت مدنی قدسرہ کی اکثر تالیفات کا بھی مأخذ ہے اور قاری سعید صاحب کی تالیف ''کشفِ حقیقت'' کا بھی مأخذ ہے اور اس ناکارہ نے تقریباً پچاس بڑی تقطیع کے صفحات پر خود بھی ایک رسالہ لکھا تھا، باوجود اکابر اور احباب کے شدید اصرار کے طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ یہ رسالہ میرے مسودات میں موجود ہے۔ بھائی اکرام کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا ہے۔

(۷۵) مشرقی کا اسلام:......(غیر مطبوعہ)

عنایت اللہ مشرقی کا تذکرہ اور اس کی کتابوں کو بھی ایک زمانے میں بہت کثرت سے دیکھا اور

اس کی کفریات کو ایک رسالہ میں جمع کیا یہی رسالہ قاری سعید صاحب مفتی مظاہر علوم کے رسالہ مشرقی کا اسلام مطبوعہ کا ماٗ خذ ہے۔

(۷۶) میری محسن کتابیں:

مولانا الحاج ابوالحسن علی ندوی نے ایک زمانہ میں اخبارات میں اس عنوان پر مضامین لکھوانے کا تقاضا کیا تھا اور اس نا کارہ پر تحریراً وتقریراً کئی دفعہ تقاضا کیا، اس پر اس نا کارہ نے زبانی تو یوں کہا تھا کہ ''میری محسن کتابیں تو ابا جان کا جوتا تھا'' لیکن ان کے اصرار پر ایک رسالہ اس سلسلے میں بھی تصنیف کرنا شروع کیا تھا، جس میں ہر دور کی اپنی پسندیدہ کتابیں لکھی تھیں، مضمون ناقص رہ گیا پورا نہ ہو سکا۔

(۷۷) نظام مظاہر علوم:

مولانا شبیر علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ جب مظاہر علوم کے ابتداءً سرپرست بنے تو انہوں نے مدرسہ کے سابقہ نظام کے متعلق تحریراً اور تقریراً بہت ہی معلومات دریافت کیں، اس کے جواب میں اس نا کارہ نے یہ بہت ہی اہم رسالہ لکھا تھا، جس میں میرے کئی ماہ تتبع اور تلاش میں بھی خرچ ہوئے تھے۔ بہت بڑی تقطیع کے تقریباً سو صفحے سے زائد تھے لیکن افسوس کہ اس سال مولانا مرحوم اوّلاً حجاز اور وہیں سے پاکستان تشریف لے گئے۔

اس رسالہ کے متعلق پاکستان پہنچنے کے بعد میں نے استفسار کیا تو مولانا مرحوم نے لکھا'' مجھے یاد نہیں وہیں متروکات میں رہ گیا ہوگا''۔ مولانا ظہور الحسن صاحب مقیم خانقاہ اشرفیہ اور مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم نائب مہتمم مظاہر علوم سے بھی دریافت کیا کہ شاید ان کے پاس ہو، نہ ملا۔ اس کی نقل میرے کاغزات میں بھی نہایت باریک میرے قلم کی لکھی ہوئی ہے، مگر وہ نمی کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپک گئے۔ مظاہر علوم کی نہایت مستند بہترین ابتدائی تاریخ تھی جس کا مجھے بھی بے حد قلق ہے۔

مولانا شبیر علی صاحب ۲۳ ربیع الثانی ۲۳ھ میں سرپرست مقرر ہوئے اور شوال ۲۹ھ میں حج کو گئے اور وہاں سے مستقل پاکستان چلے گئے اور شب سہ شنبہ ۲۸ رجب المرجب ۸۸ھ کو انتقال ہو گیا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(۷۸) جامع الروایات والاجزاء:...... (غیر مطبوعہ)

اس نا کارہ نے اپنی ابتداء زندگی میں جس کو میں ۳۵ھ کے بعد سے شروع سمجھتا ہوں اور ۸۸ھ پر ختم سمجھتا ہوں۔ کتبِ احادیث کے اطراف لکھنے شروع کیے تھے جن کی روایات کو جامع الروایات کے نام سے جمع کرنا شروع کیا تھا اور ان کی تفاصیل کو اجزاء کے نام سے لکھنا شروع کیا

تھا اور اس میں صحاح ستہ، موطئین، طحاوی، حاکم، بیہقی وغیرہ کے اطراف لکھنا شروع کیے تھے، بہت بڑا ذخیرہ اس کا ہو چکا تھا جس کو مشکوٰۃ کی ترتیب سے شروع کیا تھا، مشکوٰۃ تو پوری ہوگئی تھی، خیال تھا کہ جملہ حدیث کی کتابوں کو بھی نقل کروں، لیکن پھر زندگی ختم ہوگئی اس لیے اس کی تالیف ناقص رہ گئی۔ کاش کہ کوئی پوری کرنے والا ہوتا!

(۷۹) معجم رجال تذکرۃ الحفاظ للذھبی:......(غیر مطبوعہ)

تذکرۃ الحفاظ چار جلدوں میں طبع ہوئی ہے اور ہر جلد کی فہرست الگ ہے اور اس میں بھی مشہور لقب اور کنیت سے رواۃ کو ذکر کیا گیا ہے، اس ناکارہ نے اس رسالے میں چاروں جلدوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی جس میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ناموں کی فہرست لکھی تھی اور ہر نام کو اس کے نام کے اعتبار سے اسی کے حرف میں لکھا تھا۔

(۸۰) تبویت تاویل مختلف الاحادیث لابن قتیبۃ:......(غیر مطبوعہ)

ابن قتیبہ کی ''تاویل حدیث'' مشہور کتاب ہے مگر مبوّب نہیں ہے کیف ما اتفق احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ اس ناکارہ نے ابوابِ فقہیہ کی ترتیب پر اس کی تبویب کی تھی جو ۵ جمادی الاول ۴۳ھ جمعہ میں لکھی گئی۔

(۸۱) تبویب مشکل الاثار:......(غیر مطبوعہ)

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مشکل الآثار چار جلدوں میں ہے اور اس کی فہرست بھی مسلسل مضامین کے اعتبار سے غیر مرتب ہے۔ اس ناکارہ نے ان چار جلدوں کی فہرست کو ابوابِ فقہیہ کے اعتبار سے مرتب کیا تھا۔

(۸۲) معجم الصحابۃ التی اخرج عنہم، ابوداؤد الطیاسی فی مسندہ:......(غیر مطبوعہ)

امام ابوداؤد طیالسی نے بھی مسند احمد کی طرح سے صحابہ کی روایات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مراتب کے اعتبار سے نقل کی تھیں جس سے وہی فائدہ اٹھا سکتا تھا جو مراتب صحابہ سے واقف ہو۔ اس ناکارہ نے ان سب صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایات کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کی۔

(۸۳) تبویب احکام القرآن للجصاص:

امام ابوبکر جصاص رازی قدس سرہ کی ''احکام القرآن'' کی فہرست قرآن پاک کی ترتیب کے موافق ہے، اس سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو حافظ قرآن ہو، اس لیے اس کے مضامین کو علیٰ

ترتیب ابواب الفقہیہ مرتب کیا گیا ہے۔

یہاں تک ختم کرنے کے بعد یہ باب تالیف کا ختم کرتا ہوں۔اب تک ان ہی رسائل واجزاء کا پتہ چلا ہے،میرے اندازے میں پچیس تیس ابھی اور بھی ہیں،لیکن اپنی فضیلت کے اظہار کے واسطے اتنے بھی کافی ہیں،اللہ تعالیٰ اس ریا کاری کو معاف فرمائے،آج ۱۵ شعبان کو یہ نمبر ختم ہو رہا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آئندہ نمبر اور ابواب آج کے بعد لکھے جائیں گے،یہ تو شروع میں لکھوا چکا ہوں کہ علی گڑھ کے قیام میں آٹھ بابوں کا اجمالی خاکہ اور بہت سے مضامین تفصیل سے پورے ہو گئے تھے۔چنانچہ باب سوم و چہارم بھی وہیں مکمل ہو چکے تھے اور بقیہ نمبروں کو بھی کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا تھا،سہولت اور آپ بیتی نمبر۱ کی رعایت سے بقیہ نمبروں کو بھی مختصر کرنے کا خیال ہے۔

......☆☆☆☆☆......

آپ بیتی نمبر ۳

یا

یادِ ایام نمبر ۲

جس میں

عارفِ کبیر، شیخ الحدیث، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ کی بعض مخصوص عاداتِ مبارکہ، حوادث وشادیوں میں آپ کا طرزِ عمل نیز اپنے بعض اکابر کے حوادثِ انتقال کا تفصیلی تذکرہ اور بعض عجائبات قدرت کے مشاہدات نہایت مؤثر انداز میں مذکور ہیں۔

ناشر

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْم ط

یہ رسالہ آپ بیتی نمبر۳ یا یادِ ایام نمبر۲ سلسلہ کا دوسرا رسالہ ہے اس سے پہلے رسالہ کی تمہید میں لکھا جاچکا ہے کہ اس ناکارہ نے اپنے قیام علی گڑھ کے دوران آٹھ ابواب پر مشتمل مضامین کا ایک اجمالی خاکہ لکھوایا تھا، یہاں آ کر جب ان کو صاف نقل کرایا تو وہ ایک طویل مضمون ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اس کو چار نمبروں پر تقسیم کرنا پڑا، ہر نمبر میں دو باب ہیں۔

باب اول: ''اعمال کا مدار نیتوں پر ہے''

باب ثانی: ''درس وتدریس اور تالیفات''

رسالہ نمبر ۱ میں گزر چکے ہیں۔ زیرِ نظر رسالہ نمبر۲ میں بھی دو باب ہیں۔

باب سوم: ''میری چند بری عادتیں''

باب چہارم: ''حوادث اور شادیاں اور ان میں میرا طرزِ عمل''

بقیہ ابواب انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد شائع ہو جائیں گے۔

فقط والسلام

محمد زکریا کاندھلوی

۵ صفر ۱۳۹۱ھ

بابِ سوم

اِس سیہ کار کی چند بُری عادتیں

میں ہی کرتا ہوں گلہ اپنا، نہ سن غیروں کی بات
وہ یہی آخر کہیں گے اور کیا کہنے کو ہے

(۱)......مہمان بالخصوص خصوصی اور اہم یا محض اجنبی آنے والوں سے یہ سوال کہ کیا نظامِ سفر ہے یا کب تک قیام ہے؟ ایک مستقل معمول ۳۵ھ سے ہے اور یہ چیز میں نے میرٹھ کے اکابر سے سیکھی تھی، عالی جناب الحاج فصیح الدین صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی الحاج وجیہ الدین صاحب کے مخلص دوست میرے حضرت مرشدی نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے مخلص خادم الحاج رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کے متعلق محاسن وخوبیوں کا بہت بڑا دفتر چاہیے، مختصر یہ ہے کہ ان کے وصال کے بعد جب حضرت اقدس مولانا الحاج عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ چاٹگام تشریف لے گئے اور ان کے مزار پر پہنچے تو واپسی میں مجھ سے بلا واسطہ خصوصی تعلقات رہے، مگر مزار پر پہنچ کر اس قدر انوار وبرکات دیکھے کہ میں حیرت میں رہ گیا۔ میرے اکابر اربعہ حضرت اقدس سہارنپوری، حضرت اقدس تھانوی، میرے والد صاحب، میرے چچا جان حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مراقدہم ہر ایک سے اس قدر محبانہ اور محبوبانہ تعلق تھا کہ کہیں موقع ہوا تو دو چار قصے ان کی اہم خصوصیات کے بھی کہیں آجائیں گے۔ اس وقت تو میں یہ لکھوا رہا تھا کہ ۳۵ھ سے میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کا یہ معمول دیکھا کہ جب بھی دہلی، خورجہ، امروہہ، اجراڑہ بلند شہر وغیرہ کسی بھی ایسی جگہ جانا ہوتا کہ جہاں میرٹھ راستے میں پڑے تو ناممکن تھا کہ میرٹھ آتے یا جاتے اترے بغیر حضرت کا سفر پورا ہو جائے اور یہ خادم بھی اکثر اسفار میں حضرت کا ہم رکاب رہتا تھا۔ ان میں سے حضرت کی تشریف بری کی اگر پہلے سے اطلاع ہوتی تو یہ سب چھاؤنی یا شہر کے اسٹیشن پر ملتے اور بسا اوقات حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو اپنے غایت تعلق کی وجہ سے بغیر اطلاع دے دیئے بھی جانے کی نوبت آجاتی۔ خان بہادر الحاج فصیح الدین صاحب تاجرِ اسلحہ مالک الٰہی بخش اینڈ کو چھاؤنی میرٹھ ان سب کے بڑے تھے، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سیدھے ان کی کوٹھی پر تشریف لے جاتے اور یہ سب خبر سنتے ہی دوڑے ہوئے آتے اور مصافحہ کے ساتھ ہر ایک کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ حضرت کیا نظامِ سفر ہے؟ مجھے اس وقت بہت غصہ آتا، بڑے مہمل لوگ ہیں، مصافحہ نہیں، خیریت نہیں، پہلا سوال کہ کب جاؤ گے؟ مگر ان دوستوں کا سوا بڑے ہی اخلاص پر مبنی تھا،

جیسا کہ اس کے اگلے نمبر پر آرہا ہے۔ میں نے اس کو اپنی بری عادت میں شمار کیا، اس لیے کہ میرا سوال تو اخلاص پر مبنی نہیں ہوتا، خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے، مگر ان کا واقعی اخلاص پر جیسا آگے آرہا ہے۔

مہمان سے سوال کہ قیام کب تک ہے اس کا ماخذ:

اس کے بعد میں نے حضرت حکیم الامت حضرتِ اقدس تھانوی قدس سرہ کے معمولات میں بھی یہ چیز پڑھی اور سنی ہے کہ حضرت خاص مہمان سے نظام سفر معلوم کر لیتے۔ اس میں بڑی مصلحت معلوم ہوئی کہ ہر آنے والے کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کب تک قیام ہے تو اپنی سہولت اور اس کی سہولت کے اعتبار سے بالخصوص مشغول لوگوں کے لیے وقت نکالنے کی گنجائش ہو جاتی ہے۔ اس کے خلاف میں بسا اوقات دقتیں بھی اٹھائیں کہ لوگوں نے عین سبق کے وقت یا کسی ضروری کام کے درمیان میں کہا کہ اسی وقت جانا ہے اور ایک ضروری کام سے آئے تھے، اس وقت اپنے اوپر بہت غصہ آتا ہے کہ آتے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔ اگرچہ اس میں بعض دفعہ بعض لوگوں کی جہالت سے نامناسب چیزیں پیدا ہوئیں۔ ایک صاحب کا قریب دو (۲) برس ہوئے ایک خط آیا، اس قسم کے خطوط تو مختصر مفصل آتے ہی رہتے ہیں، مگر یہ عجیب تھا اس نے لکھا کہ ''میں ایک ہفتہ قیام کے ارادے سے تیرے پاس آیا تھا، تو نے اجازت نہ دی، روتا ہوا واپس چلا آیا، جب سے طبیعت بے چین ہے۔'' میں نے لکھا کہ ''مجھے تو بالکل یاد نہیں آیا کیوں اجازت نہ دی، تم ہی لکھو تو یاد آئے کہ میں نے کس بات پر تم کو جانے کو کہہ دیا''؟ اس کا جواب اس شخص نے لکھا کہ میرا ارادہ ایک ہفتہ قیام کا تھا، تو نے جاتے ہی، مصافحہ پر پوچھ لیا ''کب تک ٹھہرو گے''؟ میرے منہ میں جلدی سے دو (۲) دن نکل گئے، پھر دو دن بعد روتا ہوا چلا آیا، میری ہمت نہ پڑی۔ میں نے اس کو ڈانٹ کا خط لکھا کہ ''قصور اپنا الزام مجھے دیتے ہو، میں نے کب جانے کو کہا تھا''؟

اس نوع کے کئی لطیفے اور بھی پیش آئے، لیکن اس قسم کے لطائف کے مقابلے میں سہولتیں زیادہ ہیں۔

(۲)...... یہ نمبر حقیقت میں نمبر ۱ کا تکملہ ہی ہے اور یہ بھی میں نے میرٹھ کے اکابرِ ثلاثہ ہی سے سیکھا ہے جس کا اوپر ذکر آیا اور یہی وہ بات تھی جس کو میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ان کا یہ فعل اخلاص پر مبنی تھا۔

حضرت اقدس کا عام معمول یہ تھا کہ شام کی گاڑی سے پہنچتے تو رات کے قیام کے بعد صبح کی گاڑی سے آگے روانہ ہو جاتے، چاہے سہانپور کی طرف یا دوسری طرف جدھر جانا ہو۔ یہ احباب جب حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے نظام پوچھ لیتے تو اسی مجلس میں ذرا الگ ہو کر تینوں کہتے ''شام کا کھانا تمہارے یہاں، صبح کا ناشتہ فلاں کے ہاں اور روانگی کے وقت ناشتہ دان میں توشہ فلاں کے یہاں۔ اس میں ذرا بھی ایک منٹ کو بھی تاخیر نہ ہو''۔ فوراً تینوں کا مرحلہ طے ہو جاتا، کبھی کبھی آپس میں تغیر بھی ہو جاتا، اس وقت مجھے دقت ہے صبح کا ناشتہ میرا، دوسرا کہتا بہت اچھا، البتہ ریل کا ناشتہ

اس وقت میں ہوتا جب سہانپور کی طرف آمد ہوتی۔ اگر دوسری طرف جانا ہوتا تو راستے کا ناشتہ نہ ہوتا، مگر تیسرے نمبر کی قضا اس وقت متعین ہو جاتی کہ اگلی آمد میں پہلا وقت ان کا۔

مجھے کبھی یاد نہیں کہ ان اکابر میں سے کبھی کسی نے یوں کہا ہو کہ ''حضرت! ایک گاڑی مؤخر کردیں''۔ یہ ادا مجھے ان لوگوں کی بہت پسند آئی۔ اللہ بہت ہی جزائے خیر دے اور اس حرکت نے مجھے بہت ہی بدنام کیا۔ میرے اکثر اکابر کے کئی کئی واقعات بہت ہی کثرت سے پیش آئے، صرف نمونہ کے واسطے تین بزرگوں کے تین واقعے لکھواتا ہوں۔

(۳) (الف)......سب سے پہلے مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب زادمجدہم جب ان کی آمد ہمارے نواح میں شروع ہوئی، جس کو یہ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ چچا جان الحاج مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح میں بار بار لکھ چکے ہیں، رائے پور کی حاضری کے لیے سہارنپور تو جنکشن تھا اور مولانا دام مجدہم اپنے تعلق اور محبت کی وجہ سے ایک دو روز ٹھہر کر رائے پور جایا کرتے۔ چند مرتبہ کی آمد و رفت میں علی میاں نے حضرتِ اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کو ایک خط لکھا، جس کا تذکرہ علی میاں نے تو مجھ سے نہیں حضرتِ اقدس رائے پوری نوراللہ مرقدہ ' نے خود علی میاں کا خط اور اپنا جواب مجھے سنایا۔ علی میاں نے حضرتِ اقدس کی خدمت میں یہ خط لکھا کہ ''جب سہارنپور جانے پر زکریا سے ملاقات ہوتی ہے تو اس قدر محبت اور شفقت سے ملتا ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی اشتیاق و مسرت ہو رہی ہے۔ لیکن جب بھی ذرا بر سبیلِ تذکرہ ہی جانے کا ذکر آیا ایسی جلدی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے جس سے معلوم ہو ہے کہ بہت ہی بوجھ ہو رہا تھا''۔ علی میاں نے حضرت کو لکھا کہ ''کئی مرتبہ صرف خیال کے درجے میں آنے کا ذکر کیا اور ان سے کہا کہ خیال یہ ہے کہ اس گاڑی سے چلا جاؤں اور انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیے، تو اس کے مصافحے کی پیش قدمی پر ارادہ کر لینا پڑا''۔ یہ بھی لکھا کہ ''کئی مرتبہ ریل پر آنے کے بعد شدید تقاضا واپسی کا پیدا ہوا، مگر اس خیال سے واپس نہ گیا کہ مصافحہ کر کے واپس آ گیا ہوں اب کس منہ سے واپس جاؤں''۔ حضرتِ اقدس نے علی میاں کو جواب لکھا کہ ''آپ اس کا بالکل خیال نہ کریں، اس کے شکار آپ تنہا ہی نہیں ہیں ہم سب ہیں''۔

اس سیہ کار کے اس نوع کے واقعات میرے دو (۱) مخدوم (۲) آقا حضرت رائے پوری، حضرت مدنی نوراللہ مرقدہما کے ساتھ بارہا پیش آئے، جیسا کہ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علی میاں کو لکھا کہ ''ہم سب اس کے شکار ہیں''۔ بالکل صحیح تحریر فرمایا۔

(۴) (ب)......حضرت اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مدنی کے ساتھ بارہا اس قسم کے واقعات مجھ گستاخ بے ادب کے پیش آئے، حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہ کا

معمول ۴۶ھ سے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی طویل بیماری شوال ۷۴ھ جو منصوری پر ہوئی تھی، ہر ماہ تین دن کے لیے سہارنپور تشریف لانے کا رہا اور جب یہ طویل علالت شروع ہوگئی تو حضرت قدس سرہ کا یہ پیام پہنچا کہ ''صحت میں کوئی مہینہ تیرے پاس آنے میں نہیں چھوڑا، اب ملاقات تیرے اختیار کی چیز ہے''۔ اسی ارشاد نے اس سیہ کار کو مجبور کیا کہ جس زمانے میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام بہٹ میں شاہ مسعود کی کانگرو والی کوٹھی پر رہا میں شام کو ہمیشہ حدیث پاک کا سبق پڑھانے کے بعد بہٹ جاتا تھا، مغرب تک کوٹھی پر پہنچتا، شب وہاں گزار کر صبح کی نماز کے بعد سہارنپور آجاتا۔ جس زمانے میں حضرت اقدس کی ماہانہ تشریف آوری کا دور تھا تیسرے دن رات کو بہٹ سے کار آجاتی اور علی الصباح چائے کے بعد حضرت تشریف لے جاتے تھے۔

(۱)......ایک مرتبہ حسبِ معمول حضرت اقدس تشریف لے جا رہے تھے سامان بند چکا تھا، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ مصافحوں سے فراغ پر تشریف بری کے لیے اٹھ رہے تھے، میرے بچے طلحہ نے جب کہ اس کی عمر غالباً تین سے چار سال کے درمیان ہوگی، حضرت قدس سرہ کے کرتہ کا پلہ پکڑ کر اپنے بچپن کی وجہ سے کہا ''حضرت آج نہیں''۔ ''حضرت فوراً چبوترے پر بیٹھ گئے''، بھائی الطاف سے کہا ''سامان کھول دو، آج نہیں جانا ہے''۔ میں نے ہر چند اصرار و تقاضا کیا کہ ''حضرت یہ ناسمجھ بچہ ہے، اس کو خبر نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟ بھائی الطاف! سامان ہرگز نہیں کھلے گا''۔ میرا تو بار بار یہ اصرار اور حضرت کا بار بار یہ ارشاد کہ ''سامان کھول دو میں نہیں جاؤں گا''۔ حضرت نے فرمایا کہ ''اس گھر میں آج تک کسی چھوٹے بڑے کی زبان سے ''آج نہیں'' کا لفظ میں نے سنا ہی نہیں، آج پہلی دفعہ کان میں پڑ رہا ہے''۔

میرے دونوں حضرات رائے پوری اور مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کے واقعات میرے بیسیوں نکلیں گے۔

سہارنپور کا تبلیغی اجتماع:

(۲)......حضرت رائے پوری قدس سرہ کے ساتھ اس وقت ایک اور اہم واقعہ یاد آگیا، جس کو عزیز محمد ثانی نے سوانح یوسفی صفحہ ۳۲۲ پر مختصر طور پر لکھا ہے۔ ۲۴ شوال ۷۳ھ میں سہارنپور کا تبلیغی اجتماع ہوا تھا۔ حضرت قدس سرہ بھی پاکستان سے دہلی ہوتے ہوئے ۲۶ھ شوال کو سہارنپور میں پہنچے۔ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات شب کے اجتماع کی تقریروں سے فراغ پر سب ریل پر پہنچ گئے، میل سے حضرت کی تشریف آوری ہوئی۔ میں نے مصافحہ کے ساتھ پوچھا ''حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نظام کیا ہے؟ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کل پرسوں دو (۲) دن بعد سہارنپور طے کر کے آیا ہوں، تیسرے دن جیسا آپ کا ارشاد ہو''۔ میں نے عرض کیا ''کل کے

قیام کی بھی اجازت نہیں، صبح کی اذان کے بعد اپنی جماعت کریں چائے تیار ملے گی، مدرسہ کی جماعت سے پہلے تشریف لے جائیں''۔ حضرت نے فرمایا ''تکان ہو رہی ہے ایک دن قیام کی تو ضرور اجازت دے دیں''۔ میں نے عرض کیا ''صبح کی اذان کے بعد آدھے گھنٹہ کی بھی اجازت نہیں''۔ تبلیغی احباب کو جتنا غصہ آنا چاہیے تھا وہ قرین قیاس تھا، مجھے الطاف بھائی کا غصہ ہمیشہ یاد رہے گا، بہت ہی غصہ آیا کہ دنیا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ٹھہرنے کی خوشامد کرے اور یہاں حضرت خود فرمادیں اور یہ یوں کہے کہ نہیں۔ سب کی مخالفتوں کے باوجود صبح کی اذان کے بعد میں نے روانہ کردیا۔ میں نے حضرت سے عرض کیا ''جون کا مہینہ، گرمی کی شدت، ہمارے یہاں راحت کی کوئی جگہ نہیں اور یہ تبلیغ والے کل رات کو جلسے میں تھوڑی دیر کی خواہش وتمنا اور مجھ ہی سے درخواست کرائیں گے، پرسوں صبح کو ہمارا جلسہ ختم ہو جائے گا، ظہر کے وقت میں اور عزیز یوسف رائے پور حاضر ہوں گے، دو دن قیام کریں گے''۔ کار میں بیٹھنے کے بعد شاہ مسعود نے بہت قیام کی درخواست کی، حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ''جب شیخ نے سہارنپور نہ ٹھہرنے دیا، تو اب کہیں نہیں ٹھہرتا''۔ طلوع آفتاب تک رائے پور پہنچے۔ رائے پور کے پہنچنے کے بعد دو دن تک ہر آنے والے سے سنتا رہا اور خوب سنا کہ حضرت قدس سرہٗ نے اتنی لا تعدو لاتحصیٰ دعائیں دی اور ہر آنے والے سے رائے پور کا ہو یا دیہات کا فرماتے کہ ''میرا تو دو دن قیام کا ارادہ تھا مگر شیخ نے نہ مانا، محبت اس کا نام ہے، محبت کرنا بھی کوئی ان ہی لوگوں سے سیکھے، کیا عقل میں آئے کہ حضرت شیخ کا دل نہ چاہتا ہوتا، مگر میری راحت کو اپنی خواہش پر غالب کرکے دکھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ بہت بلند درجے عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ ان کو بھی ایسی ہی راحت دے، اللہ یوں کرے۔ اللہ یوں کرے''۔ دو دن تک وہ دعائیں ملیں کہ اب تک بھی جب کبھی اپنی زبردستی کا خیال آجاتا ہے دل خوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں اور عزیز مولانا یوسف مرحوم جلسہ کے اختتام پر منگل کی دوپہر کو رائے پور حاضر ہوئے۔

حضرت مدنی کا بندہ کے ساتھ تعلق اور اثناء اسفار میں تشریف آوری کا اہتمام:

(ج)...... پہلے دو قصے بلکہ تین، ایک علی میاں کا، دوسرا حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کے لکھوا چکا ہوں۔ میرے حضرت سیدی وسندی، ماوائی وملجائی، شیخ الاسلام حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ کو جو شفقت ومحبت اس سیہ کار پر رہی اس کے دیکھنے والے سینکڑوں نہیں ابھی تک ہزاروں آنکھیں موجود ہیں، حضرت قدس سرہٗ کا ہمیشہ مستقل اور مستمر معمول یہ رہا کہ دیوبند سے رڑکی لائن پر جاتے ہوئے سہارنپور کے قصبات میں کسی جگہ جاتے ہوئے اگر ایک گھنٹہ کا وقفہ بھی ملتا تھا تو واپسی کا تانگہ لے کر ضرور کرم فرماتے تھے، ہر چند کہ میں بار بار تکلیف کے خیال سے گستاخانہ لہجے میں نکیر بھی کرتا۔ سینکڑوں واقعات اس کے گزرے،

جو اصل واقعہ اس جگہ لکھوانا ہے وہ تو آگے آرہا ہے، بیچ میں ایک چھوٹا سا فقرہ لکھواتا ہوں۔

(۱) ایک مرتبہ دسمبر کا زمانہ، سردی زور پر، بارش اس سے بھی زیادہ، ساڑھے گیارہ بجے رات کے میں اپنے مکان کے دروازے پر کتاب دیکھ رہا تھا، دروازے ہی میں سویا کرتا تھا۔ زنجیر زور سے کھٹکی، پوچھا ''کون ہے؟'' ارشاد ہوا ''حسین احمد''۔ ننگے پاؤں اٹھ کر کواڑ کھولے اور تعجب سے پوچھا ''حضرت اس وقت بارش میں؟'' ارشاد ہوا کہ لکھنؤ جانا ہے، کلکتہ میل دو گھنٹہ لیٹ ہے۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ تم جاگ رہے ہو گے، اس لیے خیال ہوا کہ تمہارے درشن کر آؤں۔ میں نے نہایت گستاخی سے کہا، ان مبارک ہونٹوں سے یہ لفظ بڑا ثقیل ہے، میں نے چائے کی درخواست کی، فرمایا ریل پر جا کر پیوں گا، چائے پی کر بارش میں جانا پڑے گا، تانگہ بھی باہر بھیگتا رہا اور حضرت ایک گھنٹہ تشریف فرما کر کچھ خصوصی ارشادات فرما کر تشریف لے گئے۔

یہ بات تو بیچ میں آ گئی تھی، سینکڑوں واقعات اس نوع کے پیش آئے، ان کے لیے ایک ''الف لیلہ ولیلہ'' چاہیے۔

بندہ کے ساتھ حضرت مدنیؒ کے ہمرکابی میں اطراف سہارنپور کے اسفار:

اس وقت جو قصہ مقصود تھا، وہ بھی ایک عجیب ہے۔ دسمبر کی رات، حضرت قدس سرہ آبھہ ایک گاؤں نانوتہ کے قریب تشریف لے گئے تھے، ویسے تو اس زمانے کا اکثر یہ معمول تھا کہ حضرت ضلع سہارنپور کے کسی قصبے یا گاؤں میں جاتے تو سٹیشن سے کار میں سیدھے میرے گھر تشریف لاتے، مجھے کار میں بٹھا کر اپنے ہمراہ لے جاتے تھے، تین چار گھنٹے کا سفر ہوتا تھا، واپسی میں مجھے مکان پر اتار کر اسی کار میں اسٹیشن تشریف لے جاتے اور وہاں سے ریل میں، اکثر دیوبند سے سہارنپور کا سفر آمد و رفت کا ریل میں ہوتا اور سہارن پور کے اسٹیشن سے اسٹیشن پر واپسی تک کار میں آبھہ، نانوتہ، بہٹ، رائے پور، گنگوہ کے سفر میں اکثر معیت رہی۔ ریڑھی تاجپورہ کے سالانہ جلسے کا تو خاص مستمرہ دستور تھا کہ حضرت قدس سرہ شام کو چار بجے کی گاڑی سے دیوبند سے تشریف لاتے، چائے نوش فرماتے، عصر کی نماز مدرسہ کی مسجد میں پڑھ کر کار میں ریڑھی جاتے، مغرب وہاں پڑھ کر ایک گھنٹہ آرام فرماتے، اٹھنے کے بعد کھانا نوش فرماتے۔ یہ ناکارہ دسترخوان پر تو شریک ہوتا لیکن کھانے میں شریک نہ ہوتا، اس لیے کہ رات کو کھانے کا معمول نہیں تھا۔ عشاء کے بعد مدرسہ کے جلسہ میں پورے بارہ بجے تک وعظ فرماتے، پورے بارہ بجے وعظ ختم کر کے تقریباً آدھا گھنٹہ مصافحوں میں لگتا اور کار میں مجھے بٹھا کر میرے دروازے پر چھوڑ کر اسی کار میں سٹیشن تشریف لے جاتے اور ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے دیوبند اور علی الصباح مدرسہ کا سبق۔

حضرت کے سفر آبھہ کا واقع سردی اور بارش:

(۲)......اصل واقعہ دسمبر والا جولکھنا شروع کیا تھا وہ مؤخر ہوتا جارہا ہے۔ ایک مرتبہ آبھہ کار میں تشریف لے گئے۔ معلوم نہیں کہ یہ ناکارہ ساتھ کیوں نہیں تھا؟ غالباً مدرسہ کی کوئی ضرورت تھی۔ دوسرے دن مغرب کے بعد حضرت قدس سرہ آبھہ سے واپس تشریف لائے، اس قدر زوردار طوفانی بارش کہ کمرہ سے باہر پاؤں رکھنا مشکل، اتنی ہی زوردار سردی اور حضرت قدس سرہ کو شدت سے بخار، آتے ہی فرمایا کہ مغرب نہیں پڑھی ہے، راستے میں دیر ہوتی چلی گئی، کہیں اترنے کی جگہ نہیں ملی، مشلح وغیرہ سب بھیگ رہا ہے، میں نے جلدی سے لنگی پیش کی، کپڑے اتارے، لنگی اور چادر میں حضرت نے مغرب کی نماز پڑھی، دو تین خادم بھی ساتھ تھے، اتنے حضرت نے نہایت ہی اطمینان سے مغرب کی جماعت کرائی، میں نے دو انگیٹھیاں بھروا کر منگوائیں اور عزیزم مولوی نصیرالدین کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، دارین کی ترقیات سے نوازے اور ان چیزوں کے ثمرات وہ خود بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، وہ بغیر کہے چائے تیار کر کے لے آیا، چائے کی پیالی پیش کی گئی اور میں نے اپنی بری عادت کا مظاہرہ کیا۔ کار تو سہارنپور تک ہی گئی تھی، وہ حضرت کو اتار کر چلی گئی، میں نے عرض کیا ''حضرت نظام سفر؟'' ارشاد فرمایا کہ ''خیال یہ ہے کہ اسی وقت ساڑھے دس کی گاڑی سے چلا جاؤں''۔ میں نے عرض کیا ''بہتر ہے''۔ مگر ایک منٹ سکوت کے بعد میں نے عرض کیا ''حضرت بارش بڑی زور کی ہو رہی ہے، سردی بھی زوروں پر ہے، بخار بھی شدت سے ہے، معلوم نہیں دیوبند اس گاڑی کی اطلاع بھی ہے یا نہیں''؟ حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''اطلاع تو نہیں ہے، لیکن اگر سواری نہ ملی تو اسٹیشن کی مسجد میں لوگ رہتے ہیں''۔ میں نے عرض کیا جیسے ارشاد ہو مگر اس وقت میں اور صبح چھ بجے میں کوئی زیادہ فرق تو ہے نہیں۔ حضرت قدس سرہ نے نہایت تبسم سے جن کو اب یاد کر کے رونا آتا ہے (از کاتب الحروف: یہ لفظ لکھواتے وقت شیخ کی آنکھوں میں سے پانی نکل پڑا) یہ ارشاد فرمایا ''فرق تو کچھ نہیں ہے میں یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ ان حالات میں کیا ارشاد فرمائیں گے''؟ میں نے عرض کیا ''وہ تو حضرت نے ملاحظہ فرمالیا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ بہتر ہے جیسی آپ کی رائے ہو''۔ اس پر حضرت قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ ''نہیں صبح ہی کو جاؤں گا، صرف تمہیں دیکھنا تھا''۔ بہت سے واقعات ہیں اس نوع کے۔

حضرت مدنی کی لکھنؤ سے واپسی:

(۳)......ایک مرتبہ حضرت لکھنؤ سے آرہے تھے، حضرت کا ہمیشہ معمول یہ رہا کہ اگر وقت میں ایک گھنٹہ کی بھی یا زائد کی گنجائش ہوتی تو خود مکان پر تشریف لاتے ورنہ تار لکھنؤ یا مرادآباد سے

ضرور دیتے اور یہ ناکارہ اگر وقت پر تار پہنچ جاتا تو اسٹیشن پر ضرور جاتا، فسادات کے زمانے میں اسٹیشن پر سکھوں کی کار میں پندرہ روپے پر اسٹیشن گیا ہوں۔ البتہ جب تار ہی بعد میں پہنچتا تھا تو معذوری ہوتی۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہ لکھنؤ سے تشریف لا رہے تھے، گیارہ بجے رات کو تار ملا، میں اسی وقت ریل پر حاضر ہوا، بارہ بجے گاڑی آئی، میں نے مصافحہ کے ساتھ پوچھا، ''حضرت! نظام''؟ یوں فرمایا ''اسی وقت ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے دیوبند جانے کا ارادہ ہے''۔ میں نے عرض کیا ''وہاں کوئی اطلاع ہے''؟ فرمایا ''وہاں کوئی اطلاع نہیں دی ہے کہ تار دیر میں پہنچتا ہے''۔ میں نے پوچھا ''اس وقت دیوبند سٹیشن پر سواری ملے گی''؟ ارشاد فرمایا ''نہیں''۔ میں نے کہا ''تو پھر مدرسہ تشریف لے چلیے''۔ ارشاد فرمایا کہ ''تم اپنے اصولوں کے خلاف کیوں کہتے ہو''؟ میں نے عرض کیا ''حضرت! میرا اصول اکابر اور مہمانوں کے واسطے ہے کوئی مصیبت کے واسطے نہیں''۔ حضرت نے خوب تبسم فرمایا اور مدرسہ تشریف لے آئے۔۔۔۔۔۔ اللہ میرے سارے ہی بزرگوں کو عالی مراتب نصیب فرمائے۔ جتنی جتنی میں نے بے ادبیاں، گستاخیاں اپنے اکابر کی شان میں کیں ہیں اتنی ہی ان کی شفقتیں، محبتیں، کرم فرمائیاں بڑھیں۔

(۴)......اوپر کے واقعات اس سیہ کار کے اپنے اکابر کے ساتھ رہے۔ اس کے بالمقابل میری بری عادتوں میں سے ایک عادت یہ بھی ہے کہ جیسا کہ اس سیہ کار کو ہمیشہ اکابر کے ساتھ ان کی رائے کے خلاف قیام نہ کرنے پر اصرار رہا اسی طرح اپنے قیام پر بھی تجویز سے زائد قیام پر بہت ہی لڑائیاں بے ادبیاں، گستاخیاں ہوئیں، اللہ تعالیٰ سب ہی کو معاف فرمائے۔

اپنی انتہائی بے ادبی کا پہلے ایک قصہ لکھوا کر پھر اصل قصہ لکھواؤں گا جو اس وقت مقصود ہے۔

دیگر اکابر کی طرح چچا جان کی بندہ کے زیادہ سے زیادہ قیام کی خواہش:

(الف)......میرے چچا جان میرے مرشد و استاد حضرت اقدس عمی وصنوابی کی بھی میرے دوسرے اکابر و احباب کی طرح سے ہمیشہ یہ خواہش رہتی کہ اس سیہ کار کا قیام جتنا بڑھ جائے چاہے صرف ایک گاڑی ہی کیوں نہ ہو بڑھ جائے۔ ایک مرتبہ نظام الدین کے سہ روزہ قیام کے بعد چوتھے دن سہارنپور کی واپسی تجویز ہوئی۔ اس زمانے میں جناب الحاج حافظ عبدالحمید صاحب چربی والے قصاب پورہ دہلی کا چچا جان قدس سرہ اور ان سے زیادہ اس سیہ کار پر شفقتوں کا زور تھا۔ دہلی کا کوئی سفر ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں جاتے یا آتے میں ان کے یہاں ہو کر نہ آتا ہوں۔ قرار یہ پایا کہ علی الصباح نظام الدین سے چل کر ناشتہ حافظ صاحب کے یہاں کرنے کے بعد پونے نو کی ریل سے یہ سیہ کار سہارنپور روانہ ہو جائے اور چچا جان قدس سرہ اپنے معمول کے مطابق مجھے اسٹیشن پہنچانے کے واسطے ساتھ تشریف لائے۔

چچا جان کے نماز میں طویل قیام کا قصہ:

ناشتہ سے فراغ پر پونے آٹھ بجے چچا جان نے نماز کی اتنی لمبی نیت باندھی کہ رکوع کرنا بھول گئے۔ تقریباً سوا آٹھ بجے تھے، میں نے جس بے چینی سے ان کے رکوع کا انتظار کیا وہ آج بھی یاد ہے اور سوا آٹھ بجے وہاں سے پاؤں پیدل چل کر راستے میں سے تانگہ لے کر اسٹیشن پہنچ گیا۔ ایک دو آدمی میرے ساتھ اسٹیشن تک آئے اور ایک دو آدمی تانگے پر سوار ہونے کے بعد چچا جان کو اطلاع کرنے کے لیے واپس چلے گئے۔ چچا جان قدس سرہ، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے اور میری بے ادبی اور گستاخی کو معاف فرما کر جو اذیت ان کو میری حماقتوں سے ہوئی ہوا پنی شایانِ شان ان کو بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آج تک جب یہ واقعہ یاد آجاتا ہے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ سے بہت ہی توبہ کرتا ہوں، اللہ ہی مجھے معاف فرمائے اور حضرت چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ کے لیے بہت ہی دعائیں کرتا ہوں، میری نالائقیوں پر ان کی محبت بڑھتی گئی۔

کاندھلہ کا سفر اور اعزہ کا لوئی جانا:

(ب)...... جو اصل واقعہ اس جگہ لکھوانا ہے، وہ بھی ان ہی حماقت کے نمونوں کا نمونہ ہے، غالباً ۳۹ھ کا قصہ ہے۔ ۳۸ھ سے ماہِ مبارک میں رات کے نہ سونے کا معمول شروع ہو گیا تھا، جو پہلے سفرِ حج میں مکہ مکرمہ سے سیکھ کر آیا تھا۔ میرے چچا جان قدس سرہ کا ہمیشہ یہ معمول اخیر تک رہا کہ جب کاندھلہ کا ارادہ ہوتا تھا یا میرا ارادہ ہوتا تھا تو ایک دوسرے کو اطلاع کر دیتے تھے کہ فلاں وقت کاندھلہ جانا ہے، اس لیے کہ دونوں کی خواہش یہ رہتی تھی کہ ساتھ ہی جانا ہو۔ میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہ کو اخیر رمضان میں لکھا کہ میرا عید سے اگلے دن کاندھلہ کا ارادہ ہے اور حضرت قدس سرہ کا بھی عید سے اگلے روز کسی جگہ کا سفر تھا اس لیے اور بھی اطمینان تھا چچا جان نے منظور فرمایا، عید سے اگلے دن بندہ سہارنپور سے اور چچا جان دلی سے کاندھلہ پہنچے، گاڑی کا میل کاندھلہ اسٹیشن پر ہوتا تھا، بیک وقت دونوں بارہ بجے کے قریب اسٹیشن پر اترے۔ قصبے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم عصر عزیز سب کاندھلہ کے قریب لوئی ایک قصبہ ہے غالباً دس میل ہے، بھائی اکرام الحسن، ماسٹر محمود الحسن، مد فیوضہما، عزیزم بھائی ظہیر الحسن مرحوم، حاجی محسن مرحوم، وغیرہ اعزہ سب لوئی گئے ہوئے ہیں'' مستورات نے ہمارے جاتے ہی ایک آدمی بھیج دیا کہ دونوں چچا بھتیجے آئے ہوئے ہیں اس آدمی نے لاپرواہی برتی، اس کو کیا اہمیت تھی، وہ شام کو لوئی پہنچ کر اپنے عزیزوں میں ٹھہر گیا، صبح کو اس نے کنور اصغر علی خان مرحوم جن کی ملاقات کے لیے یہ کاندھلوی پارٹی گئی ہوئی تھی وہاں جا کر یہ پیام پہنچایا، یہ سب احباب واعزہ چائے پی رہے تھے جس کے ہاتھ میں جتنی پیالی تھی

وہیں چھوڑ کر ایک دم اٹھ گئے۔ کنور اصغر علی خاں مرحوم نے بہت اصرار کیا کہ ''میں ابھی گاڑی منگواتا ہوں تم لوگ چائے پی لو''۔ ان عزیزوں نے اللہ ان کی محبت کا بہترین بدلہ عطا فرمائے دیر کے خیال سے ایک نہ سنی اور پیالیاں بیچ میں چھوڑ کر جلدی چل دیئے اور کہہ دیا ''گاڑی جلدی بھیج دو جہاں ملے گی بیٹھ جائیں گے''۔ انہوں نے جلدی جلدی پیچھے پیچھے گاڑی بھیجی اور جس جس کو جہاں گاڑی ملتی رہی بیٹھتا رہا اور یہ سب نو بجے کے قریب کاندھلہ پہنچے اور میں اس ڈر کی وجہ سے کہ یہ لوگ آ کر ٹھہرنے پر اصرار کریں گے نو بجے سے پہلے چچا جان کے ساتھ اسٹیشن پر آ گیا، گاڑی وہی کل کی بارہ بجے والی تھی جس سے آمد ہوئی تھی اور اسٹیشن پر ہی میل ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو جب قصبہ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ دونوں اسٹیشن جا چکے ہیں تو یہ سب ان ہی گاڑیوں میں جن میں لوئی سے آئے تھے، اسٹیشن پہنچ گئے گاڑی میں تین گھنٹے باقی تھے، انہوں نے اولاً چچا جان سے قیام کی درخواست کی، چچا جان نے نہایت تبسم سے یہ فرمایا کہ اس کو راضی کر لو، اگر یہ ٹھہر گیا تو میں بھی بخوشی ٹھہروں گا اور اگر یہ چلا گیا تو مجھ پر تمہارا اصرار تم بھی جانو ظاہر داری ہی کا ہے، سب ہنس پڑے اور مجھ پر دھاوا بول دیا میں نے شدت سے انکار کیا کہ ''میں حضرت سے ایک رات کی اجازت لے کر آیا ہوں، ہرگز نہیں ٹھہروں گا، اسی ڈر کے مارے اسٹیشن آ گیا ہوں''۔ اس کا اس سیہ کار کو ہمیشہ ہی بہت اہتمام رہا کہ حضرت اقدس سے واپسی کا جو وقت عرض کر کے گیا اس میں کبھی تخلف نہیں ہوا، میرے حضرت اقدس سرہٗ کو بھی میری یہ بات بہت پسند تھی، یہ سب معاصر تھے، عزیز واقارب تھے، بے تکلف دوست تھے، سب کی اصلاح یہ ہوئی کہ اس کو ایک چارپائی پر سب مل کر لٹا دو اور رسہ سے باندھ کر نعش کی طرح چارپائی پر لے چلو، سارے گویا بچے تھے، کم وبیش عمروں کا تفاوت تھا، میں نے قسم کھالی کہ ''اگر سہارنپور آج نہ گیا تو عمر بھر کاندھلہ نہ آؤں گا''۔ میرے اس فقرے پر سب سے نازک ترین عزیز مولوی ظہیر الحسن مرحوم بی اے علیگ تو بغیر بولے، بغیر ملے، بغیر مصافحہ کیے، نہ مجھ سے ملا نہ چچا جان سے، لوئی کی ایک گاڑی میں بیٹھ کر قصبہ میں چلا گیا، بھائی ماسٹر محمود الحسن صاحب جو آج کل پاکستان میں ہیں کئی سال سے مکہ مکرمہ مقیم تھے وہ گاڑیوں کے روانہ ہونے تک ساتھ رہے نہ بولے نہ بات کی۔ بھائی اکرام صاحب دام مجدہم جو میرے بہت ہی مخلص محبوب ترین عزیز ساری عمر رہے، بہت کثرت سے ان کا ذکر کہیں کہیں آئے گا بہت خندہ پیشانی سے نہایت محبت اور تعلق سے گاڑیوں کی روانگی تک بولتے بات کرتے رہے۔ حاجی محسن مرحوم نے بار بار کہا کہ ''چونکہ رمضان میں ساری رات جاگنے کا دستور شروع کر دیا ہے، دماغ پر خشکی آ گئی ہے، میاں صاحب تیل کی مالش کیا کرو نہیں تو جنون ہو جائے گا'' وغیرہ وغیرہ۔

کئی واقعات میری زندگی میں اس نوع کے پیش آئے، اس میں حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ کی

نافرمانیاں مجھ سے بہت ہوئی، اللہ ہی معاف فرمائے کہ حضرت نے بخوشی واپسی کی اجازت دی مگر یہ ناکارہ خلافِ طبع مصافحہ کر کے واپس چلا آیا۔ اب اپنے ان جرائم کی تلافی اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ بہت ہی زاری اور الحاح کے ساتھ مالک الملک سے اپنی تقاصیر کی معافی چاہوں اور ان اکابر کے لیے ان کی شفقتوں اور اذیتوں کا جو اس سیہ کار سے پہنچیں، بہترین بدلہ کریم آقا سے مانگوں۔

مہمل جواب مہمان کا یہ کہ جب تک ارشاد ہو قیام کروں گا:

(۴)......میری ان ہی بری عادتوں میں سے جو اوپر گزریں ایک بری عادت یہ تھی کہ میرے اس سوال پر کہ ''کب تک قیام ہے؟'' بہت سے لوگ یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ''جب تک حضرت کا ارشاد ہو؟'' یہ مہمل جواب مجھے ہمیشہ بہت برا لگا ہے، میں ان کے اس جواب پر ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ ''واہ واہ! میرے چھوٹے بھائی یعنی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہر شخص سے تین چلے مانگا کرتے تھے میں تو ان کا بڑا بھائی ہوں اس لیے چار چلے تو آپ قیام کیجیے، اس کے بعد غور کریں گے'' اور جب وہ یوں کہتا ہے کہ اتنا تو میں نہیں ٹھہر سکتا تو پھر میں کہا کرتا ہوں کہ ''پھر جناب نے یوں کیوں فرمایا تھا کہ جب تک تو کہے، میں نے آپ کے جواب سے یہ سمجھا کہ آپ بھی میری طرح سے گھر سے فالتو ہیں مجھے تو آپ کی ضروریات کا حال معلوم نہیں، اب دوبارہ بتائیے کب تک ٹھہر سکتے ہیں؟'' اس پر دو چار دن یا زیادہ سے زیادہ ہفتہ عشرہ نکلا کرتا ہے۔

میرا مقصد اس سوال سے یہ ہوا کرتا ہے کہ آنے والے کی مدتِ قیام معلوم ہونے کے بعد اپنے اوقات کی رعایت کرتے ہوئے اس سے بات کرلوں، اگر ہم روزہ جلدی جانے والا ہے تو اسی وقت بات کرنے کی کوشش کروں اور اگر اس کے وقت میں گنجائش ہے تو اپنے اوقات کی رعایت رکھتے ہوئے اس کے واسطے وقت تجویز کروں کہ اپنے طالب علمانہ مشاغل کی وجہ سے دن میں وقت بچنا مشکل ہوتا ہے۔ میرے تخلیوں اور تفصیلی بات کے لیے وقت مغرب کے بعد سے لے کر سونے کے وقت تک نکل سکتا ہے اس لیے کہ اپنے امراض اور اعذار کی وجہ سے اب رات کو علمی کام نہیں ہوتا۔

ایک بری عادت دوبارہ دعوت مہمان اور اس کے تین قصے:

(۵)......ان ہی بری عادتوں میں سے ایک بری عادت جس میں مجھے اپنے آقا ماویٰ وملجا سیدی وسندی، حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ کی طبع مبارک کے خلاف یہ بری عادت ہمیشہ رہی کہ میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ کے مہمان کی کوئی دعوت کرتا تو حضرت کو ازراہ محبت وشفقت داعی و مدعو دونوں پر غصہ آجاتا، حضرت قدس سرہٗ داعی سے ڈانٹ کر فرماتے: ''تم میرے مہمان کو چھینتے ہو؟'' اور مہمان سے فرماتے ''آپ سے دال روٹی نہیں کھائی جاتی،

مال کھانے کو جی چاہتا ہے؟''

اس کے بالمقابل اس سیہ کار کا ہمیشہ معمول یہ رہا کہ اگر میرے مہمان کی کوئی دعوت کرے اور مجھے اس کا بخوشی پسند کر لینا معلوم ہو جائے تو میں کبھی مانع نہیں ہوتا بلکہ بڑی خوشی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا ہوں بشرطیکہ مہمان اس کو خوشی سے پسند کرے بلکہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرا مہمان داعی کی دعوت کو زیادہ پسند کرتا ہے اور محض میرے لحاظ سے میرے یہاں کھانا چاہتا ہے تو میں از خود داعی کی سفارش کر دیتا ہوں۔

(الف)......مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رئیس الاحرار، جن کا کچھ حال پہلے گزر چکا اور ان کے اس ناکارہ سے تعلقات روز افزوں شروع ہو گئے تھے، ایک مرتبہ سہارنپور آئے۔ سہارنپور کے ایک صاحب نے ان کی دعوت کی، انہوں نے اس خیال سے کہ زکریا کو ناگوار ہوگا، سختی سے انکار کر دیا ان کے داعی میری اس بری عادت سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے اصرار سے کہا کہ آپ منظور کر لیجئے میں اس سے نمٹ لوں گا۔ رئیس الاحرار صاحب نے کہا کہ بہت بے ادبی ہے میں خود اجازت لے کر آتا ہوں۔ ان داعی نے بہت اصرار کیا کہ آپ اس کا بالکل فکر نہ کریں میں اس سے خوب واقف ہوں، مگر رئیس الاحرار نے نہ مان کر دیا، ظہر کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کے دروازے پر قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا یاد نہیں رمضان تھا؟ غالباً رمضان ہی تھا اس لیے کہ رمضان ہی میں ظہر کے بعد تلاوت کا اکثر معمول رہا ہے۔ مولانا نے آتے ہی سلام کیا، میں نے تلاوت بند کر کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا ''کچھ فرمانا ہے؟'' انہوں نے ایک طویل تمہید شروع کی۔ میں نے ایک منٹ میں اندازہ کر کے ان سے کہا کہ ''اگر کسی نے شام کی آپ کی دعوت کی ہے تو بخوشی منظور ہے بشرطیکہ آپ پسند فرمائیں''۔ میرے اس روکھے جواب پر وہ سکتہ میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا میں نے کہہ دیا کہ ''اس کی بالکل فرصت نہیں، عشاء کے بعد بات ہوگی''۔ یاد آیا کہ رمضان ہی تھا اور رمضان میں ہمیشہ میرا چوبیس گھنٹوں میں تراویح کے بعد کی چائے میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ دوستوں اور مہمانوں سے ملاقات کا معمول رہا۔ تراویح کے بعد میں نے ان سے اپنی اس بری عادت کا ذکر کیا اور میں نے کہا کہ آپ کے داعی نے صحیح کہا کہ وہ میری اس عادت سے خوب واقف ہیں میرا دستور یہ ہے کہ میرے مہمان کی جب کوئی دعوت کرتا ہے اور مجھے یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ بخوشی پسند کرتا ہے تو میں کبھی مانع نہیں بنتا، اس لیے کہ جب کوئی شخص دعوت کرے گا وہ کچھ خاطر ضرور کرے گا، میں اپنے مہمان کا نقصان کیوں کروں کہ لنگی باندھ کر حوض میں کود جا۔ البتہ مہمان ہی اگر مال چھوڑ کر دال کھانا چاہے تو مجھے بھی زبردستی نہیں، سر آنکھوں پر۔ چنانچہ متعدد وزراء ہند و بیرونِ ہند کے جب اس ناکارہ کے مہمان ہوئے اور میں نے

ان کے اکرام میں کچھ اہتمام کیا تو انہوں نے شدت سے اس پر نکیر کی اور یہ کہا کہ ”یہ چیزیں تو ہمیں روز ملتی رہتی ہیں ہم تو آپ کے لنگر کا کھانا کھانے آئے تھے وہ ہمیں نہیں ملتا“۔ ایک وزیر صاحب نے یہ کہا ”ہمیں تو آپ اپنے مدرسہ کے مطبخ کا کھانا کھلایئے“۔ ان کے لیے بعض طالب علموں کا میں نے کھانا لے کر اپنے دستر خوان پر بلایا، انؐ کا کھانا وزیر صاحب نے کھایا اور وزیر صاحب کی مرغی بریانی ان طالب علموں نے کھائی اور بھی کئی واقعے اس نوع کے گزرے۔ ایسوں کے لیے میں بھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی ان کی دعوت کرے۔

دعوت کے سلسلے میں میرے دو اکابر حضرتِ اقدس مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرتِ اقدس رائپوری، کا خاص معمول رہا ہے، یہ دونوں حضرات اس سیہ کار کے یہاں کا کھانا چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کا کھانا بلا کسی سخت مجبوری کے ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے لیکن دونوں اکابر کا معمول آپس میں ضد تھا۔

(ب)......میرے حضرتِ اقدس مدنی قدس سرہٗ کی آمد پر جب کوئی دعوت کرتا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ شدت سے فرمادیتے کہ ”کھانا زکریا کے یہاں کھانا ہے“۔ بارہا اس کی نوبت آئی، ایک مرتبہ جمعیۃ علماء ضلع کی کانفرنس حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلائی گئی، خواجہ اطہر صاحب ضلع کے صدر تھے، دو بجے سے عصر تک جمعیۃ کانفرنس ہوتی رہی۔ عصر کے بعد حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ تشریف لانے لگے خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ ”حضرت یہ کیا؟“ فرمایا کہ ”کھانا زکریا کے یہاں کھانا ہے“۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ جمعیۃ آپ کی طرف سے طلب کی گئی ہے۔ حضرت نے فرمایا ”جس کام کے واسطے طلب کی تھی وہ کام ہوگیا، میں نے کھانے کی دعوت نہیں کی تھی، آپ کھلایئے“۔ خواجہ صاحب نے بہت ہی اصرار فرمایا مگر حضرت نے قبول نہ فرمایا۔ مجھے خود بھی اس کا واہمہ نہ تھا کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ جمعیۃ کو چھوڑ کر تشریف لے آئیں گے۔

اسی طرح سے مولانا منظور النبی مرحوم نے ایک دفعہ ایک کانفرنس حضرت کی طرف سے بلائی، مغرب تک کانفرنس رہی اور مغرب کے بعد حضرت اس سیہ کار کے گھر تشریف لے آئے، مولوی صاحب کو بہت ہی ناگوار بھی ہوا، میں نے چپکے سے خوشامد کی کہ ”اکابر کے منشاء پر عمل حقیقی تعلق اور محبت کی علامت ہے، میں نے تو کوئی درخواست نہیں کی، اگر میں درخواست کرتا تو آپ کا غصہ بجا تھا کہ آپ کے مہمان کو کیوں چھینا لیکن یہ تو حضرت کا خود منشا ہے، اس پر آپ کو بھی ہتھیار ڈال دینا چاہیئے“۔ بیسیوں واقعات میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ کے اس قسم کے پیش آئے۔

(ج)......اسی مدکا اور اس کا بالمقابل معمول حضرت اقدس رائپوری قدس سرہٗ کا رہا۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی تشریف آوری پر کوئی دعوت کرتا، بہت خندہ پیشانی سے قبول کرتے، جان و مال میں برکت کی بہت دعائیں دیتے، بہت دل داری فرماتے اور جب دعوت کرنے والا خوشی سے

آسمان پر پہنچ جاتا تو آخر میں چپکے سے فرمادیتے کہ ''ساڑھے گیارہ بجے کچے گھر میں کھانا لے آئیں''۔ وہ بیچارہ یہ تو کیا کہہ سکتا تھا کہ ''مردنی موقوف مقبرہ مسمار''۔ حضرت بہت اچھا، حضرت ضرور۔ بعض دفعہ مجھے بھی داعی سے ندامت ہوتی، مگر میں کیا کرسکتا تھا۔

(د)......حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے حالات میں بھی ایک عجیب واقعہ اس نوع کا آنے والا ہے جو اسی جگہ زیادہ مناسب ہے، اکابر کی عظمت کی وجہ سے یہ دو تین واقعات لکھ دیئے ہیں، ورنہ میری بری عادت کی وجہ سے بعض مہمانوں کو یہ خیال ہوجاتا کہ یہ مہمان کو ٹالنا چاہتا ہے، لیکن جن کی آمدورفت کچھ بڑھ جاتی ہے تو وہ حالت سے واقف ہوجاتا ہے۔

(۶)......میری بری عادتوں میں سے ایک بری عادت یہ رہی کہ میٹھے سے ہمیشہ نفرت اور گوشت سے ہمیشہ عشق رہا، جن کے بہت ہی کثرت سے واقعات پیش آئے۔ نمونہ کے طور پر چند واقعات لکھواؤں گا۔ واقعات تو میری ستر سالہ زندگی میں نہ جانے کیا کیا گزرے اور حکیم الامت حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ نوراللہ مرقدہٗ کا فرمان جو اپنے بارے میں کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ ''میری قدردانی جتنی میرے بڑوں نے کی میرے چھوٹوں نے نہیں کی''۔ مجھ پر واقعی یہ فقرہ حرف بہ حرف صادق آرہا ہے، میرے اکابر، میرے مشائخ بہت ہی میری خواہشات کا اہتمام فرماتے تھے، میری مٹھائی نہ کھانا چونکہ ابتداء میں ضرب المثل تھا، میرے حضرت قدس سرہٗ نوراللہ مرقدہٗ نے کئی دفعہ فرمایا کہ مولوی زکریا اتنے دنوں سے میرے پاس بیٹھتے ہیں ان کو تو میٹھے کا شوق نہیں ہوا مجھے نمکین کا ہوگیا، اپنی اپنی قوت کی بات ہے۔

ابتداء میں تو مجھے مٹھائی سے گویا نفرت تھی اب تو اچھی خاصی کھانے لگا۔ میرے حضرت رائپوری قدس سرہٗ نے بھی ایک دفعہ یہی جملہ دہرایا تھا میرے ان دونوں بزرگوں کو میٹھے کا شوق تھا۔ ایک دفعہ میرے حضرت اقدس قدس سرہٗ کے یہاں کئی دور سے مٹھائی آئی وہ آتے آتے خراب ہوگئی نازک مٹھائی تھی میں اور میرے دو رفیق مظہر و محفوظ، جن کا باب دوم میں ذکر آچکا مخصوص جماعت کہلاتی تھی، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''بچوں کو بلا کر کھلا دو'' ہم اوپر سے بلائے گئے، میں نے ذرا سی چکھ کر چھوڑ دی۔ میرے رفیقِ درس مظہر علی راج پوری مٹھائی کے شوقین ہونے میں ضرب المثل تھے، وہ زردہ بھی مصری یا بورہ مزید ڈال کر کھایا کرتے تھے اور ان کے یہاں کی رساول بھی ہم کاندھلہ والوں میں سے کسی سے نہیں کھائی جاتی تھی، ان کے یہاں رساول (رس کی کھیر) گھر میں نہیں پکتی تھی بلکہ ان کے کڑھاؤں میں پکتی تھی جن میں گڑ بنتا تھا اور جب رس پکتے پکتے آدھا رہ جاتا تھا تب ان میں چاول پڑتے تھے۔ میرا عذر تو حضرت کے یہاں اور جو اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے متفق اللسان ہوکر سب نے قبول کرلیا اور کہا کہ یہ تو مٹھائی

نہیں کھاتا، میرے رفیق مظہر کے سب سر ہو گئے کہ تو تو شوقین ہے کھا۔ ان کو بہت غصہ آیا۔ حضرت کی اہلیہ محترمہ سے عزیز داری تھی بچپن تھا، مجھ سے کہنے لگے "سڑی ہوئی مٹھائی کی عادت نہیں ہے گرم گرم امرتیاں ہوں تو ایک بھی نہ چھوڑوں"۔ میں تو ساکت رہا، مگر سب اس کے سر ہو گئے اور متفق اللسان ہو گئے، اس کو اور محفوظ کو کھانی پڑی۔ اس کے بالمقابل گوشت کے بہت سے واقعات ہیں۔

مولانا منظور نعمانی نے چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات میں کسی جگہ بغیر نام کے لکھا ہے کہ "چچا جان اپنے ایک عزیز کے لیے گوشت کا بہت اہتمام فرمارہے تھے جس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی"۔

یہ انہوں نے صحیح لکھا، چچا جان اور حضرتِ اقدس رائپوری کے یہاں میرے گوشت کا بہت ہی اہتمام ہوتا تھا۔ جب میرے جانے کا دن ہوتا تو دونوں بزرگوں کے یہاں بلکہ حضرت میرٹھی نوراللہ مرقدہٗ کے یہاں بھی میرے لیے کبابوں کا بہت اہتمام ہوتا تھا، بازار اور گھر کے دونوں منگوائے جاتے تھے اور کئی طرح کے گوشت کا سالن بھی بنواتے تھے، لیکن اس سیہ کار کا دستور حضرت میرٹھی اور حضرت تھانوی قدس سرہما کے یہاں بے اطلاع جانے پر ہمیشہ روٹی کھا کر جانے کا تھا۔ حضرت میرٹھی نوراللہ مرقدہٗ کئی مرتبہ ناراض بھی ہوئے کہ اتنا سویرے کیسے کھالیا؟ اور حضرت تھانوی اعلیٰ اللہ مراتبہ نے بھی کئی دفعہ دس بجے کی گاڑی سے پہنچنے پر دریافت فرمایا کہ "کیا آپ صبح ہی کھا لیتے ہیں؟" اور میں ان دونوں اکابر کے یہاں حاضری پر اپنی عادت کے خلاف چائے کے ساتھ ایک دو لقمہ روٹی کا ضرور کھا کر جاتا تھا۔ حضرت تھانوی کے ارشاد پر میں عرض کیا کرتا تھا کہ "حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ! چونکہ رات نہیں کھائی تھی اس لیے صبح ہی کھالی" اور یہ صحیح تھا کیونکہ رات کو نہ کھانے کا معمول بہت برس سے تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کھا کے جانے پر ناراض ہوتے تھے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ نے اس ناکارہ کے متعلق تحریراً وتقریراً ابتدائی زمانہ میں یہ ارشاد فرمادیا تھا کہ تم میرے یہاں کے قواعد سے مستثنیٰ ہو لیکن اس کے باوجود چونکہ ان دونوں اکابر کے یہاں قواعد کی پابندی بہت تھی اور میں دوسرے بے وقت آنے والوں پر ڈانٹ سنتا رہتا تھا، اس لیے میں بھی ان کے قواعد کا احترام کرتے ہوئے کبھی بغیر کھائے نہ جاتا تھا اور اس کے بالمقابل جب حضرت رائپوری یا چچا جان نوراللہ مرقدہٗ کے یہاں جانے کا ارادہ ہوتا تو ایک دن پہلے کھانا کھانا چھوڑ دیتا تھا۔ اس میں میرے حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ تو بہت سے واقعات پیش آئے۔

(الف)......ایک دفعہ چچا جان قدس سرہٗ عصر کے وقت دہلی سے تشریف لائے آتے ہی فرمایا کہ "رائے پور چلنا ہے"۔ میں نے کہا کہ "ضرور، چائے پی لیجئے"۔ چائے میں ذرا تاخیر ہوگئی، رائپور جانے والے اڈے پر پہنچے، موٹریں اس وقت تک نہیں چلیں تھیں، گھوڑے تانگوں میں جانا

ہوتا تھا، تانگے کی تلاش میں دیر ہوگئی، مغرب کی اذان کا وقت قریب ہوگیا۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ مغرب پڑھ کر چلیں گے۔ میں نے تانگے والے کو راضی کرلیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر تانگے میں بیٹھ گئے، عشاء کی اذان کے وقت بہٹ پہنچے، چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ ''شاہ زاہد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے مل کر چلیں گے''۔ میں نے عرض کیا ''اب تو دیر ہوگئی، وقت ہوگیا واپسی میں ملیں گے''۔ چچا جان نے فرمایا کہ ''معلوم نہیں کہ واپسی میں وقت ملے یا نہیں، اب تو رات اپنی ہے ابھی ملتے چلو''۔ میں نے عرض کیا ''میں تو نہیں جاؤں گا آپ ہو آئیں'' چچا جان نے کئی دفعہ ارشاد فرمایا۔ میں زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا کہ آپ ہو آئیں میں یہاں بیٹھا ہوں، جب تشریف لے آئیں گے تو آپ کے ساتھ چلوں گا۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ آخر کیا ضد ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ''وقت ہوگیا، وہ کھانے پر اصرار فرمائیں گے اور بہت اصرار فرمائیں گے اور رئیسوں کے یہاں کا کھانا ہم جیسے غریبوں کا نہیں ہوتا کہ دس منٹ میں ماحضر پیش کریں، وہ اہتمام فرمائیں گے دو گھنٹے اس میں لگ جائیں گے اور پھر وہ فرمائیں گے کہ اب تو دیر ہوگئی آرام فرمائیں، صبح کو میں اپنی گاڑی میں بھیج دوں گا، بہت سا وقت ضائع ہو جائے گا''۔ چچا جان نے فرمایا کہ ''ہم کھانے کو نہیں مانیں گے،'' میں نے عرض کیا کہ وہ بہت زیادہ اصرار کریں گے اور انکار مشکل ہو جائے گا۔ یہ بات چچا جان نے بھی قبول فرمالی اور رائپور چل دیے۔ گرمی کا زمانہ تھا، گیارہ کے بعد رائپور پہنچے، سب سو چکے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ بھی اپنی چھپری میں آرام فرمارہے تھے۔ حضرت کے حجرے کے آگے دالان میں کھونٹی پر ایک لالٹین ہمیشہ جلتی رہتی تھی، وہاں پہنچ کر بہت آہستہ آہستہ بوریئے نکالے، ان کو بچھایا اور وضو کیا۔ ہم آٹھ دس آدمی تھے اور نماز کے لیے آہستہ آہستہ میں نے تکبیر شروع کی اور چچا جان مصلے پر آگے تھے، ایک دم حضرت قدس سرہٗ لیٹے ہوئے بیٹھ گئے، سب حضرت کو دیکھ کر چھپری کی طرف دوڑ پڑے، مصافحے کیے، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''میں دیر سے چلت پھرت تو دیکھ رہا تھا مگر میرا خیال تھا کہ یہ لوگ (یہاں کے مقیمین) میرے لیٹنے کے بعد کچھ امرود وغیرہ کھایا کرتے ہیں شاید یہ کچھ کررہے ہوں''، پھر فرمایا کہ ''حضرت کھانا؟''

میری عادت تو رات کو کھانے کی نہیں تھی مگر مجھے خیال رہا کہ میرے انکار پر دوسرے لوگوں کو انکار کرنا پڑے گا، وہ رات کو بھوکے رہیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ ''ضرور کھائیں گے'' اور یہ کہہ کر میں نے زور سے حاجی ظفر کو آواز دی وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئے تھے، میں نے کہا کہ ''حاجی جی آٹھ آدمی ہیں روٹی کھائیں گے۔'' اللہ تعالیٰ حاجی ظفر کو اور اس کی اہلیہ کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، دین و دنیا کی راحتیں عطا فرمائے، رائپوری دربار کے حاضرین جو وہاں سے ذرا بھی خصوصی تعلق رکھتے ہیں وہاں سے خوب واقف ہیں کہ ان دونوں میاں بیوی نے ہمیشہ

پچاس ساٹھ مہمانوں کا کھانا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں تیار کیا، پھر آٹھ آدمی ان کے یہاں کے تھے، میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میرے لیے کوئی اہتمام اس وقت نہ کرنا، میں تو صبح کو کھاؤں گا، میرے لیے تو صرف دو تین انڈوں کی ٹکیاں اور کیریوں کی خوب مرچیں ڈال کر چٹنی تیار کر دو، چنانچہ ہم نے اتنے نماز پڑھی اتنے کھانا تیار تھا، میں نے چچا جان سے عرض کیا کہ اتنی جلدی وہاں نہ ملتا۔

حضرت اقدس رائپوری قدس سرہٗ کے یہاں اور حضرت کی وجہ سے سارے ہی ہندوستان بلکہ عرب میں بھی مرغا میرے کھانے کا جزو بن گیا تھا۔ یہ حقیقت میں بڑا ہی لطیف قصہ ہے جو انشاء اللہ میرے حج کے بیان میں آئے گا۔ گوشت سے انتہائی رغبت اور بغیر گوشت کے کھانا نہ کھا سکنے کے واقعات تو بہت کثرت سے ہیں، لیکن ایک عجیب واقعہ ۱۳۳۱ھ میں یہ پیش آیا کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے درس کی خصوصیات جو اس رسالہ میں بھی کہیں کہیں آئیں گی اور اکمال الشیم کی تمہید میں بھی تفصیل سے گزر چکی، وہ یہ تھا کہ اونچے درجے کے طلبہ کے ذمے جو سمجھ دار اور ذی استعداد ہوں ان سے چھوٹے درجے کے طلبہ کے اسباق متعلق ہوتے تھے، وہ ابا جان کے سامنے بیٹھ کر پڑھانے ہوتے تھے۔ ۱۳۳۱ھ میں میرے پاس مقامات ہوا کرتی تھی جس میں عزیزان حکیم ایوب، مولوی نصیر الدین، شیخ انوار احمد اور ایک اور لڑکا تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں۔ اس سال میرے بہت زور دار خارش ہوئی اور اتنی سخت ہوئی کہ اس کی پھنسیاں چیچک کی پھنسیوں کی طرح انگوروں کی مانند سارے بدن پر پھیل گئی، ان میں سے راد (پیپ) ہر وقت نکلا کرتی تھی، میرے بستر پر بہت سی راکھ اور نیم کے پتے بچھتے تھے اور وہ راد میں تر ہو جاتے تھے اور روزانہ بدلے جاتے تھے، گوشت، نمک مرچ سب بند تھا، بڑی ہی تدبیریں سب اطباء نے کیں، ایک چیز کاڑھا کہلاتی ہے، اس میں شاہترہ، چرائتہ نیم کے پتے اور نہ معلوم دس بارہ چیزیں، وہ تین دن تک پکا اور اس کی نو بوتلیں۔ ایک گلاس یعنی آدھی بوتل صبح اور آدھی شام میں پینی پڑتی تھی اور اس میں تعفن اس قدر تھا کہ بوتل کا منہ کھلتے ہی ناک سڑ جاتی تھی، ناک بند کر کے جس مصیبت سے پیتا تھا، اب تک یاد ہے، وہ بھی ختم ہو گیا اور میرے تقریباً روزانہ فاقے ہی فاقے رہتے تھے۔ یہ عزیزانِ مذکور مجھ سے مقامات پڑھا کرتے تھے۔ مدرسہ قدیم کی غربی جانب جو ایک چھوٹا سا مکان ہے اور اس میں صرف دو کمرے تھے، ایک شرقی، اس میں میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا سونا ہوتا تھا اور وہ ان کی قیام گاہ تھی اور غربی جانب میں میں اور میری والدہ، میری بہن وغیرہ سب رہتے تھے، اس میں شمال کی جانب ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں لوہے کی سنخس لگی ہوئی تھیں اور میری چارپائی کے اوپر زنانہ طرف ایک لمبا سا پردہ پڑا رہتا تھا اور اس جنگلہ کے پاس باہر کی طرف بیٹھ کر یہ لوگ ''مقامات'' پڑھا کرتے تھے اور بھی ایک دو سبق چھوٹے بچوں کے تھے۔ میری والدہ نور اللہ

مرقدھانے کچھ پیسے بھی اِکنّیاں، دونیّاں میرے پلنگ کے سرہانے ڈال رکھی تھیں کہ صدقہ کے طور پر جنگلے کی طرف جانے والوں کو اپنے ہاتھ سے دیتا رہوں۔ سردی کا موسم تھا، میں نے مقامات کے سبق کے بعد عزیز نصیر الدین سے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، جب سب چلے گئے میں نے ان کو ایک دونی دی، اس زمانے میں ایک پیسے کا ایک کباب اتنا موٹا اور لمبا چوڑا آتا تھا کہ آج کل دو آنے میں جتنا آتا ہے، وہ بھی اس کا آدھا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے کباب لے کر آئے اور اس میں خوب مرچیں، ترشی اور پیاز ڈال لانا اور خوب کاغذ میں بند کر کے لانا اور اگر کسی سے کہا تو اتنے جوتے ماروں گا کہ سر گنجا ہو جائے گا۔ انہوں نے لا کر جنگلے میں مجھے دے دیے اور میں نے پردے کے پیچھے پڑے پڑے ان سب کو کھا لیے، کھانے کو تو کھا لیا اور بہت ہی مزہ آیا، مگر کھانے کے بعد جو مجھ پر گزری وہ بھی خوب یاد ہے، سر تو چکرا گیا اور سارے بدن میں وہ مرچیں لگیں کہ تڑپا دیا، لیکن:

خدا شرے بر انگیز ددراں خیرے نہاں باشد

دو گھنٹے بعد پاخانہ کا اتنے زور کا تقاضا ہوا کہ بڑی مشکل سے بھاگ کر پاخانہ میں گیا، اس وقت پاخانہ میں جانے کے لیے بھی دو آدمیوں کو پکڑ کر لے جانا ہوتا تھا، لنگی بندھی ہوئی تھی، بیٹھنے سے پہلے ہی اسہال شروع ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی وہ پھنسیاں جن میں دو گھنٹے پہلے راد نکل رہی تھی ایسی خشک ہوئیں کہ میں نے پاخانہ ہی میں بیٹھے بیٹھے ٹانگوں کی، پیٹ کی، کمر کی سب پھنسیوں پر سے کھرنڈ اتار اتار کر وہیں پھینک دیے، والدہ کو بہت فکر ہو رہی تھی اور انہوں نے ایک دو دفعہ آواز بھی دی کہ پاخانہ میں اتنی دیر کیوں لگ گئی؟ لیکن جب میں باہر آیا تو میری والدہ اور سب حیرت میں رہ گئے کہ اس کی خارش کیا ہوئی۔ سب نے بہت ہی پوچھا کہ کون سی دوا تو نے کھائی اور کس کے کہنے سے کھائی؟ کسی نے پوچھا کہ کیا کوئی عمل پڑھا غرض بہت ہی تحقیقات سب نے کیں۔ مگر میں نے بھی والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زندگی تک تو کسی سے کہہ کر نہ دیا۔

لیکن براہِ کرم کوئی دوسرے صاحب اس مجرب نسخہ پر عمل نہ کریں، میری ہی زندگی تھی جو میں اس دن بچ گیا۔ ہر شخص کی عادات، حالات اور مزاج الگ ہوتا ہے اور اللہ جل شانہ کا معاملہ بھی ہر شخص کے ساتھ الگ ہے۔ اس سلسلے میں جملہ معترضہ کے طور پر ایک قصہ اور نقل کراتا ہوں۔

اس سیہ کار کو ٹھنڈے پانی کا مرض جو بچپن سے شروع ہوا تھا اور بڑھاپے تک بھی نہ گیا، تقریباً پچیس سال کا واقعہ ہے، میرا ایک مخلص دوست مولوی عبدالمجید مرحوم اللہ تعالیٰ اس کو بلند درجات عطا فرمائے، میری بڑی ہی خدمت کی، دسمبر کے مہینے میں میرے واسطے برف خریدنے گیا، برف والے نے ان کی مولویانہ صورت دیکھ کر ان کو خوب گھورا۔ مرحوم نے کہا کہ ''حضرت شیخ کے واسطے چاہیے۔'' برف والے نے بہت غصے سے کہا کہ کوئی شیخ ہو یا قاضی ہو

آج کل بجز شرابی کے کوئی برف نہیں پی سکتا۔''

میرے حضرت اقدس رائپوری قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کا دستور تھا کہ جب گنوں کی موسم میں رائپور حاضر ہوتا تو رات کو اپنے حجرہ شریفہ کی چھت پر دسمبر اور جنوری کے مہینے میں میرے لیے رس منگا کر عشاء کے بعد رکھوا لیتے تھے اور آخر شب میں تہجد کے بعد صبح کی نماز سے پہلے اتروا کر اس سیہ کار کو پلاتے تھے اور وہ برف جمنے کے قریب ہو جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم تھا کہ اور کوئی اس میں حضرت شیخ کا اتباع ہرگز نہ کرے۔ کئی مرتبہ اس کی خاص طور سے ممانعت فرمائی۔ ایک بزرگ حضرت کے یہاں رہتے تھے۔ شاہ جی سکندر علی پنجاب کے، انہوں نے اس ناکارہ کا بچا ہوا رس تھوڑا سا پی لیا، صبح کو حضرت سے عرض کیا کہ حضرت بہت ہی مزیدار تھا اور بہت ہی لذیذ تھا اور پنجابی زبان میں بھی دو ایک فقرے اس کی تعریف میں کہے۔ حضرت بہت ناراض ہوئے۔ اللہ تعالیٰ شاہ جی کی مغفرت فرمائے، اسی دن ان کو بخار ہو گیا اور وہی بخار مرحوم کے وصال کا سبب بن گیا۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

ایک دفعہ میرے کاربنکل نکل آیا۔ ذی الحجہ کا مہینہ تھا، حضرت اقدس رائپوری قدس سرہٗ یہاں تشریف فرما تھے، حضرت کو میری صحت اور بیماری کا بہت ہی اہتمام اور فکر رہا کرتا تھا، ذرا سی معمولی بیماری بھی معلوم ہو جاتی تو اتنا اہتمام فرماتے کہ حد نہیں اور یہ مرض تو سنا ہے کہ بڑا خطرناک ہوتا ہے حضرت کو بڑا فکر ہو گیا، ادھر اُدھر شہر میں کہرام مچ گیا، ڈاکٹر صاحب اسی وقت بلائے گئے، انہوں نے بھی دیکھ کر پریشانی کا اظہار کیا اور بیک وقت میری کمر میں بارہ انجکشن بہت گہرے لگائے جس نے اس سارے حصے کو جس میں کاربنکل کا اثر تھا اپنے اندر لے لیا، اس پر وہ ڈاکٹر صاحب تعجب بھی کرتے تھے کہ اتنے گہرے انجکشن لگے مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ اس ناکارہ کو ہمیشہ سے بہت بچپن سے ۹ ذی الحجہ کے روزہ کی عادت رہی اور اس میں افطار کے بعد ایک پیالی چائے کے علاوہ رات کو کچھ نہیں کھاتا تھا، اس لیے کہ اللہ کے یہاں کل کو دعوت ہے۔ میرے سب گھر میں روٹی نہ پکتی تھی، نہ آتی تھی، اب تو آٹھ دس برس سے مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے یہ معمول چھوٹ گیا اور مہمانوں کی وجہ سے بہت اہتمام سے روٹی پکتی بھی ہے، مگر اس سے پہلے سالہا سال تک یہ دستور رہا کہ تین دن تک میرے گھر میں روٹی نہیں پکتی تھی اور میرا ایک تفریحی فقرہ بھی بہت مشہور تھا کہ اگر قربانی کے گوشت کے ساتھ روٹی بھی دعوت کا جزء ہوتی تو صدقۂ فطر بھی ایام اضحیٰ میں ہوتا۔ اس زمانے میں اگر کسی مہمان کے واسطے روٹی کی ضرورت پیش آتی تو بازار سے منگوانی پڑتی میرے کاربنکل کے انجکشن ۸ ذی الحجہ کو لگے، سب تیمارداروں نے مع حضرت قدس سرہٗ کے ڈاکٹر صاحب پر زور دیا کہ یہ پرہیز بالکل نہیں کرتے، ڈاکٹر صاحب نے جو میرے بہت ہی کرم فرما تھے اور بعد میں تو اور بھی زیادہ ہو گئے، پرہیز کی بہت ہی تاکید کی۔ ان بیچاروں کو میرے معمول

یا دستور کچھ معلوم نہ تھا انہوں نے بڑے اہتمام سے فرمایا کہ دیکھئے چار پانچ دن تک آپ گوشت کے سوا کوئی چیز نہ کھائیں۔ ایک دم مجلس میں قہقہہ شروع ہوگیا۔ میرے حضرت رائپوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرمانے لگے ''جس کو اللہ کھلاوے اس کو کون روکے۔'' اب یہ سب چیزیں چھوٹ گئیں، میٹھا نمکین سب برابر ہوگیا، گوشت کی بھی کوئی اہمیت نہ رہی لیکن ترجیح تو ہے ہی۔

آج کل ہمارے علی گڑھ کے ڈاکٹر صاحب نے بھی میرے لیے یہ فرمایا ہے کہ تیرا بلڈ پریشر گرا ہوا ہے جس کے بڑھنے کی ضرورت ہے اس کے لیے کٹڑہ کا گوشت تیرے لیے زیادہ مفید ہے، دوسرے درجے کے مرغے کا اور بھی میرے گوشت کے قصے بڑے عجیب ہیں۔

سفر سے نفرت:

(۷)...... میری بری عادتوں میں جو ہمیشہ سے ہے۔ ''سفر سے وحشت ہے۔'' یہ ابتداہی سے میری عادت اور طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔ اس کی ابتداء جیسا کہ میں اپنے متعدد رسالوں میں اور غالباً الاعتدال میں لکھ چکا ہوں، اپنے والد صاحب کے ابتدائی زمانہ میں کہیں نہ جانے پر جبر و پابندی تھی اور وہ میرے لیے ایسی عادت بن گئی کہ اب نہیں بلکہ ساری عمر سے سفر میرے لیے ایک مصیبت بنا رہا۔ جہاں کہیں سفر ہوتا تو سفر سے تین دن پہلے سے اس کی وحشت اور بلا مبالغہ اس کی فکر سے بخار اور واپسی کے بعد کئی دن تک اس کا تکان اور خمیازہ، بخار، سر میں درد۔ یہ چیزیں ہمیشہ سے بڑھتی ہی رہیں اور اپنے دو اکابر مرشدی حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ اور ان سے بھی بڑھ کر حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ۔ ان دونوں کو دیکھتا تھا تو بڑا رشک کرتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کو دیکھنے والے ابھی تک کثرت سے موجود ہیں کہ ان کے یہاں جمعرات کی شام دیوبند سے دہلی جانا اور عشاء کے بعد دہلی کے ایک اجتماع میں صدارت کرنا اور پھر ایک جلسہ شوریٰ میں شرکت کرنا اور اس کے بعد راتوں رات نانوتہ آنا، صبح کی نماز کے بعد وہاں جلسہ میں تقریر کرنا اور اس کے بعد سنسار پور گیارہ بجے کے قریب ایک جلسہ میں تقریر کرنا اور جمعہ کی نماز کے بعد بہٹ میں تقریر کرنا اور اس کے بعد ساڑھے چار بجے کے ایکسپریس سے دیوبند جانا اور عشاء کے بعد سبق پڑھانا۔ یہ ایک مرتبہ کا واقعہ نہیں ہے، اس قسم کے بیسیوں واقعات ہمیشہ کا معمول تھا۔

میرے حضرت مرشدی قدس سرہٗ بذل نہایت اطمینان سے لکھواتے رہتے۔ حضرت منتظم خاص حاجی مقبول احمد صاحب بستر وغیرہ سب مکمل کر کے اس میں کپڑے وغیرہ رکھ کر باندھ کر گاڑی کے وقت تانگہ منگا لیتے اور جب تانگہ آجاتا تب اوپر اطلاع کرتے کہ ''تانگا آگیا''۔ اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نہایت اطمینان سے جو عبارت لکھوا رہے ہوتے اس کو پوری کراتے اور وہاں سے اُٹھتے، کھڑے کھڑے مکان پر تشریف لے جاتے اور وہاں سے آکر تانگہ میں بیٹھ کر جاتے اور میں سوچتا

رہتا کہ گاڑی کا وقت قریب آ گیا، حضرت کو فکر نہیں اور مجھے دو دن پہلے سے ''السفر قطعة من العذاب'' کا اتنا سہم ہوتا کہ کوئی کام اطمینان سے نہیں ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احباب کے اصرار اسفار پر ہوتے رہتے ہیں اور واقعی میرا دل بھی دوستوں کی خواہش کو پورا کرنے کو چاہتا ہے مگر ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' سفر کی ہمت بالکل نہیں ہوتی، اس قدر طبیعت واقعی بیمار ہو جاتی ہے کہ دوستوں کو اس کا یقین آنا بھی مشکل ہے۔

جب میرے اعزہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے، غالباً پچاس برس پہلے، علی گڑھ کا ارادہ اور وعدہ ایک پارٹی سے ہوا، جب فارغ ہو کر آئی تو دوسری پارٹی سے ہوا، جب وہ بھی فارغ ہو کر آئی، تو تیسری پارٹی سے ہوا اور واقعی ارادہ اور وعدہ پختہ ہوا۔ مگر مقدر، سب اعزہ انگریزی پڑھ کر اور ڈگریاں حاصل کر کے آ گئے۔ ہم ارادے ہی میں رہے۔ مگر اس کا ردعمل اب آنکھوں کے علاج نے کرا دیا کہ دو (۲) ماہ تو علی گڑھ میں ایک ایک ماہ کا قیام ہو چکا، آئندہ کی خبر نہیں اور یہاں کے دوران قیام ہی میں یہ ''آپ بیتی'' لکھوا رہا ہوں۔

تقریباً پچاس سال ہوئے، بعض دوستوں کے شدید اصرار پر مظفر نگر کا وعدہ کیا اور واقعی پختہ ارادہ تھا اور پختہ وعدہ تھا۔ لیکن اپنے سفر کی وحشت کی وجہ سے ٹلتا ہی رہا۔ اب تو وہ حضرات بھی ختم ہو گئے، جن سے وعدہ تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، آمین!

حضرت مدنی کے گھٹنوں کا علاج بجلی کے ذریعے:

حضرت قدس سرہٗ ایک مرتبہ ۱۵ ربیع الاول ۷۰ھ میں مظفر نگر گھٹنوں کا علاج بجلی سے کرانے کے لیے ایک عشرہ کے واسطے تشریف لے گئے، جن احباب سے وعدہ تھا اور وہ حیات تھے، انہوں نے اس ناکارہ کو بہت ہی زور سے لکھا کہ تمہارا اتنے دنوں سے وعدہ ہے اور اس وقت حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ یہاں مقیم ہیں بہت اچھا موقع ہے، عیادت بھی ہو جائے گی ہمارا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا اور انہوں نے حسن ظن پر کہ حضرت قدس سرہٗ بھی پسند فرمائیں گے، حضرت سے ذکر کر دیا۔ حضرت کا گرامی نامہ اسی ڈاک سے فوراً آیا کہ میری طبیعت بحمد اللہ بہت اچھی ہے، تم مظفر نگر کا ہرگز ارادہ نہ کرنا میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد دو تین دن میں پہلے سہارنپور آؤں گا پھر دیوبند جاؤں گا۔ چنانچہ حضرت قدس سرہٗ مظفر نگر سے مع سامان و حشم و خدم ریل میں سوار ہو کر، ان سب کو تو دیوبند اُتار دیا اور تنہا سہارنپور تشریف لا کر اگلی گاڑی سے واپس ہوئے۔

اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے نواسے چچا یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ کو اس ناکارہ سے محبت عشق کے درجے میں تھی اور ان کی زندگی میں شاید ہی کوئی دو تین مہینے اس ناکارہ کو گنگوہ کی حاضری سے خالی گیا ہو، وہ اپنی والدہ حضرت صاحبزادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا کی طرف سے ہمیشہ

گنگوہ کے جانے پر اصرار کیا کرتے تھے، باوجودیکہ ان کی حیات میں بہت کثرت سے حاضری ہوتی تھی، مگر ان کی محبت اس کو کافی نہ سمجھتی تھی اور میرا یہ عذر کہ حضرت قدس سرہٗ کا حرج ہوتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے حضرت قدس سرہٗ سے گنگوہ چلنے کی درخواست کی اور آبھے والوں کا بھی بہت اصرار ہو رہا تھا، حضرت نے دونوں جگہ کا قبول فرمالیا۔ قرار یہ پایا کہ اسی وقت ریل سے نانوتہ اور ظہر کے بعد نانوتہ سے آبھہ اور شب کو آبھے قیام کے بعد علی الصباح گنگوہ اور دوسرے شام کو گنگوہ سے واپسی۔ حضرت قدس سرہٗ نے منظور کرلیا کہ دو دن میں تین جگہ نمٹ جائیں گی۔ میں حضرت کی خدمت میں ڈاک لکھ رہا تھا، چچا یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تو آپ کے حرج کا عذر نہیں۔ حضرت خود تشریف لے جارہے ہیں، میں چپ۔ واقعی کوئی عذر نہ تھا اور یہ ناکارہ بھی ہم رکاب ہوگیا۔ چچا یعقوب کی ایک بہترین عادت یہ تھی کہ جب ریل کا سفر ہوتا، ہر اسٹیشن پر اُترتے، کسی واقف سے ملاقات ہو جائے، کسی نے جانے والے کے ہاتھ کہیں پیام بھیج دیں، مجھے یہ عادت معلوم تھی، میں رامپور کے قریب حضرت کے قریب ہوگیا۔ جب رامپور کے اسٹیشن پر اُترے، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ تعمیل میں تو حاضر ہوگیا مگر میرے پاس تو بذل کی بہت سی کاپیاں مقابلہ کے لیے رکھی ہیں۔ یہ خیال تھا کہ حضرت کا کوئی سفر ہوگا تو مقابلہ کرلوں گا، حضرت نے نہایت تیزی سے فرمایا کہ وہاں کیوں نہیں کہا؟ میں نے کہا کہ حضرت نے حکم نافذ فرمادیا، اس وجہ سے ہمت نہیں پڑی اور فرمایا کہ نانوتہ سے فوراً واپس ہو جاؤ۔ نانوتہ پہنچنے کے بعد جب آبھے جانے کے لیے سواریوں کی تنظیم شروع ہوئی اور حضرت قدس سرہٗ کی گاڑی میں اس سیہ کار کا نام بھی تجویز ہوا تو حضرت قدس سرہٗ نے فوراً فرمایا کہ نہیں یہ آگے نہیں جائے گا۔ اس کو واپس ہونا ضروری ہے۔ اس وقت کا چچا یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا غصہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔ فرمانے لگے کہ میں قصداً اس وقت سے تیرے ساتھ ہوں کہ کہیں چپکے سے تو اڑنگا نہ لگادے، میں نے تو تجھے حضرت سے بات کرنے کا موقع نہیں دیا، تو نے کس وقت بات کی بس اتنا بتلا دے؟ میں تو چپ اور حضرت نہایت زور سے فرمارہے ہیں، نہیں نہیں اس کا جانا ضروری ہے اور وہ مرحوم بار بار پوچھتے رہے مجھے بتادے بات تو نے کہاں کی؟ جب میں یہاں پہنچا تو حضرت قدس سرہٗ کے ایک عزیز جو ہمیشہ اس کوشش میں رہا کرتے تھے کہ ان کا ایک عزیز اس سیہ کار کی جگہ بذل میں لگ جائے، میری نانوتہ سے واپسی پر نہایت غصہ سے فرمانے لگے کی یہ باتیں ہوں دل میں گھر کرنے کی، اس کا دل بالکل سفر کو نہیں چاہتا تھا، میں اس کے چہرے کو خوب دیکھ رہا تھا، حضرت کے حکم کی تعمیل میں چلا گیا تھا، راستہ میں ایسی پٹی پڑھائی ہوگی جس سے حضرت بھی خوش ہوگئے ہوں گے کہ میرے کام کی وجہ سے جارہا ہے۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کیا پڑھایا تھا؟ میں نے کہا

کا پیاں مقابلہ کی رہ گئی تھیں، فرمانے لگے ضرور رہ گئی تھیں، سفر کو دل نہ چاہ رہا تھا، میں بھی تو صبح کو دیکھ رہا تھا کہ کس مجبوری کو تو نے ہاں کی تھی

بہت سے واقعات ہیں جو یاد آتے چلے جارہے ہیں۔ بعض مرتبہ تو مجھے شیخ الہند قدس سرہٗ کا بھی اتباع کرنا پڑا۔ میں نے سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ پر جب کسی ایسی جگہ جانے پر اصرار ہوتا جہاں جانے میں کوئی دینی امر مانع ہوتا، اول تو انکار فرماتے، لیکن جب زیادہ اصرار ہوتا اور طبیعت کے خلاف کوئی مجبور کرتا تو اسہال کی گولی نوش فرمالیتے۔ مجھے تو ایک آدھ دفعہ اس کا سابقہ پڑا، ورنہ میرے لیے تو سفر کا تصور ہی بیماری کے لیے ہمیشہ کافی سے زیادہ رہا۔

بری عادت سفارشوں سے نفرت:

(۸)...... میری بری عادتوں میں سے ایک نہایت شدید اور بد ترین عادت یہ ہے کہ ''مجھے سفارش سے ہمیشہ وحشت رہی۔'' میں نے سنا کہ میرے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ جب نواب چھتاری کے یہاں جاتے تو اپنے ساتھ اتنی درخواست لَاتُعَدُّ وَلَا تحصیٰ لے جاتے کہ حد نہیں۔ اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کو تو ہمیشہ خود بھی دیکھا کہ حضرت قدس سرہٗ سے جو شخص جہاں بھی سفارش چاہتا ہے مہتمم مدرسہ ہو چاہے وزیر اعلیٰ صوبہ ہو یا وزیر اعلیٰ مرکز فوراً اس کے نام کی سفارش کر دیتے۔ میں تو بعض دفعہ عرض کر دیتا تھا کہ آپ سے اگر کوئی یہ سفارش کرائے کہ پنتھ صاحب وزیرِ اعلیٰ استعفاء دے کر مجھے اپنی جگہ وزیر اعلیٰ کر دیں تو آپ اس کی بھی سفارش فرما دیں، حضرت ہنس دیتے۔

مجھے سفارش ہمیشہ اسی واسطے گرانی رہی کہ اب سفارش، سفارش کے درجہ میں نہیں رہی، جس کے متعلق ''اشفعوا توجروا ولیقض اللہ علی لسان رسولہ ماشاء'' ارشاد فرمایا گیا ہے، اسی بناء پر مجھے سفارش سے ہمیشہ گھبراہٹ رہی کہ وہ اب سفارش کے درجہ میں نہیں بلکہ وہ اب باراور حکم کے درجہ میں ہو گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ہدیہ کے قبول کرنے کی ترغیب میں وارد ہوئے ہیں، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد بخاری شریف میں وارد ہے کہ ہدیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو ہدیہ تھا اب تو رشوت ہے اور سچ فرمایا۔

ایک دفعہ میرے عزیز مولوی ظہیر الحسن مرحوم نے یہ کہا کہ اگر کوئی شخص میری سفارش قبول نہ کرے تو میری ہمیشہ کے لیے اس سے لڑائی ہو جاتی ہے اس سے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں، جانا آنا بھی بند کر دیتا ہوں۔ میں نے مرحوم سے کہا کہ جو میری سفارش رد کر دے مجھے اس سے زیادہ

خوشی ہوتی ہے بہ نسبت اس سے کہ جو اس کو قبول کر لے۔ اس لیے کہ سفارش قبول کرنے والے کے متعلق مجھے یہ فکر ہو جاتی ہے کہ کہیں اس پر بوجھ نہ پڑا ہو۔

اسی بناء پر تقسیم سے پہلے مسلمان حاکم جو بکثرت آتے تھے اور جو مسلمان حاکم آتا تھا وہ کہیں سے آنے سے پہلے اس سیہ کار کا نام سن لیتا تھا اور آنے کے بعد بہت جلد ملاقات کے لیے آیا کرتا تھا اور میرا ہمیشہ دستور یہ رہا کہ جب کوئی مسلمان حاکم آتا تو ابتدائی ملاقات میں اس کا بہت اعزاز کر کے اس کو بہت اکرام سے درخواست کرتا کہ آئندہ کرم نہ فرمائیں اور جب وہ بہت تعجب سے پوچھتے کہ کیوں؟ ہماری تو خواہش یہ ہے کہ بہت کثرت سے حاضر ہوں تو میں ان سے کہتا کہ آپ تو حاکم ہیں آپ تک تو لوگوں کی رسائی مشکل اور جاتے ہوئے ڈریں گے اور اس غریب پر ہر شخص مسلّط رہے گا کہ جج صاحب، ڈپٹی صاحب، منصف صاحب تیرے یہاں آتے ہیں ہماری سفارش لکھ دے۔ یہ ناکارہ مصیبت میں پھنس جائے گا۔

ایک آدھ صاحب نے تو میری درخواست قبول کی اور دو ڈپٹیوں کے متعلق جن کے نام کے اندر تردّد ہے اور ان سے بے تکلفی بہت ہو گئی تھی انہوں نے کہا، آنا کبھی نہ چھوڑیں گے آپ جتنا منع کریں، اس کا اطمینان دلاتے ہیں کہ ناحق میں آپ کی سفارش قبول نہ کریں گے میں نے ان سے بہت ہی کہا کہ قبول کرنا تو آپ کا کام ہے اور بعد کا کام ہے میں تو مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ یا واقعہ یا قصہ پیش آیا۔ میرے ایک عزیز الحاج مولوی محمود الحسن کاندھلوی اسلامیہ اسکول کے ہمیشہ مدرس دوم رہے، مگر کبھی کبھی وہ پرنسپل کے نہ ہونے کی وجہ سے پرنسپل بھی بنتے رہتے تھے۔ چونکہ کثرت سے میرے یہاں آمدورفت تھی، اسکولوں کے سبھی طلبہ کو میری عزیزداری کا حال معلوم تھا، صبح سے لے کر شام تک سینکڑوں نہیں، ہزاروں کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا، لوگ مجھ پر مسلط ہو گئے کہ ماسٹر صاحب تمہارے عزیز ہیں، کل کو لڑکے کا امتحان ہے آپ سفارش کر دیں۔ اول اول تو میں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ امتحان میں سفارش ہرگز نہ چاہیے۔ میں تو خود ایک مدرسہ کا ذمہ دار ہوں اور امتحان میں سفارش کا سخت مخالف ہوں۔ مگر میں جتنا وجوہ و دلائل بیان کرتا اتنے ہی زیادہ مجھ پر خوشامد و اصرار اور مدرسہ اور شہر کے اکابر صبح سے شام تک میں عاجز آ گیا، کوئی کام نہ کر سکا۔ دوپہر تک تو میں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ سمجھانا بالکل بے کار ہے تو میں نے ظہر کے بعد سے کہنا شروع کیا اچھا کل صبح کو آپ آئیے میں ضرور سفارش کروں گا اور مغرب کے بعد میں نے اپنے عزیز بھائی محمود الحسن کو آدمی بھیج کر بلایا اور میں نے اپنی مصیبت اور پریشانی کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ انکار پر تو مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی، اس کی وجہ سے تم کو بلایا کہ میں کل صبح سے جو آئے اس

کی سفارش بغیر پڑھے لکھنی شروع کر دوں گا، میرے اور تمہارے دونوں کے امن اور خلاصی کی صورت ایک ہی ہے کہ جو میری سفارش لے کر جائے میرا نام دیکھ کر بغیر پڑھے پھاڑ کر اس کے منہ پر پھینک دینا کہ ان کا کام تو یہی ہے کہ بیٹھے بیٹھے سفارشیں لکھتے رہتے ہیں۔ اول تو بھائی محمود نے میری تجویز پر عمل کرنے سے شدت سے انکار کر دیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور میں کیسے کر سکتا ہوں، مگر جب میں نے ان کو سمجھایا کہ میری اور تمہاری دونوں کی خلاصی اسی میں ہے۔ اگر میری سفارش کے بعد اتفاقیہ کوئی شخص خود بھی پاس ہو گیا تو لوگ تمہیں متہم اور ملزم قرار دیں گے کہ سفارش پر پاس کر دیا۔ بڑی دیر میں ان کی بھی بات سمجھ میں آئی اور اگلے دن علی الصباح میں نے سفارشات زوردار لکھنا شروع کیں اور بھائی محمود نے اللہ ان کو جزائے خیر دے، میری تجویز پر عمل کرنا شروع کیا۔ دس بارہ ہی لکھی ہوں گی کہ اسکول میں اس کی شہرت ہو گئی کہ ماسٹر صاحب اور ان کے خانگی تعلقات خراب ہیں اور اس کی جستجو شروع ہوئی کہ میری ان کی لڑائی ذاتی ہے یا خاندانی ہے اور اس کا منشأ کیا ہے؟ مجھ سے اور ان سے تو کسی نے براہ راست نہ پوچھا مگر میں سنتا رہا کہ اس کی جستجو رہی ہے۔ لیکن دس بارہ کے بعد ان کو بھی امن ہو گیا اور مجھے بھی ہو گیا اور یہ بدنامی کہ ان کے آپس کے تعلقات خراب ہیں، میرے اور ان کے لیے بہت آسان تھی اس مصیبت کے مقابلہ میں جو سفارشات پر آتی۔

اپنے اکابر میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا اُسوہ اس ناکارہ کے لیے اتباع کو کافی ہے کہ حضرت قدس سرہٗ بھی اس سے بہت پہلوتہی فرماتے تھے۔ اب بھی اس ناکارہ کو ایسے لوگوں سے سفارش سے بہت بار ہوتا ہے جو سفارش کو حکم کا درجہ دیں۔ خود اس سیہ کار نے اکابر کی سفارشوں کو بسا اوقات اپنی نااہلیت سے قبول نہیں کیا۔

دارالعلوم کی ایک اسٹرائک میں میرے ایک عزیز بہت قریبی، شریک تھے میں نے مظاہر علوم میں شدت سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ دارالعلوم کا کوئی اسٹرائکی مظاہر علوم میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ میرے اس عزیز کے والد مرحوم جو میرے بھی بزرگ اور میرے بڑوں کے بھی بزرگ اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے بھی اخص الخواص، وہ مرحوم اپنے بچے کو لے کر آئے۔ ہمارے ناظم صاحب نور اللہ مرقدہ اعلی اللہ مرقدہٗ ایسے موقعوں پر بلکہ بسا اوقات اس کی نوبت آتی تھی یہ کہہ کر الگ ہو جاتے تھے کہ زکریا سے بات کر لیجئے۔ میرے مرحوم بزرگ یہ سن کر کہ زکریا سے بات کر لیجئے بہت خوش ہوئے کہ اب تو گھر کی بات ہو گئی۔ مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ اسے مظاہر میں داخلہ کے واسطے لایا ہوں ناظم صاحب نے تیرے حوالے کر دیا، میں نے عرض کر دیا کہ مدرسہ نے یہ طے کر دیا ہے کہ دارالعلوم کا کوئی اسٹرائکی مظاہر میں داخل نہ ہو گا۔ اول تو مرحوم نے مجھے شفقت سے فرمایا پھر ذرا ڈانٹ کر فرمایا۔ میں نے کہا یہ میری ذات کا قصہ نہیں ہے مدرسہ کا قصہ ہے اور

مدرسہ کی مصالح ہمیشہ ذاتی تعلقات پر مقدم ہونے چاہئیں۔ مرحوم نے فرمایا کہ اگر میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سفارش لکھوا کر لاؤں تو کیا کرے گا؟ اگرچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارش کا مسئلہ بہت مشکل تھا مگر مرحوم کے تعلقات پر مجھے یہ اندیشہ ضرور ہوا کہ اگر مرحوم نے درخواست کی تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ قانونی اور آئینی الفاظ میں ضرور کچھ تحریر فرمادیں گے۔ میں نے مرحوم سے عرض کیا کہ اگر حضرت قدس سرہٗ نے سفارش فرمائی تب تو میں حضرت سے عرض کردوں گا کہ حضرت مدرسہ کا قصہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے قبول کرنے سے معذرت کردی تھی اور اگر حضرت نے بحیثیت سرپرست حکم دیا اور یہ تحریر فرمایا کہ میں بحیثیت سرپرست حکم دیتا ہوں تو پھر مجھے کوئی عذر نہ رہے گا اور نہ صرف عزیز موصوف کو بلکہ جتنوں کے لیے حضرت فرمائیں گے داخل کرلیا جائے گا۔ یہ خود میں بھی سمجھتا تھا اور وہ بھی سمجھتے تھے کہ حضرت ایسا کیسے تحریر فرماسکتے ہیں؟

مدرسہ کے مصالح ذاتی مصالح پر مقدم ہیں

اور میرے حضرت مدنی کے یہاں سفارش کا تو صلائے عام تھا، روزمرہ کا یہی قصہ رہتا تھا، جہاں تک مدرسہ کے حدود میں گنجائش ہوتی تعمیل ارشاد میرے لیے فخر تھا، لیکن جہاں میرے خیال میں مدرسہ کے قوانین کے خلاف ہوتا وہاں کسی موقع پر معذرت کردیتا۔

ایک صاحب ایک مرتبہ بڑی زوردار سفارش حضرت مدنی کی لائے خط میرے نام تھا، میں نے خط کو پڑھ کر بے ادبی کے ساتھ ایسے رکھ دیا کہ جیسے کوئی چیز تھی ہی نہیں، وہ صاحب کہنے لگے آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں، میں نے کہا کہ یہ خط حضرت کا میرے نام ہے، اس میں یہ نہیں لکھا کہ آپ مجھ سے جواب طلب کریں، میں حضرت کے خط کا اپنے آپ جواب لکھ دوں گا آپ کو جواب لینے کے لیے نہیں لکھا۔ کہنے لگے کہ آپ اس پر لکھ دیجئے کہ میں قبول نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ آپ کو تو جواب دینے کو اس میں لکھا نہیں۔ کہنے لگے پھر میری سفارش واپس کردیجئے، میں نے کہا یہ حضرت کا والا نامہ میرے نام ہے، آپ قاصد ہیں، آپ نے خط پہنچادیا، آپ دوبارہ حضرت سے لکھوا کر لائیے کہ میں نے جو خط بھیجا تھا وہ ان ہی کے ہاتھ واپس کردیا جائے، بہت دیر تک انہوں نے مجھے دق کیا، میں نے کہا آپ کا اس خط سے کوئی واسطہ ہی نہیں، آپ کے ہاتھ حضرت نے ایک خط بھیجا ہے جیسا ڈاکیہ کے ہاتھ بھیجتے ہیں، کہنے لگے میرے متعلق ہے، میں نے کہا آپ کو کیا حق تھا اس خط کے پڑھنے کا جو میرے نام تھا؟ کہنے لگے میں نے ہی لکھوایا تھا، میں نے کہا آپ نے حضرت سے اس کی اجازت لے لی تھی کہ آپ اس خط کو پڑھیں گے؟ بہرحال میں نے یہ خط واپس بھی نہیں کیا اور تعمیل بھی نہیں کی اور جب کئی روز کے بعد حضرت قدس سرہٗ تشریف لائے

تو میں نے زبانی معذرت کردی حضرت نے فرمایا میں نے کوئی حکم نہیں دیا تھا، سفارش ہی تو کی تھی، میں نے عرض کیا کہ بعضوں کی سفارش حکم کا درجہ رکھتی ہے، حضرت مدنی کے ساتھ تو اس نوع کے بہت سے واقعات پیش آئے مدرسہ کے طلبہ اور ملازمین کے سلسلہ میں بھی اور سیاسی مسائل میں بھی۔

(۹)......میری بری عادتوں میں سے ایک عادت یہ ہے کہ میں تعلیمی سلسلوں میں چند امور میں اکثر علماءِ عصر کا شدید مخالف ہوں:

(الف)......میرا اور میرے اکابر کا جو دستور رہا وہ طلبہ کو اخبار بینی، جلسہ بازی اور مجلس سازی ان سب چیزوں کو طالب علم کے لیے میں مہلک سمجھتا ہوں ہماری طالب علمی کے زمانے میں بلکہ ابتداء مدرسی کے زمانے میں بھی طلبہ تو طلبہ مدرسین کے یہاں بھی اخبار بینی کا دستور نہ تھا، پہلے بھی اس سلسلہ میں لکھوا چکا ہوں، میرے خیال میں طلباء کی اسٹرائکوں میں اور ان فسادات اور ہنگاموں میں جو مدارسِ عربیہ میں کثرت سے ظہور پذیر ہیں اخبار بینی کو بہت دخل ہے، وہ اخبارات میں اسکولوں کے، مزدوروں کے قصے پڑھتے ہیں اور بیوقوف یہ نہیں سمجھتے کہ وہ وارثانِ انبیاء علیہم السلام اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام لیوا ہیں، وہ اس قابل تھے کہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دانتوں سے مضبوط پکڑ کر دنیا کے مقتداء بنتے اور وہ احمق دوسروں کا تھوکا چاٹ کر دوسروں کے مقتدی بنتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تورات کا نسخہ پڑھنے پر چہرۂ انور سرخ ہو گیا تھا، جس کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محسوس فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اے عمر! تجھے تیری میّا روئے (یعنی تو مرجا) دیکھتا نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر غصہ کے آثار ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب چہرۂ انور کو دیکھا تو خوف زدہ ہو کر دوزانو بیٹھ کر جلدی جلدی ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ'' الخ پڑھنا شروع کیا کہ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں اللہ کے غضب سے، اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب سے۔ ہم لوگ اللہ کو رب ماننے پر، اسلام کو اس کا دین ماننے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے پر راضی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس وقت موجود ہوتے اور تم مجھ کو چھوڑ کر ان کا اتباع کرتے تو سیدھے راستے سے گمراہ ہو جاتے اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میرا زمانہ نبوت پاتے تو وہ خود میرا اتباع فرماتے۔ (کذا فی المشکوٰۃ)

اور اسی نوع کے دوسرے قصے میں ایک دوسری حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسرا قصہ نقل کیا گیا ہے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم یہود سے بعض ایسی باتیں سنتے ہیں جو ہم کو اچھی معلوم ہوتی ہیں، آپ کی رائے اور اجازت ہو تو ہم بعض ان میں

سے لکھ لیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم کو اپنے دین کے بارے میں ایسا تردّد ہے جیسا یہود و نصاریٰ متردد تھے، میں تمہارے پاس ایک صاف ستھری شریعت لے کر آیا ہوں، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے بغیر چارہ نہیں تھا۔(مشکوٰۃ)

اس نوع کے بہت سے مضامین احادیث میں آئے ہیں اور ہم لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع تو بعد کی چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اقوال پڑھنے کی بھی فرصت نہیں ہے، ہم کو اخبارات چاہئیں، ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ فرانس، امریکہ کیا کہتے ہیں، کافر لوگ کیا کرتے ہیں اور ان کا تھوکا چاٹنے میں وہ مزہ آتا ہے کہ شہد کھانے میں بھی وہ مزہ نہ آئے، اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ترجمہ سن لو یا دیکھ لو تو اس کے لیے وقت نہیں ملتا اور اخبارات و رسائل کے لیے اسباق تو درکنار نماز کی جماعت بھی فوت ہو جائے تو پرواہ نہیں ہے، عوام کا تو ذکر نہیں، جو لوگ دیندار کہلاتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ جب میں طلبہ کے متعلق یہ دیکھتا ہوں کہ مسجد میں تکبیر اولیٰ کے اہتمام کی بجائے دوکان پر بیٹھے ہوئے اخبار دیکھ رہے ہیں تو میں ہی جانتا ہوں کہ میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔

(ب)......میں مدارسِ عربیہ کے درمیان میں ہندی، انگریزی کے داخل کرنے کا ہمیشہ سے شدید مخالف ہوں۔ ہمارے اکابر نے ان مدارس میں انگریزی کو داخل کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی، ہمیشہ مخالفت فرمائی۔ اسی طرح ہندی کا حال ہے، میں مدارسِ عربیہ میں اس کے داخلے کا بھی سخت مخالف ہوں۔

جب یہ ناکارہ دارالعلوم دیوبند کا ممبر شوریٰ تھا، ایک صاحب نے ضروریاتِ زمانہ سے متاثر ہو کر بہت زور شور سے دارالعلوم کے نصاب میں ہندی داخل کرنے کی تحریک کی، میں نے نہایت شدت سے مخالفت کی، میں نے کہا کہ انگریزی اور ہندی کے لیے گاؤں در گاؤں اسکول کھلے ہوئے ہیں یہ لاکھوں میں دو چار بچے عربی پڑھنے کے لیے آگئے ہیں تم ان کو بھی اسی میں دھکیل رہے ہو۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی اس وقت حیات تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بلند درجات عطا فرمائے، میری تائید میں بہت زوردار تقریر انہوں نے فرمائی اور کہا کہ سب کو معلوم ہے کہ میں ہندی کا کتنا حامی ہوں، مگر میں دارالعلوم کی چار دیواری میں شیخ الحدیث صاحب کے ساتھ ہوں، یقیناً اس کو اسلاف کے طرز پر جتنا بھی زیادہ سے زیادہ ممکن ہو رکھنا چاہیے۔ اصل محرک صاحب نے ضرورتِ زمانہ پر زور دیا، مولانا مرحوم نے میری وکالت کرتے ہوئے کہا کہ ان مدارس کی ابتدا میں انگریزی کی ضرورت اس سے زیادہ سخت تھی جتنی آج کل ہندی کی بتلائی جاتی

ہے اور میں خود بھی اسی کا ہم خیال ہوں، مگر دار العلوم کی حدود میں شیخ الحدیث کے ساتھ ساتھ ہوں، مجھ غریب کی آواز میں تو اتنا زور نہ ہوتا مگر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے جوش وخروش کو دیکھنے والے اب تک بھی خوب ہیں۔

• میں نے پہلے کسی جگہ پر یہ لکھوایا ہے کہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ باوجود اپنے سیاسی زوروں کے اس ناکارہ کی رائے اپنی رائے کے خلاف قبول فرماتے تھے اور جہاں کہیں ان کی رائے کے بہت خلاف ہوتی وہاں بھی وہ اس سیہ کار کی رائے کو بغیر نام کے ذکر ضرور کردیتے تھے، دار العلوم کے مسائل میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا بھی یہی معمول رہا ہے کہ وہ بسا اوقات اپنے سیاسی رجحان کی مخالفت کے باوجود دار العلوم کے مسائل میں اس سیہ کار کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

(ج)......اسی طرح سے یہ ناکارہ مدارسِ عربیہ میں صنعت وحرفت کا بھی شدید مخالف رہا اور ہے، مظاہر علوم میں حضرت قدس سرہٗ کی حیات تک تو جو کوئی اس کا محرک آتا اس سے حضرت قدس سرہٗ خود نمٹ لیتے، ہم لوگوں کو نوبت ہی نہیں آتی تھی، لیکن حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے بعد حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے دور میں بہت سے اہلِ خیر نے یہ پیشکش کی کہ آپ شعبۂ صنعت وحرفت مدرسہ میں داخل کرلیں۔

حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص سے فرمادیتے کہ حضرت شیخ سے بات کرلو اور مجھ سے جو کوئی کہتا میں یہ جواب دیتا کہ بجائے اس کے کہ آپ اس کو مدرسہ میں داخل کریں اور اس کے سارے اخراجات آپ برداشت کریں آپ اس کو شہر میں مستقل شعبہ کی حیثیت سے جاری کردیں اور جو جو مدرسہ سے فارغ ہوتا رہے گا اور اپنے مستقبل کے لیے درس وتدریس کے نہ ہونے کی وجہ سے سوچے گا تو میں اس کو ضرور مشورہ دوں گا کہ وہ ضرور صنعت وحرفت سیکھے، سائل یا فقیر نہ بنے۔

مجھے ان تین چیزوں میں زیادہ مخالفت تجربہ سے ہوئی ہے ابتداء تو اکابر کا طرزِ عمل ہے کہ تصوف میرے اکابر اور مظاہر علوم اور دار العلوم کے اکابر کی جان رہی ہے، دونوں مدارس کے اکابر میں شاید ایسا کوئی بھی نہ ہوگا جو کسی سے بیعت نہ ہوا ہو اور ذکر وشغل میں کسی درجہ میں اشتغال نہ ہوا ہو، لیکن اس کے باوجود طالب علموں کے بیعت کرنے میں حضرت اقدس قطب عالم گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کو جس قدر شدت رہی سب کو معلوم ہے، اس لیے کہ طلب علم کے ساتھ دوسری چیز جوڑ بالکل نہیں کھاتی، اگرچہ طلبہ کی موجودہ بے راہ روی کو دیکھ کر کہ وہ فراغ سے پہلے ہی اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتے ہیں، متاخرین نے صرف بیعت کو اختیار کرلیا تھا، لیکن ذکر وشغل کی اب بھی اجازت نہیں ہے، اس واسطے کہ علم کے ساتھ خواہ کوئی مشغلہ ہو وہ علم کے لیے نہایت مُضر ہے۔ علم کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ ''اتنے تو اپنے آپ سارے کے سارے کو مجھے نہیں دے دے گا،

اس وقت تک میں تھوڑا سا حصہ بھی تجھ کو نہیں دوں گا۔''

یہ اسلاف کے کارنامے کہ وہ علم کو اللہ کے واسطے پڑھاتے رہے اور صنعت وحرفت سے اپنی روزی کماتے رہے، گزر گئے۔ اب تو اس میں نہ مبالغہ ہے اور نہ تصنع کہ بہت سے ذی استعداد لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے شوق سے یا بڑوں کے جبر سے انگریزی میں لگے اور پھر انگریزی نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور ان کے ذی استعداد ہونے کا اب تک قلق ہے، بہت سے دوستوں نے ہمارے ہی مدرسہ میں معین مدرسی کی درخواست دی، بہت حتمی وعدے کیے اور بہت سے وعدے کیے کہ مدرسہ کا ذرا حرج نہ ہوگا اور بقیہ وقت اپنی تجارت میں لگایا لیکن ایک ہی سال کے اندر تجارت نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور مدرسہ کو خیر باد کہنا شروع کیا، دنیا کی کشش اور مال ودولت کی کشش فطری چیز ہے، اللہ جل شانہ نے بھی اس پر تنبیہ فرمائی ہے، سورۂ قیامۃ میں ارشاد ہے:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ الآية

خبردار! ''تم لوگ دنیا کو محبوب رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو''۔

عام حالت دنیا کی یہی ہے، اسی وجہ سے میں ان کا ہمیشہ مخالف رہا اور ہوں کہ یہ سب چیزیں دنیا ہیں جن کی محبت فطری ہے اور علم دین آخرت ہے، یہ کمبخت دنیا ہم پر غالب آجاتی ہے اور آخرت یعنی علم دین ہم سے چھوٹ جاتا ہے، لیکن اللہ اگر کسی کو توفیق دے تو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تجارت بھی کرتے رہے اور پڑھنے پڑھانے میں اخیر تک مشغول رہے، تجارت نے ان کے کسی کام میں ذرا بھی حرج نہیں کیا، مگر یہ سب شواذ میں سے ہے، دیکھنا عمومی حالت کا ہوتا ہے۔

(د)......اسی طرح یہ ناکارہ تبدیل نصاب کا بھی سخت مخالف ہو گیا، میں اپنی طلب علم کی تفصیلات میں لکھوا چکا ہوں کہ میں نے درس نظامی کی پابندی سے نہیں پڑھا، میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ تدریس میں خود مجتہد تھے، اس لیے اپنی ابتداء مدرسی میں تو تبدیل نصاب کا خبط مجھ پر بھی خوب سوار تھا، ۳۵ھ سے ۳۸ھ تک ساری دنیا کے نصاب ڈھونڈ کر منگائے تھے ندوہ کا، اہل حدیث کے مدارس کا، حرمین کے مدارس کا اور دو نصاب مرتب کیے، ایک مطول۔ ایک مختصر۔ اول نصاب آٹھ سالہ ان لوگوں کے لیے جن کو پڑھنے کے بعد پڑھانے کے اسباب میسّر ہوں، مالی اور گھریلو حالات سے، مثلاً یہ کہ ان کے خاندان میں اوپر سے علم کا ذوق وشوق چلا آرہا ہو، دوسرا مختصر نصاب، سہ سالہ، ان لوگوں کے لحاظ سے جن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ یہ پڑھنے پڑھانے کے کام کے نہیں بلکہ یہ پڑھنے پڑھانے کے بعد طبیب یا کاشتکار بنیں گے، شطرنج کے کھلاڑیوں کی طرح سے میرا دماغ دن رات ان ہی میں گھومتا رہتا تھا اور بہت ہی غور وخوض سے میں نے یہ نصاب مرتب کیا تھا، اُس وقت تو ایک مختصر سا رسالہ لکھ کر شائع کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن جوں جوں

تدریس کا زمانہ یا تجربہ بڑھتا رہا، تبدیلِ نصاب کا خبط میرے دماغ سے نکلتا رہا، ایک دو کتاب کا تغیر علوم آلیہ میں ہو جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، لیکن فقہ، اصولِ حدیث و تفسیر اور علوم آلیہ کی اہم کتب کافیہ، شرح جامی جیسی کتب میں تغیر کا بالکل قائل نہیں ہوں جس کی بہت سی وجوہ ہیں، بڑی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی نصاب کے آئے دن کے تغیرات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ اگر مدارس عربیہ میں بھی یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر دس بارہ برس کے بعد نئی نسل اپنی جولانیاں دکھانی شروع کرے گی اور کیوں نہ کرے گی تو یہ نصاب رفتہ رفتہ وہ شیر بن جائے گا جس کی تصویر اپنی کمر پر کھینچوانی چاہی تھی لیکن دم، ہاتھ، پاؤں، کان، ناک ہر ایک کے بنانے میں جب تکلیف ہوئی تو وہ یہ کہہ کر انکار کرتا رہا کہ بغیر دُم کا بھی تو شیر ہوتا ہے اور بغیر ہاتھ کا بھی شیر ہوتا ہے۔

(۱)...... درسِ نظامی کی ابتدا کی طرح سے ہر محقق اور ہر با اثر یہ چاہے گا کہ اس کی تصنیف ضرور داخل نصاب ہو، جس کی نظیریں اپنی ابتداء مدرسی سے لے کر اب تک بارہا خوب دیکھیں، لیکن درسِ نظامی کو اللہ نے وہ مقبولیت عطا فرما رکھی ہے کہ اس میں عمومی کھپت کی گنجائش نہیں رہی، اس لیے لوگوں کی مساعی اس کے خلاف ناکام ہی ہوتی آ رہی ہیں۔

(۲)...... مروّجہ نصاب کی اتنی خدمت ہو چکی ہے، شروح و حواشی ضرورت سے زیادہ لکھے جا چکے ہیں جن کا حال اہل علم کو خوب معلوم ہے، متبدل نصاب کی اتنی خدمت کرنے والے میرے خیال میں اب پیدا نہ ہوں گے اور اگر چہ ہمت والے آستینیں چڑھائیں گے بھی تو جتنی شروح و حواشی درسِ نظامی کی کتب پر سو برس میں لکھی گئی ہیں، ان سے آدھی کے لیے کم از کم پچاس برس چاہئیں اور اتنی مدت میں اگر یہ سلسلہ جاری ہو گیا تو نہ معلوم کتنی تبدیلیاں اور پیدا ہوں گی۔

(۳)...... میں دوسروں کو تو نہیں کہوں گا مگر اپنے شاگردوں کو جرأت کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی استعداد جیسی ہے وہ موجودہ نصاب کی کتب کو تو شروح و حواشی کی مدد سے کسی نہ کسی درجہ میں پڑھا لیں گے، لیکن کوئی نئی کتاب جس کی نہ شرح ہو نہ حاشیہ، تو نوے (۹۰) فیصد ایسے ہیں جو نہیں پڑھا سکتے، ایک شرح جامی کو لے لو کہ اس کی جگہ اگر ابن عقیل رکھ دی جائے جو مجھے بھی یاد ہے کہ میں نے اپنے خبط کے زمانے میں نصاب میں تجویز کی تھی، تو اس کا پڑھانے والا اگر علماء زمانہ کی توہین نہ ہو تو میرے خیال میں بہت دشواری سے ملے گا، اس لیے کہ اس کی کوئی شرح نہیں ملے گی اور شرح جامی کی اُردو، عربی، فارسی بے حد شروح ملیں گی، جو مدرسین حضرات سے دیکھی بھی نہیں جائیں گی، ابن ماجہ کی جگہ اگر تیسیر الوصول رکھ دی جائے تو ان دونوں کے شروح بکثرت موجود نہ ہونے کے باوجود مختلف مطابع، مختلف حواشی اس قدر کافی ہیں کہ شروح کی ضرورت نہیں اور تیسیر الوصول کا ایک بھی حاشیہ نہیں ملے گا، ابن ماجہ شریف کے لیے انجاح الحاجہ کافی سے زیادہ ہے اور

ایک انجاح الحاجہ ہی ایسا متبرک حاشیہ ہے کہ اس جیسا تیسیر الوصول کے لیے ملنا بھی مشکل ہے، یہ مدرسین کی نئی پود جن میں سے بہت سے تو اپنی وجاہت اور سفارشوں سے مدرس ہو گئے اور ان کے پڑھنے کا زمانہ ہماری نگاہوں میں ہے۔ اُردو کی شرح اور حواشی دیکھ کر کچھ دال دلیہ کر سکتے ہیں، مگر جن کی کوئی شرح نہ ہو اس کو اپنی تقریر کے زور سے اُڑا دی تو ممکن ہے جس کے متعلق میرا خود ذاتی تجربہ بھی ہے کہ بعض نو مدرسین جن کی تقریر شُستہ ہو، آج کل جس کا رواج ہے وہ اپنے زور سے چلا تو دیتے ہیں مگر جب خود نہیں سمجھے تو طالب علم کیا سمجھے گا۔

باب چہارم

حوادث وشادیاں

میری ان ہی بری عادات میں سے ایک بری عادت ساری عمر بچپن سے شادیوں میں شرکت سے نفرت ہے، لیکن اس کے بالمقابل جنازوں میں شرکت کی رغبت، اہمیت۔ دونوں کے چند واقعات آپ بیتی کے لکھواؤں گا۔

شادیوں میں جانے سے مجھے ہمیشہ بچپن سے وحشت سوار رہی، حالانکہ بچپن میں ان کا بہت شوق ہوتا ہے اور بعض دفعہ تو "وَ نَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّي سَقِيْمٌ" پر مجھے عمل کرنا پڑتا تھا اور اس میں کچھ کِذب یا توریہ نہیں تھا کہ امراضِ ظاہرہ سے زیادہ امراض باطنہ کا شکار رہا اور جوں جوں امراضِ باطنہ میں کمی ہوتی رہی امراضِ ظاہرہ اس کا بدل ہوتے رہے۔ اس لیے "اِنِّي سَقِيْمٌ" سے کوئی دَور بھی خالی نہیں تھا اور کبھی کبھی شیخ الہند قدس سرہٗ کے اُسوہ پر بھی عمل کرنا پڑا۔ اگر چہ یہ سیہ کار اپنے اکابر کا اتباع کسی جگہ بھی نہ کر سکا۔

میرے اکابر کے اس میں ہمیشہ دو نظریئے رہے، ایک حضرت سہارنپوری اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہما کا کہ اگر سفر سے کوئی عذر مانع ہوا تو صفائی سے کہہ دیا کہ وقت نہیں اور فرصت نہیں ہے۔ اس کے بالمقابل حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ہر دو حضرات رائے پوری نور اللہ مرقدہم کا یہ معمول رہا کہ یہ لوگ اصرار کرنے والوں کے سامنے بالکل عاجز ہو جاتے تھے اور ہتھیار ڈال دیتے تھے، خواہ کتنی ہی مشقت اُٹھانی پڑے۔ میں نے حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے علیٰحدہ علیٰحدہ دو موقعوں پر ایک ہی سوال کیا کہ جب مجبوری اور معذوری ظاہر ہے تو شدت سے آپ کیوں انکار نہیں کرتے؟ دونوں اکابر نے اللہ بلند درجات عطا فرمائے بڑا ہی قابل اتباع وعبرت جواب دیا، اگر چہ دونوں نے مختلف عبارتوں سے جواب ارشاد فرمایا، یہ فرمایا کہ اس کا ڈر لگنے لگتا ہے کہ اگر یہ مطالبہ ہو کہ ہم نے اپنے ایک بندے کو تیرے پاس بھیجا تیری کیا حقیقت تھی، ہم نے ہی تو اس کو بھیجا تھا، تو نے اس کو ٹھکرا دیا، تیری کیا حقیقت تھی، اس کا کیا جواب دوں گا۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے جس معمول کا اوپر ذکر کیا گیا، وہ یہ تھا کہ جب کوئی مجبور کرتا اور جانے میں کوئی معذوری ہوتی تو کوئی مسہل دوا نوش فرما لیا کرتے تھے، اسہال کو عذر فرما لیا کرتے تھے، اسہال کا عذر ایسا کہ ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے، صاف انکار کرنے سے اپنے کو مشقت میں ڈالنا ان اکابر کو آسان تھا۔

فصل اوّل......حوادث

(۱)......۳۴ھ تک تو یہ ناکارہ اپنے والد صاحب کی حیات میں محبوس، قیدی، نظر بند، کہیں جا آ سکتا نہیں تھا۔ ۱۰ ذیقعدہ ۳۴ھ میں میرے والد صاحب کا انتقال ہوا، اتفاق کی بات ہے. جس صبح کو میرے حضرت مرشد العرب والعجم حضرت سہارنپوری کا جہاز بمبئی کی گودی پر لگا اسی صبح کو سہارنپور میں میرے والد صاحب کا انتقال ہوا، ایک عجیب واقعہ اس وقت کا ہے، یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ بمبئی جہاز سے اُترتے ہی حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ انگریزوں کی قید میں نینی تال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریک کی تفتیش میں لے جائے گئے۔ اس سے پہلے بڑی ہی مسرتیں جھوم رہی تھیں۔ کوئی دہلی، کوئی بمبئی کا سامان باندھ رہا تھا، میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ایک مخلص دوست شیخ حبیب احمد صاحب مرحوم نے پوچھا حالانکہ اس وقت تک کسی بیماری کا اثر تک نہیں تھا کہ مولوی صاحب آپ بمبئی جائیں گے یا دہلی؟ تو میرے والد صاحب نے جواب دیا تھا کہ میں تو اپنی جگہ پڑا پڑا ملاقات کرلوں گا، وہی حال ہوا کہ حضرت کے تشریف لانے پر وہ حاجی شاہ میں لیٹے ہوئے تھے، بہرحال میرے والد صاحب کے انتقال اور میری ابتدائی مدرسی کے بعد سے لے کر ۴۷ء کے ہنگامہ، تقسیم ہند کے وقت تک کا کوئی مدرسہ کا طالب علم اور غربی جانب اسلامیہ اسکول کے محاذات میں جو مسجدیں ہوتی تھیں، کسی مسجد کا رہنے والا کوئی طالب علم ایسا نہیں رہا ہوگا جس کو نہلانے اور کفنانے میں یہ ناکارہ مستقلاً شریک نہ ہوا ہو، ابتداءً اکیلا ہوتا تھا اور میرے ساتھ دو چار طالب علم، لیکن ۴۷ھ سے مخی، صدیقی، مخلصی مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جن کی بے تعلقی اور تعلق کا قصہ بھی رئیس الاحرار کی طرح بڑا عجیب ہے، علی گڑھ کے قیام میں موقع ملا تو وہ بھی آجائے گا بڑا ہی عجیب قصہ ہے، میرے دست و بازو ہوگئے اور آخر میں تو میری معذوری کے بعد وہی اصل ہوگئے تھے، وہ میرے ساتھ اس مبارک کام میں شریک رہا کرتے تھے، اپنے ہاتھ سے غسل دینا، بالخصوص جن طلبہ کو چیچک نکل آئی ہو اور اپنے ہاتھ سے کفن پہنانا، قبرستان میں دفن تک شریک رہنا۔

البتہ اس سلسلہ میں ایک نہایت بُری عادت یہ بھی رہی کہ تعزیت میں آنے والے کبھی اچھے نہیں لگے، اگرچہ یہ ناکارہ دوسروں کی تعزیت میں اطلاع پاتے ہی پہنچتا۔ اس لیے کہ لوگوں کو بہت شدت سے میرے جانے کا اہتمام ہوتا، بہت شدت سے منتظر رہتے، لیکن مجھے میری تعزیت کے واسطے آنے والے کبھی اچھے نہ لگے، اِلّا ماشاء اللہ، حضرت مدنی حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہما جیسے تو مستثنیٰ تھے کہ ان کی آمد سے واقعی تعزیت ہوتی تھی، لیکن عام آنے والوں کو نہایت شدت سے منع کردیتا تھا۔

حادثۂ انتقال والد صاحب:

(۱)......میری زندگی کا سب سے اہم اور ابتدائی واقعہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا حادثۂ انتقال جو ۱۰ ذیقعدہ ۳۴ھ کو ہوا۔

میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے ذمہ انتقال کے وقت آٹھ ہزار روپے قرض تھے۔ جس کا کچھ حال تذکرۃ الخلیل میں حضرت میرٹھی لکھ چکے ہیں۔ مجھ پر ان کے قرض کا بہت ہی بوجھ تھا کہ اللہ جل شانہ کے یہاں مطالبہ نہ ہو۔ میں نے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے مشورہ سے دوستوں کو کارڈ لکھے کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ان کے ذمہ جو قرض تھا وہ میری طرف منتقل ہو گیا، یہاں آنے کی ہرگز ضرورت نہیں، وہیں سے دعائے مغفرت و ایصال ثواب اپنی دست وسعت کے مطابق کرتے رہیں۔ جن سے کچھ لین دین تھا ان کے خط میں یہ اضافہ بھی ہوتا تھا کہ والد صاحب کے ذمہ کچھ قرض ہو تو اس کی تفصیل سے مطلع کریں۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے تو نینی تال سے واپسی پر میری اور چچا جان کی اس تجویز کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ یوں ارشاد فرمایا کہ یوں لکھنا چاہیے تھا کہ ان کا ترکہ کتابیں ہیں، اپنے قرضہ کے بقدر لے لو۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ اگر میرے کارڈوں سے پہلے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی تشریف آوری ہو جاتی تو حضرت کی تجویز کے خلاف لکھنا ناممکن تھا اور مجھے یہ لکھتے ہوئے غیرت آتی تھی کہ کتابیں لے جاؤ۔ اس موقع پر بھی تین عجیب واقعے پیش آئے:

(الف) والد صاحب کے انتقال کی اس قدر شہرت آن کے آن میں ہوتی رہی کہ تقریباً ۸ بجے صبح کو انتقال ہوا، ۹ بجے تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی۔ تدفین میں بہت معرکہ رہا، حکیم اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور حکیم یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ جن سے میرے والد صاحب کے بہت ہی خصوصی مراسم تھے، ان کی تمنا خواہش یہ تھی کہ اپنے اپنے باغ میں تدفین عمل میں آئے۔ مگر ہمارے اہلِ محلّہ بالخصوص جناب الحاج فضل حق صاحب جو بانیانِ مدرسہ میں ہیں ان کے صاحبزادے جناب شیخ حبیب احمد صاحب اور ان کے رفقاء لٹھ لے کر تشریف لائے کہ تدفین حاجی شاہ میں ہوگی ورنہ یہاں معرکہ ہو جائے گا اور اہل محلّہ بھی اس پر مُصر تھے اور چونکہ مولانا محمد مظہر صاحب بانی مظاہر علوم کا مزار مبارک بھی حاجی شاہ میں تھا۔ اس لیے اہل مدرسہ کی رائے بھی وہیں کی ہوئی۔

انتقال کے وقت گھر میں صرف میری والدہ مرحومہ تھیں، (جن کو اسی وقت سے بخار شروع ہو گیا اور دس ماہ بعد بڑھتے بڑھتے تپ دق تک پہنچا کر مورخہ ۲۵ رمضان المبارک لیلۃ القدر میں میرے والد صاحب کے پاس ہی پہنچا دیا)۔ اس وقت گھر میں صرف میری چھوٹی بہن مرحومہ جس کی عمر اس وقت غالباً تیرا (۱۳) چودہ (۱۴) برس کی ہوگی اور اہلیہ مرحومہ تھیں اور کوئی نہیں تھا۔ مجمع رات

تک لَا تعدّ وَلا تحصیٰ ٹوٹ پڑا، کھانے کی مہمانوں کے لیے انتظام کرنے کی کوئی صورت نہ تھی بجز اس کے میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے شاگردانِ رشید ان شام تک بازار جاتے آتے رہے، روٹی کچوری اسٹیشن تک جہاں جس دکان پر ملی وہ بیچارے خرید کرلاتے رہے۔ جہاں تک یاد ہے تین چار سو روپے کی صرف کچوریاں منگوائی تھیں، جو دکاندار شام تک پھرتی سے پکاتے رہے، یوں یاد پڑتا ہے کہ ایک پیسے کی ایک اچھی کچوری آتی تھی۔ میں بھی خواص کے ساتھ شرکت کرتا تھا تا کہ اصرار سے ان کو کھلاؤں۔ اتنی کچوریں اس سے پہلے نہ عمر بھر میں کھائیں بلکہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں، نہ آیندہ کو کوئی احتمال۔ میرا لوگوں کے کھانے پر اصرار اوران کے ساتھ کھانے پر میں نے اپنے کانوں سے کئی فقرے سنے۔ ایک یہ کہ اس کو اپنے باپ کے مرنے کی بہت ہی خوشی ہو رہی ہے، کیا بات ہے؟ دوسرے یہ کہ باپ کی زندگی میں بڑی قید میں رہتا تھا، آج آزادی ملی ہے۔ بعض ناواقف آپس میں یہ بھی پوچھتے تھے کہ یہ اس کے باپ نہیں معلوم ہوتے، اس کی والدہ کے دوسرے خاوند ہوں گے۔

تفصیل ادائیگی قرضہ:

(ب) میرے والد کے ذمے آٹھ ہزار قرض تھا اور میری عمر تقریباً انیس (۱۹) سال تھی، قرض خواہوں کو یہ فکر ہو گیا تھا یہ رقم ماری گئی۔ ایسے خصوصی تعلق رکھنے والوں نے بھی ایسے شدید تقاضے کیے جس کا واہمہ بھی نہ تھا۔ اس سال مالی حیثیت سے مجھے بہت ہی پریشانی ہوئی، شاید اس کی تفصیلات کہیں آ جائیں۔ مالکُ الملک کے اس قدر احسانات لَا تُعَدُّ وَلَا تحصیٰ برسے ہیں کہ ''وَاِنْ تَعُدُّوْ ا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' کا اعتقاد ہی نہیں عملی تجربہ ہے۔

(ج)...... میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا تجارتی کتب خانہ اشتہاری قیمت سے تو قرضے کی حیثیت سے کچھ زائد تھا، لیکن تجارتی اور نیلام کی صورت سے قرضہ سے بہت کم تھا۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مخلص دوست عالی جناب شاہ زاہد حسن صاحب رئیس بہٹ مرحوم کا یہ اصرار تھا کہ میں کتب خانہ کو فوراً بیچ دوں اور اس کے بعد قرضہ جتنا باقی رہ جائے اس کو مرحوم از راہِ کرم اپنے پاس سے ادا کریں گے اور میں مرحوم کے یہاں کسی دوسری جگہ ملازمت بچوں کے پڑھانے کی اختیار کروں۔ میں نے اس تجویز کا شدت سے انکار کر دیا۔ اس پر شدید ناراض ہو گئے۔

(د)...... میری ہمشیرہ مرحومہ چونکہ نابالغ تھیں اور مجھ سے حساب کا رکھنا بہت مشکل تھا، قرضے کا بھی بڑا مرحلہ تھا، اس لیے میں نے مرحومہ کی طرف سے اپنے چچا جان کو وکیل بنایا اور کاندھلہ کی ننھیال والی جائداد مسکونہ اور صحرائی کا حساب لگا کر والدہ اور دادی اور ہمشیرہ کی طرف لگا دیا جو بہت

تھوڑی تھوڑی مقدار میں آیا اور کتب خانہ جس کی مقدار بہت ہی کم تھی اپنی طرف لگالیا اور قرضہ بھی اپنی طرف لگالیا اللہ نے وہ احسان فرمایا ہے کہ آج دنیا بھی دیکھ رہی ہے کہ کسی نواب یا بادشاہ کو یہ وسعت کہاں حاصل ہوگی جو اس سیہ کار کو حاصل ہے۔ البتہ ابتدائی ایک سال لوگوں کے اس اندیشے سے کہ رقم ضائع ہوجائے گی مجاہدے کا ضرور گزرا۔ میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے چند مخلص دوست حکیم خلیل صاحب دیوبندی ثم سہارنپوری مقیم کھالہ پار جو خود تو مال دار نہیں تھے مگر ان کے محلّہ کے متعدد نور باف متمول بہت معتقد تھے اور محلّہ پٹھانپورہ کے متعدد پیسے والے اور مولانا منفعت علی صاحب سابق وکیل سہارنپور جو تقسیم کے بعد کراچی جاکر انتقال کرگئے اور سب سے آخر میں میرے مخلص، میرے محسنِ اعظم جناب الحاج حبیب احمد صاحب جن کے صاحبزادے بہاولپور میں افسر الاطباء رہ کر انتقال فرماگئے، ساکن محلّہ منڈی کلاں یہ سب میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی وجہ سے مجھ پر شفیق تھے، چونکہ لوگوں کے مطالبے تھے، میں ہر دن کے لوگوں سے وعدے کرلیا کرتا تھا کہ کل کو انشاء اللہ ادا کردوں گا۔ چوتھے گھنٹے کا سبق پڑھا کر دارالطلبہ سے سیدھا کھالہ پار جاتا، حکیم خلیل صاحب سے کہتا کہ آج شام تک پانچ سو کے دینے کا وعدہ ہے، وہ مجھے اپنے مطب میں بٹھا کر ایک پنسل اور ایک کاغذ لے کر اپنے معتقد نور بافوں میں جاتے جو ان کے گھر کے قریب رہتے تھے اور جاکر کہتے، بھائی ہمارے مولوی صاحب کو پیسے چاہئیں، بولو کون کیا دے گا؟ کوئی دس دیتا، کوئی بیس دیتا، کوئی کم وبیش، وہ پندرہ بیس منٹ میں ایک فہرست لکھ کر لاتے جس پر نام، رقم، وعدہ درج ہوتا تھا، اس فہرست کو اپنے قلم دان میں رکھتے اور میرے پاس تشریف لاکر مجھے دوسرا پرچہ لکھواتے۔ فلاں تاریخ کو دس روپے، فلاں تاریخ کو بیس روپے، فلاں میں پندرہ، فلاں میں پچیس۔ میں یہاں سے نمٹ کر فوراً پٹھانپور جاتا اور وہاں بھی اس دن کا مطالبہ پورا نہ ہوتا تو مولانا منفعت علی صاحب کے پاس جاتا جو اس زمانے میں محلّہ مطربان میں رہتے تھے۔ جہاں میری غرض پوری ہوجاتی واپس آجاتا اور آخری درجے میں جناب الحاج حبیب احمد صاحب کے پاس جاتا، وہ خود بھی پیسے والے تھے اور ان کے پڑوسی بھی۔ وہ صورت دیکھتے ہی پوچھتے کتنی کسر باقی ہے؟ میں کہتا کہ حاجی جی آج تو بہت باقی ہے، آٹھ سوا بھی باقی ہیں، وہ جاتے اور جتنی کسر ہوتی فوراً لا دیتے۔ یہ روزانہ کا معمول اس وجہ سے بن گیا تھا کہ لمبے وعدے پر اور زیادہ مقدار میں اس وقت پیسے نہیں ملتے تھے۔ مرحوم کو پندرہ بیس ہی دن میں کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوگیا جس کا میں نے تو اظہار نہیں کیا کہ یہ دارالطلبہ سے سیدھا بغیر کھانے کھائے چل دیتا ہے کھانا نہیں کھاتا۔ موصوف اچھے پیسے والے تھے مگر لباس اور غذا بہت ہی معمولی، سرکاری نمبر دار بھی تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں سیدھا آتا ہوں تو اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے کہ مرحوم

کو آخر میں مجھ سے بہت ہی محبت ہوگئی تھی۔ میرا لڑکپن تھا، اس کے باوجود مرحوم نے وصیت کی تھی کہ مجھے غسل بھی زکریا ہی دے اور نماز بھی وہی پڑھائے۔ جب مرحوم کو یہ معلوم ہوا کہ میں بغیر کھانا کھائے جاتا ہوں تو جب میں جاتا اور وہ اس وقت میں میرے منتظر رہتے، صورت دیکھتے ہی پوچھتے کہ کتنی کسر ہے؟ میں کہتا پانچ سو کی، جب ہی اٹھتے زنانہ مکان میں جاتے، تین چار روٹی رکابی میں اس وقت کوئی سالن ابلا ہوا گوشت بھجی وغیرہ روٹی پر رکھ کر لوٹے میں پانی اور اس کی ٹونٹی میں گلاس لٹکا ہوا لاکر مجھے دیتے اور کہتے کہ اتنے تو روٹی کھا، اتنے میں تیرے لیے پیسے لاؤں اور جب میں کہتا کہ حاجی جی واقعی بالکل بھوک نہیں، تو بہت بے تکلفی کے ساتھ بلا مذاق واقعیت کے ساتھ کہتے کہ بھاگ جا میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ جھک مار کر کھانا پڑتا اور اپنی غرض باولی بغیر بھوک کھاتا تھا۔ وہ واپس آ کر دیکھتے کہ میں نے کچھ کھایا ہے یا نہیں اگر ایک دو روٹی کھالیتا تو پیسے دیتے ورنہ بے تکلف فرمادیتے تشریف لے جاؤ پیسے نہیں ہیں۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے، میری بہت ہی مدد کی جیسا کہ اُوپر معلوم ہوگیا کہ مجھے تو روزانہ شام کو سینکڑوں کی ادائیگی کرنی پڑتی تھی اور روزانہ ہی تقاضے رہتے تھے، اس لیے ان مرحوم کا ایک دستور اور بھی تھا۔ وہ نمبردار تھے اور سرکاری روپیہ داخل کرنے کے واسطے نکوڑ جانا پڑتا تھا، امن کا زمانہ تھا، اپنی سائیکل پر اکثر بار کی صبح کو روپے لے کر جاتے، شام کو اسی سائیکل پر نکوڑ سے سیدھے دار الطلبہ پہنچتے۔ درس گاہ میں میرے پاس جاکر کہتے کہ ڈیڑھ ہزار میری جیب میں ہیں آج فلاں وجہ سے وہ داخل نہ ہو سکے کل کو اتوار ہے پرسوں تک کے واسطے چاہئیں تو لے لے اور اگر وہ یوں کہہ دیتے کہ پرسوں کو چھٹی ہوگئی ہے دو (۲) دن کی گنجائش اور ہے تو پھر میری عید تھی۔ میں اس رقم کو لے کر شام کو کسی بڑے قرض خواہ کے پاس جاتا اور اس وقت تو میرے پاس روپے ہیں آپ کا جی چاہے تو مجھ سے لے لیجئے اور نوٹ ان کے سامنے کر دیتا اور اس کی وجہ سے مجھے ایک دو ماہ کی توسیع ضرور مل جاتی۔ ان مخلصین میں خاص طور عالی جناب میرے محسن الحاج حافظ زندہ حسین صاحب مرحوم بھی تھے۔ اللہ ان کو بہت ہی درجاتِ عالیہ نصیب کرے۔ ان کے احسانات کا اپنی شایانِ شان بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔ ابتدائی زمانے میں بہت ہی قرض دیا، مگر مرحوم میں دو (۲) خاص ادائیں تھیں۔ ایک یہ کہ ابتداء میں پانچ سو اور ایک سال بعد سے ایک ہزار سے زائد نہیں دیتے تھے اور ''اللہ کے فضل سے'' ان کا تکیۂ کلام تھا۔ میں جب بھی کچھ مانگتا وہ اس سے آدھے کا فوراً وعدہ کرتے، میں کہتا کہ حافظ جی پانچ سو کی بڑی ضرورت ہے، وہ فرماتے کہ ''اللہ کے فضل سے ڈھائی سو تو میں دے دوں گا، ڈھائی سو کا کہیں اور سے انتظام کرلو۔'' میں نے بھی دو تین مرتبہ کے بعد سمجھ لیا تھا کہ جتنے کی ضرورت ہوتی اس سے دو گنا مانگتا اور وہ اللہ کے فضل سے اس سے آدھے کا یعنی میری بقدر

ضرورت کا فوراً وعدہ کر لیتے اور فرماتے کہ اگلی نماز لیتا آؤں گا، مجھے کبھی جانا نہ پڑا۔ وہ اگلی نماز میں مرحمت فرما دیتے۔ دوسری خاص ادا مرحوم میں یہ تھی کہ وہ وعدہ ایک دن پہلے پوچھتے کہ حضرت جی! آج کیا تاریخ ہے؟ اور اور میں کہتا حافظ جی خوب یاد ہے...... اللہ اپنے فضل و کرم سے ان کو اور میرے سارے محسنوں کو جن جن کے بھی جس نوع کے احسان جانی، مالی، جاہی، علمی، سلوکی، اخلاقی مجھ پر ہوئے ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم، انعام و احسان سے اپنی شایانِ شان ان کے احسانات سے بہت زیادہ بڑھا کر ان کو بدلہ عطا فرمائے۔ میری یہ دعا اپنے سارے محسنوں کے لیے بیس برس کی عمر سے روز مرّہ کی اہم دعاؤں میں شامل ہے۔ اس میں تخلف تو یاد نہیں کہ کبھی عمر بھر میں ہوا ہو، کئی کئی مرتبہ ہو جاتی ہے۔ ماہ مبارک اور سفر حجاز میں تو خوب یاد ہے کہ یہ سیہ کار، نابکار، بے کار و بدکار اپنے محسنوں کے احسانات کا بدلہ بجز دعاء کے اور کچھ نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ ہی اپنے کرم سے قبول فرمائے۔

البتہ دوستوں کو نہایت تجربہ کی وصیت اور نصیحت کرتا ہوں، بالخصوص جن کو قرض سے کوئی کام پڑتا ہو کہ قرض کے ملنے میں وعدہ پر ادا کرنے کو جتنا مجرب اور حصولِ قرض کے لیے سہل نسخہ میں نے پایا ایسا کوئی بڑے سے بڑا نسخہ نہیں پایا مجھے ابتدائی چند ماہ میں بے شک دقت اُٹھانی پڑی، لیکن چند ہی ماہ میں بعد لوگوں کو وعدے پر ادائیگی کا یقین ہو گیا تو پھر قرض میں اس اس قدر سہولت رہی کہ صرف پرچہ یا کسی معتمد کے ہاتھ زبانی پیام قرضہ لینے کے لیے کافی تھا۔

میرے محلے کے دوستوں کا مشہور مقولہ تھا کہ جسے کچہری میں کسی ضرورت سے روپیہ لے جانا ہو گھر کی الماری میں سے نکالنے میں تو دیر لگے گی کچہری جاتے ہوئے راستے میں اس سے لیتے جاؤ جیب میں ملیں گے۔ ایک دن پہلے اس سے کہہ دو کہ ''کل کو ۱۰ بجے کے قریب کچہری جانا ہے، ۸ بجے اس کی جیب میں پہنچ جائیں گے۔'' اسی کا ثمرہ تھا کہ ایک زمانے میں مجھے بعض لوگوں سے ساٹھ ہزار تک قرض لینا پڑ گیا۔ اس مالک کا احسان ہے اور مالک کے کس کس احسان کو شمار کروں۔

بچیوں کے حج کے قرضے کی کیفیت اور مالک کی قدرت کے کرشمے:

۷۴ھ میں مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بچیوں کو حج کرانے کو جی چاہتا ہے، میں نے کہا بڑے شوق سے۔ اپنا اور مولوی انعام صاحب کا اور غالباً دو بچیوں کا انتظام تو آپ کے ذمے اور بقیہ میں کر دوں گا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور شعبان میں کہہ دیا کہ جن صاحب نے ہمیں قرض دینے کا وعدہ کیا تھا انہوں نے عذر کر دیا۔ ہمارا انتظام بھی اس وقت تمہیں ہی کرنا ہے اور میرے پاس قریبی رشتہ دار مستورات کا کئی سال کا قرضہ اسی نام سے جمع تھا کہ وہ تھوڑا تھوڑا دیتی رہتی تھیں کہ جب ہم حج کو جائیں تو لے لیں گے۔ میں نے اپنی بیوی بچیوں سے

اعلان کر دیا کہ پہلے اپنا اپنا زیور فروخت کرو اس کے بعد جس کے خرچہ میں جتنی کمی ہو وہ بطور قرض میں دوں گا، جب تمہارے پاس آجائے دے دینا، نہ آئے تو اللہ معاف کرے۔ سب سے پہلے تو اپنے اللہ کا احسان، اس مالک کے کسی احسان اور انعام کا شکر ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد اپنی بیوی اور بچیوں کا ممنونِ احسان کہ اس قدر خوشی اور مسرت سے ہر ایک نے اپنی ایک ایک چیز لا کر مجھے نہ دی نہ بتائی، بعض اپنے اعزہ کے واسطے سے فوراً بازار فروختگی کے واسطے بھیج دی۔

میرے ایک مخلص دوست حاجی جان محمد پشاوری جو اس زمانے میں سہارنپور میں مستقل رہتے تھے اور وہیں کام کرتے تھے اور میرے بڑے مخلص جاں نثار تھے، سب نے اپنا اپنا زیور فروختگی کے واسطے ان ہی کو دیا کہ وہ ہم سب کی نگاہوں میں بہت معتمد تھے۔

انہوں نے رات کو مجھے مشورہ دیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجئے۔ زیور دو (۲) طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن میں مالیت تو ہوتی ہے مگر ان کی گھڑائی صنعت زیادہ نہیں ہوتی۔ دوسری قسم وہ جن میں مالیت تو بہت کم ہوتی ہے مثلاً تیس چالیس روپے کا سونا اور اس کی دلآویز، دل کش صنعت ستر (۷۰)، اسی (۸۰) روپے کی ہوتی ہے۔ فروختگی میں صنعت کی کوئی قیمت نہیں ہوا کرتی اور اصل مالیت میں ربع کے قریب خوردہ کے نام سے کٹوتی ہوتی ہے۔ ایسے زیور جو بنتے ہیں تقریباً ڈیڑھ دوسو میں فروخت ہوتے ہیں چالیس پچاس میں، ان کو ہرگز نہ فروخت کرائیں۔ مجھے زیورات کی اس تفصیل سے کبھی پہلے کام نہیں پڑا تھا، میں نے ان حاجی جی سے کہہ کر اس قسم کے زیورات لڑکیوں کو واپس کرا دیے اور بچیوں سے کہہ دیا یہ میرے قرض میں رہن ہیں تم میں سے کسی کو اس میں تصرف کی اجازت نہیں جب تک میرا قرضہ ادا نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے سب کا حساب لگایا تو مع مولانا یوسف صاحب مولانا انعام صاحب کے تقریباً ستائیس ہزار روپے کی میزان ہوئی جس کی مجھے ضرورت تھی۔ میں نے شعبان ۷۴ھ میں اپنے دوستوں کو پرچے لکھے کہ مجھے ستائیس ہزار روپے کی ضرورت ہے اس میں سے تم کتنا اور کتنے زمانے کے واسطے دے سکتے ہو؟ اس وقت کچھ لینا نہیں ہے میرے پاس رکھنے کی جگہ نہیں ہے، ۹ شوال کو یہ قافلہ سہارنپور سے روانہ ہوگا، ۸ شوال کو آپ کی موعودہ رقم لوں گا، مجھے صرف اس وقت حساب کے واسطے اتنا پختہ معلوم ہو جائے کہ آپ کتنی رقم کتنے دنوں کے واسطے دے سکتے ہیں؟ اَللّٰھُمَّ لَآ اُحصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ تین دن میں جو پرچوں کے جواب ملے ہیں ان کی میزان چھتیس ہزار تھی۔ میرے پرچے کا مضمون صرف وہ تھا جو اوپر لکھا ہے اور اس میں بھی مالک کے عجائب کرشمہ ہائے قدرت دیکھئے میرے ایک مخلص دوست کا ایک گاؤں بڑی دعاؤں کے بعد تیس ہزار میں انہی ایام میں فروخت ہوا تھا جس کی فروختگی کی شیرینی بھی وہ مجھے کھلا چکے تھے۔ دوسرے صاحب کا دس ہزار میں ایک باغ فروخت ہوا تھا اس کی

بھی شیرینی میں کھا چکا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تھا اور اپنے تعلقات کی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا اور کوئی تردد بھی نہ تھا کہ سارا نہیں تو معظم حصہ ان دونوں سے وصول ہوگا۔ مگر دونوں نے اس زور کی معذرت کی کہ ایک پیسے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے واقعی ذرا بھی قلق نہ ہوا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ معاً مجھے یہ خیال ہوا کہ تو نے بندہ پر نگاہ رکھی کیوں؟ تیری سزا یہی ہے اور اس کے بالمقابل جو مالک کے کرشمہ ہائے قدرت دیکھے وہ بھی بڑی لمبی داستانیں ہیں۔ مولوی نصیر نے مجھ سے کہا کہ ایک پرچہ فلاں کو بھیج دے میں نے کہا تیری عقل ماری گئی، اس بیچارے کے پاس کہاں پیسہ؟ مولوی نصیر نے کئی دفعہ اصرار کیا۔ میں نے نہیں مانا، اس نے زبردستی میرے پرچوں میں سے ایک پرچہ اٹھا کر لڑکے کے ہاتھ میرے اس دوست کے پاس بھیج دیا۔ وہ جواب لایا کہ کل کو جواب دوں گا۔ میں مولوی نصیر پر (اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ میری بے جا ڈانٹیں ہمیشہ سنیں) بہت خفا ہوا کہ تو نے مجھے بھی شرمندہ کیا انہیں بھی شرمندہ کیا، میں نے پہلے سے کہا تھا کہ اس غریب کے پاس کچھ نہیں ہے، اسے جواب دیتے ہوئے شرم آئی اور تو نے مجھے ذلیل کیا۔ دوسرے دن دوپہر کو وہ صاحب اپنا کھانا لے کر ساتھ کھانے کے واسطے آئے۔ کھانے کے بعد تخلیہ کیا اور ایک پرچہ لکھا ہوا مجھے دیا، جس میں لکھا تھا کہ ''پانچ ہزار روپے ایک سال کے لیے تو بڑی سہولت سے دے سکتا ہوں اور دس ہزار تک دو سال کے لیے معمولی سے وقت کے ساتھ اور پندرہ ہزار تین سال کے لیے ذرا زیادہ وقت ہے۔'' میں نے پہلی پیشکش قبول کر لی اور کہہ دیا کہ ۸ شوال کو پانچ ہزار لے لوں گا۔ میرا ایک اور دوست مخلص نوعمر لڑکا آیا اور یہ کہا کہ میرے پاس ایک ہزار کی رقم ہے جس کی نہ تو میرے ماں باپ کو خبر نہ میری بیوی کو، آپ جب کہیں لا دوں گا، ادا کرنے کی بالکل فکر نہیں۔ میرے پاس ان کے رکھنے کی جگہ بھی نہیں، پانچ سات برس میں جب میں بااختیار ہوں گا لے لوں گا، ابھی تو باپ کا دست نگر ہوں، جہاں کہیں سے کچھ ملتا رہتا ہے اسے جمع کرتا رہتا ہوں، رکھنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ میرے ایک اور مخلص دوست نے رمضان میں مجھ سے کہا کہ تو نے فلاں فلاں کو پرچے لکھے مجھے تو کہا ہی نہیں۔ میں نے کہا تیرے پاس کھانے کو تو ہے ہی نہیں، بے تکلفی تھی محبت تھی، یہی فقرہ میں نے کہا کہ تیرے پاس کھانے کو تو ہے نہیں تیرے پاس سے کیسے قرض مانگوں؟ اس نے کہا کہ میرے پاس بھی ایک ہزار روپے سب سے مخفی ہیں، میں کل صبح کو لاؤں گا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں، ۸ شوال کو لوں گا، میرے پاس رکھنے کی جگہ نہیں۔ اس نے کہا کہ رمضان میں خرچ کرنے کا بڑا ثواب ہے، میرے سے تو تم اللہ کے واسطے اور پاؤں پکڑ لیے کل کو ہی لے لو کہ رمضان ہے پر میرے ہی پاس امانت رکھوا دیجیو۔ میں نے کہا شوق سے لے آئے، چنانچہ وہ اگلے روز لایا اور پھر میرا قرض کر کے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔

اس سلسلے میں، میں اپنے محسنِ اعظم عالی جناب الحاج میر آل علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی ممنون ہوں، انہوں نے فرمایا اتنی سی بات کے لیے کیا پرچہ بازی کی ضرورت تھی، بیس پچیس ہزار تو میں اکیلا ہی دے دوں گا جب تجھے سہولت ہوا ادا کرتے رہنا۔ میں نے بہت ہی ان کا شکریہ بھی ادا کیا اور بہت ہی دعائیں بھی دیں اور ان سے کچھ نہیں لیا اور ان سے کہہ دیا کہ اب تو میری مطلوبہ رقم پوری ہو چکی اور میں ان سب کا احسان اٹھا چکا ہوں ان میں سے جس جس کی رقم کی ادئیگی کا وقت آتا رہے گا آپ سے مانگتا رہوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایسے ہی اپنے محسن متولی ریاض الاسلام کاندھلوی کا بھی اس میں شکر ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا، انہوں نے مجھے دس بارہ خط لکھے۔ میں نے سنا ہے کہ تیری بچیاں حج کو جا رہی ہیں، میری انتہائی تمنا ہے کہ تھوڑی سی شرکت میری اس میں قبول کرلے۔ میں نے بہت معذرت کی مگر وہ نہ مانے اور ان کے کئی احسان ان کے خوابوں کی بدولت پہلے اٹھا چکا تھا، اس لیے غالباً دو ہزار کی رقم یا اس سے کچھ زائد مرحوم نے بلا قرض عطا فرمائی جو میں نے سب حج کو جانے والیوں پر مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ وانعام کے علاوہ تقسیم کردی اور ان دونوں کے متعلق ان کو لکھ دیا کہ ان دونوں کا معاملہ آپ جانیں وہ جانیں میں اس میں کچھ دخل اثباتاً یا نفیاً نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ میر صاحب اور متولی صاحب اور میرے سارے ہی محسنوں کو ان کے احساناتِ جانی و مالی اور ہر نوع کے احسانات کا اپنی شایانِ شان بہترین بدلہ عطاء فرمائے:

گفتگو آئین درویشی نبود
ورنہ با تو ماجرا ہا داشتیم

اب تو چونکہ وقت نکل گیا۔ اس قسم کے قصوں میں تفریح کے سوا کچھ نہ رہا، ورنہ اس قسم کے تذکرے بھی پہلے صورت سوال اور بہت گراں ہوتے تھے، شاید میری جوانی میں میری یہ کہانیاں کسی نے سنی بھی نہ ہوں گی۔ اب تو اکثر تذکروں میں لطائف تحدیث بالنعمۃ کے طور پر آتے رہتے ہیں۔

عزیزو!...... تم نے کیا کیا پرانے مردے اکھڑوانے شروع کر دیے اگر علی گڑھ کا قیام کچھ لمبا ہو گیا تو نہ معلوم کیا کیا عجائب قدرت لوگوں کے کان میں پڑیں گے۔ اس حج کے متعلق ایک المناک واقعہ یہ ہے کہ میرے حضرت اقدس سیدی وسندی مولانا الحاج حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ اسی جہاز میں تشریف لے گئے جس میں میری بچیاں اور مولانا یوسف صاحب ومولانا انعام صاحب تھے۔ حضرت قدس سرہٗ نے حج سے واپسی پر مجھ سے کئی بار قلق سے فرمایا کہ مجھے جہاز میں بیٹھنے کے بعد معلوم ہوا کہ تیرا بھی خیال کچھ تھا، اگر مجھے واہمہ اور شبہ بھی ہو جاتا تو تجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قلق پر مجھے بھی بہت قلق

ہوا، میرے لیے عین سعادت تھی اور میرا یہ پختہ ارادہ بھی تھا اور رئیس الاحرار صاحب سے وعدہ بھی ہوگیا تھا کہ وہ اس سال ہوائی جہاز سے جا رہے تھے میرا ارادہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ چپکے سے ہوائی جہاز سے چلا جاؤں گا، لیکن مقدرات اٹل ہوتے ہیں، حضرت اقدس رائپوری سے ایک شب کے لیے نظام الدین جانے کی اجازت چاہی کہ وہاں کے حالات دیکھتا آؤں۔ حضرت نے یہ کہہ کر اجازت نہ دی کہ میری حالت تو یہ ہورہی ہے، میں رات کو اگر مرگیا تو میرے جنازے کی نماز کس طرح پڑھا سکے گا؟ یہی وہ زمانہ تھا جس کے متعلق اوپر لکھوا چکا ہوں کہ میں شام کے دوسرے گھنٹے میں حدیث پاک کا سبق پڑھا کر سیدھا بہٹ جاتا اور گانگرو والی کوٹھی میں عصر پڑھتا، جہاں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا مستقل قیام تھا چونکہ روز کا جانا ہوتا تھا اور علی الصباح آنا ہوتا تھا، اس زمانے کے لاری والے بھی ہندو مسلمان دونوں ہی رعایت کرتے تھے، بہٹ میں گاڑی نہیں روکتے تھے بعض مرتبہ سواریاں شور بھی مچاتیں مگر وہ بہٹ کے قریب جا کر اس تیزی سے نکلتے کہ مجھے گانگرو کے پل پر اتار کر واپس بہٹ آ کر سواریاں اتارتے مجھے بہت ہی ندامت ہوتی اور میں خوشامد بھی کرتا مگر وہ نہیں مانتے تھے اور یہ کہتے کہ ان کا دومنٹ میں کیا حرج ہوگا آپ تو نماز پڑھیں گے۔ اللہ ان سب کو بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ حضرت قدس سرہٗ کے اس فقرہ پر نہ صرف نظام الدین کا جانا ملتوی کیا بلکہ حجاز کے سفر کا ذکر زبان پر لانا بھی حضرت قدس سرہٗ کی گرانی کا سبب سمجھا۔ حضرت قدس سرہٗ کے اس مرض نے اتنا طول پکڑا کہ ڈاکٹر برکت علی صاحب مرحوم کے اصرار پر حضرت قدس سرہٗ کو بجائے بہٹ کے سہارنپور تشریف لانا پڑا اور کچھ زمانہ مدرسہ قدیم کے مہمان خانہ میں ڈاکٹر برکت علی صاحب کی تجویز سے قیام کیا۔ اس سال کی عید الاضحیٰ بھی مدرسہ قدیم کی مسجد میں پڑھی اور اپنے اس چند روز قیام کے حضرت قدس سرہٗ نے مدرسہ کے چندہ کے نام سے بہت بڑا کرایہ ادا کیا، جو حضرت قدس سرہٗ کے خدام کے لیے خاص طور سے سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ اس ناکارہ نے بہت عرض کیا کہ حضرت کا قیام مدرسہ کی ضرورت میں داخل ہے، مدرسہ کو حضرت کے قیام سے بہت زیادہ نفع ہے مگر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے منظور نہیں فرمایا، خود بھی چندہ کے نام سے کرایہ ادا کیا اور آنے والے مہمانوں سے بھی خاص طور سے تاکید کر کے چندہ دلوایا کہ حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے ان لوگوں کا بھی مدرسہ میں قیام ہوتا تھا، خاص طور سے پاکستان سے آنے والے مہمان سے بھی چندہ دلوایا۔

بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے، ابتداء میں تو یہ قصہ شادیوں میں شرکت سے نفرت اور جنازہ میں شرکت کے شوق سے چلا تھا۔

شادیوں میں شرکت سے نفرت بالخصوص تالیف بذل کے زمانے میں:

(ھ)...... مجھے شادیوں میں شرکت سے ہمیشہ نفرت رہی۔ کاندھلہ میں خاندان کا سب سے چھوٹا تھا، جب خاندانی بزرگوں میں سے کسی کا شادی میں شرکت کا خط آتا اس پر اظہار مسرت خوشی نہ معلوم کیا کیا لکھتا اور ظہر کے بعد وہ کارڈ حضرت کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کی عادت مبارک ایسے موقعہ میں بڑی عجیب لطیف قابلِ اقتداء تھی جب خدام میں سے کوئی اس قسم کا خط پیش کر دیتا یا زبانی تذکرہ کرتا، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ خط پڑھ کر یا بات سن کر ارشاد فرماتے۔ کیا رائے ہے؟ اگر وہ شخص (اجازت مانگنے والا) خوشی یا ضرورت کا اظہار کرتا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے، ہاں ہاں مناسب ہے ہو آؤ اور بخوشی اجازت دے دیتے اور اگر اس کی طرف سے بے اعتنائی دیکھتے تو حضرت بھی فرما دیتے کیا کرو گے؟ حرج ہوگا۔ مجھے بارہا اس قسم کے پرلطف قصے دیکھنے میں آئے۔ جب میں خط پیش کرتا تو حضرت نہایت تبسّم خندہ پیشانی سے دریافت فرماتے، کیا رائے ہے؟ میں عرض کرتا، حضرت! بذل کا بہت حرج ہو جائے گا، لیکن میں تو انکار نہیں کر سکتا، میرے اکابر خفا ہو جائیں گے۔ تو حضرت فرماتے انکار تو میں لکھوا دوں گا، چونکہ ڈاک بھی میں ہی لکھتا تھا تو میں عرض کرتا کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ انکار کا خط میں نہیں لکھوں گا، تو حضرت کسی دوسرے کو بلا کر جو اکثر حاجی مقبول صاحب ہوتے تھے لکھواتے تھے کہ عزیز موصوف کے آنے سے میرا بڑا حرج ہوگا، امید ہے کہ میری خاطر عزیز موصوف کی عدم حاضری کو معاف فرما دیں گے۔ پھر کس کی مجال تھی کہ لب کشائی کر سکتا اور ڈاک میں ہر دو (۲) خط میرا اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ساتھ پہنچتا تھا۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ خوب یاد آیا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ بھائی اکرام صاحب سے مجھے سارے خاندان میں انتہائی محبت رہی۔ اگرچہ اب مدرسہ نے اس پر کچھ پردہ ڈال رکھا ہے۔ میری والدہ کے حقیقی چچازاد بھائی میرے مخلص دوست ماموں حکیم محمد یامین صاحب جو آج کل مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں، ان کی شادی ۱۲ جمادی الاول ۵۰ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۳۱ء بروز جمعہ کیرانہ میں ہوئی۔ بعد عصر چچا جان نے نکاح پڑھایا۔ مہر کے سلسلے میں ایک لطیفہ پیش آیا کہ تائے سعید مرحوم مہتمم مدرسہ صولتیہ لڑکی کے باپ نے مہر فاطمی تجویز کیا اور جب قصبہ کے شرفاء نے اصرار کیا کہ مہر دس ہزار اور پانچ ہزار سے کم ہرگز نہ ہوگا تو تائے سعید مرحوم نے فرمایا کہ میری بیٹی حضرت فاطمہ سے بڑھ کر نہیں ہے مہر فاطمی ہوگا، چنانچہ اسی پر نکاح ہوا اور قصبہ کے رؤساء مولانا سعید سے ناراض ہو گئے اور کافی عرصہ تک کبیدہ خاطر رہے کہ لڑکی بوجھ رہی تھی جو ایک سو پچیس (۱۲۵) کے عوض چلتی کر دی۔

بھائی اکرام نے مجھے کاندھلہ سے ایک کارڈ لکھا، جس میں شروع میں تین شعر تھے جن میں سے صرف پہلا یاد رہ گیا:۔

میں نہیں جانتا قبلہ قبلی
بات ہے صاف بھائی شبلی

اگلے دو شعروں میں اس قسم کا مضمون تھا کہ ہمارے ساتھ آؤ، پلاؤ قورمہ وغیرہ ہمارے ساتھ کھاؤ۔ اس کے بعد یہ مضمون تھا کہ عزیز یامین کی شادی فلاں دن تجویز ہوئی ہے، علی الصباح کاندھلہ سے بارات جائے گی، میں اور فلاں، فلاں، ان پانچ چھ کے نام جن کا عید کے موقعہ پر لوئی کے سلسلہ میں نام گزر چکا، ایک جگہ بیٹھے ہیں، ہمارا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اگر اس میں شرکت کرنا چاہے گا تو بڑے سے بڑا عذر بھی تجھے مانع نہیں اور اگر تیرا جی نہیں چاہے گا تو ایک سے ایک بڑھ کر ایسا قوی عذر ہوگا جس کا جواب دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ ہماری تمنا، خواہش، استدعا یہ ہے کہ ایک رات کا احسان سب پر کردے۔ اگر تو منظور کرے تو آسان صورت یہ ہے کہ ساری بارات غالباً تیس چالیس بہلیاں تھیں، علی الصباح روانہ ہو جائیں گی اور ہماری دو گاڑیاں ریل کے وقت پر اسٹیشن پہنچ جائیں گی اور اسٹیشن سے تم کو لے کر سیدھے کیرانہ چلے جائیں گے۔ میں نے لکھا اور مجھے اپنا جواب بھی خوب یاد ہے کہ تم نے ایسا زوردار خط لکھ دیا کہ میرا بھی جی چاہ گیا۔ انشاء اللہ وقت مقرر پر کاندھلہ کے اسٹیشن پر اُتر کر سیدھا کیرانہ جاؤں گا۔ چنانچہ ساری بارات صبح کو ناشتہ کے بعد سے لے کر اٹکتی مٹکتی ظہر کے قریب کیرانہ پہنچی اور مجلس طعام کے منتہی پر ہم لوگ بھی پہنچ گئے۔ کھانے اور چائے اور بعد عصر تقریب نکاح میں شرکت کے بعد اگلے دن صبح بارات رخصت ہو کر کاندھلہ آئی۔ میں ایک ہی رات کی نیت سے گیا تھا۔ جب میں نے دو پہر کو واپسی کا ارادہ کیا تو میرے والد صاحب کے حقیقی ماموں مولانا رؤف الحسن صاحب نے مجھے بہت بُرے طریقہ سے ڈانٹا۔ مجھے ان کی ڈانٹ خوب یاد ہے اور فرمایا کہ آج ہرگز نہیں جا سکتا، کل کو ولیمہ سے فراغ پر جانا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میں حضرت سے ایک ہی رات کی اجازت لے کر آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کچھ مضائقہ نہیں، میں لکھ دوں گا، مجھے یہ جواب بالکل پسند نہیں آیا۔ اتفاق سے ماموں یامین کے بڑے حقیقی بھائی پروفیسر حافظ محمد عثمان صاحب جو اس زمانے میں علی گڑھ میں غالباً بارہ سو روپے تنخواہ پر ملازم تھے، وہ نکاح میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس لیے کہ کسی مجبوری سے چھٹی نہ مل سکی تھی۔ میں نے حضرت ماموں سے عرض کیا، اجی ان کے حقیقی بھائی تو نکاح میں بھی شریک نہ ہوئے اس کو تو آپ نے کچھ فرمایا نہیں، فرمانے لگے اور بہت غصے میں فرمایا کہ اس کی تو مجبوری تھی چھٹی نہ ملی، مجھے بھی چونکہ ان کے عتاب پر گرانی ہو رہی تھی، میں نے کہا کہ حضرت جی یہ تو کوئی

مجبوری نہ تھی استعفاء دے کر چلے آتے، اصل مجبوری تو میری ہے کہ میں حضرت سے کیا عرض کروں گا۔ اس پر ماموں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو غصہ تو بہت آیا مگر کچھ فرمایا نہیں اور میں عین گاڑی کے وقت ریل پر بھاگ آیا۔ اپنے معمول کے مطابق پہلے سے اس واسطے نہیں آیا کہ کبھی ماموں صاحب کو خبر ہوجائے اور وہ آدمی بھیج کر بلالیں۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہ حقیقی ماموں اور میری اہلیہ مرحومہ کے والد، مجھ سے اس قدر محبت تھی کہ میں واقعی بیان سے عاجز ہوں، ان کی شفقتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ بات میں بات نکلتی رہتی ہے ایک قصے پر دوسرا قصہ یاد آتا رہتا ہے۔ اگر علی گڑھ کے قیام میں کچھ وسیع وقت مل جائے تو ایک الف لیلۃ ولیلۃ میں بھی لکھوادوں۔

بندہ کا سفر مظفر نگر اور آموں کا قصہ:

حضرت مولانا الحاج رؤف الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یعنی میرے والد کے حقیقی ماموں اور ان کی پہلی اہلیہ مرحومہ جو میری خوش دامن تھی اور مرحوم کی دوسری اہلیہ، دونوں کا قیام مظفر نگر رہتا تھا اور ہمیشہ ہی دونوں کا شدید اصرار میری مظفر نگر حاضری کا رہا اور مجھے کبھی توفیق نہ ہوئی اللہ ہی معاف فرمائے اور تینوں مرحومین کو بہت ہی زیادہ بلند درجے ان کی محبت کے عطا فرمائے۔ ایک دفعہ میرے چچا جان قدس سرہٗ نے نظام الدین سے یہ لکھا کہ جھنجھانہ میں تبلیغی اجتماع ہے، فلاں گاڑی سے میں شاملی پہنچوں گا، تم بھی فلاں گاڑی سے شاملی پہنچ جاؤ، میں شاملی میں تمہارا انتظار کروں گا اور پھر جھنجھانہ کے تبلیغی اجتماع میں جانا ہے یہ جھنجھانہ تو ہمارا اجدادی وطن ہے ہی، عالی جناب الحاج محمد شفیع صاحب قریشی امیر جماعتِ تبلیغ پاکستان کا بھی وطن ہے، انہیں کی تحریک اور اصرار پر یہ اجتماع ہورہا تھا۔ جھنجھانہ سے واپسی پر سہارنپور آنا تھا اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو دہلی جانا تھا، ان کی تشریف بری ظہر کے وقت قرار پائی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ ماموں رؤف الحسن صاحب ہمیشہ مظفر نگر کا اصرار فرماتے ہیں، کبھی نوبت نہیں آتی، اگر کوئی صورت ایسی ہوجائے کہ میں صبح کو مظفر نگر چلا جاؤں اور دو (۲) بجے کی گاڑی سے سہارنپور۔ قریشی صاحب کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے انہوں نے میرے دو رفیقوں کے لیے مظفر نگر تک کار کا انتظام کردیا اور ماموں صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور ممانی صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ میری حاضری پر حد سے زیادہ مسرور کہ نہ معلوم کیا نعمت آگئی۔ تین گھنٹے میں نہ اس میں مبالغہ ہے نہ تصنع، بازار کی اور گھر کی میٹھی، نمکین، پھیکی اور ترش پھل اور شیرینیاں شاید پچاس کے قریب جمع کردی ہوں گی، مجھے دیکھ کر بہت ہی کلفت ہوئی، میں نے ممانی سے تیز لہجے میں کہا کہ ممانی اتنی چیزیں کوئی کھا بھی سکے گا۔ انہوں نے کہا کہ ساری عمر میں پہلی دفعہ تیری آمد ہوئی ہے وقت کم ملا میں تو اور بھی کچھ کرتی۔ میرے ساتھیوں کا کھانا باہر بھیج دیا گیا۔ میں اور ماموں صاحب، وہ سرہانے اور میں پائنتی اور ایک ایک رکابی میں پانچ پانچ

سالن ذرا ذرا سا اور ایک ایک رکابی پر دو دو رکابی رکھی ہوئی۔ کھانا شروع ہوا ماموں صاحب نے ایک لقمہ منہ میں رکھا اور دوسرا ہاتھ میں لیا اور جوتا پہن کر باہر چلے گئے، رنج اور قلق سے سناٹے میں رہ گیا کہ میری کس بدتمیزی پر ماموں صاحب کو غصہ آیا۔ میرا لقمہ بھی ہاتھ کے ہاتھ میں رہ گیا۔ میں نے ممانی سے پوچھا کہ ماموں کس بات پر خفا ہوگئے؟ مرحومہ نے بڑی شفقت سے یوں کہا، پیارے بچے روٹی کھالے، ناراض نہیں ہیں، تیرے ماموں کی ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ جب آموں کا موسم ختم ہوجاتا ہے تو آٹھ دس دن ان کی یہی فاقوں کی حالت رہتی ہے۔ آٹھ دن سے مظفر نگر میں آم کسی قیمت پر نہیں ملتا اور ان کے فاقے چل رہے ہیں اور یہ جو لقمہ منہ میں رکھ لیا یہ بھی دروازے پر جاکر تھوک دیا ہوگا، مرغی وغیرہ کھالے گی، ان کے حلق سے نہیں اُترا ہوگا۔ یہ سن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس لیے کہ میں اس زمانے کچھ آموں کا شوقین بھی نہیں تھا اور میرے نزدیک گوشت کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کے بغیر روٹی کھانا ناممکن ہو۔ میں ۴ بجے کی گاڑی سے سہارنپور پہنچ گیا، اسٹیشن سے مدرسہ تک اس زمانے میں میں سواری کا محتاج نہیں تھا، کبھی سواری نہیں لیتا تھا۔ گھر تک پہنچا ہی تھا کہ مولوی نصیر نے یوں کہا کہ ملیح آباد سے ایک بلٹی آموں کی آئی تھی، وصول تو کرلی کھولی نہیں۔ اس زمانے میں مظاہر علوم کے اندر مظفر نگر اور اس کے نواح کے طالب علم کئی پڑھتے تھے، میں نے سڑک ہی پر کھڑے کھڑے ایک آدمی دارالطلبہ بھیجا کہ کوئی طالب علم مظفر نگر جانے والا ہو تو آدھا کرایہ اور مدرسہ سے چھٹی میں ناظم صاحب سے خود دلوادوں گا، فوراً چلا آئے، ایک دم پانچ چھ بھاگ آئے، میں نے ایک ہوشیار سے لڑکے کو آموں کی ٹوکری حوالے کردی اور دونوں طرف کا کرایہ دے دیا، آدھے کا وعدہ تو اس مصلحت سے کیا تھا کہ مفت کرایہ پر بہت سے آجائیں گے۔ مگر آدھے پر کئی آگئے، میں نے ماموں صاحب کا پتہ بتلایا اور حضرت ناظم صاحب کی خدمت میں ایک پرچہ لکھ دیا کہ فلاں طالب علم کو اپنی ایک ضرورت کے لیے میں مظفر نگر بھیج رہا ہوں، کل دوپہر تک کی رخصت اس کی میری درخواست پر قبول فرمائیں۔

مغرب سے پہلے وہ لڑکا وہاں پہنچ گیا۔ وہاں کاندھلہ کے میرے ایک عزیز جو باغوں کے اور آموں کے دھنی اور دلدادہ تھے، ان کا باغ آموں کا بہت مشہور و معروف تھا اور نہ معلوم کتنی انواع ان کے باغ میں تھیں۔ وہ شام کو اتفاق سے ماموں صاحب کے مہمان تھے۔ سنا گیا ہے کہ وہ آم اس قدر لذیذ تھے کہ ماموں صاحب نے نہ کبھی اس جیسا آم کھایا تھا نہ ان کاندھلوی عزیز نے، دوسرے دن میرے ان عزیز مرحوم نے کاندھلہ جاکر اپنے ملازم کو صحیح تعداد میں مجھے تردد ہے کہ تین سو سے تو کم نہیں تھے اور پانچ سو سے زائد نہ تھے، روپے لے کر بھیجا کہ جس قسم کے آم تم نے کل مولانا رؤف الحسن صاحب کو بھیجے ہیں جس قیمت پر اور جتنے بھی مل سکتے ہوں میرے ملازم

کے ہاتھ بھیج دیں، میں نے اسی پرچہ کی پشت پر جب ہی جواب لکھ کر حوالہ کر دیا کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ وہ کیسے آم تھے مظفر نگر میں یہ واقعہ پیش آیا تھا، یہاں پہنچ کر مولوی نصیر نے ایک بلٹی کا ذکر کیا، میں نے بغیر کھولے وہ بلٹی مظفر نگر بھیج دی تھی، مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ کس قسم کے آم تھے۔ میرے نزدیک اس واقعہ کو اہمیت بھی نہ تھی۔

چچا جان کا یکشبانہ قیام کاندھلہ میں معمول:

میرا عموماً چھ مہینے، آٹھ مہینے میں ایک شب کے لیے کاندھلہ جانا ہوا کرتا تھا، کاندھلہ کے رؤساء میں جملہ قصباتی شرفاء کی طرح سے ہمیشہ پارٹی بازی زوروں پر رہتی، بالخصوص الیکشن کی مصیبت سے ہر موقعہ پر جا کر سن لیا کرتے تھے کہ آج کل فلاں فلاں میں چل رہی ہے، ہم بھی تفریحاً آپس کی لڑائیاں سُن آیا کرتے، مگر میرا اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ اپنی یک شبانہ حاضری میں جملہ اعزہ کے گھروں پر جا کر ان سے ایک ایک دو دو منٹ کے لیے ضرور ملتے تھے، اکثر اعزہ اس پر خفا بھی ہوتے تھے، زبان سے تو وہ یہ کہتے کہ ذرا سا وقت ہوتا ہے وہ بھی سب پھرنے میں خرچ ہو جاتا ہے اور اندر خانہ ان کو غصہ اس پر ہوتا کہ جب ہماری لڑائی ہے تو پھر یہ کیوں ملتے ہیں۔ مگر میرے اور چچا کے طرز معاشرت کو دیکھ کر اس عتاب کو علی الاعلان کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

غالباً آٹھ ماہ بعد میرا کاندھلہ جانا ہوا اور اپنی عادت کے موافق سب گھروں کو چکر لگایا۔ میرے محترم عزیز برادر معظم ماسٹر محمود الحسن کاندھلوی اس وقت کاندھلہ میں تھے، میرے ساتھ وہ بھی بادل ناخواستہ میری خاطر مٹرگشت میں چل دیے، جب میں اپنے ان عزیز کے پاس جن کے آموں کا قصہ اوپر آیا ہے۔ میں نے جا کر سلام کیا، انہوں نے منہ پھیر لیا، میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا مرحوم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ بھائی محمود کا اس وقت غصہ کے مارے چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، میں نے ایک مونڈھا کھینچا اور ان عزیزی کے قریب دو (۲) منٹ بیٹھ کر چلا آیا۔ انہوں نے میری طرف منہ نہیں کیا۔ جب وہاں سے واپس آ رہا تھا، بھائی محمود نے کہا بے غیرت بے حیا پھر بھی ان کے یہاں آئے گا، میں نے کہا ضرور آؤں گا۔ یہ ان کا فعل تھا جو انہوں نے کیا، وہ میرا فعل ہوگا جو میں کروں گا۔ ہمیں حدیث پاک میں ''صِلْ مَنْ قَطَعَکَ'' کا حکم دیا گیا ہے، مگر میں اندر اندر سوچتا رہا اور خوب سوچتا رہا کہ ان کی لڑائیاں تو آپس کی ہمیشہ کی تھیں، میرے ساتھ تو یہ برتاؤ کبھی نہیں ہوا۔ چند ہی منٹ میں سوچتے سوچتے مجھے وہ آموں والا قصہ یاد آ گیا تو میں نے بھائی محمود سے کہا کہ بھائی محمود خوب یاد آ گیا اور میں نے آموں والا قصہ سُنا کر یوں کہا کہ بھائی یہ معذور ہیں، ان کی عقل سے یہ بات اُونچی ہے کہ آدمی آموں کی بلٹی کو بغیر دیکھے بغیر کھولے چلتا کر دے۔

لڑائی کے بعد انتہاء تعلقات کا زور:

ان مرحوم کے ساتھ قصے تو کئی پیش آئے مگر مالک کا ایک عجیب احسان یہ بھی رہا کہ جس جس سے ابتداءً لڑائی رہی اُسی سے وہ تعلقات بڑھے کہ باید وشاید۔ یہ مرحوم عمر میں مجھ سے بڑے تھے، اخیر میں ان کا یہ اصرار رہا کہ تجھ ہی سے بیعت ہوں گا اور تیرے ہی پاس پڑ کر مروں گا، اتنا بڑھا کہ حد وحساب نہیں، بار بار خطوط لکھتے، آدمی بھیجتے، میں نے ان کو کئی دفعہ لکھا کہ میرے دو (۲) بزرگ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت رائے پوری حیات ہیں۔ سیاسی حیثیت سے حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے آپ کے خصوصی تعلقات بھی ہیں، ان دونوں میں سے جون سے کو آپ پسند کریں میں بیعت کے لیے خود لے کر چلوں گا، بیعت کراؤں گا، مگر موصوف نے ایک مان کر نہ دی اور اسی پر اصرار کرتے رہے کہ بیعت تو تجھ ہی سے ہونا ہے۔

اس سیہ کار کے ساتھ جس جس کا تعلق ابتداءً نفرت کا ہوا انتہا عشق ومحبت پر جا کر ختم ہوا۔ اسی وقت تیس چالیس نام دفعۃً ذہن میں آ گئے جو ساٹھ برس کی عمر میں اولاً مخالف اور انتہاء جانثار رہے۔ خوامخواہ ایک فضول مد شروع ہو گئی، مگر میں بھی خالی نہیں ہوں، دوستوں کی یاد کم از کم ان کے لیے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ تو ہے ہی۔ پڑھنے والوں سے بھی بہت اصرار سے میری درخواست ہے کہ میرے ان اکابر اور دوستوں کو جن کے قصے آپ اس رسالہ میں پڑھیں یا سنیں دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب سے فراموش نہ کریں۔ مجھ پر احسان ہوگا۔

دوسرا حادثہ والدہ مرحومہ کا انتقال:

(۲)...... میری زندگی کا سب سے اہم اور پہلا واقعہ میرے والد صاحب کے انتقال کا تھا، جو نمبر ا میں لکھا گیا اور میرے والد کے انتقال کے دن ہی سے میری والدہ مرحومہ نور اللہ مرقدہا، اعلی اللہ مراتبہا کو بخار شروع ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں تپ دق کی طرف منتقل ہو گیا اور دس ماہ چند ایام بعد ۲۵ رمضان المبارک شبِ قدر میں عین تراویح کے وقت ان کا وصال ہو گیا۔ اس رمضان میں یہ ناکارہ حکیم محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مسجد میں ان کے شدید اصرار پر تراویح پڑھاتا تھا۔ حکیم صاحب مرحوم کو بھی شوق تھا کہ جلدی سے فراغت ہو جائے۔ وہ معذور و بیمار اور مجھے بھی شوق کہ جلدی سے فارغ ہو کر دار الطلبہ میں حضرت قدس سرہٗ کے پیچھے جا کر بہ نیت نوافل حضرت کا قرآن سنوں اور دار الطلبہ کی مسجد سے آدھ گھنٹہ قبل حکیم جی کی مسجد میں نماز شروع ہوتی تھی۔ میری جلد بازی اور حضرت قدس سرہٗ کا وقار واطمینان۔ میں اپنی مسجد سے فارغ ہو کر حضرت کے یہاں دوسری یا تیسری رکعت میں شریک ہو جایا کرتا تھا۔ حادثہ کی رات میں میری والدہ مرحومہ پر کوئی

خاص تغیر نہ تھا، مگر جب انہوں نے افطار کے بعد شدید اصرار سب پر کیا کہ روٹی جلدی کھائیں۔ جب میں حکیم جی کی مسجد میں پہنچا تو حکیم صاحب نے فرمایا کہ آج صرف آدھا پارہ پڑھنا ہے۔ میں نے کہا کیوں؟ انہوں نے ڈانٹ دیا کہ چل چل جلدی پڑھا اور جلدی سے تراویح ختم کرا کر یوں کہا کہ سیدھے دارالطلبہ نہ جانا، والدہ کی خیر خبر لے کر جانا۔ مجھے اس وقت تک کوئی واہمہ بھی اس قسم کا نہ تھا۔ میں جب گھر پہنچا تو میری والدہ مرحومہ کو نزع شروع ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تو اللہ کے یہاں پہنچ گئیں اور میں دارالطلبہ حاضر ہوا، حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ ''حضرت والدہ کا انتقال ہو گیا۔'' میرے حضرت قدس سرہٗ کو مجھ سے جتنی محبت تھی، اس کو دیکھنے والا اب کوئی نہیں رہا۔ میری چھوٹی اولادیں میں جب بھی کسی کا انتقال ہوتا اور میں حسبِ معمول بذل لکھنے بیٹھ جاتا۔ حضرت مجھے گھر جانے کا تقاضہ کرتے۔ میں عرض کرتا کہ حضرت میں جا کر کیا کروں گا، عزیزان، مولوی حکیم ایوب، مولوی نصیر میرے یہاں کے ہر کام کے ذمہ دار تھے۔ عرض کرتا کہ حضرت! ایوب و نصیر دفن کرا آئیں گے، میرے جانے میں بذل کا حرج ہوگا، لیکن کئی مرتبہ یہ نوبت آئی کہ میری درخواست پر املاء شروع کرایا اور ایک دو سطر لکھوا کر یوں فرما کر اُٹھ گئے کہ مجھ سے تو نہیں لکھوایا جاتا۔ بہر حال جب میں نے اپنی والدہ کے انتقال کا حال عرض کیا تو ایک سناٹا سا رہ گیا اور حضرت پر مکمل سکوت۔ میں نے دو منٹ بعد عرض کیا کہ ''حضرت نماز جنازہ کی تمنا تھی، مگر حضرت تو اعتکاف میں ہیں۔'' حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ پیشاب تو قبضہ کی چیز ہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کا دستور یہ تھا کہ تراویح کے بعد دس پندرہ منٹ خدام کے پاس بیٹھتے، پھر پیشاب کرتے پھر وضو فرماتے، پھر مسجد میں واپس جا کر آرام فرماتے۔ اس رات کو حضرت پیشاب کے لیے نہیں اُٹھے اور جب میں گھر واپس آیا تو تقریباً غسل وغیرہ سے فراغت ہو چکی تھی، کفن میں بھی میں نے لمبا کام نہیں کیا، مختصر سا کفن تھا، جو گھر میں کپڑے موجود تھے پہنا کر اور اوپر وہی سیاہ چادر جو ہر وقت میں اوڑھا کرتا تھا نعش پر ڈال دی۔ حضرت باہر تشریف لائے پیشاب و وضو کیا، نماز جنازہ پڑھائی اور واپس مسجد میں تشریف لے گئے اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ قبرستان چلا گیا۔ میرے دوستوں نے جو مدرسہ کے طلبہ بھی تھے گورکن کو پرے ہٹا کر آدھ گھنٹے میں ایسی بہترین قبر تیار کی جو سنت کے بالکل موافق تھی اور جنازہ کی نماز سے لے کر تدفین سے فراغ پر سوا گھنٹے میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ اگلے دن میں نے بہت مخصوص لوگوں کو خط لکھوائے کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا، رمضان میں ہرگز آنے کا ارادہ نہ کریں، دعائے مغفرت ایصالِ ثواب سے مجھے مسرور فرمائیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کا بہت جی خوش ہوا ہوگا کہ رمضان میں سفر بہت مشکل ہوتا ہے، میری قریبی رشتہ دار بھی رمضان کے بعد آئے۔

پہلی اہلیہ کا انتقال اور بندہ کے نکاح ثانی کی تحریک:

(۳)......اس کے بعد میرے خانگی واقعات میں میری پہلی اہلیہ مرحومہ کا انتقال ہے۔ یعنی عزیزانِ ہارون، زبیر، شاہد کی نانی۔ یہ میری پہلی اہلیہ مرحومہ ہے۔ اس کا انتقال زچگی کی حالت میں ہوا کہ آخری بچی صفیہ ۲۴ ذیقعدہ ۵۵ھ کو مغرب کے قریب پیدا ہوئی اور اسی وقت کے احتباس نفاس ہو گیا اور ۵ ذی الحجہ ۵۵ھ بدھ کی شب میں مغرب عشاء کے درمیان میں انتقال ہوا۔ جس کی شادی کا قصہ آئندہ شادیوں کے ذیل میں آرہا ہے۔ بچی پچپن دن زندہ رہی، جس کو اس کی بڑی بہنوں اور والدۂ طلحہ جو اس وقت تک میرے نکاح میں نہیں تھی نے پرورش کیا۔ پھر وہ بھی ۲۱ محرم ۵۶ھ کو اپنی ماں سے جاملی اور اس کے قریب ہی دفن ہوئی اور میں نے اپنی عادت کے موافق اگلے دن اطلاعی کارڈ لکھ دیے کہ یہاں کی آمدورفت میں جتنا کرایہ اور وقت خرچ ہو اس کا صدقہ اور تلاوت کا ایصالِ ثواب کر کے اطلاع دیں۔

میری اسی اہلیہ کے انتقال کا بھی عجیب واقعہ ہے۔ آخری بچی پیدا ہوئی تھی اور احتباس نفاس شروع ہو گیا۔ مجھے اپنی بے حسی سے کچھ احساس نہ ہوا۔ عزیزم حکیم یعقوب صاحب علاج کرتے رہے، اپنے بڑوں کے مشورے سے۔ مگر دو ہی دن بعد میرے مکان کے متصل مکان جواب گارڈہ بورڈنگ کے نام سے مشہور ہے اس میں ایک مسلمان ڈاکٹرنی عباسیہ بہت ہی مشہور ڈاکٹرنی تھی، سہارنپور کے مسلمانوں میں اس کا علاج بہت ہی مشہور و معروف تھا اور یہ مکان بھی ذاتی اس کا خرید تھا۔ ۴۷ء کے ہنگامے میں وہ پاکستان چلی گئی تھی۔ روانگی کے وقت وہ اپنا یہ مکان بہت ہی کم قیمت یعنی پانچ ہزار روپے پر گویا مجھے مفت دینا چاہتی تھی، بہت ہی اصرار کیا، اللہ اسے بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میں کسٹوڈین کے جھگڑے میں کہاں پھنسوں گا۔ ہر چند مجھے مولوی نصیر نے اللہ ان کو جزائے خیر دے انہوں نے اور دوسروں نے بہت اصرار کیا کہ مقدمہ سے تو ہم نمٹ لیں گے تو قبول کر لے۔ مگر اس زمانے میں تو ساری ہی دنیا زاهد الی الله منقطع عن الدنیا ہو رہی تھی، مجھے اپنا موجودہ ذاتی مکان ہی وبال معلوم ہو رہا تھا، اس لیے شدت سے انکار کر دیا۔ اس ڈاکٹرنی کو میرے گھر والوں سے بھی خصوصی تعلق ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر عطا فرمائے وہ ڈاکٹرنی بہت اہتمام سے کئی کئی بار آتی، خود اپنے ہاتھ سے عمل علاج کرتی، دوائیں پلاتی، شرمگاہ میں دوا رکھتی، انجکشن لگاتی، انتقال کے دن مورخہ ۴ ذی الحجہ ۵۵ھ کی صبح کو اس نے یہ کہا کہ میری دوائیں تو کارگر نہیں ہو رہی ہیں، اسے سرکاری شفاخانے میں لے جانے کی یا تو مجھے اجازت دیں، ورنہ وہاں کی نرسوں کو بلائیں، میں مرض سمجھا دوں گی اور وہ دوائیں لا دیں گے۔ دوسری صورت پر عمل کیا گیا دو نرسیں آئیں، بہت غور خوض سے انہوں نے

دیکھا، عباسیہ ڈاکٹرنی سے بھی مشورہ ہوا اور مجھ سے مریضہ سے دور جا کر یہ کہا کہ مریضہ کو تو اس کی ہوا بھی نہ لگے۔ اگر ان انجکشنوں کے بعد ۶ گھنٹے تک مریضہ زندہ رہی تو زندگی کی امید ہے ورنہ آخری وقت ہے۔ اس پر مجھے بھی فکر ہوا، میں مغرب کی نماز پڑھ کر خلافِ عادت مرحومہ کے پاس جا کر بیٹھا۔ اس نے کہا تم اپنا حرج کیوں کرتے ہو؟ اپنا کام کرلو۔ میں نے کہا کہ نہیں حرج نہیں ہے، تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔ غالباً میری خلافِ عادت بیٹھنے سے مرحومہ کو شبہ ہوا۔ تو اس نے کہا ''اچھا میری تجہیز و تکفین کا سامان کردو۔'' میں نے جبری تبسم پیدا کر کے بہت اہتمام سے کہا کہ وہ تو نمٹنے کے بعد ہوا کرے پہلے نہیں ہوا کرتا۔ اس نے کہا اچھا ایک بات کہوں تم نے لڑکیوں کا نکاح تو کھڑے کھڑے بے اطلاع کر دیا۔ اس کی مراد مولانا یوسف مرحوم اور مولانا انعام صاحب کی شادیاں تھیں جس کا عجیب قصہ انشاء اللہ ان اوراق ہی میں آجائے گا۔ مرحومہ نے کہا کہ ان کی شادیاں تو تم نے کھڑے کھڑے بغیر کسی اطلاع کے کر دیں، رخصتی میں کوئی کپڑا زیور وغیرہ ضرور دے دیجیو، کبھی ننگی ہی چلتی کردو۔ میں نے کہا لاحول ولا قوۃ اور بہت زور سے تین دفعہ لاحول پڑھی اور اس سے کہا کہ اللہ کی بندی بیماری میں اس قسم کے خیالات پاس نہیں آنے دیا کرتے توبہ توبہ توبہ۔ اس نے کہا کہ اچھا تو پھر کچھ پڑھ کر سناؤ، میں نے کہا یہ کام کی بات کہی۔ چونکہ جنات کا بھی اثر سمجھا جا رہا تھا اس لیے سورۂ یٰسین تو ابتداءً نہیں پڑھی، پہلے سورۂ جن پڑھی پھر منزل پڑھی، پھر یٰسین پڑھی اور یٰسین پڑھتے پڑھتے اس کا سانس آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔ میری یٰسین سے پہلے وہ ختم ہوگئی۔ شب ہی میں نے تجہیز و تکفین ہوگئی تھی صبح کی نماز پڑھتے ہی گھنٹہ بھر میں تدفین ہو گئی، میرے حضرت رائپوری قبرستان تشریف لے گئے۔ قبرستان سے واپسی پر مجھے خوب یاد ہے اور میرے حضرتِ اقدس رائپوری قدس سرہٗ تو اس فقرہ کو شاید پچاسوں دفعہ سے زائد دوہرا چکے ہوں گے۔ میں نے مولوی نصیر صاحب سے کہا (مہمان زیادہ جمع ہو چکے تھے) نصیر پیارے مرنے جینے کے قصے تو ہر وقت کے ہیں دیکھ حضرت نے چائے نہیں پی۔ پچیس تیس آدمیوں کی تو جلدی بنالا۔ پھر پانی کو کہتا آ کہ رکھتے ہیں، جب تک بھی سلسلہ چلے اور مطبخ میں دو دیگ پلاؤ کے واسطے جب ہی میں نے پرچہ بھیجا۔ حضرتِ اقدس رائپوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرمانے لگے، ''حضرت کے یہاں رنج وغم کا تو دروازہ کھلتا ہی نہیں۔ یہ حادثہ بھی جشن ہی بن گیا۔'' مرحومہ کے انتقال کے بعد فوراً ہی ارجنٹ تار مظفرنگر مرحومہ کے والد، اپنے باپ کے حقیقی ماموں مولانا رؤف الحسن صاحب کو دے دیا کہ فوراً آؤ۔ وہ گھبرا گئے۔ صبح کی نماز سے پہلے ہی ریل سے پہنچ گئے۔ مجھے خوب یاد ہے۔ بڑا ہی ان پر رشک بھی آیا، بڑی دعائیں بھی میں نے ان کو اس وقت دیں اور بعد میں بھی دیں کہ محبت اس کو کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی بچی کو سپردِ خاک کر کے قبرستان سے واپس آرہے تھے تو

میرے چچا جان سے راستے میں کہا کہ "عزیز القدر زکریا ابھی بچہ ہی ہے اس کی دوسری شادی میں دیر نہ کرنا۔ جلد کسی جگہ سوچ کر مجھے اطلاع کرو میں وہاں اس کے نکاح کی تحریک کروں گا۔"

مرحومہ کے انتقال کے بعد میں اپنے مشاغلِ علمیہ کی وجہ سے بالکل ہی یہ طے کر چکا تھا کہ دوسرا نکاح نہیں کروں گا کہ بڑا احرج ہوگا۔ اس مرحومہ کے انتقال کے بعد بلا مبالغہ پچیس تیس اہم جگہوں سے اس سیہ کار کی شادی پر اصرار آئے اور بہت ہی دینی اور دنیوی جگہوں سے مطالبے ہوئے۔ میرے دو شیخ، حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ اور حضرتِ اقدس رائپوری قدس سرہٗ کو بھی لوگوں نے سفارشی بنایا۔ ایک مرتبہ حضرتِ اقدس رائپوری عین صبح کے وقت تشریف لائے اور فرمایا کہ حضرت بہت ہی مجبور کیا گیا ہوں۔ ہر چند میں نے ان صاحب سے معذرت بھی کی شیخ کا ارادہ تو نکاح کا ہے نہیں۔ مگر انہوں نے میرے پاؤں پکڑ لیے، مجھے مجبور کر دیا۔ یہ اپنی لڑکی کا نکاح آپ سے کرنا چاہتے ہیں، بڑی جائیداد کے مالک اور ساری جائداد اگر آپ قبول کریں تب تو آپ کے نام کر دیں، ورنہ لڑکی کے نام۔ میں نے عرض کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرا تو ارادہ شادی کا نہیں ہے۔ فرمایا مجھے تو معلوم تھا، میں نے ان صاحب سے بہت انکار کیا مگر انہوں نے بہت اصرار کیا اس لیے حاضر ہوا۔

میری چچا زاد بہن والدۂ طلحہ سلمہٗ کی منگنی دوسری جگہ ہو چکی تھی، وہاں شادی کی تیاریاں بھی تھیں۔ حافظ محمد حسین صاحب اجراڑوی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے خادم، میرے حضرت قدس سرہٗ کے رمضان کے سامع، میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے خاص دوستوں میں، اکثر نظام الدین جاتے ایک ایک دو دو ماہ قیام کرتے، کسی وقت میں چچا جان نے ان سے درخواست کی ہوگی کہ ہمشیرۂ یوسف کے لیے صالح خاوند چاہیے۔ اہلیۂ مرحومہ کے حادثۂ انتقال کے بعد حافظ محمد حسین نے اجراڑہ سے چچا جان کو پیام بھیجا کہ "ہمشیرۂ یوسف کے لیے صالح خالی ہو گیا ہے جا کر اس سے نکاح کر دو۔" میرے چچا جان کے ذہن میں پہلے سے نہیں تھا اس لیے کہ اس کی منگنی دوسری جگہ طے شدہ تھی تیاری بھی مکمل تھی۔ میرے چچا جان قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اس پیام پر دہلی سے سیدھے اول کاندھلہ تشریف لائے اور والدۂ طلحہ کے سابقہ مجوزہ شوہر کے والد کے پاؤں پکڑ لیے اور عرض کیا کہ "لڑکی تو میں آپ کو دے چکا مگر میرے بھتیجے کا جو حادثہ پیش آیا اس کے بعد میری عاجزانہ درخواست آپ سے یہ ہے کہ آپ اپنی اس بچی کو بجائے اپنے صاحبزادے کے عزیز زکریا کو دے دیں تو مجھ پر احسان ہے کہ وہ بھی آپ ہی کا بچہ ہے۔" ماموں صاحب چچا جان کی گفتگو سن کر آبدیدہ ہو گئے اور یوں کہا کہ "میری تمنا تو یہ تھی کہ مولانا اسماعیل صاحب (میرے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ) کی اولاد میں میری اولاد کا بھی کہیں پیوند لگ جاتا، مگر تم نے جو مجبوری اور ضرورت بتلائی وہ تو یقیناً میری بھی ضرورت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔" اس کے بعد چچا جان سہارنپور

تشریف لائے اور اس سیہ کار سے اپنی خواہش اور ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ’’جناب کو تو معلوم ہے کہ میرا بالکل نکاح کا ارادہ نہیں، لیکن جناب کا اگر حکم ہے تو میں کیا انکار کر سکتا ہوں؟ نکاح پڑھ دیجئے۔‘‘ چچا جان نے فرمایا کہ ابھی نہیں مجھے مشغولی ہے دو چار دن بعد دیکھا جائے گا۔ میں نے عرض کیا۔ ’’نکاح پڑھنے میں کتنی دیر لگتی ہے تین چار منٹ لگیں گے، لڑکے موجود ہیں پڑھ دیجئے۔‘‘ چچا جان نے فرمایا ابھی لڑکی سے استیمار نہیں ہوا، تغیر زوج کا اس کو علم نہیں ہوا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ پہلے لڑکی کے خسر اور تم سے نمٹ لوں اور پھر یوسف کی والدہ ہمشیرہ سے ذکر کروں گا۔ میں نے عرض کیا ’’بہت اچھا۔‘‘ اس شادی کی دلچسپ داستان تو شادیوں کے سلسلے میں آئے گی۔ اس وقت تو تعزیت چل رہی تھی۔

عزیز طلحہ کے بڑے بھائی کے انتقال پر چچا جان کے علمی مراسلہ:

میری اس اہلیہ سے ایک لڑکا عزیز طلحہ کا بڑا بھائی سب سے پہلے پیدا ہوا، نظام الدین ہی میں پیدا ہوا، چند ماہ بعد وہیں انتقال ہو گیا، مجھے اس معصوم کے دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ اس وقت تو اس کے انتقال کا قصہ لکھنا تھا۔ اس کے انتقال کی اطلاع چچا جان کے کارڈ سے ہوئی۔ ۹ بجے ڈاک آتی تھی، میں بذل لکھ رہا تھا، حضرت املاء کرا رہے تھے، اتنے حضرت قدس سرہٗ اپنی ڈاک اجمالاً چند منٹ میں یہ دیکھا کرتے تھے کہ کوئی ضروری خط تو نہیں، اتنے میں بھی جلدی جلدی اپنی ڈاک کا ضروری خط دیکھ لیتا۔ چچا جان کے اس کارڈ کو میں نے الگ رکھ لیا، جب حضرت اپنی ڈاک ملاحظہ فرما چکے تو یہ کارڈ میں نے حضرت کی تپائی پر رکھ دیا اور قلم دوات لے کر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ حضرت نے خط ملاحظہ فرمانے کے بعد نہایت لڑکھڑائی ہوئی آواز میں ایک جملہ لکھوانا شروع کیا جو پورا نہ ہو سکا اور یہ فرما کر اٹھ کر تشریف لے گئے کہ ’’مجھ سے تو نہیں لکھوایا جاتا۔‘‘ میں اس زمانے میں مدرسہ کے کتب خانہ ہی میں حضرت کی تشریف بری کے بعد اپنا کام کیا کرتا تھا اور وہی شذرات لکھا کرتا تھا جس کا ذکر پہلے گزر چکا۔ ظہر کے وقت اٹھتا، بھاگتے دوڑتے کبھی ظہر کے بعد روٹی کھاتا، پھر مدرسہ کے سبق میں چلا جاتا یا حضرت کی ڈاک میں۔ ظہر کے وقت کارڈ گھر بھیج دیا، معلوم نہیں کوئی سی بچی روئی یا نہیں روئی۔ اگلے دن ڈاک میں عزیز مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا نہایت ہی رنج و غم اور قلق و اضطراب سے لبریز خط پہنچا، جس میں اپنی بہت زیادہ بے چینی اور رنج کا اظہار تھا۔ میں نے اس کا نہایت تفریحانہ جواب دیا۔ اس زمانے میں میرا خطوط لکھنے کا وقت رات کے بارہ بجے کے بعد شروع ہوتا تھا تاکہ جتنا وقت اس میں خرچ ہو وہ سونے کے اوقات میں سے کٹوتی ہو جائے، کام کے اوقات میں سے ضائع نہ ہو۔ میں نے رات بارہ بجے سے خوب تنبیہی تفریحی خط عزیز یوسف مرحوم کو لکھا۔ یاد پڑتا ہے کہ اس کی

ابتداءاس شعر سے تھی:

عشق با مردہ نباشد پائیدار — عشق را باحی و با قیوم دار

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھ تو ہوتا ہے کیا

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ اس وقت اچھی طرح یادنہیں کیا ہے؟ میرے چچا جان نے یہ خط پڑھ لیا۔ مجھے نہایت عتاب کا خط لکھا، حوادث پر ایسے خطوط ہرگز نہیں لکھا کرتے جن سے جرأت، بیبا کی، حوادث سے عدم تأثر معلوم ہوتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ خوب ڈانٹا۔ میں تو اپنے سارے اکابر کی شان میں ہمیشہ ہی گستاخ رہا۔ میں نے چچا جان کی خدمت میں یہ لکھا کہ ''امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو ترجمۃ الباب باندھے ہیں: اول ''باب من جلس عند المصيبة يعرف فيه الحزن'' اور دوسرا ''باب من لم يظهر حزنه عند المصيبة'' ۔جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ کا قصہ لکھا کہ ان کا چھوٹا بچہ سخت علیل تھا، جب اس کا انتقال ہوگیا، باپ نے پوچھا، بچہ کیسا ہے؟، ماں نے کہا آج تو بالکل راحت سے ہے۔ کپڑے پہنے، کھانا وغیرہ تیار کیا، خوشبو لگائی، جو مختلف روایات میں وارد ہوا ہے۔ خاوند نے ان کو سچا سمجھا۔ کھانا بھی کھایا، پھر صحبت بھی کی۔ جب خاوند نماز کو جانے لگے تو بیوی نے کہا بچہ کا انتقال ہوگیا ہے نماز کے بعد اس کو دفن کر دیں۔ خاوند نے صبح کو یہ قصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صحبت بھی کی تھی، انہوں نے اقرار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری اس رات میں اللہ برکت فرمائیں گے اور برکت کی دعا دی۔ چنانچہ اس رات کی صحبت سے ایک صاحبزادے عبداللہ پیدا ہوئے اور ان کے نولڑکے پیدا ہوئے جو سب حافظ قرآن ہوئے۔ چچا جان نوراللہ مرقدہٗ نے لکھا کہ پہلا باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل ہے اور دوسرا صحابیہ کا۔ میں نے لکھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل رأفت وشفقت علی الامۃ ہے، اس کو میرے شیخ نے پورا کر دیا کیونکہ وہ یہ کہہ کر اٹھ گئے تھے کہ مجھ سے نہیں لکھوایا جاتا اور دوسرے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی۔ چچا جان نے پھر مجھے ایک ڈانٹ کا خط لکھ دیا۔ اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، والد صاحب کے بعد وہ میری تربیت کا اپنے آپ کو مستقل ذمہ دار سمجھتے تھے۔ میرا دل تو چاہا کہ ان کے کارڈ کا بھی جواب لکھوں مگر ڈر کے مارے نہیں لکھا کہ وہ مزید ناراض نہ ہوں۔ میرے چچا جان قدس سرہٗ میری اصلاح وتربیت کے لیے بعض مرتبہ معمولی سی بات پر زیادہ ناراض ہوجایا کرتے تھے اور تو کسی کی پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی مگر ایک دو مرتبہ حضرت رائپوری قدس سرہٗ کے سامنے جب اس قسم کا واقعہ پیش آیا اور حضرت نے تنہائی میں چچا جان سے پوچھا کہ حضرت یہ تو کوئی اتنی ناراضی کی بات نہ تھی تو حضرت چچا جان یہ فرماتے کہ حضرت! آخر میں چچا بھی تو ہوں۔

میری اہلیہ مرحومہ سے بارہ اولادیں ہوئیں، چار لڑکے جو شیر خواری میں چل دیے آٹھ لڑکیاں جن میں تین تو شیر خواری میں گئیں اور دو عروسی کے بعد۔

چوتھا حادثہ میرے چچا کا انتقال:

(۴)...... میرے اکابر کے حوادث کا سلسلہ تو بہت وسیع ہے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اور ان کے اجل خلفاء۔ مگر میں یہاں اس وقت چند نمونے خانگی کے لکھوا رہا ہوں۔

جب میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا ۲۱ رجب ۶۳ھ مطابق ۱۳ جولائی ۴۴ء بروز پنجشنبہ بوقت اذانِ صبح وصال ہوا تو میں نظام الدین میں تھا۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے وصال پر ایک مشترک کارڈ حضرت ناظم صاحب، مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مولانا اسعد اللہ صاحب کے نام لکھا کہ آپ حضرات میں سے کوئی نظام الدین تکلیف فرمانے کا ارادہ نہ کریں۔ میں خود ہی کل یا پرسوں حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں اور جب میں نے یہ لکھ دیا کہ میں خود ہی حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں تب کون ارادہ کرتا؟ اور یہ لفظ میں نے قصداً جان کر لکھا تھا کہ جب ان حضرات کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک دو دن میں آنے کا ارادہ کر رہا ہے تو پھر کوئی نہیں آئے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک تحریر اپنے مشہور و معروف مضمون کی لکھوا کر مدرسہ کے بورڈ پر لگوادی۔ نیز میرے نظریے اور مضمون کی روشنی میں نظام الدین کے حضرات کی طرف سے آفاقِ عالم میں مختصر اور مفصل خطوط بھیجے گئے کہ نظام الدین میں آنا محض رسمی تعزیت ہے۔ اصل تعزیت وہ کام ہے اور اس میں ہم لوگوں کا ہاتھ بٹانا ہے جس میں چچا جان تشریف لے گئے۔ اس کا اللہ کے فضل سے بہت اچھا اثر ہوا کہ اتنی کثرت سے جماعتیں نکلیں کہ حضرت چچا جان کی حیات میں بیک وقت اتنی نہ نکلی تھیں۔

حادثہ بڑی لڑکی کا انتقال:

(۵)...... جن دو (۲) لڑکیوں کی عروسی کے بعد انتقال ہوا، ان میں سے پہلی اور سب سے بڑی لڑکی والدۂ مرحومہ عزیز ہارون سلمہٗ ہے۔ اس کی موت کا قصہ میں اپنے کسی رسالہ میں لکھ چکا ہوں کہ کئی سال تپ دق میں بیمار رہ کر ۲۹ شوال ۶۶ھ مطابق ۱۵ استمبر ۴۷ء کو مغرب کی نماز کے سجدہ میں انتقال ہو گیا، جب کہ وہ اشارے سے سجدہ کر رہی تھیں۔

حادثہ انتقال دوسری لڑکی شاکرہ:

(۶)...... اس کے علاوہ دوسری لڑکی شاکرہ مرحومہ کا انتقال ۱۲، رجب دوشنبہ ۶۹ھ مطابق یکم مئی ۵۰ء کو ہوا۔ وہ بھی مرحومہ ایک بڑے رنج اور اور صدمہ کا شکار ہو کر تپ دق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ مگر اللہ نے صبر و شکر اتنا عطا فرمایا تھا کہ اس نے اپنی کسی بہن پر بھی کبھی رنج و قلق کا اظہار نہ کیا۔ اللہ

تعالیٰ کا شکر ہر وقت ادا کرتی تھی اور اپنے نام کا حق ادا کر گئی۔ جس حادثہ میں اس کی موت ہوئی اس حادثہ کے بعد اس نے بچیوں کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا تھا اور سارے دن اسی میں مشغول رہتی۔ تپ دق کی حالت میں بھی پڑے پڑے بچیوں کو بڑے اہتمام سے محنت اور محبت کے ساتھ پڑھایا کرتی تھی۔ اتفاق سے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سہارنپور آئے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ گھر گیا تو مرحومہ نے یٰس پڑھنے کی فرمائش کی۔ مولانا یوسف صاحب نے پڑھی اور جب ''سَلَامٌ قَوْلاً مِنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ'' پر پہنچے تو نہ معلوم مولانا یوسف صاحب مرحوم پر ایک جذبہ اور جوش آیا اور اس آیت شریفہ کو تین بار پڑھا۔ تیسری کے درمیان میں میری مرحومہ بچی کی رُوح پرواز کر گئی۔

میں نے اس مرحومہ کے انتقال کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی، نوعمر بچی تھی۔ کوئی خاص امتیازی شہرت نہ تھی۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب دو ہفتہ کے اندر اندر میرے پاس دو سو سے کہیں زیادہ کارڈ پہنچے، مضمون مشترک سب کا مختلف الفاظ کے ساتھ ایک تھا۔ ''حضرت! صاحبزادی صاحبہ کے انتقال کا حال فلاں سے معلوم ہوا۔ حاضری کو طبیعت بے چین ہے۔ مگر چونکہ حضرت والا کا اصول پہلے سے معلوم تھا اس لیے سہارنپور آمد و رفت کا اتنا کرایہ اور آمد و رفت کے دو دن میں اتنی تلاوت ہوسکتی تھی، پیسوں کا صدقہ اور تلاوت کا ایصالِ ثواب کر کے جناب کی خدمت میں اطلاعی کارڈ ارسال ہے۔'' میرے اللہ کا کتنا احسان ہے، مجھے اس مرحومہ کی تعزیت کرنے والوں سے اس قدر مسرت پہنچی کہ اس کے حادثۂ انتقال کا قلق اس کثرت سے جانی و مالی ایصال میں دب گیا۔ میرا یہ معمول اس وقت تک مشہور ہو چکا تھا، کہ سب سے پہلے اپنے والد صاحب کے انتقال پر، پھر اپنی والدہ کے، پھر اہلیہ مرحومہ اور پھر چچا جان کے انتقال پر ایک ہی مضمون سب دوستوں کو لکھا گیا تھا، اس لیے یہ چیز مشہور ہوگئی۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ دیوبند سے شاہجہانپور کسی اجتماع میں جا رہے تھے، سہارنپور کے اسٹیشن پر ان کو مرحومہ بچی کے حادثہ کا حال معلوم ہوا، ٹکٹ ردّی کر دیا اور اسٹیشن سے اجتماع میں تار دیا کہ ''میں آنہیں سکتا خط کا انتظار کریں۔'' اور میرے پاس تشریف لے آئے۔ دو پہر کا وقت تھا۔ میں چبوترے پر ویسے ہی بغیر کچھ بچھائے پڑا ہوا تھا۔ مولانا مرحوم سے بہت ہی بے تکلفی ہوگئی تھی اتنی زیادہ کہ اس کے واقعات بھی بہت عجیب ہیں اور آخر میں تو مولانا کا یہ تعلق اتنا بڑھ گیا کہ تقریباً ہر جمعہ کو ۹ بجے کی گاڑی سے آتے، جمعہ کے بعد کھانے میں شرکت کرتے اور ۴ بجے کی گاڑی سے دیوبند واپس چلے جاتے۔ میں نے آتے ہی مولانا مرحوم سے مطالبہ کیا آپ کہاں؟ فرمایا کہ شاہجہاں پور جا رہا تھا، اسٹیشن پر حادثہ کی اطلاع ہوئی، تار دے کے آ گیا۔ میں نے کہا آپ نے بڑا تیر مارا۔ جلسہ میں تشریف لے جاتے مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتے

کراتے اور اس جلسہ کی شرکت کا اجر وثواب مرحومہ کو بخش دیتے تو میرا کتنا دل خوش ہوتا۔ یہ کہہ کر میں نے کہا کہ لیٹ جاؤ، اب تک کی گفتگو میں میں پڑا ہوا تھا اور وہ بیٹھے ہوئے تھے، لیٹ گئے۔ اس کے بعد میں نے مولانا مرحوم سے اپنا قانونِ تعزیت جو والد صاحب قدس سرہٗ کے زمانے سے چل رہا تھا، مفصل سُنایا۔ فرمایا کہ حضرت قانون تو بہت ہی قیمتی ہے، کاش لوگ اس پر عمل کرلیں تو جانے والوں کے لیے بھی بڑا سرمایہ اور رہنے والوں کے لیے بھی بڑا ذخیرہ ہے مگر کوئی عمل نہیں کرے گا۔ میں نے کہا کم از کم تم جیسوں کو تو اس کی تبلیغ کرنی چاہیے اور براہِ کرم آیندہ میرے کسی حادثہ میں ہرگز تکلیف نہ فرمائیں اور پھر میں نے زبردستی ۱۲ بجے کی گاڑی سے ان کو شاہجہانپور روانہ کردیا۔

اس مرحومہ کے انتقال پر مجھے قلق بھی بہت ہوا، اس واسطے کہ اس نے ناگہانی مصیبت اُٹھائی اور مسرت بھی اس معنیٰ میں بہت ہوئی کہ میرا خیال یہ ہے کہ شاید اللہ ہی کی طرف سے یہ بات ہو کہ اس مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب کے جتنے خطوط میرے پاس آئے ہیں، اکابر کو چھوڑ کر اعزہ میں سے کہیں کسی کے متعلق اتنے ایصالِ ثواب اور صدقہ کے خطوط نہیں پہنچے ہوں گے۔ تیسرے دن حضرت اقدس مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ مع اہلیہ محترمہ علی الصباح پہنچ گئے اور میں نے نہایت تجاہل عارفانہ کے ساتھ عرض کیا حضرت! کیسے تشریف آوری ہوئی؟ حضرت نے ڈانٹ کر ارشاد فرمایا کہ مجھے خبر بھی نہیں کی۔ میں نے عرض کیا حضرت کوئی ایسی اہم چیز نہیں تھی، یہ قصے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا، مجھے تو رات ۱۲ بجے معلوم ہوا، میں تو اسی گاڑی سے آرہا تھا مگر گھر میں سے اصرار کیا کہ میں بھی چلوں گی، بے وقت ان کے لانے میں دِقت تھی، اس لیے علی الصباح آیا۔ میں نے عرض کیا کہ ''حضرت وہیں سے دعائے مغفرت، ایصالِ ثواب فرمادیتے تو وہ مرحومہ کے لیے زیادہ قیمتی ہوتا، آج کے بخاری کے سبق کا ایصالِ ثواب فرمادیتے۔'' اچھی طرح تو الفاظ یاد نہیں مگر یہ یاد پڑتا ہے کہ حضرت نے اس قسم کے الفاظ فرمائے تھے کہ آنے سے وہ حذف تھوڑے ہوگئے، یہ بھی سہی وہ بھی سہی۔ اس مرحومہ کی شادی کا بھی عجیب قصہ ہے، یاد رہا تو اپنی جگہ آئے گا۔

حادثہ انتقال عزیز یوسف مرحوم:

(۷) ان حوادث کی آخری کڑی عزیز گرامی قدر منزلت مولانا الحاج محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کا حادثہ جانکاہ ہے جس کی تفاصیل اخبارات ورسائل میں شائع ہوچکی ہیں اور خوب ہوئی ہیں، چند واقعات جن کا تعلق میری ذات سے ہے مختصراً لکھوا رہا ہوں۔

مورخہ ۲۹ ذی قعدہ ۸۴ھ مطابق ۲ اپریل ۶۵ء بروز جمعہ عزیز مرحوم کی سہارنپور آمد کی اطلاع

تھی، جمعہ کی صبح کو عزیز مرحوم کی بیماری کا تار آیا۔ مجھے پاکستانی احباب پر بہت ہی غصہ آیا، اس واسطے کہ ان سب احباب کی مستقل اور مستمر عادت عزیز یوسف مرحوم کے سلسلے میں اور اس سے کہیں زیادہ حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے معاملے میں ہمیشہ یہ رہی کہ عین وقت پر بیماری کے تار دمادم آنے شروع ہوجاتے اور اس کے بعد مولانا یوسف مرحوم کا تو ہفتہ عشرہ مؤخر کر دینا اور حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کو آٹھ دس ماہ مؤخر کردینا ایک معمولی بات تھی۔ مجھے بیماری کا یقین ذرا نہ آیا، میں جمعہ کی نماز کے بعد کھانا کھا کر سونے کے ارادہ سے لیٹا تھا کہ ۴ بجے کے قریب عزیز طلحہ نے مجھے آکر اُٹھایا اور کہا کہ ''صابری صاحب کا آدمی کھڑا ہے، لاہور سے فون آیا ہے کہ ماموں حضرت کا انتقال ہوگیا۔'' موت کے لیے نہ تو کوئی وقت ہے نہ اس میں کوئی استبعاد، میں اُٹھ کر وضو کر کے مدرسہ کی مسجد میں جا بیٹھا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اس لیے کہ طلحہ کی اس روایت کے ساتھ ساتھ چاروں طرف ہجوم نے گھیرنا شروع کردیا اور مجھے ایسے وقت میں لغو باتیں کہ ''کیا ہوگیا؟ کیا بیمار تھے؟ کب ہوا؟ کون خبر لایا؟'' لغویات سے بہت ہی وحشت ہوا کرتی ہے کہ یہ اہم اور قیمتی وقت بہت ہی مبارک ہوتا ہے، جس میں طبیعت ''منطقع عن الدنیا متبتل الی الآخرۃ'' ہوتی ہے، اس وقت کی تلاوت بھی قیمتی، ذکر وفکر بھی قیمتی۔ مجمع بڑھتا ہی چلا گیا۔ مدرسہ، سڑک سب بھر گیا اور میں نے تکبیر تک سلام پھیر کر ہی نہ دیا، عصر کی تکبیر پر سلام پھیرا اور گھر جاکر۔ وہاں خبر پہنچ چکی تھی، مگر میرے گھر کی سب بچیوں کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، اپنی مرضیات پر عمل کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے، نامرضیات سے حفاظت فرمائے، وہ اس کی خوب عادی ہوچکی ہیں کہ وہ ایسے موقع پر تلاوت یا تسبیح لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور ہر آنے والی کو زائد تسبیح رکھی ہوتو وہ ورنہ اپنے ہاتھ کی تسبیح دے دیا کرتی ہیں اور خود بغیر تسبیح کے شروع کردیتی ہیں کہ اس کی عادی ہیں۔ میں نے زنانہ دروازہ پر آکر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا کہ ''وہ حادثہ تو تم نے سُن ہی لیا، بہت مشغول رہنا، تمہارے پاس عشاء کے بعد آؤں گا، اس سے پہلے پڑھنے پڑھانے میں لگی رہو۔''

دروازے سے نکلا تو گھر سے مدرسہ تک ہجوم ہی ہجوم تھا۔ میں تُرش رُوئی کیساتھ ان دوستوں سے یہ کہتے ہوئے کہ ''مجھے تو اس وقت کچھ ضروری پڑھنا ہے، آپ لوگ یہاں تشریف رکھیں، مدرسہ میں تشریف رکھیں اور خوب باتیں کریں، ایسی فراغت کا وقت پھر کب ملے گا۔'' اس گفتگو کے بعد مجمع منتشر ہوگیا اور میں مسجد میں جا کر بیٹھ گیا، البتہ وہاں بولنے کی آواز کان میں پڑتی رہیں۔ عصر سے آدھے گھنٹے بعد عزیز طلحہ، صابری صاحب کے دوسرے آدمی کو ساتھ لے کر آیا کہ دوسرا ٹیلیفون آیا ہے۔ ''حضرت جی رحمہ اللہ تعالیٰ کے دفن کے مسئلہ پر ہنگامہ ہوگیا ہے۔ حافظ

صدیق صاحب وغیرہ ہندی اہلِ میوات دہلی جانے پر اصرار کر رہے ہیں اور مقامی حضرات یہاں تدفین پر اور فیصلہ تیری رائے پر۔''

مجھے اس کا واہمہ بھی نہ تھا کہ دہلی تابوت کسی طرح آسکتا ہے، اس لیے کہ اس سے قبل مُرشد العالم حضرت اقدس مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے وصال پر مجھے یہ باور کرایا گیا تھا کہ رائے پور منتقل ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔ حالانکہ حضرت نوراللہ مرقدہٗ کی خواہش وتمنا اور جملہ خدام خاص طور سے اپنے بھتیجے عبدالجلیل سے یہ وعدہ لینا میرے اور سب کے سامنے کا تھا کہ نعش کے روکنے کی کوشش نہ کیجیو اور جب میں نے ڈھڈیاں تدفین پر مطالبہ کیا کہ یہ کیوں ہوئی؟ تو مجھے بہت زور سے متعدد احباب کے خطوط میں بتایا گیا تھا کہ رائے پور لانے کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی: (۱) حکام سے اجازت۔ (۲) ڈاکٹروں کی اجازت۔ (۳) دماغ میں، دونوں مونڈھوں پر، گردن کی دونوں طرف، سینے پر، ٹانگوں پر شگاف آکر سب جگہ دوائیں بھری جائیں گی۔ (۴) ان سب کے باوجود بھی نعش کا بغیر تعفن کے پہنچنا ناممکن۔ میں نے ان راویوں کو سچا سمجھا اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کے خدام بڑے بڑے اعلیٰ مدبرین، وزراء، ڈاکٹر سارے ہی شامل تھے اور سب ہی کو حضرت کی تمنا کا حال معلوم تھا اور پھر حضرت کا تابوت منتقل نہ ہوسکا، مجھے تو اس کا واہمہ بھی نہ تھا، بلکہ کسی درجے میں بھی خیال نہ تھا کہ عزیز مرحوم کا تابوت منتقل ہوسکتا ہے۔ میں نے حافظ صدیق صاحب وغیرہ کی دلداری میں اپنی رائے کے خلاف یوں سمجھ کر مفت کرم داشتن ہے یہ کہلا دیا کہ ''اگر نظام الدین آمد کی کوئی صورت ہوسکتی ہو تو مقدم ہے ورنہ رائے ونڈ کے مدرسہ میں۔'' مگر میری حیرت کی انتہاء نہ رہی، جب آٹھ بجے تیسرا ٹیلیفون آیا کہ ''تابوت تیار ہے۔ ۱۱ بجے لاہور سے چل کر ۱ بجے دہلی پہنچ جائے گا۔'' میں بڑی دیر تک عزیز یوسف مرحوم کے مسئلے کو چھوڑ کر حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے مسئلہ میں کھو گیا کہ حضرت کی تمنا کے باوجود، اصرار وخواہش کے باوجود، محبت کے دعویداروں نے کس طرح یہ اقدام کیا؟

عشاء کی نماز پڑھ کر حسبِ وعدہ گھر میں گیا تھا کہ عزیز ہارون، بابو ایاز وغیرہ کار لے کر سہارنپور پہنچے، اس لیے کہ نظام الدین میں بہت مجمل خبر عصر کے قریب کسی کی روایت سے حادثے کی صرف پہنچی تھی، میں نے ہارون سے کہا کہ ''تم یہاں کہاں؟ تمہارے یہاں تو تابوت پہنچ رہا ہے۔'' اور سمجھایا کہ اللہ جل شانہٗ نے اس سیہ کار کے واسطے کار بھیجی ورنہ میرے جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے ہارون سے کھانے کا تقاضا کیا۔ اس نے کہا کہ جمعہ کے بعد کھایا ہے، تو میں نے کہا تم لوگ عشاء کی نماز پڑھ آؤ اتنے چائے تیار ہوجائے گی۔ انہوں نے نہایت عجلت میں نماز پڑھی اور عجلت میں چائے پکائی گئی۔ ۱۱ بجے سہارنپور سے کار میں چل کر ۳ بجے نظام الدین پہنچنا ہوا۔ راستہ خوب

صاف ملا اور سناٹے میں خوب لطف آیا۔ لیکن تین جگہ قسمت سے پھاٹک بند ملے، پہلا ہی پھاٹک روڑ کی والا بہت پہلے سے بند کر دیا تھا۔ بڑی خوشامد کی کہ گاڑی قریب نہیں ہے مگر ایک نہ مانی اور آدھا گھنٹہ لے ہی لیا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ نعش کے آنے میں بھی تاخیر ہوئی اور ہم سے ذرا پہلے نظام الدین پہنچی۔ اس کی تفاصیل تو مدّ زائد ہی ہیں اور رسائل، اخبارات سوانحوں میں آبھی چکی ہیں۔ یہاں میرا مقصد تو یہ ہے کہ اس حادثہ میں بجائے تعزیت کے لیے آنے کی شدید ممانعت کے دہلی اہل مرکز کی طرف سے اور ان ہی کے ساتھ میری طرف سے بھی تعزیت کرنے والوں کو بلانے کا وہ زور رہا کہ ساری عمر کی کسر نکل گئی۔ مگر یہ بلانا بھی حقیقت میں اس نہ بلانے سے زیادہ قیمتی تھا جواب تک پیش آیا، اس لیے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی روزانہ آتے اور آتے ہی ان کی تشکیل کر کے کسی جانب جماعت میں برائے ایصال ثواب مولانا یوسف مرحوم چلتا کر دیا جاتا۔ اس دن تو ہنگامہ بہت ہی زیادہ رہا، بات کرنے کی بھی نوبت نہ آئی۔ دوسرے دن مولوی انعام سلّمہٗ نے مجھ سے فرمایا کہ تیرے حکم کی تعمیل میں جنازہ یہاں تک آ گیا، ورنہ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے تابوت کے نزاع میں ہمیشہ مجھ سے یہ کہا اور کئی دفعہ کہا کہ ”میری نعش کہیں منتقل نہ کی جائے، اگر ریل میں انتقال ہو جائے تو قریب کے اسٹیشن پر اُتار کر وہیں جنگل میں دفن کر دینا، جس جگہ کا ٹکٹ ہو وہاں بھی نہ لے جانا۔“ میں نے ان سے کہا کہ ”اللہ کے بندو جب مرحوم کی تمہارے پاس ایک وصیت تھی تو تمہیں اس پر عمل کرنا چاہیے تھا۔“ تو عزیزم مولانا انعام الحسن صاحب نے فرمایا کہ ”وہاں ہنگامے کی ایسی صورت پیدا ہو رہی تھی کہ جس میں نزاع کا اندیشہ تھا، تیرا نام آتے ہی ہر فریق چپ ہو گیا، ورنہ اہل لاہور کا شدید اصرار تھا کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مقبرہ میں دفن کیا جائے اور تبلیغی احباب کا رائیونڈ میں اور ہندی میواتیوں کا زور تھا کہ دہلی لیا جانا ہوگا ورنہ یہیں ہنگامہ ہو جائے گا۔ تیرے نام پر تینوں فریق چپکے ہو گئے اور حافظ صدیق نے کہہ دیا کہ اس کے حکم کے خلاف تو ہم نہیں بول سکتے۔“ میں نے کہا کہ پھر کم از کم مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی وصیت ٹیلیفون پر نقل کرانی چاہیے تھی، مجھے تو پہلے سے اس کا حال معلوم نہ تھا، میں تو کبھی دہلی نہ منگواتا، البتہ رائے ونڈ کو ضرور پسند کرتا۔“ کیا کیا قصے لکھے جائیں اور لکھوائے جائیں۔ ورنہ ان چوہتر (۷۴) برس میں کیا کیا دیکھا، کیا کیا سنا، کیا کیا گزری، بہت طویل قصے ہیں اور عبرت کے لیے تو میں اس قسم کے بعض واقعات میں بڑا فکر میں پڑ جاتا ہوں کہ مالک کی قدرت کے عجب کرشمے ہیں۔

گزشتہ واقعات، خاندانی اہم اموات کا تذکرہ تھا، جن کی تعزیت سے میرا خصوصی تعلق رہا۔ اکابر کے سلسلہ کے حوادث میں بھی بعض عجیب قدرت کے کرشمے دیکھنے پڑے۔

اکابر میں پہلے حادثہ انتقال حضرت گنگوہیؒ:

(۱)...... اس سلسلے میں سب سے اول قطب الارشاد سید الطائفہ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ کا حادثۂ وصال دیکھا، جو ۸ یا ۹ جمادی الثانیہ علی اختلاف رؤیۃ الہلال ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء جمعہ کے دن چاشت کے وقت ہوا، وہ منظر اب تک آنکھوں کے سامنے ہے۔ جمعہ کی نماز کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ صبح کے بعد سے اور جنازہ کے اُٹھنے تک اس قدر سناٹا رہا کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آدمی کی آواز نہیں جانور کی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی، لب ہر شخص کے خوب ہل رہے تھے اور اس قدر مکمل کہ قرآن پڑھنے کی بھی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ حفاظ بھی قرآن پڑھ رہے تھے اور ناظرہ خواں بھی مسجد میں بیٹھ کر قرآن خوب کثرت سے پڑھ رہے تھے، مگر زبان پر ایسا سکوت کہ آواز کا نام نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سے بات پوچھتا بھی تھا تو ایک دو منٹ بعد اشارے سے جواب ملتا۔ جمعہ کی نماز تو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو پہلے حضرت قدس سرہٗ کی علالت سے امامت کر رہے تھے پڑھائی بہت بھرّائی ہوئی آواز میں، جنازہ کی نماز حضرت شیخ الہند نے حضرت صاحبزادہ صاحب کے حکم سے پڑھائی۔ اس لیے کہ سارے ہی اجل خلفاء موجود تھے۔ حضرت صاحبزادے سے پوچھا گیا، انہوں نے کہا کہ ''مولوی محمود پڑھائیں گے۔'' میں تو بہت ہی بچہ تھا۔ چھپ چھپ کر قبرستان جا رہا تھا اور جگہ جگہ سے ہٹایا جا رہا تھا، راستے میں مخلص کہتے کہ ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔ قبر شریف تک تو پہنچ ہی نہ سکا، اس لیے کہ تقریباً چاروں طرف سے ایک میل زائد جگہ کا لوگوں نے احاطہ کر رکھا تھا۔ منظر خوب یاد ہے۔

دوسرا سانحۂ ارتحالی بڑے حضرت رائے پوری:

(۲)...... اس کے بعد ۲۶ ربیع الثانی ۳۷ھ میں پیلوں میں حضرت اقدس قطب الاتقیاء رأس التواضع والصفا حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کا منظر دیکھا، میرے حضرت قدس سرہٗ نے سہارنپور میں ایک شب پہلے خواب دیکھا کہ چاند گرہن ہو گیا۔ خواب دیکھتے ہی بے چینی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اماں جی مرحومہ یعنی اہلیۂ محترمہ حضرت قدس سرہٗ نے پوچھا کہ کیا بات ہوئی؟ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا یہ خواب دیکھا ہے۔ مولانا محمود الحسن مالٹا میں ہیں اور مولانا عبد الرحیم صاحب عرصہ سے بیمار ہیں۔ اللہ ہی خیر فرمائے۔ علی الصباح حضرت پیلوں کا ارادہ فرمایا۔ مجھے یہ خواب اسی طرح یاد ہے۔ تذکرۃ الخلیل صفحہ ۲۶۷ میں کچھ معمولی تغیر خواب کے نقل میں ہے۔ یہ گاؤں شاہ زاہد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رئیس بہٹ کا خریدا ہوا تھا، آب وہوا اس کی بہت اچھی تھی اور انگریزوں کی چند کوٹھیاں اس میں تھیں جن سے خریدا گیا تھا۔ بہت ہی

ہوادار بہت ہی پُر فضا جگہ تھی۔ شاہ صاحب کی درخواست پر حضرت قدس سرہٗ زندگی کے آخری ایام میں تبدیلِ آب وہوا کی وجہ سے یہاں تشریف لے آئے تھے۔ یہیں وصال ہوا۔ وصال کے بعد جنازہ رائے پور گیا۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی تشریف آوری تو صبح کو ہوگئی تھی۔ وصال اگلی شب میں ہوا۔ دوسرے دن اخیر شب میں ہی سہارنپور میں خبر گونج گئی تھی۔ ہمارے یہاں مدرسہ میں شش ماہی امتحان ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں امتحان اتنی شدید چیز تھی کہ مدرسہ کے کسی ملازم کو مدرس ہو، اہل دفتر، محصلِ چندہ ہو، ناظم کتب خانہ ہو، کسی کو کسی حال میں بھی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ محصلین چندہ بھی اس زمانے میں اگر دُور دراز نہ ہوں تو واپس بلائے جاتے تھے۔ کتب خانہ صبح کو اور مالیات کا دفتر بھی صبح کو بند رہتا تھا۔

مولانا ثابت علی صاحب کا انتقال:

ہمارے مدرسہ کے مدرسِ دوم حضرت مولانا ثابت علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت مولانا عبد الطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم کے حقیقی چچا ۱۲۸۳ھ یعنی جب سے مدرسہ کی ابتداء ہوئی اس وقت سے مدرسہ کے طالب علم ابتداء فارسی سے لے کر آخر دورہ تک مدرسہ ہی میں تعلیم پائی اور یکم محرم ۹۷ھ میں دو روپے وظیفہ طلبہ جو پہلے سے تھا وہ بدستور رہ کر دو روپے معین المدرسی کی تنخواہ مقرر ہو کر چار روپے پر تقرر رہا اور معین المدرسی کے ساتھ ۱۲۹۸ھ میں تکمیلِ حدیث اور ۹۹ھ میں صرف بیضاوی پڑھی اور ترقی کرتے کرتے تدریس حدیث تک پہنچے اور چودہ (۱۴) دن مرض احتباس البول میں بیمار رہ کر شب جمعہ ۲۰ ربیع الثانی ۴۲ھ میں بعمر پینسٹھ (۶۵) سال سہارنپور ہی میں انتقال فرمایا اور حاجی شاہ قبرستان میں جہاں مدرسہ کے اکثر اکابر اور میرے والدین، اہلیہ مرحومہ اور بعض لڑکیاں مدفون ہیں وہیں حضرت مولانا دفن ہوئے۔ مولانا مرحوم حضرت قدس سرہٗ کی روانگی پر مدرسِ اول ہی ہوتے۔ مگر ۳۳ھ میں جب حضرتِ اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ معرکۃ الآراء سفر میں تشریف لے جا رہے تھے تو اپنی نیابت کے لیے میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی تحریک اور اعلیٰ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب کی تائید سے مولانا ثابت علی صاحب کے بھتیجے مولانا عبد الطیف صاحب کو مدرسِ اول بنا دیا تھا۔

مولانا عبد الطیف کی صدر مدرسی:

میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریک کا مطلب یہ کہ چونکہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ۲۸ھ سے قائم مقام صدر مدرس تھے، اس لیے حضرت کے طویل سفر میں ان ہی کو مدرسِ اول ہونا چاہیے تھا مگر والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر کہ صدر مدرسی کے واسطے جس متانت،

انتظامی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مولوی عبداللطیف میں زیادہ ہے میرے حضرت نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور بڑے حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی۔ حضرت مولانا ثابت علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس پر رنج وقلق طبعی چیز تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا مرحوم کئی دن تک ''الرجل و قدمہ و الرجل و بلاؤہ'' یہ مشہور حدیث ابوداؤد شریف میں ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد منقول ہے جس کا مطلب یہ ہے آدمی اور اس کی قدامت ومشقت یعنی خدمات کی رعایت ضروری ہے۔ اس حدیث پاک کو گنگنایا کرتے۔ مگر چونکہ اصل واستحقاق سب کی نگاہوں میں میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا تھا

مولانا ثابت علی صاحب کی نگرانی امتحان:

مولانا ثابت علی صاحب کے درجے میں دوسرے مدرس مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی بھی تھے۔ اس لیے کچھ مولانا ثابت علی کی حق تلفی نمایاں نہ ہوئی، لیکن اپنی علوِ شان، قدامت، جلالت کی وجہ سے امتحان کی رُوحِ رواں خاص طور سے وہی تھے اور بہت ہی اہتمام سے محافظین کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ طلبہ کی نگرانی تو مدرسین حضرات کرتے اور مولانا مرحوم سب سے زیادہ مدرسین کی نگرانی فرماتے۔ ان کی نگرانی کا منظر بھی کاغذ پر لانے کا نہیں، بلکہ کر کے دکھانے کا ہے۔ بڑے غور سے دائیں طرف دیکھ رہے ہیں ایک دم بائیں طرف منہ پھیر لیا۔ لیکن زیادہ نگرانی مولانا مرحوم کی محافظوں پر ہوتی۔ دو(۲) محافظ مدرسین اکابر میں سے بھی اگر اس موقعہ پر ایک دوسرے سے مختصر سی بات کرتے تو مولانا مرحوم جن کے کلام میں بہت عجلت تھی اور بہت جلدی بولا کرتے تھے، وہیں ڈانٹ دیتے تھے اور مولانا عبدالوحید صاحب کے علاوہ سارے ہی مدرسین مولانا کے شاگرد تھے۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو امتحان گاہ میں ہوتے نہ تھے۔ مولانا مرحوم جلدی جلدی فرماتے ''میاں صاحب، میاں صاحب، میاں صاحب تم تو بات کرنے لگے وہ اپنا کام کر لیں گے۔'' مجھے تو ان کا زور دکھلانا تھا ورنہ یہ جگہ اس مضمون کی تھی نہیں۔

میں نے حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ نور اللہ مرقدہٗ سے پیلوں جانے کی اجازت مانگی۔ مہتمم صاحب کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، مجھ پر بچپن ہی سے شفیق تھے، چپکے سے اجازت دے دی اور یہ کہا کہ ''چپکے سے چلا جا، مولوی ثابت نہ دیکھیں۔'' میں بہت ہی آہستگی سے اُٹھا، مگر مولانا ثابت علی صاحب نے نہ جانے کہاں سے دیکھ لیا، حادثہ کی خبر ان کو بھی ہو چکی تھی۔ میرے اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کی بنا پر ان کو شبہ ہوا کہ یہ جا تو نہیں رہا، ایک دم شور مچا دیا ''یہ کہاں جا رہا ہے، یہ کہاں جا رہا ہے؟'' اور میں دارالطلبہ قدیم کے زینے تک تو ذرا تیز قدموں سے چلا اور زینے پر سے اس زور سے بھاگا ہوں کہ کچھ انتہا نہ رہی کبھی کوئی

آدمی پکڑ کر واپس نہ لے جائے۔ مہتمم صاحب نے شروع میں تو ادھر سے منہ پھیر لیا، امتحان کا بالکل افتتاح ہو رہا تھا، سوالات کے پرچے بٹ رہے تھے، مہتمم صاحب عمداً اس طرف مشغول ہو گئے اور مولانا مرحوم شور مچاتے رہے اور میرے ساتھ کوئی پیسہ نہیں تھا، مگر پھر بھی گھر اس واسطے نہ گیا کہ کبھی مولانا ثابت علی صاحب کا قاصد پکڑ نہ لے جائے۔ اس نیت سے چلا تھا کہ کہیں تو کوئی واقف ملے گا ہی، چار پانچ آنے کی سواری بہٹ تک تانگے کی تھی، موٹریں نہیں چلی تھیں، تانگے بھی صرف بہٹ تک آتے تھے۔ اڈے پر پہنچ کر ایک صاحب مل گئے ان سے چار آنے ادھار لیے اور مولانا ثابت علی صاحب کے ڈر کے مارے یَا رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ کہتا ہوا حدودِ سہارنپور سے نکل گیا، جب جان میں جان آئی۔ بہٹ سے پیلوں آرہا تھا کہ ادھر سے جنازہ آتا ہوا نظر آیا راستے ہی سے جنازہ کے ہمراہ رائپور پہنچ گیا، نماز میرے حضرت قدس سرہٗ نے پڑھائی تھی۔ تدفین کے بعد مولانا ثابت علی صاحب کے ڈر کے مارے اسی وقت الٹے پاؤں بہٹ آیا، وہاں تو واقف بہت مل گئے تھے، پیسے بہت سے ادھار لے لیے تھے، نہ معلوم سواری پوری ملے یا ناقص، رات میں سہارنپور پہنچ گیا۔ حضرت اگلے دن تشریف لائے۔

تیسرا حادثہ انتقال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ:

(۳)......اس کے بعد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کا حادثۂ وصال دیکھا اور مالک کی قدرت کا عجیب کرشمہ دیکھا۔ یہ سیہ کار کی جس کو حاضری کی بہت ہی کم توفیق ہوتی تھی تجہیز و تکفین میں شریک اور میرے آقا میرے سردار حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ جو سفر و حضر کے رفیق، مالٹا میں بھی ساتھ نہ چھوڑا ایک دن پہلے جدا ہو گئے اور تجہیز و تکفین اور تدفین میں بھی شریک نہ ہو سکے، بڑی عبرت کا قصہ ہے:

امروہہ میں شیعہ سنی مناظرہ طے ہو چکا تھا، کئی مہینے پہلے سے اعلان اشتہار وغیرہ شائع ہو رہے تھے، اخبارات میں زور و شور تھا۔ سہارنپور سے میرے حضرت قدس سرہٗ پہنچ گئے اور لکھنؤ سے مولانا عبدالشکور صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دونوں اس نوع کے مناظرہ کے امام، شہرۂ آفاق، اہل تشیع جواب تو بہت ہی زوروں پر تھے۔ ان دونوں حضرات کے پہنچنے پر اس کوشش میں لگ گئے کہ مناظرہ ہرگز نہ ہو اور التواء بھی سُنّیوں کی طرف سے ہو اس لیے انہوں نے مولوی محمد علی جوہر مرحوم کو آدمی بھیج کر دہلی سے بلایا اور مرحوم نے مناظرہ کے خلاف آپس کے اتحاد پر مجامع میں اور مجالس میں ۲۴ گھنٹے تک وہ زور باندھے کہ حد نہیں۔ میں نے مرحوم کو عمر بھر میں اسی وقت دیکھا نہ اس سے پہلے دیکھا نہ بعد میں دیکھنا یاد ہے۔ میں نے مرحوم سے کہا کہ مجھے آپ سے ملنے کا عرصہ سے اشتیاق تھا، میرا

خیال یہ تھا کہ وہ شاید ایک دو منٹ میرے اشتیاق پر دیں اگر چہ مجھ سے واقفیت نہیں تھی۔ مگر وہ میرے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا عبدالشکور صاحب کے اقدام پر بہت ہی ناراض ہو رہے تھے اس لیے انہوں نے سخت ناراض ہو کر یہ کہا کہ اس سے نمٹ لوں پھر ملوں گا۔ سارے دن یہ ہنگامہ رہا۔ دوسرے دن ۷ اربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو علی الصباح میرے حضرت قدس سرہٗ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام بہت مختصر پرچہ اس مضمون کا لکھوایا صورت حال یہ ہے اور سنیوں کی طرف سے اس وقت التواء ہرگز مناسب نہیں آپ میرے نام ایک خط جلدی بھیج دیں کہ ''مناظرہ جاری رکھا جائے'' یا ''مناظرہ ملتوی نہ کیا جائے۔'' بہت مختصر پرچہ میں لے کر امروہہ سے دہلی روانہ ہوا۔ جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو دو چار آدمی ملے مصافحہ کیا، میں نے ان سے پوچھا کون؟ کیسے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ جو اس گاڑی سے کلکتہ جا رہے ہیں، ان کی زیارت کے واسطے آئے ہیں۔ میرے پاس نہ کاغذ نہ پنسل۔ ایک کاغذ ردی اسٹیشن سے ڈھونڈا اور ایک کوئلہ اٹھایا اور جو مجھے اسٹیشن پر پہنچانے کے واسطے گیا تھا اس کے ہاتھ کوئلے سے حضرت قدس سرہٗ کے نام پرچہ لکھا کہ ''حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کو وہیں اتارلیں۔'' میں یہ کہہ کر دہلی روانہ ہو گیا۔ میرے حضرت نے گاڑی پر آدمی بھیجا اور حضرت سے اترنے کو فرمایا۔ باوجود اس کے کہ حضرت کا کلکتہ کا ٹکٹ تھا اور سامان سفر ساتھ تھا، میرے حضرت کے حکم پر حضرت مدنی وہیں اتر گئے۔ انقیادِ اکابر میں نے جتنا حضرت مدنی قدس سرہٗ میں دیکھا اتنا کم کسی دوسرے میں دیکھا اپنی طبیعت کے جتنے بھی خلاف ہو مگر اپنے بڑوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ان ہی کا حصہ تھا اور سارے دن مناظرے کے متعلق زوردار تقریریں فرمائیں، جس میں فریقین کو یہ نصیحت کے یہ زمانہ آپس میں اشتعال کا نہیں ہے، اس وقت میں تو غیر مسلموں سے بھی صلح کرنے کی شدید ضرورت ہے چہ جائیکہ آپس میں لڑائی جھگڑا کیا جائے۔ میں حضرت قدس سرہٗ کا گرامی نامہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام لے کر مغرب کے قریب حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی قیام گاہ پر پہنچا تو حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ پر مرض کا شدید حملہ تھا، پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی، دوسرے دن صبح کو وصال ہو گیا اور دنیا بھر میں تار ٹیلیفون دوڑنے لگے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے نام کلکتہ اور اس کے قرب وجوار کے چند اسٹیشنوں پر تار دیے گئے، جہاں تک اہل الرائے کی یہ رائے ہوئی کہ صبح کی جس گاڑی میں حضرت مدنی گئے ہیں وہ اس وقت تک کہاں پہنچے گی اس جگہ سے لے کر کلکتہ تک ہر مشہور اسٹیشن پر تار دیا گیا میں نے کہا ایک تار حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کو امروہہ بھی دے دو۔ سب نے مجھے بے وقوف بتلایا اور بعضوں نے یہ سمجھا کہ یہ حضرت سہارنپوری کو تار دلوانا چاہتا ہے، حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام سے۔ ہر شخص نے کہا آخر

امروہہ کا کیا جوڑ؟ میں نے کہا ''احتیاطاً۔'' جناب الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے باوجودیکہ میں سیاسی حیثیت سے ان کے ساتھ نہیں تھا، ممکن ہے کسی جگہ مولانا مرحوم کا تذکرہ ذرا تفصیل سے آسکے۔ لیکن مفتی صاحب مرحوم کو شفقت بہت تھی اور بہت وقعت سے میری بات قبول فرمایا کرتے تھے، بہت سے سیاسی اور مذہبی مسائل میں اپنی رائے کے خلاف میری رائے کو ان الفاظ سے شائع کیا ہے کہ ''بعضے مخلص اہلِ علم کی رائے یہ ہے گو میری رائے نہیں۔'' اس قسم کی کوئی عبارت اس وقت کے وقف بل میں بھی شائع ہوئی ہے جو مفتی صاحب نے لکھا تھا۔ بہت سے وقائع اس قسم کے مفتی صاحب کے ساتھ پیش آئے کہ میری رائے کو انہوں نے اپنی رائے کے خلاف انتہائی تبسم اور خوشی کے لہجے میں بہت اہتمام سے قبول کیا۔ اس موقع پر بھی میرے بار بار اصرار اور لوگوں کے انکار پر تیز لہجے میں فرمایا کہ ''جب یہ بار بار فرما رہے ہیں تو آپ کو ایک تار امروہہ دینے میں کیا مانع ہے؟'' چنانچہ تار دیا گیا، شاید ارجنٹ نہ دیا ہو کہ دینے والوں کی رائے کے خلاف ہو۔ دوسرے دن امروہہ تار پہنچا اور تیسرے دن علی الصباح حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکان پر پہنچے۔ یہ ناکارہ اس وقت تک امروہہ روانہ نہیں ہوا تھا بلکہ جا ہی رہا تھا، وہ منظر ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ انتہائی ساکت قدم بالکل نہیں اٹھتا تھا۔ ہر قدم ایسا اٹھ رہا تھا جیسے ابھی گر پڑیں گے۔ مصافحہ بھی ایک آدھ ہی نے کیا، میں نے تو کیا نہیں، ہر شخص اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کے مردانہ مکان کے سامنے کی سہ دری میں جا کر دو زانو بیٹھ گئے اور چپ۔ دو چار اور حاضرین بھی گھر میں موجود تھے وہ بھی جمع ہو کر مولانا کے پاس بیٹھ گئے اور میں قدرت کا کرشمہ سوچتا رہا کہ جو شخص سفر وحضر میں کسی وقت بھی جدا نہ ہوا ہو، وہ انتقال سے ایک دن بعد قبر پر حاضر ہوا اور جس کو حاضری کی نوبت کبھی نہ آئی ہو وہ دہلی سے لے کر تدفین تک جنازہ کے ساتھ ساتھ رہے۔

عجب نقشِ قدرت نمودار تیرا:

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کی نمازِ جنازہ دہلی میں میرے چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ نے پڑھائی اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی بھائی مولانا محمد حسین صاحب نے شرکت نہیں کی تاکہ ولی کو اعادہ کا حق رہے، انہوں نے دیوبند آنے کے بعد پڑھائی۔

ان ہی عجائب قدرت میں اس سیہ کار کی حضرت رائپوری کے جنازہ میں عدم شرکت ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اور منشی رحمت علی صاحب جالندھری کے جنازہ میں شرکت، جن کے یہاں زندگی

میں کبھی جانا نہ ہوا اور بھی کئی نظائر اس کے ہیں جن میں اس ناکارہ کی اپنے حضرت قدس سرہٗ کے جنازہ میں عدم شرکت کہ یہ ناکارہ چند ماہ پہلے مدینہ پاک سے مظاہر علوم کی وجہ سے واپس کر دیا گیا تھا، جیسا کہ تفصیل سے نمبر۴ میں آرہا ہے اور حضرت الحاج حافظ فخر الدین صاحب کے جنازے میں عزیز مولانا یوسف سہارنپور کے اجتماع کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، حالانکہ حضرت حافظ صاحب نظام الدین کے ہمیشہ کے حاضر باشوں میں سے تھے اور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری پاکستان سے ہمیشہ سیدھے سہارنپور آنے والے اس مرتبہ دہلی کے راستے سے آئے اور وہاں جنازہ کے اندر ۲۵ شوال کی صبح کو فتح پوری میں شرکت فرمائی۔

چوتھا حادثہ انتقال حضرت کا وصال:

(۴)......اس کے بعد اپنے حضرت مرشدی سیدی ومولائی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا حادثۂ انتقال بھی نمبر۳ ہی کا نمونہ ہے کہ یہ ناکارہ ۳۵ھ سے سفراً حضراً ہر وقت کا حاضر باش، لیکن وصال کے وقت دور کر دیا گیا کہ ذیقعدہ ۴۵ھ میں مدینہ منورہ سے واپسی ہوئی اور ربیع الثانی ۴۶ھ بروز چہارشنبہ جب کہ عرب کی ۱۶ اور ہندوستان کی ۱۵ تاریخ تھی میرے حضرت قدس سرہٗ نے مدینہ پاک میں وصال فرمایا۔ مولانا طیب مغربی صدر مدرس مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ نے مصلی الجنائز میں نماز پڑھائی۔

پانچواں حادثہ انتقال حضرت تھانویؒ:

(۵)......حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا وصال۔ حضرت کی علالت میں حاضری تو اکثر اور بار بار ہوتی رہی۔ ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ سہ شنبہ علی الصباح میں اپنے کمرہ میں تھا، بھائی اکرام نے اوپر پہنچ کر حادثے کی اطلاع کی اور میں اسی حال میں اٹھ کر سب طرف کے کواڑ لگا کر سیدھا اسٹیشن دوڑ گیا، وہاں جا کر معلوم ہوا کہ گاڑی کا وقت بہت ہی قریب ہے بلکہ چھوٹ رہی تھی، ٹکٹ لے کر چلتی گاڑی میں بیٹھ گیا، مدرسہ کے دوسرے احباب اس گاڑی تک نہ پہنچ سکے، معلوم ہوا اہلِ شہر کی کوشش پر چھوٹی لائن کے افسروں نے دو اسپیشل تھانہ بھون کے لیے چند ڈبوں کے منظور کر لیے، پہلا اسپیشل تو تقریباً دو گھنٹے کے بعد پہنچ گیا۔ دوسرا اسپیشل تدفین کے بعد پہنچا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے عیدگاہ میں جنازہ کی نماز پڑھائی۔ لیکن سکوت کا جو منظر گنگوہ میں دیکھا تھا اور پھر کچھ حصہ اس کا رائپور میں، وہ پھر کہیں نصیب نہ ہوا۔ طبائع کے اضطراب اور بے چینی پر مکمل غلبہ تو گنگوہ میں دیکھا کہ جانور تک بھی نہیں بول رہے تھے، ”لِلّٰہِ مَآ اَخَذَ وَلَہٗ مَآ اَعْطٰی“۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی علالت میں بار بار جانا ہوا۔ وصال سے چند روز قبل چھوٹی اہلیہ

مرحومہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ پیر و منگل کی درمیانی شب میں ۱۰ بج کر ۴۰ منٹ پر وصال ہوا۔ نور اللہ مرقدہٗ واعلی اللہ مراتبہٗ وصال سے چند روز پہلے اس دار الحزن والمحن سے طبیعت اکتا گئی تھی، کئی مرتبہ فرمایا: ''یا اللہ! میں اس سنڈ اس میں کب تک پڑا رہوں گا۔''

چھٹا حادثہ انتقال حضرت میرٹھیؒ:

(۶)......ان ہی حوادث میں حضرت میرٹھی نور اللہ مرقدہٗ کا حادثۂ انتقال بھی ہے جس کو میں ارشاد الملوک کی تمہید میں لکھ بھی چکا ہوں کہ یکم شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء دوشنبہ کی صبح کو ۶ بجے وصال ہوا۔ ۴ بجے شام کو مکان کے قریب ہی اپنے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ حادثہ کے وقت بھی ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ حضرت اقدس مولانا عبد القادر صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ ایک سفر سے سہارنپور واپس تشریف لائے اور اس ناکارہ زکریا سے ارشاد فرمایا کہ حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کی شدتِ علالت کی خبریں سنی جارہی ہیں خیال یہ ہے کہ رائپور جانے سے پہلے حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عیادت کرتا جاؤں بشرطیکہ تو بھی ساتھ ہو۔ میں نے قبول کرلیا اور قرار یہ پایا کہ اتوار کو دیو بند چلیں، شب کو وہاں قیام رہے، پیر کو صبح میرٹھ چلے جاویں، شام کو واپسی ہوجائے منگل کو حضرت رائپور تشریف لے جاویں۔ چنانچہ اتوار کے دن ظہر کے وقت دیو بند حاضری ہوئی اور پیر کی صبح کو حضرت مدنی سے میرٹھ جانے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے اپنی عادتِ شریفہ کے موافق اجازت میں تأمل فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ آج عقیقہ ہے، میں ابھی بکرے کٹواتا ہوں، اس کا گوشت کھا کر دس بجے کی گاڑی سے چلے جانا، یہ عقیقہ عزیزم مولوی ارشد سَلَّمہٗ، کا تھا، مگر نہ معلوم علی الصباح میرٹھ جانے کا فوری تقاضا میری طبیعت پر اور مجھ سے زیادہ حضرت کی طبیعت پر کیوں ہوا؟ اور بہت ہی گرانی اور طبیعت کے تکدر سے حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے جانے کی اجازت لی جس کا طبیعت پر دوپہر تک بہت ہی قلق رہا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بھی بڑی گرانی سے اجازت دی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ۶ بجے صبح کو مولانا میرٹھی کا انتقال ہو چکا ہے اور دو تار سہارنپور پہلا حادثے کی اطلاع کا اور دوسرا جنازے کی نماز میں انتظار کا سہارنپور جا چکے ہیں اور حادثے کی اطلاع کا تار دیو بند حضرت مدنی کی خدمت میں روانہ ہو چکا ہے، اس کی وجہ سے جو گرانی، ندامت، کلفت صبح تھی کہ حضرت کی منشاء کے خلاف آنا ہوا وہ جاتی رہی۔ جنازہ اس ناکارہ کے انتظار میں رکھا ہوا تھا، تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ کی نماز ہوئی۔ ظہر سے پہلے ہی تدفین ہوگئی اور شام کو حضرتِ اقدس رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کی ہمرکابی میں سہارنپور واپسی ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ حضرت میرٹھی نے اس سیہ کار کے لیے نماز جنازہ کی وصیت فرمائی تھی۔

منشی رحمت علی کے انتقال میں بندہ کی شرکت:

(۷)......عجائب قدرت میں اس ناکارہ کا منشی رحمت علی صاحب (جو اعلیٰ حضرت بڑے حضرت رائپوری قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے) کے انتقال میں شرکت ہے حالانکہ منشی صاحب کی زندگی میں باوجود اپنی اور ان کی خواہش کے کبھی حاضری نہ ہوئی۔ ان کی شدت علالت کی خبر پر حضرت اقدس مولانا الشیخ الحاج عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے تشریف لے جانے کا ارادہ کیا اور اس سیہ کار کو بھی ہم رکاب چلنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ دس پندرہ روز پہلے حاضری ہو ہی گئی۔ منشی صاحب رموز واسرار پر بہت کلام فرماتے تھے، تعبیر خواب میں خاص ملکہ تھا۔ شب یک شنبہ ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۱ھ میں جالندھر میں بمرض فالج وصال فرمایا۔

آٹھویں حادثہ انتقال حضرت مدنی قدس سرہ اور حضرت کی طویل بیماری:

(۸)......میرے اکابر میں جن حوادث سے اس ناکارہ کو سابقہ پڑا انہی اہم ترین حوادث میں حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا حادثۂ وصال ہے، حضرت کی طبیعت ناساز تو آخری رمضان ۷۶ھ میں بانسکنڈی (کچھاڑ) ہی میں ہوگئی تھی کہ حضرت نے یہ رمضان اور اس سے پہلا رمضان بانسکنڈی ہی میں گزارا تھا۔ ۴، رمضان کی شب میں شدت سے بخار ہوا، اس کے باوجود افطار نہیں فرمایا۔ ۲۶ شوال کو واپسی کی اطلاع تھی، علالت کا سلسلہ چلتا رہا ۲۲ شوال کو بیس مرتبہ اسہال ہوا، اس واسطے عین وقت پر التواء ہوا۔ دیوبند کے حضرات بھی استقبال کے لیے سہارنپور تک تشریف لائے اور واپس ہوئے ۲ ذیقعدہ شنبہ کو حضرت قدس سرہٗ تشریف لائے، بندہ اپنی عادت کے موافق اسٹیشن پر حاضر ہوا اور چونکہ حضرت کی طبیعت ناساز تھی اور اس کی اطلاعات سنی جارہی تھیں۔ اس لیے بندہ اپنی عادت کے موافق جو حضرت اقدس رائپوری کے ہر سفر میں پیش آتی تھی لکڑی لے کر اسٹیشن کی مسجد کے اندر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا، مسجد مجمع سے لبریز تھی۔ بندہ نے اعلان کیا کہ جو مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے گا لکڑی ہاتھ پر ماروں گا۔ حضرت قدس سرہٗ ضعف کی وجہ سے نہایت ہی آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے تشریف لائے حضرت کی تشریف آوری کے بعد زکریا سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ زکریا نے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے کہ میں ان لوگوں پر تشدد کر رہا ہوں یہ کیا کہیں گے۔ حضرت نے اس ناکارہ کا ہاتھ کھینچ کر مصافحہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ آج کل کے مولویوں کا یہی کام ہے کہ دوسروں کو منع کرتے ہیں اور خود کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد لاری سے دیوبند تشریف لے گئے اور باوجود علالت کے طویل وعریض اسفار اپنی عالی ہمتی سے فرماتے رہے۔ میری بچی (حکیم الیاس کی اہلیہ) کی علالت کی اطلاع سنی، تو دفعۃً بلا اطلاع بڑی

صاحبزادی سلمہا کے ساتھ ۲۸ ذیقعدہ پنجشنبہ کو بعد مغرب تشریف لائے اور جمعہ کی شام کو واپس تشریف لے گئے۔ اسی حالت میں مدراس، بنگلور، میسور کا طویل دورہ۔ ۱۵ ذی الحجہ کو دیوبند سے بذریعہ کار دہلی اور اگلے دن صبح کو بذریعہ طیارہ دہلی سے شروع ہوا اور

مقدمہ لامع وکوکب واوجز کی تمہید بقلم حضرت مدنی:

۴ محرم ۷۷ھ۱۳ کو دہلی بذریعہ طیارہ اور اگلے دن دیوبند پہنچے۔ دورہ تو یہ بہت طویل تھا لیکن علالت کی شدت کی وجہ سے مختصر کرنا پڑا کہ چند قدم چلنے سے اور معمولی تقریر سے تنفس کی شدت ہو جاتی تھی۔ حکیم اسماعیل دہلوی نے مدراس سے واپسی پر بلغم تجویز کیا تھا اور اس کا نسخہ استعمال کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا۔ دیوبند کے ڈاکٹر نے قلب کا پھیلاؤ تجویز کیا اور ضروری قرار دیا کہ سہارنپور کے سول سرجن کو جلد دکھلایا جائے۔ جمعرات ۱۱ محرم ۷۷ھ کو رائپور کا سفر تجویز تھا تو تکرار سفر سے بچنے کے لیے معائنہ بھی اس سفر میں طے ہوا چنانچہ جمعرات کی شام کو ۴ بجے سہارنپور پہنچے اور ہسپتال میں سول سرجن نے ایکسرے اور معائنہ کیا اور دیوبند کے ڈاکٹر کی موافقت کی۔ اس کے بعد رائپور تشریف لے گئے، رات کو ساڑھے دس بجے رائپور پہنچے۔ حضرت رائپوری سو چکے تھے مگر کسی نے اطلاع کر دی، صبح کو عین واپسی کے وقت بھائی الطاف کے معمولی اصرار پر قیام فرمایا اور زکریا سے فرمایا کہ مجھے ''مقدمۂ لامع'' کی تاخیر سے بہت ندامت ہو رہی ہے۔ اس ناکارہ کی ''اوجز'' اور ''لامع'' اور ''کوکب'' کے مقدمہ کی تمہید تینوں حضرت اقدس سرہٗ کے دست مبارک سے لکھی ہوئی ہے یہ مقدمہ حضرت کے پاس چند ماہ سے رکھا ہوا تھا، مگر لکھنے کا موقع نہیں مل سکا، اس پر حضرت نے فرمایا تھا اور فرمایا کہ دیوبند سے طے کر کے آیا تھا کہ بہٹ یا سہارنپور میں لکھوں گا۔ آزاد صاحب کے کمرے میں ۱۱ بجے تک لکھا اور پھر جمعہ کی نماز مسجد باغ میں پڑھ کر عصر تک پھر لکھا۔ مگر ضعف کی وجہ سے پورا نہ ہوسکا۔ بعد مغرب چل کر شب بہٹ میں گزاری۔ صبح شنبہ کو وہاں سے چل کر سہارنپور ڈاکٹر برکت علی کو کچے گھر میں دکھایا گیا اور شام کو ۵ بجے دیوبند تشریف لے گئے۔ اس دوران میں یاد ہے دورے پڑتے رہے اور ڈاکٹر برکت علی صاحب دوسرے تیسرے دن جاتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بہت اہتمام تھا کہ وہ جب جاویں اس ناکارہ کو بھی ساتھ لیتے جاویں اور عزیز مولانا اسعد سلمہ کے قاصد بھی اکثر ناکارہ کے پاس آتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آ جاؤ۔ ۱۹ صفر سے حضرت پر نظر کا اثر زیادہ محسوس ہوا کہ ہر کھانے پینے کی چیز سے امتلاء سحر کا اثر تو تقریباً سال بھر سے محسوس کیا جا رہا تھا اور اس کے ازالے کی تدابیر بھی ہو رہی تھیں۔ قلبی دورے کے بار بار اعادہ کی وجہ سے یکم ربیع الاول پنجشنبہ کو ڈاکٹر برکت علی مرحوم کے اصرار پر یہ تجویز ہوا کہ دہلی میں قلبی امراض کے ماہر ڈاکٹر کے شفاخانے میں داخلہ کیا جائے۔ مولوی اسعد سلمہ نے دہلی ٹیلیفون

کے ذریعے سے جمعیۃ کے وساطت سے سارے انتظامات مکمل کر لیے اور اتوار کی صبح کو بذریعہ کار جانا بھی طے ہوگیا۔ لیکن جمعہ کی شام کو حکیم عبدالجلیل صاحب نے آکر عزیز مولوی اسعد سلمہ سے با اصرار دہلی کا سفر ملتوی کرایا کہ حضرت میں سفر کا تحمل بالکل نہیں ڈاکٹر برکت علی نے سفر سے پہلے اور سفر کے دوران کی دوائیں بھی دے دی تھیں لیکن عدم تحمل کی وجہ سے اور سب لوگوں کے مشورہ کی وجہ سے ۴ربیع الاول سے پھر حکیم عبدالجلیل کا علاج شروع ہوگیا اور دہلی سے عبدالحمید صاحب اور بریلی سے حکیم محمد صدیق صاحب کو بلانے کے تار دیے گئے مگر حکیم عبدالحمید صاحب پاکستان جارہے تھے، البتہ حکیم محمد صدیق صاحب پہنچ گئے۔ ربیع الثانی کے آخری ہفتے میں تنفس کی شکایت شدت سے بڑھ گئی۔ باوجود نیند کے غلبہ کے جس کروٹ بھی لیٹتے تنفس کا غلبہ بہت شدت سے ہوجاتا۔ یکم جمادی الاول سے استفراغ کا غلبہ ہوگیا۔ ہر دوا، غذا قے میں نکل جاتی۔ ۲ جمادی الاول دوشنبہ کو پھر ڈاکٹر برکت علی صاحب کو لے کر زکریا حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے مایوسی کا اظہار زکریا سے کیا اور نسخہ بھی تجویز کیا۔ حضرت قدس سرہ سے زکریا نے تخلیہ میں کہا کہ مولوی حمید الدین صاحب کا کلکتہ سے خط آیا ہے کہ پہلا اثر سحر کا تو زائل ہوگیا، لیکن ساحر نے دوبارہ شدید ترین سحر کیا ہے۔ ۷ جمادی الاول شنبہ کو صبح کی نماز کی ایک رکعت پڑھنے کے بعد زنانہ مکان میں چوکی سے چکر آنے کی وجہ سے گر گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ عمر بھر میں کبھی دورانِ سر نہیں ہوا۔ اتوار کی صبح کو زکریا ڈاکٹر برکت علی صاحب کو لے کر گیا اور اتوار کے دن سے صحت کی خبریں جمعرات تک آتی رہیں حضرت قدس سرہ نے یہ بھی فرمایا کہ محمود کا خط شدید تقاضے کا آیا تھا کہ اگر تو منظور کرے تو میں ہوائی جہاز لے کر دہلی پہنچ جاؤں اور آپ کو میں مع اہل وعیال لے آؤں، دونوں حکومتوں سے میں خود نمٹ لوں گا۔ حضرت نے زکریا سے فرمایا کہ ایک دن تیرا انتظار بھی کیا کہ مشورہ سے جواب لکھوں، مگر محمود کے انتظار کی وجہ سے میں نے لکھ دیا کہ جو دینی وعلمی خدمت یہاں کرسکتا ہوں وہاں نہیں ہوسکتی۔ زکریا نے عرض کیا ''حضرت بالکل سچ فرمایا۔''

جمعرات تک روزانہ صحت کے اضافے کی خبریں آتی رہیں۔ ۱۲ جمادی الاول ۷۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۵۷ء جمعرات کے دن زکریا دارالحدیث میں بخاری کا سبق پڑھارہا تھا کہ عبداللہ مؤذن نے جاکر کہا کہ حضرت مدنی کا انتقال ہوگیا۔ محمود علی خاں کے ہاں ٹیلیفون آیا ہے۔ زکریا وہاں سے اٹھ کر سیدھا ریل پر پہنچ گیا کہ گاڑی کا وقت قریب تھا۔ بعد میں مولانا اسعد سلمہ کی بھیجی ہوئی کار بھی پہنچی مگر زکریا جاچکا تھا۔

جمعرات کی صبح کو عزیزان مولوی اسعد وارشد سلمہما کو آپس کے اتحاد ومحبت کی نصیحتیں بھی فرمائیں اور دوپہر کو بلا سہارا کمرہ سے صحن میں کھانا کھانے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور اہلیہ کو

صبر علی المصائب کی تلقین فرماتے رہے، پون بجے سونے کے لیے لیٹے تھے، ڈھائی بجے تک خلاف معمول نماز کے لیے نہ اٹھنے پر اہلیہ محترمہ دیکھنے گئیں تو برد اطراف پایا، جس پر مولوی اسعد کو آدمی بھیج کر بلایا کہ آج سب بے فکر تھے کہ طبیعت بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹر نے آ کر کہا کہ تشریف لے گئے۔ ۹ بجے شب کے جنازہ کی نماز کا اعلان ہوا، لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا تار مراد آباد سے پہنچا کہ ''ہم روانہ ہو چکے۔'' اُن کے لینے کے لیے روڑکی کار بھیجی گئی کہ سیدھے آ جاویں۔ ساڑھے بارہ تک انتظار کے بعد جنازہ کی نماز ہوئی وہ حضرات نماز کے بعد پہنچے۔ ۳ بجے تدفین عمل میں آئی۔ تقریباً تیس ہزار کا مجمع بتلایا جاتا ہے، اعلی اللہ مراتبہ نور اللہ مرقدہٗ۔

نواں حادثہ انتقال حضرت رائپوری مع تفصیل شدید بیماری:

(۹)...... میرے اکابر نور اللہ مراقدہم کے حوادث میں میرے لیے آخری حادثہ سخت ترین حادثہ میرے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ کا حادثہ وصال ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جس کا بیان کسی دوسری جگہ آ رہا ہے۔ حضرت قدس سرہ کا معمول بار بار پاکستان تشریف لے جانے کا ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ حضرت قدس سرہٗ اور ان کے شیخ اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر پاکستان ہی میں تھے۔ خود حضرت قدس سرہٗ کا وطن بھی پاکستان ہے، اس لیے کئی مرتبہ تشریف بری ہوئی، جس کو علی میاں حضرت قدس سرہٗ کی سوانح میں مفصل لکھ چکے ہیں۔

آخری تشریف بری معرکۃ الآراء تھی، اس لیے کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو گویا مرض الوصال شروع ہو گیا تھا، جس کی ابتداء ۱۸ شوال ۷۴ھ مطابق ۱۰ جون ۵۵ء بروز جمعہ منصوری پر ہو چکی تھی۔ دفعۃً بہت طبیعت ناساز ہوئی، صبح کے کھانے میں مچھلی کھائی تھی، جس سے بخار اور سینے میں درد ہوا۔ شنبہ کو زکریا کو بلانے کے لیے آدمی آیا، مگر مجبوری کی وجہ سے اس دن جانا نہ ہوا۔ پیر کی صبح کو اولاً عزیز جلیل کا منصوری سے تقاضے کا خط اور پھر شام تک دو تار بلانے کے آئے۔ منگل کی صبح کو زکریا، قاری سعید مرحوم، میر صاحب، خان صاحب منصوری گئے۔ ۴ بجے شام پہنچے طبیعت اچھی پائی۔ ابتداء سال ہونے کی وجہ سے حضرت کے ارشاد پر بدھ کو واپسی ہو گئی اور ۲ ذیقعدہ کو حافظ عبدالعزیز صاحب و عزیز جلیل منصوری سے واپس آ کر لاہور چلے گئے۔ ۱۲ ذی قعدہ یک شنبہ کی صبح کو صوفی عبدالمجید صاحب اپنی کار میں حضرت کو منصوری سے لے کر بہٹ پہنچے اور دوشنبہ کی صبح کو صوفی صاحب تو اپنی کار میں لاہور روانہ ہو گئے اور حضرت کا قیام بہٹ میں گانگروں والی نہر کی کوٹھی پر اس وجہ سے ہوا کہ ڈاکٹر کو وہاں آنے جانے میں سہولت رہے۔ ۱۹ ذیقعدہ یک شنبہ کی صبح کو حضرت کا ایکسرے کے لیے سہارنپور آنا طے تھا۔ لیکن اذان سے پہلے بہٹ سے زکریا کے پاس کار پہنچی کہ ۱ بجے شب شدید دل کا دورہ پڑا ہے، ڈاکٹر برکت علی کو لے کر فوراً آ ؤ۔ فوراً اذان کے بعد اپنی صبح کی

جماعت کر کے ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر روانگی ہوئی اور مریضوں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی صبح ۸ بجے کی لاری سے واپسی ہوئی اور دوشنبہ سے زکریا کا روزانہ کا معمول ابوداؤد شریف کا سبق پڑھا کر سیدھے لاری سے بہٹ جانا اور علی الصباح چائے کے بعد تالیفی مشاغل اور سبق کی وجہ سے واپس آنا۔ ۲۶ ذیقعدہ یک شنبہ کو حضرت ایکسرے کے لیے تشریف لائے اور مدرسہ قدیم میں قاری سعید صاحب کے دارالافتاء میں جو دروازے کے اوپر تھا اب مہمان خانہ بن گیا، ڈاکٹر برکت علی کی رائے سے قیام ہوا کہ ہوادار جگہ ہے۔ منگل کی صبح سے زکریا نے آیاتِ شفا لکھ کر پلانا شروع کی۔ ۵ ذی الحجہ کو ڈاکٹر صاحب نے دوا بالکل بند کر دی کہ مرض کا کوئی اثر نہیں ہے۔ البتہ احتیاط بہت ضروری ہے، حرکت بالکل نہ ہو۔

عید الاضحیٰ کی نماز حضرت قدس سرہٗ نے مدرسہ قدیم کی مسجد میں ساڑھے چھ بجے ادا کی اور دارالطلبہ میں ساڑھے آٹھ بجے ہوئی، مہمانوں کا ہجوم حضرت کی عیادت کے سلسلے میں روز افزوں رہا۔ ۲۴ ذی الحجہ یک شنبہ کی صبح کو حضرت قدس سرہٗ شاہ صاحب کی کار میں سہارنپور تشریف لے گئے اور گویا مرض کا اثر نہیں رہا اور تندرستی ہو گئی، لیکن معمولی عوارض کا سلسلہ چلتا رہا، جس کے لیے ڈاکٹر صاحب سے وقتاً فوقتاً مراجعت کی نوبت آتی رہتی تھی، لیکن اصل مرض قلبی دورے کا اثر ڈاکٹر صاحب کے قول کے موافق بالکل نہیں رہا۔ بدھ یکم شعبان ۷۵ھ کی شب میں صوفی عبدالمجید، ڈاکٹر محمد امیر صاحب، بھائی افضل، حافظ عبدالعزیز صاحب وغیرہ آٹھ نفر ۳ بجے شب کے سہارنپور پہنچے اور صبح کو چائے کے بعد رائے پور حضرت قدس سرہٗ کا رمضان پاکستان گزارنے کی درخواست واصرار لے کر پہنچے اور جمعہ کی شام واپس آ کر لاہور چلے گئے۔ تین دن تک حضرت کا رمضان پاکستان گزارنے پر اصرار رہا، مگر حضرت نے پختہ ارادہ نہیں کیا اور سارے شعبان میں کئی بار پاکستانی وفود آئے اور پاکستان رمضان کرنے پر شدید اصرار کرتے تھے، لیکن بالآخر حضرت نے اِمسال ماہ مبارک رائے پور گزارنا طے فرمالیا۔ اس سے قبل کئی رمضان پاکستان میں گھوڑا گلی متصل راولپنڈی میں گزارے تھے۔ اس سال حضرت اقدس رائے پوری نے رائے پور میں اور حضرت اقدس مدنی نے ماہ مبارک بانسکنڈی میں گزارا۔

۱۲ صفر ۷۶ھ میں صوفی عبدالمجید صاحب و ڈاکٹر محمد امیر صاحب وغیرہ حضرت قدس سرہٗ کو لینے کے لیے دوبارہ تشریف لائے، مگر ضعف وعلالت کی وجہ سے اس مرتبہ بھی حضرت تشریف نہیں لے گئے۔

شب یکشنبہ ۲۱ ربیع الاول ۷۶ھ کو صوفی جی، بھائی اسلم صاحب، اکرم افضل اپنی اپنی کاروں میں لاہور سے چل کر سہارنپور پہنچے اور دوسرے دن صبح کو مع زکریا، علی میاں، عزیزانِ یوسف و انعام رائے پور روانہ ہوئے اور دوشنبہ کی صبح کو مع حضرت قدس سرہٗ اپنی نماز پڑھ کر ایسے وقت

سہارنپور پہنچے کہ مدرسہ میں جماعت ہو رہی تھی اور اسی وقت کاروں سے لدھیانہ روانہ ہو گئے اور اور ۱۰ بجے بخیریت لدھیانہ پہنچ گئے۔ شام کو ۸ بجے مولوی عبدالمنان کا تار لدھیانہ بخیر رسی کا پہنچ گیا۔ وہاں سے منگل کو چل کر ۱۰ بجے لاہور پہنچ گئے۔ جلیل کا تار بخیر رسی کا آیا۔ ۳ ماہ لاہور کے قیام کے بعد ۲ فروری ۷۵ھ کو لائل پور تشریف لے گئے۔ ۳ شوال ۷۶ھ کا دیا ہوا تار صوفی جی کا پہنچا کہ حضرت خیریت سے ہیں۔ آج لائل پور سے لاہور واپس آگئے اور روزانہ تار، ٹیلیفون سے حضرت کی سہارنپور کی ناسخ و منسوخی کی خبریں آتی رہیں۔ ۱۱ شوال کو بذریعہ کار لدھیانہ پہنچے۔ وہاں سے ٹیلیفون ملانے پر جواب ملا کہ ''کل صبح کو واپسی ہے اور زکریا کو ساتھ لے کر سیدھے رائے پور جانا ہے۔'' چنانچہ ۱۲ شوال کی صبح کو ۵ بجے لدھیانہ سے چل کر ۱۰ بجے سہارنپور اور زکریا کو ساتھ لے کر ۱۲ بجے رائے پور پہنچ گئے۔ علالت کا سلسلہ تو کم و بیش چل ہی رہا تھا، عزیزانِ مولوی یوسف وغیرہ کو علالت کی خبر پہنچی تو وہ یکشنبہ یکم ذی الحجہ کی شب میں دلی سے آکر علی الصباح مع زکریا رائے پور حاضر ہوئے اور بدھ کی صبح کو رائے پور سے واپس آکر دہلوی حضرات واپس گئے۔

۲۰ ذی الحجہ کی شب میں حضرت پر پھر قلبی دورہ پڑا، ایک گھنٹہ تنفس بھی خراب رہا۔ ۳ محرم کو علی میاں بھی حضرت کے دورے کی خبر سن کر لکھنؤ سے آئے اور علی الصباح رائے پور جا کر پانچ دن میں واپس ہوئے۔

۱۴ ربیع الاول ۷۷ھ کو حضرت رائے پوری کا پیام پہنچا کہ ''تمہاری برکت سے بتیس (۳۲) سال کے بعد آج سے مرچ کھانی شروع کر دیں، مرچ کی طرف خود بخود رغبت پیدا ہو گئی۔'' یہ غالباً کسی مرض ہی کا اثر ہو گا ورنہ حضرت قدس سرہٗ تو مرچ بالکل نہیں کھا سکتے تھے اور یہ اثر بھی کچھ ہی دنوں رہا پھر جاتا رہا۔

۸ ربیع الثانی ۷۷ھ یوم جمعہ کو چودھری عبدالمجید صاحب اور بھائی کے برادرِ بزرگ بھائی اسلم صاحب پہنچے، تاکہ حضرت قدس سرہٗ کو پاکستان لے جانے پر اصرار بھی کریں اور تاریخ کی تعیین بھی کرائیں۔ دوسرے دن بھائی اکرام رائے پور گئے تو حضرت قدس سرہٗ نے ان سے فرمایا کہ ''سفر کی بالکل ہمت نہیں مگر یہ بے حد اصرار کر رہے ہیں، یہ جرأت اللہ جل شانہٗ نے شیخ الحدیث ہی کو دی ہے کہ سختی سے انکار کر کے اس پر جم جائیں، ان دونوں کو راضی کر لو کہ اس وقت تو معاف کر دو۔'' چنانچہ سب کے زور دینے سے چند ماہ کا التواء ہو گیا اور ایک صاحب سے فرمایا کہ ''جتنی محبت یہ پاکستان والے کرتے ہیں اگر تم ان سے آدھی بھی کر لو تو میں کیوں مارا مارا پھروں۔'' پیر کو التواء کا تار لاہور دے دیا گیا، لیکن منگل کو مولوی عبدالمنان کا پاسپورٹ تیار ہو کر دہلی سے آگیا۔ بدھ کو پھر سفر طے ہو گیا۔ یہ مراحل ہمیشہ حضرت قدس سرہٗ کے ہر سفر میں پیش آتے، چاہے ہند سے پاک کا

ہو یا پاک سے ہند کا۔ تار مہینوں چلتے رہتے تھے۔

۲۸ ربیع الاول پنجشنبہ کی صبح کو صوفی جی کار سے لے کر پہنچ گئے۔ زکریا بھی رائے پور ساتھ گیا۔ بعد نماز جمعہ حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں رائے پور سے چل کر آدھ گھنٹہ میں سہارنپور اور تقریباً آدھ گھنٹہ میں دیوبند حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عیادت کو پہنچ گئے۔ دیوبند قیام کے بعد شام ہی کو واپسی ہوگئی اور شنبہ کے دن دوپہر کو اپنی ظہر پڑھ کر لدھیانہ کے لیے روانہ ہوگئے اور دوسرے دن علی الصباح ۳ ربیع الثانی ۷۷ھ مطابق ۲۴ نومبر ۵۷ء کو لاہور پہنچ گئے ۲۳ فروری تک لاہور میں قیام رہا۔ ۲۴ فروری کی صبح کو لائلپور تشریف لے گئے اور یکم مارچ کو پھر لاہور تشریف لے آئے، تاکہ فوراً ہی ہندوستان روانہ ہو جائیں۔ مگر وہاں آنے کے بعد پھر اصرار شروع ہوئے۔ ناسخ منسوخ کی تاریخیں روزنامچہ ہیں، حالانکہ نومبر میں روانگی کے وقت نہایت مؤکد مواثیق اور مواعید اہلِ پاکستان سے طے ہوگئے تھے کہ اس سال کا رمضان رائے پور گزارنا ہے، مگر ناسخ منسوخ ہوتے ہوتے رمضان ۷۷ھ بھی پاکستان صوفی جی (صوفی عبدالمجید صاحب مرحوم) کی کوٹھی پر گزارا۔ ۷ شوال کو دودن کی لگاتار کوشش کے بعد ٹیلیفون ملا۔ جس پر بھائی عبدالوہاب متھلوی نے جواب دیا کہ جلیل لائلپور گیا ہوا ہے، ڈاکٹر یوسف علی صاحب ماہر قلب نے بہت غور سے حضرت کا معائنہ کرنے کے بعد چھ ہفتہ مکمل آرام اور سفر نہ کرنے پر اصرار کیا کہ قلبی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ ۱۱ ذیقعدہ کی شب میں ہمارے مدرسہ کے نائب مہتمم تعلیمات مولانا عبدالمجید صاحب جو بکارِ مدرسہ لائل پور گئے ہوئے تھے حضرت قدس سرہٗ کا شدید تقاضا بنام زکریا کہ عطاء الرحمٰن اور شاہ مسعود کو میرے لینے کے لیے جلدی بھیج دو۔ شاہ مسعود صاحب چندروز کے بعد چلے گئے۔ ۲۵ ذیقعدہ کو برادران اکرام، محمود لاہور سے واپس آئے، معلوم ہوا کہ حضرت نے شاہ صاحب کو یہ کہہ کر باصرار روک لیا کہ تم چلے گئے تو میری واپسی میں بڑی تاخیر ہو جائے گی۔ ۱۴ ذی الحجہ مطابق ۲ جولائی کو بہت مشکل سے میر آل علی صاحب نے ٹیلیفون ملایا۔ جواب ملا کہ حضرت کی طبیعت آہستہ آہستہ صحت کی طرف ترقی کر رہی ہے، ابھی روانگی کچھ طے نہیں ہے۔ اس کے بعد کئی دفعہ تاریخیں تجویز ہوئیں اور تخلیوں کے بعد التواء ہوتا رہا۔

بالآخر ۲۳ ربیع الاول ۷۸ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۵۸ء کو حضرت اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ مع صوفی جی وغیرہ فرنٹیر میل سے چل کر رات کو ۳ بجے سہارنپور پہنچے، شاہ صاحب کے مکان پر قیام فرمایا اور مسلسل قیام بہٹ ہاؤس رہا۔ زکریا کا معمول حدیث کا سبق پڑھا کر سیدھا بہٹ ہاؤس جا کر عشاء کے ایک گھنٹہ بعد واپسی کا رہا اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا رمضان بھی اس سال بہٹ ہاؤس ہوا۔ اس لیے زکریا کا بعد عصر کا اسماع بھی نہیں ہو سکا۔ قبل عصر جا کر عصر بھی حضرت کے ساتھ پڑھتا اور

تراویح شاہ مسعود کے پیچھے پڑھ کر دس بجے واپسی ہوتی۔

حضرت قدس سرہٗ شروع کے دو ایک دن بیٹھ کر پھر ڈاکٹر کے منع کرنے پر لیٹ کر اور اس کے کچھ دنوں بعد بغیر تراویح کے لیٹے لیٹے سنتے رہے۔ ڈاکٹر برکت علی صاحب کا علاج اہتمام سے ہوتا رہا۔ روزوں کی ممانعت تھی، اس سال عید الاضحیٰ کی نماز بھی حضرت قدس سرہٗ نے بہٹ ہاؤس ہی میں پڑھی۔ پاکستانی احباب کی بہت کثرت سے آمد اور تقاضے ہوتے رہے۔ بالآخر ابراہیم پہلوان لائلپوری نے حضرت سے بات کر کے ٹکٹ خرید لیے اور حضرت قدس سرہٗ مع خدام ۲۸ ربیع الاول ۷۹ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۵۹ء فرنٹیر میل سے شب میں ۲ بجے روانہ ہو گئے اور اگلے دن شام کو صوفی جی کا تار لاہور بخیر رسی پہنچ گیا۔ اس دوران میں لاہور اور لائلپور والوں میں خوب رسہ کشی ہوئی اور دونوں میں سخت کلامیاں بھی ہوئیں جن کی تفصیل تو غالباً حضرت اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح میں علی میاں لکھ چکے ہوں گے، اس وقت تو کچھ یاد نہیں، لیکن یہ رمضان حضرت قدس سرہٗ کا لائلپور میں ہوا۔ ۴ شوال کو حسب قرارداد صوفی جی وغیرہ لاہور سے کاریں لے کر گئے، سامان بھی رکھا گیا۔ پانچ سو (۵۰۰) کے قریب حضرات نے مصافحہ بھی کر لیا۔ لیکن لائلپور والے سول سرجن کی تحریر لے آئے کہ تین ماہ ہرگز سفر مناسب نہیں، اندراج کٹوا دیا گیا، سفر ملتوی ہوا اور چونکہ یہ حربہ پاکستانی احباب ہمیشہ حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ کیا کرتے تھے، اس لیے ایک دوسرے کی تجاویز کو خوب سمجھتا تھا۔ لاہور کی واپسی ملتوی ہو گئی، بالآخر ایک سال سترہ یوم کے بعد ۲۵ ربیع الثانی ۸۰ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۶۰ء کو شب دوشنبہ میں فرنٹیر سے حضرت واپس تشریف لائے اور "بہٹ ہاؤس" میں قیام رہا۔ حضرت قدس سرہٗ کا رائے پور تشریف لے جانے کا بہت ہی تقاضا رہا، مگر مولوی عبدالمنان صاحب شدت سے علاج کی سہولت کی وجہ سے مخالفت کرتے رہے، لیکن افسوس کہ ڈاکٹر برکت علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت کا بہت ہی اہتمام سے علاج کرتے تھے اور باوجود خود قلبی مریض ہونے کے روزانہ حضرت کو دیکھنے آتے تھے، اُن پر ۹ شعبان ۸۰ھ شب جمعہ میں قلبی دورہ پڑا اور فوراً ساڑھے گیارہ بجے انتقال فرما گئے اور جمعہ کے دن بعد نمازِ جمعہ حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے بہٹ ہاؤس میں نمازِ جنازہ ہوئی اور حاجی شاہ میں تدفین ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد سے ان کے جانشین ڈاکٹر فرحت علی صاحب نے بھی حضرت کے علاج میں بہت ہی اہتمام فرمایا۔ جزاہم اللہ اور جب ڈاکٹر برکت علی صاحب کا انتقال ہو گیا اور یہ عذر بھی نہ رہا تو بالآخر ۲۵ شعبان ۸۰ھ دوشنبہ کو رائے پور کو روانگی ہوئی۔ زکریا بھی ہم رکاب تھا۔ یہ رمضان رائے پور میں گزرا۔

ربیع الثانی ۸۱ھ میں صوفی صاحب کے تار حضرت کو لے جانے کے لیے بار بار آتے رہے اور حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے سفر کی ہمت نہ ہونے کی وجہ سے التواء کے تار بکثرت جاتے رہے،

جن کو ان حضرات نے خدام کی طرف سے سمجھا، اس لیے ۹ جمادی الاول جمعہ کو صوفی جی مع بھائی اکرام صاحب بذریعہ کار سہارنپور اور شنبہ کو رائے پور پہنچے، زکریا بھی ساتھ تھا، ان حضرات نے بار بار حضرت قدس سرہٗ سے تشریف لے چلنے کی درخواست کی، حضرت معذرت فرماتے رہے۔ ان حضرات نے مشورہ میں یہ طے کیا کہ جب زکریا واپس ہو جائے پھر اصرار کیا جائے۔ زکریا نے بدھ کے روز واپسی کی اجازت چاہی۔ حضرت قدس سرہٗ نے یہ فرما کر کہ اتنے مشکلوں اور تقاضوں سے تو تم کو بلایا ہے، اجازت سے انکار کر دیا۔ لیکن جمعرات کے دن بخاری شریف کے زیادہ باقی رہنے کے عذر کی وجہ سے اجازت ملی، مگر گرانی سے۔ اس لیے کہ زکریا ہر ہفتہ، جمعہ کی نماز کے بعد جا کر اتوار کی صبح کو واپس آتا رہا اور بخاری شریف کے ختم پر ۱۴ رجب شنبہ کی صبح کو ایک ہفتہ کی نیت سے حاضر ہوا۔ حضرت قدس سرہٗ بہت ہی خوش ہوئے، لیکن جب پنجشنبہ کو واپسی کی اجازت چاہی تو تکدر سے فرمایا کہ "شیخ الحدیث ہو کر دھوکہ دیتے ہو ایک ہفتہ کہاں ہوا؟" لیکن جمعہ اور بعض مجبوریوں کی وجہ سے جمعہ کی صبح کو واپسی ہوگئی اور حسب سابق جمعہ کو جا کر اتوار کی صبح کو واپسی ہوتی رہی۔ ماہِ مبارک کے متعلق یہ تجویز کیا کہ نصف سہارنپور گزرے اور نصف رائے پور۔ چنانچہ ۱۵ رمضان کو رائے پور کا ارادہ تھا مگر مولانا یوسف صاحب کی آمد کے انتظار میں ۱۷، کو قبل عصر ان کی آمد ہوئی اور اسی وقت ان کی گاڑی میں روانہ ہو کر افطار حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ ہوا۔ مولانا یوسف صاحب تو دوسرے دن واپس آ گئے اور زکریا مستقل ٹھہر گیا۔ البتہ ایک دو دن کے لیے درمیان میں بعض ضرورتوں کی وجہ سے آنا ہوا۔ اس کے بعد یکم شوال ۸۱ھ پنجشنبہ ساڑھے سات بجے عید کی نماز حضرت کی معیت میں باغ کی مسجد میں آزاد صاحب کی اقتداء میں پڑھ کر فوراً سہارنپور واپسی ہوگئی، یہاں عید کی نماز اس وقت تک نہیں ہوئی تھی۔

چونکہ حضرت کا سفر پاکستان طے شدہ تھا، اس لیے زکریا کی بار بار آمد ہوتی تھی اور ہر مرتبہ جا کر آنا بہت مشکل ہوتا تھا کہ حضرت کو گرانی ہوتی تھی۔ ۵ شوال کو رائے پور کی حاضری پر حضرت قدس سرہٗ کی غیبت میں حافظ عبدالعزیز صاحب سے طویل گفتگو کے بعد زکریا نے حضرت قدس سرہٗ کی غیبت میں حافظ صاحب کے مستقل رائے پور میں قیام کا اعلان کیا۔ علی میاں نے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی سوانح میں بھی صفحہ ۲۰۴ پر مختصراً اس قصہ کو لکھا ہے۔ ۳۰ شوال کو واپسی کی درخواست پر مصافحہ کرتے وقت حضرت قدس سرہٗ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس لیے واپسی ملتوی کر دیا۔ ۳ ذیقعدہ کو واپسی ہوئی، چونکہ مدرسہ کا ابتدائے سال تھا، تقسیم اسباق وغیرہ امور میں مدرسہ کو بھی زکریا کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی۔

اس کے بعد چونکہ حضرت کا سفر طے ہو چکا تھا اور جنرل شاہ نواز نے اپنے اسپیشل میں لے جانا

طے کیا تھا اور ہر جگہ تار بھی روانہ ہو گئے تھے کہ وزیر صاحب کا اسپیشل فلاں وقت پہنچے گا، لیکن چار پانچ دن پہلے مردوں اور عورتوں کا اتنا ہجوم ہوا کہ حد نہیں۔ جس کی وجہ سے حضرت قدس سرہٗ کا بلڈ پریشر ایک دو (۲) دن قبل دوسو دس (۲۱۰) تک پہنچ گیا، ڈاکٹر فرحت علی صاحب نے بہت شدت سے سفر کے خلاف فیصلہ دیا اور سب جگہ التواء کے تار دے دیے گئے۔ جنرل شاہ نواز نے جواہر لال کی ایک ضروری تجویز کو بھی یہ کہہ کر تعمیل سے معذرت کر دی تھی کہ اس تاریخ میں مجھے حضرت کو بورڈ پر پہنچانا ہے۔ التواء کے بعد جنرل صاحب رائے پور پہنچے اور یہ درخواست کی کہ ''آئندہ جب ارادہ ہو دو تین دن پہلے تار سے اطلاع کر دیں۔'' مگر حضرت قدس سرہٗ کا سفر روزانہ ناسخ منسوخ ہوتا رہا اور ۲۵ ذیقعدہ ۸۱ھ مطابق یکم مئی ۶۲ء شب منگل میں فرنٹیر سے روانگی ہوئی اور یہ حضرت قدس سرہٗ کی پاکستان کو آخری روانگی ہے کہ پھر واپسی نہ ہو سکی۔

روانگی سے پہلے حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے بہت لجاحت، خوشامد، منت وسماجت سے ایک مجلس میں جس میں یہ ناکارہ بھی حاضر تھا، صوفی عبدالمجید صاحب اور بعض خصوصی احباب پاکستان جناب الحاج مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب، حضرت کے برادر زادے مولوی عبدالجلیل اور ان کے دوسرے عزیز مولوی عبدالوحید وغیرہ موجود تھے، یہ درخواست پیش کی کہ ''مجھے پاکستان میں نہ روکا جائے اور میری رائے پور واپسی میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے کہ میری تمنا اپنے حضرت کے قدموں میں دفن ہونے کی ہے۔ اس سے جانے کو دل نہیں چاہتا، مگر تم دوستوں کے اصرار پر جا رہا ہوں۔'' میرے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا تھا کہ ''زندگی بھر تو ساتھ ہی رہے تمنا یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی ساتھ ہی رہیں، مگر ہوتا ہے وہ جو اللہ چاہے۔''

حضرت کی وصیت خواہش دفن کے بارے میں:

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا یہ مقولہ پہلے بھی حضرت نے بار بار دُہرایا، صحت کے زمانے میں بھی کئی دفعہ دُہرایا۔ صحت کے زمانے میں اس ناکارہ نے ایک دفعہ اس ''مگر'' پر اشکال بھی کیا تھا اور حضرت بالکل ساکت وصامت رہے اور جب بھی حضرت کا مقولہ نقل کرتے، میں اس مگر میں گم ہو جاتا۔

بہر حال آخری پاکستان روانگی سے دو دن پہلے حضرات بالا کو اہتمام سے جمع کر کے اپنی تمنا اور خواہش ظاہر کی اور خاص طور سے عبدالجلیل کو مخاطب کر کے وعدہ لیا کہ مانع نہیں بنے گا اور حضرت حافظ عبدالعزیز صاحب لانے کے ذمے دار بنائے گئے اور صوفی عبدالمجید صاحب بھیجنے کے ذمے دار اور کئی کئی مرتبہ قول وقرار ہوئے اور جب وہاں پہنچنے کے بعد طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو بار بار ہندوستان راؤ عطاالرحمٰن اور شاہ صاحب کو تقاضے کے خطوط بھی لکھوائے، جن میں سے تیس (۳۰)

چالیس (۴۰) تو میرے واسطے سے ہوں گے کہ ''اگر مجھے لے جانا چاہتے ہو تو جلد آ کر لے جاؤ آخری وقت ہے۔'' میں ہر خط کی شاہ صاحب کو اطلاع دیتا رہا کہ ان کا قیام سہارنپور ہی میں تھا اور راؤ عطاالرحمٰن کو رائے پور پیام بھیجتا رہا۔ مگر یہ لوگ کچھ حضرت کی زندگی کی طرف سے ایسے مطمئن تھے کہ ان کو اس کا واہمہ بھی نہ تھا کہ وقت موعود جلدی آتا جارہا ہے۔ عالی جناب الحاج نجم الدین صاحب مدراس بوٹ ہاؤس والے حضرت قدس سرہٗ کو لینے کے واسطے پاکستان تشریف لے گئے۔ حضرت نے فرمایا جی تو میرا ابھی چاہ رہا ہے، مگر شاہ مسعود اور راؤ عطاالرحمٰن کی آمد پر جانے کا ارادہ ہے۔ یہ لاہور سے سیدھے سہارنپور اور پھر رائے پور حاضر ہوئے۔ لیکن بقول اعلیٰ حضرت کے ''مگر ہوتا وہ ہے جو اللہ چاہتا ہے۔'' شاہ مسعود صاحب تو ارادہ ہی فرماتے رہے، راؤ عطاالرحمٰن اس ناکارہ کے شدید اصرار پر شدتِ علالت نے مایوسی کی حالت تک پہنچا دیا تھا اور ایک ایک دن میں مختلف احباب کے تین چار تار زکریا کے نام صبح سے شام تک آتے کہ افاقہ ہے، خطرناک ہے، افاقہ ہے، خطرناک ہے، پہنچتے رہتے تھے۔ اس وقت غفلت ہے، اس وقت صحت ہے، بالآخر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس ۱۴ ربیع الاول ۸۲ھ مطابق ۱۶ اگست ۶۲ء پنجشنبہ کو لاہور سے ٹیلیفون پہنچا کہ رات ۹ بجے وصال ہو گیا۔ اس وقت ۹ بجے جنازہ کی نماز ہوگی۔ مولوی یوسف صاحب نے اسی وقت زکریا کے پاس ایک آدمی اجازت کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ لاہور روانہ ہو جائیں گے؟ زکریا نے انکار کر دیا کہ ''جب ۹ بجے نماز ہو گئی ہوگی تو تجہیز و تکفین اگر وہاں ہوئی تو شرکت نہیں ہو سکتی اور اگر جنازہ یہاں آرہا ہے تو ایسا نہ ہو کہ آپ وہاں جائیں اور جنازہ یہاں آجائے۔'' زکریا کے پاس رات سے کوئی برقیہ نہیں آیا تھا، تاروں کی تحقیق کی گئی، ٹیلیفون ملائے گئے، صابری صاحب کے صاحبزادے الحاج افضال صاحب آئے کہ لاہور کے ٹیلیفون سے حادثہ کی اطلاع ملی ہے اور ساتھ ہی پاکستان ریڈیو کی خبر سے یہ سُنا کہ جنازہ براہِ لائلپور، سہارنپور جائے گا۔ زکریا نے سہارنپور کی تردید کر دی کہ براہِ لائلپور کے ساتھ سہارنپور کا کوئی جوڑ نہیں، ان میں سے ایک خبر غلط ہے۔'' شام کے چھ بجے بھائی افضل کا بہت مفصل تار پہنچا کہ صبح ۱۱ بج کر ۲۰ منٹ پر وصال ہو گیا۔ اس کے بعد متعدد تار اس کی تائید میں پہنچے۔ حافظ عبدالعزیز صاحب ایک دن قبل سرگودھا اپنا پاسپورٹ وغیرہ لینے جا چکے تھے حادثہ کی اطلاع پر جمعرات کو عصر کے وقت ایسی حالت میں پہنچے کہ عصر کی نماز کے بعد فوراً جنازہ ٹرک پر رکھ کر ڈھڈیاں کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ حافظ صاحب بہت بیتابی سے کہتے رہے کہ مجھے زیارت تو کرنے دو، مگر ہجوم کی کثرت اور ڈھڈیاں لے جانے کی عجلت میں کسی نے التفات نہیں کیا۔

چونکہ جنازہ سہارنپور لانے کی امیدیں پہلے سے تھیں اور پاکستانی ریڈیو سے اشتباہ بھی پیدا ہو گیا تھا، اس لیے شدت سے انتظار تھا، لیکن کوئی اطلاع تدفین کے متعلق شنبہ کی صبح تک نہ مل سکی۔ شنبہ کی شب میں میر آل علی صاحب راؤ یعقوب علی خاں صاحب جو ڈھڈیاں نہیں گئے تھے لاہور ہی سے واپس آ گئے۔ ان سے جنازہ کے ڈھڈیاں جانے کا حال معلوم ہوا۔ زکریا نے عزیز مولوی جلیل کو بہت سخت خط لکھا کہ حضرت کی تمنا کا احترام بہت ضروری تھا، لیکن اس نے اتنی طویل معذوریاں، مجبوریاں، قانونی مشکلات اور نعش مبارک کے خراب ہونے کا خطرہ وغیرہ لکھے جن کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن جب ۲۹ ذیقعدہ ۸۴ھ کو مولانا یوسف صاحب کی نعش کے متعلق کوئی بھی اشکال قانونی نہ پیش آیا نہ کوئی دقت، تو پھر اور بھی زیادہ رنج ہوا۔ سعادت کی بات حضرت قدس سرہٗ کی تمنا کو اپنے جذبات پر مقدم رکھنا تھا۔ حافظ عبدالعزیز صاحب نے تو بہت ہی کوشش کی، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے، مگر ان کی کوشش ہجوم میں بالخصوص آخری وقت ہو جانے پر مثمر نہ ہو سکی، البتہ سہارنپوری جو احباب انتقال کے وقت موجود تھے، ان پر ہمیشہ تعجب رہا اور رہے گا کہ اتنے اونچے مدبّر، وسیع التعلقات ہونے کے باوجود حافظ صدیق نوح والوں کے برابر بھی نہ پہنچ سکے۔ جن لوگوں نے حضرت قدس سرہٗ کی تمنا کا خون کیا ہے، چاہے وہ پاکی ہوں یا ہندی۔ معلوم نہیں کل کو کس طرح سے حضرت قدس سرہٗ کے سامنے ہوں گے اور جن لوگوں نے نعش مبارک کے لانے کی انتہائی کوشش کی چاہے وہ کامیاب نہ ہوئے ہوں وہ حضرت کے سامنے سُرخرو ضرور ہوں گے۔ تمنا میں تو یہ ناکارہ بھی دوسرے فریق کے ساتھ ہمیشہ رہا۔ لیکن دفن کے بعد قبر شریف کو دوبارہ اکھاڑنے میں مجبور تھا کہ مسئلہ تو وہ ہے جو مفتیانِ عظام فرما دیں۔ اہلِ فتاویٰ سے میں نے براہِ راست حاصل کیے، بالخصوص ان لوگوں کے جو معروف بالفتویٰ ہیں، ہندی تھے یا پاکی۔ ان سب نے نبش کو ناجائز بتایا، اس لیے میں نبش کے مسئلہ میں ان حضرات کا متبع رہا اور جس نے میری ذاتی رائے پوچھی میں نے دونوں مسئلوں میں احباب اور مخلصین کے تعلق کی رعایت نہ کرتے ہوئے صفائی سے اپنی رائے ظاہر کر دی اور اس کا بھی ہمیشہ قلق رہا کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ۴۷ھ میں میری بچیوں کے حج کے وقت مجھے توجہ سے یہ کہہ کر روک دیا کہ میرے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا؟ مگر ہوتا وہی ہے جو مقدر میں ہے، یہ ظاہری بُعد ہم لوگوں کی نگاہ میں بعد ہے، عالمِ برزخ میں تو سب ایک ہیں، نہ معلوم کون کون کہاں کہاں تشریف فرما ہیں۔

ہمارے اہلِ محلّہ کا ہمیشہ ایک دستور رہا کہ ہمارے اکابر میں سے جس کسی کا وصال ہوتا، ایسا زور اس کی تدفین پر ہوتا کہ جھگڑے کا اندیشہ ہو جاتا۔ چنانچہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے متعلق حکیم صاحبان کی رائے تھی کہ ان کے باغ میں تدفین ہو، مگر اہلِ محلّہ نے وہ زور

باندھا کہ کچھ انتہا نہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ لیکن ہمارے متعلقین طلبہ یا دوسرے بعض اعزہ میں سے کسی کا پہلے انتقال ہوتا تو وہ گورِ غریباں میں جاتا، اب تک بھی یہی دستور ہے۔ میں نے ایک دفعہ اپنے آقا اپنے مرشد حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا تو میرے حضرت نے یہ فرمایا۔ ''یہ بُعد سارا زمین کے اوپر کا ہے زمین کے اندر عالمِ برزخ میں بُعد نہیں ہے، بہر حال مقدرات اپنی جگہ اٹل ہیں۔'' حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی خواہش وتمنا پوری نہ ہونے کا قلق جتنا ہے وہ ہمیشہ ہی رہے گا اور حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے بعد میں نے دوستوں کو جو خط لکھے، اس میں بھی میں نے اپنے قلق کا بہت ہی اظہار کیا۔ لیکن دفن کے بعد نبش قبر تو ہمارے اختیار سے باہر کا مسئلہ بن گیا تھا۔ مسائل میں جذبات کو تو دخل نہیں، اس میں تو درمختار اور شامی ہی کو امام ماننا پڑتا ہے اور ان حضرات کی آراء مقدم ہوتی ہیں جو ہر وقت فتاویٰ میں رہتے ہیں۔

عالمِ برزخ میں بُعد نہیں:

بات میں بات پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔ اکابر کے حالات بھی وصال کے بہت کثرت سے دیکھے اور گھر کی مستورات اور اقارب کے بھی، دفعتہً تین واقعات جن میں سے دو (۲) تو گزر بھی چکے، ایک اپنی سب سے بڑی لڑکی والدۂ ہارون کا انتقال، جو اس تحریر میں بھی مختصر گزر چکا، کسی دوسری تحریر میں بھی گزر چکا۔ مرحومہ نے بہت ہی تکلیفیں اٹھائیں، اس کو بھی تپ دق ہوگئی تھی، عین مغرب کی نماز کے دوران جب کہ وہ دوسری رکعت کے سجدہ میں تھی، اشارے سے نماز پڑھ رہی تھی قبلہ کی طرف منہ تھا، ایسی قابلِ رشک ہیئت سے گئی ہے کہ اس کے چہرے کے انوار اب تک یاد ہیں۔ میری دوسری لڑکی شاکرہ مرحومہ کے متعلق بھی لکھ چکا ہوں کہ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سورۂ یٰسین پڑھ رہے تھے ''سَلٰمٌ قَوْلاً مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ'' پر ایسا جذبہ مولانا مرحوم کو آیا کہ تین دفعہ اس لفظ کو پڑھا اور تیسری میں لونڈیا کی روح بھی ساتھ چل دی۔ اس میں کوئی تصنع یا توریہ نہیں کہ جس دن اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ عروسی بنی ہوئی اچھی لگ رہی تھی، اس سے زیادہ خوبصورت انوار میں لبریز سفید کفن میں سر کے بال سینے پر پڑے ہوئے، اب تک اس کا وہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور رہے گا۔ بیسیوں اعزہ مستورات کو انتقال کے بعد دیکھا، مگر ایسی حسین صورت مجھے یاد نہیں۔

تیسرا عجیب واقعہ مجھے اپنی پھوپھی صاحبہ نور اللہ مرقدھا کے ساتھ پیش آیا۔ مجھے کاندھلہ بلا سخت مجبوریوں کے، جو دو چار دفعہ پیش آئیں، ان میں پھوپھی صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ کے حادثۂ انتقال کے

وقت دو تین شب قیام کی نوبت آئی۔ آثار اس کے کئی دن پہلے سے شروع ہو گئے تھے، ساری رات میں، بھائی اکرام، حاجی محسن مرحوم میری پھوپھی کے داماد تھے، نمبروار جاگا کرتے تھے، انتقال کی شب میں صبح صادق سے ذرا پہلے وہ لیٹی ہوئی تھیں، ایک دم گھبرا کر بیٹھنے کی کوشش کی اور دروازے کی طرف دیکھ کر مجھ سے فرمایا کہ ’’جلدی اُٹھا کر مجھے سہارے سے بٹھا دے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔‘‘ چونکہ صبح کی اذان بالکل قریب تھی مجھے یہ خیال ہوا کہ نہ معلوم کتنی دیر لگ جائے جماعت فوت نہ ہو، حاجی محسن سے کہا کہ ’’جلدی بیٹھو۔‘‘ میری پھوپھی مرحومہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ’’تو بیٹھ‘‘۔

رَحِمَهُمُ اللّٰهُ كُلَّهُمْ رَحْمَةً وَّاسِعَةً

فصل ثانی......تقریبات اور شادیاں

اللہ جل شانہٗ کے انعامات، احسانات اس نابکار، بدکار، سیہ کار پر اپنی ناپاکی اور گندگی کے باوجود بارش کی طرح ہمیشہ برسے۔

میں جب سہارنپور ابتداء میں آیا تھا، یعنی ۲۸ھ میں، میں نے خواب میں دیکھا کہ ''مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ اس سیہ کار سے لپٹ گئے اور مجھے خوب بھینچا۔'' میں نے اپنے حضرت اقدس مرشدی قدس سرہٗ سے اس خواب کا ذکر کیا تھا تو حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''عنایت الٰہی تمہارے شاملِ حال ہے۔'' یہ تعبیر ہر چیز پر اور ہر ہر وقت میرے ساتھ رہی اور اللہ نے اپنے فضل وکرم سے ہر ہر موقع پر اپنی عنایت کو اس سیہ کار پر بارش کی طرح برسایا۔ ہر جزوِ زندگی میں جتنی میں نے نافرمانیاں کیں اتنی ہی مالک کی طرف سے عنایات میں اضافہ ہوتا رہا۔ خدا کرے کہ استدراج نہ ہو۔ ان میں سے ایک معمولی مسئلہ تقریبات اور شادیوں کا بھی ہے۔

میں نے دو (۲) اپنی اور ہمشیرہ زادی اور بنات اور ولد واسباط کی تقریباً سولہ (۱۶) سترہ (۱۷) شادی کیں اور ہر شادی میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وہ کرم فرمایا کہ کبھی یہ پتہ نہ چلا کہ نکاح کیا یا دو رکعت پڑھ لی۔

نکاح کی مروجہ رسم کی مذمت:

نکاح ایک عبادت ہے، جس کو لوگوں نے ایک مصیبت بنالیا۔ علماء نے لکھا ہے کہ دو (۲) عبادتیں ایسی ہیں کہ جو حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہو کر قیامت تک بلکہ جنت میں بھی باقی رہیں گی، ایک ایمان، دوسری نکاح۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا اور ارشاد فرمایا ''نکاح میری سنت ہے جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔'' مگر ہم لوگوں نے اس بابرکت سنت کو بے حد لغویات اس میں شامل کر کے اس کو ایک مصیبت عظمیٰ بنالیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہٴ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں یہ سنت ہی کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ لغویات جو ہم نے شامل کر لی ہیں، اُن کا شائبہ بھی اُس زمانے میں نہیں تھا۔

صحابہٴ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جو عشق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس کے کچھ نمونے اپنے رسالے حکایاتِ صحابہ میں لکھ چکا ہوں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایک

مشہور صحابی ہیں، عشرۂ مبشرہ میں ہیں، حضور کے جاں نثاروں میں ہیں، مگر اپنی شادی میں حضور کو بلانا تو درکنار خبر بھی نہ کی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کپڑوں پر کچھ ''صفرہ'' کا اثر دیکھا، یہ ایک قسم کی خوشبو ہے جو اس زمانے میں شادیوں کے موقع پر استعمال کی جاتی تھی اس کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ کیا تم نے شادی کر لی؟ انہوں نے عرض کیا، جی حضور!

اس ناکارہ نے ایک رسالہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے نکاح اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی تفاصیل جس کا ذکر تالیفات میں گزر چکا ہے، تفصیل سے لکھا ہے، مگر طبع نہ ہو سکا۔

بندہ کا پہلا نکاح:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ ''جو نکاح بہت ہلکا پھلکا ہو وہ بہت مبارک ہے۔'' مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس مبارک سنت کو اپنی رسوم کی بدولت مشکل ترین بنا دیا ہے۔ نہ معلوم کتنی نمازیں اس کی نذر ہو جاتی ہیں، بعض جگہ تو مصیبت یہ ہے کہ عین نماز کے وقت بارات رخصت ہوتی ہے کہ جس سے دولہا، دلہن اور سارے باراتیوں کی جماعت فوت ہوتی ہے، جس کی ابتداء اس نحوست سے ہوتی ہو اس کی منتہا پر آپس میں لڑائیاں، فتنہ، فساد جتنا ہو وہ کم ہی ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جو حمل اس صحبت سے ٹھہرے جو نماز کے وقت میں کی گئی ہو یعنی اس سے نماز فوت ہوئی ہو تو اس سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ ''عَاق بِالْوَالِدَیْن'' ہوتا ہے یعنی والدین کا نافرمان اور ان کو تکلیف پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور ہم کو ہدایت سے نوازے اور اس سے بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ ان ہی لغویات کی وجہ سے لڑکیاں ایک لمبی عمر تک بیٹھی رہتی ہیں، شادی کا انتظام نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ بعض جگہ اس مصیبت کے لیے سُود پر روپیہ لینا پڑتا ہے، جس کے متعلق قرآن پاک میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی اور اعلانِ جنگ بتایا گیا ہے۔ اللہ سے لڑائی اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلانِ جنگ کے بعد کون پنپ سکتا ہے اور ان کی ساری مصیبتوں کا عذر اور مجبوری یہ بتائی جاتی ہے کہ ''ناک کٹ جاتی ہے۔'' میں نے سینکڑوں اکابر و احباب کو ان خرافات کے بغیر سادگی کے ساتھ نکاح کرتے دیکھا مگر کسی ایک کی بھی ناک کٹی ہوئی نہ دیکھی،

آپ بیتی کے چند واقعات اس جگہ لکھوانے ہیں:

(۱)......سب سے پہلے اس ناکارہ کی پہلی شادی ۲۹، صفر بروز دوشنبہ ۳۵ھ میں ہوئی۔ جس کا

ذکر میری والدہ صاحبہ کے انتقال کے سلسلہ میں آ بھی چکا ہے میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے حادثۂ انتقال کے دن ہی سے میری والدۂ مرحومہ کو بخار شروع ہوا تھا، جس نے اخیر میں ان کو والد صاحب سے جا کر ملا ہی دیا۔ میری والدہ مرحومہ نے میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے انتقال جو ۱۰ ذیقعدہ ۳۴ھ کو ہوا، اس سے کچھ دنوں بعد میرے حضرت قدس سرہٗ کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ "طبیعت خراب ہے، زندگی کا اعتبار نہیں، میری خواہش یہ ہے کہ زکریا کا نکاح جلد ہو جائے تا کہ گھر کھلا رہے۔" اس وقت میری ہمشیرہ بھی بہت چھوٹی اور اکیلی تھی۔ حضرت قدس سرہٗ نے اسی وقت کاندھلہ خط لکھوا دیا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کا طرز کاندھلہ کے جملہ اکابر کے ساتھ اور جملہ کاندھلہ کے اکابر کا طرز میرے حضرت کے ساتھ ایسے گھر کے چھوٹے بڑوں کا سا تھا کہ حضرت قدس سرہٗ بھی بے تکلف احکام جاری فرماتے تھے، جیسے گھر کا بڑا کیا کرتا ہے اور کاندھلہ کے سارے اکابر حضرت قدس سرہٗ کے ارشاد کو ایسا اہم قابلِ وقعت سمجھتے تھے کہ ذرا کچھ چوں و چراں نہ کرتے۔ سینکڑوں واقعات اس قسم کے پیش آئے۔ میرے حضرت کا خط جاتے ہی وہاں سے جواب آیا کہ "جیسا ارشاد ہو، جب چاہیں تشریف لے آئیں۔"

تاریخ مقرر فرمادی اور میرے ہم زلف عزیز ظہیر الحسن مرحوم کا بھی میرے ساتھ ہی نکاح تجویز کر دیا کہ حضرت کی تشریف آوری ہو رہی ہے۔ حضرت تشریف لے گئے، یہ ناکارہ اور چچا جان اور حضرت کے دو خادم، یہ جملہ بارات کاندھلہ پہنچی، میرے حضرت نے نکاح پڑھایا۔ اس وقت تک ہمارے خاندان کا مہر "مثل" اسی ہزار ٹکے دو (۲) دینار زرِ سُرخ" تھا۔ یہی عام طور سے ہر نکاح میں ہوتا تھا۔ حضرت نے نکاح کی ابتداء میں مہر دریافت فرمایا تو یہی بتایا گیا۔ حضرت نے لاحول پڑھی اور فرمایا کہ اس کے روپے بناؤ۔ خاندان کے سب اعزہ محاسبین موجود تھے۔ اتنے حضرت نے خطبہ پڑھا، کسی نے جلدی سے ڈیڑھ ہزار کہہ دیا اور حضرت نے میرا نکاح ڈیڑھ ہزار پر پڑھا دیا، میرے بعد جب عزیز ظہیر الحسن مرحوم کا نمبر آیا تو سب نے کہا حضرت ڈیڑھ نہیں ڈھائی ہزار ہوتے ہیں، اس وقت سے ہمارے خاندان کا مہر مثل ڈھائی ہزار قرار پا گیا۔ جو میری بچیوں کے دور تک رہا۔ خاندان میں اب بھی یہی ہے مگر میری بچیوں کا حضرت مدنی قدس سرہٗ مہر فاطمی تجویز کر گئے، جس کا قصہ آگے آئے گا۔

شادی ہو گئی اور میں نے یوں کہلوایا کہ "کاندھلہ تو میرا وطن اصلی ہے۔ اہلیہ کو لے جانے کا جھگڑا میرے بس کا نہیں، میں دو تین دن کاندھلہ ٹھہر کر سہارنپور آ جاؤں گا۔" حضرت نے فرمایا "وہ کون انکار کرنے والا، باپ بن کر تو میں آیا ہوں، لڑکی کل کو میرے ساتھ جائے گی، البتہ جلدی جلدی آنے جانے میں تو واقعی دقت ہو گی، دس پندرہ دن وہاں قیام کے بعد مولوی شمس الحسن صاحب جا

کر لے آئیں گے۔'' یہ میری اہلیہ مرحومہ کے حقیقی تایا اور ہمارے خاندان میں سب سے زیادہ غصہ والے اور نازک مزاج تھے۔ ان کا ذکر ''آپ بیتی نمبر۱'' میں میری علی گڑھ کی ملازمت کے سلسلہ میں آچکا ہے، مگر چونکہ حضرت قدس سرہٗ سے بیعت تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے اور میرے حضرت کو بھی کہ مجھے کبھی اہلیہ مرحومہ کو یا موجودہ لڑکیوں میں سے کسی کو کبھی بھی کاندھلہ لے جانے اور لانے کی دِقت نہیں ہوئی۔

دو تین سال تک تو مولانا شمس الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ بیگار رہی کہ ایک دو ماہ بعد میرے حضرت کا خط پہنچ جاتا کہ ''عزیزہ کو پہنچا دو'' یا ''عزیزہ کو لے جاؤ''۔ کئی سال تک یہ قصہ رہا۔ اس کے بعد سے کاندھلہ کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ مظاہر میں شروع ہوگیا، اولاً مولوی احتشام، پھر مولوی قمر الحسن مرحوم، پھر مولوی مصباح، مسلسل کئی سال تک یہی بچے لاتے لے جاتے رہے، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے۔ اس کے بعد تو عزیزانِ مولوی یوسف مرحوم اور مولوی انعام الحسن صاحب کا سلسلہ شروع ہوگیا جو اب تک جاری ہے۔

ہمشیرہ مرحومہ کی شادی:

(۲)......میری ہمشیرہ مرحومہ کی شادی ہے یعنی عزیز مولوی سلمان سلمہ کی نانی، میری والدہ کے انتقال کے وقت ہمشیرہ مرحومہ کی منگنی تو کاندھلہ کے ضابطہ کے موافق بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔ لیکن عزیز سلمان کے نانا ہمیشہ باہر رہے، اپنے والد رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس منٹگمری قیام رہا کہ ان کے والد صاحب ہمیشہ وہیں ملازم رہے، آنا جانا بالکل بھی نہیں تھا۔ حکیم ایوب صاحب کے والد حکیم یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے والد صاحب سے اس کی خواہش اور تمنا ظاہر کی کہ میری ہمشیرہ مرحومہ کا نکاح حکیم ایوب سے ہو۔ حکیم ایوب میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے بہت ہی لاڈلے شاگردوں میں سے تھے۔ والد صاحب نے کہا کہ میری تو عین تمنا ہے مگر یہ قصہ انفرادی نہیں بلکہ خاندانی ہے، اس کی منگنی ہوچکی ہے، اس کے توڑنے میں خاندان میں اختلاف پیدا ہوں گے، رنجشیں پیدا ہوں گی، اس لیے معذوری ہے۔ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد حکیم یعقوب صاحب نے مجھ سے بھی فرمایا۔ میں نے بھی وہی جواب دیا کہ حکیم ایوب صاحب تو میرے لیے سب سے بہتر ہیں مگر آپ خود خیال کریں جس چیز کو میرے باپ نہیں کر سکے میں کیسے کر سکوں گا۔ حالانکہ حکیم ایوب صاحب اس وقت میں میرے لیے ابتداءً محبّ اور انتہاً محبوب تھے۔ یہ دونوں فقرے معنی دار ہیں۔

''ابتداءً محبّ'' کا مطلب تو یہ ہے کہ جب میں رجب ۲۸ھ میں سہارنپور آیا تھا تو حکیم ایوب

صاحب نے مجھ سے ظہر کی نماز سے فراغ پر مسجد کے دروازے سے نکلتے ہوئے سجدۂ سہو کا ایک مسئلہ پوچھا تھا، میں نے لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ حکیم جی نے کہا ''مسئلہ تو مجھے معلوم ہے، میرا کئی مہینوں سے تجھ سے بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی اس لیے مسئلہ پوچھا۔'' میں ہنس پڑا اور ایک دو بات کھڑے کھڑے کی، تم کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور دوسرا فقرہ ''انتہاءً محبوب'' کا مطلب یہ ہے کہ میرے والد صاحب کے انتقال تک تو حکیم جی کا ہر وقت کا رہنا سہنا کچے گھر ہی کا تھا، صرف رات کو عشاء کے بعد اپنے گھر جاتے، صبح آجایا کرتے میرے والد صاحب سے بھی ان کو عشق کے درجہ کی محبت تھی۔ چنانچہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو یہ زنانہ مکان کے دروازے میں غش کھا کر گر گئے تھے، بڑی مشکل سے ان کو چارپائی پر لٹا کر گھر پہنچایا تھا اور میرے والد صاحب کے انتقال کی پریشانی کے ساتھ حکیم جی کے والد اور تایا کو ان کی فکر پڑ گئی تھی۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد یہ مجھ سے منہ موڑ کر حضرت مولانا ثابت علی صاحب کے خصوصی تلمذ میں پہنچ گئے تھے، جس کا مجھے اس وقت بہت قلق ہوا۔ مگر میں ابتدائی مدرس بھی نہیں ہوا تھا اور یہ حدیث تک پہنچ گئے تھے، اگرچہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال تک زیادہ تر مجھ سے ہی پڑھتے تھے، اس لیے اور بھی قلق ہوا مگر اب تو پھر ان کی محبوبیت مدرسہ کی وجہ سے عود کر آئی۔ یہ میرے رسالہ میں بار بار ظاہر ہو گا کہ مدرسہ کا جو شخص جتنا لحاظ رکھتا ہے مجھے اس سے بہت ہی زیادہ محبت بڑھتی ہے اور جو ملازم ہو کر مدرسہ کے امور میں تساہل تسامح کرتا ہے مجھے اس سے چاہے کتنی ہی محبت ہو نفرت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ حکیم جی باوجودیکہ ملازم نہیں ہیں مگر جب سے سرپرستِ مدرسہ ہوئے ہیں مدرسہ کے ہر کام کو میرے ذوق کے موافق اپنا کام سمجھتے ہیں، بالخصوص تعمیر کو، توسیع چندہ کی کوشش کو، نظامت کے امور میں مشورہ کو۔ غرض کسی کام کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ میرا فرض منصبی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر، صحت وقوت عطا فرمائے کہ اب تو ان کی صحت نے بہت جواب دے رکھا ہے۔

خوانخواہ بات میں بات آجاتی ہے، بہر حال حکیم جی سے میری ہمشیرہ کی شادی مقدر نہ تھی نہ ہوئی۔ لیکن چونکہ اس کے مجوزہ شوہر یعنی عزیز سلمان کے نانا باہر رہتے تھے، مستقل قیام منٹگمری پنجاب میں رہتا ہی تھا، لیکن دو سال سے بصرہ محاذ جنگ پر گئے ہوئے تھے وہاں سے واپسی ۳۰ محرم ۳۷ھ مطابق ۱۸ء کو ہوئی، اس وجہ سے کاندھلہ آنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لیے خاندان کے دوسرے لوگوں نے میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد مجھ پر بہت ہی زور ڈالے کہ میں خاندان کے دوسرے افراد فلاں فلاں میں سے کسی سے نکاح کروں اور عزیز سلمان

کے نانا کی اس قدر سخت تر شکایتیں کاندھلہ اور پنجاب سے پہنچیں کہ ان کی وجہ سے میں ڈر گیا۔
میں اعلیٰ حضرت قطب الاقطاب حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا، سارے حالات پیش کیے۔ حضرت قدس سرہٗ نے تقریباً دس منٹ تک بلکہ شاید اس سے زائد مراقبہ فرمایا اور پھر سر اُٹھا کر فرمایا کہ ''اللہ کا نام لے کر دو، اللہ خیر کرے۔'' میں نے رائے پور سے واپس آتے ہی کاندھلہ خط لکھ دیا کہ یہ اس وقت کاندھلہ چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ میرے خط پر میرے حقیقی نانا حافظ محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے چھوٹے بھائی حافظ محمد یونس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یعنی ان کے والد ان کو اپنے ساتھ لے کر سہارنپور پہنچ گئے۔ نہ کوئی بارات ساتھ تھی نہ کوئی اور آدمی۔

میرے آقا میرے مرشد حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی ٹانگ میں اُس زمانہ میں تکلیف تھی، مدرسہ تشریف نہیں لاتے تھے، یہ ناکارہ جماعت کرانے حضرت کی خدمت میں جایا کرتا تھا، مغرب کی نماز کے وقت جب میں پہنچا تو میں نے عرض کیا کہ ''حضرت ہمشیرہ کا مجوزہ شوہر عصر کے بعد آ گیا ہے، اس وقت حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نکاح پڑھ دیں تو صبح کو کاندھلہ بہن کو لے جائے۔'' حضرت نوراللہ مرقدہٗ نے اس وقت کوٹھے میں لیٹے لیٹے نکاح پڑھا دیا، میں اور چچا جان، حضرت قدس سرہٗ کے ایک دو خادم چار پانچ آدمی تھے۔ نکاح کے بعد صبح کو ہمشیرہ مرحومہ کو ان کے خاوند کے ساتھ بھیج دیا...... چچا جان نوراللہ مرقدہٗ ساتھ تشریف لے گئے تھے، نہ کچھ ساتھ سامان تھا، نہ کپڑے، نہ برتن، چونکہ سب کو اندازہ تھا کہ بچی ہے یتیم ہے کسی نے ان چیزوں کی طرف التفات بھی نہیں کیا۔ البتہ میری والدہ نے کچھ برتن پہلے سے رکھے تھے اور کچھ کپڑے بھی، اس وقت تو کچھ نہیں دیا گیا۔ البتہ حسبِ ضرورت وہ لے جاتی رہی۔ لیکن جب وہ سسرال والوں سے علیحدہ ہو کر اپنے مستقل مکان میں مقیم ہوئی، اس وقت میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ گھر کے سامان میں سے کھانے پکانے کا ہو، استعمال کا ہو جو تیرا جی چاہے لے جا۔ نیز میں نے اپنی والدہ نوراللہ مرقدہا کے انتقال پر عام گھروں کے دستور کے موافق کہ بہنیں اپنی رضا وخوشی سے اپنا حصہ بھائیوں کو دے دیا کرتی ہیں، اس کا حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ مرحومہ نے بہت خوشامد کی، بہت روئی بھی کہ میں تو آخر تمہارے ہی ذمے رہوں گی، کہاں جاؤں گی، ماں نہیں، باپ نہیں۔ میں نے کہا ضرور رہے گی انشاء اللہ اور ماں اور باپ دونوں کا بدل کر کے دکھاؤں گا۔ لیکن حصہ تیرا ضرور الگ کروں گا۔ میں نے اپنے منتظم جائیداد حاجی محسن صاحب مرحوم سے کہہ دیا تھا کہ دو (۲) حصے میرے اور ایک حصہ ہمشیرہ کا جو تقسیم کے ضابطے تمہارے ہوتے ہوں اس کے موافق کر دو۔ انہوں نے کئی دن بعد مجھ سے ازراہِ شفقت فرمایا کہ کنویں والا حصہ تیرے قرعہ میں لگا دیا ہے۔ میں جانتا بھی نہ تھا کنویں والا

کیا بلا ہے اور کیا اہمیت اس کو ہے۔ میں نے کہہ دیا ''نہیں وہ تو ہمشیرہ کی طرف لگے گا۔'' ان بے چاروں نے تو مجھ پر بڑا احسان رکھا تھا، میرے شدت انکار پر وہ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ''پھر آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیں، میرا زمین کی آمدنی سے کیا سہارا ہو سکتا ہے، سارا ہی ہمشیرہ کے نام لکھوا دو۔'' اول تو مرحوم اس کو تفریح سمجھے، لیکن جب میں نے بڑوں سے یہ کہہ دیا کہ یہ دس (۱۰) بارہ (۱۲) من غلّہ مجھے کیا کفایت کرے گا؟ وہ بچی ہے، اس کو کام دے گا، آپ اسی کے نام لکھوا دیں، تب مرحوم نے میری مرضی کے موافق اس کو کر دیا۔

(۳)، (۴)...... مجھے اپنی بچیوں میں سب سے پہلا سابقہ اور معرکۃ الآراء سابقہ سب سے بڑی دو (۲) بچیوں والدۂ ہارون، والدۂ زبیر کا مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، و مولانا انعام الحق صاحب کے نکاح سے پڑا۔

عزیزان مولوی یوسف مولوی انعام کی شادی:

(الف)...... ہمارے خاندان کا قدیم دستور اصول موضوعہ کے طور پر یہ طے شدہ تھا کہ جب کوئی لڑکی پیدا ہو تو اس کا اقرب ترین نامحرم گویا شادی کے لیے متعین تھا۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعض مؤرخین نے گڑ بڑ کر کے نقل کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ جب ہارون کی والدہ پیدا ہوئی تو دایہ نے اس بات کو کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے، اس عنوان سے اعلان کیا تھا میری چچی کو مخاطب کر کے کہ آپا تمہیں مبارک باد دوں کہ اللہ نے تمہارے یوسف کے بہو دی۔ یہ منگنا ہو گیا تھا۔

والدۂ زبیر کے متعلق ذہنوں میں تو سب کے مندرجہ بالا قاعدہ کے موافق طے شدہ تھا، لیکن دو ایک سال بعد بھائی اکرام صاحب کا ایک کارڈ آیا کہ ''والد صاحب کے تعمیل حکم میں لکھ رہا ہوں، تمہاری دوسری بچی سے عزیز انعام کے نکاح کی تجویز کو فرمایا ہے۔'' میں نے اس کے جواب میں لکھ دیا تھا کہ پھوپھا میرے بھی بڑے ہیں اس کے بھی بڑے ہیں، میرے سے کیا پوچھنا؟ یہ ہوا منگنا مولانا انعام الحسن صاحب کا۔

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ہر سال مظاہر علوم کے سالانہ جلسے میں شنبہ کی شام کو تشریف لایا کرتے تھے، حسب معمول مورخہ ۲ محرم ۵۴ھ مغرب کے قریب تشریف لائے اور فرمایا کہ ''ہمارے یہاں میوات میں جلسوں میں نکاحوں کا دستور پڑ گیا۔ کل کے جلسے میں حضرت مدنی سے یوسف و انعام کا نکاح پڑھوا دوں؟'' میں نے کہا شوق سے پڑھوا دیجئے مجھ سے کیا پوچھنا۔ عشاء کی نماز کے کچھ دیر بعد میں نے اہلیہ مرحومہ اور دونوں بچیوں کے کان میں ڈال دیا کہ چچا جان کا ارادہ یہ ہے کہ کل کے

جلسے میں دونوں بچیوں کا نکاح پڑھوادیں میری اہلیہ مرحومہ نے اس کے لفظ مجھے خوب یاد ہیں یہ کہا کہ ''تم دو چار دن پہلے کہتے تو میں ایک جوڑا تو ان کے لیے سلوا دیتی۔'' مجھے اپنا جواب بھی خوب یاد ہے اور میرے جواب پر مرحومہ کا سکوت بھی ''اچھا مجھے خبر نہیں تھی یہ ننگی پھر رہی ہیں، میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کپڑے پہنے پھرتی ہیں۔'' میرے جواب پر مرحومہ بالکل ہی ساکت ہوگئی۔

جامع مسجد آتے ہوئے حضرت مدنی سے میں نے عرض کر دیا کہ یوسف وانعام کا نکاح پڑھنے کے لیے چچا جان فرما رہے ہیں۔ حضرت نے بہت ہی اظہار مسرت فرمایا۔ کہا ''ضرور پڑھوں گا، ضرور پڑھوں گا۔'' اور جامع مسجد میں پہنچنے کے بعد بیٹھتے ہی فرمایا کہ ''مہر کیا ہوگا؟'' میں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں مہر مثل ڈھائی ہزار ہے۔ حضرت جی کو غصہ آ گیا، فرمایا کہ میں مہر فاطمی سے زیادہ ہرگز نہیں پڑھوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو شرعی چیز ہے۔ فقہاء کے نزدیک مہر مثل سے کم پر سکوت کافی نہیں بالتصریح اجازت کی ضرورت ہے تھوڑی دیر میرا اور حضرت کا جامع مسجد کے در میں بیٹھے بیٹھے مناظرہ ہوا میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اندر سے تو میرے ساتھ مگر حضرت جی کے غصے کی وجہ سے چپ تھے اور میں خوب ڈانٹیں سن رہا تھا۔ میری اہلیہ مرحومہ کے والد مولانا رؤف الحسن صاحب جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے انہوں نے مجھ سے فرمایا۔ ''جیسے حضرت فرما رہے ہیں مان لو۔'' میں نے کہا ''یہ تو شرعی چیز ہے۔'' میرے چچا جان نے فرمایا ''بچیوں میں سے کون سی انکار کر دے گی اور یہ نکاح نکاحِ موقوف بن جائے گا؟ اور جب تم گھر جا کر اظہار کر دو گے تو تکمیل ہو جائے گی۔''

حضرت قدس سرہٗ ممبر پر تشریف لے گئے اور سادہ نکاحوں کی فضیلت برکت پر لمبا چوڑا وعظ شروع کیا اور حضرت کی محبوب ترین گورنمنٹ برطانیہ کا ذکر تو کسی جگہ چھوٹتا ہی نہیں تھا، اس نکاح کے وعظ میں بھی وہ بار بار آتا رہا۔ حضرت مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی ثم الدہلوی جو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد اور ہمارے سارے اکابر کے محبوب تھے، اس جلسے میں تشریف فرما تھے، مجھ سے فرمایا کہ ''میں ساڑھے دس بجے کی گاڑی سے جانا ضروری سمجھتا ہوں اور مولانا کی طبیعت خوب زوروں پر چل رہی ہے اگر نکاح مولانا پہلے پڑھ دیں تو میری اور ساتھیوں کی تمنا یہ ہے کہ اس میں شرکت کرتے جاویں۔'' میں نے حضرت کی خدمت میں ممبر پر پرچہ بھیج دیا کہ بعض مہمانوں کو اس گاڑی سے جانے کی ضرورت ہے، ان کی درخواست ہے کہ نکاح پہلے پڑھ دیں۔ حضرت قدس سرہ کو خیال ہوگیا کہ بعض لیگی حضرات میری تقریر سننا پسند نہیں کرتے اس لیے اوّل تو خوب ممبر پر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ''اصل غلطی تو مجھے ممبر پر کھڑا کرنا ہے اور اس بے ایمان حکومت کو کہے بغیر میں رہ نہیں سکتا، جس کو سننا ہو وہ سنے اور جس کو میری تقریر سننا گوارا نہ ہو وہ چلا

جائے۔'' لیکن معاً دونوں لڑکوں یوسف وانعام کو ممبر کے پاس کھڑے کر کے خطبہ پڑھ کر نکاح پڑھ دیا اور پھر اپنے وعظ میں مشغول ہو گئے۔

جلسے کے بعد فرمانے لگے ''فلاں لیگی صاحب کو میری تقریر سے گرانی ہو رہی ہوگی۔'' میں نے کہا ''نہیں حضور، جناب کے الحاج حکیم جمیل الدین صاحب کو جانے کا تقاضا ہو رہا تھا اور ان ہی کے تقاضے پر میں نے پرچہ بھیجا تھا، مگر آپ تو رستے چلتے لیگیوں کے سر ہوتے پھرتے ہیں۔'' حضرت نے فرمایا کہ پھر پرچے میں یوں کیوں نہ لکھا کہ حکیم جمیل الدین صاحب جانا چاہتے ہیں۔''

نکاح تو ہو گیا مگر وہ گالیاں مجھ پر پڑیں کہ یاد رہیں گی۔ لڑکوں سے تو لوگ واقف نہیں تھے اور میری لڑکیاں ہونے کا اعلان آ ہی گیا تھا، لڑکے دونوں حسین جمیل امرد اور مدنی رومال دونوں کے سروں پر، جو میں نے ہی رکھے تھے، جلسے میں جاتے ہوئے دے دیے تھے۔ دو تین فقرے نقل کراتا ہوں فقرے تو بہت سے:

(۱)......ان مولویوں کا بھی کچھ تک نہیں، دو خوبصورت لونڈے دیکھے تھے تو لونڈیاں ہی حوالے کر دیں۔

(۲)......بمبئی کے سیٹھوں کے لونڈے جلسے میں آئے تھے، پیسے والا دیکھ کر لڑکیاں ہی دے دیں۔

(۳)......پہلے سے جانتے ہوں گے ویسے رستے چلتے کیا حوالہ کر دیتے۔ ارے نہیں ان مولویوں کا کچھ تک نہیں۔

(۴)......ہمارے محلّہ کے ایک بڑے متمول، رئیس اعظم، دیندار، متشرع بزرگ نے اپنے گھر جا کر بڑی ہی خوشی اور مسرت سے میری بچیوں کے نکاح کا تذکرہ کیا، ان کی اہلیہ مرحومہ خوب خفا ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں ہی کی مغفرت فرمائے کہنے لگیں ''گھر میں تو چوہے قلابازیاں کھاویں، کھانے کے واسطے کچھ ہے نہیں، ہر وقت ہمارے دروازے پر قرض کے واسطے آدمی کھڑا رہتا ہے وہ یوں نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟ تم مجھے سناؤ اللہ کے فضل سے اللہ میاں نے بہت کچھ دے رکھا ہے، مال و دولت دے رکھی ہے، خدا نہ کرے کہ میں اپنے بچے کا نکاح فقیروں کی طرح کروں۔''

اس کے بعد چونکہ خاندان کی ساری روایات کے خلاف تھا اور اب تک کوئی نکاح اس طرح نہیں ہوا تھا، اس لیے کاندھلہ میں بھی اس نکاح پر چہ می گوئیاں تو بہت ہوئیں، ایک صاحب کا فقرہ مجھے پہنچا کہ ''زکریا نے اپنی بھی ناک کٹوا دی اور ہم سب کی بھی۔ بھلا نکاح یوں ہوا کرتے ہیں۔'' میں نے اس کا جواب اہتمام سے بھیجا کہ ''میری تو کٹی نہیں اور میں نے قاصد سے کہا کہ تو بھی ہاتھ لگا کر دیکھ لے اور کہہ دیجئے کہ میں دیکھ کر آیا ہوں، اس کی تو کٹی نہیں اور کسی کی مجھے خبر نہیں۔''

تایا سعید مرحوم کیرانوی سابق ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جن کے ساتھ ہمارے خاندانی تعلقات بھی قدیم، حکیم یامین صاحب مہاجر مکی کے نکاح کے سلسلہ میں بھی ان کا ذکر خیر گزر چکا ہے۔ جب ان کو اِن دو نکاحوں کی خبر ہوئی تو انہوں نے کاندھلہ میں فرمایا کہ ''اس نے بہت بُری رسم جاری کردی۔ بھلا شادیاں اس طرح ہوا کرتی ہیں، خیر نہ خبر، یہ تو اعزہ کی مسرتوں کا زمانہ ہوتا ہے، مسرت انگیز خبروں کا پہلے سے ذکر تذکرہ ہونا چاہیے، خوشی کی لہر دوڑے زکریا کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔'' میں نے بڑے اہتمام سے تایا مرحوم کے پاس اس کا جواب بھیجا کہ ''جناب کی تجویز بہت مناسب ہے، ضرور اس سیہ کار کو سزا ملنی چاہیے اور سزا جرم کے مناسب ہوا کرتی ہے چونکہ اس سیہ کار نے اعزہ میں سے کسی کو اپنی بچیوں کے نکاح میں نہیں بلایا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اعزہ میں سے کوئی بھی کبھی مجھے اپنی تقریب میں نہ بلائے۔'' تایا سعید مرحوم نے پیام بھیجا ''اس کو تو سزا نہیں کہتے، یہ تو تیری عین منشأ کے مطابق ہو گیا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ ہر شخص تجھے اپنی ہر تقریب میں دو مرتبہ بلائے۔ ایک مرتبہ اپنی تقریب میں اور دوسری دفعہ سزا میں۔'' گھر کے مردوں پر تو گرانی خوب سنی، لیکن عتاب تایا سعید مرحوم کے علاوہ کسی کا نہیں پہنچا۔

البتہ گھر کی مستورات کی طرف سے خوشیوں کے، مسرتوں کے، دعاؤں کے پیامات پہنچے۔ اللہ تمہیں بہت ہی جزائے خیر دے، بہت ہی اچھا راستہ نکال دیا، اللہ کرے یہ چل پڑے۔ شادیاں تو مصیبت بن گئیں۔ سُودی قرض تک سے بھی اب تو پرہیز نہیں رہا جس کی عام طور سے لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ مگر بھائی زکریا سچی بات ہے کہ بعض بعض گھروں میں تو شادی کی لعنت سے سود تک بھی گھر میں گھس گیا۔ اللہ تمہیں جزائے خیر دے، اللہ یوں کرے، اللہ یوں کرے، فلاں فلاں کے نکاح بھی اسی طرح جلد کرادو۔

(ب)......اس زمانے میں عزیز مولویان یوسف وانعام سہارنپور ہی میں پڑھتے تھے اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ہمارے مدرسہ کے سرپرستان میں تھے اور حضرتِ اقدس رائپوری قدس سرہٗ بھی سرپرست تھے، مدرسہ کے اجتماع سرپرستان میں دونوں حضرات کی اکثر تشریف آوری ہوتی رہتی ہے۔

ربیع الاول ۵۵ھ میں حضرات سرپرستان کا اجتماع تھا۔ حضرتِ اقدس رائپوری چچا جان ودیگر سرپرستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا: ''خیال یہ ہے کہ کل کو جاتے وقت یوسف وانعام کی بیویوں کو لے جاؤں۔'' میں نے کہا ''جیسے رائے عالی ہو، مگر لڑکے دونوں یہاں پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بناء تو ان ہی کے گھر میں ہوئی تھی، میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں لونڈوں کی بناء یہاں ہی کرادیں۔'' چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مقولہ میرے متعلق

بہت معروف ومشہور، نہ معلوم بیسیوں دفعہ فرمایا ہوگا کہ ''تجھے نہ معلوم اپنے کام کی حدیثیں بہت یاد رہتی ہیں۔'' چچا جان نے فرمایا ''بہت اچھا۔''

میں نے ۱۲ ربیع الاول ۵۵ھ مطابق ۳ جون ۳۶ء کو عصر کے وقت بچیوں سے کہہ دیا کہ ''اپنی بہنوں کو کپڑے پہنا دو، رات کو ان کی یہیں رخصتی ہے۔'' مولانا یوسف مرحوم کو اپنے کمرے میں اور مولانا انعام الحسن صاحب کو کچے گھر میں تجویز کیا۔ مقدر کی بات کہ خوب بارش ہوئی اور اوپر مولانا یوسف صاحب خوب بھیگے کہ وہ چھجے کے نیچے تھے۔

حضرات سرپرستان کی آمد پر اور مہمانوں کی آمد پر کھانے کا دستور تو ہمیشہ سے ہے، مہمانوں کی کثرت رہتی ہی ہے۔ میں نے عشاء کے بعد، عزیزم مولوی عامر انصاری رامپوری جو اس وقت مظاہر علوم میں پڑھتے تھے اور مجھ سے ہمیشہ خصوصی محبت رہی اور وہ بڑھتی ہی رہی اس میں روز افزوں اضافہ اب تک بھی ہے۔ میں نے عشاء کے بعد، اس کو بلا کر یوں کہا کہ پلاؤ بچ گئی، کاندھلہ کے دس بارہ عزیز اس زمانہ میں مظاہر علوم میں پڑھتے تھے میں نے عامر سے کہا کہ سب بچوں کو بلالو، آج بچیوں کی رخصتی ہو رہی ہے تمہاری دعوت ہے۔ سب عصر کے بعد کھا چکے تھے۔ مگر عزیز عامر کے پیام پر ایک عزیز نے غصہ میں یوں کہا کہ ''شادیوں کی دعوت یوں ہوا کرتی ہے کھا چکا میں، میں نہیں جاتا۔'' اس عزیز کے علاوہ کسی نے کوئی تامل نہیں کیا، پیام سنتے ہی ایسے خوشی سے آئے کہ جیسا بہت ہی میں نے کچھ کرم کیا ہو۔ عزیز عامر نے میرے اس عزیز کو جواب بھی حیات ہے اور پاکستان میں ہے۔ یہ جواب دیا کہ ''تیری عقل ماری گئی، بھائی زکریا نہیں بلا رہے ہیں حضرت شیخ الحدیث صاحب بلا رہے ہیں، یہ نخرے جب کیجئے جب بھائی زکریا کاندھلہ میں تجھے بلائیں اور وہاں وہ کبھی تجھے بلانے کے نہیں۔'' وہ بیچارہ شرما کر ساتھ آ گیا عزیز عامر سلمہ کا یہ فقرہ میں ہمیشہ بہت مزے لے کر دورہ کے اسباق میں سناتا رہا ہوں:

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی!

چونکہ عزیزان مولویان یوسف وانعام یہیں پڑھتے تھے، اس وجہ سے لڑکیوں کے نظام الدین جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ میرے گھر ہی میں شب جمعہ کو دونوں کی چارپائیاں علیحدہ علیحدہ بچھوا دی جاتیں، جب سال کے ختم پر وہ حضرات نظام الدین گئے اپنی اپنی بیویوں کو بھی چچا جان کی معیت میں ساتھ لے گئے۔

نکاح والدہ سلمان:

(۵)......میری ہمشیرہ زادی والدۂ سلمان کا نکاح بھی ایک معرکۃ الآراء نکاح بن گیا۔ خاندان

کے دستور کے موافق خاندان میں ایک جگہ اس کی منگنی ہو چکی تھی، مگر قرابت کے اعتبار سے دو تین جگہ زیادہ قریب تھیں، مگر ان کا قیام پنجاب میں تھا، اس کے والد ماموں شعیب صاحب جو پنجاب ہی میں رہتے تھے ان کا نہایت زور دار خط میرے پاس آیا کہ ''میں تو حالات سے واقف نہیں، سب سے بہتر اور سب سے زیادہ دیندار جگہ جو ہو وہاں کرنا چاہتا ہوں، تمہارے مدرسہ کے طالب علموں میں کوئی دیندار ملے تو اس سے کردو۔'' میں نے لکھا کہ ''دیندار تو بہترین موجود ہے یعنی مفتی یحییٰ، مگر خاندان میں منگنی ہو چکی ہے، قرابت کا قصہ ہے، تعلقات کشیدہ ہوں گے اور بے دینی وہاں بھی نہیں ہے۔'' انہوں نے پھر زور دار الفاظ میں لکھا کہ ''مجوزہ شخص داڑھی منڈاتا ہے آپ کو خبر نہیں۔'' مجھے تو واقعی خبر نہ تھی، میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ نہیں نکلی ہوگی۔ میں نے چچا جان سے مشورہ کیا۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ بھائی شعیب کی بات کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔'' چنانچہ جب چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے میری بھانجی کا مدرسہ قدیم کی مسجد میں عصر کے بعد نکاح پڑھایا تو تمہید میں یہ فرمایا کہ ''بھائی شعیب صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجہ عطا فرمائے کہ انہوں نے تو وہ کہا کہ جو مجھے اور شیخ الحدیث کو کہنا چاہیے تھا، یعنی ''دیندار کے مقابلے میں کسی کی رعایت نہیں۔'' اور ہم دونوں نے وہ کہا جو انہیں کہنا چاہیے تھا کہ قرابت کی رعایت زیادہ ضروری ہے۔''

ماموں شعیب صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، ان کے دین پسند رجحان سے نکاح تو ہو گیا، لیکن خاندان والوں کی جو یورش اس ناکارہ پر ہوئی، ہر ایک کے ذہن میں یوں تھا کہ بھائی شعیب تو کسی کو جانتے نہیں اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی رائے میری رائے کے تابع ہے۔ خاندان سے باہر نکاح کی بدعت زکریا کا کارنامہ ہے۔ اس میں ایسے عزیز قریب رشتہ دار تک خفا ہوئے کہ جن سے اس قسم کی ناراضگی کا واہمہ بھی نہیں تھا اور میرے ایک عزیز ماموں شعیب کے بھائی تو مجھ سے اتنے ناراض ہوئے کہ دو برس تک ملاقات پر بات بھی نہیں کی اور اتنے سخت ناراضگی کے خط لکھے کہ کچھ حد و حساب نہیں۔ میں نے دبے لفظوں میں ایک دو دفعہ ان کو لکھا بھی کہ یہ چیز ماموں شعیب صاحب کی دین پسندی کا ثمرہ ہے۔ مگر ان کو اس کا بالکل یقین نہیں آیا کہ میں نے زبردستی ایسا نہیں کرایا۔

اس قصہ کے تو بڑے واقعات ہیں مگر اس کے اکثر افراد انتقال کر چکے ہیں، اب تو اتنا ہی کہوں گا کہ اللہ جل شانہٗ ان عتاب کرنے والوں کو، ناراض ہونے والوں اور انتہائی سب و شتم کرنے والوں کو معاف فرمادے اور ہمارے گھر میں خاندان سے باہر شادی کا یہ پہلا واقعہ ہے، پھر تو ان حکیموں نے مجھے ایسا گھیرا کہ میری ساری لڑکیاں چن چن کر لے لیں۔

تیسری چوتھی بچیوں کا نکاح:

(۶)، (۷)......ان کے بعد میری دو (۲) لڑکیاں شاکرہ مرحومہ جس کا تذکرہ حوادث اور اموات میں گزر چکا اور اس کی چھوٹی بہن، جواب مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بیوہ ہے، کا نکاح ساتھ ہوا۔ شاکرہ مرحومہ کا جس سے نکاح ہوا تھا، حسن دیوبند پڑھتا تھا اور اس سے چھوٹی بہن کا مجوزہ شوہر سعید الرحمٰن سہارنپور پڑھتا تھا، بڑا ہی سعید بچہ تھا۔ اسم بامسمیٰ تھا، اس کی خوبیوں کے واسطے ایک دفتر چاہیے، چونکہ اس کی والدہ مرحومہ کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے وہ مع اپنی بہن کے میرے ہی پاس رہا کرتا تھا۔ بچپن میں شرارت کرتے میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ بہت بلند درجہ عطا فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ۱۸، ۱۹ شوال ۶۶ھ مطابق ۴، ۵، اگست ۴۷ء کی درمیانی شب، شب جمعہ میں مرحوم کا انتقال ہوا۔ ہنگاموں کا زمانہ تھا کہ ڈاک بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جاسکتی تھی۔ کئی ماہ بعد مرحوم کے حادثہ انتقال کی خبر نظام الدین میں پہنچی جب کہ میں اپنی سب بچیوں سمیت ۴۷ء کے ہنگاموں میں نظام الدین میں محبوس تھا۔

حسن کے والد نے مجھ سے کہا کہ ''میں اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس نکاح میں شرکت نہیں کر سکتا۔ میرے لیے تو بہت مشکل ہے کہ مجھے خبر ہو اور میں شریک نہ ہوں، تیرے لیے بہت آسان ہے کہ تو مجھے خبر بھی نہ ہونے دے۔ اگر بغیر اطلاع کے نکاح کر دے تو مجھ پر بہت احسان ہوگا۔'' میں نے مرحوم سے کہا کہ ''تمہاری ذاتی مجبوریاں تو نہایت لغو ہیں، تمہاری مصلحت کا تقاضا ہے تو مجھے بھی انکار نہیں۔'' میں نے حسن کے ہاتھ ایک دستی پرچہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں لکھا کہ ''دو (۲) بچیوں کے نکاح کا خیال ہو رہا ہے، جس دن سہارنپور کی طرف تشریف لانا ہو حامل عریضہ حسن کو ساتھ لیتے آئیں۔'' حضرت قدس سرہٗ نے اپنی ڈائری میں فوراً نوٹ کر لیا، زبانی اسی وقت اس کا جواب دے دیا کہ ''میں پرسوں لکھنؤ جا رہا ہوں، پہلے سے رات کی گاڑی آنے کا خیال تھا، اب خیال ہے کہ ۴ بجے کی گاڑی سے آجاؤں گا، عصر کے بعد نکاح ہو جائے گا۔'' چنانچہ ۱۹ ربیع الاول ۶۵ھ مطابق ۲۲ اپریل ۴۶ء دوشنبہ کو حضرت تشریف لائے، حسن بھی ساتھ تھا۔ سعید الرحمٰن تو پہلے سے یہیں تھا۔ عصر کے بعد نکاح ہو گیا اور مغرب کے بعد ماشاء اللہ شادی کی دعوت بھی ہو گئی۔ کسی کو بلانا تو یاد نہیں، ویسے بھی حضرت مدنی قدس سرہٗ کی وجہ سے ادھر اُدھر کے احباب جمع ہو ہی گئے تھے۔ سعید الرحمٰن مرحوم تو سہارنپور میں پڑھتا تھا اور میرے ہی گھر میں قیام تھا اس لیے اسی دن عشاء کے بعد اس کی بناء تو میرے ہی گھر میں ہو گئی اور دوسرے دن حسن کے ساتھ اس کی بیوی کو کاندھلہ بھیج دیا گیا۔ بھائی اکرام ساتھ گئے۔ اس سے کہہ دیا تھا کہ جمعہ تک کاندھلہ میں قیام کرے، جمعہ کے دن شاکرہ کو یہاں چھوڑ تا جائے۔ خود دیوبند چلا

جائے۔اس کے بعد ہر شب جمعہ میں دیو بند سے آتا رہتا تھا۔

(۸)......اس ناکارہ کی دوسری شادی کا مسئلہ بھی بہت معرکۃ الآراء ہے،حوادث کے ذیل میں گزر چکا ہے کہ میں نے اپنی پہلی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی سے بہت ہی شدت سے انکار کر دیا تھا اور بلا مبالغہ بیس پچیس جگہوں سے بہت ہی تقاضے ہوئے اور جن میں بعض کے متعلق حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی سفارش فرمائی۔ایک کے متعلق تو حضرت رائپوری قدس سرہٗ بہت اہتمام سے تشریف لائے،مگر میں اپنی معذوریوں اور اس وجہ سے کہ ادائے حقوق نہیں کر سکتا،شدت سے انکار کرتا رہا۔لیکن چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے ہمشیرہٗ مولوی یوسف مرحوم کے متعلق فرمایا تو مجھے انکار کی گنجائش نہیں رہی اور میں نے عرض کی کہ ''پھر نکاح پڑھتے جائیے۔''انہوں نے کہا کہ تغیر زوج کے واسطے استیمار کی ضرورت ہے۔میں دو تین دن میں خط لکھ دوں گا اس پر چلے آنا۔حضرتِ اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی تشریف آوری تو بار بار ہوتی رہتی تھی، مجھے تو اپنا ذکر کرنا بالکل یاد نہیں۔لیکن معلوم نہیں حضرت کو کس طرح سے علم ہوگیا۔حضرت کے متعدد اعزہ اس زمانہ میں یہاں پڑھتے تھے حضرت قدس سرہٗ کو چچا جان کی ابتدائی گفتگو کا علم ہو چکا تھا،انہوں نے مجھ سے بہت اصرار سے ارشاد فرمایا کہ ''میں ضرور چلوں گا۔''میں نے عرض کیا کہ ''میں لے کر نہیں جاؤں گا۔''حضرت نے بار بار اصرار فرمایا میں نے عرض کیا حضرت ہم لوگوں کو بارات وغیرہ کے قصے سے اور زیادہ احتیاط برتنی چاہیے کہ بہت ہی توغل،حد سے زیادہ اسراف ہونے لگا ہے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ''میں باراتی بن کر تھوڑا ہی جاؤں گا حضرت کا خادم بن کر جاؤں گا۔'' میں نے پھر بھی قبول نہیں کیا۔مگر حضرت قدس سرہٗ کے بھانجے مولوی عبدالرحمٰن شاہ پوری بھی یہاں پڑھتے تھے۔میرے یہاں رہتے تھے۔حضرت نے ان کو تاکید فرمائی اور کرایہ بھی دیا کہ بہت اہتمام سے خبر رکھیں اور جس دن حضرت دہلوی کا خط بلانے کا آجائے فوراً،اگر سواری نہ ملے تو مستقل تانگہ بہٹ کا کر کے مجھے اطلاع کریں۔مجھے اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔چچا جان کا والا نامہ آنے پر میں نے تجویز کیا کہ کل کو ۱۰ بجے کی گاڑی سے چلا جاؤں،کسی کو لے جانے کا ارادہ نہیں تھا،نہ کسی باراتی کو نہ کسی خادم کو۔مگر علی الصباح ۷ ربیع الثانی ۵۶ھ مطابق ۱۷ جون ۳۷ء پنجشنبہ کو حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ اللہ بہت ہی بلند درجہ عطا فرمائے تشریف لے آئے۔میں نے عرض کیا کہ ''میں اس گاڑی سے روانگی ملتوی کر دوں۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ''مجھے بھی واپسی کا تقاضا نہیں،دو چار دن ٹھہرنے میں اشکال نہیں۔'' لیکن چچا جان یہ تحریر فرما چکے تھے کہ ۱۰ بجے کی گاڑی سے آجانا،اسٹیشن پر سواری مل جائے گی۔یہ ناکارہ، حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ اور ان کے چند خدام حافظ عبدالعزیز صاحب، بھائی الطاف

وغیرہ کے ساتھ ریل پر پہنچا اور اسی گاڑی سے جس سے ہم لوگ سوار ہونے کا ارادہ کر رہے تھے یعنی ۱۰ بجے کی گاڑی سے حضرتِ اقدس مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ ٹانڈہ سے تشریف لا رہے تھے، اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ یہ سمجھے کہ حضرت کی آمد کی اطلاع مجھے ہوگئی اور میرا مستقل معمول تھا کہ جب حضرت کی آمد کی اطلاع ہوتی تو اسٹیشن پر ضرور حاضر ہوتا اور اگر حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا سہارنپور میں قیام ہوتا تو حضرت بھی اسٹیشن پر ضرور تشریف لے جاتے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو اسٹیشن پر دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ ''اچھا، میری اطلاع کس طرح ہوئی؟ میں نے تو تار نہیں دیا تھا، اس لیے کہ وقت تنگ رہ گیا تھا۔'' حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کا اپنی آمد پر تار دینے کا بڑا اہتمام تھا۔ حضرت کے ارشاد پر قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ ''حضرت کی آمد کی اطلاع تو نہیں تھی ان حضرت کا نکاح ہو رہا ہے۔'' حضرت مدنی قدس سرہٗ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا ''اور ہمیں خبر بھی نہیں کی؟'' حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ ''حضرت میں بھی زبردستی ساتھ ہوں، انہوں نے مجھے بھی خبر نہیں کی اور ساتھ لے جانے سے صاف انکار کر دیا کہ میں نہیں لے جاتا، میں نے تو جاسوس مقرر کر رکھا تھا کہ جب حضرت دہلوی کا خط آئے تو مجھے فوراً اطلاع ہو جائے۔ کل شام مجھے اطلاع ہوئی، صبح ہی حاضر ہو گیا۔''

حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ نے حضرت رائے پوری کے ہاتھ چچا جان کے پاس پیام بھیجا کہ مولوی الیاس سے کہہ دیں کہ ''نکاح میں پڑھاؤں گا، میرے بغیر نکاح نہ ہوگا، میں تو اسی گاڑی سے چلتا مگر مستورات بھی ساتھ ہیں سامان بھی ساتھ ہے ان کو اُتار کر اگلی گاڑی سے آ جاؤں گا۔'' میں نے اول تو رد کیا کہ ''حضرت تکلیف نہ فرمائیں۔'' ایک ڈانٹ اور پڑی۔ ''میں آپ سے نہیں کہہ رہا ہوں، میں مولوی الیاس کے پاس پیام بھیج رہا ہوں کہ نکاح میں پڑھاؤں گا۔'' اس پر میں نے عرض کیا کہ ''حضرت پھر حرج نہ فرمائیں جب حضرت کو سہولت ہو تشریف لے آئیں۔ حضرت رائے پوری کو بھی دو چار دن نظام الدین کے قیام میں دِقت نہ ہوگی اور یہ ناکارہ بھی حضرت کا انتظار کرے گا۔'' حضرت نے فرمایا: ''اس کی ضرورت نہیں میں شام کو آ جاؤں گا۔'' یہ قصہ مجھے اسی طرح بہت ہی خوب یاد ہے، کوئی اس میں تردد کسی قسم کا نہیں۔ حضرت رائے پوری کو مولوی عبدالرحمٰن شاہ پوری کا جا کر اطلاع کرنا اور حضرتِ اقدس مدنی کا دس بجے کی گاڑی سے اسٹیشن پر ملنا اور مجھے ڈانٹ۔ یہ سب باتیں خوب یاد ہیں۔

مگر میرے روزنامچے میں تھوڑا سا تغیر ملا، جس کا کوئی جوڑ سمجھ میں نہیں آتا اور مجھے نظر نہیں آتا جس سے اندازِ تحریر سے کچھ جوڑ پیدا ہوتا، میرے رجسٹر میں حضرت مدنی کا شب پنجشنبہ میں

سہارنپور آنا لکھا ہے اور صبح کو ۵ بجے سے دیوبند تشریف لے جانا اور حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق لاہور سے کلکتہ میل سے آنا اور اسی ۵ بجے کی گاڑی سے بندہ کے ساتھ جانا لکھا ہے۔ حضرت رائے پوری کا ۳ بجے آکر ۵ بجے جانا عقل میں نہیں آتا، معلوم نہیں کہ لکھنے میں کیا اشتباہ ہوا۔

اس بات میں رجسٹر اور یاد دونوں برابر ہیں کہ دیوبند تک حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ ساتھ تشریف لے گئے اور دیوبند اُتر کر شام کی گاڑی سے دہلی تشریف لے گئے اور یہ ناکارہ اور حضرت رائے پوری دونوں اس گاڑی سے سیدھے دہلی چلے گئے۔ رجسٹر میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ مظفر نگر سے اسی گاڑی سے میرٹھ تشریف لے گئے اور شام کو وہ بھی دہلی پہنچ گئے۔ سہارنپور سے دیوبند تک حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ بہت ہی مسرت کے ساتھ تفریح فرماتے رہے اور اپنی اٹیچی کھول کر عطر اگر کی بند شیشی نکالی اور تیل کی طرح ہاتھ کی ہتھیلی پر سارا اُلٹ کر اس سیہ کار کے میلے کھدر کے کرتے پر مل دی۔ میں حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کی حیات تک ان کے خوف کے مارے ہمیشہ کھدر کا کرتا پہنتا تھا، اس لیے کہ سیہ کار پر حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ شفقت و کرم بھی تھا کہ بغیر کھدر کا کرتہ اگر میرے بدن پر دیکھتے تو فوراً بلا تکلف پھاڑ دیتے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کھدر کے میلے کرتہ پر یہ بڑھیا عطر کیوں ضائع فرما رہے ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ کھدر پر عطر خوب مہکتا ہے۔ میں نے عرض کیا ع

"کَمَا ضَاعَ عِقْدٌ عَلٰی خَالِصَه"

حضرت ہنس پڑے۔ حضرت اپنے دونوں مبارک ہاتھوں سے عطر ملتے جاتے تھے اور بار بار فرماتے تھے کہ نائی دولہا کے عطر ملا کرتا ہے، ساری شیشی ختم کر دی اور شام کی گاڑی سے دہلی پہنچ گئے، ایک غلط فہمی سے شب کو مسجد عبد الرب میں قیام ہوا اور اگلے روز جمعہ کو علی الصباح نظام الدین تشریف لے گئے اور بعد نماز جمعہ اس سیہ کار کا نکاح بمہر فاطمی پڑھا۔ زکریا نے عرض کیا کہ مہر فاطمی مجمل ہے اور مختلف فیہ بھی ہے، سکہ رائج الوقت سے اس کی تعیین فرمائی جائے۔ حضرت نے نہایت تبسم سے اور زور سے فرمایا کہ "دولہا شرمایا کرتے ہیں چپ رہو۔" میں نے عرض کیا کہ دین میں حیاء جائز نہیں ہے، یہ مسئلہ کی بات ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ پانچ سو درہم۔ میں نے کہا کہ یہ بھی مختلف فیہ ہے۔ سکہ رائج الوقت بتائیے، فرمایا کہ تقریباً ایک سو تینتیس (۱۳۳) روپے ہوتے ہیں۔ زکریا کے اس مناظرہ کو خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنے کسی رسالہ میں جو اس وقت نکلتا تھا تفصیل سے لکھا ہے۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ تو اسی وقت شام کو ۵ بجے واپس تشریف لے آئے اور ان ہی کے ساتھ حضرت میرٹھی بھی واپس تشریف لے آئے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کو دہلی کے اسٹیشن پر چھ ماہ تک

دہلی میں عدم داخلہ کا نوٹس دیا گیا اور زکریا مع اہلیہ یعنی والدۂ طلحہ اور حضرت رائے پوری مع خدام و عزیزان یوسف وانعام بارہ نفر اتوار کی صبح کو ۴ بجے کی گاڑی سے چل کر ساڑھے آٹھ بجے سہارنپور پہنچے اور ہم سب کا کرایہ حضرت اقدس رائے پوری نے دیا اور حضرت نے اپنی طرف سے زکریا کے ولیمہ کا اعلان فرمایا، جس کو راؤ یعقوب علی خاں نے عملی جامہ پہنایا اور حضرت میرٹھی بلا طلب ۹ بجے کی گاڑی سے ولیمہ میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ زکریا نے درخواست کی تھی کہ ولیمہ میں شرکت نہ فرمائیں۔

مولوی یوسف کا عقد ثانی اور حکیم الیاس کا نکاح:

(۹)، (۱۰)...... عزیزم مولانا یوسف مرحوم نور اللہ مرقدہٗ کا عقد ثانی ہے۔ جب مولانا مرحوم کی پہلی اہلیہ کا انتقال ہوا یعنی والدۂ ہارون کا، تو میں نے مرحوم کو شدت سے انکار کر دیا تھا کہ تم دوسرے نکاح کا ہرگز ارادہ نہ کرو، مشاغل کا ہجوم ہے تمہیں فرصت بالکل نہیں، نیز میں نے یہ بھی کہا کہ اس کے باوجود اگر تمہارا ارادہ ہو تو تم جہاں تجویز کرو دہلی یا کاندھلہ میں اس کے لیے تکمیل و تحریک کے لیے تیار ہوں۔ عزیز مرحوم نے یوں کہا کہ ”آپ کا مشورہ تو مناسب ہے لیکن اگر کسی وقت نکاح کا خیال ہوا تو کروں گا آپ ہی کی لڑکیوں میں سے کسی سے اور کسی جگہ کرنے کا ارادہ نہیں۔“ میں نے خاندان کی کئی لڑکیوں کا نام لیا، جن کے متعلق والدۂ ہارون کے انتقال کے بعد عزیزم مولانا یوسف مرحوم کے لیے میرے پاس بہت سی جگہ سے سفارشات اور تقاضے آئے تھے۔ عزیزم مرحوم نے کہہ دیا کہ اگر کرنا ہے تو آپ کے یہاں اور کہیں کرنا نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے بعد عزیز مرحوم نے کہا کہ نکاح کی ضرورت ہے اور کرنا آپ ہی کے یہاں ہے۔ میں نے مرحوم سے کہا کہ میرے پاس اس وقت دو لڑکیاں ہیں۔ ایک بیوہ اور ایک کنواری۔ بیوہ عزیزم مولوی سعید الرحمٰن کی بیوی تھی جس کا اوپر ذکر آیا۔ عزیز مرحوم نے کہا۔ میرے لیے دونوں برابر ہیں۔ میں نے پھر اصرار سے کہا نہیں جس میں تمہیں ذرا بھی ترجیح ہو میں اس کے لیے تیار ہوں اور اگر واقعی تمہارے نزدیک دونوں برابر ہیں تو میرے نزدیک بیوہ کو ترجیح ہے، اس لیے کہ وہ غمزدہ ہے، شادی کے بعد جلدی ہی اس کے خاوند کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے یوں کہا کہ بہت مناسب ہے۔

نیز حکیم ایوب صاحب کے صاحبزادے حکیم الیاس کے متعلق حکیم ایوب صاحب مجھ سے کئی دفعہ کہہ چکے تھے، میں ہر دفعہ میں یہ کہتا تھا کہ تمہارے سب بچوں میں حکیم الیاس سے جتنی مجھے محبت ہے اتنی کسی سے نہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکیم الیاس کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر دے ان کو بچپن سے مجھ سے بہت محبت تھی۔ جب شادی کا ذکر تذکرہ بھی نہیں تھا اور میری دہلی کی آمد و

رفت بہت کثرت سے تھی تو حکیم الیاس اللہ بہت ان کو جزائے خیر عطا فرمائے دن اور رات میں محض اطلاع پر اسٹیشن جاتا تھا، حالانکہ میں نے کئی بار منع بھی کیا کہ محض اطلاع پر نہ آیا کرو۔

مولانا یوسف صاحب کا تو طے ہو ہی چکا تھا، ان کی نظام الدین سے آمد کا میں نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا، مگر اتفاق سے حضرتِ اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ سہارنپور تشریف فرما تھے اور اسی وقت لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے، مولوی یوسف کی آمد پر حضرت قدس سرہٗ نے نکاح میں شرکت کی خواہش بھی ظاہر کی اور یہ بھی کہا کہ لکھنؤ اطلاع کر چکا ہوں اسی وقت جانا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے یہاں کی تقریبات کوئی ایسی موقت نہیں ہوتیں، آپ کی واپسی پر دیکھا جائے گا۔ عزیز یوسف چلا گیا۔ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی لکھنؤ سے واپسی پر جس کی اطلاع عزیز مولوی یوسف کو نظام الدین میں ہو گئی تھی وہ بھی آ گئے۔ میں نے حکیم ایوب صاحب سے دوپہر کے کھانے کے بعد کہلوایا کہ عزیز یوسف کا نکاح عصر کے بعد پڑھوانے کا خیال ہے اور حکیم الیاس کے متعلق تم بہت دفعہ کہہ چکے ہو، اب تو میں نے بھی ارادہ کر ہی لیا۔ عزیز الیاس سے کہہ دیں کہ عصر کی نماز مدرسہ قدیم میں پڑھے۔ تمہیں اپنا اختیار ہے اور کسی کو اطلاع نہ کریں۔ مگر نہیں معلوم حکیم ایوب کے بڑے بھائی حکیم یامین صاحب کو کسی طرح خبر ہو گئی کہ وہ مجھ سے مخفی اس وقت ایک کار لے کر دیوبند پہنچ گئے اور حضرت مدنی قدس سرہٗ سے کہا کہ شیخ الحدیث صاحب کی دو لڑکیوں کا نکاح عصر کے بعد ہو رہا ہے، اس نے تو نہیں بھیجا لیکن ان میں سے ایک کا میرے بھتیجے کے ساتھ ہے، میری درخواست ہے کہ حضرت تشریف لے چلیں۔ حضرت قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجہ عطا فرمائے۔ حضرت نے فرمایا کہ شیخ الحدیث صاحب کی لڑکیوں کے نکاح کے لیے طلب کی ضرورت نہیں اور حضرت قدس سرہٗ کو اس وقت بخار بھی بڑا شدید تھا اور قاری اصغر صاحب مرحوم نے حکیم یامین صاحب پر بہت عتاب بھی فرمایا کہ تم لوگ اپنے جذبات میں حضرت کی راحت کی بالکل پرواہ نہیں کرتے مگر حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا "میں ضرور جاؤں گا۔" شدید بخار میں ۱۹ ربیع الثانی ۶۹ھ چہار شنبہ کو تشریف لائے اور نکاح دونوں کا پڑھا کر اسی وقت اسی کار میں تشریف لے گئے۔ ان دونوں کے ساتھ مولوی نصیر الدین کی سب سے بڑی لڑکی زبیدہ مرحومہ کا بھی حضرت نے نکاح پڑھایا۔ مولوی نصیر الدین نے سو (۱۰۰) روپے کا نوٹ بہت توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ حضرت نے گھورا اور شدت سے انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ضرور لے لیجئے۔ میں نے نصیر کے ہاتھ میں سے لے کر حضرت کی جیب میں رکھ دیا اور عرض کیا کہ بڑے موذی کا مال ہے ضرور قبول فرمالیں۔ اس پر حضرت ہنس پڑے۔

عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو دوسرے ہی دن اپنی اہلیہ کو نظام الدین لے کر

چلے گئے، والدۂ طلحہ، والدۂ سلیمان بھی ساتھ گئیں اور عزیز مولوی نصیر الدین کی لڑکی زبیدہ مرحومہ کی رخصتی ۲۷ شعبان ہوئی۔

عزیز حکیم الیاس کے نکاح سے ایک ماہ بعد ۸ جمادی الاول یکشنبہ کو میں نے عشاء کے بعد جب سب سونے کے واسطے لیٹ گئے، اپنی بچیوں سے کہا کہ ''الیاس کی گھر والی کو چائے وائے پلا دینا۔'' میرا خیال یہ ہے کہ اذان پر میں خود پہنچا دوں گا۔'' اور حکیم ایوب صاحب کے پاس آدمی بھیجا، وہ سونے کے لیے لیٹ گئے تھے، اس لیے کہ سردی کا زمانہ تھا، گیارہ بج چکے تھے، میں نے مولوی عبدالمجید مرحوم کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ''اذان کے وقت میں مولوی الیاس کی گھر والی کو لے کر آؤں گا گھر والوں سے کہہ دو کہ اذان کے وقت کوئی زنجیر کھٹکھٹائے تو نام پوچھ کر دروازہ کھول دیں، کبھی مجھے دق ہونا پڑے۔'' حکیم جی کا جواب آیا کہ مجھے تو انکار نہیں مگر تجھے اس وقت دِقت ہوگی اگر اجازت دے تو میں اور الیاس ایک رکشہ لے کر اس کو لے آئیں اور کسی کو خبر نہ ہوگی۔'' چنانچہ دوشنبہ کی صبح کو اذان کے بعد حکیم جی اور الیاس ایک رکشہ لے کر آ گئے اور عزیزہ کو مع ایک دو عزیزوں کے جو یہاں موجود تھے لے کر چلے گئے۔ خود ان کے گھر والوں کو بھی صبح کی نماز کے بعد پتہ چلا کہ بیگم گھر میں آ گئی۔ میرے ایک مخلص دوست حاجی نور الٰہی عرف شیخ بدھو پندرہ بیس دن سے روزانہ دریافت کرتے تھے کہ میرے گھر والے بہت اصرار کر رہے ہیں۔ اللہ کے واسطے میرے گھر والوں کو ضرور خبر کر دیں کسی کو کریں یا نہ کریں۔ مرحوم اس زمانے میں صبح کی چائے میرے ساتھ پیا کرتے تھے۔ میں نے صبح کی چائے میں ان سے کہہ دیا کہ ''وہ تو چلی گئی، پہلے سے کہنے کا موقع نہ ہوا۔'' مرحوم کو بڑا قلق ہوا، اپنے گھر جا کر کہا کہ وہ جالی اب تم شور مچاتی رہو۔

(۱۱)......اب تک ساری شادیاں میری پہلی اہلیہ مرحومہ کی اولاد کی ہوئیں دوسری اہلیہ کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا عزیز طلحہ ہے۔ دونوں بچیوں میں سے بڑی کے متعلق حکیم ایوب صاحب نے عزیز مولوی عاقل کے متعلق کئی دفعہ تحریک کی اور میں نے وہی جواب دیا جو چچا جان نے عزیز یوسف کی ہمشیرہ کے متعلق مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہارے قابل نہیں ہیں، یہی میں نے حکیم ایوب سے دُہرایا۔ اس کے بعد ایک صاحب نے مجھ سے سفارش اور میرے ذریعہ سے اپنی بہن کا پیام عاقل کے لیے دیا، میں نے حکیم ایوب صاحب سے پیام بھی پہنچایا اور سفارش بھی زور سے کی۔ حکیم ایوب صاحب نے کہا کہ جب تک آپ کی اس بچی کا کہیں نکاح نہ ہوگا میں عزیز عاقل کا کہیں نکاح نہیں کروں گا، جب آپ کی بچی کا کہیں ہو جائے گا تو میں اس کے لیے بھی تلاش کر لوں گا۔

عزیز ہارون طلحہ وعاقل کا نکاح:

عزیز مولوی یوسف مرحوم کا عمرہ پر جانے کا خیال ہوا، انہوں نے مجھے لکھا کہ "عمرہ پر جانا ہے، خیال یہ ہے کہ جانے سے پہلے عزیزان ہارون وطلحہ کا نکاح ہو جائے۔" میں نے لکھ دیا جب چاہو آجاؤ اور چونکہ حضرتِ اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی طبیعت ناساز تھی اس لیے یہ تجویز ہوا کہ عزیز یوسف مرحوم کی گاڑی میں ہم سب رائے پور چلے جائیں، وہیں ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے۔ ظہر کی نماز میں حکیم جی کی مسجد میں میں نے حکیم ایوب صاحب سے کہا کہ عزیزان ہارون و طلحہ کے نکاح کی تجویز ہو رہی ہے۔ ہم لوگ اس وقت رائے پور جا رہے ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ عزیز عاقل کو بھی ساتھ لیتے جائیں۔ جب آپ کا اصرار ہے تو اس کو بھی پڑھوا دیں۔ ہم لوگ تو اسی وقت عصر سے پہلے جا رہے ہیں، خیال یہ ہے کہ عزیز عاقل کو بھی ساتھ لیتے جائیں، تمہیں تو رات کے قیام میں وہاں دِقت ہوگی، اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ تم تکلیف کر کے کیا کرو گے، تاہم اگر تمہارا آنے کا ارادہ ہو تو صبح کو میر صاحب کی گاڑی سے آجانا اور عزیزی عاقل کو تم اپنے ساتھ لے آنا اور بجائے شام کے صبح ۹ بجے نکاح پڑھا دیں گے۔ چنانچہ حکیم جی صبح کو مع عزیز عاقل، عزیز اسرائیل پہنچ گئے اور ۹ بجے حضرتِ اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی موجودگی میں حضرت ہی کے حجرہ میں عزیز مولوی یوسف مرحوم نے تینوں کا نکاح پڑھ دیا، لیکن عزیز ہارون کے خسر مولوی اظہار صاحب نے اصرار کیا کہ ان کی خوشدامن وغیرہ سب کا مہر پانچ ہزار ہے اور عزیز طلحہ کے خسر صوفی افتخار صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں کا مہرِ مثل ڈھائی ہزار ہے، میں نے کہا کہ بھائی میری بچیوں کا مہرِ مثل تو حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ "مہر فاطمی" تجویز کر گئے ہیں، لہٰذا بیک مجلس تین نکاح تین مہروں پر ہوئے۔ حکیم ایوب صاحب تو اسی وقت واپس آگئے۔ عزیز عاقل کو میں نے اپنے ساتھ آنے کے لیے روک لیا۔ اگلے دن ہم سب ساتھ واپس ہوئے۔

۱۸ ذی الحجہ ۸۰ھ کو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، حافظ عبدالعزیز دہلوی کی کار میں ہارون کی اہلیہ کو رخصتی کر کے نظام الدین لے گئے اور عزیز طلحہ کی رخصتی ۸۳ھ میں ہوئی، جب کہ ہم لوگوں کا سفرِ حج طے ہو گیا تھا، اس ناکارہ نے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو لکھ دیا کہ "جب تم سہارنپور آؤ تو راستہ سے اہلیہ عزیز طلحہ کو لیتے آنا۔" عزیزان یوسف وانعام ۸ شوال بروز شنبہ حاجی شفیع کی کار میں عزیز طلحہ کی اہلیہ کو لانے کے واسطے کاندھلہ اُترے۔ حاجی غلام رسول صاحب کلکتہ کے پندرہ بیس نفر پنڈوہ کے تبلیغی اجتماع کی تاریخ لینے کے واسطے اسی دن دہلی پہنچنے والے تھے، جب ان کو معلوم ہوا کہ مولانا یوسف صاحب اس تاریخ میں سہارنپور ہوں گے تو سیدھے

سہارنپور پہنچ گئے اور جب یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مولانا یوسف صاحب کاندھلہ میں ہیں تو صابری صاحب کی کار میں کاندھلہ چلے گئے۔

چند ماہ بعد ۱۱ رجب ۸۱ھ بروز چہارشنبہ عزیز مولوی یوسف مرحوم سہارنپور کے قریب سیکری کے تبلیغی اجتماع میں جانے کے لیے رائے پور ہوتے ہوئے سہارنپور پہنچے۔ حکیم ایوب صاحب نے کہا کہ اگر آپ عاقل کی اہلیہ کو آج بھیج دیں تو مولوی یوسف صاحب کو کل عاقل کے ولیمہ میں شرکت کر کے جائیں گے۔ میں نے کہا کچھ مضائقہ نہیں۔ میں نے مولوی یوسف مرحوم سے کہا کہ حکیم جی کل کو سیکری سے واپسی پر تمہیں عزیز عاقل کے ولیمہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس وجہ سے اپنے کسی کام کا حرج کرنا نہیں، البتہ وہاں والوں سے یہ ضرور کہہ دیں کہ کل کو ایک ولیمہ کی شرکت کا وعدہ کر کے آیا ہوں۔ اطمینان سے جب تمہیں فراغت ہو آ جانا، میں تو تمہارا انتظار کروں گا اور جس کا جی چاہے تمہارا انتظار کرے یا نہ کرے۔ چنانچہ مولانا یوسف صاحب مرحوم دوسرے دن پنجشنبہ ۱۲ رجب کو عصر کی اذان کے قریب آئے، اسی وقت ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔

اس سے پہلے چہارشنبہ کے دن عصر کے بعد حکیم ایوب صاحب آئے، ان کا ہمیشہ کا معمول عصر کے بعد آنے کا تھا، مگر وہ آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے لیکن اُس دن وہ بجائے بیٹھنے کے کھڑے ہوگئے، میں نے کہا بیٹھنا ہو تو بیٹھ جاؤ ورنہ اُڑ جاؤ، وہ تو چلے گئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد عزیز عاقل آیا، اس سے میں نے اور بھی زیادہ تفریح کا فقرہ کہا جو شائع کرنے کے قابل نہیں، زبانی تو کہہ دیا۔

جب میں مغرب کی نماز کو جا رہا تھا میں نے عزیزان ہارون، طلحہ سے کہا کہ مجھے تو مغرب کے بعد دیر لگتی ہے تم مغرب کی نماز پڑھتے ہی ڈولی میں اپنی بہن کو حکیم جی کے یہاں پہنچا دینا۔ مغرب کے بعد محلّہ کے ایک مخلص دوست نے یہ کہا بھی کہ میں چپکے سے ڈولہ اُٹھالاؤں محلّہ میں موجود ہے مگر عزیزان ہارون وطلحہ وغیرہ نے کہا کہ شیخ ابا کو گرانی ہوگی، اس لیے یہ دونوں عزیز عاقل کی اہلیہ کو میرے مسجد سے آنے سے پہلے وہاں پہنچا کر آئے۔ اگلے دن ۱۲ رجب ۸۱ھ بروز جمعرات حکیم جی نے مختصر ولیمہ کر دیا، مگر میں نے اور حکیم جی نے عزیز یوسف مرحوم کے انتظار میں عزیز موصوف کی واپسی پر عصر کے وقت کھانا کھایا۔

عزیز سلمان کا نکاح:

(۱۲)...... میری سب سے چھوٹی بچی کا نکاح، جو دوسری اہلیہ کی دوسری بچی ہے، میری ہمشیرہ مرحومہ کے نواسے عزیزم مولوی سلمان سلمہ سے ہوا۔ خاندانی حیثیت سے اس کی منگنی تو بہت ابتداء ہی میں ہو چکی تھی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ شاید بچی کے پیدا ہونے پر ہو چکی تھی اور مجھے یہ بھی یاد نہیں

کہ مجھ سے کسی نے پوچھا بھی ہے، اس لیے کہ یہ تو خاندان کے قانون ''اَقْرَبُ ذَکَرٍ غَیْرِ مَحْرَمٍ'' میں داخل تھا۔ مولوی انعام الحسن کی آمد پر ۲ ذیقعدہ ۸۶ھ مطابق ۱۳ فروری ۶۷ء بعد عصر مسجد قدیم میں زکریا نے اعلان کر دیا کہ ایک نکاح ہے، سب حضرات تھوڑی دیر تشریف رکھیں، اب تو اس ناکارہ کے لیے یہ کوئی چیز قابلِ التفات، قابلِ توجہ بھی نہ رہی تھی۔ مولوی انعام الحسن سلمہٗ نے مہر فاطمی پر عصر کے بعد نکاح پڑھ دیا اور مغرب کی نماز کے بعد جب کہ یہ ناکارہ مسجد میں تھا، عزیز طلحہ و ہارون بابو جی کی کار میں حکیم جی کے ہاں پہنچا بھی آئے۔ عزیز مولوی انعام منگل کی دوپہر کو ولیمہ کھانے کے بعد کاندھلہ ہوتے ہوئے نظام الدین گئے۔

(۱۳)، (۱۴)...... میری لڑکیاں تو نمٹ گئیں، اب نواسوں کا نمبر شروع ہوا، اگرچہ ایک نواسہ عزیز ہارون کا نمبر ۱۱ کے تحت گزر چکا۔

عزیزان شاہد و زبیر کا نکاح:

شوال ۸۸ھ میں عزیزان مولوی انعام، ہارون وغیرہ کا تو تبلیغی قانون کے موافق کہ ہر تیسرے سال حج کو جانا ہے، سفرِ حج متعین تھا اور اس ناکارہ کے حج کا مسئلہ ہمیشہ ہی بیم و رجاء میں رہتا ہے۔ اللہ کا لطف و احسان، فضل و کرم اور اور حرمین کے اعزہ و احباب کا اصرار ہمیشہ حاضری پر زور دیتا رہتا ہے اور میری بد اعمالیاں، سیئات مانع بنتی رہتی ہیں، اس وقت بھی میرے حج کا مسئلہ بیم و رجاء میں تھا۔ عزیز مولوی انعام نے مجھے دہلی سے لکھا کہ اگر آپ کا ارادہ سفرِ حجاز کو ہو گیا ہو تو عزیزان زبیر، شاہد کا نکاح پڑھاتے آئیں، میری شرکت کی وجہ سے تاخیر نہ کریں، آپ کی شرکت میری شرکت کا نعم البدل ہے۔ لیکن اس وقت تک اس سیہ کار کا سفر پختہ نہ ہو سکا تھا اور بعد میں خود مولانا انعام الحسن صاحب نے نظام الدین کی بعض ضروریات کی بناء پر میرا سفر ملتوی فرما دیا تھا اور علی میاں بھی میرے سفر کے التواء میں اور یہاں کی ضروریات میں مولانا انعام الحسن صاحب کے ہمنوا تھے۔ اس ناکارہ کا سفر ملتوی ہو گیا تو مولانا انعام الحسن صاحب الوداع کے لیے تشریف لائے، ان کی آمد پر حکیم ایوب صاحب کی رائے ہوئی۔ دار الطلبہ جدید کے دار الحدیث کا افتتاح بھی اس وقت ہو جائے۔ چنانچہ ۲۵ شوال ۸۸ھ یوم چہار شنبہ کی صبح کو اول اس سیہ کار نے بخاری شریف کا سبق شروع کرایا، جس کی تجویز تو پہلے سے مولانا یونس صاحب کے متعلق ہو چکی تھی مگر ان کا بھی اصرار تھا کہ بسم اللہ یہ ناکارہ کراتا جائے۔ چنانچہ بخاری شریف کی بسم اللہ کے بعد عزیز مولوی انعام سلمہٗ نے دونوں نواسوں کا نکاح دونوں نواسیوں کی بہنوں سے ''مہر فاطمی'' پر پڑھ دیا۔ خیال تو یہ تھا کہ رخصت بھی اسی وقت کرا دیں، مگر دونوں طلب علم میں مشغول تھے، مولوی انعام صاحب

کا ہوا کہ مبادا رخصتی تعلیم میں حارج ہو۔ میں نے تو کہا بھی کہ تمہارا اور عزیز یوسف مرحوم کا تو طالب علمی میں نکاح ہوا اور طالب علمی ہی کے زمانے میں رخصتی ہوئی تھی۔ مگر عزیز مولوی انعام الحسن سلّمہٗ نے یوں کہا کہ دور بدل گیا اور صحیح کہا۔

نکاح کی عجلت بھی ان عزیزوں اور دوستوں کو اس خیال سے تھی کہ اس ناکارہ کی امراض کی کثرت اوا ور اعذار کی وجہ سے حجاز سے واپسی کی نوبت نہ آئے۔ شادیاں تو اللہ کے لطف وکرم سے، اس کے فضل واحسان سے ساری ایسی سہولت اور آسانی کے ساتھ ہوئیں کہ اللہ تعالیٰ دوستوں کو بھی نصیب فرمائے، جہیز کا قصہ کسی کے ساتھ پیدا نہ ہوا۔

حکیم الیاس سلّمہٗ کو میں نے شادی کے بہت دنوں بعد کہا تھا کہ ہمارے یہاں پیالے بہت جلدی گم ہو جاتے ہیں اور مہمانوں کے لیے اکثر ضرورت ہوتی ہے، بار بار منگا تا ہوں، پھر کھوئے جاتے ہیں۔ تو جہیز کے نام سے پندرہ بیس خرید کر اپنے گھر رکھ لے، وہ ملک تو تیری اہلیہ کی ہے اور کام میرے مہمانوں کے آئیں گے۔ چنانچہ عزیز موصوف کے یہاں وہ پیالے اس کی شادی کے بعد سے رکھے ہوئے ہیں۔ بہت معمولی قسم کے، جو اس سے زیادہ میرے کام آتے ہیں۔ اکثر مہمانوں کے موقع پر عزیز موصوف کھانے کے وقت تو ہوتا ہی ہے جب پیالوں میں کھانے کی کوئی چیز کہیں سے آجاتی ہے تو عزیز موصوف خود ہی پیالے لے آتا ہے اور لے جاتا ہے یا میں آدمی بھیج دیتا ہوں۔

البتہ جہیز کے سلسلے میں ایک نہایت قابلِ فخر چیز میری سب بچیوں کے لیے یہ ہے کہ ان سب کے جہیز کے لحاف بچھونا میں نے ضرور دیا اور بہت عمدہ دیا، لیکن یہ بھی اللہ کا ایک احسان ابتداءً اور حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا احسانِ عظیم ثانیاً جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت قدس سرہٗ ہر سال یا دوسرے سال ایک نہایت ہی نفیس اعلیٰ قسم کا لحاف، بچھونا اس ناکارہ کو مرحمت فرماتے تھے اور حضرت کا اصرار شدید ہوتا تھا کہ میں اس کو استعمال کروں، مگر چونکہ وہ اعلیٰ قسم کا ہوتا تھا میرے استعمال کے قابل نہیں ہوتا تھا، اس لیے میں اس کو نہایت مضبوط رسی سے ترپال میں باندھ کر اپنے کمرے کے سامنے لٹکا دیتا تھا اور جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی تھی تو اس وقت تو نہیں، اس سے ایک دو ماہ پہلے یا اس کے ایک دو ماہ بعد اس کے حوالے کرتا تھا، یہ بھی ایک عجیب قدرت کا کرشمہ ہے۔ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے اپنی طالب علمی کے قصے بہت ہی سنائے۔ نیز اپنی رائے پور کی ابتدائی حاضری کا بھی۔

حضرت قدس سرہٗ نے کئی مرتبہ یہ قصہ بھی سنایا۔ شاید یہ قصہ میری کسی تحریر میں آچکا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ایک سال سردی کا ایسا گزرا کہ سردی سے بچاؤ کا کوئی کپڑا لحاف، بچھونا، کملی،

رضائی وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ کسی سے اظہار کی غیرت نے اجازت نہ دی، مغرب کے بعد سے کتاب لے کر جس مسجد کے اندر قیام تھا اس کے حمام کے سامنے بیٹھ جاتا، لوگ سمجھتے کہ بعض آدمیوں کو آگ سے سینکنے کا مرض ہوتا ہے۔ اس کو بھی سینکنے کا شوق ہے جب سب نمازی چلے جاتے، مسجد کا کواڑ لگا کر مسجد کے کونے میں صف پر لیٹ کر اور صف کو ہاتھ سے پکڑ کر کروٹیں لیتا ہوا دوسرے کونے پر چلا جاتا۔ وہ صف ساری مجھ سے لپٹ جاتی، وہی اوڑھنا تھا اور وہی بچھونا تھا۔ سر کی طرف سے اور پاؤں کی طرف سے رات بھر خوب ہوا آتی۔ جب اخیر شب ہوتی تو اسی صف کے کروٹیں بدلتے بدلتے دوسری طرف آجاتا، صف ساری بچھ جاتی۔ حضرت نے کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ حضرت وہ سردی تو گزر گئی۔ لیکن اس کے بعد سے کوئی سردی ایسی نہیں گزری جس میں ایک عمدہ لحاف، بچھونا اللہ کی طرف سے عطا نہ ہوا ہو۔ یہی وہ لحاف بچھونے تھے جو اکثر اس سیہ کار کو مرحمت فرما دیتے، زیادہ خوبصورت ہوتا تو اس سیہ کار کو مرحمت فرما دیتے، کم درجہ کا ہوتا تو کسی اور کو یا اپنے استعمال میں ضرورت ہوتی تو لے آتے، یہ چونکہ بہت عمدہ مخمل کا یا اطلس کا ہوتا تھا، اس لیے میں اس کو احتیاط سے رکھوا دیتا۔ میری سب سے چھوٹی بچی تک بڑی دولڑکیوں سے لے کر حضرت قدس سرہٗ کے لحاف بچھونے جہیز کے نام سے دیے گئے۔

جہیز میں بقدر ضرورت برتنوں کے دینے میں تو خلاف نہیں اگر واقعی ضرورت ہو اور زیور کا دینا پسندیدہ بشرطیکہ ایسا ہو کہ اس میں مالیت تو زیادہ ہو اور گھڑائی بہت کم ہو، تاکہ ضرورت کے وقت بچیوں کے کام آسکے اور اپنی ہمت کے موافق ضرور دیا جائے۔

زیور ضرور دیا جائے، کپڑوں کی مخالفت:

البتہ جہیز بَری کے کپڑوں کا بہت مخالف ہوں کہ وہ عمدہ عمدہ قیمتی جوڑے اس قابل تو ہوتے نہیں کہ گھر میں پہن لیے جائیں، صندقوں کی زینت ہو کر گلتے ہیں یا خدانخواستہ موت کا حادثہ پیش آجائے تو مدرسہ میں داخل ہو کر معمولی داموں میں نیلام ہوتے ہیں۔ اگر ایک دو جوڑا اگر قیمتی بھی بنالیا جائے تب بھی کچھ مضائقہ نہیں کہ وہ کہیں جانے آنے میں استعمال ہو سکتا ہے، لیکن بہت سے قیمتی جوڑے اسراف اور اضاعتِ مال کے سوا کچھ نہیں۔ اس سلسلے کے درمیان آپ بیتی نمبر ا صفحہ نمبر ۲۴ (بالکل شروع کے واقعات میں واقعہ نمبر ۹ کے آخر میں ہے) پر بھی کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس سے اس قدر نفرت ہوگئی ہے کہ بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔

میرے بچپن میں ایک چیز ''سراسری'' کے نام سے مشہور تھی۔ وہ اس قدر لغو چیز تھی کہ حد نہیں۔

ایک اوڑھنے کی چادر ہوتی تھی جس پر مختلف قسم کے موتی چھوٹے بھی اور بادام کے برابر بڑے بڑے بھی اور اس سے بڑے بھی جیسے نادیہ بیل کے اوپر کوڑیوں والی چادر ہوتی ہے، اتنے جمے رہتے تھے کہ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحصیٰ اور درمیان میں گوٹہ کی اور گھوکھرو کی انواع اتنی زیادہ کہ کپڑا کسی جگہ سے نظر نہیں آتا تھا اور عروس کے لیے یہ ایک عذاب عظیم تھا۔ اس لیے میرا اندازہ یہ ہے کہ اس کا وزن ایک دھڑی سے کسی حال کم نہ تھا، بچی پر جب اوڑھایا جاتا تھا تو وہ غریب پسینہ پسینہ ہوکر سارے کپڑے بھیگ جاتے تھے۔ جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو وہ سراسری پانچ چھ دن کے لیے مانگ لی جاتی۔ وہ تو ایک مصیبت تھی لیکن اس کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا کہ، اگر ایک عمدہ لباس فاخرہ خاندان میں بنا کر رکھ لیا جائے اور جہاں کہیں شادی ہو وہ آٹھ دس دن کے لیے مانگ کر دے دیا جائے تو بہت اچھا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ حدیث پاک سے بھی یہ چیز مستنبط ہوتی ہے۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بخاری شریف میں درمیان میں ''باب استعارة الثیاب للعروس وغیرھا'' ایک مستقل باب باندھ کر میرے اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ شادی میں اگر دلہن کے لیے کوئی کپڑا وغیرہ مانگ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس باب کے اندر امام بخاری رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک سفر میں اپنی بہن کا ہار مانگ کر لے جانا ذکر ہے۔ اس سے زیادہ واضح دوسرا باب کتاب الھبہ میں باندھا ''باب الاستعارة للعروس عند البناء'' (دلہن کے واسطے رخصتی کے وقت کپڑے کا مانگ لینا) اور اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک قصہ نقل کیا ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ''میری اس لونڈیا کو دیکھو یہ اس کرتے کو اپنے گھر کے اندر پہننے سے بھی انکار کرتی ہے، (یوں کہتی ہے کہ میں نہیں پہنتی، یعنی ناک چڑھاتی ہے۔) حالانکہ میرے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسی قسم کا ایک کرتہ تھا، مدینہ میں جب کسی عورت کی شادی ہوتی میرے پاس آدمی آتا کہ دو چار دن کو اپنا کرتہ دے دو۔'' فقط............ میں نے جب یہ حدیث بخاری شریف میں پڑھی تھی اس وقت سے بڑا ہی لطف آرہا ہے۔

اگر ایک مشترک لباس نہ ہو تو کم از کم شادی کے وقت اپنی گھر کی شادی شدہ بہنیں اپنی بہن کو نئی شادی کے لیے ایک نیا کرتہ چندروز مانگا دے دیں تو کیا اشکال ہے؟ اسی طرح سے زیور بھی۔

زیور سے تو مجھے سابقہ پڑا ہے کہ جس لڑکی کی رخصتی فوری طور پر ہوئی ذرا سا اشارہ اس کی بہنوں کی طرف کر دیا اور انہوں نے میرے اشارے سے بھی آگے بڑھ کر اپنا اپنا زیور پہنا دیا اور مہینوں خبر نہ لی۔ جب اس کا بن گیا واپس لے لیا۔ اگر آپس کے تعلقات اچھے ہوں، محبت ہو، اخلاص ہو، ساری چیزیں آسان ہیں۔ شادی تو خوب آسان ہے، جس کو آج کل لوگوں نے بہت ہی مصیبت عظمٰی بنا دیا۔

شادی کی دعوت سے نفرت:

اور جہیز بَری سے زیادہ شادیوں کی دعوت سے بھی مجھے نفرت ہے۔ اس ناکارہ کے یہاں دیکھنے والوں کو سب ہی کو معلوم ہے کہ مہمانوں کا ہجوم بعض اوقات دوسو ڈھائی سو تک ضرور پہنچ جاتا ہے، بلکہ بعض مرتبہ تو دس بارہ دیگوں کی نوبت بھی پکنے کی آئی۔ لیکن شادیوں کی مد میں ایک دفعہ بھی مجھے یاد نہیں کہ کوئی ایک دیگ پکوائی ہو۔

اور شادیوں کی دعوت میں ایک مصیبت عظمٰی یہ ہے کہ اگر ایک کو بلایا تو دوسرا خفا ہو جائے گا اور اس کو بلایا تو پھر تیسرا خفا ہو جائے گا۔ کہیں تو مجبوری کی وجہ سے نام بڑھتے ہیں اور کہیں ناموری کی وجہ سے اور جو شروع ہی میں ناک کٹوالے جو واقع میں تو کٹے گی نہیں تو پھر نہ تو قرض لینا پڑے اور نہ سود دینا پڑے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ جب کوئی یہ کہے کہ تم نے دعوت نہ کر کے اپنی ناک کٹوالی، تو اس کے جواب میں یہ کہہ دے کہ میری تو کٹی نہیں۔

......☆☆☆☆☆......

آپ بیتی نمبر ۴

یا

یادِ ایام نمبر ۳

جس میں

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ، کے تحدیث بالنعمۃ کے طور بعض اہم واقعات حضرت گنگوہیؒ و دیگر اکابر مشائخ کی خصوصی شفقتیں حجاز مقدس کے اسفار ۱۳۸۹ھ تک کے حالات اور اس دوران کے حجوں کی تفصیل مذکور ہے

ناشر

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم ط

جیسا کہ آپ بیتی نمبر۳ کی ابتداء میں گزر چکا کہ اِس کے ہر حصہ میں دو باب تجویز ہیں، اس کے پہلے باب میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اکابر کی شفقتوں کا مختصر حال، حضرتِ گنگوہی، حضرتِ سہارنپوری، حضرتِ اقدس رائپوری شاہ عبدالرحیم صاحب، حکیم الامت حضرت تھانوی، حضرت شیخ الاسلام مدنی، حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری، والد صاحب اور چچا جان نور اللہ مراقدہم کے بھی چند واقعات آ گئے ہیں، اس لیے کہ ان دونوں کے حالات کے لیے تو بڑا دفتر چاہیے۔

اور دوسرے باب میں اس سیہ کار کے حجازِ مقدس کے اسفار کی تفاصیل، سفر کا زمانہ، ابتداء اور انتہا اور دورانِ سفر کے چند واقعات جو تحدیث بالنعمۃ سے تعلق رکھتے ہیں درج کیے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان واقعات کو دوستوں کے لیے خیر و برکت کا سبب بنا دے کسی فتنہ کا سبب نہ بنائے۔

محمد زکریا کاندھلوی

۶ جمادی الثانی ۱۳۹۱ھ

باب پنجم

التحدیث بالنعمة

"اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ"

پہلا دور قطبِ عالم حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ:

اپنے ابتدائی دور کے بہت سے حالات اور اللہ جل شانہٗ کے انعامات و احسانات کا کچھ بیان باب دوم کی ابتداء میں گزر چکا، پہلے یہ لکھ چکا ہوں کہ یہ ناکارہ ڈھائی برس کی عمر میں کاندھلہ سے گنگوہ گیا اور حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کا دور تھا اور حضرت قدس سرہٗ کی اس ناکارہ کے والد پر بہت ہی توجہ اور خصوصی نظر تھی خادم خاص اور کاتب خطوط اور شریک حجرہ تھے، اس لیے حضرت کے خدام میں ہر شخص انتہائی شفقت سے پیش آتا، خانقاہ سے باہر ایک مٹھائی کی دکان تھی، ابواُس دوکاندار کا نام تھا، اس نے گویا بیٹا بنا رکھا تھا۔ جب میں مولانا سیّد احمد صاحب کی گردن پر سوار ادھر کو گزرتا وہ بیٹا بیٹا کہہ کر اپنی دکان سے بھاگتا اور دو تین مٹھائی کی ڈلیاں میرے ہاتھ پر رکھتا، میرے ہاتھ سے تو وہ سنبھلتی بھی نہ تھیں۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب قدس سرہٗ اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور اپنے مونڈھے کے اوپر کو چلتے چلتے مجھے کھلا بھی دیتے۔ گنگوہ میں ہر ہفتہ پینٹھ لگتی تھی جو اَب بھی لگتی ہے۔ اس میں دور دور کے دکاندار حضرت قدس سرہٗ کی زیارت کے اشتیاق میں اپنی اپنی دکانیں لے کر آیا کرتے تھے۔ بڑوت کے ایک مخلص حضرت گنگوہی کے جاں نثار خادم حاجی مولا بخش ان کی جوتوں کی دکان تھی۔ ہر ہفتہ تشریف لاتے اور بہت اصرار کرتے کہ مجھے ایک جوڑا جوتے کا دے جائیں اور جب پہلا جوتا صحیح و سالم ہوتا تو ابا جان انکار فرما دیا کرتے تھے۔ اس مجبوری کو مجھے اگلے ہفتہ اس کو چاقو سے کاٹنا پڑتا تھا اور پانی میں بھگونا پڑتا تھا۔

اس سیہ کار نے مشائخ کے پانچ دور دیکھے اور ہر دور کے اکابر و مشائخ اس سیہ کار کی ناپاکی اور گندگی کو ملاحظہ کرتے ہوئے بھی اپنی شفقتوں میں اضافہ ہی فرماتے رہے، سب سے پہلا دور حضرت قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا ہے دوسرا دور ان کے اجل خلفاء حضرت سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، اعلیٰ حضرت رائپوری کا، تیسرا دور چچا جان اور ان کے معاصرین کا، چوتھا دور حضرت مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے معاصرین کا، پانچواں دور حضرت مولانا

انعام الحسن صاحب زادمجدہم کا دیکھ رہا ہوں مدرسہ کی نظامت کے بھی چار دور مجھ پر گزر گئے، سب سے پہلا دور حضرت اقدس قدس سرہ کا، دوسرا حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کا، تیسرا حضرت مولانا اسعداللہ صاحب زادمجدہم کا اور چوتھا دور قاری مظفرحسین صاحب کا دیکھ رہا ہوں اور چار ہی دور خانقاہوں کے دیکھے سب سے پہلے اعلیٰ حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کی خانقاہ کا دور دیکھا، جس کی لذت اپنے بچپن کے باوجود اب تک دل و دماغ میں ہے، اس کے بعد بڑے حضرت رائپوری قدس سرہٗ کی خانقاہ کا دیکھا۔اس کے بعد حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کی خانقاہ کا دور دیکھا، اس کے بعد دوسرے حضرت رائپوری قدس سرہٗ کی خانقاہ کا دور دیکھا اور ان سب سے پہلے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کا دور دیکھا تو نہیں مگر جناب الحاج حکیم ضیاء الدین صاحب خلیفہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید قدس سرہٗ نے تفاصیل اس خانقاہ کی لکھی ہیں اس سے اس کا منظر سامنے آگیا، مگر افسوس کہ اب ساری خانقاہیں خاموش ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کوئی سی خانقاہ کو آباد کردے تو اس کے کرم سے کچھ بعید نہیں۔

دونوں دور کے مشائخ و اکابر نے خواہ تصوف کے ہوں یا نظامت کے ہوں ہمیشہ ہی شفقتیں اور محبتیں فرمائیں، کس کس کے حالات اور شفقتیں لکھواؤں، اکابر مشائخ کے چند اہم واقعات لکھوا رہا ہوں لیکن ایک ضروری بات کے اوپر بہت ہی اہتمام سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں بہت ہی اہم بات ہے، اکابر کے وصال کے بعد یا یہ کہیے کہ ہر شیخ کے انتقال کے بعد بہت سے لوگ ان کے بعد والوں میں وہ صفات دیکھنا چاہتے ہیں جو شیخ نوراللہ مرقدہٗ میں تھیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ ہر بعد والا پہلے سے کچھ نہ کچھ کم ہی ہوگا۔ الّا ماشاءاللہ۔ جو لوگ جانے والے بزرگ کی صفات بعد والے میں نہ دیکھ کر ان سے رجوع میں پہلو تہی کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنا بڑا نقصان کرتے ہیں۔ میں نے اس بات کو بہت ہی غور سے حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء کے دور میں بہت معاصرین کو دیکھا جو حضرت قطب عالم سے بیعت تھے اور ان خلفاء کے معاصر تھے۔ وہ یہ بات دیکھ کر کہ حضرت گنگوہی والی بات ان حضرات میں نہیں ہے رجوع نہ کر سکے۔ اس کا مجھے بہت ہی قلق رہا کیونکہ وہ میری نگاہ میں اقرب الی النسبت بلکہ صاحب نسبت بھی تھے۔ اگر وہ ان اجل خلفاء میں سے کسی کی طرف رجوع کرتے تو بہت آگے نسبت ہوتی اسی طرح ان اجل خلفاء کے بعد تیسری پشت والوں میں بھی بہت دیکھے۔ تیسری پشت والوں کو تو میں نے بہت سمجھایا بھی۔ چچا جان قدس سرہٗ کے بعد عزیز مولوی یوسف کے متعلق بہت سے لوگوں نے مجھ سے یہ شکایت کی کہ ''حضرت جی'' میں حضرت دہلوی والی بات نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تم نے سچ کہا۔ مگر حضرت دہلوی میں حضرت

سہارنپوری والی بات ہم نے نہیں دیکھی۔ میں نے ان لوگوں سے بہت کثرت سے اور عزیزی مولانا یوسف صاحب کے بعد ان پانچوں پشت والوں سے بہت یہ کہا اور میرے نزدیک یہ بہت قابل غور بات ہے کہ یہ تم نے سچ کہا کہ مولانا محمد یوسف صاحب میں وہ بات نہیں جو چچا جان قدس سرہٗ میں تھی۔ مگر تم ان کے معاصرین پر نگاہ ڈالو گے تو تم ان کے بعد والوں میں وہ بات نہیں پاؤ گے۔ جو عزیز مولوی یوسف میں ہے۔ اب عزیز مولانا انعام الحسن کے دور میں بکثرت یہ فقرے سنتا ہوں کہ حضرت مولانا یوسف صاحب والی بات نہیں تو میں کہا کرتا ہوں کہ میرے دوستو! بعد میں یہ بات بھی نہیں ملنے کی۔ جو مولانا انعام الحسن صاحب میں ہے۔ جانے والا تو ہٹ کر آتا نہیں۔ لیکن اس تو ہم سے کہ موجودین میں وہ بات نہیں جو جانے والوں میں تھی ان سے نفع حاصل نہ کرنا اپنے کو نقصان پہنچانا ہے۔ میں نے اپنے والد صاحب سے اپنے بچپن میں بار بار ایک فقرہ سنا اور اپنے دور میں اس کا خوب مشاہدہ کیا وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ معلوم نہیں ایک رمضان میں کیا تغیر ہو جاتا ہے کہ دو سال کے دورہ والوں میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ ان کی زبان مبارک سے تو یہ لفظ بار بار سنا اور اپنے پچاس سالہ تدریس حدیث کے دور میں خود مشاہدہ بھی کر لیا۔ حدیث کے پڑھانے کے ابتدائی دور میں بعض بعض طلبہ ایسے اچھے اشکالات کیا کرتے تھے کہ جی خوش ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن انتہا میں بعض دفعہ تقریر کرتے ہوئے تقریر کو درمیان میں اس وجہ چھوڑنا پڑتا تھا کہ مخاطبین میں سے کوئی اس کو سمجھ نہیں رہا تھا۔ بہر حال اس وقت تو مجھے اکابر کے سلسلہ کے چند واقعات اپنی شفقتوں کے دکھلانے ہیں۔

(۱)...... سب سے پہلا دور حضرت قطب عالم قطب الاقطاب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ' کا تھا۔ میری عمر ڈھائی برس کی تھی جب گنگوہ حاضر ہوا اور آٹھ برس کی تھی جب حضرت قدس سرہٗ کا وصال ہوا، شعور تو اب تک بھی نصیب نہ ہوا مگر وہ تو عرف میں بھی بے شعوری کا زمانہ تھا، اس بے شعوری اور بے تمیزی کے زمانے میں بھی اپنی چند حماقتیں ضرور یاد ہیں، سب سے پہلی تو یہ کہ حضرت قدس سرہٗ چارزانو تشریف فرما ہوتے اور یہ بے ادب بدتمیز گستاخ حضرت قدس سرہٗ کے دونوں گھٹنوں پر ایک ایک پاؤں رکھ کر حضرت قدس سرہٗ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر لپٹ کر کھڑا ہو جاتا تھا، اب جب خیال آتا ہے تو دُھڑ دُھڑی آ جاتی ہے کہ میرے کپڑوں میں سے کتنی بدبو حضرت کو آتی ہوگی اور کتنی تکلیف حضرت کو پہنچی ہوگی۔

یہ بھی خوب یاد ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کی معیت میں حضرت کے ساتھ کھانا کھانے کی کئی دفعہ نوبت آئی اور حضرت کو چونکہ نزول آب ہو چکا تھا اس لیے حضرت قدس سرہٗ تو بہت آہستہ آہستہ نوش فرماتے اور مجھے اس عمر میں جو بدتمیزی کرنی چاہیے تھی وہ کیا بیان کروں۔ البتہ چونکہ حضرت

قدس سرہٗ کی صاحبزادی جناب الحاج حافظ محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی والدہ ماجدہ برابر کھڑی ہوا کرتی تھیں اور ان کے بارعب چہرے سے میں ڈرا کرتا تھا۔ اس لیے جب وہ ادھر اُدھر ہوتیں تو جلدی سے دست درازی کیا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں بڑے ہو کر حضرت صاحبزادی صاحبہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست جو شفقتیں ہوئیں وہ بھی **لا تعد و لا تحصیٰ** ہیں۔ شاید ایک دو واقعہ کہیں لکھوا دوں۔ یہ میں باب دوم میں لکھوا چکا ہوں کہ جب میں حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ شریک نہ ہوتا تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کی اہلیہ محترمہ میرے لیے پلاؤ خاص طور سے رکھا کرتی تھیں۔

یہ بھی خوب یاد ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کو امرودوں کا بہت شوق تھا اور چونکہ دانت نہیں تھے، اس لیے حضرت مولانا سید احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ۔ حضرت قدس سرہٗ کے لیے ایسی باریک درقیاں امرودوں کی کاٹتے جیسے پتنگ کا کاغذ ہوتا ہے۔ بڑی ہی مہارت تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کے سامنے سے جو کچھ بچتا اس کا واحد وارث میں ہی تھا۔ اس کے علاوہ حضرت کی چارپائی کے نیچے پھل مٹھائی وغیرہ کی ٹوکریاں اور ہنڈیاں رکھی رہا کرتیں ان پر بھی چوری سے نہیں اگر غصب سے کہوں تو بے محل بھی نہیں بہر حال غاصبانہ تصرف میرا ہی ہوتا تھا۔ غصب میں نے اس لیے کہا کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اگر دیکھتے تو گھورتے اور مجھے جھڑک بھی دیتے تھے۔ لیکن حضرت مولانا سید احمد صاحب جو حضرت قدس سرہٗ کی اس قسم کی چیزوں کے منتظم تھے ان کی طرف سے اذن عام تھا بلکہ والد صاحب کے گھورنے یا جھڑکنے پر میں اگر اس چیز کو واپس ڈال دیتا اور وہ دیکھ لیتے تو اٹھا کر چپکے سے اور کبھی ان کے سامنے بھی مجھے دے دیتے، حضرت قدس سرہٗ کے یہاں عام معمول چائے کا مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ تھا یا نہیں، لیکن یاد پڑتا ہے کہ کبھی کبھی دو حصہ دودھ اور ایک حصہ چائے کی ایک چھوٹی پیالی ہوتی تھی، البتہ صبح کے وقت میں دو تین بیضوں کا نیم برشت ایک تکیہ بنا کرتا تھا۔ وہ بہت ہی عجیب چیز ہوا کرتی تھی اور بہت اہتمام سے بنا کرتا تھا۔ مولانا مرحوم تین بیضوں کو تقریباً آدھ گھنٹہ پھرکی سے اس قدر پھینٹتے کہ وہ پھول کر بڑا پیالہ ہو جاتا۔ پھر اس کو پکتے ہوئے گھی میں فرائی پان میں ڈالتے جس سے وہ بلا مبالغہ پھول کر ایک چھوٹے نان کے برابر ہو جاتا۔ پھر جلدی جلدی اس کو بستر ے کی طرح لپیٹتے جس سے وہ گاؤ تکیہ معلوم ہونے لگتا جو اندر کی طرف سے تو بالکل کچا اور اوپر سے چلّی کی طرح پکا ہوا۔ بہت ہی لذیذ ہوتا۔ اس میں سے ایک دو چمچہ تو حضرت قدس سرہٗ نوش فرمایا کرتے تھے۔ باقی وہ سارا گاؤ تکیہ اس حقیر فقیر زاہد عن الدنیا کے حوالہ ہو جاتا۔ اکابر میں کوئی ہوتا تو ایک دو چمچہ بطور تبرک ان کی خدمت میں بھی پیش کیا جاتا۔ حضرت قدس سرہٗ کو ٹھنڈے پانی کا بڑا اہتمام اور شوق تھا، گرمیوں میں حضرت کے لیے بعد ظہر

اولے کا شربت شورۂ قلمی میں ٹھنڈا کیا جاتا۔ پندرہ بیس منٹ تک حضرت مولانا سید احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ المونیم کے ڈبوں میں اس کو ٹھنڈا کیا کرتے تھے اندر کے بند ڈبے میں شربت ہوتا اور باہر کے کھلے ڈبے میں شورہ وہ پندرہ بیس منٹ تک اس کو گھماتے جس سے وہ برف سا ہو جاتا، وہ اندر کے بند ڈبہ کو بالکل صاف کر کے کہ کہیں اس کے اندر اثر نہ رہ جائے گلاس میں حضرت قدس سرہٗ کو پلانے کے لیے نکالتے اور باہر حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش کرنے کو لے جاتے اور ایک چوتھائی کے قریب اس ڈبہ میں خاص طور سے اس سیہ کار کے لیے بھی چھوڑ جاتے، حضرت قدس سرہٗ کے گلاس میں جتنا بچتا اسی میں میرا اوالا حصہ ملا کر مجھے مرحمت فرما دیتے۔

ایک دفعہ حماقت سوار ہوئی، مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ تو حضرت قدس سرہٗ کو پلانے باہر تشریف لے گئے اور اس حریص اور لالچی نے ان کے آنے سے پہلے ہی شورہ سے وہ ڈبہ نکال کر منہ کو لگایا، اندر کا شربت تو دیر میں پہنچا اور باہر جو شورہ تھا وہ سب سے پہلے منہ کو لگ گیا۔ جس سے سارا منہ کڑوا اور خراب ہو گیا کہ تھوکتا تھوکتا تھک گیا۔ اتنے میں مولانا تشریف لے آئے۔ میری حالت دیکھ کر ڈانٹا کہ ایسی کیا گھبراہٹ تھی میں تو آ ہی رہا تھا کئی مرتبہ کلی کرائی پھر وہ بقیہ شربت پلایا۔ اس سیہ کار نابکار نے جملہ مشائخ کے یہاں سے مادی مال ہی کھائے اور اپنی بداعمالیوں سے روحانی کچھ نہ کھایا۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نوراللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ کی ہمرکابی میں عیدگاہ جانا بھی خوب یاد ہے، ایک پالکی میں سرہانے کی طرف حضرت قدس سرہٗ ہوتے اور دوسری طرف (یعنی پاؤں کی جانب) یہ سیہ کار بیٹھا ہوا کرتا اور بڑے بڑے مشائخ درس، اکابر، صوفیا، محدثین اس کو اُٹھانے والے ہوتے۔ دس بارہ آگے ہوتے دس بارہ پیچھے اور دو سو ڈھائی سو کا مجمع اِدھر اُدھر، تشبیہ تو اچھی ہے نہیں مگر کوئی اور لفظ سمجھ میں نہیں آیا کہ جنازہ کی طرح سے ایسی جلدی جلدی کندھا بدلتے کہ میں بیٹھا اس منظر کی سیر کیا کرتا تھا۔ خانقاہ سے عیدگاہ تک نہایت آہستہ خراماں خراماں وہ پالکی چلتی اور ہر شخص کو تمنا ہوتی کہ مجھے بار بار یہ سعادت ملے ہمت والے نوجوان تو دو دو بار نمبر لگا لیتے جس کو میں دیکھتا رہتا اور ضعفاء ایک آدھ ہی چکر لگا پاتے۔ مگر چونکہ اہل تواضع اور احترام کا خاص منظر تھا اس لیے دوسرے آنے والے کے بعد پہلے والے کو ہٹنے میں ذرا تامل نہیں ہوتا تھا۔

ایک حماقت ساری عمر یاد رہے گی، حضرت قدس سرہٗ کی سہ دری اور شرقی جانب ایک بہت بڑا چبوترہ تھا، اس کے اوپر ایک بہت بڑا چھپر پڑا رہتا تھا وہ گویا میرے والد صاحب اور ان کے متعلقین وخدام ادب کی قیام گاہ تھی اس میں چارپائیاں بھی پڑی رہتیں اور سردیوں میں پرال اور گرمیوں میں چٹائیاں وہی گویا میری بھی قیام گاہ تھی۔ جب حضرت قدس سرہٗ دوپہر کا کھانا کھا کر مکان سے تشریف لاتے اور خانقاہ شریف کے اندر داخل ہوتے تو میں اس قدر زوردار جھٹکے سے

''السّلع معلیکم'' کہتا کہ دونوں عینوں کو ایسے جھٹکے سے کہتا اور حضرت قدس سرہٗ اتنے ہی زور دار جھٹکے سے وعلیکم السلام کہتے کہ حضرت قدس سرہٗ کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے اور اجل خلفاء اور اکابر علماء جب حضرت قطب عالم کی مجلس میں بیٹھتے تو ایسا سر جھکا کر بیٹھتے ''کانّ علیٰ رؤسھم الطیر'' سناٹا چھایا ہوا ہوتا۔ البتہ حکیم محمد اسمٰعیل صاحب جو بعد میں بمبئی میں حکیم اجمیری کے نام سے مشہور ہوئے۔ جب وہ گنگوہ حاضر ہوتے تو وہ کچھ نہ کچھ بات اکثر کرتے رہتے۔ یا حضرت صاحبزادے حکیم مسعود صاحب جن کا گدی دار موڑھا حضرت قدس سرہٗ کی چارپائی کے قریب پائنتی کی جانب ہوتا یا میرے والد قدس سرہٗ ڈاک سنانے کے لیے تشریف لاتے اور بہت چھوٹے سے بغیر گدی کے موڑھے کو چارپائی کے قریب لاکر اس پر بیٹھتے اور ڈاک سناتے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے اکابر معمولی موڑھوں پر ایسے چپ چاپ آہستہ آہستہ دبے پاؤں موڑھوں پر آکر بیٹھتے کہ آہٹ نہ ہو۔ الّا یہ کہ خود حضرت قدس سرہٗ کسی سے مخاطب ہوں تو وہ نہایت عجلت سے نہایت آہستگی سے جس کے اندر آواز نہ ہو موڑھے کو قریب کر کے بیٹھتا اور جواب دیتا۔ ایک مقولہ حضرت قدس سرہٗ کا میں نے خود تو نہیں سنا۔ مگر میں نے والد صاحب اور چچا جان ہر دو سے کئی مرتبہ سنا ہے جو آگے آرہا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ مکان سے کھانا کھا کر جب تشریف لاتے تو خدام مکان سے خانقاہ تک پیچھے پیچھے آیا کرتے تھے۔ وہ حضرت قدس سرہٗ کے سہ دری میں تشریف لانے پر اپنی اپنی جگہوں پر واپس لوٹ جاتے تھے۔ دستور یہ تھا کہ جب حضرت قدس سرہٗ دونوں وقت کھانا کھانے مکان تشریف لے جاتے تو خدام میں سے دو چار نہایت آہستہ آہستہ پیچھے ہو لیتے۔ حضرت قدس سرہٗ کا ہاتھ پکڑ کر کوئی نہیں چلتا تھا۔ بلکہ حضرت قدس سرہٗ کے ہاتھ میں ایک لکڑی ہوتی تھی اسی کی مدد سے بغیر سہارے کے تشریف لاتے اور لے جاتے۔ خدام جو مکان جانے پر ساتھ جاتے وہ حضرت قدس سرہٗ کے فارغ ہونے تک باہر دروازہ ہی پر کھڑے رہتے یا بیٹھ جاتے اور حضرت کی واپسی پر ساتھ ساتھ خانقاہ آتے ہوئے جب حضرت قدس سرہٗ سہ دری تک آتے تو وہ لوٹ جاتے۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ تشریف لائے۔ حضرت نے سہ دری میں قدم رکھا اور خدام لوٹ گئے اور حضرت نے سہ دری میں کھڑے ہو کر فرمایا کوئی ہے؟ میرے والد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! یحییٰ اور الیاس ہیں۔

اللہ کا نام کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا:

حضرت نے نہایت جوش میں فرمایا، اللہ کا نام چاہے کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا، حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد بالکل صحیح ہے، اسی وجہ سے جملہ مشائخ سلوک میں اللہ کا ذکر

اور ورد جاری ہے کہ یہ اثر کیے بغیر نہیں رہتا، ایک دوسرا ارشاد حضرت کا میں نے مکاتیب میں دیکھا اور مشائخ سے سنا بھی حضرت قدس سرہٗ ایسے لوگوں کو جو تصوف کی باریکیاں یا کسی چیز کی لم یا اصطلاحی چیزیں پوچھا کرتے تھے تو حضرت قدس سرہٗ کا جواب مجھے بہت ہی پسند آیا کہ یہ بندہ صوفیاء کی اصطلاحات سے واقف نہیں حضرت قدس سرہٗ کے احوال یہ ناکارہ ارشاد الملوک کے مقدمہ میں بھی نہایت مختصراً لکھوا چکا ہے اور اوجز کے مقدمہ میں بھی۔ حضرت قدس سرہٗ کی صورت مبارک میں جو کشش تھی وہ آج تک بھی دل کو کھینچ رہی ہے۔

دوسرا دور مرشدی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہ:

دوسرے دور کے مشائخ کے حالات کیا کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں۔ سب سے اول میرے مرشد میرے آقا سیّدی وسندی حضرت الحاج مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری تو رجب ۲۸ھ سے ہوگئی تھی لیکن میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال یا یوں کہوں کہ شوال ۳۳ھ تک براہ راست حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود حضرت کی جو شفقتیں تھیں وہ بے پایاں تھیں۔ حضرت کی نگاہ محبت تو بہت شروع ہی سے تھی اسی کا وہ ثمرہ تھا جو میری تعلیم کے بارے میں گزر چکا کہ حضرت قدس سرہٗ نے مجھے منطق کی تعلیم کے لیے مولانا ماجد صاحب کی خدمت میں بھیجنے سے منع کر دیا اور ایک سال کے لیے بھی اپنے اقدام عالیہ سے جدا کرنا گوارا نہیں فرمایا۔ براہِ راست حضرت قدس سرہٗ سے تعلق والد صاحب کے انتقال کے بعد سے پیدا ہوا اور حضرت نے واقعی باپ بن کر دکھلا دیا۔ میری پہلی شادی کے سلسلہ میں ایک واقعہ گزر چکا کہ میں نے کاندھلہ جا کر اپنی پہلی شادی کے موقعہ پر اہلیہ مرحومہ کو یہاں لانے سے انکار کر دیا تھا کہ کاندھلہ بھی میرا وطن ہے وہیں پانچ سات دن رہ کر چلا آؤں گا۔ اہلیہ کے لانے اور لے جانے کا جھگڑا مشکل ہے تو حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ وہ کون ہے انکار کرنے والا باپ بن کر تو نکاح کرانے کے لیے میں آیا ہوں۔

چھ ماہ تک مدرسہ قدیم سے باہر نہ نکلنا:

ایک مرتبہ حضرت کی غایت شفقت اور میری کثرت حاضری کو دیکھ کر ایک صاحب نے حضرت قدس سرہٗ سے میرے سامنے یہ پوچھا کہ یہ حضرت کے صاحبزادے ہیں؟ تو حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ بیٹے سے بڑھ کر ہیں۔ مجھے ابا جان کے جوتوں کی بدولت باہر آنے جانے سے شروع ہی سے نفرت تھی۔ میں اپنے کسی رسالہ میں لکھ چکا ہوں کہ ایک مرتبہ میرا نیا جوتا اٹھ گیا تھا تو جہاں تک یاد ہے۔ چھ ماہ تک دوسرا جوتا خریدنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لیے کہ جمعہ بھی

مدرسہ قدیم میں ہوتا تھا اور دارالطلبہ بھی اس وقت تک نہیں بنا تھا اور بیت الخلا میں بوسیدہ جوتے پڑے رہا کرتے تھے۔ اس لیے مجھے چھ ماہ تک باہر نکلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

بندہ کا نمائش میں جانے سے انکار:

یہ اسی کا اثر تھا کہ جب سہارنپور میں نمائش ہوئی تو جناب الحاج حافظ مقبول احمد صاحب مرحوم جو میرے والد صاحب سے بہت خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ اپنے بچوں کو نمائش دکھلانے کے لیے کسی رئیس کی فٹن لے کر آئے اور چونکہ شہر میں نمائش پہلی مرتبہ ہو رہی تھی، اس لیے اس کی شہرت بہت ہی ہو رہی تھی انہوں نے میرے والد صاحب سے اپنے بچوں کے ہمراہ مجھے بھی نمائش میں لے جانے کی اجازت چاہی۔ والد صاحب نے اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ انہوں نے مجھ سے چلنے کو فرمایا۔ میں نے پوچھا کہ وہاں کیا ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ دکانیں لگتی ہیں میں نے کہا کہ دکانیں تو یہاں سے اسٹیشن تک بہت ہیں۔ انہوں نے ازراہِ شفقت بہت اصرار کیا۔ مگر میرا جی نہ چاہا۔ اسی کا اثر تھا کہ کبھی سیر وتفریح کا شوق نہیں ہوا۔ صفر ۴۳ھ مطابق ستمبر ۲۴ء میں یوپی وغیرہ میں طوفانی بارش آئی جس میں سہارنپور کا مشرقی نالہ اتنا بھرا کہ محلّہ کھالہ پار بالکل الگ ہوگیا اور اس نالہ کا پانی مدرسہ قدیم کی سیڑھیوں تک آ گیا اور اس نالے کے ہر پل پر پولیس کا پہرہ رہتا تھا کہ کوئی شخص اس پل پر نہ گزرے۔ کیونکہ ہر پل کے گرنے کا خطرہ تھا۔ دہلی تا غازی آباد کی ساری گاڑیاں کئی ماہ بند رہیں۔ اس لیے کہ وہاں بھی جمنا نے ریل کی پٹڑی جگہ جگہ سے توڑ دی تھی۔ دہلی سے سہارنپور کی گاڑیاں انبالہ کو آتی تھیں۔ ساری یوپی میں اس طوفانی بارش سے بہت نقصانات ہوئے۔ کھادر کے حصہ میں سنا گیا کہ آدمی اور سانپ دونوں درختوں پر نہایت سلوک سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔

اس زمانے میں بھی سیر کے شوقین تو ہر حالت میں سیر ہی میں رہتے ہیں عبرت تو حاصل ہوتی نہیں سیر ہی کی سوجھتی ہے۔ محلّہ خانعالم پورہ میں شہر کی کئی ندیاں اور نالے باہم ملتے ہیں۔ وہ حصہ سمندر بن رہا تھا اور مخلوق سارے دن اس کی تفریح میں رہتی تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کی مجلس میں ذکر آیا کہ خانعالم پوری کی ندی کل سے اتنی بھر رہی ہے کہ سارے شہر میں پانی بھر جانے کا اندیشہ ہوگیا حضرت قدس سرہٗ اس کا حال دریافت فرما رہے تھے۔ جناب الحاج مقبول احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جن کا اسم گرامی میری اس تحریر میں بار بار آ رہا ہے اور شاید کہیں تفصیل بھی آ گئی ہے فرمایا کہ مولوی زکریا بھی تو کل دیکھنے گئے تھے۔ ان سے دریافت فرمالیں۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے انتہائی سادگی سے فرمایا نہیں یہ نہیں گئے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو غصہ آ گیا کہنے لگے کہ

ایسی بھی کیا خوش اعتقادی یہ تو سامنے بیٹھے ہیں دریافت فرمالیں؟ اور میں چپ حضرت قدس سرہٗ نے دوسری بار بھی یہی فرمایا کہ نہیں یہ نہیں گئے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زور سے فرمایا آخر اس سے دریافت تو فرمالیں۔ میرے حضرت نے فرمایا کیوں جی تم گئے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت بالکل نہیں مجھے یہ خبر پہنچی تھی کہ حاجی خلیل احمد صاحب کا مکان پٹھان پورہ میں گر گیا۔ ان کے گھر کو دیکھنے گیا تھا۔ حضرت نے فرمایا یہ بالکل صحیح ہے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خوش اعتقادی ہو تو ایسی ہو اور واقعہ بھی یہی تھا۔ پٹھانپورہ خانعالم پورہ سے اِدھر ایک محلّہ ہے۔ اس میں میرے والد صاحب کے ایک مخلص دوست حاجی خلیل احمد صاحب مرحوم رہتے تھے جن کو میرے والد صاحب سے بہت ہی خصوصی تعلق تھا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بھی اس کا خوب علم تھا میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی کثرت سے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس لیے میرے حضرت قدس سرہٗ نے بے تکلف فرمادیا کہ یہ صحیح ہے۔

ایک مرتبہ مدرسہ کے ایک طالب علم کا اخراج حضرت قدس سرہٗ نے طے کیا۔ میں نے مخالفت کی اور عرض کیا کہ حضرت اس کے اندر یہ اندیشہ ہے۔ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمادی کہ نہیں حضرت کوئی اندیشہ نہیں۔ حضرت نے اخراج فرمادیا۔ معاً وہی اندیشہ سامنے آ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ کو اس کا بڑا فکر ہوا اور حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی ندامت ہوئی۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ہمارے قلندر نے تو پہلے ہی مخالفت کی تھی۔ ہم نے ہی نہ مانی۔ میں نے عرض کیا حضرت فکر نہ فرمائیں دعاء و توجہ فرمائیں انشاء اللہ یہ اندیشہ جاتا رہے گا۔ حضرت کو اس جواب سے اتنی مسرت ہوئی کہ اس کی لذت اب تک مجھے معلوم ہوتی ہے اور حضرت کی دعاء و توجہ سے فوری خطرہ جو پیش آیا تھا۔ وہ اسی طرح فوراً دور ہو گیا۔ اللّٰھم لک الحمد کله ولک الشکر کله.

حضرت کا ارشاد "ہمارے قلندر نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا"

حضرت قدس سرہٗ کا ہندوستان میں بھی اور مدینہ پاک میں بھی بہت کثرت سے یہ معمول تھا کہ جب کبھی کھانے میں یہ سیہ کار شریک ہوتا تو حضرت قدس سرہٗ کوئی بوٹی یا کباب کا ٹکڑا بہت شفقت سے دستِ مبارک سے مرحمت فرمایا کرتے تھے مجھے تو کبھی اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوا کہ حضرت کی شفقتیں اس سے بہت زائد رہتی تھیں۔ لیکن مدینہ پاک میں تو یہ ناکارہ تو دونوں وقت کھانے میں شریک ہوتا ہی تھا۔ حضرت قدس سرہٗ رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ بھی بسا اوقات کھانے میں یا کسی دوسری چیز کے کھانے میں شرکت فرماتے حضرت رائے پوری نے مجھے ارشاد فرمایا کہ تجھ

پر بڑا رشک آتا ہے کہ جب حضرت تجھے کوئی چیز کھانے کی مرحمت فرماتے ہیں تو پہلے اس چیز کو خوب گھورتے ہیں پھر مرحمت فرماتے ہیں۔ کاش مجھے بھی اسی طرح سے گھور کر کوئی کھلاتا۔ اس کے بعد میں نے بھی خیال کیا تو واقعی حضرت اقدس رائے پوری نے صحیح فرمایا تھا۔ کاش اسی قسیُ القلب پر بھی کوئی اثر ہو جاتا۔ مدینہ پاک کے قیام میں یہ ناکارہ بذل لکھا کرتا تھا اور صبح کی چائے کے بعد سے مسلسل چھ گھنٹے حضرت کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی تو ایک بار یہ نابکار ناپاک سیہ کار بذل لکھتے ہوئے نہ معلوم کن کن خیالات اور واہی تباہی خیالات میں مستغرق تھا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے عبارت لکھواتے لکھواتے نہایت تیز و تند لہجے میں ارشاد فرمایا ''من تبو مشغول و تو با عمر و زید'' مجھے اب تک بھی جب وہ منظر یاد آجاتا ہے تو ایک سناٹا چھا جاتا ہے میں ان لغو خیالات پر اور حضرت کے اس ارشاد پر پسینہ پسینہ ہو گیا۔ میرا کرتہ اور پاجامہ پسینہ کے اندر بھیگ گیا۔ اس وقت بھی بہت سوچا اور بعد میں بھی بہت سوچا۔ مگر اب تک یہ یاد نہیں آیا کہ کیا خرافات میرے دل میں تھی۔ جس پر حضرت نے یہ ارشاد فرمایا۔ حضرت قدس سرہٗ کی یہ توجہات کسی قابل پر ہوتیں تو نہ معلوم وہ کہاں پہنچتا یہ سیہ کار اپنے سارے ہی مشائخ کی شان میں گستاخ رہا۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہا تھا کہ چونکہ بے ادب ہے حدیث پاک کے استاذ کے علاوہ کسی اور استاذ کی بے ادبی کرے گا اور وہ فن ضائع ہو جائے گا تو بلا سے۔ یہ قصہ میرے طلب علم کے حالات کے اندر گزر چکا۔ مگر حق یہ ہے کہ مجھ سے نہ حضرت والد صاحب کا ادب ہو سکا نہ حضرت قدس سرہٗ کا۔

مدینہ پاک میں میں نے اپنی حماقت اور گستاخانہ عادت کے مطابق مولوی عبداللہ جان مرحوم کے متعلق چونکہ ان کا دستور یہ تھا کہ ہر ہفتہ ایک لمبا سا خط ان کا پہنچتا تھا۔ جس کو یہ جمعہ کے دن شروع کر دیتے اور روزانہ تاریخوار اپنے، مدرسہ کے، شہر کے، یاد کے، محبت کے حالات تاریخوار لکھ کر ہر جمعرات کو ڈاک میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک سادہ کاغذ سبز جو چوڑان میں تو تقریباً اسی سائز کے برابر جس پر یہ رسالہ ہے اور لمبان میں ڈیوڑھا۔ نیلے فونٹین پین سے سارا خط اور سرخ سے روزانہ کی تاریخ ان کا خط گویا شہر اور مدرسہ کے حالات کا روزنامچہ ہوتا تھا۔ شاید تین چار سو ورق ہوں، جو میرے کاغذات میں دو گتوں کے اندر رسی سے بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ لوگوں نے مجھ پر بہت اصرار کیا کہ یہ اردو کی بہترین خدمت ہے۔ اس کو طبع کرا لے۔ اس وقت تو چونکہ اشتغال علمی اونچی چیزوں میں سے تھا اس لیے التفات بھی نہیں ہوا۔ آج کل دور ہوتا تو شاید طبع کرا لیتا۔

بہت اُونچے بیرسٹر تھے لندن اور نہ جانے کہاں کہاں سے ڈگریاں لے کر آئے تھے۔ محمد احمد صاحب کاظمی مولوی منفعت علی صاحب مرحوم اور یہاں کے ہندو مسلم وکلاء اور بیرسٹر ان کے

شاگرد تھے ان کی بھی میرے حضرت قدس سرہٗ سے ابتدائی نیازمندی ایک طلاق کے مسئلہ میں ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں حضرت قدس سرہٗ کے تعمیل ارشاد میں بہت سی اردو کی مستند مصنفوں کی کتابیں ناول اور خطوط دن رات بکثرت پڑھیں اور میرا کام یہ تھا کہ جہاں جہاں لفظ ''جواب'' آجائے، وہاں حاشیہ پر نشان لگاتا جاؤں۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ لفظ جواب اردو میں کن کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کو مجھ سے بھی بہت تعلق ہوگیا تھا ۴۶ھ میں حجاز سے واپسی کے بعد وہ بہت اہتمام سے اس سیہ کار کے پاس ہندو مسلمان وکیلوں کو عصر کے بعد لاتے اور ان سے کہتے کہ ارے تم لوگ کیا جانو چائے پینا۔ چلو میں تمہیں ایک مولوی کے یہاں چائے پلواؤں۔ پھڑک جاؤ گے۔ اس زمانہ میں اس سیہ کار کو بھی چائے کا بہت شوق تھا اور مجمع بھی زائد نہ ہوتا تھا۔ پانچ سات آدمی عموماً اور مہمان ہوتے تو دس پندرہ ہو جاتے اتنے میں آدمی جیسی چاہے بڑھیا چائے پی لے۔ دوسو کے مجمع میں تو دیگ ہی پکتی ہے۔ بہرحال مولانا عبداللہ جان مرحوم کو مجھ سے اور میرے ابا جان سے محبت بہت تھی اور حضرت قدس سرہٗ سے تو گویا عشق تھا اور ہر ہفتہ ان کا بہت لمبا چوڑا خط جاتا جس کو یہ ناکارہ بہت مزے لے لے کر سناتا۔ کیونکہ اپنے وطن کی داستان ہوتی تھی اور حضرت بھی بڑے شوق سے سنتے تھے۔

ایک دفعہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ مولوی عبداللہ جان کو حضرت سے عشق تو ہے مگر یہ ذکر وشغل بالکل نہیں کرتے۔ حضرت ان کو کچھ ذکر تلقین فرمادیں۔ حضرت نے فرمایا وہ پوچھیں تو بتلاؤں گا۔ بغیر پوچھے کیوں بتلاؤں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت پوچھنے کی کیا بات ہے۔ جب وہ اپنے کو حضرت کے سپرد کر چکے ہیں محبت بھی بہت ہے۔ حضرت نے فرمایا وہ پوچھیں جب ہی تو بغیر پوچھے میں کیوں بتلاؤں؟۔ میں نے عرض کیا کہ میں کچھ لکھ دوں؟ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا اپنی طرف سے جو چاہے لکھ دیجیو میری طرف سے کچھ نہیں۔ میں نے عرض کیا حضرت میرے لکھنے سے کیا ہوتا ہے اسی زمانے میں حضرت اقدس رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ بھی مدینہ پاک میں تشریف رکھتے تھے اور عصر سے مغرب تک حضرت قدس سرہٗ کی مجلس میں خادمانہ تشریف رکھتے تھے، حضرت رائے پوری کے ساتھ بھی دس بارہ خادم ہمراہ تھے۔

ایک مرتبہ حضرت رائے پوری نے میرے حضرت سے بطور معذرت کے عرض کیا کہ حضرت ایسی بے حسی کا زمانہ ہے کہ اول تو ان لوگوں کو خود ہی احساس چاہیے کہ جب میں خادمانہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو ان کو بھی حاضر ہونا چاہیے تھا لیکن میں ان لوگوں کو ترغیب بھی دیتا رہتا ہوں۔ پھر بھی حاضری کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضرت قدس سرہٗ نے حضرت رائے پوری سے ارشاد فرمایا کہ حضرت! اس کا بالکل خیال نہ فرمائیں۔ مجھے تو اس میں بہت غیرت آتی ہے۔ میں

نے تو اپنے شیخ یعنی قطب عالم گنگوہی کے متعلق بھی کبھی کسی کو ترغیب نہیں دی پھر اپنے صاحبزادے مرحوم کی بیعت کا قصہ سنا کر اس ناکارہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ یہ تو ان باوا بیٹوں کا دستور ہے کہ جوان کی طرف ذرا جھکے یہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ مجھے تو اس میں بڑی غیرت آتی ہے۔ میرے نزدیک تو کسی کی غرض ہو تو دس دفعہ آئے ورنہ میری پاپوش سے۔ حضرت کا ارشاد کہ ان باوا بیٹوں کی تو یہ عادت ہے اسی مولوی عبداللہ جان کے واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ اس زمانے میں یہ ناکارہ ان کی بار بار سفارش کر رہا تھا۔ اس قصہ کو مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل طبع جدید طبع کردہ حکیم محمد الیاس سلمہ کے صفحہ ۴۴۳ پر مختصراً نقل کیا ہے۔ وہ مخلص دوست جن کو مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تحریر فرمایا ہے یہی مولوی عبداللہ جان مرحوم تھے۔ البتہ تذکرۃ الخلیل میں اور میرے اس بیان کردہ واقعے میں یہ فرق ہے کہ مجھے بیعت کا قصہ حضرت کے صاحبزادے حافظ محمد ابراہیم کا یاد ہے اور مولانا نے یہ قصہ حضرت کے داماد محمد یامین کا لکھا ہے جب حضرت قدس سرہٗ کا ۴۴ھ میں مستقل قیام کی نیت سے سفر ہوا تو الوداعی سفر کئی جگہ کے حضرت نے فرمائے۔ یہ سیہ کار بھی ساتھ تھا۔ میرٹھ میں حماقت سوار ہوئی۔ دستر خوان پر انواع بہت تھیں میں نے عرض کیا حضرت کے طفیل میں بہت ہی انواع ولذائذ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔

اس وقت تک اس ناکارہ کا حج طے نہیں ہوا تھا جیسا کہ سفر حج میں آرہا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے بے ساختہ فرمایا کہ اب تک طفیل میں کھایا تھا۔ اب اصالتاً کھاؤ گے۔ حضرت قدس سرہٗ کے حجرہ میں سے ایک مرتبہ کسی کی امانت گم ہوگئی۔ چونکہ حجرہ کا کھولنا ڈاک باہر نکالنا۔ ڈاک کا سامان اندر رکھنا وغیرہ وغیرہ اسی سیہ کار کے متعلق تھا اور یہ میں متعدد بار لکھ چکا ہوں کہ حضرت قدس سرہٗ کی ان شفقتوں اور الطاف کی وجہ سے مجھ پر اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور میرے والد صاحب پر تھیں شروع ہی سے حاسدین کا حملہ ہم تینوں پر رہا۔ چنانچہ بعض کرم فرماؤں نے اس چوری کا الزام اس سیہ کار پر لگایا اور حضرت سے عرض کیا کہ حضرت اسی کی آمد و رفت حجرہ کے اندر کثرت سے ہے۔ حضرت نے نہایت صفائی سے ارشاد فرمایا کہ اس کا کام نہیں۔ اللہ کا انعام احسان شکر تو یہ ناکارہ کر ہی نہیں سکتا۔ بعد میں محقق ہوگیا کہ ایک دوسرے صاحب کی حرکت تھی۔ تحریک خلافت کے زمانے میں جلسوں کا بہت زور تھا کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس میں دس بارہ جگہ شہر میں جلسے نہ ہوں اور دس بارہ جگہ کے باہر سے مطالبے نہ ہوں۔ اسباق پڑھانے مشکل ہوگئے۔ بالخصوص مولوی قدوسی مرحوم کی طلب ہر جگہ سے بہت ہوتی تھی اور خاص طور سے لوگ ان کو اس وجہ سے بلاتے کہ ان کے وعظ عوام میں بہت پسند ہیں اس وجہ سے مولوی قدوسی کے اسباق بہت ناغہ ہوتے تھے مسلسل ایک ایک ہفتہ سبق نہیں ہوتا تھا اس لیے ان کے متعلق خاص طور سے وہ تجویز ہو

گیا تھا کہ وہ ہر جلسہ میں نہ بھیجے جائیں۔ مخصوص جلسوں میں حضرت کی اجازت سے جائیں۔

ایک مرتبہ کاندھلہ میں خلافت کا جلسہ تھا۔ وہاں کے لیڈروں نے ہمارے ایک عزیز حافظ شریف کو میرے پاس بھیجا کہ حضرت قدس سرہٗ سے اجازت لے کر مولوی قدوسی کو کاندھلہ بھیج دو۔ حافظ شریف نے مجھ سے آ کر کہا مجھے چونکہ اندازہ تھا میں نے حافظ شریف سے کہہ دیا کہ میں تو بہت چھوٹا ہوں بڑے حضرات مثلاً مولانا عبداللطیف صاحب حاجی مقبول صاحب ان میں سے کسی سے درخواست کرو۔ بات معقول تھی۔ اس لیے ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔ مولانا نے جواب دیا کہ ان کا حرج بہت ہو چکا ہے۔ میری ہمت حضرت سے اجازت لینے کی نہیں پڑتی۔ انہوں نے حضرت حاجی مقبول صاحب سے کہا۔ انہوں نے کہا کہ "ارے حضرت کے لاڈلے سے کیوں نہیں کہتا۔" (یعنی ناکارہ) انہوں نے میرا جواب نقل کر دیا کہ میں تو بچہ ہوں اس پر حاجی صاحب کو غصہ آ گیا اور فرمایا وہ بچہ ہے اگر وہ یوں کہے......تو حضرت جی اس کی خاطر میں یوں کہیں گے...... بھائی شریف میرے سر ہو گئے کہ میں کل سے دھکے کھا رہا ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ کنجی تو تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے کہا کہ سچ ہے کاندھلہ کاندھلہ ہی ہے۔ بڑے بڑے جس کام کو نہیں کر سکتے بھلا میں کس طرح کر دوں۔ لیکن ان کے شدید اصرار پر میں نے حضرت سے عرض کیا کہ یہ بھائی شریف دو دن سے پڑے ہیں اور اہل کاندھلہ ایک جلسہ کرانا چاہتے ہیں اور مولوی قدوسی پر چلنے کا اصرار ہے، حرج تو بہت ہو گیا۔ اب جیسے ارشاد عالی ہو۔

حضرت قدس سرہٗ نے اپنی عادت مبارکہ (جیسا کہ تفصیل سے لکھوا چکا ہوں) کے موافق فرمایا۔ کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت اگر جمعہ کی صبح کو چلے جائیں اور جمعہ کے بعد تقریر کر لیں اور عصر کے بعد کاندھلہ سے جو گاڑی چلتی ہے اس سے واپس آ جائیں تو یہاں عشاء تک پہنچ جائیں گے۔ سبق کا حرج نہیں ہو گا۔ حضرت نے فرمایا بہت اچھی بات۔ میں نے بھائی شریف اور مولانا قدوسی صاحب ہر دو سے کہہ دیا کہ حضرت نے اجازت مرحمت فرما دی جمعہ کی صبح کو جا کر شام کو آ جائیں۔ اس پر مولوی قدوسی نے کہا کہ یہ جمعہ تو میرا رکا ہوا ہے۔ اگلے جمعہ کو آؤں گا۔ چنانچہ اگلے جمعہ کا اعلان کرا دیا۔

ان حافظ شریف صاحب کے ساتھ ایک عجیب لطیفہ پیش آیا۔ جو لکھوانے کے قابل ہے۔ یہ عین کھانے کے وقت پہنچے تھے اور کوئی چیز فوری طور پر خاطر کی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے تھوڑی سے دودھ جلیبیاں بازار سے منگوا لیں اور بھگو کر ان کے سامنے ایک پیالہ میں رکھ دی مجھے ترشی کا شوق بچپن سے رہا اور اب تک بھی ہے۔ ترشی بچپن ہی سے ہر نوع کی خوب کھائی۔ اتفاق سے اس وقت

کہیں سے عرق نعناع کی بوتل آئی ہوئی تھی اور میرے دستر خوان پر پیاز مرچ کتر کر اس پر عرق نعناع ڈال کر لانے کا دستور تھا۔ میں تو اس کو کھاتا ہی تھا۔ مگر اور لوگ اس کو نہیں کھاتے تھے۔ ''الا ماشاء اللہ'' حافظ شریف نے جلیبیوں پر تواضع بلکہ اصرار مجھ پر کھانے کا کیا میں نے سادگی سے کہہ دیا کہ میں تو عرق نعناع کھا رہا ہوں۔ میری حالت اور تعجب کی انتہا نہ رہی اور بہت مسرت ہوئی کہ جب میری زبان سے یہ فقرہ نکلا تو دستر خوان پر آٹھ دس طلبہ میرے پاس رہنے والوں میں سے جو میرے ساتھ کھانا کھا رہے تھے سب نے چپکے چپکے نعناع کے ایک دو پیاز کھا لیے۔ حافظ شریف نے سب کی تواضع کی لیکن سب کا جواب یہ تھا کہ ہم نے نعناع کھالیا۔ حافظ شریف نے کہا کہ میں بھی نعناع کھالوں میں نے کہا شوق سے۔ مگر ان دودھ جلیبیوں کے دام مجھے دے دیجیو۔ مگر مجھے اپنے ان لڑکوں کی یہ ادا بہت ہی اچھی لگی اور بہت ہی پسند آئی اور یاد پڑتا ہے کہ میں نے کھانے کے بعد چپکے سے کچھ انعام بھی ان لڑکوں کو دیا تھا۔

یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ اس پیاز کھانے کی ابتداء عزیز عبدالجلیل برادر زادہ حضرت اقدس رائے پوری نے کی تھی، جو اس وقت یہیں رہتا تھا اور میرا شریک دستر خوان تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ حضرت قدس سرہٗ کی شفقتیں اور محبتیں **لا تعد و لا تحصی** نہ لکھوائی جا سکتی ہیں اور نہ ان کا احصاء ہو سکتا ہے اس رسالہ میں مختلف مضامین کے ذیل میں مختلف چیزیں آئیں گی اور بہت سی گزر چکیں۔ تعلیم و تدریس کے باب میں لکھوا چکا ہوں کہ ابتدائی مدرسی پر میری ہدایہ کی درخواست پر حالانکہ اس وقت تک کنز صرف ایک سال پڑھائی تھی حضرت قدس سرہٗ نے تقسیم اسباق میں بیٹھتے ہی فرمایا کہ تم نے ہدایہ اولین کو کہا یا ہدایہ اخیرین کو۔ گویا دونوں میں ہر ایک دینے کے لیے تیار تھے۔ نیز بخاری شریف کے سبق کے نہ لینے پر جو ڈانٹ پڑی ہے۔ وہ بھی حضرت ہی کی شفقت کا نتیجہ ہے اگر زندگی اور توفیق ہوئی تو ۳۸ھ اور ۴۴ھ کے حجوں کے ذیل میں بہت سے واقعات آ جائیں گے۔ حضرت قدس سرہٗ کی اپنی شان اور جلالت قدر کے باوجود اس سیہ کار کے ساتھ ابتداء زمانۂ تدریس میں تو میری یتیمی کی وجہ سے اور انتہاءً اس سیہ کار کے بذل کے ساتھ اشتغال کی وجہ سے شفقتیں اور محبتیں اور تعلق بڑھتا ہی رہا کیونکہ میرے حضرت کو بذل کے ساتھ عشق تھا اور اس ناکارہ کو بھی بذل سے ابتداء ہی سے عشق تھا۔ اس وجہ سے حضرت کی شفقتیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ درحقیقت بذل کی تالیف اس ناکارہ پر اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا ہی احسان تھا کہ اس کی وجہ سے میری ساری گندگیوں اور کوتاہیوں پر حضرت التفات نہ فرماتے تھے۔

تیسرا دور شیخ الہند قدس سرہٗ:

اعلیٰ حضرت شیخ الہند حضرت مولانا الحاج محمود حسن صاحب قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت

میں (اور جیسا کہ آگے آرہا ہے) اعلیٰ حضرت رائے پوری کی خدمت میں اس سیہ کار کی حاضری کی نوبت کم آئی۔ حضرت شیخ الہند کی خدمت میں تو بہت ہی کم آئی، اس لیے کہ اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کی حیات میں تو یہ ناکارہ اسیر محض تھا کہیں باہر آنا جانا تو درکنار۔ گنگوہ سہارنپور کے قیام میں بھی کہیں مقامی جگہوں پر آنا جانا نہیں ہوتا تھا۔ والد صاحب کے وصال کے بعد جو ذیقعدہ ۳۴ھ میں ہوا۔ حضرت شیخ الہند گویا اسیر مالٹا بن چکے تھے۔ مالٹا کے قیام کے زمانہ میں تو صرف اتنا ہی ہوتا تھا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے خطوط مالٹا سے اس سیہ کار کے نام کبھی کبھی آتے رہتے تھے۔ ان میں حضرت شیخ الہند کی طرف سے اس ناکارہ کے خطوط کے جواب میں سلام و دعائیں آتی رہتیں۔

حضرت شیخ الہند کی مالٹا سے واپسی:

۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹا سے روانہ ہوئے اور راستہ میں مختلف شہروں میں قید کی حالت میں قیام کے بعد ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو بمبئی جہاز سے اُتر کر رہا ہوئے اور ۲۶ رمضان المبارک کو دیو بند پہنچے۔ عید سے دوسرے دن یہ ناکارہ سیدی و مرشدی حضرت اقدس سہارنپوری کے ساتھ دیو بند حاضر ہوا۔ ان دونوں اکابر کا بغل گیر ہونا بھی خوب یاد ہے اور حضرت شیخ الہند کا نہایت مسرت کے ساتھ یہ ارشاد کہ ”مولوی حسین احمد مولانا کے لیے سبز چائے بناؤ۔“ بھی خوب یاد ہے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے نہایت مسرت کے لہجے میں فرمایا حضرت ابھی لاتا ہوں۔ اس وقت یہ ناکارہ بھی ہمرکاب تھا اور حضرت نے بہت شفقت و محبت سے مصافحہ کے بعد یاد پڑتا ہے کہ سَر پر ہاتھ بھی پھیرا تھا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند کے اسفار باوجود امراض کے بہت کثرت سے ہوئے اور آخر زمانہ میں دلی میں قیام رہا۔ ان ایام میں دیو بند یا دہلی میں زیارت و حاضری تو ہوئی مگر بہت تھوڑے سے وقت کے لیے۔ البتہ شوال ۳۳ھ سے پہلے جب ان دونوں حضرات کا حجاز کا سفر طے ہورہا تھا۔ اس زمانہ میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے ایک ہفتہ مستقل مدرسہ مظاہر علوم میں قیام فرمایا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے سوانح خودنوشت میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت سہارنپوری کو اس تحریک کا تفصیلی علم مدینہ منورہ میں ہوا۔ جب کہ حضرت شیخ الہند نے حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الاسلام سے اس کا تفصیلی حال بیان کیا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کو حضرت شیخ الہند نے تفصیلی احوال سنائے اور حضرت سہارنپوری چونکہ پہلے سے رازدار تھے اس لیے حضرت سہارنپوری کو بھی اس مکالمے میں شامل کیا۔ اس کا بہت ہی قلق ہوا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی حیات میں اس پر گفتگو کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ گو خیال کئی مرتبہ آیا۔ ورنہ میں

حضرت اقدس مدنی سے اس کی تفاصیل بیان کرتا۔ کہ حضرت مدنی تو ان حضرات کے سفر حجاز سے قبل مدینہ منورہ تھے اور یہ ناکارہ اس وقت سہارنپور میں تھا۔

ایک ہفتہ مظاہرعلوم میں:

حضرت شیخ الہند کا سفر حجاز کو روانگی سے قبل حضرت کا قیام ایک ہفتہ مدرسہ مظاہرعلوم ہی میں رہا اور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولانا الحاج احمد صاحب رامپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام بھی اس زمانہ میں سہارنپور ہی رہا۔ یہ چاروں حضرات صبح کی چائے کے بعد مدرسہ کے کتب خانے میں تشریف فرما ہوتے۔ کیونکہ تعلیم اس وقت تک شروع نہیں ہوئی تھی اور طلبہ کے کتب خانہ سے کتب لینے کا موقعہ بھی نہیں تھا۔ کتب خانہ کا دروازہ جوان کی نشست گاہ سے بہت دور تھا اس کی اندر کی زنجیر لگ جاتی اور ان چار حضرات کے علاوہ کوئی شخص اندر نہیں جا سکتا تھا۔ 11½ بجے سے حاجی مقبول احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت کے گویا گھر کے منتظم تھے، کھانا کا تقاضہ شروع کرتے اور نیچے سے آواز دے کر بار بار کہتے کہ حضرت کھانا آ گیا ہے۔ ٹھنڈا ہو گیا اور اُوپر سے شروع شروع میں تو جواب ہی نہیں ملتا تھا اور پھر دو چار مرتبہ کے بعد حکیم احمد کھڑکی میں سے کہتے کہ ابھی آتے ہیں، ابھی آتے ہیں۔ ظہر کی اذان کے قریب یہ حضرات اترتے اور جو کچھ ٹھنڈا یا گرم ہوتا اس کو جلدی جلدی نوش فرماتے۔ اسی درمیان میں ظہر کی اذان ہو جاتی۔ نہایت اطمینان سے وضو اور فرائض اور سنتوں سے فراغ پر پھر کتب خانہ میں پہنچ جاتے اور عصر کی اذان پر اُترتے۔ بعد عصر البتہ تخلیہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس وقت چائے ہُوا کرتی تھی اور مغرب کے بعد نوافل سے فراغت پر کھانا کھانا اور مہمانوں سے ملاقات کرنا۔ تین چار دن تک یہی سلسلہ رہا جو لوگ اجمالاً حضرت شیخ الہند کی تحریک سے واقف تھے وہ تو اجمالاً سمجھے ہوئے تھے۔ کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اس وقت یہ ناکارہ تحریک کا صرف نام ہی سنے ہوئے تھا اور اس زمانہ میں بعض حاسدین کی طرف سے میرے والد صاحب کو مدرسہ سے علیحدہ کرنے کی تدابیر بھی ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ والد صاحب سے عرض کیا کہ یہ سب حضرات جناب ہی کے مسئلہ میں گفتگو فرما رہے ہیں؟ میرے والد صاحب نے بہت لمبی لاحول پڑھی اور فرمایا کہ میرا مسئلہ اتنا اہم تھوڑا ہی ہے کہ صبح سے شام تک اس کے اندر محور ہیں۔ یہ تو نہ معلوم کہاں ہیں بہت اونچی پرواز کر رہے ہیں۔

حضرت شیخ الہند اور میرے حضرت کے درمیان بے تکلفی:

ان ہی ایام میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ذمے حضرت شیخ الہند کی غیبت میں ان کی تحریک کی سرپرستی تجویز ہوئی تھی اور حضرت سہارنپوری کا حضرت شیخ الہند کے ساتھ جانا تجویز

ہوا۔مگراس طرح پر کہ علیحدہ علیحدہ سفر ہو۔اس لیے کہ حکومت کی نگاہ میں دونوں مخدوش تھے۔خیال یہ ہوا کہ اگر ایک گرفتار ہو جائے تو دوسرا حجاز پہنچ جائے۔چنانچہ حضرت سہارنپوری کی روانگی پہلے ہوئی اور حضرت شیخ الہند کی بعد میں۔ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ وسط شوال ۳۳ھ میں سہارنپور سے روانہ ہوئے اور ۲۲ ذیقعدہ ۳۳ھ کہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ باوجود ارادہ کے اس جہاز سے نہ جا سکے۔ بعد میں تشریف لے گئے۔

یہ میں اپنی طلب علم کے زمانہ میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ الہند فرما رہے ہیں کہ مجھ سے بخاری دوبارہ پڑھو اور حضرت شیخ الہند کے جنازہ میں شمولیت کو بھی حوادثات وعجائبات قدرت میں لکھوا چکا ہوں۔شوال ۳۳ھ سے پہلے مظاہر کے جلسہ میں ہر سال حضرت شیخ الہند اعلیٰ حضرت رائے پوری اور حضرت تھانوی تینوں حضرات سہارنپوری قدس سرہٗ کی خدمت میں تشریف آوری کا منظر بھی خوب دیکھا۔اس مجلس میں مجمع تو بہت بڑا ہو جاتا تھا لیکن یہ چاروں اکابر ممتاز جگہ پر ایک ہی مقام پر تشریف فرما ہوتے۔اس میں حضرت شیخ الہند اور حضرت سہارنپوری کی نشست تو بہت مساویانہ ہوتی تھی اور گفتگو بھی بہت مساویانہ ہوتی تھی۔زیادہ ادب و احترام نہیں ہوتا تھا اور اعلیٰ حضرت اقدس رائے پوری اور حضرت اقدس تھانوی کی نشست ان دونوں حضرات کے سامنے مؤدبانہ ہوتی تھی اور گفتگو بھی بہت مؤدبانہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی تشریف آوری حجاز کے یکسالہ سفر سے پہلے جلسے کے علاوہ بھی بھی ہوتی رہتی تھی۔ یہ منظر تو میں نے ان چاروں اکابر کے یہاں بہت کثرت سے دیکھا کہ جب کسی ایک کی بھی آمد کسی دوسرے بزرگ کے یہاں ہوتی تو میزبان کو اتنی مسرت ہوتی کہ بس قابل دید تھی۔حضرت سہارنپوری کے مزاج میں انتظام اور نظم بہت تھا اور شیخ الہند قدس سرہٗ کے مزاج میں بے تکلفی بہت تھی۔ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند مع دو تین خدام کے مدرسہ آئے۔حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے فوراً بازار سے مٹھائی منگوائی اور جب وہ آ گئی تو حضرت قدس سرہٗ نے چٹائی بچھوائی اور اپنے دست مبارک سے چمڑے کا دسترخوان بچھایا اور خود اندر حجرہ میں طشتریاں لانے کے واسطے چلے گئے کہ ان میں قاعدہ سے مٹھائی رکھیں۔حضرت شیخ الہند نے حضرت مدنی قدس سرہٗ کو مخاطب کر کے فرمایا۔مولوی حسین احمد اتنے وہ رکابیاں لائیں اتنے اس کو نمٹادو۔ چنانچہ اتنے حضرت سہارنپوری رکابی لے کر آئے۔ وہ مٹھائی نمٹ چکی تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ خدام بھی تھے۔شاید حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنی نے ایک ایک مٹھائی کھائی ہو۔مگر ہم جیسے حریصوں کے لیے تو ایسے مواقع کبھی کبھی ملتے ہیں۔ حضرت سہارنپوری نے حجرہ سے باہر آ کر ارشاد فرمایا ”ان کے واسطے رکابیاں لاؤ۔“ اپنا اور حضرت شیخ الاسلام مدنی کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

یہ تو میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ حضرت صاحبزادی کی حیات میں حضرت مدنی، چچا جان نور اللہ مرقدہما اور اس ناکارہ کی حاضری گنگوہ بکثرت ہوتی تھی۔ حضرت مدنی کی تو بہت ہی کثرت سے ہوتی تھی۔ لیکن چچا جان کی مشغولی اور دوری کی وجہ سے کم ہوتی تھی۔ لیکن خواہش چچا جان کی یہی رہتی تھی کہ جب حضرت مدنی اور اس ناکارہ کی روانگی ہو تو مجھے بھی اطلاع ہو جائے اگر حضرت مدنی کی فوری تشریف آوری ہوتی تب تو مجبوری تھی۔ لیکن اگر مجھے پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ فلاں تاریخ ڈائری کے اندر گنگوہ کی لکھی گئی ہے تو میں چچا جان کو ضرور اطلاع کر دیتا۔

ایک بہت ہی عجیب اور لطیف قصہ ہے ایک مرتبہ ہم تینوں گنگوہ حاضر ہوئے۔ وہاں پہلے سے کسی نے اطلاع نہیں دی تھی۔ چچا یعقوب صاحب اور ان کی والدہ حضرت صاحبزادی صاحبہ کو ہم میں سے جو بھی پہنچ جاتا اس قدر مسرت اور عید آجاتی کہ کچھ انتہا نہیں وہ منظر اب تک آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے اور اس مرتبہ تو تینوں ساتھ تھے نہایت عجلت میں کئی طرح کے تھوڑے تھوڑے سالن تیار کیے۔ لذیذ اور جلدی کھانا پکانے میں حضرت صاحبزادی صاحبہ کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ ان کا مشہور مقولہ تھا کہ تم آٹھ آدمی ایک ایک روٹی لے کر بیٹھ جاؤ اگر درمیان میں تار ٹوٹے تو میرا ذمہ اور ہم لوگوں میں سے اگر کوئی ایک یا سب تنہا ہوتے تو (یعنی کوئی غیر ساتھ نہ ہوتا) تو زنانہ مکان میں کھانا کھایا کرتے اور اگر لوگ بھی ساتھ ہوتے تو مردانہ میں کھاتے چونکہ ہم تین تھے لہٰذا اندر زنانہ میں کھانا کھانے گئے۔ حضرت صاحبزادی صاحب نے خوان میں کئی طرح کے کھانے نکال کر جناب الحاج چچا یعقوب صاحب کے ہاتھ بھیجا۔ وہ سالن رکھ کر گرم گرم روٹیاں لینے گئے۔ حضرت مدنی نے مجھ سے اور چچا جان سے کہا کہ اتنے وہ روٹیاں لائیں سالن نمٹا دو۔ پھر کیا تھا میرا تو لڑکپن تھا اتنے وہ روٹی لائے۔ سب برتن صاف ہو گئے۔ دیکھ کر حیرت بھی کی اور جا کر کہا کہ اماں جی ان حضرتوں نے تو سالن رکھا کھالیا اور وہ روٹی رکھ کر سالن لائے۔ حضرت نے فرمایا یہ بھی نمٹا دو۔ پھر وہ سالن لا کر روٹیاں لینے گئے تو سالن نمٹا دیا۔ اس پر حضرت صاحبزادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا کمرے کے دروازہ پر خود تشریف لائیں اور فرمایا ''اے تم تینوں کہلاتے تو ہو حضرت، تمہارا بچپن ابھی تک نہیں گیا۔'' حضرت مدنی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ یہ حاجی یعقوب ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ روٹی ہو تو سالن نہیں سالن ہو تو روٹی نہیں کھلاتے ہیں یہ مذاق کر رہے ہیں اور میں نے عرض کیا کہ حضرت ہو جائیں یا اور کچھ۔ بہر حال آپ کے بچے رہیں گے۔ فرمانے لگیں تمہارے اس بچپن پر میرا بہت جی خوش ہوا۔ بہت دفعہ حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ خاص طور سے اس نوع کے واقعات اس سیہ کار کے پیش آئے۔

چوتھا دور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ:

اعلیٰ حضرت شیخ المشائخ قدوۃ الاتقیاء حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ کی خدمت میں بھی حاضری کی نوبت کم آئی۔ لیکن حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے زمانہ سے زیادہ ہوئی۔ میری اصالتاً حاضری تو میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد سے حضرت قدس سرہٗ کے وصال ۲۶ ربیع الثانی ۳۷ھ تک رہی لیکن والد صاحب کی حیات میں بھی ان کی ہمرکابی میں رجب ۲۸ھ سے ان کے وصال ۱۰ ذیقعدہ ۳۴ھ تک بار بار ہوئی۔ اس سیہ کار کی سب سے پہلی حاضری گنگوہ کے قیام میں جب میری عمر دس گیارہ سال کی تھی اپنے والد صاحب کے ساتھ ہوئی مولانا عبدالقادر صاحب کو پہچاننا تو یاد نہیں۔ حضرت کی کوئی امتیازی حالت بھی اس وقت نہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ اعلیٰ حضرت نے اپنے ایک خادم سے جو کثرت سے حجرہ شریف میں آتے جاتے تھے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ مولوی صاحب جو مٹھائیاں وغیرہ اندر رکھی ہے وہ سب صاحبزادے صاحب کو دے دو اور ان صاحب نے اندر کی جانب جو حضرت قدس سرہٗ کے حجرہ کے غربی جانب دوسرا حجرہ تھا اب تو اس کا دروازہ بھی مستقل ہو گیا۔ اس وقت وہ کتب خانہ تھا۔ اس میں کئی ہانڈیاں متفرق مٹھائیوں کی اور نمکین کی رکھی ہوئی تھیں اس سیہ کار کے حوالہ کر دی تھیں۔ البتہ اس وقت میں حافظ عبدالرحیم صاحب سلمہ جو اس وقت میں حضرت کا کھانا لاتے تھے وہ ضرور یاد ہیں اور ان سے اس زمانہ میں جان پہچان اور دوستی بھی ہو گئی تھی اور اعلیٰ حضرت کے حکم سے اس زمانہ میں نہر کا مخرج یعنی جس پہاڑ سے نہر نکلی ہے (بوگری والا) اس کی سیر بھی کرائی گئی تھی اور چونکہ میرا پہلا سفر تھا اور بچپن تھا اس لیے بہت سی چیزوں کی سیر کرائی تھی اور چونکہ اعلیٰ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو تیرنا بہت آتا تھا اس لیے حضرت نے خود تیر کر تیرنا بھی دکھایا تھا اور یہ ناکارہ آل کدو کے تونبوں کو بغل میں لے کر چند منٹ تیرا تھا۔ مگر قابو میں نہیں آیا۔ اس کے بعد رجب ۲۸ھ میں سہارنپور آنے کے بعد سے تو حاضری دن بدن بڑھتی ہی رہی۔ جب بھی اس ناکارہ کی ابتداء تبعاً اور انتہاءً اصالتاً حاضری ہوتی تو حضرت قدس سرہٗ کے یہاں جو بھی پھل یا مٹھائی رکھی ہوئی ہوتی تو حضرت ارشاد فرماتے کہ مولوی عبدالقادر جو کچھ رکھا ہو صاحبزادے صاحب کے حوالہ کر دو۔ یہ ناکارہ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ خود بھی کھاتا اور مکتب کے بچوں کو بھی بانٹتا۔

رائے پور کا رمضان:

اعلیٰ حضرت رائے پوری کے یہاں رمضان مبارک کا جتنا اہتمام دیکھا مشائخ کے یہاں اتنا نہیں پایا۔ ۲۹ شعبان کو جملہ حاضرین سے مصافحہ کر لیتے اور فرماتے کہ بس بھائی، اب عید پر ملیں

گے اور جو لوگ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں رمضان کرنے کے لیے باہر سے آتے تھے ان سے ملاقات کا بالکل وقت نہیں تھا۔ مسجد میں جاتے آتے دور سے حاضرین زیارت کر لیتے مصافحہ یا بات چیت کا نمبر عید کے بعد آتا۔ البتہ اخص خدام جیسے مولانا اللہ بخش صاحب۔ منشی رحمت علی صاحب وغیرہ حضرات کو اتنی اجازت ہوتی کہ تراویح کے بعد جب حضرت مولانا عبدالقادر صاحب سادی چائے لے جاتے اور اعلیٰ حضرت ایک دو فنجان نوش فرماتے اتنے یہ حضرات حاضر رہتے۔ البتہ اگر کوئی خاص مضمون شروع ہو جاتا تو کئی کئی گھنٹے لگ جاتے۔ ایک مرتبہ میں نے سنا کہ حقیقت محمدیہ پر اعلیٰ حضرت نے عشاء کے بعد تقریر فرمائی تو مسلسل کئی گھنٹے کئی دن تک ہوتی رہی۔

ایک دفعہ اس سیہ کار کو والد صاحب کے زمانہ میں (یعنی رمضان ۳۴ھ میں) رائے پور رمضان گزارنے کا شوق ہوا اور والد صاحب نے اجازت بھی مرحمت فرمادی۔ اس لیے کہ والد صاحب کے وصال کے ایک سال پہلے مجھے نیم آزادی مل گئی تھی اور خود میرے ہی سے والد صاحب نے اپنے انتقال سے ایک سال پہلے اعلیٰ حضرت رائے پوری کو خط لکھوایا تھا کہ اب تک عزیزی زکریا کی زنجیر میرے پاؤں میں ایسی پڑی ہوئی تھی کہ میں کہیں آنے جانے سے معذور تھا۔ مگر اب اللہ کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا اب آپ جب اور جہاں فرمائیں حاضر ہو جاؤں۔ چنانچہ حضرت کے ارشاد پر اعلیٰ حضرت اور میرے والد صاحب کا قیام بہٹ رہا اور اس سیہ کار نے بھی والد صاحب کی آزادی پر اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو ایک عریضہ لکھا کہ یہ ناکارہ حضرت والا کی خدمت میں رمضان گزارنا چاہتا ہے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے ازراہِ شفقت تحریر فرمایا کہ رمضان کہیں آنے جانے کا نہیں ہوتا اور نہ ملنے کا۔ اپنی جگہ پر یکسوئی سے کام کرتے رہو۔ اس گستاخ نے دوبارہ خط لکھا کہ صرف اخیر عشرے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ اس کا جو جواب آیا وہ اتفاق سے میرے کاغذات میں مل گیا۔ جس کو تبرکاً نقل کراتا ہوں۔

"برخوردار مولوی زکریا سلّمہٗ اللہ۔ از احقر عبدالرحیم بعد سلام مسنون و دعا۔

تمہارا خط پہنچا مضمون معلوم ہوا۔ جو سبب شروع ماہ مبارک میں عدم قیام کا ہے وہ اخیر ماہ میں بھی موجود ہے۔ باقی تم اور تمہارے ابا جان زبردست ہو۔ ہم غریبوں کی کیا چل سکے۔ یہ تمہاری زبردستی ہے کہ جو اس وقت ماہِ مبارک میں تم کو جواب لکھوا رہا ہوں۔ باقی جو ذکر و شغل حضرت مولانا سلمہ نے تلقین فرمایا ہے وہی کرنا چاہیے۔ عائشہ کو دعا، تمہاری والدہ مکرمہ کی خدمت میں سلام بخدمت جناب مولانا مولوی یحییٰ صاحب السلام علیکم۔"

راقم عبدالرحیم

از رائے پور

یہ خط حضرت قدس سرہٗ کے بھانجے مولانا اشفاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے یہ اضافہ تھا۔ ''از محمد اشفاق عفی عنہ السلام علیکم واقع میں ہوز بردست اس میں کچھ شک نہیں۔ فقط۔'' مگر میرے والد صاحب نے فرمایا کہ تیری وجہ سے حضرت کی یکسوئی میں فرق پڑے گا اور حضرت کو تیرے کھانے پینے کا فکر رہے گا۔ اس لیے حضرت کا حرج نہ کر اور یہ میرے والد صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا۔ حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ کے اہتمام کو جو اس ناکارہ کی حاضری پر ہوتا تھا بہت سے لوگ دیکھنے والے اب بھی موجود ہیں یہ سب کچھ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہ کے تعلق کا ثمرہ اور عکس تھا اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے اس ارشاد کا ردعمل حضرت رائے پوری ثانی نے کیا کہ جو رمضان رائے پور میں ہوتا حضرت کی خواہش ہوتی کہ یہ ناکارہ رائے پور حاضر ہو مگر بدقسمتی سے نفس امارہ دینی اعذار کا ٹنٹا سامنے کھڑا کر دیتا۔ لیکن حضرت قدس سرہٗ کی حیات کا آخری رمضان اس وجہ سے کہ اس زمانے میں ہفتہ کے تین دن رائے پور گزرتے تھے اور چار دن سہارنپور اس لیے رمضان بھی نصف سہارنپور گزرا نصف رائے پور۔ مگر اللہ کے محبوبوں کی شفقت سے بھی اس سیہ کار نے کچھ نہ لیا۔''

میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے بعد میں اپنی مدرسی کے ذیل میں لکھ چکا ہوں کہ ایک جانب تو اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے مدرسہ میں یہ سفارش کی کہ پندرہ روپے تنخواہ کم ہے کم از کم پچیس روپے ہونا چاہیے اور دوسری جانب اس سیہ کار سے از راہ شفقت ومحبت ارشاد فرمایا کہ مدرسہ کی تنخواہ خطرہ کی چیز ہے جب اللہ توفیق دے چھوڑ دیجیو۔ حضرت قدس سرہٗ کی ہی توجہ اور شفقت کا اثر تھا کہ اللہ نے چھوڑنے کی توفیق عطا فرمادی۔ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد مدرسہ کے خزانچی کا ایک واقعہ تفتیش کا پیش آ گیا۔ ہر وقت اس کے متعلق کچھ مساعی ہو رہی تھیں اس کا بہت فکر تھا۔ حضرت نے استفسار فرمایا اس میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی حماقت سے حضرت کے استفسار پر یہ لکھ دیا کہ والد صاحب کے انتقال کے بعد اب ان امور کی اس ناکارہ کو اطلاع نہیں ہوتی۔ یہ کیا ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم اور انعام سے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے کہ میرے اس احمقانہ جواب پر حضرت قدس سرہ رائے پور تشریف لائے اور مجھے علیحدہ بٹھا کر یہ سارا واقعہ بڑی تفصیل سے سنایا۔

میں بلا تصنع اور بلا مبالغہ لکھواتا ہوں اس میں ذرا تو یہ یا مبالغہ نہیں کہ جب بھی یہ منظر یاد آتا ہے سناٹا چھا جاتا ہے۔ خبر نہیں کیا حماقت کی تھی۔ میں اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد تقریباً چھ ماہ تک ان کو بہت ہی کثرت سے خواب میں دیکھا کرتا تھا۔ دن ہو یا رات اور اکثر خواب اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا کرتا تھا۔ اس لیے کہ اپنے حضرت قدس سرہٗ سے ڈرتا تھا اور

اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی بارگاہ میں ان کی شفقتوں کی وجہ سے بہت گستاخ تھا اور میری ان حماقتوں پر حضرت قدس سرہٗ اس قدر تبسم اور مسرتوں کا اظہار فرماتے تھے کہ اس وقت تو یہ گستاخیاں بھی معلوم نہ ہوئیں۔ خواب تو بہت سے یاد ہیں اور میرے انبار میں خطوط بھی اعلیٰ حضرت رائے پوری اور دیگر اکابر کے تو ہزاروں ملیں گے:

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ایک مرتبہ اس سیہ کار نے خواب میں دیکھا کہ والد صاحب نے مجھے خواب میں تین کتابیں دیں۔ کافیہ، شافیہ، مقامات، میرے حضرت قدس سرہٗ تو اس وقت نینی تال جیل میں تھے۔ اس لیے میں نے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا۔ حضرت کا جو جواب آیا وہ بھی اس وقت میرے سامنے ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا:

برخوردار مولوی زکریا سلّمہٗ۔ از احقر عبدالرحیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''تمہارے دو خط مولوی عبدالقادر صاحب کے نام آئے۔ میری معذوری جو باعث تاخیر جواب ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ اب مختصراً عرض کرتا ہوں پہلے خواب کی تعبیر۔ ہر چیز کی تعبیر کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک جملہ خلاصہ ہے۔ اس کی تعبیر جو اپنے خیال میں آئی وہ عرض کرتا ہوں۔ وہ صرف یہ ہے کہ کافیہ، شافیہ اور مقامات امانت کو معیشۃ کافیہ و حالۃ شافیہ و مقامات السلوک والوصول۔ یہ تینوں بشارتیں حق تعالیٰ نے تمہاری طبیعت میں ودیعت رکھی ہیں۔ جو اپنے اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوں گی دوسرے خواب کی تعبیر کی ضرورت نہیں۔ سب قصہ ہی دنیا کا چند روزہ ہے۔ خصوصاً عالم آخرت کے مقابلہ میں تو ساری دنیا کی عمر ہی کچھ نہیں۔'' فقط

میں نے اعلیٰ حضرت کو یہ واقعہ بھی لکھا تھا کہ کثرت سے جب سوتا ہوں والد صاحب کو خواب میں دیکھتا ہوں۔ اس کا جواب اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا تو اس وقت سامنے نہیں۔ مگر اس کے متعلق حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک کارڈ سامنے ہے۔ جو حسب ذیل ہے:

سیّدی ومولائی حضرت دام مجدکم۔ از احقر عبدالقادر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

''والا نامہ شرفِ صدور ہو کر باعث سرور ہوا۔ حضرت تعجب کی کیا بات ہے۔ مجھ جیسوں کو پوچھتا ہی کون ہے اور کس کو جواب نہیں دیتا ہوں۔ جناب بھی بوجہ اس تعلق کے جو کہ حضرت مرحوم مغفور (یعنی میرے والد صاحب) کے ساتھ تھا یاد فرماتے ہو۔ جس کا یہ ناکارہ نہایت ممنون ہے اور باعث سعادت دارین سمجھتا ہے۔ نصف اخیر خط کا پورا خواب حضرت قدس سرہ کو سنایا اور دوبارہ جناب کو جواب لکھوانے کی یاد دہانی بھی کر دی۔ یہ کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ جناب کو جواب کب

لکھوایا جائے گا۔ تعبیر تو جو حضرت اقدس لکھوادیں گے وہ ہوگی۔ اپنا خیال یہ ہے کہ آنجناب پریشان نہ ہوا کریں۔ محض یہ ہے کہ حضرت مرحوم کی روحانیت متوجہ ہے جس کی بڑی خوشی ہے چونکہ وہ یقیناً مصفیٰ اور کثافت سے بالکل مبرّا ہے۔ یہ جو کچھ آپ دیکھتے ہیں یا جواب ملتا ہے جناب کے خیالات اور تفکرات کا عکس ہے۔ جب خود آدمی اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔ بات ہی کیا ہے خام خیالی ہے۔ اصل بات تو وہ ہوگی جو کہ حضرت قبلہ لکھوادیں گے۔ بس اتنی عرض ہے کہ احقر کو ایک نالائق خادم سمجھا کیجئے۔ کچھ نہیں فقط آپ لوگوں کا سہارا ہے۔''

ایک بات یاد آگئی جو کہ بہت اہم ہے اور بہت قابلِ اہتمام دوستوں کو خاص طور سے اس کی تاکید کرتا ہوں۔ اس کا ضرور اہتمام رکھیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ''جو شخص کسی کو کسی گناہ کے ساتھ عار دلاتا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے اس میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔'' یہ مضمون میرا بہت ہی مجرب ہے اور بہت سے لوگوں پر اس کا تجربہ کر چکا ہوں۔ دوستوں کو وصیّت اور نصیحت کرتا ہوں کہ کسی کو کسی گناہ پر عار دلانا بڑی سخت چیز ہے۔ اس کو نصیحت کرنا۔ اس کو تنبیہ کرنا امر آخر ہے اور اس کو عار دلانا یا ذلیل کرنا امر آخر ہے اس سے بہت ہی بچیں۔ اس وقت یہ حدیث پاک اس خاص واقعہ پر یاد آئی۔

یہ سیہ کار اپنی حماقت سے اپنے بچپن میں جب یہ دیکھتا تھا کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے دانت بالکل نہیں اور حضرت تمباکو کے ساتھ پان تناول فرماتے تو اس کو چار پانچ منٹ میں ویسے کے ویسے نکال کر اگالدان میں ڈال دیتے تو میں اپنی حماقت سے یہ سوچا کرتا تھا کہ ان کو پان کھانے کی کیا ضرورت پیش آرہی ہے۔ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں پان توڑ کر کھانے کا دستور نہیں تھا بلکہ چھوٹا سا پان بغیر چھالیہ کے کھاتے اور تھوڑی دیر بعد ویسے کے ویسے اگالدان میں پھینک دیا کرتے تھے۔ اب میں اس حماقت کو دس برس سے بھگت رہا ہوں۔ دانت ٹوٹ گئے اور پان کا مرض ہے۔ بہت باریک باریک ٹکڑے کر کے کھاتا ہوں تو اپنے آپ کو بڑی ملامت کرتا ہوں کہ تجھے پان کھانے کی کیا مصیبت ہے۔

بات میں بات یاد آتی ہے اور اس قسم کی باتیں لکھوانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ آپ بیتی تو فضول ہی لکھوائی، مگر اس قسم کی باتیں بہت مفید اور کارآمد ہوتی ہیں۔ میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال پر چند واقعات بڑے عجیب پیش آئے۔ تقریباً چھ ماہ دن میں یا رات میں جب بھی میں سوتا تھا، والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھتا تھا اور خواب میں خوب محسوس ہوتا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے اور میں ان کو خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ بہت سی باتیں ان سے عنوان دریافت کرتا کہ ایک بات جلدی سے یہ بتا دیجئے پھر تو میری آنکھ کھل جائے گی۔ اس زمانے میں بہت سے ایسے حضرات بھی تعزیت کے لیے آئے جن کو اللہ تعالیٰ نے کشف قبور کی دولت سے نوازا تھا۔

چنانچہ ایک بزرگ تشریف لائے اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''مولانا یحییٰ صاحب نے چند پیغامات دیے ہیں۔

(۱)......میرے قرضہ کی بالکل فکر نہ کر، کیونکہ مجھ پر اس کا بالکل بار نہیں۔

(۲)......فلاں شخص کی وجہ سے مجھ پر کوئی گرفت نہیں اس کو اپنی حرکتوں کی وجہ سے بہت نقصان ہوا ہے۔

(۳)......''اللہ والوں سے ڈرتے رہا کرو، ان کی الٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔'' پہلے دو نمبر تو بالکل صحیح ہیں میری سمجھ میں بھی آ گئے۔ کیونکہ مجھے والد صاحب کے قرض کی بہت فکر تھی کہ ان پر ان احادیث کے بارے میں جو مقروض کے لیے وارد ہوئی ہیں کوئی گرفت نہ ہو رہی ہو۔ اسی لیے میں نے والد صاحب کے انتقال کے بعد چچا جان کے مشورے سے سب لوگوں کو خطوط لکھ دیے کہ ان کا قرضہ میری طرف ہے۔ جس کا بیان والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے سلسلہ میں باب چہارم حوادث میں گزر چکا۔ (۲) بھی سمجھ میں آ گیا کہ ایک صاحب کو میرے والد صاحب سے بغض پیدا ہو گیا تھا اور وہ حضرت کے یہاں بہت مقرب تھے اور ان کے متعلقین چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور اس ناکارہ سے بہت خفا تھے، اسی کے ثمرہ میں چچا جان اور اس ناکارہ کو حضرت قدس سرہٗ پرسی، آئی، ڈی بتاتے اور میرے سبعہ معلقہ کی ابتدائی تدریس میں ان سب دوستوں نے بہت مخالفت کی تھی۔ ایک عرصہ بعد والد صاحب کا یہ ارشاد بھی دیکھ لیا۔ کیونکہ وہ صاحب حضرت کے یہاں سے پھر معتوب بنا کر نکالے گئے اور جب اس ناکارہ نے حضرت قدس سرہٗ کے یہاں ان کی سفارش کی تھی تو حضرت قدس سرہٗ نے بڑے تعجب سے فرمایا تھا کہ تم بھی اس کی سفارش کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا ہاں حضرت ضرور کرتا ہوں کہ حضرت کی ناراضی سے اس کا دین خراب ہو جائے گا۔ لیکن (۳) کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کہ اُلٹی تو بہر حال اُلٹی ہے، لیکن ابا جان کا یہ ارشاد کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہو، ان کی الٹی بھی سیدھی ہے سمجھ میں نہیں آیا۔

۴۶ھ میں حجاز سے واپسی پر حضرت اقدس رائے پوری ساتھ تھے، میرے مرشد میرے حضرت قدس سرہٗ نے حضرت رائے پوری کی زبانی مدرسہ میں حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو یہ پیغام بھیجا کہ فلاں شخص کے متعلق تمہارا رویہ مناسب نہیں۔ حضرت رائے پوری نے حضرت ناظم صاحب کو یہ پیام پہنچا دیا۔ حضرت ناظم صاحب نے فرمایا کہ فلاں شخص حضرت کو جھوٹی شکایت لکھتا ہے۔ میری طرف سے اس پر کوئی زیادتی نہیں۔ میرے نزدیک حضرت ناظم صاحب کا یہ جواب بالکل صحیح تھا کہ یہ شخص بہت جھوٹی شکایات حضرت ناظم صاحب کی لکھتا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ حضرت ناظم صاحب کے اس جواب پر کچھ خوف زدہ

سے ہو کر ساکت ہو گئے۔ مجھے اپنے والد صاحب کا یہ کشف والا پیام (۳) یاد آیا۔
میں نے حضرت رائے پوری کو یہ کشف والا مقولہ سنایا کہ اس کا مطلب کبھی سمجھ میں نہیں آیا اور اس وقت حضرت ناظم صاحب کے جواب پر میں نے آپ کو کچھ خوف زدہ دیکھا حالانکہ حضرت ناظم صاحب نے صحیح فرمایا تھا کہ حضرت کا یہ ارشاد اس شخص کی جھوٹی شکایت پر مبنی ہے۔ حضرت رائے پوری نے میرے اس اشکال کے جواب میں بہت ہی صحیح فرمایا کہ یہ تو تم نے صحیح کہا کہ اُلٹی بات بہر حال اُلٹی ہے، لیکن اہلِ اللہ کے قلوب میں اگر کسی سے تکدر پیدا ہو جائے خواہ کسی غلط بات کی ہی وجہ سے پیدا ہو تو ان کے پاک دل کا تکدر رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ اس شخص کو کسی مصیبت میں پھانس دیتا ہے، یہ بات میری خوب سمجھ میں آ گئی اور ان کے نظائر بھی دیکھے۔ اس لیے میں اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا کشفی پیام دوستوں کو ضرور اہتمام سے پہنچاتا ہوں کہ ان اللہ والوں سے بہت ڈرتے رہنا۔ ان کے دل میں تمہاری طرف سے تکدر نہ پیدا ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور میرے دوستوں کو بھی اس سے محفوظ رکھے۔ غالباً میں اپنے رسالہ الاعتدال میں بھی اس نوع کا ایک مضمون لکھوا چکا ہوں کہ کسی شخص کا معتقد نہ ہونا امر آخر اور اس کی مخالفت اور بے ادبی امر آخر ہے۔ تم اللہ والوں میں سے کسی کے معتقد نہیں ہوتے نہ ہو۔ مگر اس کی مخالفت یا کوئی حرکت جس سے اس کے دل میں تکدر پیدا ہو بہت بچنا۔
بات پر بات یاد آتی ہے اور کہیں سے کہیں نکلی چلی جاتی ہے۔ میں تو اعلیٰ حضرت رائے پوری کی شفقتیں لکھوا رہا ہوں کہ مجھے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع باوجود اس کے کہ اعلیٰ حضرت کی زندگی کا زمانہ حضرت شیخ الہند کے زمانہ سے زیادہ پایا۔ لیکن بذل کے شروع ہو جانے کی وجہ سے حاضری کا موقعہ کم ملا۔ لیکن جتنا بھی ملا اس میں حضرت کی شفقتیں بہت زیادہ رہیں۔ آپ بیتی نمبر ا کے صفحہ ۸ پر لکھوا چکا ہوں کہ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے مولانا میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مشورہ پر مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں کتب خانہ لے کر میرٹھ منتقل ہو جاؤں اور میرے اس جواب پر کہ ''میری یہ تمنا ہے کہ حضرت سہارنپوری کی حیات تک کہیں باہر نہ جاؤں۔'' حضرت رائے پوری نے انتہائی مسرت سے فرمایا کہ بس بس اور انتہائی مسرت کے ساتھ مجھے اتنی دعائیں دیں کہ جن کا مشاہدہ اب تک خوب کر رہا ہوں۔ اس سیہ کار کا دستور تقسیم ہند سے پہلے زندوں اور مُردوں کی طرف سے قربانی کے حصص کی کثرت کا بہت تھا۔ آٹھ دس گائیں تو مستقل خود میری ہی ہوتی تھیں اور جس کی گائے میں ایک آدھ حصہ بچ جاتا تھا۔ اس کے لیے عام دستور تھا کہ وہ مجھے اطلاع کرے اور میرا حصہ اپنے یہاں کر لے۔ نسبی، سلوکی، علمی، مشائخ خصوصی صحابۂ کرام، ائمۂ فقہ، ائمۂ حدیث، غرض جتنی بھی گنجائش ہوا کرتی مجھے حصہ لینے میں انکار نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس کے

ساتھ یہ بھی شوق تھا کہ اکابر کے جانوروں میں میرا حصہ ہو جائے۔ حضرت اقدس سہارنپوری اعلیٰ حضرت رائے پوری اور عجیب بات یہ کہ حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے جانوروں میں بھی ایک ایک حصہ ہوتا تھا۔ جس کے گوشت وغیرہ سے مجھے کوئی تعلق نہیں، وہ جس طرح چاہیں تصرف فرماویں۔ حضرت رائے پوری ثانی نے تو اس کا ردِ عمل یہ کیا کہ مستقل ایک جانور میری طرف سے حضرت خود کیا کرتے تھے چاہے رائے پور میں ہوں چاہے پاکستان میں۔ رائے پور کے قیام میں حضرت کا ارشاد ہوتا تھا کہ میں ۱۲ کو ضرور پہنچوں اور جانور میرے سامنے ہی ذبح ہو۔ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے زمانے کا ایک کارڈ چونکہ نظر پڑ گیا، وہ بھی درج کرا رہا ہوں، جو حسبِ ذیل ہے:

سیّدی ومولائی حضرت دام مجدکم ،از احقر عبد القادر السلام علیکم ورحمۃ اللہ

”والا نامہ شرف صدور ہو کر باعث افتخار خاکسار ہوا۔ مضمون حضرت اقدس سلمہٗ کی خدمت شریف میں عرض کیا۔ بلکہ کچھ بلفظ پڑھ کر سنایا یہی جی چاہا اور اپنے نزدیک یہی مناسب سمجھا۔ وقت بھی مناسب ملا۔ یہ ارشاد فرمایا کہ یوں خدمت والا میں لکھ دے کہ بندے کی سعادت تو ہے، یا سعادت جانتا ہے۔ غرض حضرت اقدس سلمہٗ نے اس گائے میں جو یہاں آنجناب والا صفات بوساطت شاہ صاحب ارسال فرمائیں گے۔ ایک حصہ کی شرکت قبول، بخوشی فرمائی۔ اب احقر عرض پرداز ہے، حضور پُر نور نے اس کی تفصیل نہ تحریر فرمائی، آیا وہ حصہ حضور انور اپنی طرف سے حضرت اقدس سلّمہٗ کو عطا فرما رہے ہیں یا قیمتاً حضرت سلّمہٗ خریدیں گے۔

یہ آپ کا غلام غبی بہت ہے، پوری بات نہیں سمجھتا، حضرت خفا نہ ہوں اور دعاء سے فراموش بھی نہ کیا جاؤں، آخر آپ ہی کا ہوں جیسا بھی ہوں۔ حضرت سلام فرماتے ہیں اور طبیعت بدستور سابق ہی ہے۔ تین چار روز سے شب کو کسی قدر حرارت ہوتی ہے۔“

اس خط پر رائے پوری کی مہر ۶ ستمبر ۱۸ء کہ ہے جو قمری حساب سے ذی الحجہ ۳۶ھ بنتا ہے۔ ایک خط اور بھی اس وقت میرے سامنے ہے۔ ذخیرہ تو جیسا کہ بار بار لکھ رہا ہوں ہزاروں کی تعداد ہے، اس وقت اتفاق سے ایک لفافہ سامنے آ گیا، جس میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے خطوط ہیں۔ ہیں تو بہت سے جن میں سے چند کا نمونہ اندراج کرایا۔ ایک خط حسب ذیل ہے:

سیدی ومولائی حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سلمہٗ ،از احقر عبد القادر السلام علیکم ورحمۃ اللہ

”والا نامہ شرف صدور ہوا۔ اللہ تعالیٰ جناب کو صحتِ عاجلہ عطا فرمائے۔ جناب کا خط حضرت اقدس سلمہٗ کو سنانے لگا۔ اس قدر ہنسی آئی پورا خط سنا نہ سکا۔ دو دفعہ کر کے بمشکل سنایا۔ یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی خط مولوی زکریا کا میرے پاس نہیں آیا۔ البتہ مولوی الیاس کے خط آئے۔ ان کا

جواب بھی لکھوا دیا گیا۔ باقی ویسے خط مولوی زکریا کو اس وجہ سے لکھا کہ اکثر آدمی آتے رہتے ہیں، ان سے خبر ملتی رہتی ہے اور یہاں سے بھی پوچھوا بھیجا گیا۔ چنانچہ مولانا عاشق الٰہی صاحب ابھی گئے ہیں ان کے ہاتھ سلام وغیرہ کہلا بھیجا گیا۔ حضرت اقدس سلمہٗ کو بھی کئی روز سے بخار آرہا ہے اور ضعف بہت ہے۔ نماز میں بھی قیام بتکلف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جناب کو جلد صحت عطا فرمائے۔ جناب کی زیارت کو جی چاہتا ہے، دیکھئے کب ہو۔ آج کل ڈاک کے مدار المہام مخدوم مکرم حضرت ملا جی صاحب سلمہٗ ہیں۔ واقعی جناب نے خوب پوچھا۔ بزرگ تو بڑے ہیں۔ خطوط بھجوانے کی کچھ زیادہ حاجت نہیں سمجھتے۔ جس کسی کو کچھ کہنا ہو خود آ کر بالمواجہ کہو۔ دور دور سے تیر چلانا کچھ حضرت ملا جی کو بھاتا نہیں۔ حضرت اقدس مدظلہٗ اور مولوی الیاس صاحب وغیرہ کو دست بستہ سلام و دعا۔"

رائے پور کی مسجد باغ کا افتتاح:

جب باغ کی تعمیر ہوئی تو اس کے افتتاح کے لیے اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے میرے والد صاحب کو بلایا اور بہت تاکیدی خط ایک ڈاک میں ایک دستی روانہ فرمائے۔ جس میں بہت تاکید سے مسجد کی افتتاح کے لیے بلایا گیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ ضرور آنا ہوگا۔ کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ میرے والد صاحب اس کی تعمیل میں تشریف لے گئے۔ یہ ناکارہ بھی ساتھ تھا۔ بہٹ تک تو تانگہ تھا اور اس کے بعد پاؤں تشریف لے گئے دھوپ بڑی تیز تھی۔ آدھی پٹری پر جا کر لیٹ گئے۔ مجمع دیہات کا بہت پٹری پر گزر رہا تھا، جانے والوں سے دو تین منٹ کے بعد پیام بھیجتے کہ آدھے راستے تو پہنچ گیا ہوں، اگر دیر ہو جائے تو تھوڑا انتظار فرمائیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ۲ بجے کے قریب پہنچے تھے۔ غسل فرمایا اور اعلیٰ حضرت نے جوڑا مع عمامہ کے تیار کرا رکھا تھا۔ اسے پہن کر جمعہ کی نماز پڑھائی۔ جس وقت میں یہ خط سن رہا تھا مکرم محترم جناب الحاج حافظ عبدالعزیز صاحب گمتھلوی میرے پاس تشریف فرما تھے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں خطوں کی مجھے ضرورت ہے۔ میں نے بصد احترام پیش کر دیے۔ اس کے علاوہ بھی اعلیٰ حضرت کے خطوط اس لفافہ میں کئی تو ملے، دوستوں کا اصرار جس کے نقل پر ہوا، وہ کرا دیے۔ ایک خط میرے والد صاحب کے انتقال پر جو حضرت نے تحریر فرمایا وہ یہ ہے:

برخوردار مولوی زکریا سلمہٗ از احقر عبدالرحیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"اس وقت گیارہ بج کر بیس منٹ پر تار جو بہٹ شاہ صاحب کے پاس آیا تھا، بندہ کے پاس حاجی غلام محمد صاحب لے کر آئے۔ جس سے اچانک اس حادثۂ عظیمہ انتقال مولانا محمد یحییٰ صاحب کی خبر معلوم ہو کر سکتہ کی حالت ہوگئی۔ طبیعت پر ایک ایسی حیرت ہے جو تحریر میں نہیں آ سکتی

ہے۔مشیت ایزدی میں کسی کو دخل نہیں۔وہ مالک مختار ہے وہ اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے اس سے جلد اطلاع دو کہ مرض پیش آیا۔اس فوری حادثہ سے ایک سخت حیرت ہے۔میں اسی وقت یہاں سے چل دیتا مگر اپنی حالت کی وجہ سے سخت مجبور ہوں۔اس وقت زیادہ کیا لکھوں۔"

راقم عبدالرحیم از رائے پور

بروز شنبہ

بوقت گیارہ بج کر بیس منٹ

اسی سلسلہ کا دوسرا والا نامہ:

برخوردار مولوی محمد زکریا سلمہٗ اللہ تعالیٰ،از احقر عبدالرحیم السلام علیکم ورحمتہ اللہ

"یہ حادثہ ایسا ہے کہ جس نے طبیعت کو بہت مضمحل کر دیا۔مجھ کو تو صدمہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ مگر یہاں پر مرد وعورت جس کسی نے سنا سب کو صدمہ ہے۔بجز صدمہ اُٹھانے کے اور کوئی کیا کرسکتا ہے۔طبیعت بے اختیار ہے اور تمہارے پاس آنے کو طبیعت چاہتی ہے،مگر اس وجہ سے فوراً حاضر نہیں ہوسکا کہ ضعف اس درجہ کا ہوگیا کہ کھڑے ہوتے ہوئے چکر آتا ہے۔اندیشہ گرنے کا ہوتا ہے۔مسجد تک جانے میں مغرب اور عشاء اور صبح کو بغیر دوسرے شخص کے پکڑے جا نہیں سکتا ہوں۔ادھر شاہ صاحب چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ان کی صحت کی حالت میں سواری کا انتظام بسہولت ہو جاتا تھا۔اب ایسی سواری دستیاب نہیں کہ جس میں رائے پور سے بہٹ تک پہنچوں۔عنقریب ارادہ کررہا ہوں کہ کوئی سواری کا انتظام ہو جائے تو انشاءاللہ تعالیٰ حاضر ہوں گا۔ بیل گاڑی کی حرکت سے دماغ پر ایک ایسا اثر پہنچتا ہے کہ جس کی تاب نہیں لاسکتا ہوں۔اگر چہ یہ صدمہ تو ایسا ہے کہ تم کو تو لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔مگر آخر مشیت ایزدی پر صبر کرنا اور راضی برضا رہنا اس کے سچے بندوں کا کام ہے۔اُمید ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ تمہاری یہی حالت ہوگی۔

اپنی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ کی جہاں تک ہوسکے تسلی کرو اور صبر اور راضی برضا ہونے کا ان کو اجر سناؤ۔اگرچہ عنوان اس صدمہ کا بہت وجوہ سے بہت بڑھا ہوا ہے مگر آخر ہمیں تمہیں سب کو پس وپیش یہی راہ طے کرنا ہے۔مالکِ حقیقی اپنے جو چاہے کرلے کسی کو مجال دم زدن نہیں،رضا وتسلیم بندوں کا کام ہے۔زیادہ کیا عرض کروں۔یہ نہیں معلوم ہوا کہ کیا مرض پیش آیا اور کس وقت انتقال ہوا۔عائشہ کو بہت بہت دعاء اور اپنی والدہ مکرمہ کی خدمت میں سلام ودعاء عرض کر دینا۔"

از جانب مولوی عبدالقادر صاحب ملاجی صاحب ومولوی رستم علی صاحب ومولوی سراج الحق صاحب بعد سلام مسنون مضمون واحد ہے۔

راقم عبدالرحیم

از رائے پور،بروز اتوار

اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کو میرے والد صاحب کے بُلانے کا اتنا ہی اشتیاق و اصرار رہتا تھا، جس کا نمونہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اس سیہ کار کو بُلانے پر اصرار کے دیکھنے والے ابھی بہت ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا اصرار اور خواہش یہ رہتی تھی کہ میرے والد صاحب کثرت سے بار بار رائے پور جائیں اور خوب ٹھہریں۔ اسی کا اتباع حضرت رائے پوری ثانی نے اس سیہ کار کے ساتھ کر کے دکھایا، بلکہ اس سے زیادہ کر دکھایا۔ اعلیٰ حضرت کا ایک خط میرے والد صاحب کے نام دوستوں کے اصرار پر اس سلسلے کا نقل کرا رہا ہوں:

المخدوم المکرّم حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب مدفیوضہم، از احقر عبدالرحیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''آپ سے ملنے کی غرض سے بہٹ آنے کو بہت جی چاہتا رہا۔ مگر اول تو سواری اختیاری نہیں ہے۔ دوم یہ کہ شاہ صاحب کو احقر کے جانے پر اُوپر کا کمرہ خالی کرنا پڑتا ہے کہ جس میں وہ خود تشریف رکھتے ہیں۔ بہٹ آپ کا تشریف لانا طمانیت کا ہو تو فرمادیں، تاکہ بہٹ حاضر ہونے کا قصد کروں۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ آپ جمعرات کو تشریف لائیں اور جمعہ کو واپس ہونے لگیں۔ اس صورت میں تو مجھے آنے جانے کی ہی بہت تکلیف ہوگی۔ طمانیت سے ٹھہرنا ہو تو تشریف لائیں۔''

راقم عبدالرحیم از رائے پور

۵ ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو میرے والد صاحب سے بہت ہی محبت اور تعلق تھا۔ ۲۸ھ کے سفر میں بہت ہی خواہش اور تمنا رہی کہ والد صاحب کو حج میں ساتھ لے جائیں اور والد صاحب بھی تیار تھے۔ ٹیکے وغیرہ لگوا لیے تھے۔ عین وقت پر کچھ ایسی مجبوریاں پیش آئیں کہ والد صاحب کو سفر ملتوی کرنا پڑا۔

ایک دفعہ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے میرے والد صاحب سے ارشاد فرمایا کہ پنجاب کا ایک لمبا سفر ہے اور اعلیٰ حضرت رائے پوری کا سفر بھی حضرت مدنی کی طرح سے گھوڑے سوار نہ ہوتا تھا بلکہ حضرت رائے پوری ثانی کی طرح سے نہایت اطمینان کا ہفتوں اور مہینوں کا ہوتا تھا۔ مگر اس سفر میں چونکہ میرے والد صاحب بھی ساتھ تھے، اس لیے اعلیٰ حضرت کو مشقت تو بہت اُٹھانی پڑی لیکن سفر بہت طویل اور اپنی عادت شریفہ کے خلاف عجلت کا ہوا، جس پر مجھے بھی بہت قلق ہوتا تھا۔

اعلیٰ حضرت نے میرے والد صاحب سے فرمایا کہ یوں جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پنجاب کا سفر تو حضرت بھی فرمالیں، بہت سے مشتاق ایسے ہیں جو آنہیں سکتے۔ حضرت گنگوہی کے خدام بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ جناب کی زیارت کے بھی مشتاق ہیں۔ میرے والد نے تین شرطوں کے ساتھ قبول فرمایا۔ پہلی شرط یہ کہ اس سفر میں جو نقد ہدایا آئیں تو وہ میرے والد صاحب کے، کھانے پینے

اور کپڑے قسم کی جو اشیاء ہوں وہ حضرت کی۔ دوسرے یہ کہ ہر جگہ پر کھانے اور آرام کرنے میں میرے والد صاحب آزاد ہوں گے، حضرت کے پابند نہ ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ میں واپسی میں ہمرکابی کا پابند نہیں ہوں، جہاں سے میرا جی چاہے گا واپس آجاؤں گا۔ حضرت اقدس نے تینوں شرطیں منظور فرمالیں۔ یہ ناکارہ بھی ہمرکاب تھا۔

پہلی منزل یہاں سے انبالہ ہوئی۔ حافظ صدیق صاحب کے مکان پر قیام ہوا۔ اس کے بعد خانپور، لدھیانہ، جگراؤں، رائے پور گوجران تک یہ سفر ہوا۔ ہر جگہ جہاں جانا ہوتا سب سے پہلے اعلیٰ حضرت فرماتے کہ صاحبزادے اور حضرت کا بستر الگ کردو، پہلے چارپائی اور بستر وغیرہ بچھوا کر میرے والد صاحب کو وہاں لٹوا دیتے۔ یہ ناکارہ شوق میں حضرت کے ساتھ رہتا۔ ہر جگہ پر ہزاروں کا مجمع حضرت کو گھیر لیتا۔ مصافحوں اور بیعت کی اس قدر بھرمار ہوتی کہ کچھ انتہا نہیں۔ کھانا تو میرے والد صاحب کو علیٰحدہ کھانے کی نوبت نہیں آئی اس میں تو اعلیٰ حضرت کی شرکت ہوتی تھی، لیکن لیٹنے میں کبھی ساتھ نہ ہوا اور اعلیٰ حضرت کو بعض مرتبہ تو کئی کئی دن رات لیٹنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ رتھ اور بیل گاڑیوں میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور تیسرے گاؤں۔ بعض مرتبہ تو چوبیس گھنٹے میں تین چار گاؤں نمٹا دیتے۔ میں تو بچہ تھا کیا تھکتا۔ مگر اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ پر تکان اس قدر محسوس ہوتی تھی کہ کچھ حد نہیں ہے اور تکان کا کیا قصور، صبح کی نماز پڑھ کر ایک جگہ سے چلے اور خدام وعشاق سینکڑوں کی تعداد میں گاڑیوں کے دونوں اطراف پروانہ وار خوشی خوشی میں جھومتے بھاگتے دوڑتے چلتے تھے۔ دوسرے گاؤں میں پہنچے تو میرے والد صاحب تو لیٹ جاتے اور اعلیٰ حضرت عشاق کے ہجوم میں بیٹھ جاتے تھے۔ کہیں لسی کا دور کہیں چائے کا دور چلتا۔ حضرت تو ایک دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیتے۔ مگر مجمع کی کثرت کی وجہ سے چائے کا دور بھی دیر تک چلتا اور لسی کا بھی۔ مگر حضرت قدس سرہٗ اتنی دیر مصافحہ اور بیعت سے نمٹ کر اگلی منزل کے لیے گاڑی میں تشریف رکھتے۔ یہ ناکارہ کبھی حضرت قدس سرہٗ کی گاڑی میں ہوتا اور کبھی اپنے والد صاحب کی، اسی سفر میں رائے پور گوجراں میں حضرت مولانا احمد الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا نکاح بھی میرے والد صاحب نے پڑھایا تھا۔

رائے پور گوجراں کے قریب کوئی دریا تھا جس پر کشتیوں میں بیٹھ کر عبور ہوا تھا۔ ادھر کی گاڑیاں ادھر ہی رہ گئی تھیں اور رائے پور گوجراں سے ہزاروں کی تعداد میں پیادہ اور پچاس بناٹھ گھوڑیاں بڑی خوبصورت جواب تک نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر اس لالچی کے منہ میں پانی بھر گیا۔ کہ گھوڑی پر بیٹھیں گے چڑھنا آتا نہیں تھا۔ ایک نہایت اونچی گھوڑی نہایت ہی سفید جس پر کالے دھبے۔ اس قدر خوشنما قریب قریب گویا چتکبری اس پر اینجانب رحمہ اللہ تعالیٰ

والغفر ان نے بیٹھتے ہی ایڑ ماردی اور وہ ایسی بے تحاشہ دوڑی کہ اپن تو چار جامہ کے اوپر سر بسجود ہو گئے اور اس نے دریا کا رخ کر لیا۔ مگر اللہ رے پنجابی نوجوان بیس پچیس شہسوار ایک دم انہوں نے اپنی گھوڑیوں پر چڑھ کر میری گھوڑی کا سامنا روک لیا اور چار پانچ نے آگے سے اس کا لگام پکڑ کر اس کو کھڑا کیا اور وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی اور کئی نوجوانوں نے تو میرا سامنا روکنے کے لیے اپنی گھوڑیا دریا میں ڈال دیں۔ اللہ نے زندگی مقدر میں لکھی تھی ورنہ ہم نے تو اپنے ڈوبنے میں کچھ کسر نہیں چھوڑی تھی۔

یہ معلوم ہوا کہ وہ گھوڑی بہت اصیل تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ کبھی اس کے ایڑ نہیں ماری گئی تھی۔ مگر ان نوجوانوں کا بھی منظر ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے بڑے ہی ماہر تھے انہوں نے میری گھوڑی کے ساتھ اپنے گھوڑے نہیں دوڑائے۔ کہ اس سے وہ گھوڑی اور نہ بھڑکے بلکہ دائیں بائیں جانب بہت تیزی سے بھگا کر اور ایک دم اپنے گھوڑوں کی باگیں میری گھوڑی سے بہت آگے کی طرف پھیر کر کچھ تو دریا کے کنارے پر اور کچھ دریا کے ابتدائی حصہ میں پہنچ گئے۔ اس گھوڑی نے ان کی گھوڑیوں پر پھلاندنا بھی چاہا ایسی بے قابو ہوئی کہ اللہ کو زندگی رکھنی ہی تھی اس ناکارہ نے اپنے مرنے کی کوشش میں تو کچھ کسر چھوڑی نہیں۔ مگر موت تو وقت ہی پر آتی ہے۔

سہارنپور کی ابتدائی آمد میں مدرسہ قدیم کے کتب خانہ کے دونوں جانب جو کمرے ہیں۔ ان کی کھڑکیوں کے باہر چھوٹے چھوٹے سائبان لگ رہے ہیں۔ ان کے لوہے کے سریوں پر لٹکنا اور مہمان خانہ کے سامنے شرقی جانب جو چھجہ ہے اس کے سریوں پر کھیلنا یعنی بازی گروں کی طرح پھرنا۔ سڑک پر ہر دیکھنے والا شور مچاتا۔ ارے مرنے کو جی چاہ رہا ہے کیا؟ مدرسہ قدیم کے کتب خانہ کے سامنے جو چھجہ ہے نماز کے اوقات میں اس پر دائی دُکا کھیلنا کہ میرے اور میرے ساتھیوں مظہر ومحفوظ کے لیے یہ قانون تھا کہ ہم تینوں اپنی جماعت اندر کریں۔ اختلاط کی وجہ سے مسجد کی جماعت کی ایک زمانہ تک اجازت نہیں تھی نیز گرمیوں کے دوپہر میں جب سب سو جائیں گھر یا رات کے وقت سیڑھیوں پر اترنے چڑھنے کا دستور نہیں تھا بلکہ مدرسہ قدیم کے دروازے کے برابر جو ایک تھم کھڑا ہوا ہے اور اس پر چھجہ رکھا ہوا ہے اسی پر کو اترنا اور اس پر کو چڑھنا۔ ایسے معمولات تھے کہ کسی وقت گرتا تو وہیں نمٹ جاتا۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ **لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ** کہاں منہ ماردیا۔

تیسری شرط بھی حضرت قدس سرہٗ نے پوری فرمادی کہ مدرسہ کے حرج کی وجہ سے میرے والد صاحب پہلے تشریف لائے اور مجھے یاد نہیں کہ حضرت قدس سرہٗ نے خود ارشاد فرمایا یا والد صاحب کی درخواست پر اجازت مرحمت فرمائی بہرحال یہ ناکارہ اور والد صاحب تشریف لے آئے اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی علالت کا زمانہ بہت ہی طویل گزرا تو تقریباً سات آٹھ سال علالت کا

سلسلہ رہا اور روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی ثم الدہلوی مستقل معالج تھے۔ بار بار تشریف لاتے اور کئی کئی دن قیام فرماتے مگر:

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ہر نوع کا علاج کیا گیا۔ مگر ہر علاج بجائے صحت کی طرف لانے کے علالت کی شدت کی طرف لے جاتا تھا اس زمانے میں والد صاحب کی بہت کثرت سے آمد و رفت تھی اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو اشتیاق اور تقاضا رہتا تھا۔ میرے والد صاحب نے اس زمانے میں کئی دفعہ فرمایا بیماری وغیرہ کچھ نہیں یوں سمجھ رکھا کہ میری موت کا وقت قریب ہے اور موت کے قریب مقبولین کو جو مرنے کا اشتیاق ہوتا ہے وہ ابھی ہے نہیں۔ میں جا کر اول تو اس پر مناظرہ کرتا ہوں کہ کیا آپ کو علمِ غیب ہے کہ میرا وقت موعود آ گیا اور اس کے بعد احادیث رحمت اور آیاتِ قرآنی بکثرت سناتا ہوں۔ مثنوی شریف کے وہ اشعار بھی سناتا ہوں جو رحمتِ چاہئیں کے متعلق ہیں اور زور سے اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ گھبرائیں نہیں جب وقتِ موعود آئے گا تو وہ ساری چیزیں پیدا ہو جائیں گی جن کا آپ کو اشتیاق ہے۔ اس سے طبیعت دو چار دن کو اُبھر جاتی ہے۔ اُٹھنے بیٹھنے لگتے ہیں۔ کچھ غذا شروع ہو جاتی ہے لیکن دو چار دن کے بعد وہ بات ختم ہو جاتی ہے اسی وجہ سے میرے بلانے کا بار بار تقاضہ رہتا ہے اور میرا بھی دل چاہتا ہے کہ دو چار ماہ مستقل قیام کروں مگر مدرسہ کے اسباق کی مجبوری کو زیادہ ٹھہرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شوال ۳۲ھ میں حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کے اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے طویل سفرِ حجاز کی وجہ سے حضرت سہارن پوری کے اسباق ترمذی، بخاری بھی والد صاحب کے ہی ذمہ ہو گئے تھے اور ان کے اپنے اسباق ابوداؤد، نسائی شریف وغیرہ تو تھے ہی۔ البتہ مسلم شریف اس سال پہلی مرتبہ مولانا عبداللطیف صاحب کے پاس ہوئی تھی۔

میرے والد صاحب کے سفر کی وجہ سے دورے کے اہم اسباق کا حرج ہوتا تھا۔ اس لیے بہت کثرت سے ایسا ہوتا تھا کہ جمعرات کی شام کو جا کر شنبہ کی علی الصباح واپسی ہوتی تھی۔ موٹریں بھی اس زمانے میں نہیں تھیں۔ شاہ زاہد حسین مرحوم بہتر سے بہتر گھوڑا انتخاب کر کے رکھتے اور اس کو دُگنی اُجرت دیتے۔ اس زمانے میں ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ روپے میں عموماً بہٹ سے سہارنپور تانگہ آیا کرتا تھا۔ لیکن شاہ صاحب مرحوم اپنی انتہائی کفایت شعاری اور حسنِ انتظام کے باوجود اس کو تین روپے دیا کرتے تھے اور وہ بہٹ سے سہارنپور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچا دیتا تو میرے والد صاحب اس کو مزید انعام دیا کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ اپنی بیماری کے اخیر زمانے میں پیلوں جو بہٹ اور مرزا پور کے درمیان ایک گاؤں ہے جس کو شاہ زاہد حسن صاحب نے خرید

لیا تھا۔ وہاں انگریز منیجروں کا قیام رہتا تھا اوران کی بنائی ہوئی متعدد کوٹھیاں نہایت ہوادار ان میں سے ایک کوٹھی میں حضرت کا قیام تھا آب وہوا کی عمدگی کی وجہ سے نیز لب سڑک ہونے کی وجہ سے ڈاکٹروں کی آمد میں سہولت تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کی بیماری کا زمانہ وہیں گزرا اور انتقال بھی وہیں پر ہوا اور وصال کے بعد نعش مبارک رائے پور لائی گئی تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کی طویل علالت میں اس سیہ کار کا پیلوں جانا کئی دفعہ ہوا۔

ایک زمانے میں آموں کی ابتدا تھی اور مجھے پکے آم کھانے کا شوق تو بہت ہی کم رہا لیکن کیریاں (کچے آم) کھانے کا بہت ہی شوق ہمیشہ رہا اور اس زمانے میں تو بہت ہی تھا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ میرا یہ باغ فروخت شدہ نہیں ہے۔ کچے آم کھانے کو جی چاہے یا چٹنی بنانے کو تو شوق سے استعمال کریں۔ میری ہی مِلک ہیں۔ پھر کیا تھا اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مولانا عبدالقادر سے فرمایا کہ نمک مرچ پسوا کران کو دے دینا۔ حضرت مولانا نوراللہ مرقدہٗ نے مٹی کی ایک بڑی رکابی میں نمک اور مٹی کی ایک رکابی میں لال مرچیں پسوا کر میرے حوالہ کردیں۔ جو مولانا ہی کی قیام گاہ پر چھوڑ دیں۔ دو دن میرا قیام رہا۔ خوب یاد ہے کہ نہ روٹی کھائی نہ چاول کھائے اور نہ کوئی اور چیز کھائی۔ حالانکہ بڑی نعمتیں دستر خوان پر تھیں۔ چاقو میرے ہاتھ میں رہتا اور دن بھر قلمی آموں کی کیریاں کھایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی مٹھائی یا پھل وغیرہ کچھ بھی نہ کھایا۔ حالانکہ حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب بہت ہی اصرار فرمایا کرتے تھے۔

پانچواں دور حکیم الامت حضرت تھانوی:

اعلیٰ حضرت حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا زمانہ بہت پایا اور حضرت کی شفقتیں بھی بے پایاں چونکہ حضرت سہارنپوری کے زمانہ میں حضرت اقدس تھانوی کی سہارنپور میں تشریف آوری بکثرت ہوتی تھی اور معمول یہ تھا کہ جب بھی سہارنپور کی طرف کو پورب لائن یا پنجاب لائن جانا ہوتا وہاں سے واپسی ہوتی تو شباب کے زمانہ میں مدرسہ تشریف لائے بغیر روانگی نہیں ہوتی تھی۔ بہت ہی شاذ و نادر ایسا ہوتا تھا کہ وقت کی قلت کی وجہ سے مدرسہ تشریف لانا نہ ہوا اور اگر کبھی ایسا ہوتا تو ہم خدام اسٹیشن پر ضرور حاضر ہوا کرتے۔ ایک دفعہ یہ ناکارہ اسٹیشن پر حاضر ہوا۔ بڑا مجمع موجود تھا۔ جب میں نے مصافحہ کیا تو مصافحہ کے ساتھ ہی حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اکابر کے یہاں تربیت کے بھی طرق عجیب اور مختلف ہوتے ہیں۔ اکتساب بھی ایک طریقہ ہے۔ وہ زمانہ بذل المجہود کی اس سیہ کار کی کتابت کا تھا۔ اسی زمانے میں اس ناکارہ کو تھانہ بھون حاضری کی کثرت سے نوبت آتی تھی۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں بذل المجہود مولانا شبیر علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پریس میں تھانہ بھون میں طبع ہوتی تھی۔ چونکہ بذل کا

مسودہ بھی یہی ناکارہ لکھتا تھا اور پندرہ بیس دن میں اولاً تھانہ بھون پھر اس کے بعد دہلی طباعت کے لیے بار بار جانے کی نوبت آتی تھی۔ لیکن یہ محض اللہ کا انعام احسان اور میرے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی توجہ و برکت کہ جس پریس میں بھی بذل کا کام ہوتا وہ اپنے سب کام چھوڑ کر بذل کا کام شروع کر دیا کرتا تھا۔

تھانہ بھون کے بعد دہلی میں دریبہ کلاں میں ایک ہندوستانی پریس تھا جو کہ بہت بڑا تھا اور اس میں بیک وقت آٹھ، دس مشینیں چلتی تھیں۔ اس کا مالک اور سارا عملہ غیر مسلم تھا۔ مگر اس مالک کے دل میں اللہ نے کچھ ایسی محبت ڈال دی تھی کہ میرے پہنچتے ہی وہ اپنے منیجر سے نہایت زور سے کہتا کہ اتنے ان مولانا صاحب کا کام نہ ہو کسی مشین پر کوئی نیا پتھر نہیں چڑھے گا۔ اس کے بھی بڑے ہی عجیب قصے ہیں اور بہت ہی مالک کے احسانات لاتعد و لا تحصٰی ہیں لیکن اس وقت یہ ناکارہ حضرت تھانوی کے حالات لکھوا رہا ہے۔ تھانہ بھون کی طباعت کا قصہ ۳۸ھ یا ۳۹ھ کا ہے۔ تھانہ بھون میں عموماً علی الصباح پہنچتا۔ اس زمانے میں چھوٹی لائن کی گاڑیاں دن رات میں کئی چلتی تھیں۔ گو وہ اب مرحوم ہو چکی ہے اور سالِ رواں میں یکم ستمبر ۷۰ھ سے سب بند کر دی گئی ہیں۔ اگر چہ لوگ کہتے ہیں کہ عارضی بند ہوئی ہیں اور موٹروں کی کثرت نے اس کو فیل کر دیا۔ سہارنپور تا دہلی میں کئی نوع کی موٹریں سرکاری وغیر سرکاری چل پڑیں اور اس سے زائد ٹیکسیوں کی بھر مار۔

بہر حال یہ ناکارہ علی الصباح تھانہ بھون پہنچتا اور مولانا شبیر علی صاحب مرحوم حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے میرے جاتے ہی سب کا پیاں جموا دیتے اور ظہر کے وقت تک مجھے چھ، سات پروف مل جاتے اور شام تک ان کی واپسی کا تقاضا ہوتا۔ تا کہ اگلے دن ان کی سنگسازی اور طباعت شروع ہو جائے۔ اس لیے یہ ناکارہ مسجد کے شمالی جانب سہ دری میں گرمی کا موسم تھا اور اس زمانے میں اس ناکارہ کو پسینہ اتنا کثیر آیا کرتا تھا کہ ہر سفر میں ایک پائجامہ بالکل گل جایا کرتا تھا۔ یہاں تو میں پائجامہ پہنتا ہی نہ تھا۔ دو لنگیاں میرے استعمال میں رہتی تھیں۔ جب دو تین گھنٹے میں وہ بالکل بھیگ جاتی تو وہ لے لیتا۔ شب و روز میں سات مرتبہ ٹھنڈے پانی سے غسل کا دستور تھا اور یہاں پائجامہ پہن کر سو نہیں سکتا تھا۔ چونکہ میں اپنے کمرے میں اکیلا ہوا کرتا تھا۔ اس لیے چاروں طرف سے کواڑ لگا کر سو جاتا۔ مگر سفر میں محض لنگی باندھے سونے پر قادر نہیں تھا۔ کیونکہ میرے اندر ایک مرض بچپن سے اب تک یہ ہے کہ جب لنگی باندھ کر سوتا ہوں تو صبح کو کروٹوں میں نہ معلوم کس طرح لنگی پیٹ پر آ جاتی ہے اور ٹانگیں کھل جاتی ہیں۔ اس لیے سفر میں ہمیشہ سوتے وقت پاجامہ پہننے پر مجبور رہا۔ لیکن دن میں ہمیشہ لنگی ہی ہوا کرتی تھی۔ تھانہ بھون کی حاضری میں گرمی کی شدت کی وجہ سے میں شمالی سہ دری میں کرتا نکال کر اور پروفوں کو بہت غور سے نہایت جھک کر عصر کے وقت تک

دیکھتا رہتا تھا اور یہی ظہر سے لے کر عصر تک کا وقت حضرت اقدس حکیم الامت کی عام مجلس کا تھا۔ مجھے اس کا بہت قلق رہتا تھا کہ تھانہ بھون رہتے ہوئے بھی حضرت کی خدمت میں حاضری کا وقت نہیں ملتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ بہت قلق کے ساتھ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ لوگ تو بہت دور دور سے حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ناکارہ یہاں رہ کر بھی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ میرے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے ایسا جواب مرحمت فرمایا کہ میری مسرت کے لیے مرنے تک کافی ہے۔ حضرت نے فرمایا مولوی صاحب اس کا آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ آپ اگرچہ میری مجلس میں نہیں ہوتے مگر میں ظہر سے عصر تک آپ ہی کی مجلس میں رہتا ہوں میں بار بار آپ کو دیکھتا رہتا ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ کام تو یوں ہوتا ہے۔ میں آپ کو ظہر سے عصر تک اپنے اوراق سے سر اُٹھاتے نہیں دیکھتا۔

ایک دفعہ اس سیہ کار نے حضرت سے دریافت کیا کہ شرح صدر کے خلاف کرنے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اہلِ نسبت کو شرح صدر کے خلاف نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے کبھی جسمانی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک بزرگ تھے۔ ان کا خیال ہوا کہ فلاں عالم صاحب کی عیادت کرنی چاہیے۔ وہ عالم ہیں، چناں ہیں چنیں ہیں۔ مگر طبیعت نے شدت سے اباء کیا۔ کئی دفعہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ اول تو عیادت سنت پھر عالم کی۔ اپنے شرح صدر کے خلاف زبردستی چل دیے۔ چند قدم چلے تھے کہ پاؤں پھسل گیا اور گر پڑے۔ پیر ٹوٹ گیا۔ لوگ اُٹھا کر گھر لے آئے۔ اس سیہ کار کا خیال یہ ہے کہ یہ اونچے لوگوں کی باتیں ہیں۔ جس کا شرح صدر:

"گفتۂ او گفتۂ اللہ بود"

کا مصداق ہو۔ لیکن اس سیہ کار کو باوجود نااہلیت کے اس کا تجربہ بہت ہے کہ جب بھی کوئی شرح صدر کے خلاف سفر کیا یا تو جانے سے پہلے ہی بیمار رہا یا دوران سفر وغیرہ ہوا اس کو بہت ہی بھگتنا پڑا، پھر سفر کے بعد کئی دن تک خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جب بھی کوئی قصہ پیش آیا تو حضرت تھانوی کا ارشاد یاد آیا۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس سیہ کار سے فرمایا اور میں تنہا ہی حاضر ہوا تھا کہ مولوی زکریا ایک اشکال بہت دن سے پیش آرہا ہے۔ کئی دفعہ اس کو سوچ چکا ہوں کہ دنیا بھر کے سارے پاگل ایک ایک ہو کر میرے ہی پاس کیوں آتے ہیں اور پھر ایک قصہ سنایا کہ ایک حکیم غالباً جالینوس نام لیا تھا مجھے اس وقت تردّد ہے شاید بقراط ہو وہ جا رہا تھا۔ راستہ میں کسی پاگل نے اس کو سلام کیا۔ اس حکیم کو بہت ہی فکر ہوا کہ اس پاگل نے مجھے سلام کیا۔ "اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ" ہیں مجھ میں تو جنون کا اثر نہیں۔ گھر جا کر غسل کیا اور دافع جنون دوا کھائی میں نے عرض

کیا کہ حضرت بالکل نہیں۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب دام مجدہم بھی ہر وقت یہی فرماتے ہیں کہ یہ سارے پاگل چن چن کر میرے ہی پاس کیوں آتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اچھا دوسرں کے پاس بھی جاتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت سب کو یہی شکایت ہے حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو بہت جزائے خیر عطا فرمائے تم نے میرا بوجھ بہت ہلکا کردیا ہے مجھے تو یہ خیال تھا کہ صرف میرے پاس ہی آتے ہیں۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو مجھ سے بچپن میں بہت محبت تھی اگرچہ اخیر زمانے میں لیگ اور کانگریس کے جھگڑے کی وجہ سے اس میں کمی آگئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کے ساتھ اس ناکارہ کے خصوصی تعلق کی بناء پر بار بار میرے شدید ترین کانگریسی ہونے کی شکایات پہنچتی رہتی تھیں اور حضرت حکیم الامت کو کانگریس سے ایسی نفرت تھی جیسی اس سیہ کارکو اسٹرائک سے۔ چنانچہ جب ''مجلس دعوۃ الحق'' حضرت نے قائم فرمائی اس کے ممبران میں کسی نے اس ناکارہ کا نام بھی پیش کیا تو حضرت نے بڑے تعجب سے یہ کہہ کر کہ ''وہ تو مولوی حسین احمد کا خاص آدمی ہے'' اس ناکارہ کا نام لکھنے سے انکار کردیا اور چند روز بعد ہمارے مدرسہ کے مفتی اور میرے رشتہ کے ماموں مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب مرحوم جو حضرت تھانوی کے مخصوص خدام میں سے تھے۔ جب وہاں حاضر ہوئے تو حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے بڑے استعجاب سے ان سے یہ کہا کہ میری مجلس میں فلاں صاحب نے مولوی زکریا کا نام بھی بتلایا ہے۔ تو مولوی اشفاق الرحمٰن نے کہا کہ حضرت وہ تو بغیر تلی کا ٹینڈر ہے ہر ایک کے ساتھ لڑھک جاتا ہے۔ حضرت والا کے ساتھ اس کا تعلق مولوی حسین احمد صاحب سے کم نہیں۔ مگر حضرت قدس سرہٗ نے سابقہ روایات کثیرہ کے مقابلہ میں اس کو اہمیت نہیں دی اور ان روایات کا محمل بھی صحیح تھا اس لیے کہ حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کی تو تقریباً روزانہ نہیں تو ہر دوسرے تیسرے روز آمدورفت ضرور رہتی تھی۔ اس لیے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا دستور یہ تھا کہ دہلی سے پنجاب یا رڑکی لائن پر جب بھی جانا ہوتا اگر دو گھنٹے کی بھی گنجائش ملتی تو حضرت میرے گھر ہوکر ضرور تشریف لے جایا کرتے اور اس کے علاوہ رئیس الاحرار کا جب بھی رائے پور آنا جانا ہوتا تو میرے پاس ضرور قیام کرتے۔ ایسے ہی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی جب رائے پور کی آمدورفت ہوتی یا مستقل ان کو لوگ سہارنپور بلاتے تو ہر صورت میں قیام کثیر وقلیل میرے گھر پر ہوتا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کا تو مشہور مقولہ تھا کہ ''کچا گھر'' (یعنی میر گھر جو اس زمانے میں بالکل کچا تھا اور اسی نام سے اب تک مشہور ہے) مشترک پلیٹ فارم ہے۔ ساری گاڑیاں اسی پلیٹ فارم سے گزرتی ہیں کبھی کہتے کہ ''یہ تو جنکشن ہے ساری گاڑیاں اسی اسٹیشن پر سے گزرتی ہیں۔ لیگ کی ہو یا احرار کی ہو، کانگریس کی ہو یا جمعیت کی''۔

شاہ صاحب مرحوم کی ابتدائی آمد کا بھی ایک عجیب لطیفہ ہے۔ سب سے پہلی آمد جوان کی اہم جلسہ میں ہوئی۔ (اور جس کی تاریخ میرے رجسٹر میں محفوظ ہوگی) سہارنپور کے لوگوں نے بہت اصرار تمنائیں، درخواستیں ان کو بلانے کی کیں اور جب انہوں نے سہارنپور پہنچنے کا وعدہ کرلیا تو چونکہ وہ رئیس البُغاۃ تھے۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں بہت مخدوش اب مسئلہ یہ مشکل ہوا کہ ان کا قیام کہاں ہو؟ اس لیے کہ ان کو ٹھہرانا ہر شخص کو مخدوش معلوم ہوتا تھا اور یہ ڈر تھا کہ ان کے ساتھ میں بھی گرفتار نہ ہو جاؤں۔ اس واسطے جتنے بلانے والے تھے وہ سب مل کر ایک وفد کی صورت حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ شاہ صاحب چناں اور چنیں ہیں ہمارے مکانات ان کی شان کے مناسب نہیں ہیں، مدرسہ ہی ان کی شان کے مناسب ہے۔ ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص ادا تھی۔ وہ نہایت بے تکلفی سے بلا جھجک یہ کہہ دیتے تھے کہ اتنے میں شیخ الحدیث سے بات نہ کروں اتنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لوگوں نے اصرار کیا کہ انہیں ابھی بلا لیجئے۔ ناظم صاحب نے فرمادیا کہ یہ وقت ان کی مشغولی کا ہے شام کو خبر لے لیں۔ ان لوگوں کے جاتے ہی حضرت ناظم صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ فلاں فلاں آئے تھے بہت اصرار اس پر کررہے ہیں کہ شاہ صاحب کا قیام مدرسہ میں رہے۔ میں نے عرض کردیا کہ آپ ان سے بے تکلف میری طرف سے کہہ دیجئے کہ مدرسہ میں ان کا قیام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مدرسہ کو ان کے قیام سے نقصان کا اندیشہ ہے البتہ کچے گھر میں ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ تو ہے ہی باغیوں کا ٹھکانا۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام تو ہر وقت کا تھا۔ رئیس الاحرار کی بھی کثرت سے آمد و رفت تھی۔ میری شاہ صاحب سے اس سے پہلے کوئی ملاقات نہ تھی۔ نام طرفین کا ایک دوسرے نے سُن رکھا تھا۔ میں نے اس دعوت دینے والے سے یہ بھی کہا کہ جب تمہارا حوصلہ ٹھہرانے کا نہیں تھا تو دعوت دینے کی کیا مصیبت پڑ رہی تھی؟ شاہ صاحب تشریف لائے اور ان کی آمد پر بڑا جلوس نکلا اور وہ جلوس ان کو مدرسہ تک لاکر جب مدرسہ میں پہنچا تو ناظم صاحب نے ان سے کہہ دیا شاہ صاحب کے سامنے ہی کہ شاہ صاحب کا قیام تو شیخ الحدیث صاحب کے مکان پر طے ہوا تھا۔ شاہ صاحب تو میرا نام پہلے ہی سنے ہوئے تھے اور جنہوں نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سُنی ہیں وہ خوب واقف ہیں کہ ان کو تعریف اور مذمت دونوں میں کمال کا درجہ حاصل تھا۔ انہوں نے اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے، اس زور وشور سے میرے گھر قیام پر مسرت کا اظہار فرمایا کہ کچھ انتہا نہیں۔ ہوشیار تھے، سمجھ دار تھے، دنیا دیکھے ہوئے تھے، جلوس تو ختم ہوگیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ میرے مکان پر تشریف لے آئے اور میرا مکان اس زمانے میں اسم بامسمّیٰ کچا گھر تھا۔ صرف ایک کوٹھری تھی وہ بھی کچی۔ شاہ صاحب مع سامان آکر بوریئے پر بیٹھ گئے۔ اوّل تو

انہوں نے میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔اس کے بعد میرے مکان کی تعریفیں شروع کیں کہ نانا ابا صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کی یاد تازہ ہوگئی۔حضرت کیا عرض کروں؟ کتنی مسرت اس مکان کو دیکھ کر ہوئی، اسلاف کا دور آنکھوں میں پھر گیا۔

چناں چنیں یہ وہ، پھر کہنے لگے حضرت یہ لوگ مجھے شوق میں بُلا تو لیتے ہیں مگر مجھے ٹھہراتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اسی واسطے میں کہیں جاتے ہوئے بہت انکار کرتا ہوں، لیکن جب وعدہ کر لیتا ہوں تو ان بلانے والوں کو نانی یاد آتی ہے کہ اس باغی کو کہاں ٹھہرائیں۔لیکن یہ میری خوش قسمتی، خوش بختی نہ معلوم کیا کیا کہا کہ جب میں دیوبند جاتا ہوں تو وہاں بھی وہاں کے شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مکان میری قیام گاہ تجویز ہوتی ہے اور یہاں، یہاں کے شیخ الحدیث کا مکان میری خوش قسمتی سے میری قیام گاہ تجویز ہوا۔قیام تو ان کا میرے یہاں برائے نام ہی ہوا، اس لیے کہ تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ کہیں کسی صاحب کے یہاں دعوت میں چلے گئے۔وہاں سے لوگ اپنے اپنے یہاں لیے پھرے، پھر جلسہ ہوگیا۔کچھ معمولی کھانے پینے کی تواضع میں نے بھی کی۔اس کے بعد کئی دفعہ رائے پور آتے جاتے قیام ہوا اور یہ سب روایات حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ تک پہنچتی رہتی تھی۔اس لیے میرا کانگریس یا جمعیتی ہونا حضرت قدس سرہٗ کے ذہن میں بہت ہی مستحکم تھا۔

کچھ دنوں بعد جناب الحاج شیخ رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھانہ بھون حاضر ہوئے جو حضرت حکیم الامت کے یہاں بہت معتمد اور اُونچے سمجھے جاتے تھے، دہلی کے مسلم لیگ کے صدر تھے۔مسٹر جناح کے خاص دوست اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی مجلس دعوۃ الحق کے رکن رکین تھے۔حضرت قدس سرہٗ بہت ہی استعجاب سے شیخ جی سے یہ کہا کہ فلاں شخص نے مجلس میں مولوی زکریا کا نام بھی پیش کیا۔مجھے بہت تعجب ہوا، وہ تو مولوی حسین احمد کا خاص آدمی ہے۔تو شیخ جی نے بھی بہت زور سے نام پیش کرنے والے کی تائید کی اور عرض کیا کہ حضرت میں تو ان کا نام خود ہی پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ان کو مولانا حسین احمد صاحب سے جتنا بھی تعلق ہو لیکن جناب والا سے بھی عقیدت کم نہیں ہے اور جتنا کسی کانگریسی یا جمعیتی سے تعلق ہو اس سے زیادہ مجھ سے ہے، میں اس سے خوب واقف ہوں۔مگر چونکہ حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کے پاس روزانہ حضرت مدنی کی آمد اور میری حضرت مدنی قدس سرہٗ کے ساتھ قرب وجوار کے اسفار میں معیت خوب پہنچتی رہتی تھی اور پہنچانے والے بھی حواشی سے پہنچاتے تھے۔

چنانچہ ایک صاحب اللہ انہیں معاف کرے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی مجلس میں اس سیہ کار پر یہ افتراء کیا کہ وہ تو یوں کہتا ہے کہ تھانہ بھون جا کر کیا کرو گے دیوبند حضرت مدنی کی خدمت میں جاؤ۔جن صاحب نے مجھ سے یہ نقل کیا وہ حضرت کی مجلس میں اس وقت موجود تھے اور حضرت کے

خاص لوگوں میں سے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے بہت ہی اس روایت پر رنج وقلق ہوا اور اس پر تعجب بھی ہوا کہ اکابر کے حاشیہ نشین اس قدر دروغ گو بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے تمہارا حضرت تھانوی کے ساتھ تعلق عرصہ سے معلوم ہے میں نے تردید کرنے کا ارادہ بھی کیا مگر جرأت نہ ہوئی۔ غرض اسی قسم کے واقعات حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کو پہنچتے رہتے تھے، جن کی بناء پر اس سیہ کار کو حضرت مدنی کے خاص لوگوں میں سمجھنا بے محل نہیں تھا اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے ساتھ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا اس زمانے میں مسلک کا شدید اختلاف تھا۔ اس سلسلے میں کئی رسالے اس زمانے میں شائع ہوتے تھے جس میں سے ایک رسالہ البوادر النوادر شائع بھی ہو چکا ہے۔

اس لیے جس شخص کا بھی حضرت مدنی قدس سرہٗ سے خصوصی تعلق معلوم ہوتا تھا وہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے یہاں پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر ان حضرات اکابر کا آپس کا اختلاف ہم جیسے نااہلوں کا اختلاف نہیں تھا بلکہ اس نوع کا اختلاف تھا جس کی نظیر جنگ، جمل، جنگِ صفین میں گزر چکی ہے اور اس کے متعلق میں مفصل کلام اپنے رسالہ اعتدال میں کر چکا ہوں۔

چنانچہ یکم محرم ۱۳۵۱ھ میں سول نافرمانی اور قانون شکنی کے جرم میں مظفر نگر کے اسٹیشن پر سے حضرت مدنی کو گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو اس کی اطلاع ملی تو ظہر سے عصر تک کی مجلس میں حضرت مدنی کی گرفتاری پر نہایت ہی رنج وغم اور قلق کا اظہار فرماتے رہے اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس کا احساس نہیں تھا کہ مجھے مولانا حسین احمد صاحب سے اتنا تعلق ہے اور جب کسی شخص نے حاضرین مجلس میں سے یہ عرض کیا کہ حضرت گورنمنٹ نے کوئی ظلم تو نہیں کیا، اس نے تو صرف دہلی کے داخلے پر بندش لگائی تھی، وہ تو خود ہی قانون شکنی کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ تو حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ آپ اس فقرے سے مجھے تسلی دینا چاہتے ہیں۔ حضرت سید حسین رضی اللہ عنہ بھی تو یزید کے مقابلے کے لیے خود ہی تشریف لے گئے تھے۔ یزید نے ان کو جبراً تو قتل نہیں کیا تھا۔ لیکن حضرت سید حسین رضی اللہ عنہ کا غم تو ساری دنیا آج تک نہیں بھولی۔

میں بھی کہاں سے کہاں چلا گیا۔ لکھ تو یہ رہا تھا کہ ابتداء حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو اس سیہ کار سے بہت ہی تعلق اور محبت وشفقت تھی۔ میری ابتداء سہارنپور کی حاضری میں حضرت قدس سرہٗ نے میرا ایک امتحان بھی لیا تھا۔ اس شعر کا مطلب پوچھا تھا:

اگر بر جفا پیشہ بشتافتے
کھا زدست قہرش اماں یافتے

میں نے فوراً مطلب بتا دیا تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے یہ فرمایا کہ آپ نے سمجھا ہوگا، کسی جاہل کا پڑھایا ہوا ہے۔ حضرت نے فرمایا کیوں نہیں ماشاء اللہ آپ کے عالم ہونے میں

کیا شک ہے۔ میرے والد صاحب کا برتاؤ حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہما کے ساتھ تو بہت ادب کا تھا۔ حضرت سہارنپوری کی طرف تو حضرت قطب عالم حضرت گنگوہی کے وصال کے بعد رجوع ہی کر لیا تھا اور اجازت وخلافت بھی ان ہی سے ملی تھی۔ لیکن اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ سے محبت اکابر ثلثہ سے زیادہ تھی اور ابتداءً بے تکلفی بھی بہت تھی، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد حضرت قطب عالم گنگوہی کی طرف سے ایک صاحب کشف قبور نے یہ پیام دیا تھا کہ مولوی یحییٰ سے کہہ دینا کہ مولانا رائے پوری کے ساتھ ایسی بے تکلفی نہ کیا کریں اس وقت سے کچھ احترام شروع ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ اخیر تک رہا اور بہت زیادہ۔ جو ہم جیسے بچوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا اور وہ فقرے نقل بھی کرانے، مشکل ہیں۔ اسی کا اثر تھا کہ حضرت حکیم الامت کو ابتداءً اس سیہ کار کے ساتھ بہت ہی محبت اور تعلق تھا۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حضرت حکیم الامت کے ساتھ بے تکلفی کے واقعات تو بہت کثرت سے ہیں، دو لکھواتا ہوں۔

ایک مرتبہ میرے والد صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ افطار کا وقت ہوا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ آپ کے یہاں افطار کا کیا دستور ہے؟ حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ گھنٹے اور جنتریوں کے بعد تین چار منٹ میں شرح صدر اور اطمینان کے لیے انتظار کیا کرتا ہوں۔ میرے والد صاحب نے گھڑی دیکھی اور آسمان کی طرف اِدھر اُدھر دیکھا اور افطار شروع کر دیا اور ان کے ساتھ ان کے خدام نے بھی شروع کر دیا اور حضرت اقدس تھانوی اور ان کے خدام انتظار میں رہے۔ ایک دو منٹ کے بعد حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اتنے میرا شرح صدر ہوگا اتنے یہاں تو کچھ رہنے کا نہیں۔

تراویح کے بعد حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے میرے والد صاحب سے پوچھا کہ مولانا سحر کا کیا معمول ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ ایسے وقت ختم کرتا ہوں کہ دن بھر یہ خیال رہے کہ روزہ ہوا کہ نہیں (یہ تو مبالغہ تھا ورنہ دو تین منٹ صبح صادق سے پہلے ختم کرنے کا معمول تھا) حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ میرا صبح صادق سے ایک گھنٹہ قبل فارغ ہونے کا ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ آپ اپنے وقت پر کھالیں، میں اپنے وقت پر۔ ڈیڑھ دن کا روزہ میرے بس کا نہیں۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا یہ تو نہیں ہوگا، کھائیں تو ساتھ۔ ایسا کریں کہ ایک دن کے لیے آپ کچھ مشقت اُٹھالیں اور ایک دن کے لیے میں آپ کی خاطر مشقت اٹھالوں گا۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ پون گھنٹے پہلے شروع کر دیا جائے تاکہ ۱۵، ۲۰ منٹ کھانے میں لگیں گے اور تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے فراغت ہو جائے۔ والد صاحب کی اس بے تکلفی کا ایک اور واقعہ لکھواتا ہوں۔ کہ جب اعلیٰ

حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہما ۳۳ھ میں طویل سفر حجاز کے لیے تشریف لے گئے تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدۂ نے اپنی بے تکلفی کے سلسلہ میں جونہایت ہی زیادہ تھی اور اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ اب تک تو آپ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی وجہ سے رڑکی یا پنجاب جاتے ہوئے بہت اہتمام سے مدرسہ تشریف لاتے تھے، لیکن اب حضرت تو طویل قیام کے ارادے حجاز تشریف لے گئے اور میری بہ نسبت آپ کو سفر آسان ہے۔ اس لیے اب آپ کو ہر ماہ میری زیارت کے لیے ایک سفر کرنا ہوگا اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اپنے اس تعلق اور بے تکلفی کی بناء پر تحریر فرمایا کہ بڑی خوشی سے لیکن چند شرائط ہیں۔

جب میں کہیں آگے جارہا ہوں گا تب تو میرا کرایہ اس کے ذمہ ہوگا جہاں میں جارہا ہوں گا۔ لیکن جس ماہ آگے نہیں جانا ہوگا اور صرف آپ سے ملاقات کے لیے سہارنپور آؤں گا تو میرا کرایہ اور میرے ایک رفیق کا آمد و رفت کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ آپ کو دینا ہوگا اور جب میں واپس آؤں گا تو ایک مٹی کی ہانڈی میں ماش کی دال ناشتہ میں دینی ہوگی اور وہ ہانڈی واپس نہیں ہوگی۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو ماش کی دال کا بہت شوق تھا اور خاص طور سے میری والدہ مرحومہ کے ہاتھ کی دال بہت پسند تھی۔ یہاں میں نے اکثر دیکھا کہ حضرت اقدس کی تشریف آوری پر دسترخوان پر بہت ہی لذیذ چیزیں جمع ہوتی تھیں۔ فرینی بھی، شاہی ٹکڑے بھی، مگر حضرت اقدس اُڑد کی دال کی رکابی لے کر اس کو فرینی کی طرح چمچے سے نوش فرماتے۔ بعض مرتبہ تو میں نے دیکھا کہ روٹی کے صرف ایک دو لقمے کھا کر نہ پلاؤ کھایا نہ فرینی کھائی، اُڑد کی دال کی دو تین رکابیاں فرینی کی طرح کھالیں۔ یوں ارشاد فرمایا کرتے کہ اپنے گھر میں جب دو تین دن ماش کی دال نہیں پکتی تو میں مطالبہ کرتا کہ اللہ کی ہر نعمت پکتی رہتی ہے اُڑد کی دال نہیں پکتی۔

میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے دور میں تو اس معاہدے پر دو تین دفعہ عمل ہوا، لیکن اس گستاخ بے ادب نے والد صاحب نور اللہ مرقدۂ کے وصال کے بعد اعلیٰ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کو اپنی حماقت سے لکھا تھا کہ حضرت والد صاحب کے اس وعدہ میں میراث جاری ہوگی یا نہیں؟ اعلیٰ حضرت نے تحریر فرمایا کہ ضرور ہوگی۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا یہ والا نامہ میرے اکابر کے خطوط میں موجود ہے۔ مگر اس وقت سامنے نہیں ہے۔ اس پر عمل کی نوبت میرے ساتھ نہیں آئی، البتہ ایک اہتمام اس سیہ کار کی طرف سے چند سال تک رہا کہ ماش کی دال جب تک میری والدہ حیات رہیں میں تشریف بری پر پیش کردیتا اور ایک اہتمام حضرت قدس سرہٗ کی طرف کئی سال تک مسلسل رہا کہ یہاں کی تشریف آوری پر اگر کوئی شخص حضرت کی دعوت کرتا تو جس کے واسطے اس کو

پہلے سے خط لکھنا پڑتا کہ معلوم ہوا کہ حضور کی تشریف آوری فلاں وقت ہو رہی ہے اگر حضور والا مکان پر قدم رنجہ فرما دیں تو زہے عزت ورنہ میں کھانا مدرسہ ہی میں پہنچا دوں گا۔ حضرت قدس سرہٗ کا جواب یہ ہوتا کہ میں مستقل مہمان مولوی زکریا کا ہوں تم ان سے اجازت لے لو اور جو مجھ سے اجازت لیتا تو میں اُسی بُری عادت کے موافق جو مہمان کے متعلق شروع میں لکھ چکا اجازت تو ضرور دے دیتا، اگرچہ میرا دل بالکل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس خوف سے کہ مبادا حضرت کو تشریف بری میں دِقت ہو یہ شرط کر لیتا کہ کھانا مدرسہ قدیم میں آئے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کا نام میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے بعد برفی رکھ دیا تھا۔ جب میں حاضر ہوتا نہایت تبسم کے ساتھ برفی کا لفظ دو دفعہ فرما کر وعلیکم السلام فرمایا کرتے۔

اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب میں کاندھلہ جاتا تھا تو تھانہ بھون کے اسٹیشن پر گزر ہوتا اور اسٹیشن پر سے کوئی شخص حضرت قدس سرہٗ کی زیارت کے لیے جانے والا ہوتا تو میں ریل پر سے خرید کر اس کے ساتھ تین چار سیر برف بھیج دیا کرتا۔ لے جانے والا اپنے کسی کپڑے میں لپیٹ لیتا۔ وہاں پہنچ کر پیش کرتا۔ اپنا کپڑا دھوپ میں ڈال دیتا وہ سوکھ جاتا۔ ایک مرتبہ ایک مخلص حاجی محمد جان صاحب محلّہ نئی بانس کی مسجد کے امام تھانہ بھون کے اسٹیشن پر اُترے میں نے اپنی حماقت سے حسبِ عادت ان کو برف دے دی اور یہ دریافت نہ کیا کہ آپ کے پاس کوئی کپڑا ہے یا نہیں۔ ان کے پاس اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ کوئی کپڑا تو تھا نہیں کسی کاغذ یا پتے پر رکھ کر کھلا ہوا لے گئے۔ ان بیچاروں کا ہاتھ بھی ٹھٹھر گیا ہوگا۔ ایسی حالت میں جب خانقاہ پہنچے اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت قدس سرہٗ نے دریافت فرمایا کہ اسی طرح اسٹیشن کے لا رہے ہو۔ انہوں نے عرض کر دیا، کپڑا کوئی تھا نہیں۔ حضرت کو جلال آ گیا کہ جب تمہارے پاس کپڑا کوئی تھا نہیں تو اس سے عذر کیوں نہ کر دیا۔ یہ اسٹیشن سے یہاں تک آتے ہوئے جتنا گھلا ہے وہ کس کا گیا۔ ان بے چاروں کے عتاب کا خیال آ جاتا ہے تو مجھے رنج ہوتا ہے کہ میری وجہ سے ان پر ڈانٹ پڑی اور میرا نام کئی سال تک برفی رہا۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مدرسہ کے ایک ملازم کے متعلق جو حضرت ناظم صاحب کے عزیز بھی تھے۔ مجھے راز میں ایک خط لکھا اور یہ قصہ ان کے عزیز کا تھا، اس لیے یہ بھی لکھ دیا کہ مولوی عبداللطیف صاحب کو اس خط کی خبر نہ ہو تو زیادہ اچھا ہے مبادا کہ ان کو تکلیف ہو بشرطیکہ یہ تغیر آپ اپنی رائے سے کر سکتے ہوں۔ میں اس زمانہ میں نظامت اور مدرسہ پر جتنا حاوی تھا وہ تو اس زمانہ کے سب ہی آدمیوں کو معلوم ہے۔ میں اپنی تجویز سے تغیر بالکل بے تردّد کر سکتا تھا اور اس پر ناظم صاحب کو کوئی گرانی بھی نہ ہوتی۔ مگر میں نے ناظم صاحب سے عرض کیا کہ آپ سے راز

میں ایک خط ہے میرے پاس جو آپ کو دکھانا ہے اور عمل مجھے کرنا ہے۔ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا ضرور یہ تغیر کر دو اس کو میرا بھی دل چاہتا تھا۔ مگر تم سے مشورہ کا سوچ رہا تھا موقعہ نہیں ہوا تھا۔ اب تو مؤکد ہو گیا۔ میں نے ایک حکم نامہ لکھ دیا کہ فلاں صاحب کو فلاں جگہ سے فلاں جگہ منتقل کر دیا جائے۔ حضرت ناظم صاحب نے اس پر دستخط فرما کر لکھ دیا کہ ضرور کر دیا جائے۔ حضرات سرپرستان سے منظوری لے لی جائے گی۔ صاحبِ قصہ بیچارے ہمیشہ ہی مجھ سے ناراض رہے اور ان کی ناراضی بجا ہے کہ وہ تفصیل سے ناواقف اور میرے پاس وہ راز ہے میں کیسے ظاہر کرتا۔

یہ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ ان اکابر اربعہ کے درمیان میں حضرت سہارنپوری حضرت شیخ الہند اور اعلیٰ حضرت رائے پوری اور حضرت حکیم الامت تھانوی اعلی اللہ مراتبہم ونور اللہ مراقدہم کے یہاں جب ایک دوسرے کو یہاں کوئی مہمان ہوتا تو گویا عید آتی۔ ایک مرتبہ حضرت سہارنپوری قدس سرہ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ یہ سیہ کار بھی ہمراہ تھا۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تھانہ بھون کے ایک معروف ومشہور معمر بزرگ کو ان کی علوشان کی وجہ سے بلا لیا اور کھانے میں اتنی انواع تھیں کہ **لا تعد ولا تحصی**۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے ان صاحب نے اس دعوت پر بڑی سخت تنقید اپنی مجالس میں کی کہ یہ علماء سادگی اور زہد پر تقریریں تو ایسی لمبی لمبی کریں۔ میں نے رکابیاں گنیں صرف چار آدمی تھے اور اتنی رکابیاں تھیں۔ مجھے صحیح تعداد یاد نہیں۔ باسٹھ یاد پڑتا ہے۔ آٹھ دس طرح کی تو چٹنیاں اور اچار تھے۔ کئی طرح کے مربے۔ کئی طرح کے سالن۔ چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو ان کی تنقید اور عیب جوئی پر قلق بھی ہوا۔ اپنی مجالس میں اس پر رنج فرمایا کہ میں نے تو ان کا اعزاز کیا اور وہ رکابیاں گننے ہی میں رہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا جو مجھے اب تک بھی خوب محفوظ ہے کہ حضرت یہ تکلف میں نے نہیں کیا آپ نے کرایا۔ اگر حضرت کی تشریف آوری جلدی جلدی ہو تو پھر اتنا تکلف کیوں ہو۔ یہ سارا واقعہ حضرت کے کسی ملفوظ میں طبع بھی ہو چکا ہے۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا معمول ہم مخصوص خدام کے ساتھ یہ تھا کہ اگر ہم دو تین ہوتے تو زنانہ مکان میں کھانا ہوتا۔ ایک مرتبہ یہ ناکارہ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مہمان تھے اور چھوٹے گھر میں مغرب کے بعد کھانے کے لیے حاضر ہوئے۔ حضرت قدس سرہٗ خود ہی اندر سے کھانا لا رہے تھے اور مجھے بہت ہی شرم آ رہی تھی۔ یہاں تک لکھوانے کے بعد یاد آیا کہ یہ قصہ تالیف میں نمبر۱۳ رسالہ تحفۃ الاخوان کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

ایک دفعہ یہ ناکارہ اور حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ حاضر خدمت ہوئے حضرت قدس سرہٗ

نے کھانے سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے ٹھنڈا پانی پیا اور کھانے کے وقت ارشاد فرمایا کہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کو دل چاہ رہا تھا اسی لیے قصداً بغیر پیاس کے ٹھنڈا پانی پیا تھا کہ شاید بھوک لگ جائے مگر اس سے بھی نہ لگی۔ اس لیے ساتھ کھانے سے تو معذور ہوں۔ اسی وقت پہلی دفعہ یہ بات معلوم ہوئی کہ ٹھنڈے پانی کو بھوک لگنے میں خاص دخل ہے۔ میرے استفسار پر حضرت نے اس کی تصدیق بھی فرمائی کہ ٹھنڈے پانی کو بھوک لگنے میں خاص دخل ہے۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ نے اس ناکارہ سے ازراہِ شفقت یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ تم میرے یہاں کے قوانین سے مستثنیٰ ہو۔ اس کے باوجود یہ ناکارہ خانقاہ کے قوانین کا حتی الوسع بہت اہتمام کرتا تھا۔ اس لیے حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور حضرت میرٹھی کے یہاں جب بھی بلا اطلاع کھانے کے وقت میں جانے کی نوبت آتی بلا بھوک ایک دو لقمے ضرور کھا کر جاتا اور حضرت کے استفسار پر کہ آپ نے صبح ہی کھالیا تھا میرا یہ جواب ہوتا کہ رات کو کھانے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اس لیے صبح کو کھالیا تھا۔

بذل کی طباعت کے زمانے میں اکثر ایک دو شب قیام کی نوبت آتی حضرت قدس سرہٗ نے کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ کھانا گھر سے آجایا کرے گا۔ مگر میں نے بہت ہی ادب اور اصرار سے اس کی اجازت لے لی تھی کہ حضرت میں خانقاہ کے مہمانوں کی طرح سے اپنے کھانے کا انتظام طباخ کے یہاں کرلوں تو مجھے اس میں راحت رہے گی۔ تو حضرت نے قبول فرمالیا تھا۔ ایک لڑکا تھا۔ اس کے گھر والے خانقاہ کے مقیمین اور واردین کا کھانا بڑے ہی شوق اور محبت سے پکایا کرتے تھے وہ دو تا تین آنے فی خوراک لیا کرتا تھا۔ پانچ چپاتیاں اور ایک سالن دال یا بھجی یا لوکی۔ تھانہ بھون میں گوشت بہت کم ہوتا۔ ہفتے میں دو تین دن ہوتا تھا، لیکن اس ناکارہ کا وہ دور تھا کہ جس میں بغیر گوشت کے روٹی نہیں کھا سکتا تھا میں نے اس سے یہ طے کرلیا کہ دو خوراک مستقل میری جب تک میں وہاں رہوں۔ اس میں خانقاہ کا وہی کھانا جو دو آدمیوں کا وہاں کے معمول کے مطابق ہوتا وہ ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے آدھ سیر گوشت فی وقت اپنا علیٰحدہ پکوانا تجویز کرلیا تھا۔ جس میں سارے سامان کے دام میرے اور پکوائی کی اجرت ۴ آنے فی وقت علیٰحدہ۔ میں نے مولوی شبیر علی مرحوم سے کہا کہ یہاں کا قانون تو یہ ہے کہ دو آدمی مل کر کھانا نہ کھائیں اور میری عادت یہ ہے کہ میں نے کبھی اکیلا کھایا ہی نہیں۔ انہوں نے فرمایا اللہ ان کی مغفرت فرمائے بلند درجات عطا فرمائے۔ ان سے اس زمانے میں بے تکلفی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ ان کا بھی لڑکپن تھا اور اس ناکارہ کا بھی ہنسی مذاق بھی بہت ہوتا تھا۔ انہیں اشعار بھی بہت یاد تھے۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے دولت خانہ پر تشریف لے جانے کے بعد ہمارے یہاں شعر و شاعری بھی ہو جاتی اور اگر اتفاق سے عالی جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب کی تشریف آوری ہوتی پھر تو پوچھنا ہی کیا۔ مولوی

شبیر علی صاحب نے فرمایا کہ تو فکر نہ کر بڑے ابا کے گھر تشریف لے جانے کے بعد دونوں وقت میں اور بھائی ظفر تیرے ساتھ کھایا کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا۔

مولانا شبیر صاحب مرحوم اور مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان نے بھی بار بار اصرار فرمایا کہ تیرے انتظام سے ہمیں گرانی ہوتی ہے مگر میں نے کہہ دیا کہ اگر ایک دو دن کی مہمانی ہوتی تو میں کبھی بھی خود انتظام نہ کرتا، لیکن یہ تو مستقل روزمرہ کی آمد ہے اس میں دوسرے کے سر پڑنا مجھے بہت گراں ہے اور اس میں کچھ تھانہ بھون کی خصوصیت نہیں۔ میری شروع ہی سے اب تک یہ عادت ہے کہ دو چار دن کی مہمانی میں تو کچھ اشکال نہیں ہوتا لیکن مستقل کسی دوسرے کے ذمے پڑ جانا میری غیرت نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ اگر کہیں میں قیمتاً انتظام کرنے پر قادر نہ ہوا تو میں نے ہدیہ یا کسی دوسرے عنوان سے اس میں رقم سے چوگنا ضرور دیا۔ جو مجھ پر خرچ ہوئی ہے اللہ تعالیٰ ہی کھانا پکانے والے مخلص دوست کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔

تھانہ بھون میں روزانہ گوشت نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جلال آباد میں روزانہ ہوتا تھا اس لیے وہ میرے لیے ہمیشہ جلال آباد سے گوشت منگوا کر پکواتا اور اگر کسی دن وہاں سے بھی نہ ملتا تو مرغا کٹواتا۔ اللہ جل شانہٗ اسے بہترین اگر زندہ ہو تو دارین کی ترقیات سے نوازے اور چل دیا ہو تو مغفرت فرما کر بلند درجات عطاء فرمائے۔ اس قدر میرے کھانے کا اہتمام کرتا کہ میرا جی خوش ہوتا۔ میں کبھی کبھی اس کو انعام بھی دیتا۔ وہ بھی میری آمد کا بہت ہی مشتاق رہتا۔ بہرحال جب حضرت قدس سرہٗ دونوں وقت مکان تشریف لے جاتے تو میں اور مولانا شبیر علی مرحوم اور مولانا ظفر احمد تینوں اپنا اپنا کھانا لے کر اکٹھے کھاتے اور میرا بچا ہوا کھانا میرا طباخ لے جاتا۔ لیکن میرا سالن کم بچتا تھا اس لیے کہ گوشت علی الدوام میرے ہی کھانے میں ہوتا تھا اور شوربا بھی اس میں مطبخ جیسا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ گاڑھا ہوتا تھا۔ ایک دو مرتبہ ایسا بھی دوپہر کے کھانے میں ہوا کہ ہم لوگوں کو کھانا شروع کرنے میں دیر ہوئی اور حضرت قدس سرہٗ اپنے مکان سے تشریف لے آئے اور ہم کو مجتمع کھاتے ہوئے دیکھا مگر کچھ فرمایا نہیں، نیچی نگاہ کر کے گزر گئے۔

والد صاحب کا بہشتی زیور کو طبع کرانا:

ایک چیز کا تعلق میری ذات سے تو نہیں ہے لیکن میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ضرور ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی تالیفات مفید عام اور مخلوق کے لیے دینی ترقیات کا جتنا ذریعہ ہیں وہ تو ظاہر ہے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں اور ان میں بہشتی زیور کو جو مقبولیت عامہ حاصل ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن بندہ کا خیال یہ ہے کہ اس میں میرے والد صاحب قدس

سرہٗ کے عمل کو بہت دخل ہے۔ حوادث میں لکھوا چکا ہوں کہ والد صاحب کے انتقال کے وقت ۸ ہزار روپے ان پر قرض تھا۔ اس میں ان کی تجارت کو بہت زیادہ دخل تھا۔ خاص طور سے بہشتی زیور کی طباعت ان کے زمانے میں دس بارہ ہزار سالانہ کی ہوتی تھی۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں بہشتی زیور کا کوئی حصہ بلالی پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ میں زیرِ طبع نہ ہو۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے قرضے میں پریس کے بھی چار پانچ ہزار باقی تھے۔ ان کے زمانہ میں ساڑھے تین آنہ فی حصہ عام اس کی قیمت رہی اور ۲/۱، ۷ (ساڑھے سات) پیسے فی حصہ اس کی پڑت تھی اور تاجروں کو ہمیشہ نصف قیمت پر یعنی ۷ پیسے پر دیا جاتا اور عوام کو بھی اکثر بالخصوص مدرسہ مظاہر علوم کے سالانہ جلسے اور دارالعلوم دیوبند کے ۳۸ھ کے دستار بندی کے جلسے پر سب کتابیں جلسے کے ایک دن کے لیے اور دارالعلوم کے تین دن کے لیے نصف قیمت ہو گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کو بہشتی زیور کامل کے پانچ سات نسخے اس طرح پر دیے جاتے تھے کہ جب فروخت ہو جائیں تو آدھی قیمت مجھے بھیج دیں آدھی قیمت خود رکھ لیں۔

میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد کئی برس تک اس ناکارہ کے نام دس پندرہ روپے کے منی آرڈر اس مضمون کے آتے رہے کہ ہمیں مولانا مرحوم نے اتنے بہشتی زیور دیے تھے وہ فروخت ہو گئے تھے۔ مگر قیمت ادا کرنے کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ جب حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے حیاۃ المسلمین تالیف فرمائی اور اپنی تالیفات میں اس کو بہت ہی اہم ارشاد فرمایا اور واقع میں بھی بہت اہم ہے اور حضرت قدس سرہٗ نے بہشتی زیور کی طرح سے اس کی عام اشاعت کی تمنا ظاہر فرمائی تو مجھے اپنے والد صاحب بہت یاد آئے۔ کاش ان کی حیات میں یہ کتاب تصنیف ہوتی تو بہشتی زیور سے اس کی اشاعت المضاعف ہو جاتی۔

میرا بار بار جی چاہا کہ اس کو طبع کر کے ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کروں۔ لیکن اس ناکارہ کے علمی مشاغل کی وجہ سے مجھے پہلے سفر حج ۳۸ھ کے بعد سے اپنے کتب خانہ کے کام کرنے کا وقت نہ ملا۔ اللہ تعالیٰ مولوی نصیر الدین صاحب کو جزائے خیر دے کہ ہمیشہ انہوں نے میری کتابوں کی طباعت اور فروختگی کا اہتمام کیا اور اب چند سال سے مہمانوں کے ہجوم کی وجہ سے میرے عزیز داماد مولوی حکیم محمد الیاس صاحب میری کتابوں کی طباعت کا اہتمام کرتے ہیں کہ مولوی نصیر کو مہمانوں کے خورد و نوش کے انتظام سے ہی فرصت نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ میرے دونوں محسنوں کو اور میرے سب ہی محسنوں کو جس کا کسی نوع کا احسان جانی و مالی، جاہی، علمی، سلوکی، نسبی احسان ہے اپنی شایانِ شان ان کے احسانات کا بہترین بدلہ دارین میں عطا فرمائے کہ یہ سیہ کار اپنے محسنوں کے احسان کا بدلہ بجز دعاء کے اور کیا کر سکتا ہے۔

ماحول کا اثر تو لازمی اور دائمی ہے اسی وجہ سے حدیث پاک میں اچھے جلیس کی ہم نشینی کی ترغیب اور برُے جلیس سے اجتناب کا حکم وارد ہوا ہے۔ تھانہ بھون کے قیام میں چونکہ ہر وقت ذاکرین کا زور رہتا تھا، اس سیہ کار کو بھی ذکر کا شوق رہتا اور حضرت قدس سرہٗ نے جو بتا رکھا تھا صبح کی نماز کے بعد پریس کے کھلنے تک حضرت حافظ ضامن صاحب قدس سرہٗ کی قبر پر بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا، بڑا لطف آتا تھا۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اس وقت میں تھانہ بھون کے مفتی بھی تھے اور امام بھی تھے۔ وہ بہت ہی شفقت فرمایا کرتے تھے اور اونچے الفاظ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان وجوہ سے اس سیہ کار کو خیال ہوا کہ میں بھی کچھ دنوں یکسوئی کے ساتھ ذکر شغل کروں اور اس لیے میں نے وہیں سے حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں یہ لکھا کہ مدرسہ کی مشغولی کی وجہ سے ذکر شغل میں پابندی نہیں ہوسکتی۔ اگر حضرت اجازت فرمادیں تو یہ ناکارہ کہیں یکسوئی کے ساتھ ذکر و شغل چار، چھ مہینے کرلے۔ حضرت قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں اسباق کے ساتھ جتنا تھوڑا بہت ہوتا رہے کرتے رہا کرو۔

''خوئے بدرا بہانۂ بسیار''

میرے لیے بہانہ مل گیا اور اب تک بھی کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ اس سیہ کار کا دستور یہ بھی رہا کہ حضرت حکیم الامت کی مجلس میں بہت کم جانا ہوتا اور حضرت کے یہاں کی حاضری کا وقت متعین طور پر ظہر سے عصر تک تھا۔ اس لیے یہ ناکارہ اس کا اہتمام رکھتا تھا کہ حضرت کی مجلس میں بے وضو کبھی نہ بیٹھے اللہ نے اس کی توفیق عطا فرمائی۔ قصے تو میرے اکابر کے اس ناکارہ کے ساتھ بہت ہی ہیں اور مجھے ان سب کے لکھوانے میں لطف بھی آرہا ہے۔ مگر ساٹھ سالہ حالات لکھوانے کے واسطے تو بڑا دفتر چاہیے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ اپنی علالت کے زمانہ میں اخیر دور میں بجائے مدرسہ کے قیام کے مولوی منفعت علی صاحب وکیل مرحوم کے مکان پر قیام فرمانے لگے تھے۔ اس لیے کہ وہاں استنجے وغیرہ کی سہولت زیادہ تھی۔ ایک دفعہ حضرت تشریف لائے۔ وکیل صاحب کے مکان پر قیام تھا۔ میں نے تلبینہ پکوا کر جو ایک مسنون حریرہ ہے حضرت قدس سرہٗ کے معالج خاص اور مجاز بیعت حکیم محمد خلیل صاحب جو میرے مخلص دوست اور مجھ پر بہت ہی شفیق تھے۔ ان سے اجزاء بتا کر دریافت کرچکا تھا کہ حضرت کے لیے مضر تو نہیں۔ انہوں نے اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے یہ فرمایا کہ کچھ مضر نہیں۔ میں نے وہ پکوا کر حضرت کی خدمت میں بھیجا اور پرچہ لکھا کہ یہ مسنون غذا ہے اور میں نے طبیب سے اجازت لے لی کہ یہ مضر نہیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں میرے پرچہ پر لکھا کہ میں اس کو مسرت سے قبول کرتا ہوں اگر آپ یہ نہ لکھتے کہ یہ مسنون ہے۔ موجودہ صورت میں یہ اشکال پیدا ہوگیا کہ اگر میں نے اس کو

رغبت سے نہ کھایا تو ایک مسنون چیز سے بے رغبتی ہو جائے گی۔ میں نے پھر واپس کیا اور عرض کیا کہ حضرت کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن اگر پسند نہ آیا تو یہ قصور پکانے والی کا ہوگا نہ کہ اصل شئی کا۔ ہم روزانہ اس کا تجربہ کرتے ہیں کہ ایک پکانے والی ایک چیز کو بہت لذیذ پکاتی ہے اور دوسری اسی چیز کو نہایت بدمزہ۔ اس کے بعد بھی رائے مبارک نہ ہو تو اصرار نہیں ہے۔ حضرت نے رکھوا تو لیا مگر یہ معلوم نہیں کہ نوش فرمایا کہ نہیں۔

چھٹا دور شیخ الاسلام حضرت مدنی:

حضرت شیخ الاسلام مولانا الحاج سیّد حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کو اس ناکارہ پر شفقت ومحبت اس وقت سے ہے کہ جب کہ اس ناکارہ کی عمر ۱۲ سال سے بھی کم تھی ۲۷ھ میں حضرت مدنی قدس سرہٗ نے تقریباً دو ماہ قیام گنگوہ شریف کیا اور مسلسل روزے رکھا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ حضرت عصر کی نماز خانقاہ کی مسجد میں پڑھا کر سیدھے قطب عالم کے مزار پر تشریف لے جاتے مغرب تک وہاں مراقب رہتے اور غروب سے پانچ سات منٹ پہلے اُٹھتے اور ہمارا گھر خانقاہ کے راستہ میں تھا۔ میری والدہ مرحومہ کئی نوع کی افطاری پھلکیاں وغیرہ تیار کر کے رکھتیں اور ایک دسترخوان چارپائی پر بچھا کر اس پر آٹھ دس طرح کی افطاریاں رکھ دیتیں اور میں باہر کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور جب دور سے حضرت مدنی کو آتا دیکھتا بھاگ کر اپنی والدہ سے کہتا کہ آ گئے آ گئے۔ وہ جلدی سے پردے میں ہو جاتیں۔ اتنے حضرت دروازے تک پہنچ جاتے اور میں دروازے سے آجاؤ، تشریف لے آؤ کا شور مچاتا۔ حضرت اندر تشریف لاتے بہت اطمینان سے افطار فرماتے۔ اسی قانون کے تحت جو میں اپنے والد صاحب کے افطار کا حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے حال میں لکھوا چکا ہوں۔ خوب اطمینان سے افطار فرمانے کے بعد پانی وغیرہ پینے کے بعد ہاتھ دھو کر کلی کر کے خانقاہ میں تشریف لے جاتے اور نماز پڑھاتے کہ اس زمانے میں مستقل امام وہی تھے خانقاہ میں پہنچ کر ایک لوٹے سے پانی کے دو گھونٹ پی کر گویا افطار کر کے مصلے پر پہنچ جاتے۔ یہ حقیقت میں تو یہ تھا کہ حضرت مدنی حضرت صاحبزادے صاحب حکیم مسعود احمد صاحب کے مستقل مہمان تھے اور حکیم صاحب کے لیے موجب گرانی تھی کہ وہ کہیں دوسری جگہ افطار کریں۔ یہی وہ دور ہے جس کے متعلق باب دوم میں ''مدینہ'' کے ایڈیٹر کو حضرت نے تحریر فرمایا تھا کہ میں اس وقت سے واقف ہوں جب کہ اس کی عمر ۱۲ برس کی تھی اس کے بعد سے تو پھر جب بھی ملاقات ہوتی شفقتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اخیری زمانے کا حال تو میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ دیوبند سے رڑکی اور پنجاب یا چھوٹی لائن پر جانے آنے میں اگر ایک گھنٹے کا بھی فرق ہوتا تو واپسی کا تانگہ لے کر مکان تک تشریف لاتے اور ان ہی شفقتوں نے مجھے اپنے دوا کابر حضرت

مدنی اور حضرت رائے پوری ثانی قدس سرہما کی شان میں بہت گستاخ بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے۔ ان دونوں اکابر کا اس سیہ کار کے ساتھ تعلق اور اس ناکارہ کا ان دونوں بزرگوں کے ساتھ گستاخانہ برتاؤ دیکھنے والے ابھی تک ہزاروں موجود ہیں۔

تقسیم سے پہلے جو آخری حج حضرت مدنی قدس سرہٗ کا ہوا تو بندہ کے نام تار آیا کہ میں فلاں تاریخ کو فرنٹیر سے پہنچوں گا۔ میری ایک عادت ہمیشہ مستقل اور دائمی یہ رہی جو اَب نہیں ہے کہ نہ سونا تو میرے قبضے کی چیز تھی۔ دو تین رات مسلسل نہ سونا آسان تھا۔ لیکن سونے کے بعد اُٹھنا میرے بس کا نہیں تھا بچپن میں میری والدہ مرحومہ رمضان میں سحری کے لیے انتہائی مشقت سے اُٹھاتیں مگر میں نہیں اٹھتا تھا۔ وہ بٹھا کر بڑی مشکل سے دو چار لقمے سحری کے کھلاتیں۔ جن کا کھانا مجھے بالکل یاد نہیں ہوتا تھا۔ البتہ صبح کو اس چیز کا ذائقہ ہوتا جو سحری میں کھاتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جوانی کے زمانے میں والدین کے انتقال کے بعد ایک مرتبہ رات کو بارش ہوئی۔ گرمی کا زمانہ تھا میں باہر سو رہا تھا۔ بالکل پتہ نہیں چلا صبح کو اُٹھنے کے بعد دیکھا تو ساری چارپائی بستر سارا بھیگ رہا تھا اور میں بھی بھیگ رہا تھا اس سے بڑھ کر یہ کہ ۳۸ھ کے حج میں شریف مرحوم کے زمانے میں جب کہ غارت ولوٹ مار کی کثرت کی وجہ سے مدنی قافلے راستے پر سے نہیں جا سکتے تھے اولاً سمندر کے کنارے اور آخراً جبل غائر پر کو جاتے تھے۔ اسی راستہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا سفر فرمایا تھا۔ اس میں پہاڑ کی چڑھائی کی وجہ سے آخری تین منزلوں میں شُغدُف شُبری وغیرہ کچھ نہیں جا سکتے تھے۔ اونٹ کی خالی پشتوں پر حجاج رات کو چلتے لیکن گرنے کے خوف سے اُونٹ پر نہیں بیٹھ سکتے تھے اور چونکہ کوئی سایہ کا سامان شغدف وغیرہ نہیں تھا علی الصباح آفتاب نکل آتا تھا اور کوئی درخت وغیرہ بھی آس پاس نہیں ہوتا لیکن یہ ناکارہ مدینہ جاتے ہوئے بھی اور اسی طرح واپسی میں احرام کی حالت میں ننگے بدن صرف ٹانگوں میں ایک لنگی اسی ریت پر ہندی بارہ بجے تک سوتا۔ جب اٹھتا تو میرے نیچے کا ریت پسینے کی کثرت سے ایسا ٹھنڈا اور بھیگا ہوا ہوتا کہ جیسا کسی نے پانی کا گھڑا ڈال رکھا ہو اور گرمی کی شدت کی وجہ سے سارے رفقاء کے منہ سرخ ہوتے اور وہ مجھ پر خوب خفا ہوتے کہ دھوپ سے تیری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ بہر حال چونکہ سو کر اٹھنا میرے بس کا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جب مجھے اخیری شب میں کہیں جانا ہوتا یا حضرت مدنی قدس سرہٗ کی آمد کا کہیں سے تار آیا ہوتا کہ حضرت کے علاوہ اور کسی کے لیے تو میں اسٹیشن پر نہیں جاتا تھا تو میرا دستور یہ تھا کہ میں عشاء کے بعد سے اپنے لکھنے کا کام شروع کر دیتا اور اسٹیشن جانے تک بہت سہولت اور انہماک سے لکھتا رہتا۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا تار کراچی سے فرنٹیر سے پہنچنے کا تھا اور وہ صبح کے چار بجے اسٹیشن پر آتا تھا۔ میں بہت اطمینان سے اُوپر بیٹھا لکھ رہا تھا کہ ۱۲ بجے کے قریب

میرے زینے پر نہایت شدت سے زور زور سے پاؤں مار کر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا تو حضرت شیخ الاسلام صاحب میرے کمرے پر پہنچ گئے۔ میں ایک دم اُٹھا اور اپنی حماقت سے گستاخانہ لفظ کہا کہ مشائخ حدیث مشائخ سلوک حج سے آتے ہوئے بھی تو جھوٹ اور دھوکہ دہی سے احتراز نہیں فرماتے یہ فرنٹیر کا وقت ہے؟ اور یہ کہہ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ حضرت ایک چمٹ گئے اور خوب معانقہ فرمایا جس کی لذت اب تک یاد ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے اللہ تعالیٰ بہت بلند درجات عطاء فرمائے اور حضرتین مولانا مدنی ورائے پوری کی شفقتوں کا بہتر سے بہتر بدلہ عطاء فرمائے۔ یہ ارشاد فرمایا کہ جب کراچی میل لاہور پہنچا تو کسی نے یہ کہا کہ ”کلکتہ میل سامنے چھوٹ رہا ہے۔ وہ دو گھنٹہ لیٹ تھا۔ میں چھڑی اور مشلّح ہاتھ میں لے کر چلتی گاڑی میں کلکتہ میل میں سوار ہو گیا ساتھیوں کو بھی ایک دو کے سوا جن کو میں لاہور کے اسٹیشن پر ریل سے اُترتے ہوئے کہہ کہ آیا کہ میں سہارنپور اسٹیشن پر ملوں گا کسی کو خبر نہیں ہے مستورات اور سارا سامان فرنٹیر سے آرہا ہے میں نے سوچا کہ دو گھنٹہ تم سے مل لوں گا۔ یہ فرما کر ارشاد فرمایا چلو جولاہے کو اُٹھا دیں قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے منجھلے نواسے جناب حافظ محمد یوسف صاحب مرحوم انصاری گنگوہی ممبر شوریٰ دارالعلوم دیوبند انگریزی دور میں سرکاری ملازم تھے۔ بہت اُونچی تنخواہ اور افسران کی نگاہ میں بہت باعزت و باوقار سرکاری حیثیت سے بہت ہی امتیازی شخصیت و شان رکھتے تھے۔ ترک موالات کے زمانہ میں سرکاری ملازمت سے استعفاء دے کر سہارنپور میں مستقل قیام کر لیا تھا اور یہاں کھدر کے بُننے کی کھڈیاں کئی ایک لگالی تھیں۔ اس وقت سے حضرت مدنی قدس سرہٗ کے یہاں ان کا لقب جولاہہ پڑ گیا تھا:

لگتی ہیں گالیاں بھی منہ سے ترے بھلی

میں نے کہا ضرور چلیے میں یہ کہہ کر لیمپ گل کر کے ساتھ ہولیا اور زینے سے اترتے وقت میں نے پوچھا کہ اور چائے؟ حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ ضرور نصیر سے کہہ دو کہ بنا کر وہیں لے آئے۔ نصیر اپنے مکان میں سو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کو آواز دے کر جگایا اور کہا کہ حضرت تشریف لے آئے دو کیتلی (چائے دان) چائے کی ایک بہت بڑی ہلکی چائے کی اور ایک چھوٹی تیز چائے کی بنا کر حافظ یوسف صاحب کے یہاں جلدی لے آؤ۔ وہاں پہنچے تو وہ مرحوم سو رہے تھے کئی آوازوں میں بیدار ہوئے اور اٹھ کر گھڑی دیکھ کر آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور کہا کہ میری گھڑی میں تو ابھی بارہ ہی بجے ہیں گھڑی بند ہو گئی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بے فکری سے سو رہے ہیں اور ایک ہم ہیں:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

میں نے عرض کیا کہ اب بھی کچھ پوچھنے میں کسر رہ گئی۔ مشرق، مغرب، ہندوعرب تو پیچھے پیچھے پھرتے ہیں وہاں بیٹھ کر حافظ یوسف صاحب سے وہی بیان فرمایا کہ کلکتہ میل لیٹ تھا میں نے سوچا کہ دوگھنٹہ دوستوں سے مل لیں گے۔ اتنے میں مولوی نصیرالدین چائے لے آئے اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے۔ اطمینان سے چائے پی۔ سفر کے حالات حضرت سناتے رہے۔ ڈھائی بجے کے قریب حافظ یوسف صاحب کو تقاضہ کیا کہ آپ اسٹیشن نہ جائیں اور مجھ سے فرمایا کہ چلو اسٹیشن میں نے کہا کہ میں تو بغیر حکم کے بھی چلوں گا۔ جب ہی اسٹیشن کے لیے تانگہ منگایا اور پونے تین بجے کے قریب اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں سو ڈیڑھ سو کا مجمع جمع ہو چکا تھا۔ حضرت تانگہ سے اترے اور وہاں کہرام مچ گیا۔ کوئی کہے کہ حضرت تشریف لے آئے اور کوئی دور سے کہتا ہے کہ بالکل جھوٹ ابھی تو گاڑی میں سوا گھنٹہ ہے اور کسی نے کہا کہ گاڑی تو آ گئی ہم نے تو دیکھی نہیں۔ حضرت مشلح اوڑھے چھڑی ہاتھ میں لے کر نہایت وقار سے ہر شخص سے فرمار ہے تھے کہ آپ اگر مجھے پہچانتے ہیں اور میں حسین احمد ہوں تو مل لیجئے بہت اطمینان سے لوگوں سے مصافحے کیے۔ اتنے میں فرنٹیر میل آ گیا۔ چونکہ وہ دیوبند نہیں ٹھہرتا اس لیے سارا سامان جو حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے سفر میں خوب ہوا کرتا تھا اور اس مرتبہ توحج سے تشریف لارہے تھے۔ وہ سارا سامان سہارنپور کے اسٹیشن پر اُتار دیا گیا اور جب ہی ساڑھے چار پر پسینجر جاتا تھا اس میں رکھا گیا۔ بہت ہی بھاگ دوڑ ہوئی۔ مگر حضرت قدس سرہٗ کو سامان کی کثرت سے کبھی فکر نہ ہوتی تھی اور میں حضرت کے سامان کو دیکھ کر ہمیشہ سہم جاتا تھا کہ اتنا سامان کس طرح جائے گا۔ چھ بجے کے قریب حضرت قدس سرہٗ دیوبند پہنچے اور آٹھ بجے بخاری کا سبق پڑھایا اور اس سیہ کار کو جب کہیں سفر درپیش ہو تو تین دن پہلے بلکہ ایک ہفتہ پہلے سے اس کے سہم میں بخار ہو جاتا ہے۔ اور دس دن بعد تک تکان اور بخار رہتا ہے:

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بہ کجا

میرے حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کا بھی یہی دستور تھا کہ جب کہیں جانا ہوتا تو بہت اطمینان سے بذل لکھواتے رہتے اور جب حاجی مقبول صاحب سامان بندھوا کر تانگہ پر رکھ کر یہ اطلاع دیتے کہ تانگہ آ گیا تو حضرت نہایت اطمینان سے لکھواتے ہوئے اٹھتے اور گھر کے دروازے پر کھڑے جاتے اور پھر تانگہ میں بیٹھ جاتے میرا تو اپنے بزرگوں کے قصے لکھوانے کو بہت جی چاہتا ہے خواہ کسی کو پسند آویں یا نہ آویں مجھے تو بہت مزہ آتا ہے اور حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری ثانی کی تو اتنی شفقتیں ہیں کہ بڑے بڑے دفتروں میں بھی نہیں آسکتیں ایک مرتبہ دوپہر کا وقت گرمیوں کا زمانہ ایک بجے دوپہر کو میں اپنے گھر کے دروازے میں سویا کرتا

تھا، کیونکہ بجلی پنکھے کا دور نہیں شروع ہوا تھا، میں سونے کے لیے لیٹا سر ہانے کی طرف سر اُٹھا کر دیکھا تو حضرت قدس سرہٗ کھڑے ہیں۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر مصافحہ کیا اور پہلا سوال یہ کیا کہ حضرت کھانا؟ ارشاد فرمایا کہ اگر کھانا کھا لیتے تو تمہارے یہاں کیوں آتے؟ حضرت کے پیچھے پیچھے علامہ ابراہیم مرحوم اور ان کے پیچھے نائب مہتمم دارالعلوم دیو بند مولانا مبارک علی صاحب مرحوم اور یکے بعد دیگر ایک لائن لمبی تھی جن کو میں نے اس وقت شمار بھی نہ کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بارہ تھے حضرت قدس سرہٗ تو کچے گھر میں آ گئے اور پیچھے پیچھے جملہ رفقاء اور میں ننگے پاؤں اندر گیا اور اپنی بچیوں سے پوچھا کہ حضرت کئی آدمیوں کے ساتھ ہیں کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہ روٹی کا ٹکڑا اور نہ کچھ سالن جس کی وجہ یہ تھی کہ کھانے کے وقت بے اطلاع آٹھ دس مہمان عین وقت پر پہنچے تھے اس لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ بلکہ بچیوں نے بھی آدھی بھوک کھائی تھی۔

اللہ جل شانہٗ ہر دو میری بیویوں اور سب بچیوں کو بہت ہی جزائے خیر دے مہمانوں کے سلسلہ میں ان سے بہت راحت پہنچتی ہے۔ تیس چالیس مہمانوں کا کھانا آدھ پون گھنٹہ میں تیار کر دینا ان کے یہاں بہت ہی معمولی بات رہی۔ بشرطیکہ گھر پر کئی ہوں میں نے کہا کہ جلدی سے ایک آٹا گوندھے اور ایک جلدی سے دیگچی میں مصالحہ بھونے اور میں باہر ننگے پاؤں گیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی کرامت کہ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ میرا قدیمی قصاب صوفی کرم الٰہی جو ہمیشہ سے میرے یہاں گوشت لاتا ہے اور مجھے بھی اس سے محبت و تعلق ہے اس کے سوا کسی کا گوشت پسند نہیں آتا۔ بہت آہستہ آہستہ بہت دور سے آ رہا ہے میں ننگے پاؤں اس کی طرف بھاگا اور اس کو آواز دی کہ جلدی آ۔ وہ جلدی سے آیا۔ میرے سوال پر اس نے کہا کہ گوشت بھی ہے اور قیمہ بھی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے قیمہ دے اور جلدی سے دونوں ہاتھوں میں سارا قیمہ جو تین سیر کے قریب ہو گا لے کر گھر پہنچا تو دونوں چولہوں میں آگ جل چکی تھی اور ایک پر توا رکھا تھا اور ایک پر مصالحہ بھن رہا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ گوشت مصالح میں ڈال کر کہا کہ جلدی سے پکاؤ اور دو بچیوں سے کہا کہ توے پر بیٹھو ایک پیڑے بنا کر روٹی بنائے اور دوسرے توے پر سینکے وہ بجائے دو کے تین بیٹھ گئیں۔ ایک گوشت بھون رہی تھی۔ اور اس وقت چار ہی گھر میں تھیں اور میں نے باہر آ کر شور مچایا کہ بھائی کسی نے دستر خوان نہیں بچھایا۔ ارے بھائی دستر خوان بچھاؤ اور ہاتھ دھلاؤ۔ حضرت قدس سرہٗ سمجھے کہ کھانا تیار رکھا ہو گا۔ سب کے ہاتھ دھلائے اور ترتیب سے بیٹھنے اور دستر خوان بچھانے میں دو تین منٹ لگ گئے میں اندر گیا تو دس بارہ روٹیاں تیار ہو چکی تھیں اور قیمہ بھی نیم برشت ہو چکا تھا۔ میں اطمینان سے تین رکابی میں قیمہ لایا اور تین جگہ روٹیاں رکھیں۔ ایک دم حضرت قدس سرہٗ کو خیال ہوا کہ پہلے کا کچھ نہیں حال ہی کا پکا ہوا ہے۔

حضرت کو تو تعجب نہیں ہوا کہ بارہا حضرت کو سابقہ پڑ چکا تھا۔ لیکن علامہ ابراہیم مرحوم جو فن معقول کے مشہور امام تھے، فرمانے لگے کہ کیا آپ کو ہمارے آنے کا پہلے سے علم تھا یا آپ کو کشف ہو گیا۔ میں نے کہا کہ جناب کہ یہاں بیٹھنے کے بعد یہ گوشت قصاب کے یہاں سے خریدا گیا ہے، فرمانے لگے کہ یہ بات عقل میں نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ ہر بات معقول نہیں ہوتی۔ کچھ عقول سے بالاتر بھی ہوتی ہیں۔ حضرت مدنی نے علامہ سے فرمایا کہ مناظرہ نہ کرو جلدی سے کھالو دیر ہو رہی ہے۔ ان کے یہاں تو یہ قصے چلتے ہی رہتے ہیں اور پھر مجھ سے فرمایا کہ ان میں سے میرے ساتھ کوئی نہیں۔ مولانا اشفاق صاحب (اعلیٰ حضرت رائے پوری کے بھانجے دارالعلوم کے ممبر شوریٰ) کا جب سے انتقال ہوا جس کو کئی دن گزر گئے۔ روز رائے پور جانے کا ارادہ کرتا رہا لیکن جب سبق کے بعد گھر جاتا تو کوئی نہ کوئی اہم مہمان یا کوئی مانع پیش آجاتا تھا اس لیے آج میں نے ارادہ کیا کہ سبق پڑھ کر درس گاہ سے سیدھا ریل پر چلا جاؤں۔ میں رائے پور کا ارادہ کئی دن سے کر ہی رہا تھا ان لوگوں میں سے جس جس نے سنا پیچھے ہو لیے۔ ان میں سے بعض سے ملاقات دیوبند کے اسٹیشن پر ہوئی تو بعض سے سہارنپور کے اسٹیشن پر۔ میرے ساتھ ان میں کوئی نہیں۔ کھانا کھا کر جب ہی رائے پور چلے گئے۔

اتنا مجھے خوب یاد ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے دروازے میں مصافحہ کے وقت سے گیارہویں منٹ پر دستر خوان بچھ گیا تھا۔ میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کے صرف کھانے ہی کی مد میں اگر شفقتیں اور واقعات گنواؤں تو ان کا احاطہ بھی بہت دشوار ہے۔ بارہا اس کی نوبت آئی کہ حضرت تشریف لائے اور میں دارالطلبہ سبق میں تھا۔ حضرت نے دروازے پر کسی بچے کو آواز دے کر ارشاد فرمایا کہ حسین احمد کا سلام کہہ دو اور کہہ دو کہ جو کھانے کو رکھا ہے جلدی بھیج دو گاڑی کا وقت قریب ہے اور جب اندر سے بچیوں کی یہ آواز سنتے کہ ابا جی کو جلدی سے مدرسہ سے بلا لاؤ تو حضرت للکار کے فرماتے کہ مجھے ابا جی کی ضرورت نہیں ہے۔ کھانے کی ضرورت ہے، ہو تو بھجوا دو، ورنہ میں جا رہا ہوں۔

کئی دفعہ اس کی نوبت آئی کہ میرے دارالطلبہ سے آنے تک حضرت کھانا شروع فرما دیتے یا تناول فرما لیتے تھے اور ارشاد فرماتے کہ آپ کا آپ کے گھر والوں نے حرج کیا ہے میں نے نہیں بلوایا۔ حضرت قدس سرہٗ کا معمول جمعرات کے سفر کا ہمیشہ سے تھا اور کبھی کبھی جمعہ کو بھی آتے جاتے سہارنپور کا نمبر آجاتا۔ میری عادت اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کے زمانے سے جمعہ کے دن جمعہ کے بعد کھانے کی ہمیشہ رہی۔ مجھے پہلے کھا کر جمعہ کی نماز میں لطف نہیں آتا اور حضرت قدس سرہٗ کا معمول ہمیشہ جمعہ سے پہلے کھانے کا تھا خواہ وقت قلیل ہی ہو۔ سفر میں تو ہمیشہ

میزبان ان کی رعایت کرتے اور میں تابع ہوتا۔ مگر سہارنپور میں خوب رسہ کشی ہوتی۔ میری خاطر حضرت تو فرماتے کہ میں جمعہ کے بعد کھاؤں گا اور میں کہتا کہ نہیں حضرت میں جمعہ سے پہلے کھاؤں گا مگر اس میں حضرت قبول نہ فرماتے اور غلبہ جمعہ کے بعد ہی کو ہو جاتا اور میں بھی جھوٹا سچا اصرار کر کے خاموش ہو جاتا۔

ایک مرتبہ حضرت سفر سے تشریف لائے جمعہ کا دن گیارہ بجے کے قریب فیصلہ جمعہ کے بعد کھانے پر ہو گیا۔ کھانے کے دوران میں ایک صاحب شہر کے آ گئے اور بہت اصرار سے اپنے ادارے میں چند منٹ کے لیے تشریف لے جانے کا وعدہ لے گئے۔ میں نے مخالفت بھی کی کہ حضرت وہاں جا کر دیر بہت ہو جائے گی یہ صاحب جلدی نہیں چھوڑیں گے۔ حضرت قدس سرہٗ کو ساڑھے چار بجے کے ایکسپریس سے سیدھے دہلی جانا تھا کہ وہاں کسی اجتماع میں عشاء کے بعد شرکت کا وعدہ تھا۔ مگر حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہما دلداری اور دلجوئی کے پتلے تھے قبول فرمالیا تین بجے کے قریب ان کی کار میں ان کے ادارے میں گئے۔ کار نے راستہ میں بہت پریشان کیا اور ان صاحب نے حسبِ عادت بہت تاخیر کی اور جب اسٹیشن پہنچے تو گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ مگر چہرۂ انور پر ذرا بھی ناگواری یا ملال کا اثر نہ تھا۔ دہلی تو حضرت نے تار دیا کہ دوسری گاڑی سے آؤں گا اور خادم کو توشہ دان دے کر بھیجا کہ شیخ الحدیث سے کہو جو کچھ رکھا ہے دے دیں۔ معلوم ہوا کہ اسٹیشن پر بہت سے مخلصوں نے خوشامد اور منت سماجت کی کہ کھانا وہیں سے آئے گا۔ کس کس شفقت کو یاد کروں اور روؤں اور رُلاؤں۔

ایک دفعہ تشریف لائے۔ گرمی کا موسم، میں نے حضرت کے خادم سے پوچھا کہ تھرماس میں برف ہے۔ وہ یہ سمجھے کہ پینے کے واسطے پوچھا ہے۔ وہ کہنے لگے تھوڑا سا ہے لاؤں۔ میں نے کہا کہ پینے کو نہیں پوچھتا بلکہ میرے تھرماس میں سے اپنے تھرماس میں بھرلو۔ وہ کوئی نئے خادم تھے۔ کہنے لگے کہ نہیں حضرت اس میں ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ جتنی جگہ ہے اس میں بھرلو، بخیل کا مال ہے جتنا ہو وصول کرلو۔

ایک مرتبہ میرے پاس دہلی کے ایک صاحب نے گاجر کے حلوے کا ایک پیکٹ بذریعہ ڈاک بھیجا اور اسی دن معلوم ہوا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے احترام و اشتیاق میں اس کو اپنے کمرے کے سامنے چھینکے پر رکھوا دیا۔ اس زمانہ میں میرا قیام مستقل اُوپر کے کمرے میں شب و روز رہتا تھا۔ حضرت کے تشریف لاتے ہی میں نے ایک مخلص سے کہا کہ بھائی چھینکے پر سے پیکٹ اُٹھا کر کھول کر حضرت کی خدمت میں پیش کرو۔ حضرت نے خود ہی پیش قدمی فرمائی اور چھینکے پر سے اس کو اُتار لیا اور اس کے کپڑے کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ تو بادشاہ تھے، ان کی نگاہ میں

ایسی معمولی چیزیں کیا تھیں اور میں بقول ان کے بخیل، اول تو مجھے اس کپڑے پر قلق ہوا کہ کیسا ضائع ہوا اور حضرت نے ایک دوا نگلی تو اس میں سے خود نوش فرمائی اور باقی سارا جس کی مقدار انداز اً دو سیر ہوگی ایک ایک لقمہ سارے مجمع کو جو حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ ان کے آنے پر ہمیشہ ہو جاتے تقسیم فرما دیا اور میری نہ تو اضع فرمائی اور نہ چکھایا اور سارا ختم کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ بخیل اس کو پھر چھینکے پر رکھ دیتا۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو کھدر سے تو عشق تھا اور ولایتی کپڑے سے نفرت تھی یہ تو ساری دنیا کو معلوم ہے لیکن اس سیہ کار کے حال پر ایک مزید شفقت یہ تھی کہ میرے بدن پر جب بھی بدیسی کرتہ دیکھتے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایسے زور سے چاک فرماتے کہ نیچے تک وہ پھٹ جاتا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ کی حیات تک ڈر کے مارے کھدر کا میرے یہاں بہت ہی اہتمام رہا۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ نہ دن نہ رات۔ اس لیے گرمی میں بھی کھدر کا کرتا جھک مار کر پہننا پڑتا تھا۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی صاحبزادی نور اللہ مرقدہا کو حضرت سہارنپوری سے بہت محبت تھی اور حضرت کو بھی بہت ہی زیادہ ان سے عقیدت و محبت اور ان کا احترام تھا۔ میرے حضرت کھدر بالکل نہیں پہنتے تھے۔ حضرت صاحبزادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا نے بہت اہتمام سے روئی منگوا کر بہت ہی باریک سوت خود کاتا اور ایک جوڑا کرتہ پاجامہ ٹوپی خود اپنے دست مبارک سے سیا اور میرے حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا۔ حضرت قدس سرہٗ نے ایک جمعہ تو ان کے احترام میں اس جوڑے کو پہن کر پڑھا اور دوسرے دن اس ناکارہ کو یہ کہہ کر عطاء فرما دیا کہ تم مولوی حسین احمد کی خاطر میں ہر وقت کھدر پہنتے ہی ہو اس کو بھی پہن لینا۔

جب اعلیٰ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے بعض اعذار کی وجہ سے مدرسے کی تشریف آوری سے عذر فرما دیا تھا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مدنی کو تار دیا جو اس وقت کلکتہ میں تشریف فرما تھے کہ جلسہ میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔ حضرت مدنی کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کسی دوسری جگہ تشریف لے جانا تھا۔ وہاں کا التواء کا تار دے کر فوراً سہارنپور تشریف لے آئے۔ چونکہ خاص طور سے بلائے گئے تھے اس لیے مدرسہ کے مہمان خانہ میں حضرت مدنی کے قیام کا اہتمام میرے حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا، تانگہ سے اُتر کر حضرت مدنی مدرسہ میں تشریف لے گئے۔ میرے حضرت سے مصافحہ اور دست بوسی فرمائی۔ خدام سامان لے کر پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ میرے حضرت نے فرمایا کہ سامان اوپر مہمان خانہ میں لے جاؤ۔ حضرت مدنی نے ارشاد فرمایا کہ میرا سامان کچے گھر میں جائے گا۔ اس کے بعد سے جب تک

مظاہر علوم کا سالانہ جلسہ ہوتا رہا جو تقسیم ہند تک بڑے اہتمام سے ہوتا رہا اور اس کے بعد بعض مجبوریوں کی وجہ سے بند ہوگیا۔ حضرت ہمیشہ دو مرتبہ کے علاوہ سالانہ جلسہ میں تشریف لاتے رہے اور حضرت حکیم الامت کے بعد مدرسہ کے جلسہ کے واعظ حضرت شیخ الاسلام ہی بن گئے، دو مرتبہ تشریف نہ لا سکے۔ ایک مرتبہ تو جلسہ کے موقع پر حضرت مدح صحابہ کے سلسلے میں لکھنؤ جیل میں تھے، اس جلسہ میں بعض مفسدین نے کچھ خلفشار پھیلایا، جلسہ کو بند کرنے کی کوشش بھی کی اور ایک مرتبہ باوجود دیوبند تشریف فرما ہونے کے میری حماقت سے تشریف آوری نہ ہوئی۔

میں مطمئن رہا کہ حضرت کو جلسہ کی تاریخ معلوم ہے، دفتر سے ضابطہ کا خط اور اشتہار جا چکا ہے اور خود حضرت کو بھی مدرسہ کے جلسہ کا اہتمام رہتا تھا، مجھ سے اکثر ایک دو ماہ قبل دریافت فرمالیا کرتے تھے کہ اپنے جلسہ کی تاریخ نوٹ کرادو، کبھی میری تاریخ کہیں دوسری جگہ کی ہو جائے اور تم خفا ہو۔ اس لیے میں بالکل مطمئن تھا۔ حضرت تشریف نہ لائے اور دیوبند میں مقیم رہے۔ جلسہ کے دن شام کو تشریف لائے، اس لیے کہ بعض خصوصی مہمانوں سے خود حضرت کو بھی ملنا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آج تو بڑا انتظار کرایا خیر تو ہے۔ فرمایا کہ تم نے بلایا ہی نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مدرسہ سے تو مطبوعہ اشتہار اور خط دونوں گئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ تو گئے تھے مگر اب تک معمول ہمیشہ یہ رہا کہ مدرسہ کے خط کے ساتھ یا علیحدہ مستقل حکم نامہ تمہارا بھی جاتا تھا، اب کے نہیں گیا، میں نے سمجھا کہ میری آمد تمہارے نزدیک مناسب نہیں ہے۔ اس وقت اپنی حماقت پر بہت ہی قلق ہوا۔ اس کے بعد سے کبھی مستقل عریضہ نہیں چھوڑا۔ اتنے واقعات اس وقت ذہن میں ہیں کہ اوجز کی چھ جلدیں حضرت مدنی ورائے پوری کے حالات میں آسکتی ہیں۔

میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ کو ترمذی کے سبق میں کوکب الدری کے دیکھنے کا بہت اہتمام تھا اور طلبہ کو ترغیب بھی فرماتے تھے اور کبھی کبھی مستقل سفر دیوبند سے سہارنپور کا اوجز کوکب کے سلسلے میں فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ آپ نے کوکب کا حاشیہ لکھا ہے یا اوجز کا اشتہار دیا ہے۔ ہر جگہ دو تین لفظ لکھ کر لکھ دیتے ہیں کہ ''والبسط فی الاوجز''۔ ایک دفعہ کوکب دیکھو اور ایک دفعہ اوجز دیکھو۔ حضرت اکثر بہت ہی شفقت سے کوکب اور اوجز کے مضامین پر اصل ماخذ کا بھی مطالبہ فرمایا کرتے تھے، یہ آپ نے کہاں لکھ دیا، اس کا ماخذ دکھایئے۔ اس کے متعلق بعض واقعات تالیفات میں گزرے ہیں۔ ایک اہم واقعہ تو جزءالاستحاضہ میں گزر گیا۔

ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ نے میری دیوبند حاضری پر یہ ارشاد فرمایا کہ تم نے اوجز کی کتاب الحج میں ایک ایسی اچھی بات لکھی ہے جس سے بہت دل خوش ہوا اور امام بخاری کے بہت سے اعتراضات تمہاری تقریر سے اُٹھ گئے۔ حضرت سبق کو تشریف لے جارہے تھے۔ میرا حضرت کے

ارشاد پر ندامت سے کچھ ایسا سر جھکا کہ تفصیل نہ پوچھ سکا کہ میری کون سی تحریر تھی جس سے امام بخاری کے جملہ اعتراضات ختم ہو گئے۔ بعد میں بھی کئی مرتبہ خیال آیا مگر حیا کی وجہ سے نہ پوچھ سکا۔

"لامع الدراری" بھی دراصل حضرت کے شدید اصرار پر لکھی گئی۔ کوکب کے بعد سے حضرت اس کی طباعت کا بہت ہی اصرار فرما رہے تھے اور میں اوجز کی تکمیل کا عذر کر دیتا۔ ایک مرتبہ بہت ہی قلق سے فرمایا کہ میرے سامنے طبع ہو جاتی تو میں بھی متمتع ہوتا، میرے بعد طبع کرو گے تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ بہت ہی قلق اور رنج ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت کے مرض الوصال اور شدت علالت میں بہت ہی زور باندھ کر چار صفحے اس کے چھاپے تھے، جو حضرت کی خدمت میں مستقل آدمی کے ہاتھ بھیجے تھے، جو وصال کے وقت حضرت کے سرہانے رکھے رہے مگر مقدر کہ حضرت قدس سرہٗ کی زندگی میں کم از کم ایک ہی جلد طبع ہو جاتی تو بے حد مسرت ہوتی۔ لیکن مقدرات کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ اللہ جل شانہٗ لامع کا اجر و ثواب حضرت کو مرحمت فرمادے کہ حضرت ہی کے حکم سے لکھی گئی۔

حضرت قدس سرہٗ سے علمی گفتگو بھی خوب ہوتی اور مناظرے بھی خوب ہوتے تھے۔ بہت سے مضامین کو اس ناکارہ نے "افادات حسینیہ" کے نام سے جمع بھی کر رکھا ہے، جس کا تذکرہ تالیفات میں گزر چکا ہے۔ خطبات کی تالیف میں جو حضرت کثرت سے لکھا کرتے تھے۔ اکثر کسی طالب علم کے ہاتھ پرچہ بھیج دیتے کہ فلاں فلاں حدیث کے حوالے بھیج دو، میں بڑے اہتمام سے اسی وقت لکھ کر بھیجا کرتا تھا۔

حضرت قدس سرہٗ دستی پنکھے کے بہت خلاف تھے۔ کچے گھر میں جب کوئی جھلنے کھڑا ہوتا تو ڈانٹ سنتا، میں خوشامد کرتا تو مجھ پر بھی ڈانٹ پڑ جاتی۔ ایک مرتبہ حضرت نے بہت زور سے فرمایا کہ کسی حدیث میں اس کا ثبوت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو بجلی کے پنکھے کا بھی ثبوت نہیں ملا، جو حضرت کے کمرے میں لگا ہوا ہے، حضرت ہنس پڑے۔ اس کے بعد میں نے ایک حدیث حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مسجد میں جماعت کو پنکھا کرنے کی نقل کر کے بھیجی اور جب اگلی دفعہ تشریف لائے تو میں نے ایک لڑکے سے کہا کہ حضرت کو پنکھا کر، اب تو حدیث بھیج دی، اب کیا کسر ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ غیر معروف کتاب کی حدیث بھیجی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ساری احادیث معروف کتابوں میں ہیں اسی طرح ارشاد فرمایا کہ یہ بدن دبانے کا ثبوت کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مباحات میں ہر ایک کے لیے حدیث تلاش کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس کی حدیث تو میں تلاش کر کے بھیج دوں گا۔ چنانچہ دوسرے دن ایک طالب علم کے ہاتھ بھیج دی۔

اس ناکارہ کا دستور تو رات کو کام میں مشغول رہنے کا خوب رہا اور ساری رات جاگنا معمولی

بات تھی۔ حضرت قدس سرہٗ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری اس چیز پر بڑا رشک آتا ہے۔ میری تو یہ مصیبت ہے کہ جہاں عشاء کے بعد کتاب ہاتھ میں لی نیند کا اس قدر غلبہ ہوجاتا ہے کہ بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ اخیر شب میں کتاب دیکھنے کی حضرت کی خصوصی عادت تھی اور یہ ناکارہ اس سے عاجز تھا۔ تھوڑی دیر سو کر ایک دو بجے اُٹھ کر صبح تک کتاب دیکھنا حضرت کے یہاں بہت معمولی چیز تھی۔ بسا اوقات اس کی نوبت آئی کہ حضرت تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ ایک مضمون لکھنا ہے، اس کے ماخذ نشان رکھ کر میرے سرہانے رکھ دو۔ اس وقت شروع رات میں دیکھنا میرے بس کا نہیں، اُٹھ کر دیکھوں گا۔ میں جن کتابوں میں فوراً ملتا وہ حضرت کے سرہانے رکھ دیتا۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ معاہدات یہود کی ضرورت ہے، اس کی روایات جہاں جہاں ہوں اور اس قسم کے مضامین ہوں نشان لگا کر رکھ لینا۔ کل رات کو یہاں سوؤں گا حوالہ نقل کر کے لے جاؤں گا۔

ایک دفعہ حضرت قدس سرہٗ رمضان ٹانڈہ گزار کر تشریف لائے اتفاق سے حضرت رائے پوری ثانی بھی سہارنپور تشریف رکھتے تھے۔ حضرت نے حسب معمول تار دیا اور میں صبح کو دس بجے اسٹیشن پر حاضر ہوا اور حضرت رائے پوری میرے ساتھ اسٹیشن تشریف لے گئے۔ یہ حضرت رائے پوری کی مستقل عادت تھی کہ جب ان کے قیام سہارنپور میں حضرت تشریف لاتے اور میں اسٹیشن جاتا تو حضرت ضرور تشریف لے جاتے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ حضرت رائے پوری سے مل کر بہت ہی خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ تم دونوں کی مجھے بڑی ضرورت ہو رہی تھی۔ میں تم دونوں سے ایک اہم مشورہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس وقت مستورات ساتھ ہیں، سامان بھی ساتھ ہے۔ میں ان سب کو دیوبند پہنچا کر اگلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ حضرت کا قیام یہاں کب تک ہے۔ قبل اس کے کہ حضرت رائے پوری کچھ ارشاد فرمائیں مجھ گستاخ کو پیش قدمی کی عادت ہمیشہ رہی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کا ارادہ آج ہی جانے کا تھا۔ جناب والا کی خبر سن کر ملتوی کیا تھا اور شام واپسی کا ارادہ ہے، مگر جب بھی حضرت والا تشریف لائیں، ان حضرت کا قیام یہاں ضرور رہے گا۔ آپ فوراً واپسی کا ارادہ ہرگز نہ فرمائیں، جب سہولت ہو بہت اطمینان سے کل یا پرسوں تشریف لے آئیں۔ حضرت تشریف رکھیں گے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ بالکل نہیں، میں حضرت کا حرج بالکل نہیں کرنا چاہتا۔ سامان اور مستورات وغیرہ کو پہنچا کر ابھی واپس آتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بالکل نہیں۔ ان حضرت کو نہ تو بخاری کا سبق پڑھانا ہے اور نہ مؤطا کی شرح لکھنی ہے ان کو نور پھیلانا ہے، رائے پور کی جگہ دو تین دن سہارنپور بیٹھ کر نور پھیلا دیں گے۔ دونوں حضرات بہت ہنسے اور میرے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے بہت زور سے میری بات کی تائید کی کہ ہاں حضرت انھوں نے صحیح فرمایا میں تو بے کار ہوں نہ مجھے یہاں

کوئی کام اور نہ وہاں۔ میں جب تک حضرت تشریف لاویں گے خوشی سے انتظار کروں گا۔ مگر حضرت مدنی قدس سرہ دوسری گاڑی سے فوراً تشریف لے آئے ظہر کی نماز کے بعد مدرسہ کے قدیم مہمان خانے میں جواب کتب خانہ کا جزو بن گیا شرقی دیوار کی طرف دونوں اکابر تشریف فرما تھے۔ دیوار کے قریب تکیئے رکھے ہوئے تھے اور سامنے خادمانہ دوزانوں بیٹھنے سے میں عرصے سے معذور ہوں چوزانوں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت مدنی نے فرمایا کہ مودودیوں کی کتابوں کے براہ راست دیکھنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ کچھ تراشے لوگ بھیجتے رہے اور کچھ احوال خطوط سے معلوم ہوتے رہے۔ ان ہی پر میں رائے قائم کرتا رہا۔ تم دونوں کا موقف اس سلسلہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت رائے پوری قدس سرہ کا دستور تو دیکھنے والے سینکڑوں موجود ہیں ان کا ایک عام ارشاد تھا کہ میں تو ان حضرت (یعنی یہ ناکارہ) کے پیچھے ہوں۔ جو یہ حضرت فرمادیں گے۔ وہی میری رائے ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ دونوں کی جوتیوں کی خاک اپنے سر پر ڈالنا باعث نجات اور فخر اور موجب عزت سمجھتا ہوں۔ لیکن مودودیوں کے بارے میں اگر آپ کوئی حکم متفقہ میری رائے کے خلاف دیں گے تو بہت ادب سے عرض کروں گا کہ تعمیل حکم سے معذور رہوں۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ یہ ہے ہمارے جوتوں کی خاک کی حقیقت۔ حضرت رائے پوری خوب ہنسے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تقریباً میں پانچ کے قریب کتابیں امسال دیکھ چکا ہوں جو زبردستی مجھے دکھلائی گئیں اور ان پر میرے اشکالات ایک جگہ نوٹ ہیں چنانچہ تالیفات کے سلسلہ میں اس کا ذکر گزر بھی چکا ہے۔ حضرت اطمینان سے تشریف لائیں تو میں اصل کتابوں کی عبارتیں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ جن پر مجھے اشکالات ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا میں دو دن بعد دو شب قیام کے لیے آؤں گا اس کے بعد کوئی رائے قائم کروں گا۔ مجلس ختم ہوگئی اور دونوں حضرات شام کو اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ دو دن بعد حضرت قدس سرہٗ مولانا اعزاز علی صاحب کو لے کر تشریف لائے اور دو دن مستقل قیام فرمایا۔ مہمان خانہ قدیم وہ کمرہ جو دارالافتاء کے نیچے ہے اور اب کتب خانہ کا جزو ہے اور مدرسہ کے زینہ کے منتہا پر اس جانب کواڑ بھی لگے ہوئے تھے۔ غالباً اب نہیں رہے۔ صبح کو چائے کے بعد میں اور حضرت قدس سرہٗ اور مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ زینے والے کواڑوں کی زنجیر لگا کر اس کمرہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ حضرت کئی کئی ورق اول سے آخر تک مسلسل پڑھنے کے بعد نشان لگا کر مولانا اعزاز علی صاحب کو دیتے کہ یہاں سے یہاں تک عبارت نقل کردو۔ کبھی کبھی قاری صاحب مرحوم کو بھی نقل کی یا کسی افتاء کی کتاب کی مراجعت کے لیے بلالیا جاتا تین شب دو دن مسلسل ان دونوں حضرات کا یہاں قیام رہا اور شہر میں جیسا عوام کی عادت ہوا کرتی ہے خوب قیاس آرائیاں ہوئیں کہ یہ کیا اہم مسئلہ درپیش

ہورہا ہے عام طور سے لوگ سیاسی مسائل کے اوپر رائے زنیاں کرتے۔ مگر اونچے لوگ اس کی تردید کردیتے کہ سیاسی مسائل میں شیخ الحدیث اور مفتی کی کیا ضرورت ہے کوئی علمی مسئلہ ہوگا۔ سامنے جنگلے پرسے لوگ کھڑے ہوکر کئی کئی گھنٹے گھورتے رہتے بعض سیاسی اونچے لوگ آتے اور اپنے علوشان کی بنا پر کواڑ کھلوانا چاہتے آوازیں دیتے تو میں اپنی جگہ سے اٹھتا نہیں اشارہ سے انکار کردیتا۔ حضرت کچھ آڑ میں کو ہوتے تھے اور کچھ آگے کو ہوتے تھے پورے نظر نہیں آتے تھے۔ نیچے مدرسہ والوں سے کہہ رکھا تھا کہ جو آوے اس سے کہہ دیجیو کہ بارہ بجے سے پہلے ملاقات نہیں ہوگی یا پھر عصر کے بعد۔ عصر سے مغرب تک مجلس عامہ رہتی اور مغرب سے عشاء تک سیاسی لیڈروں کے حضرت سے تخلیہ کی ملاقاتیں اور کھانا عشاء کے بعد پھر میں ہمرکاب مہمان خانہ میں پہنچ جاتا ایک دو گھنٹہ تو حضرت کتابیں دیکھتے پھر ارشاد فرماتے بھائی ہمیں تو نیند آگئی۔ نشان رکھ کر چلے جاؤ اور مولانا اعزاز علی صاحب کو اس عشاء کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں کچھ حضرت حوالے بتادیتے وہ ان کو نقل کرتے رہتے۔ بات پر بات یاد آجاتی ہے میرے حضرت مدنی کا ایک بڑا عجیب دستور میرے ساتھ سالہا سال یہ رہا اکثر مہینے دو مہینے میں ایک پھیرا کبھی تو سونے کی مد میں ہوتا اور کبھی کوئی اہم مضمون لکھنے کے واسطے حضرت تشریف لاتے اور فرماتے تین رات ہوگئیں سوئے ہوئے۔ نیند کا بڑا اخمار ہے۔ دیوبند میں سونے کی جگہ بالکل نہیں میں نے سوچا تیرے یہاں سوؤں گا میں عرض کرتا ضرور میں کچے گھر میں گرمی میں باہر اور سردی میں اندر کمرے میں چارپائی بچھا کر حضرت کو لٹا کر کسی تیل ملنے والے کو سرہانے بٹھا کر اور باہر کا قفل لگا کر تالی اپنے ساتھ لے کر اوپر چلا جاتا لوگ مولوی نصیر سے مطالبہ کرتے کہ قفل کھولدو کہتے کہ تالی تو میرے پاس نہیں وہ تو اوپر ہے اوپر ہر شخص کی جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن اونچے لوگ جن کے نام لکھنا تو مناسب نہیں سمجھتا اوپر پہنچ جاتے اور مجھ پر اصرار فرماتے کہ ضروری کام ہے کواڑ کھول دو۔ میں اول تو ذرا متانت سے عرض کرتا کہ حضرت کئی روز کے جاگے ہوئے ہیں سونے ہی کے لیے تشریف لائے ہیں ایسی حالت میں جناب کو تو خود ہی چاہیے۔ مگر بعض بڑے آدمی ذرا اپنی علوشان کی وجہ سے اس جواب کو بھی اپنی توہین سمجھتے تو میں کہتا کہ آپ کو تو حضرت کا یہاں تشریف لانا معلوم نہیں تھا آپ یوں سمجھئے کہ دیوبند ہیں کارلے کر دیوبند تشریف لے جائیے اور وہاں جا کر جب یہ معلوم ہو کہ سہارنپور گئے ہوئے ہیں تو واپس آکر مجھ سے کواڑ کھلوائیے اتنے وقت ہو ہی جائے گا۔ بعض لوگ تو نصیر ہی کے پاس سے واپس ہوجاتے تھے اور بعضے اوپر جا کر میرے پہلے یا دوسرے جواب پر خواستہ یا ناخواستہ واپس آجاتے۔ لیکن بعض لیڈر اس پر بھی زور دکھلاتے تو پھر میں بھی زور دکھلاتا۔ میں کہتا کواڑ تو نہیں کھلیں گے آپ کا جب تک جی چاہے تشریف رکھیے۔ میرا بھی حرج ہوگا مناسب یہ ہے کہ باہر

بوریئے پر تشریف رکھیے۔ مجھے بڑا لطف آتا جب عتابات اور گالیاں سنتا۔ باتیں تو کئی یاد آگئیں لیکن میں نے اوپر لکھا تھا۔ دو مد تھے تشریف آوری کے دوسرا مد جس کے لیے حضرت اہتمام سے تشریف لاتے کسی اہم مضمون کا لکھنا ہوتا تھا۔ وہ اگر طویل ہوتا یعنی ایک دوروز کا ہوتا تو حسین آباد تشریف لے جاتے دو چار گھنٹہ کا ہوتا تو ایک گاڑی سے یہاں تشریف لے آتے اور وہی سارا منظر جو اوپر سونے کے سلسلے میں گزرا وہی یہاں بھی ہوتا۔ حضرت قدس سرہ کا معمول گرمی ہو یا سردی اگر شب کو سونے کی نوبت آتی تو کچے گھر ہی میں آرام فرماتے تھے سردی میں تو کوئی دقت نہ تھی۔ لیکن گرمی میں بہت ہی اصرار کرتا کہ مدرسہ کی چھت پر بہت ہی اچھی ہوا آئے گی منت خوشامد کرتا۔ حضرت فرماتے کہ مجھے جیل کی کوٹھریوں کی عادت ہے۔ ایک دفعہ حضرت قدس سرہٗ اور مولانا عزیز گل صاحب اور دو مہمان مغرب کے وقت تشریف لائے علی الصباح گنگوہ جانا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ گرمی بڑی شدید ہے برسات کا زمانہ تھا آج تو مدرسہ کی چھت پر بڑے کمرے میں چارپائی بچھوادوں۔ بڑی اچھی ہوا آئے گی۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تو کچے گھر ہی میں سوؤں گا ان لوگوں کے لیے بچھوا دیجیو۔ میں نے مولانا عزیز گل صاحب سے اللہ ان کو بہت ہی خوش رکھے۔ پوچھا کہ آپ کی وہاں چارپائیاں بچھوادوں جو مولانا عزیز گل سے کبھی مل چکا ہوگا وہ ان کے طرز گفتگو سے خوب واقف ہوگا کہنے لگے کہ ہم بھی وہیں مریں گے جہاں یہ مرے گا چونکہ اس زمانے میں گھر والے نہیں تھے اس لیے میں نے بقیہ حضرات کی چارپائیاں زنانے مکان کی سہ دری میں بچھوادیں کہ وہاں فی الجملہ ہوا تھی۔ ایک بات اور یاد آگئی اور یہ بھی یاد نہیں کہ کہیں اور لکھوا چکا کہ نہیں۔ حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری ثانی کا معمول یہ رہا کہ سفر ہو یا حضر ان دونوں حضرات کی چارپائی مجمع سے علیحدہ ہوتی تھی اور یہ ناکارہ اس ضابطہ سے دونوں کے یہاں مستثنیٰ تھا۔ ایک مرتبہ آبھہ حضرت مدنی تشریف لے گئے یہ سیہ کار بھی ساتھ تھا حسب معمول سب رفقاء کی چارپائیاں مختلف کمروں میں بچھیں حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ان کی چارپائی میرے ہی کمرے میں ہوگی۔ آبھہ والے بھی حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ بے تکلف تھے۔ کہنے لگے کہ حضرت جی یہ کیا بات ہے کہ خادم لوگوں کی چارپائیاں تو دور ہوں ان کی کیا خصوصیت ہے کہ حضرت ہی کے پاس ہو۔ قبل اس کے کہ حضرت قدس سرہ جواب مرحمت فرمائیں۔ میں بول پڑا کہ اس کی وجہ بتلاؤں وہ یہ کہ یہ دونوں حضرات رات کو بہت مشغول رہتے ہیں اور آدمیوں کے قرب سے ان کا حرج ہوتا ہے اور میں تو ایسا ہوں جیسے تمہاری یہ بکریاں یہاں بندھ رہی ہے۔ ایک چارپائی کے قریب وہ بھی بندھی ہوئی ہے ایک میں بھی سہی جانوروں سے حرج نہیں ہوتا آدمیوں سے ہوتا ہے میں نے اپنے اکابر میں اپنے والد صاحب اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کو اخیر شب میں

بہت ہی آواز سے روتے سنا۔ بسا اوقات ان اکابر کے رونے سے مجھ جیسے کی آنکھ بھی کھل جاتی تھی۔ جس کی آنکھ سونے کے بعد بڑی مشکل سے کھلتی ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہ ہندی کے دوہے بڑے درد سے پڑھا کرتے تھے۔ میں ہندی سے واقف نہیں اس لیے مضامین کا تو پتہ نہیں چلتا تھا۔ لیکن رونے کا منظر اب تک کانوں اور دل میں ہے۔ جیسے کوئی بچہ کو پیٹ رہا ہو اور وہ رو رہا ہو۔ ہمت و جفا اور مشقت اٹھانا تو میں نے اپنے سارے اکابر میں حضرت مدنی کے برابر کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر حضرت سہارنپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ اہل شہر نے اصرار کیا کہ آج ہمارے یہاں سیرت کا جلسہ ہے۔ زکریا نے کہہ دیا کہ اب مولود کا نام سیرت ہوگیا۔ نہ معلوم حضرت مدنی قدس سرہٗ کس خیال میں تھے سختی سے انکار فرمادیا کہ میں نہیں آؤں گا اور خوب ڈانٹا کہ تم لوگوں کو عقیدت ساری ۱۲ ربیع الاول ہی کو آتی ہے سال میں کبھی توفیق ہوتی ہے جلسہ کرنے کی؟ لوگوں نے کہا حضرت ہم تو ہر وقت متمنی رہتے ہیں کوئی مانتا نہیں۔ سناتا نہیں۔ حضرت نے فرمادیا کوئی سننے کے لیے تیار ہو تو میں سنانے کے لیے تیار ہوں۔ لوگوں نے اپنی حماقت سے استقبال کا خوب اظہار کیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے ہر ہفتہ تشریف لانے کا وعدہ فرمالیا اور جمعرات کی رات اس کے لیے متعین ہوگئی۔ اس لیے کہ جمعہ حضرت کا کئی کئی ماہ کا پہلے سے موعود ہوتا تھا۔ تقریباً چار ماہ مسلسل اگر کسی دوسری جگہ کا طویل سفر نہ ہوتا تو حضرت جمعرات کی شب میں ساڑھے آٹھ بجے کی گاڑی سے تشریف لاتے اسٹیشن سے سیدھے جامع مسجد جاتے اور نماز کے بعد وعظ شروع فرماتے۔ ساڑھے بارہ ایک بجے اس سیہ کار کے مکان پر تشریف لاتے۔ چونکہ مجھے معمول معلوم تھا اور میری پہلی اہلیہ مرحومہ کو حضرت قدس سرہٗ کے لیے کھانے یا پینے کی چیزوں کا بہت ہی زیادہ اہتمام تھا وہ بارہ بجے چائے کا پانی رکھ دیتی اور حضرت کی آواز اوپر چڑھنے کی جب آتی کہ میرا قیام اس وقت اوپر کے کمرے میں تھا تو چائے دم کرتی اور زور سے کھڑکا کرتی اور میں جلدی سے آکر چائے لے جاتا۔ حضرت پر اس وقت چونکہ تعب ہوتا تھا اس لیے پیتے تو تھے رغبت سے اور بار بار مجھ سے فرماتے کہ آپ اس غریب کو ناوقت ستاتے ہیں۔ میں عرض کرتا کہ میں نے نہیں کہا اس نے اپنے شوق سے خود پکائی اور چونکہ مجھے معمول معلوم تھا اس لیے چارپائی اور بستر پہلے سے تیار ہوتا۔ حضرت چائے پی کر آرام فرماتے، میں نے اختیاری سونا اور سوکر اختیاری جاگنا اپنے اکابر میں صرف اپنے حضرت قدس سرہٗ اور حضرت مدنی میں دیکھا۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کو بارہا دیکھا کہ ریل پر تشریف لے جاکر گاڑی اگر دس پندرہ منٹ لیٹ ہوتی تو حضرت فرماتے کہ میں تو اتنے سولوں گا اور کوئی خادم جلدی سے بستر پلیٹ فارم پر کھول دیتا اور حضرت تکیہ پر سر رکھتے ہی سو جاتے اور دس منٹ کے اندر خود اٹھ جاتے۔ میرے

حضرت قدس سرہٗ کبھی کبھی یہ بھی ارشاد فرماتے کہ سونے کے ارادے کے بعد مجھے اکثر تکیہ پر سر رکھنے کی بھی خبر نہیں ہوتی ہے یہ مقولہ میں نے اپنے چچا جان سے بھی اکثر سنا کہ ماہ مبارک میں وتروں کے بعد چارپائی پر تشریف لے جا کر تکیہ پر سر رکھنے سے پہلے ہی آنکھ لگ جاتی تھی۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا معمول ماہ مبارک میں تراویح کے بعد فوراً سونے کا تھا اور بارہ ساڑھے بارہ بجے اٹھ کر سحر تک کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے کا تھا اور جہر سے قرآن پاک پڑھتے۔ صبح کو اذان کے ساتھ ہی نماز ہو جاتی اور اس کے بعد خود مصلے پر بیٹھ کر اشراق تک اوراد و وظائف پڑھتے اور خدام کو تقاضا کر کے سلا دیتے۔ کہاں سے کہاں چلا گیا۔ بہر حال حضرت مدنی قدس سرہٗ کی نینداس قدر قابو کی تھی کہ سینکڑوں دفعہ میرے یہاں رات دن میں آرام فرمانے کی نوبت آئی اور میں نے حضرت کی راحت کی وجہ سے بارہا اس کی کوشش کی کہ کوئی حرکت نہ ہو اور کوئی نہ بولے چاہے گاڑی نکل جائے مگر حضرت قدس سرہٗ گاڑی سے آدھ گھنٹہ پہلے ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ اس ہفتہ واری آمد میں بھی رات کو ساڑھے چار پر گاڑی جاتی تھی اور چار بجے سے پانچ سات منٹ قبل اٹھ جانا طے شدہ تھا۔ میں حضرت کے اٹھتے ہی کسی شخص کو تانگے کو بھیجتا اور پہلی اہلیہ مرحومہ اس وقت بھی چائے تیار رکھتی اس وقت کی چائے پر حضرت زیادہ ناراض ہوتے تھے کہ میں دیوبند جا کر پی لوں گا۔ چائے کے وقت پہنچ جاؤں گا۔ میرے اصرار پر کبھی تو پی لیتے اور کبھی عتاباً انکار فرما دیتے تھے۔ کیا کیا مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ایک دفعہ حضرت قدس سرہٗ تانگہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ وقت تنگ ہے مدینہ پاک کے لیے درخت خریدنے ہیں کہ حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ فرمایا کہ تانگہ پر بیٹھ جاؤ۔ تانگہ میں ہی ملاقات ہو جائے گی۔ ٹھہرنے کا وقت نہیں جلدی واپسی ہے۔ میں نے جلدی سے مولوی نصیر کو آواز دی اور ان کو بھی تانگہ میں اس خیال سے بیٹھا لیا کہ حضرت تو درخت خرید کر خود ہی اٹھالیں گے اور مجھے شرم آئے گی اور مجھ سے اٹھنے مشکل ہوں گے۔ اس لیے مولوی نصیر اٹھالیں گے۔ راستہ میں حضرت نے فرمایا کہ حج کو نہیں چلتے میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس وقت بڑی مشغولی ہے اسی نصیر کو لیتے جاویں کرایہ میرے ذمہ اور بقیہ اخراجات کھانے پینے کے آپ کے ذمے۔ حضرت نے فرمایا کہ ضرور میں نے اور حضرت قدس سرہٗ نے نصیر پر بہت ہی اصرار کی مگر اس نے بھی عذر کر دیا۔ اتنے میں ایک بہت لمبی چوڑی تعمیر آ گئی۔ قربان خاں مرحوم کے باغ میں جانا تھا جن کا دفتر تو شاہ مدار میں تھا پہلے وہاں گئے ان کا دوسرا باغ کچہری سے دور تھا وہاں جاتے ہوئے اس تعمیر پر کو گزرے میں نے پوچھا کہ کیا ہے اس لیے کہ مجھے کبھی چالیس سالہ قیام سہارنپور میں وہاں جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ اس کو نہیں جانتے۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں حضرت میں تو

یہاں کبھی نہیں آیا۔ فرمایا کہ یہ کچہری وہ دیوانی ہے یہ کلکٹری ہے وغیرہ وغیرہ میں نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت کی برکت نے کچہری تک تو پہنچا دیا۔ آپ جیل بھی پہنچا کر رہیں گے۔ فرمایا کہ تم لوگوں کی اس بے تعلقی نے انگریز کو ہم پر مسلط کر رکھا ہے تم کچہری سے اتنا ڈرتے ہو جیسے سانپ سے ڈرتے ہو فرمایا کہ ہمارے مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک دفعہ ایک میراث کے مسئلہ کی تصدیق کے لیے سمن پہنچ گیا۔ کچہری آنے کے ڈر سے بخار آ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جناب والی قوت کہاں سے لاویں۔ فرمایا کہ یہ سب بزدلی کی باتیں ہیں۔ غرض بہت سے پودے خریدے۔ حضرت قدس سرہٗ کا ہمیشہ معمول رہا کہ جب کبھی مدینہ پاک تشریف لے جاتے تو سید محمود صاحب کے باغ کے لیے بہت سے بیج پھلوں اور پھولوں کے اور بہت سے پودے کئی کئی ٹوکروں میں لے جاتے خاص طور سے آم کے پودے کثرت سے لے جاتے مگر ہمیشہ خراب ہو گئے بالآخر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے دو تین درخت بار آور ہو گئے۔ گزشتہ سال ۸۹ھ میں جب مدینہ پاک قیام تھا تو سید صاحب زادمجد ہم نے اپنے باغ کے آم کھلائے۔ اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر عطاء فرمائے۔ آم تو گزشتہ سال اللہ کے فضل سے مدینہ پاک میں ہندو پاک۔ افریقہ، لندن، بحرین، شام وغیرہ نہ معلوم کتنے ملکوں کے کھائے احباب اپنی شفقتوں سے دوسرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں سے لاتے ہی رہتے تھے۔ شاید ہندوستان سے زیادہ ہی کھانے کی نوبت آئی ہو۔ میں بھی شتر بے مہار کی طرح سے کبھی ادھر چلا جاتا ہوں اور کبھی ادھر۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی کیا کیا شفقتیں لکھواؤں۔ حضرت اقدس کا معمول تقسیم سے پہلے تک کثرت سے تشریف بری کا تھا اور جب بھی تشریف لے جانا ہوتا تھا تو اس سیہ کار کے لیے ایک عطر عود کی بڑی شیشی لانے کا معمول تھا ۶۰ھ میں حضرت قدس سرہٗ نے ایک عطر عود کی شیشی مرحمت فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ یہ ستر سال کا ہے اور سترہ روپیہ تولہ اس کی قیمت ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ اس کی قیمت میں ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب چونکہ یہ ستر سال کا ہے اس لیے اس وقت اس کی قیمت ستر روپے ہے۔ میں نے بھی اس کو بڑی احتیاط سے اس پر چٹ لگا کر اور یہی عبارت لکھ کر ایک ڈبہ میں محفوظ رکھ دیا تھا۔ اپنے بخل کی وجہ سے خود تو اب تک استعمال نہیں کیا البتہ گزشتہ سال ۸۹ھ میں حضرت قدس سرہٗ کے برادر خورد حضرت الحاج سید محمود صاحب کی خدمت میں اس کا ایک ربع پیش کیا تھا اگر میرے مرنے کے وقت کسی کو یاد رہے اور مل جاوے تو اس میں سے تھوڑا سا میرے کفن پر بھی مل دیں۔ اس وقت ۹۰ھ میں تو اس کی قیمت سو روپے فی تولہ ہو گئی ہو گی کیونکہ اس کی عمر سو سال ہے واقعی شیشی کھولنے سے کمرہ مہک جاتا ہے۔ ایک قصہ لکھوانے کا تو نہیں ہے مگر میرے دوستوں کا اصرار ہے کہ ضرور لکھواؤں حضرت کی شفقتیں تو بے

پایاں تھیں اور جتنی حضرت کی شفقتیں بڑھتی جاتی تھیں میری گستاخیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ کچھ تذکرہ اکابر کا اور جنت کا چل رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جنت میں میرے بغیر جانا نہیں ہوگا، حضرت نے نہایت سادگی میں بلا تامل فرمایا کہ ہاں ضرور۔ ایک سال بعد بلکہ اس سے بھی زیادہ میرے تو ذہن میں بھی نہیں رہا حضرت تشریف لائے میں دارالطلبہ تھا مجھے آدمی بلانے گیا۔ اتنے میں آتا ایک صاحب مدرسہ کے قریب ہی اپنے گھر آموں کے لیے لے گے۔ میں جب دارالطلبہ سے آیا تو معلوم ہوا کہ فلاں صاحب کے یہاں چلے گئے میں وہاں پہنچا تو آم بھیگے ہوئے تھے اور حضرت تشریف فرما میرا انتظار فرمارہے تھے۔ میں نے کہا کہ ایسا کیا تقاضا تھا پہلے ہی تشریف لے آئے حضرت نے فرمایا کہ ہر جگہ ساتھ لے جانے کا وعدہ تو نہیں کر رکھا جہاں کا وعدہ ہے وہاں کا ہے۔ مجھے اس قدر مسرت اور حیرت ہوئی کہ حضرت کو ایک سال کے بعد تک کیسے یاد رہا۔ اس کے بعد تو پھر انشاء اللہ اپنی مغفرت کی بھی ڈھارس بندھ چلی ورنہ **و امتازوا الیوم أیها المجرمون** کا خوف غالب رہتا تھا اور ہے اللہ تعالیٰ ان اکابر کی جوتیوں میں اس سیہ کار کو بھی جگہ دے دے تو اس کے لطف و کرم سے کیا بعید ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی شفقت و محبت کے قصے **لاتعدو لا تحصٰی** ہیں اور یاد بھی بہت ہیں۔ بہت سی چیزوں میں خودنمائی بھی مانع ہوجاتی ہے ایک دفعہ اس سیہ کار کو معمولی سا بخار ہوا کسی جانے والے طالب علم سے حضرت نے خیریت دریافت کی۔ اس نے کہہ دیا بخار ہورہا ہے۔ حضرت اسی وقت اسی گاڑی سے تشریف لے آئے اور کچے گھر کے دروازے میں قدم رکھتے ہی یہ شعر پڑھا

تعاللت کی اشجی و مابک علته تریدین قتلی قد ظفرت بذلک

میں ایک دم حضرت کی آمد پر کھڑا ہوگیا۔ فرمایا اچھے خاصے ہو شور مچا رکھا ہے بخار کا۔ میں نے عرض کیا میں نے حضور کی خدمت میں کونسا تار یا ٹیلیفون کیا تھا کہ میں مر رہا ہوں۔ فرمایا ساری دنیا میں شور مچ گیا بخار کا، بخار والا یوں نہیں کھڑا ہوا کرتا۔ میں نے عرض کیا

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اور واقع ہوا بھی ایسا ہی، حضرت کی تشریف آوری کی برکت سے بخار جاتا رہا۔ ایک ادا حضرت مدنی قدس سرہٗ کی بڑی پسند آیا کرتی تھی۔ ایک ادا کیا ادائیں تو ہزاروں بلکہ لاکھوں اور ایک سے ایک بڑھ کر:

فدا ہو آپ کی کس کس ادا پر
ادائیں لاکھ اور بے تاب دل ایک

میں نے بارہا دیکھا کہ جب حضرت مدنی قدس سرہٗ کی آمد حضرت مرشدی سیدی قدس سرہٗ کی خدمت میں ایسے وقت ہوتی جب حضرت کا درس جاری ہوتا تو بہت خاموشی سے آکر قاری کے برابر بیٹھ جاتے نہ سلام نہ مصافحہ نہ ملاقات اور جب قاری حدیث ختم کرتا تو اس کو اشارہ سے روک کر خود حدیث کی قراءت شروع کردیتے۔ اس سے میرے حضرت کو حضرت مدنی کی آمد کا حال معلوم ہوجاتا اور سبق کے ختم پر سلام اور مصافحہ وغیرہ ہوا کرتا۔ اللہ جل شانہ اس سیہ کار کو بھی حسن ادب کی توفیق عطاء فرمائے۔ جب حضرت کراچی جیل سے تشریف لائے اس وقت کا منظر ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ حضرت مرشدی قدس سرہٗ مکان تشریف لے جارہے تھے اور حضرت مدنی اسٹیشن سے تشریف لا رہے تھے۔ مدرسہ قدیم کی مسجد کے دروازے پر آمنا سامنا ہوا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ حضرت مرشدی قدس سرہٗ کے ایک دم قدموں میں گر پڑے۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے جلدی سے پاؤں پیچھے کو ہٹا کر سینہ سے لگایا اور طرفین کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے بڑے بھائی حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کی شفقتیں تو اس سیہ کار پر اس وقت سے رہیں جب میری عمر ڈھائی برس تھی۔ جیسا کہ میں اپنی گنگوہ کی حاضری کی ابتداء میں لکھ چکا ہوں اور مدینے پاک سے اخیر زندگی تک روضہ اقدس کی خاک وغیرہ بھیجنے کا معمول اخیر تک رہا اور ۴۵ھ میں جبکہ اس سیہ کار کا قیام مدینہ پاک میں رہا اس وقت کی شفقتوں کا تو پوچھنا ہی کیا جس حجرہ میں میرا قیام تھا اس میں رطب اور جب رطب کا زمانہ نہ ہوتا تو ایک صندوق عمدہ کھجوروں کا ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ میں کھاتا اور بانٹتا اگلے دن صبح کو پھر پُر کردیا جاتا۔ ایک ڈبہ تازہ پنیر کا بھرا رہتا۔ ایک زیر زمزم شریف سے پر رہتی اور کیا کیا بتاؤں علی الصباح ایک مستقل براد (کیتلی) دودھ کی چائے جس میں مشک وعنبر خوب پڑا ہوتا میری قیام گاہ پر آجاتی۔ یہ تو لمبی داستانیں ہیں اس وقت تو ان کا ایک گرامی نامہ جو میرے والد صاحب کے انتقال پر تعزیت کے سلسلے میں آیا تھا۔ وہ اتفاق سے سامنے نظر پڑ گیا۔ اس کے لکھوانے کو میرا بھی جی چاہا۔ مستقل عنوان تو کوئی مولانا مرحوم کا ہے نہیں اور اگر لکھا جائے تو بہت طویل مضمون ہوجائے۔ لیکن اس خط کے نقل کرانے کو میرا بھی جی چاہا بڑے مزے کا ہے۔ اس لیے تبعاً حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے حالات ہی میں نقل کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے:

بسم اللہ!

عزیزم میاں مولوی محمد زکریا صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ

از جانب خاکسار سید احمد غفرلہ بعد اہدائے سلام آں کہ احقر بخیریت رہ کر صحت وعافیت تمہاری مع جملہ کچے بچے کا خواست گار ہے اگرچہ آپ مدرس ہوگئے ہیں ہم جیسے دور افتادہ کو کیوں خیال

میں لانے لگے۔ مگر اول تو اس عاجز کو آپ کے والد بزرگوار سے اور مرحوم کو اس نابکار سے کچھ ایسا تعلق مخلصانہ تھا۔ جس کی وجہ سے اگر آپ خدانخواستہ بے اعتنائی بھی برتو گے تو اینجانب علیہ الرحمۃ و الغفر ان ایسے نہیں ہیں کہ چپکے ہو کر بیٹھ رہیں الحاصل حافظ محمد یعقوب صاحب کے خط سے آپ کے والد ماجد صاحب مرحوم کا اس دار فانی کو چھوڑ کر دار جاودانی کی طرف منتقل ہونا معلوم ہو کر جو کچھ اثر قلب پژمردہ بلکہ مردہ پر ہوا ہے عالم الغیب ہی جانتا ہے۔ مگر عزیزم کیا کیا جائے۔ بجز انا للہ وانا الیہ راجعون کے چارہ نہیں۔ اسی پر صلوات من ربہم کا انعام ملنے کی توقع ہے۔ اب آپ کو چاہیے کہ ''سرلابیہ'' کا کرشمہ کر دکھاؤ۔ جیسے کہ اپنے کمالات علمی واخلاقی کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے تم بھی اپنے آپ کو ویسا ہی ثابت کرو:

ان الفتی من یقول ھا انا ذا لیس الفتی من یقول کان ابی

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں عرصہ ہوا ایک عریضہ ارسال کیا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد دوسرا عریضہ بھائی مقبول صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔ مگر تعجب ہے کہ آج تک کسی کا جواب نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں راستہ میں ضائع ہوا۔ آپ مہربانی کر کے دونوں حضرات و نیز جملہ واقفین کی خدمت میں مودبانہ سلام عرض کر دیں اور خصوصیت سے حضرت مولانا مدظلہم اور مولانا رائے پوری ظلہم کی خدمت اقدس میں زبانی یا بذریعہ تحریر اس عاجز کی طرف سے نہایت ادب سے سلام مسنون کے بعد دعائے فلاح دارین کی التجا کر دیں اور اگر ہمت کر کے دو چار پیسہ کا ٹکٹ خرچ کر کے اس عاجز کو مدینہ منورہ کے پتہ پر دو چار حرف خیر و عافیت وغیرہ کے لکھ بھیجیں تو آپ کی سعادت مندی سے بعید نہیں معلوم ہوتا۔ میاں الیاس کو بھی ایک خط لکھا ہے مگر وہ تو ہمیشہ کے سست درست اپنے مطلب میں چست ہیں۔ ہم جیسے نابکاروں کی دلداری کی کیا پرواہ کریں گے۔ مگر یاد رہے کہ خدانخواستہ یہ سراپا عصیان ہندوستان میں آ گیا تو ایسی خبر لے گا کہ وہ بھی یاد کریں گے اور اگر خدانخوستہ وہ مدینہ منورہ آ گئے تو پھر کیا پوچھنا۔ ہندوستان کا راستہ ہی نہ بھلا دیا تو کہنا۔ اب ایجانب رحمہ اللہ تعالیٰ عنقریب ملک شام کو طلاق مغلظہ دے کر دو چار روز میں مدینہ منورہ کو بھاگا چاہتے ہیں بس گویا کہ پابرکاب ہیں کیا عجب ہے کہ راستہ میں قدس شریف کی بھی زیارت سے شرف حاصل ہو۔ نہیں تو سوئز ہوتے ہوئے ینبوع میں جا کودیں گے اور پھر کیف خلقت پر سوار ہو کر منزل مقصود کی راہ لیں گے۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب مدظلہم کے واسطے ایک سماوار مولانا خلیل احمد صاحب مدظلہم نے خرید کر ارسال کرنے کے واسطے ارشاد فرمایا تھا۔ اپنی بدنصیبی کے اثر سے کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اب جا کر دیکھیں گے مل گیا تو روانگی کی فکر کریں گے۔ میاں زکریا یاد رکھو اگر میرے خط کا جواب نہ دیا تو میں روٹھ جاؤں

گا۔ پھر کتنا بھی مناؤ گے منوں ہی گا نہیں۔ بس اور زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔

اس کے بعد یہ عبارت بھی تھی جس کو مولانا مرحوم نے قلمزد کر دیا تھا "شکل اول کا نتیجہ ظہور پذیر ہوا ہوتو اس کو دعاء و پیار۔ نہیں تو موجب تاخیر کیا ہے۔ اینجانب علیہ الرحمتہ کے نتیجہ صاحب تو اپنی ماں کو بھی لے گئے اکیلے رہنا ہی گوارا نہیں ہوا اور طرفہ یہ کہ خود مدینہ میں اور اماں جان تبوک میں فقط۔

سید احمد غفرلہ ۲۶ جمادی الاولی ۳۷ھ:

حضرت مولانا کے والا نامے میں ساوار کے سلسلہ میں جو لفظ ہے کہ "کچھ کا کچھ ہو گیا" اس لفظ میں اشارہ اس حادثہ عظیمہ کی طرف ہے جب کہ مدینہ کے بالکلیہ انخلاء کا حکومت ترکیہ نے اپنے آخری دور میں حکم کیا تھا اور حضرت سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اڈریانوپل (شام) کی طرف منتقل کیے گئے تھے۔ اس کا مختصر حال حضرت مدنی قدس سرہٗ کی خودنوشت سوانح (نقش حیات) جلد اول ص ۴۰ پر ہے شام سے واپسی کے متعلق جو مولانا نے اس خط میں لکھا ہے وہ اسی طویل غیبت سے واپسی کا ذکر ہے اور جب ۳۸ھ میں اس ناکارہ کی پہلی حاضری حجاز مقدس ہوئی اس وقت مولانا سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نئے نئے واپس شدہ تھے۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب قدس سرہٗ کے مکاتیب کا بھی بڑا ہی ذخیرہ اس سیہ کار کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور جو ظرافت ومحبت کا نمونہ اوپر کے خط میں ہے اس کے نمونے بھی ان خطوط میں بہت ملیں گے۔ بالخصوص ۳۸ھ کے بعد سے وصال تک روز افزوں سلسلہ بڑھتا ہی رہا۔ ۴۶ھ کے بعد سے چونکہ مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مدرسہ شرعیہ کا حساب اور ہندوستان کا چندہ مدرسہ شرعیہ کی روئداد کا شائع ہونا بھی اسی سیہ کار سے متعلق ہو گیا تھا اس لیے کوئی ہفتہ بھی لمبے چوڑے خط سے خالی نہ جاتا تھا اور اس کے درمیان میں لطائف وظرائف اور محبت آمیز فقرے کثرت سے ہوتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد رشید الحاج عبدالحمید جو آج کل جدہ کے کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں ۴۵ھ میں میری مدینہ پاک سے واپسی کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ میں اور مولانا مرحوم خوب چاہتے رہے کہ میرے سامنے ہو جائے مگر مقدر نہ ہوا۔ میری مدینے سے روانگی کے کچھ دنوں بعد ہوئی تو حضرت مولانا مرحوم نے ایک پر ظرافت خط لکھا تھا کہ آپ کی روانگی کے بعد آپ کے عبدالحمید صاحب دولہا بن گئے ہیں چناں چنیں میں نے آپ کی طرف سے پانچ گنی (اشرفی) ان کے نکاح میں خرچ کر کے آپ کے حساب میں درج کر دی ہیں۔ میں نے بھی اس کے جواب میں ترکی بہ ترکی ان کو دولہا بنے ہوئے نہ دیکھنے کی حسرت اور شادی میں عدم شرکت پر قلق اور پانچ گنی کی قلت پر افسوس لکھ دیا اب تو میرا بہت ہی دل چاہ رہا ہے کہ حضرت مولانا سید احمد صاحب کی شفقتیں اور کچھ خطوط نقل

کراؤں مگر وقت نہیں ہے۔ جو چیزیں علیگڑھ میں لکھوا چکا ہوں وہی پوری ہو جائیں تو غنیمت ہے،

حضرت شاہ یٰسین صاحب نگینوی رحمۃ اللہ علیہ:

یکے از خلفاء قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہٗ جن کا مختصر ذکر یہ ناکارہ اپنے رسالہ فضائل درود کی ابتداء میں بھی لکھ چکا۔ مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں ان کا دستور ہمیشہ تشریف لانے کا تھا اور جلسہ کے بعد ہفتہ عشرہ اس سیہ کار کے پاس قیام ہوتا۔ صورت سے بزرگی ٹپکتی تھی۔ بہت ہی شفقت فرماتے تھے۔ بہت ہی اہتمام سے اس سیہ کار کے سبق میں تشریف لے جاتے اور بہت ہی انتہائی ادب سے کَأَنَّ عَلٰی رُؤُسِهِمُ الطَّیْر کا مصداق بنے ہوئے نیچی نگاہ کیے ہوئے ایسے تشریف رکھتے کہ مجھے ان کی نشست پر بڑا رشک آتا تھا۔ میرے اصرار پر میرے قریب ہی تشریف فرما ہوتے۔ شفقتیں تو بہت یاد ہیں مجھے اس وقت ان کی ایک کرامت یاد آ گئی۔ اسی کی وجہ سے ان کا نام نامی لکھوایا ہے میری عادات سیہ میں ایک بری عادت یہ بھی تھی کہ جب سبق میں جاتا تو ڈبیہ بٹوہ میرے ساتھ ہوتا اور اگالدان کی بجائے مٹی کا لوٹا مستقل دارالحدیث میں رہتا اور سبق کے دوران میں پان بھی کھاتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا کہ میں پان کھانے کو تو منع نہیں کرتا۔ آپ سبق کے درمیان میں نہ کھایا کریں۔ اس دن سے تقریباً بیالیس سال ہوئے مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں سبق میں ڈبیہ لے کر گیا ہوں یا سبق کے درمیان میں پان کھایا ہو سبق میں باوضو ہونے کا اہتمام تو ہمیشہ رہا مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ حدیث پاک کا سبق کبھی بے وضو پڑھایا ہو لیکن شاہ صاحب کے اس ارشاد کے بعد سے سبق کو جاتے ہوئے ہمیشہ بہت اہتمام سے کلی کر کے جاتے تھا اور اس پر ہمیشہ قلق رہا کہ شاہ صاحب نے یوں کیوں فرمایا کہ پان کھانے کو تو منع نہیں کرتا۔ کاش یہ بھی فرما دیتے کہ پان نہ کھایا کرو تو ان کی برکت سے اس مصیبت عظمٰی سے نجات مل جاتی یہ میں ہر دو رسائل بالا کے درمیان میں لکھ چکا ہوں کہ میرے فضائل کی ابتدائی تالیفات میں فضائل قرآن ہے اور آخر میں فضائل درود اور یہ دونوں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے تعمیل ارشاد میں لکھی گئیں۔ کہ فضائل قرآن ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ میں ختم ہوئی اور فضائل درود ۶ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ کو ختم ہوئی۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے اجل خلفاء شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی دعاء جو کو مرحوم کے قول کے موافق بار بار تاکید کی معلوم ہوا کہ انتقال کے وقت اس کی بڑی تاکید فرمائی کہ میرے بعد زکریا سے تعلقات رکھیں۔

حضرت اقدس رائے پوری ثانی حضرت الحاج مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ و برد مضجعہ کی خدمت میں اس سیہ کار کی حاضری بہت قدیم اور حضرت کا دور بھی حضرت اقدس مدنی کی طرح سے خوب پایا۔ میری حاضری سہارنپور کی رجب ۲۸ھ میں ہے جیسا کہ کئی جگہ لکھا جا چکا

ہے۔اس سے پہلے گنگوہ کے قیام میں ایک مرتبہ اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ رائے پور کی حاضری خوب یاد ہے۔ اعلیٰ حضرت کا دور تھا۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ کو اس وقت کا پہچاننا تو یاد نہیں اور حضرت کی کوئی امتیازی حالت بھی اس وقت کچھ نہ تھی اتنا یاد ہے کہ اعلیٰ حضرتؒ نے اپنے ایک خادم سے جو کثرت سے حجرہ شریف میں آتے جاتے تھے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ مولوی صاحب! جو مٹھائی وغیرہ اندر رکھی ہے وہ سب صاحبزادے صاحب کو دے دو جیسا کہ اعلیٰ حضرت کے حال میں گزر چکا۔ اس کے بعد سے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے وصال تک تو کوئی امتیازی تعارف مجھے اپنے سیدی ومولائی حضرت رائے پوری ثانی سے نہیں ہوا۔ البتہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ مجھے بحیثیت صاحبزادہ خوب پہچانتے تھے اور چونکہ اعلیٰ حضرت کا کاتب بھی اس زمانے میں ایک نہیں تھا۔ عام ڈاک تو ملا جی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (جناب ملا عبدالعزیز صاحب والد ماجد حافظ عبدالرشید صاحب) لکھا کرتے تھے۔ اس واسطے خطوط میں بھی کوئی تعیین نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس سیہ کار کو تو یاد نہیں لیکن حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے اللہ ہی مجھے معاف فرمادے کئی دفعہ مجھ سے فرمایا کہ آپ کو وہ زمانہ یاد نہیں جب آپ ہم سے پاؤں دبوایا کرتے تھے۔ اللہ ہی معاف فرمادے معلوم نہیں کہ یہ لفظ نقل کرانے کا بھی ہے یا نہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب یہ سیہ کار اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد رائے پور حاضر ہوتا تو کنویں کے قریب جو بنگلہ ہے اس کے سامنے بے حیائی سے چارپائی پر پڑ جاتا اور اعلیٰ حضرت کے بہت سے مخلص خدام اعلیٰ حضرت کی شفقت دیکھ کر مجھے سب لپٹ جاتے ممکن ہے کہ حضرت اقدس رائے پوری بھی اس وقت ان لوگوں میں ہوں۔ مگر میں ان کو خاص طور سے نہیں پہچانتا تھا۔ میرا تعارف حضرت رائے پوری ثانی سے اعلیٰ حضرت کے وصال کے بعد سے شروع ہوا۔ جب کہ تین چار برس تک حضرت رائے پوری ثانی اپنے مکان سے تشریف لاکر مہینہ دو مہینہ یہاں قیام فرماتے اس زمانے میں آتے جاتے سہارنپور بھی قیام فرماتے۔ اس کے بعد سے جو تعلق بڑھنا شروع ہوا تو اخیر دور کے دیکھنے والے اب تک ہزاروں موجود ہیں اور ۴۵ھ میں جب یہ ناکارہ یک سالہ قیام کے لیے مدینہ پاک بذل المجہود کے سلسلے میں حاضر ہوا اور ماہ رجب میں حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ بھی مدینہ تشریف لے گئے تو کئی مرتبہ سفر میں بھی اور سفر کے بعد بھی یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ معاف کرے کہ میں حج کی یا حضرت مدظلہ کی زیارت کے لیے نہیں آیا بلکہ تمھاری محبت کھینچ کر لائی ہے۔ آٹھ ماہ سے تمھاری زیارت نہیں ہوئی اس نے بےچین کر رکھا ہے۔ یہ حضرت رائے پوری کا دوسرا سفر حج تھا۔ پہلا سفر حج ۲۸ھ میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ساتھ ہوا۔ اس سفر کے واقعات بھی بہت ہی عجیب اور اہم ہیں اور حضرت اقدس رائے پوری کے واقعات تو کہاں

تک لکھواسکوں اس سفر کے واقعات اس سیہ کار کے حجوں کی تفصیل میں آرہے ہیں۔لیکن اس حج کے بعد سے حضرت قدس سرہٗ کی محبت اور شفقت میں بہت ہی اضافہ ہوگیا اور چونکہ اس سفر کے اخیر میں یعنی ذیقعدہ ۴۵ھ میں حضرت اقدس نے اس سیہ کار کو اجازت بیعت بھی فرمادی تھی۔اس لیے حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی محبت میں المضاعف اضافہ ہوگیا۔اس سیہ کار نے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے پاؤں پکڑے تھے کہ اللہ کے واسطے اجازت کی خبر ہندوستان میں نہ کریں۔حضرت نے فرمایا ضرور کروں گا اور وہیں سے لوگوں کو خطوط لکھنے شروع کردیے اور یہاں آکر خوب شور مچایا:

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار گل چیں بہار تو زداماں گلہ وارد

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ اور ان ہی کی اتباع میں حضرت رائے پوری قدس سرہٗ دلداری کے تو پتلے تھے۔جب کہیں تشریف لے جاتے کبھی موعودہ وقت پر واپس تشریف نہیں لاتے تھے۔چاہے کتنا ہی پختہ وعدہ ہو۔مگر جب لوگوں نے خوشامد درآمد کی تو ملتوی فرمادیا۔حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کو چچا جان سے ملنے کا اور چچا جان کو حضرت سے ملنے کا بہت ہی اشتیاق رہتا تھا۔ہر ایک یوں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ملاقات ہو۔ایک دفعہ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ رائے پور سے تشریف لائے دہر دو دن جانا تھا۔میں نے عرض کیا کہ چچا جان کا والا نامہ بھی آیا ہے۔انھوں نے حضرت کا نظام سفر اور قیام پوچھا ہے فرمایا واہ واہ۔میرا بھی ملنے کو حضرت دہلوی سے بہت ہی دل چاہ رہا تھا۔آپ تکلیف فرما کر ان کو یہ لکھ دیں کہ فلاں دن تشریف لاویں۔چار دن کے وقفہ سے حضرت نے ان کا دن متعین کردیا۔میں نے کہا کہ میں تو نہیں لکھوں گا۔مولوی عبدالمنان لکھ دیں گے۔فرمایا کہ نہیں حضرت! آپ اتنی بدگمانی نہ کریں میں ضرور آؤں گا۔میں نے کہا کہ میں ہرگز نہیں لکھوں گا۔آخر مولوی عبدالمنان تو آپ کے کاتب ہیں۔فرمایا کہ نہیں حضرت ہی لکھیں گے میں نے عرض کیا کہ میں ہرگز نہیں لکھوں گا۔فرمانے لگے کہ حضرت ہی سے لکھواؤں گا اور آپ کو دکھلادوں گا۔کہ میں وعدہ پختہ کرنا بھی جانتا ہوں جب حضرت نے حکماً فرمایا تو میں نے لکھ دیا اور ساری بات بھی لکھ دی۔اتفاق کی بات کہ چچا جان بھی اس تاریخ کو نہ آسکے اور حضرت قدس سرہٗ بھی وعدہ کے دن سے تیسرے دن تشریف لائے اور آتے ہی دروازے سے مصافحہ سے پہلے فرمایا کہ حضرت آپ نے نہیں آنے دیا۔بالکل آپ نے نہیں آنے دیا۔ہوا یہ کہ سب ہی نے اصرار کیا اور میں نے کہا کہ مجھے اب کے حضرت کو اپنے وعدہ کا سچا ہونا بتلانا ہے۔سب ہی نے اصرار کیا خاص طور سے ڈاکٹر محمد امیر صاحب اور مستری صاحب نے تو بہت ہی زور لگائے۔مگر میں مانا نہیں۔لیکن چلنے کے بعد سے جو بارش شروع ہوئی لوگوں نے پھر بھی اصرار کیا مگر میں نے مانا

نہیں۔لیکن بارش اتنے زور کی ہوئی کہ پانچ میل پر آ کر انجن فیل ہوگیا۔نہ ادھر کے رہے اور نہ ادھر کے۔بہت دیر ہوگئی مغرب کا وقت ہوگیا۔مجبوراً یہاں سے جانے والی لاری میں بڑی مشکل سے میں اور دو آدمی سوار ہوئے اور بقیہ دوسری لاری میں واپس گئے۔ایسا تصرف نہیں کیا کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت توبہ توبہ بھلا میں تصرف حضرت پر کروں گا۔اگر ہوگا تو ڈاکٹر صاحب کا ہوگا۔حضرت قدس سرہٗ کی یہ بھی بہت ہی خواہش رہا کرتی تھی کہ میں اسفار میں حضرت کے ساتھ چلوں۔شروع شروع میں بہت ہی اصرار فرمایا مگر مجھ پر اس زمانہ میں طالب علمی کا غلبۂ حال تھا اب وہ دور یاد آ کر بڑی ندامت ہوتی ہے کہ حضرت نے بڑی محبت شفقت اور اصرار سے ہمرکاب چلنے کا اصرار فرمایا اور میں نے حرج کا عذر کر دیا۔اس کے باوجود حضرت کے ساتھ متعدد اسفار بھی ہوئے۔ ہر سفر میں اہم واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ایک دفعہ ریل کا سفر ہوا۔ یہاں سے مرادآباد اور وہاں سے بریلی تشریف لے جانا ہوا۔ہر جگہ حضرت قدس سرہٗ تو اس کی کوشش فرماتے کہ لوگوں کا اس سیہ کار سے زیادہ سے زیادہ تعارف ہو۔حضرت تخلیہ میں تشریف لے جاتے اور میزبانوں سے کہتے کہ لوگوں کی ان سے ملاقات کراؤ۔حضرت قدس سرہٗ کی بہت ہی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تعلق پیدا کریں اور مجھے اس قدر وحشت ہوتی کہ میں اپنی کوئی کتاب لے کر نقل کی یا تالیف کی دوسرے کمرے میں بیٹھ کر اندر کے کواڑ لگا لیتا اللہ ہی معاف فرمادے۔حضرت کی شفقت اب ندامت ہوتی ہے۔حضرت اقدس نوراللہ مرقدہٗ کو ہمیشہ یہ شوق رہا کہ میرے بدن پر اچھا کپڑا دیکھیں بار بار اس کا اظہار بھی فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھوں۔مگر جیسا کہ یہ ناکارہ آپ بیتی نمبر۱ میں لکھ چکا ہے کہ ابا جان کے ان جوتوں کی بدولت جو ابتداءِ عمر میں بجائے پاؤں کے سر پر پڑ چکے تھے۔واقعی مجھے اچھے کپڑے سے نفرت ہوگئی۔اس لیے حضرت جب کوئی اچھا کپڑا مرحمت فرماتے تو میں بچیوں یا دامادوں میں سے کسی کو دے دیتا۔ایک مرتبہ حضرت نوراللہ مرقدہٗ نے میری لاعلمی میں میرا ایک جوڑا حافظ صدیق سے منگایا جو میرے کپڑوں وغیرہ کے منتظم ہیں اور اس کے مطابق ایک بہت خوبصورت جوڑا سلوا کر بھیجا جس کو میں نے بہت ہی احترام سے پہنا۔یہ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ میری بچیوں کے سارے لحاف حضرت قدس سرہٗ کے عطاء فرمودہ ہیں دو لاکھ مرغوں کا قصہ یاد نہیں کہ پہلے لکھوایا یا نہیں وہ تو دوبارہ لکھوا رہا ہوں۔اس سلسلہ میں بھی میں اکثر مرغا یا مرغی آتی تو میں اپنے دوستوں میں سے کسی کو دے دیتا۔حضرت کو بھی کسی طرح اس کا علم ہوگیا تو حضرت نوراللہ مرقدہٗ کا معمول یہ بن گیا تھا کہ جب کوئی مرغا لائے تو اس سے یہ فرمادیتے کہ سالم نہ دینا، مولوی نصیر کی ٹال میں ذبح کر کے پھر دینا۔ان مرغوں کا قصہ یاد پڑتا ہے کہ کہیں پہلے لکھوا چکا ہوں۔

۴۵ھ کے سفرِ حج سے واپسی پر حضرت قدس سرہٗ بھی ساتھ تھے۔ تین چار اونٹ حضرت کے اور حضرت کے رفقاء کے اور تین چار ہی میرے اور میرے ساتھیوں کے۔ قافلہ تو سارا اکٹھا ہی رہتا۔ مگر مکہ مکرمہ سے جدہ آتے جاتے وقت حدیبیہ کی منزل میں رات کا وقت ہو گیا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ قافلے تو دونوں بالکل برابر، مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ صبح کو آپس میں ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ حضرت کے خدام نے تو حضرت کے لیے دو چوزے خرید لیے تھے اور ہمارے رفقاء کو کچھ ملا نہیں، تو کھچڑی پکائی۔ حضرت کو یہ معلوم ہوا تو بہت ہی قلق ہوا اور اس گستاخ نے بھی تفریحاً یہ کہہ دیا کہ اکیلے اکیلے آپ نے یہ مزے اُڑائے۔ حضرت قدس سرہٗ نے ازراہِ شفقت فرمایا کہ جدہ جا کے اس کی قضا کروں گا میں نے کہا کہ حرم کی ایک نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے۔ حضرت نے فرمایا انشاء اللہ ہندوستان جا کر دو لاکھ مرغیاں کھلانی ہیں۔ کراچی پہنچنے کے بعد حضرت نے انبالہ تک خدام کو خطوط لکھوائے۔ اس میں یہ بھی لکھوایا کہ میرا خیال تو راستہ میں تم دوستوں سے ملتے ہوئے جانے کا تھا۔ مگر چونکہ شیخ الحدیث صاحب ساتھ ہیں اس لیے اب تو سیدھے جانا ہے بعد میں آؤں گا۔ لیکن میرے ذمے حضرت شیخ کی دو لاکھ مرغیاں قرض ہیں۔ فلاں گاڑی سے فلاں اسٹیشن پہنچوں گا۔ ایک دو مرغیاں پکا کر لیتے آنا۔ کراچی سے سہارنپور تک ہر اسٹیشن پر چار پانچ بلکہ کہیں دس بارہ تک ملتی رہیں۔ اس کے بعد سے اس ناکارہ کی مرغ خوری نے ایسی شہرت پائی کہ گویا مرغا ہی میری غذا بن گیا۔

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے بہت سے واقعات پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ چونکہ ترتیب تو ذہن میں نہ تھی اس لیے بہت سے قصے مکرر بھی ہو گئے۔ حضرت قدس سرہٗ کی بیماری اور انتقال حوادث کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ بیماری کے زمانہ میں حضرت کا اصرار اور خواہش یہ رہتی تھی کہ یہ ناکارہ مستقل حضرت کی خدمت میں قیام کرے۔ یہ بھی درحقیقت اپنے شیخ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا اتباع اور اثر تھا۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو اپنے طویل مرض میں جو انتقال سے کئی سال پہلے شروع ہو گیا تھا بہت ہی خواہش اور اصرار تھا کہ میرے والد صاحب ہر وقت پاس رہیں، مگر ان کو اسباق وغیرہ کی مجبوری تھی، اسی کے اتباع میں حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی بھی یہی خواہش رہتی کہ یہ سیہ کار بیماری کے زمانے میں حضرت کے پاس رہے۔ بار بار تقاضے اور اصرار منصوری سے جب مرض کی ابتداء ہوئی تو تار اور آدمی بار بار پہنچے۔ مگر نابکار کو:

"خوئے بدرا بہانہ بسیار"

علاوہ مدرسہ کے اسباق کے اپنی تالیف کا مسئلہ بھی سدراہ ہوتا تھا۔ مگر اعذار میں بیان تو نہیں کرتا تھا۔ آخری سال رجب کا مہینہ اور مجھ پر بخاری شریف کے ختم کا بوجھ، میں نے اجازت چاہی۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ بخاری شریف تو پڑھاؤ گے، ہم کہاں رہیں گے۔ کیا کہوں خبر نہیں، اس وقت کچھ علمی غلو ایسا سوار تھا کہ حضرت کی ان شفقتوں کو اب دیکھ کر رونا آتا ہے۔ بارہا اس کی بھی نوبت آئی کہ میں بلا اطلاع حاضر ہوا اور حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے بلا کسی تحریک کے یہ فرمایا کہ بھائی شیخ آرہے ہوں گے خیال رکھنا۔ مجھے وہاں پہنچ کر یہ بات معلوم ہوتی تھی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی اس آخری بیماری کے زمانے میں سواری منگانے کی پابندی چھوڑ دی تھی، اس لیے کہ کثرت سے حاضری ہوتی تھی اور حضرت کو علم ہوجانے پر حضرت پر کہیں سے کار مہیا کرنے کا بوجھ ہوجاتا تھا اور پٹری پر رکشہ کے لیے کوئی پابندی نہ تھی۔ بہٹ میں ایک نوعمر لڑکا تھا، رکشہ چلاتا تھا، نام اس وقت یاد نہیں۔ اللہ اس کو بہت ہی جزائے خیر دے، بہٹ پر میرا انتظار کرتا تھا۔ میں لاری سے اُترتے ہی رکشہ پر سوار ہوکر رائے پور بیس پچیس منٹ میں پہنچ جاتا تھا اور واپسی کے لیے اس کو وقت بتادیتا۔ وہ بسا اوقات صبح کی اذان کے وقت سردی میں رکشہ لے کر جاتا تھا، جس پر مجھے بہت ہی ترس آتا تھا۔ واپسی میں حضرت کو کار کا بہت اہتمام تھا۔ اگر پاکستانی احباب میں سے کوئی موجود ہوتا تو حضرت سے زیادہ ان لوگوں کا اصرار ہوتا کہ ہم پہنچا کر آئیں گے۔

پاکستانی کاریں ماشاء اللہ کیا کہنا۔ بالخصوص بھائی اکرام کی کاریں کئی دفعہ مجھے یہ دیکھنا پڑا کہ یہ چل رہی ہے یا کھڑی ہے۔ ذرا حرکت معلوم نہ ہوتی تھی اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے حجرے سے لے کر کچے گھر کے دروازے تک صرف بائیس منٹ میں پہنچتی تھی۔ عزیزم الحاج ابوالحسن صدیقی اس وقت میرے پاس ہے جو بارہا اس قسم کی گاڑیوں میں میرے ساتھ آیا ہے اور عرصہ سے مستقل میرا رفیق سفر ہے۔ بالخصوص رائے پور کے سفر کا تو مستقل رفیق۔ وہ کہتا ہے کہ اس کار میں آٹومیٹک گیئر تھے، اس کو ہم سمجھتے نہیں وہی سمجھتا ہے، میں تو ان گاڑیوں کی ہمیشہ دوادائوں پر کہ حرکت بالکل نہیں اور بائیس منٹ میں اس دروازے سے اس دروازے تک پہنچنا حیرت میں رہتا تھا۔ وہ احباب ہمیشہ مجھے میرے دروازے پر اُتار کر اور جب ہی واپس جاتے اور وہاں کی چائے میں شریک ہوجاتے۔ پاکستان کے سفروں میں بھی ان کاروں سے بہت سابقہ پڑا۔ یہ داستان شروع ہوگئی، بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔

اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانے میں ہمیں پیسہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ مجال ہے کہ اعلیٰ حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خدام یا والد صاحب کے دوستوں میں سے مجھے کوئی پیسہ دے دے۔ ان کی اتنی پٹائی ہوتی تھی کہ اس کے ڈر کی وجہ سے پیسہ کی جنت سے پٹائی کی دوزخ سامنے آجاتی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ مجھے اپنے والد رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب کے انتقال کے بعد کسی شخص کا ہدیہ جو بزرگی کی لائن سے دیتا تھا اس سے اس قدر نفرت تھی کہ کوئی حدوحساب

نہیں۔ البتہ گھر کے رشتہ دار مستثنیٰ تھے۔ جن کے متعلق اپنے کسی رسالہ میں لکھوا بھی چکا ہوں کہ میرے والد صاحب کی حقیقی خالہ جب بھی میں کاندھلہ جاتا تو دو پیسے دیا کرتی تھیں اور جب کبھی ان کے پاس پیسے نہ ہوتے اور معذرت کرتیں تو میں ان کی خدمت میں ایک روپیہ پیش کرتا تھا اور اپنے دو پیسے لیا کرتا تھا مگر دوسری لائن سے پیسہ لینے سے مجھے اس قدر نفرت تھی کہ اللہ ہی مجھے معاف فرمائے۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم تو محض اپنے فضل و کرم سے مجھے معاف فرما اور جن مخلصوں کو میری اس حرکت سے اذیت پہنچی ہو ان کو اپنی شایان شان بہتر سے بہتر بدلہ عطاء فرما۔ بعض ہدیہ دینے والوں کے نوٹ ایک، دو، پانچ، دس کے پھاڑے بھی ہیں۔ جب میں انکار کرتا اور وہ اصرار کرتے تو اپنی حماقت سے نوٹ لے کر اس کو پھاڑ دیتا تھا۔ مگر قاعدہ یہ کہ ہر گناہ ابتداء میں بڑا گراں ہوتا ہے۔ مگر جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ اب تو احساس بھی نہیں ہوتا۔

میرے مخلص دوستوں میں سے ایک دوست حاجی جان محمد صاحب پشاوری تھے جو آج کل پاکستان میں جا کر پاسپورٹ کی گڑ بڑ کی وجہ سے وہیں پھنس گئے۔ وہ ابتداء میں بہت ہی ہدایا لایا کرتے تھے اور میری خوب لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اس وقت جو قصہ لکھوانا چاہتا تھا اور یہ سب اسی کی تمہید تھی۔ وہ یہ کہ:

ایک مرتبہ میرے حضرت رائے پوری اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہما عصر کے بعد کچے گھر میں چبوترے پر تشریف فرما تھے اور میں اپنی چار پائی پر۔ مجمع اس وقت زائد نہیں آیا تھا، دو ایک آدمی آچکے تھے۔ حاجی جان محمد صاحب اللہ ان کو بہت ہی خوش رکھے اور ان کے احسانات کا بہت ہی بدلہ عطاء فرمائے۔ ایک چائے کا ڈبہ لائے۔ مجھ پر حماقت سوار ہوئی، میں نے اس کو پھاڑ کر زور سے دیوار پر دے مارا۔ وہ ساری چائے دُور دُور تک منتشر ہوگئی۔ میرے دونوں بزرگوں کو بہت ناگوار ہوا، جس کا مجھے بھی احساس ہوا، میرے حضرت اقدس رائے پوری تو بالکل ساکت و صامت دس پندرہ منٹ تک بیٹھے رہے۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے چار پانچ منٹ کے بعد ناگواری کے لہجے میں فرمایا کہ یوں ناک مار کر کھانا ہمیں نہیں آیا۔ حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے ہدایا تو لاتعد و لاتحصیٰ شروع میں تو یہ کہہ کر انکار کرتا تھا کہ حضرت یہاں بھی خدام بہت ہیں۔ حضرت ان کو مرحمت فرمادیں۔ ایک مرتبہ ناگواری کے تیز لہجہ میں حضرت نے فرمایا کہ انکار نہ کیا کرو، میں خود نہیں دیتا۔ اس کے بعد سے نہ صرف حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی عطایا اور ہدایا میں ڈھیلا پن ہوا بلکہ اور دوسرے ہدایا میں بھی ڈھیلا پن ہوگیا۔

مشائخ سلوک کا بھی ایک مقولہ نظر سے بارہا گزرا کہ بے طلب کسی چیز کے آنے پر اگر کوئی انکار کرے تو طلب پر بھی نہیں ملتی۔ اس کو فضائل صدقات حصہ دوم فصل ششم کی حدیث نمبر۴ کے ذیل

میں آداب ہدیہ میں لکھ چکا ہوں۔مگر اس کے ساتھ جب امام غزالی کے ارشادات سامنے آتے ہیں اور مشائخ کے ارشادات بھی کہ اشراف نفس نہ ہو، دینے والا مخلص ہو تو پھر ڈر لگنے لگتا ہے۔حضرت اقدس رائے پوری کے واقعات تو اتنے اُونچے ہیں کہ مجھے لکھوانے سے بھی ڈر لگتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے رائے پور میں ارشاد فرمایا کہ میرا جی یوں چاہتا ہے کہ تو مجھے اجازت بیعت دے دے تاکہ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی نسبت سے بھی مجھے کچھ مل جائے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر دست بوسی کے بعد عرض کیا کہ حضرت توبہ توبہ ایسی بات فرمائیں۔حضرت مولانا احمد الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ اجازت نہیں دیتے تو آپ ان کو اجازت دے دیں تاکہ ان کے سلسلے میں آپ کی شرکت ہو۔حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا میری طرف سے تو بڑی خوشی سے اجازت ہے۔اللہ تعالیٰ مولانا احمد الدین صاحب کو بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ بڑے ہی مخلص تھے۔ یہ سیہ کار پہلے لکھوا چکا ہے کہ جب حضرت مرشدی قدس سرہٗ نے اس ناکارہ کو اجازت مرحمت فرمائی تو حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ وہاں ہی موجود تھے۔ میں نے حضرت کے پاؤں پکڑے تھے کہ اللہ کے واسطے اظہار نہ فرمائیں اور یہ کوئی تصنع نہ تھا۔اللہ کی قسم مجھے اب تک شرح صدر نہیں ہے کیونکہ میری حالت واقعی اس قابل نہیں ہے۔مگر حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی جواب دہی کے ڈر سے اب تک بیعت کر رہا ہوں۔

میں نے ابتداء میں بہت انکار کیا مگر ایک مرتبہ کاندھلہ جانے پر وہاں کی مستورات چچا جان کے سر ہوگئیں کہ آپ حکماً اس سے بیعت کرادیں میں مسجد میں تھا اور چچا جان گھر میں تشریف فرما تھے مجھے آدمی بھیج کر بلایا یہ چچا جان کے حالات میں آئے گا کہ وہ بعض مرتبہ چچا جان ہونے کا حق ادا کرنے کے واسطے ضرورت سے زیادہ ڈانٹ دیتے تھے۔ جب میں گھر پہنچا تو چچا جان نے ایسا غصہ کا منہ بنا رکھا تھا، فرضی غصہ میں چہرہ لال تھا۔مستورات کو سب کو کوٹھے میں جمع کر رکھا تھا اور اس کے برابر کی چارپائی خالی چھوڑ رکھی تھی اور خود دوسری چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔اپنے سر مبارک پر سے عمامہ اتارا۔اس کا ایک کونہ میرے ہاتھ میں پکڑایا اور دوسرا دروازے میں ان عورتوں کو پکڑا دیا اور نہایت غصہ میں فرمایا کہ ان کو بیعت کر میں نے کچھ اوں آں کرنی چاہی ایک ڈانٹ پلائی بیعت کر۔یہ اس سیہ کار کی بیعت کرنے کی ابتدا ہے۔

یہ بیعت علی منہاج النبوۃ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بھی سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بیعت اسلام کی۔حضرت اقدس قطب عالم مولانا گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے دستِ مبارک پر بھی گنگوہ میں سب سے پہلے ایک عورت اعلیٰ حضرت حاجی صاحب نور

اللہ مرقدہٗ کے حکم سے بیعت ہوئی تھی۔ حضرت اقدس مدظلہم کی نسبت بھی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی نسبت کا عکس ہے کہ جملہ امور تصوف مع مشاغل علمیہ خدمت حدیث تعلیماً وتصنیفاً ظاہر باہر ہے۔

اس کے بعد حضرت اقدس مدنی اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہما سے بارہا اجازت چاہی اور بلا مبالغہ ایک سے زائد مرتبہ ہر ایک کی خوشامد کی ہوگی۔ کہ بیعت نہ کرنے کی اجازت دے دیں میرے حضرت اقدس مدنی کا ایک جواب تھا کہ اپنے کو اہل سمجھتا ہی کون ہے اور حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا جواب اس سے زیادہ سخت ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے پاکستان بہت ہی زوردار اور شدت سے لکھا کہ میری حالت بہت ہی ابتر اور خراب ہوتی جارہی ہے۔ حضرت بیعت نہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی ڈانٹ کا خط آیا جو میرے خطوط کے خزانے میں محفوظ ہے۔ عزیز جلیل کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ حضرت نے لکھا تھا کہ اعلیٰ حضرت سہارنپوری نے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت دی اور حضرت دہلوی (یعنی میرے چچا جان) نے حکماً آپ سے بیعت کی ابتدا کرائی۔ میں اور حضرت مدنی بار بار آپ سے تقاضہ کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ کے اطمینان کے لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام تو اترنے سے رہے۔ یا اللہ یا اللہ یا اللہ تو ہی ان بزرگوں کے حسنِ ظن کی لاج رکھئے یہ میں نے پہلے بھی لکھوایا کہ یہ واقعات مولوی یونس کی زبردستی سے لکھوادیے ورنہ حضرت اقدس رائے پوری کے ارشادات تو واقعی اتنے اونچے ہیں کہ میری نقل کرانے کی ہمت نہیں ہے۔

میرے والد ماجد صاحب نور اللہ مرقدہٗ:

مجھے ان سب اکابر کی نہ تو سوانح لکھنی ہے اور نہ ان چند اوراق میں یہ دریا نقل کیے جاسکتے ہیں۔ کچھ خصوصیات اپنے ساتھ کے تعلقات کی نمونۃً اشارہ کرنی تھی وہ بھی تحدیث بالنعمہ کے طور پر۔

میرے والد صاحب قدس سرہٗ پیدائش سے ہی بہت ذکی الحس تھے ان کے کچھ حالات تذکرۃ الخلیل میں بھی آچکے ہیں۔ میں نے ان کی زبانی بھی یہ روایت کئی مرتبہ سنی جو انہوں نے اپنی والدہ (میری دادی) سے نقل کی فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ کے دودھ نہ تھا اس لیے مجھے دایہ نے دودھ پلایا لیکن اگر روزانہ غسل کرکے اور خوشبو لگا کر دودھ نہ پلاتی تو میں دودھ نہ پیا کرتا تھا۔ دو برس کی عمر میں جب دودھ چھٹا تو اس وقت پاؤ پارہ حفظ تھا اور سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر چکے تھے۔ جس میں اپنی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں۔ میری ابتدائی عمر میں میرے سب بڑوں کا دستور یہ تھا کہ کوئی شخص اپنے والدین یا اپنے کسی بڑے کے سامنے گود میں لینا تو درکنار اس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

میری پیدائش کے ساتویں دن وہ دوپہر کے وقت میں رمضان کا مہینہ سب سو رہے تھے میری

والدہ کی نانی کے مکان پر جہاں میں پیدا ہوا تھا تشریف لائے۔ میری والدہ کی نانی کو مجھ سے بہت ہی محبت تھی۔ انہوں نے میرے عقیقے کے لیے سنا ہے کہ بہت تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔ سارے محلے اور برادری اور دور دور تک اقرباء کو دعوت دینے کا ارادہ تھا اور تاریخ مقرر کرنے کے مشورے ہو رہے تھے وہ ساتویں دن میری والدہ کی نانی کے مکان پر آئے، گھر میں ایک عورت تھی اس کو آواز دے کر فرمایا کہ ذرا بچے کو دروازے میں لے آ میری والدہ کی نانی نے خیال کیا کہ پدری محبت نے جوش کیا بچے کو دیکھنے کو جی چاہ رہا ہوگا۔ انہوں نے ایک نہالچے پر جس پر میں پڑا ہوا تھا عورت کے ہاتھ دروازے میں بھیج دیا۔ والد صاحب نائی کو ساتھ لائے تھے میرے بال کٹوا کر ان کو ایک پڑیا میں لپیٹ کر اس عورت کے ہاتھ گھر بھیج دیے کہ بال تو میں نے کٹوا دیے بکرے تم کٹوا دو اور ان بالوں کے بقدر چاندی صدقہ کر دو میری نانی کو بہت صدمہ ہوا کہ ساری امنگیں اور حوصلے خاک میں مل گئے۔ اس کے بعد میں آپ بیتی نمبرا میں اپنی مار پٹائی کے قصے خوب لکھ چکا ہوں کہ اگر میرے مارتے مارتے تو مر جائے گا تو تُو شہید ہوگا اور مجھے ثواب ملے گا۔ بہت سے دیکھنے والوں کو اکثر یہ خیال آتا تھا کہ میں ان کا لڑکا نہیں بلکہ اپنی والدہ سے کسی پہلے خاوند کا ہوں۔ حالانکہ میری والدہ کا نکاح ابتداءً پہلا ہی میرے والد سے ہوا تھا۔ البتہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا پہلا نکاح میری حقیقی خالہ مرحومہ سے ہوا جو میری والدہ کی بڑی حقیقی بہن تھیں۔ ان کے بعد میری والدہ سے جلد ہی ہو گیا تھا۔

یہ تو مجھ سے بھی والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کئی مرتبہ فرمایا کہ تیری خالہ کے انتقال کے بعد اس کے حسنِ صورت، حسنِ سیرت کی وجہ سے تیری والدہ کے لیے بہت ہی دعائیں کیں اور بڑی ہی کوششوں سے تیری والدہ سے نکاح ہوا اور اس کے بعد اولاد سے محبت تو فطری ہوتی ہے۔ مگر اس سیہ کار کے ساتھ ان کی محبت تادیب میں مستور ہوگئی تھی۔ یہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد پر عمل تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے "**ما نحل والد ولده من نحل افضل من ادبٍ حسنٍ**" (كذا في المشكوٰة و عن الترمذی وغیرہ) یعنی کسی باپ نے اپنی اولاد کو حسن ادب سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے "**لان يودب الرجل ولده خير له من ان يتصدق بصاع**" (كذافي المشكوٰة عن الترمذی) کوئی شخص اپنی اولاد کی تادیب کرے یہ اس سے اچھا ہے کہ ایک صاع (یعنی ۳½ سیر کھجور) صدقہ کرے۔ اس قسم کی روایات کی بنا پر ان کی نگاہ میں میری محبت میری تادیب تھی۔

اس وقت تو فطری طور پر بچپن کی وجہ سے ناگواری ہونی ہی چاہیے تھی مگر اب بہت دعائیں دیتا ہوں کہ ان کی سختی اور شدائد کی وجہ سے آدمیوں کی صورت میں ہوں ورنہ معلوم نہیں کن حالات میں

ذلیل وخوار پھرتا۔ ان کے بہت سے حالات میری ابتدائی تعلیم وغیرہ کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔ ان کی یہ بھی غایت شفقت تھی کہ مجھے دینیات یعنی فقہ وحدیث اپنے اور حضرت قدس سرہٗ کے علاوہ کسی سے نہ پڑھنے دیں اور بار بار فرمایا کرتے تھے کہ تو گستاخ بے ادب ہے اگر کسی اُستاد کی بے ادبی کی تو وہ فن جاتا رہتا ہے میں نہیں چاہتا کہ تیرا فقہ وحدیث ضائع ہو۔ کوئی دوسرا فن ضائع ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔

میں حضرت مدنی کے حال میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے اپنے اکابر میں بہت بے تابی سے رونے والا حضرت مدنی قدس سرہٗ اور اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو دیکھا۔ قرآن شریف پڑھنے کا بہت ہی کثرت سے معمول تھا۔ خالی اوقات میں بہت کثرت سے حفظ قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے اور اخیر شب میں جہر وبکا کے ساتھ ان کو اس کا بہت ہی اہتمام تھا کہ اس سیہ کار کا کوئی وقت ضائع نہ ہو۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ اللہ کے فضل سے اور ان کی توجہ سے یہ چیز معتاد بن گئی۔ اپنے شاگردوں کے لیے اور بالخصوص اس ناکارہ کے لیے نظام الاوقات لکھوانے کا بڑا اہتمام تھا۔ ہر موسم میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اپنا نظام الاوقات بنا کر مجھے دکھلاؤ۔ ان کا ہر کتاب کے ختم پر شیرینی کے پیسے دینے کا معمول اپنے تعلیمی سلسلے میں لکھوا چکا ہوں اور ساتھ ہی اس کی نگرانی بھی کہ میں اپنی رائے سے ان کو خرچ نہ کرسکوں۔ وہ چونکہ بہت ہی باکمال تھے۔ فقہ وحدیث از براور علم ادب تو ان کے یہاں قاعدہ بغدادی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہ ناکارہ ونابکار تو اب تک بھی کسی چیز میں ان کا اتباع نہ کرسکا۔

اس لیے کئی دفعہ فرمایا کہ ایک مولانا تھے۔ مجھ جیسے علامہ ان کا ایک لڑکا تھا نالائق تجھ جیسا۔ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو لڑکے کو بلا کر یوں فرمایا کہ نالائق تو نے کچھ نہ کیا۔ باپ کے مرید وشاگرد ہر طرف سے تیرے پاس آ کر کہیں گے کہ حضرت صاحبزادے فلاں بات کیوں کر ہے تو یہ کہہ دیجئے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے بات بنی رہے گی۔ ان کا یہ ارشاد تو میرے سر ایسا پڑا کہ سن چالیس ہجری سے حدیث پاک کے اسباق ہونے شروع ہوئے تھے اور مجھے اختلاف مذاہب کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ ہر مسئلہ میں فلاں امام کا یہ مذہب ہے فلاں کا یہ ہے۔ ایسا زبان پر چڑھ گیا تھا۔ اس کو میں اپنے رسالہ الاعتدال میں بھی کچھ تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے زمانے میں نماز کی چار رکعت کے اختلاف ایک رسالہ میں لکھے تھے جو میری تالیفات کے ذیل میں گزر بھی چکا۔ اس وقت نماز کی چار رکعت میں دوسو سے زائد مسئلہ مختلف فیہ ملے تھے اور اس کے بعد علماء کا آپس کا اختلاف میری نگاہ میں ایسا ہلکا بن گیا کہ موجودہ زمانے میں جب علماء میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اور لوگ اس کو بہت اہمیت دیتے ہیں تو مجھے اس اہمیت دینے سے کلفت

ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں بھائی مسئلوں میں اختلاف ہوا ہی کرتا ہے۔ تمہیں جن پر اعتقاد ہو اس کے قول پر عمل کرلو۔ اس میں لڑائی، مناظرہ، مجادلہ کی کیا ضرورت ہے۔

والد ماجد اور میرے حضرت کے بعض مسائل میں اختلاف:

میرے والد صاحب قدس سرہٗ اور میرے حضرت قدس سرہٗ کے درمیان میں متعدد مسائل میں اختلاف تھا۔ مگر چونکہ مجادلہ اور مخالفت نہیں تھی اس لیے عوام تو عوام خواص کو بھی اس کی ہوا نہیں لگتی تھی۔ ان میں سے ایک مسئلہ مثال کے طور پر لکھتا ہوں۔ قربانی کے جانور میں دو تین شرکاء اگر ایک حصہ مشترک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرنا چاہیں بشرطیکہ خود ان کے حصے اپنے بھی اس جانور میں ہوں۔ یہ صورت میرے والد صاحب کے نزدیک جائز تھی اور میرے حضرت کے نزدیک ناجائز۔ میرے والد صاحب اُوپر رہتے تھے اور حضرت قدس سرہٗ کا قیام نیچے رہتا تھا۔ قربانی کے زمانہ میں متعدد لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ مسئلہ حضرت کے پاس پوچھنے آتے تو میرے حضرت یوں فرما دیا کرتے تھے کہ میرے نزدیک تو ناجائز ہے مولانا یحییٰ صاحب کے نزدیک جائز ہے۔ تو اُوپر جا کر ان سے مسئلہ پوچھ لے وہ تجھے اجازت دے دیں گے۔ تو اس پر عمل کر لینا۔ اس کے بعد میرے نزدیک یہ صورت جائز ہے اور ہمارے مدرسہ کے مفتی سابق (مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) اور سابق ناظم عبداللطیف صاحب قدس سرہٗ حضرت قدس سرہٗ کے مسلک کے مطابق ناجائز بتاتے تھے اور ہر ایک کا فتویٰ ایک دوسرے کو معلوم تھا میں نے ان دونوں حضرات سے گفتگو بھی کی انہوں نے میری نہیں مانی۔ میں نے ان کی نہیں مانی۔ مگر نہ کبھی اشتہار بازی ہوئی نہ جنگ وجدل ہوا۔

حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کے تابوت کے مسئلہ میں مَیں نے لوگوں سے ہمیشہ یہی کہا کہ اس میں جنگ وجدل اور منازعت کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ مناظرے اور مباحثے کی نہ اشتہار بازی کی جیسا کہ ہمیشہ مسائل میں اختلاف ہوتا آیا۔ اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے اس میں منازعت کی کیا بات ہے اور لڑائی جھگڑے کی کیا ضرورت ہے۔ متانت سے افہام وتفہیم میں کوئی مضائقہ نہیں کسی ایک فریق کی سمجھ میں نہ آئے تو اس پر لعن طعن سب وشتم بے جا ہے اور یہ ناکارہ تو اس میں اتنا وسیع ہے کہ مسلم لیگ، کانگریس، جمعیۃ، احرار کے مسائل مختلف فیہا میں کبھی کسی سے نہ اُلجھا اور نہ کبھی کسی سے لڑا۔ ایک لطیفہ اس وقت یاد آ گیا۔

مسلم لیگ کانگریس کے دور میں بھی یعنی تقسیم سے پہلے میرے حضرت مدنی شیخ الاسلام قدس سرہٗ تو کانگریس کی حمایت میں جتنے زوروں پر تھے سبھی کو آج معلوم ہے اور اس کے مقابل حضرت تھانوی قدس سرہٗ اس کی مخالفت اور حضرت کے اتباع میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی شیخ الاسلام پاکستان مسلم لیگ کی حمایت میں حضرت مدنی سے کم نہیں تھے۔ ممبروں پر، جلسوں میں،

اشتہارات میں ایک دوسرے کی تردید دونوں طرف سے جتنی شدت سے ہوتی تھی وہ ابھی تک سبھی کو معلوم ہے اور مقدر سے دونوں اکابر میرے مہمان ہوا کرتے تھے۔ لیکن مولانا ظفر احمد صاحب کی تشریف آوری ہوتی تھی تو دو تین دن قیام ہوتا تھا اور حضرت مدنی کے حالات میں گزر چکا ہے کہ حضرت کی تشریف آوری منٹوں اور گھنٹوں کی ہوا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ اسی دور میں مولانا ظفر احمد صاحب زادمجدہم ودام ظلہم تشریف فرما تھے دو تین دن سے آئے ہوئے تھے۔ مدرسہ میں قیام تھا میرے مہمان تھے۔ میں دارالطلبہ گیا ہوا تھا۔ ایک لڑکے نے مجھے جا کر اطلاع دی کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ آئے ہیں، کچے گھر میں ہیں۔ میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی اور اب تک بھی جب اس منظر کا مجھے خیال جاتا ہے اور اپنی اس وقت کی پریشانی یاد آتی ہے تو دھڑ دھڑی سی آجاتی ہے۔ میں دارالطلبہ سے بہت تیزی کے ساتھ مدرسہ قدیم آیا اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب زادمجدہم سے درخواست کی کہ حضرت مدنی تشریف لے آئے، مکان پر ہیں۔ حضرت کا قیام گھنٹہ آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوگا آپ ابھی تکلیف نہ فرمائیں، کھانے کے بعد حضرت کی تشریف بری کے بعد میں آپ کو بلالوں گا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اللہ ان کو بہت ہی درجے عطاء فرمائے یہ فرمایا کہ کیوں؟ میری حاضری سے کیا نقصان ہوگا، میں ابھی آؤں گا۔ میں نے بڑی خوشامد ومنت کی کہ اللہ کے واسطے ہرگز کرم نہ فرمائیں، مگر جتنا میں نے خوشامد کی اتنا ہی انہوں نے اصرار کیا کہ نہیں ابھی آؤں گا۔ میں نے کہا حضرت میرے بڑے ہیں وہ کچھ ارشاد فرمائیں گے تو میں بالکل جواب نہیں دوں گا۔ ان سے مایوس ہو کر میں کچے گھر میں حاضر ہوا اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کئی دن سے آئے ہوئے ہیں اور میرے مہمان ہیں۔ میں ان سے کہہ آیا ہوں کہ ابھی آپ نہ آئیں، حضرت کی تشریف بری کے بعد آپ کو بلالوں گا۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کیوں؟ میں ان سے کیا چھین لوں گا یا وہ مجھ سے کیا چھین لیں گے۔

میری یہ گفتگو حضرت سے ہو رہی تھی کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کچے گھر میں پہنچ گئے۔ حضرت ان کو دیکھ کر بہت ہی مسرت سے اُٹھ کھڑے ہو کر مصافحہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اچھا یہ ابوالدیک صاحب بھی یہاں تشریف فرما ہیں۔ اس کی شرح یہ ہے کہ جب عزیز مولوی عمر احمد ابن مولانا ظفر احمد پیدا ہوئے تو ان کی تاریخ ولادت مرغ محمد تجویز کی گئی تھی۔ اس وقت سے حضرت مدنی قدس سرہٗ نے تفریحاً مولانا ظفر احمد صاحب کی کنیت ابوالدیک تجویز کر رکھی تھی اور اکثر ملاقات پر اسی لفظ سے مخاطبت ہوتی تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے دست بوسی کی اور میں پھر بھی ڈرتا ہی رہا اور یارب سلم سلم پڑھتا رہا۔ جلدی سے دسترخوان بچھایا دونوں اکابر نے آمنے سامنے

بیٹھ کر کھانا نوش فرمایا۔ طرفین سے خیریت اہل وعیال کے حالات وغیرہ امور ہوتے رہے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد حضرت مدنی قدس سرہٗ تشریف لے گئے اور میری جان میں جان آئی۔ کوئی سیاسی لفظ اس مجلس میں نہیں آیا۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے ارشاد فرمایا کہ مٹھائی کھلاؤ۔ میں نے کہا ضرور مگر آپ سے زیادہ حضرت شیخ الاسلام ہیں۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اگر ایک ڈانٹ پڑگئی تو کیا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تو پہلے کہہ چکا تھا کہ مولانا اگر ڈانٹیں گے تو کچھ نہیں بولوں گا۔ مجھے مولانا کی بڑائی یا علوشان سے انکار نہیں، مولانا کو ہر طرح اپنا بڑا سمجھتا ہوں، لیکن کیا کریں، ہم دیانۃً کانگریس کو مسلمانوں کے حق میں نہایت ہی مضر سمجھتے ہیں۔ اس لیے اخبارات، اشتہارات اور منبروں کی تقریر میں تردید پر مجبور ہیں۔ یہ تو ہولیا، اب اس کا تکملہ سنو۔

ابھی دو تین سال کی بات ہے جب جمعیۃ اور مشاورت میں خوب چل رہی تھی۔ مولانا منظور صاحب نعمانی میرے مہمان تھے اور رات سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے تخلیہ کا وقت مانگ رکھا تھا اور میں نے ان کے لیے ظہر کے بعد کا وقت تجویز کر رکھا تھا۔ میں ظہر کے فرض مسجد میں پڑھ رہا تھا۔ سلام پھیرتے ہی چپکے سے داہنی ایک لڑکے نے کان میں کہا کہ مولانا اسعد صاحب تشریف لائے ہیں اور کچے گھر میں ہیں۔ پھر دوسری طرف سے ایک شخص نے بائیں کان میں کہا کہ مولانا اسعد تشریف لے آئے اور کچے گھر میں ہیں۔ میں نے ان سے کہا ''اُونٹ پہاڑ کے نیچے سے نکل چکا'' بھاگ جاؤ۔

اطمینان سے سنتیں پڑھ کر میں نے مولانا محمد منظور صاحب مدفیوضہم سے اُوپر مہمان خانہ میں کہلوایا کہ عزیز مولانا اسعد صاحب سلمہٗ آ گئے اور ان کا قیام اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کے طریق پر گھنٹے آدھ گھنٹہ کا ہوگا۔ اس کے بعد آپ کو بلائیں گے۔ اس کے بعد میں نے کچے گھر میں آ کر عزیز مولانا اسعد سلمہٗ سے کہا کہ کوئی تخلیہ کی بات ہو تب تو خیر ورنہ مولانا منظور صاحب کو میں نے یہ وقت دے رکھا ہے۔ ان کو بھی بلالوں مہمان خانہ میں ہیں۔ عزیز موصوف نے کہا مجھے تو دس منٹ تخلیہ کے چاہئیں۔ میں نے سب کو اٹھا دیا اور عزیز موصوف سے تخلیہ کے بعد ان کے رفقاء کو اپنے رفقاء کو اور مولانا منظور صاحب کو بھی مہمان خانہ سے بلایا اور ان کی آمد کے بعد میں نے دونوں کو سنایا کہ ظہر کی نماز کے بعد ایک دم میرے اُوپر یورش ہوگئی کہ حضرت مولانا اسعد صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اُونٹ پہاڑ کے نیچے سے نکل چکا بھاگ جاؤ اور پھر اس جملہ کی شرح میں حضرت مدنی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب زادمجدہم کا قصہ سنایا اور اب بیک وقت مختلف الالوان کے جمع ہونے پر کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتا اس لیے کہ اب میرے

دوست ہی رہ گئے اکابر تو تشریف لے گئے۔ اللہ میرے سب اکابر کو بہت ہی بلند درجے عطاء فرمادے بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ اس کے بعد ایک دو موقعہ پر مختلف الالوان عناصر کے اجتماع پر جب نزاعی گفتگو شروع ہوئی تو میں نے دونوں سے عرض کردیا کہ حضرت جی مرغے تو باہر جا کر لڑیں کھانا کھانا ہو تو کھائیں۔ ورنہ اللہ حافظ۔ مجھے مسائل خلافیہ میں جنگ و جدول اور نزاع سے بہت نفرت ہے اور اختلاف علماء کو رحمت سمجھتا ہوں۔ اپنے رسالہ الاعتدال میں اس کو تفصیل سے لکھوا چکا ہوں۔ اس وقت تو اپنے والد صاحب کے مختصر احوال لکھوانے تھے۔

میں تعلیم کے سلسلہ میں لکھ چکا ہوں کہ مجھے اور میرے رفیق مولوی حسن احمد کو والد صاحب والے دورے میں اس کا بہت ہی اہتمام تھا کہ نہ کوئی حدیث اُستاد کے سامنے چھوٹے اور نہ بے وضو پڑھی جائے۔ ایک دفعہ میرا ساتھی مولوی حسن احمد مرحوم وضو کے واسطے اُٹھا اور حسب معمول میرے کہنی ماری۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت فتح القدیر میں یوں لکھا ہے۔ ابا جان بہت ہنسے اور فرمایا کہ میں تمہاری فتح القدیر سے کہاں لڑوں گا۔ تم کو ایک کہانی سنادوں۔ ان کا معمول اسباق میں عبرت کے قصے سنانے کا تھا اور خوب سنایا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کبھی کبھی سبق میں رودیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ہمیشہ مستقل ایک معمول ہو گیا تھا کہ جب ہم میں سے کوئی ایک اٹھتا، ابا جان کوئی قصہ شروع کردیتے۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو طلب علم کے زمانے میں علمی شغف بہت تھا۔ ایک زمانے میں ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں نزول آب ہونے کو ہے۔ کتاب کم دیکھا کریں بالخصوص رات کو کتب بینی نہ کریں۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کئی ماہ تک اس قدر محنت اور کتب بینی کی اس خیال سے کہ پھر تو یہ آنکھیں جاتی رہیں گی جو کچھ دیکھنا ہوا بھی دیکھ لیں۔ میرے والد صاحب نظام الدین میں رہتے تھے اور مدرسہ حسین بخش میں پڑھتے تھے۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ صبح کی نماز کے بعد مدرسہ پڑھنے آتا تھا اور دوپہر کو فراغت کے بعد نظام الدین جاتا اور ظہر کے بعد پھر آکر عصر کے بعد واپس آتا۔ تقریباً یہ راستہ ساڑھے تین میل ہے۔ چودہ میل تقریباً روزانہ ہو گئے۔

میرے والد صاحب کی تعلیم بمدرسہ حسین بخش:

اس قصہ کو بہت اہمیت کے ساتھ کتب احادیث کی مواقیت صلوٰۃ میں بیان فرمایا کرتے تھے، جس میں صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم عصر کی نماز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھ کر اپنے گھر مغرب سے پہلے پہنچ جاتے تھے۔ یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہمیشہ نظام الدین سے مدرسہ حسین بخش پینتیس (۳۵) منٹ میں پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی اس سے ایک دو منٹ کم تو ہوتے مگر زیادہ

نہیں۔ مجھے تو کبھی اس کے اندر استبعاد نہیں ہوا، اس لیے کہ یہ ناکارہ خود اپنے شباب کے زمانے میں رائے پور کی پٹری جو ساڑھے تین میل ہے تیس پینتیس منٹ کے درمیان میں پہنچا ہوں۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اکثر کتب مدرسہ حسین بخش میں پڑھیں، مگر وہاں حدیث پڑھنے سے انکار فرمادیا۔

بڑا عجیب قصہ ہے، اگرچہ میری ذات سے اس کا تعلق نہیں ہے مگر میرے والد صاحب کے کمالات سے ضرور ہے۔ یہ قصہ تذکرۃ الخلیل میں بھی آچکا ہے۔ یہ فرمایا کرتے تھے کہ دہلی میں حدیث پڑھنے سے آدمی غیر مقلد ہوجاتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے بھائی مولوی محمد صاحب نے چونکہ حدیث پاک گنگوہ میں پڑھی تھی، اس لیے میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا بہت معتقد ہو گیا تھا اور طے کرلیا تھا کہ اگر حدیث پڑھوں گا تو حضرت سے ورنہ نہیں پڑھوں گا اور اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ امراض کی کثرت اور بہت سے عوارض کی وجہ سے کئی سال پہلے سے حدیث کے اسباق بند فرما چکے تھے۔ مدرسہ حسین بخش والوں کی خواہش اور اصرار تھا کہ میرے والد صاحب حدیث ان کے مدرسہ میں پڑھیں کہ اس میں میرے دادا صاحب کی وجہ سے ان کے مدرسہ کی شہرت اور مقبولیت تھی۔ میرے والد صاحب کے شدید انکار پر انہوں نے میرے دادا صاحب پر اصرار کیا کہ مولوی یحییٰ کم از کم بخاری شریف کے امتحان میں شریک ہوجائیں۔ اس کو میرے والد صاحب نے قبول فرمالیا۔

نظام الدین کا مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا حجرہ جو مسجد کی دائیں جانب ہے۔ اب تو وہ شاندار ہوگیا۔ اس وقت میں وہ بہت بوسیدہ تھا اور چھت بھی بہت نیچی تھی۔ مسجد کی طرف کا دروازہ تو اسی طرح تھا جیسا اب ہے لیکن جس جگہ آج کل زنانے مکان کی کھڑکی ہے وہاں بجائے کھڑکی کے ایک مختصر دروازہ قدِ آدم تھا اور زنانے مکان کی جگہ کیکر اور خودرو درخت اتنی کثرت سے اور گنجان خاردار کھڑے ہوئے تھے کہ وہاں چلنا بھی بہت دشوار تھا۔ میں نے بھی اس کی یہ حالت دیکھی ہے۔ اس جگہ ایک رَو بھی بہتی تھی۔

والد صاحب کا طرزِ تعلیم:

جس میں گندا پانی بہتا تھا اور مچھروں کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس منظر کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ میرے والد صاحب شب وروز اس حجرے کے اندر رہتے تھے۔ میرے دادا کے شاگردوں میں دو ایک لڑکے تھے جن کے ذمے یہ تھا کہ ہراذان پر دو لوٹوں میں پانی بھر کر اس جنگل والے دروازے کی طرف پہنچادیں اور دونوں وقت کھانا بھی اسی دروازے پر جا کر ان کے پاس رکھوادیں۔ وہ

فرماتے تھے کہ میں سنتوں اور نماز سے فارغ ہو کر اپنی کتاب دیکھنے میں مصروف ہو جاتا تھا اور نماز کی تکبیر پر مسجد کا دروازہ کھول کر جماعت میں شریک ہو جاتا اور نماز کا سلام پھیرتے ہی اندر آ کر سنتیں پڑھتا۔ اسی دوران میں کاندھلہ سے میری شادی کے سلسلہ میں میری طلبی کا تار پہنچا تو اس کو نظام الدین والوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ کئی ماہ سے یہاں نہیں ہے۔ غالباً میرے دادا صاحب کاندھلہ ہوں گے۔ انہوں نے ہی یہ تار دیا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے پانچ چھ ماہ میں بخاری شریف، سیرت ابن ہشام، طحاوی، ہدایہ، فتح القدیر بالاستیعاب اس اہتمام سے دیکھیں کہ مجھے خود حیرت ہے۔ ممتحنین میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جن کے پاس بخاری شریف کا امتحان تھا اور حضرت شیخ الہند جن کے پاس ترمذی شریف کا تھا اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب و دیگر اکابر کے پاس دوسری کتب کا۔

کھانے کی مجلس میں میرے دادا صاحب اور یہ سب حضرات شریک تھے، تو حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے میرے دادا صاحب سے فرمایا کہ آپ کے لڑکے نے ایسے جوابات لکھے ہیں کہ اچھے مدرس بھی نہیں لکھ سکتے اور اسی امتحان کی بناء پر حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے سفارش فرمائی تھی کہ حضرت نے اعذار کی وجہ سے سبق بند کر دیے، مگر ایک سال دورہ میری درخواست پر اور پڑھا دیں کہ مولانا اسمٰعیل صاحب کاندھلوی ثم الدہلوی کے لڑکے مولوی یحییٰ کا میں نے امتحان لیا ہے۔ ایسا ذہین طالب علم بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اعلیٰ حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ پہلے سے بھی میرے والد صاحب کا اصرار اور شرط سن رہے تھے اور میرے دادا صاحب سے واقفیت بھی تھی۔ اس پر حضرت نے یکم ذیقعدہ ۱۱ھ کو ترمذی شریف شروع فرمائی، جو بہت ہی آہستہ اور تھوڑی دیر ہوا کرتی تھی اور ذی الحجہ ۱۲ھ میں ایک سال کے اندر ترمذی شریف ختم ہوئی۔ اس کے بعد بخاری شریف شروع ہوئی جس کی تفصیل میں لامع کے مقدمہ میں لکھوا چکا ہوں چونکہ میرے والد صاحب کا یہ اہتمام تھا کہ کوئی حدیث استاذ کے سامنے پڑھنے سے نہ چھٹے۔

ایک موقع پر اعلیٰ حضرت کے اصرار پر والد صاحب کاندھلہ تشریف لے گئے اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے ان کی غیبت میں سبق نہ پڑھانے کا وعدہ فرما لیا۔ جب واپس تشریف لائے تو قاری ایک ولایتی تھے۔ انہوں نے ایک باب چھوڑ کر اگلے باب سے سبق شروع کیا۔ میرے والد صاحب اور دوسرے شرکاء نے ٹوکا کہ ایک باب اس سے پہلا باقی ہے۔ چونکہ وہ ولایتی تھی زور میں نہ مانے۔

چند ماہ بعد میری دادی صاحبہ کے اصرار پر حضرت قدس سرہٗ نے میرے والد صاحب کو کاندھلہ جانے کو ارشاد فرمایا۔ والد صاحب نے عرض کیا کہ مجھے پہلے ہی روانگی کا قلق ہے کہ میرا ایک باب چھوٹ گیا۔ حضرت نے فرمایا کل کو وہی باب ہوگا اور سبق میں بیٹھتے ہی اعلیٰ حضرت نے دریافت

فرمایا کہ مولوی یحییٰ تمہارا کون سا باب چھوٹ گیا اور حضرت نے سب سے پہلے وہی باب پڑھایا۔ اتفاق سے قاری اس دن بھی وہی ولایتی تھے۔ اس باب کے ختم پر ان کے منہ سے یہ نکل گیا کہ کوئی اور باب چھوٹ گیا ہو تو وہ بھی پڑھوالو۔ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کو غصہ آ گیا اور غصہ میں فرمایا چلو تو باؤلا ہے۔ چند ہی روز بعد یہ طالب باؤلا ہو گیا۔

اس زمانے میں کوے کا مسئلہ بھی زوروں پر تھا۔ یہ طالبِ علم ایک بانس کے اُوپر کوے کو باندھ کر سارے دن گنگوہ کی گلیوں میں یہ اعلان کرتا پھرتا کہ یہ کوا حلال ہے۔ ''اللّٰھم انا نعوذ بک من غضبک و غضب رسولک و غضب اولیائک'' یہی وہ بات ہے جس کو پہلے بھی لکھوا چکا ہوں کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کے غصے سے محفوظ رکھے۔ میں نے بھی کوکب الدری میں اس باب کو اسی جگہ پر رہنے دیا جس جگہ حضرت نے پڑھایا تھا، اپنی جگہ پر منتقل نہیں کیا اور اس کے حاشیہ میں اسی قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

ایک عجیب واقعہ یاد آ گیا کہ میں پہلے بھی کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد دن یا رات میں جب بھی کبھی سوتا تھا، والد صاحب کو خواب میں دیکھتا تھا۔ ایک واقعہ اسی زمانے میں یہ پیش آیا۔ میں اُوپر رہا کرتا تھا اور زینے کے اُوپر کے کواڑ لگا لیا کرتا تھا جو نہایت معمولی اور کمزور تھے۔ تین مہینے انتقال کو گزرے ہوں گے۔ ایک رات کو آواز سنائی دی، معلوم نہیں کس کی تھی، مگر مشابہ والد صاحب کی آواز کے تھی۔ زور سے کسی شخص نے کہا کہ نیچے کے کواڑ کیوں نہیں لگتے؟ اور اس آواز سے سب گھر کے بڑے سوتے ہوئے جاگ اُٹھے۔ ہم کو آج تک پتہ نہ چل سکا کہ کس کی آواز ہے۔ والد صاحب کی آواز کے بہت مشابہ ہے۔

اس سیہ کار نے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانے میں ایک خواب دیکھا تھا کہ کتابوں کا ایک ڈھیر ہے، مسجد کے مینارے کی طرح سے، میں اس خواب کے بعد بہت ہی ڈر گیا، بڑی بے ادبی سمجھی۔ میرے والد نے یہ تعبیر دی کہ انشاء اللہ کتابوں پر عبور ہوگا۔ تعبیر تو بالکل صحیح ہوئی اور اللہ کے لطف و احسان سے ہزاروں سے متجاوز کتابوں پر عبور ہوا۔ مگر عزیزم مولوی یونس سلمہٗ یوں کہتے ہیں کہ تو نے ایک عرصہ ہوا یہ نقل کیا تھا کہ والد صاحب نے اولاً تو فرمایا کہ تو بہت بڑا گستاخ ہے اور پھر تعبیر دی۔ میرے بچپن میں جب میری عمر پانچ چھ سال کی تھی۔ میرے والد صاحب کے ایک محبوب شاگرد نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص نے ان کو چاول دیے اور میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ میرے والد صاحب نے اس وقت یہ تعبیر دی تھی کہ اس بچے کو ''ثبات فی الدین'' نصیب ہوگا اور بعد میں معلوم ہوا کہ حدیث میں بھی اس کی تعبیر یہی ہے۔

میں بارہا مختلف تحریرات میں لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کا بہت فکر

سوار رہتا تھا کہ میرے اُوپر کہیں صاحبزادگی کا گھمنڈ نہ سوار ہوجائے۔ ان کا مشہور مقولہ تھا۔ جس کو انہوں نے سینکڑوں دفعہ کہا ہوگا کہ صاحبزادگی کا سور بڑی مشکل سے نکلتا ہے۔ اس لیے وہ بسا اوقات بڑے مجمع میں بے وجہ بھی مجھ کو ڈانٹ دیا کرتے تھے، اور بعض دفعہ خود فرما بھی دیا کرتے تھے کہ بات تو کچھ ایسی نہیں تھی مگر مجھے یہ خیال ہوا کہ تیرے اُوپر صاحبزادگی کا سور نہ سوار ہو جائے۔ ایک دفعہ انبالہ سے کلکتہ میل پر واپسی ہورہی تھی یہ ناکارہ بھی ابا جان کے ساتھ تھا۔ اس کی تیز رفتاری پر متوجہ فرما کر یوں فرمایا کہ دیکھ سفر اس طرح قطع ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ شعر پڑھا، جو اکثر مجھے سنا کر پڑھا کرتے تھے:

ترا ہر سانس نخل موسوی ہے
یہ جزر و مد جواہر کی لڑی ہے

ان واقعات میں کوئی ترتیب تو ہے نہیں۔ نہ مسلسل لکھوانے کی نوبت آرہی ہے۔ ''کیف ما اتفق'' جب وقت ملتا ہے اکابر میں سے جن کے حالات ہوتے ہیں جو یاد آجاتا ہے لکھوادیتا ہوں۔ اسی وجہ سے اکابر کے حالات میں سے بہت سے واقعات مکرر بھی آگئے ہیں۔ یہ میں ''اکمال الشیم'' کے مقدمہ میں لکھوا چکا ہوں کہ ان کا طرزِ تعلیم بالکل علیحدہ تھا اور طرز تربیت تو اس سیہ کار کے ساتھ تو بڑا ہی سخت تھا۔ دس سال کی عمر سے یعنی ۲۵ھ سے لے کر ۳۲ھ تک کا زمانہ مجھ پر بہت سختی کا گزرا۔ اس زمانہ میں اچھا کپڑا پہننے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ اسی بناء پر میری والدہ مرحومہ کے اچھے جوڑے پر میری پٹائی ہوئی تھی، جس کو میں آپ بیتی نمبر ا میں لکھوا چکا ہوں۔ ہر جمعہ کو سر منڈوانا ضروری تھا۔ گرمی ہو یا سردی نماز میں اگر دو نمازوں میں ایک شخص میرے پاس ہوجاتا تو مجھ سے جواب طلب ہوتا تھا کہ تیری نماز فلاں ہی کے پاس ہوتی ہے اور کہیں ادا نہیں ہوتی۔ رستے چلتے کوئی مجھے سلام کر لیتا تھا تو مجھ سے جواب طلب ہوتا تھا کہ یہ کون ہے اور جب میں لاعلمی ظاہر کرتا تو پھر ارشاد فرماتے تو پھر سارے مجمع میں تو ہی ملا تھا اس کو سلام کرنے کے واسطے، لیکن یہ ساری سختیاں اللہ کے فضل سے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال سے ایک ڈیڑھ سال پہلے ختم ہوچکی تھیں۔ اس کے بعد تو انہوں نے میرے دو تین سخت امتحان لے کر بس پھر آزادی دے دی تھی۔ اس کے بعد تو بہت ہی شفقتیں اور اعتماد اور حسن ظن بہت ہی بڑھ گیا تھا اللہ تعالیٰ ان کے حسن ظن ہی کو سچا کردیں۔

ان کے رائے پور کے سفر میں اس ناکارہ کا کچھ دل گھبرایا۔ میں نے ان کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا۔ ان کا ایک والا نامہ محبت سے لبریز آیا جس میں انہوں نے اس سیہ کار کے متعلق لکھا تھا کہ تعلق مع اللہ پیدا ہوگیا ہے میں اس کو پورا لکھوانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر عزیز سلمان نے کہا کہ یہ

آپ بیتی نمبر۱ میں گزر چکا۔ اس سب کے باوجود نکیر اخیر تک نہیں گئی۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ یک سالہ قیام کے بعد جو حضرت شیخ الہند کے ساتھ ۳۳ھ میں روانگی ہوئی تھی۔ جس دن بمبئی پہنچے اسی دن میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ والد صاحب کے انتقال کا تار حضرت کو بمبئی میں پہنچا اور حضرت اس کو سن کر سکتہ میں رہ گئے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ لیکن اس سے تین چار دن پہلے حضرت کا عدن سے تار آیا کہ فلاں جہاز سے تشریف لا رہے ہیں۔ اس تار پر جتنی مسرت سہارنپور والوں کو اور حضرت اقدس سے تعلق رکھنے والوں کو ہونی چاہیے تھی ظاہر ہے۔ میں نے اس تار کی اطلاع پر اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ اور نظام الدین کاندھلہ۔ گنگوہ سب جگہ مژدہ کے خطوط لکھ دیے دوسرے دن والد صاحب نے مجھ سے ہی اعلیٰ حضرت کو رائے پور خط لکھوانا شروع کیا۔ جس کی ابتداء یہ تھی:

مژدہ اے دل کہ دگر باد صبا ز آمد
ہدہد خوش خبر از شہر سبا باز آمد

میں نے اپنی حماقت سے خط کے دوران میں کہہ دیا کہ میں نے بھی اطلاع کا ایک عریضہ کل لکھ دیا تھا۔ فرمایا کہ ابھی تو باوا زندہ تھا۔ ابھی سے استقبال کا جھنڈا ہاتھ میں کیوں لے لیا۔ اس وقت تو میں بہت سوچتا رہا کہ اس میں کون سی ڈانٹ کی بات تھی مگر بعد میں خیال آیا کہ اس میں بے ادبی ضرور تھی۔

ان کے طرز تعلیم کے متعلق تو بہت ہی کچھ لکھوانے کو دل چاہتا تھا۔ مگر بہت ہی طول ہو جائے گا وہ مدرسہ میں قائم مقام صدر مدرس تھے۔ ابوداؤد شریف، مسلم شریف اور نسائی شریف ان کے مستقل سبق تھے اور حضرت کی غیبت میں حضرت قدس سرہٗ کے سبق ترمذی بخاری بھی ان کے یہاں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ وہ احادیث کے اسباق کے مقابلے میں ابتدائی کتابوں کے پڑھانے کا زیادہ اشتیاق رکھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بنیاد ابتداء سے پڑتی ہے استعداد کی بھی، اصلاح اور تقوے کی بھی اور جب بنیاد خراب ہو جائے تو پھر اخیر میں تعمیر اچھی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ تدریس حدیث کے زمانے میں مدرسہ سے یہ مطالبہ کرتے رہے کہ مجھے ابتدائی سبق دے دو مگر اہل مدرسہ اس کو کیسے مانتے۔

انہوں نے ایک مرتبہ مدرسہ میں یہ تجویز پیش کی کہ درجہ ابتدائی کا مدرس ایسا ہونا چاہیے جس نے شرح جامی سے اُوپر کچھ نہ پڑھا ہو کہ ایک دو ہوشیار سمجھ داروں کو ابتدائی کتب مجھ سے پڑھوا کر اور بعد کی تعلیم بند کر کے مدرس بنا دیا جائے۔ کہ وہ کہتے تھے کہ پورا مولوی ہمیشہ ترقی کی فکر میں رہتا ہے اور جب اس کو متوسط کتب مل جاتی ہیں تو ابتداء میں اس کی توجہ نہیں رہتی اور جب اس نے شرح جامی سے اُوپر پڑھا نہیں ہوگا تو وہ اُوپر کی کتابیں نہیں مانگے گا۔

یہ ناکارہ اس زمانے میں مختصر المعانی پڑھتا تھا۔ احمقوں نے یہ شہرت دی کہ یہ اپنے لڑکے زکریا کو تعلیم چھڑا کر مدرسہ میں ملازم رکھنا چاہتے ہیں۔ احمقوں کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ جس شخص نے اپنی اعلیٰ تنخواہ کبھی نہ لی ہو۔ اس کو میری ابتدائی تنخواہ کی کیا خواہش ہوگی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھوا چکا ہوں ان کو طحاوی شریف سے بڑی مناسبت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ طحاوی مشکوٰۃ شریف کے ساتھ ترجمہ کے ساتھ پڑھائی جائے۔ چنانچہ اس ناکارہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ احادیث کا ترجمہ تو میں نے مشکوٰۃ شریف میں کبھی نہ کیا۔ طحاوی میں کیا کرتا۔ لیکن امام طحاوی کی نظر کا ترجمہ ضرور کراتے تھے۔

شاید میں کہیں لکھوا چکا ہوں اسی رسالہ میں یا ''اکمال الشیم'' کے مقدمہ میں کہ انہوں نے قطب عالم حضرت گنگوہی کے انتقال کے بعد طحاوی کی اردو شرح لکھنی شروع کی تھی۔ جس میں اسانید کو چھوڑ کر متن حدیث کا ترجمہ مکررات کے حذف کے ساتھ اور امام طحاوی کی نظر کا ترجمہ بسط و تفصیل کے ساتھ کیا تھا مگر پہلے لکھا جا چکا کہ اس زمانے میں طحاوی شریف ترمذی، بخاری شریف کے ختم ہونے کے بعد اس کے گھنٹہ میں حضرت قدس سرہ کے یہاں سو دو سو ورق ہوا کرتے تھے۔

مجھ سے ایک دفعہ مولانا انور شاہ صاحب نے یہ فرمایا کہ مولوی زکریا صاحب میں تو دیوبند پر قابو یافتہ نہیں ہوں لیکن تم مظاہر علوم پر قابو یافتہ ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ طحاوی شریف پورے سال ہوا کرے۔ میں اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے پہلے سے طحاوی شریف کا دلدادہ تھا۔ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے بعد میں نے مظاہر علوم کے دورۂ حدیث میں طحاوی شریف کا پورا گھنٹہ شروع سال سے تجویز کرا دیا تھا۔ جب تک عبدالرحمٰن صاحب کا قیام یہاں رہا وہ مستقلاً مولانا کے یہاں ہوتی رہی اور ان کے پاکستان تشریف لے جانے کے بعد مولانا اسعد اللہ صاحب کے یہاں اب سے ایک سال قبل تک ہوتی رہی، مگر میری کوشش کے باوجود دونوں جلدیں کسی سال پوری نہ ہو سکیں۔

میں نے بارہا مدرسہ سے یہ درخواست کی کہ طحاوی شریف کا سبق مجھے دے دیا جائے، مگر اپنی تالیفی مشغولیت کی وجہ سے تین سبق لینے پر میں آمادہ نہیں تھا اور ابوداؤد یا بخاری شریف کی جگہ طحاوی شریف ان لوگوں نے دینا گوارا نہ کیا کہ یہ دونوں زیادہ اہم ہیں۔ میں نے کئی دفعہ یہ کہا کہ دو سال کے لیے دے دو، میں دونوں جلدیں ختم کرا کر دکھا دوں گا۔ مگر چونکہ اولاً ابوداؤد اور چند سال کے بعد اس کے ساتھ بخاری شریف میرا مستقل سبق ہو گیا اس لیے اہل مدرسہ نے مجھے طحاوی شریف نہ دی۔

میرے چچا حضرت اقدس مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہٗ بانی جماعت تبلیغ:

میرے صنوالاب نائب الشیخ مربی واستاذ کی شفقتیں تو میرے حال پر جتنی بھی ہونی چاہیے تھیں ظاہر ہے، مگر ان شفقتوں کے ساتھ ساتھ آخر میں ان کا طرز ایسا ہو گیا تھا، جس نے مجھے بہت ہی شرمندہ کر رکھا تھا اور جیسا کہ میں نے حضرت اقدس مدنی اور حضرت اقدس رائے پوری کے حالات میں لکھوایا ہے کہ ان اکابر کے بعض فقرے اب نقل کرنے کے قابل نہیں، اس کے باوجود بھی میں نے بہت نامناسب قصے لکھوا دیے۔ البتہ چچا جان کے ابتدائی حالات ضرور لکھوانے کو جی چاہتا ہے۔ اگرچہ بہت سے قصے میری ابتدائی تعلیم اور حالات سے گزر گئے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے اپنے چچا جان کو نہایت عابد، زاہد، متقی اور پرہیز گار پایا۔ میرا ابتدائی دوران کے شدید مجاہدوں کا تھا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر نفلوں کی نیت باندھا کرتے تھے اور عشاء کی نماز کے وقت سلام پھیرا کرتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد کی طویل نفلوں کا دستور تو ہمیشہ رہا، مگر عشاء کی اذان کے قریب تک پڑھنے کا معمول رمضان میں اخیر تک رہا۔ اس زمانے میں ایک دستور چچا جان کے چپ اور خاموش رہنے کا تھا۔ یاد نہیں کہ دن رات میں شاید کوئی لفظ بولتے ہوں۔ اس زمانے میں مجھ سے فرمایا کہ اگر تو چھ ہفتے چپ رہے تو میں تجھے ولی کردوں۔ مجھ میں اس زمانے میں بلا وجہ بھی بولنے کا مرض تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد نظام الدین میں میں نے ان سے عرض کیا کہ میں چھ ماہ چپ رہ کر دکھا دوں، وہ فرمانے لگے وہ بات گئی۔ میری ابتدائی تعلیم میں چچا جان کے کچھ واقعات اس سلسلہ میں گزر چکے ہیں۔

اس زمانے میں چونکہ وہ چھوٹے تھے، اس لیے والد صاحب کی اگر کہیں دعوت ہوتی تو ان کو بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا اور وہ اد بایا تو اضعاً یہ ظاہر کرنا نہ چاہتے تھے کہ میرا روزہ ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ روزہ ہے۔ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ فلاں جگہ دعوت میں جانا ہے، میرے پاس بیٹھنا۔ چنانچہ وہ لقمہ بناتے، منہ بھی چلاتے مگر ان کا بنایا ہوا لقمہ میرے منہ میں جاتا تھا۔ جب وہ چاول وغیرہ کا لقمہ بناتے یا روٹی کا لقمہ سالن میں لگاتے تو میں ان کے ہاتھ لے کر اپنے منہ میں رکھ لیتا، وہ دوسرا لقمہ شروع کر دیتے۔ دیکھنے والے میری بدتمیزی سمجھتے۔

ایک عجیب قصہ یاد آگیا۔ ایک صاحب مولوی شیر محمد صاحب ولایتی ہندوستان میں عربی پڑھنے آئے اور مختلف مدارس میں معقول کی کتب اتنی کثرت سے پڑھیں کہ **لا تعد ولا تحصیٰ** جہاں کہیں منطق کے استاد ملے وہیں پہنچے بارہ چودہ برس کے بعد گھر والوں کے شدید تقاضوں پر گھر گئے کہ لڑکی کے گھر والوں کے تقاضے کافی عرصے سے ہو رہے تھے۔ ان کے جانے پر بڑا

استقبال ہوا کہ ہندوستان سے علم پڑھ کر آئے ہیں۔ بڑے زور وشور سے شادی کا اہتمام وانتظام ہوا۔ ایک مولانا صاحب ابنِ ماجہ لے کر ان کے پاس آئے کہ میری صحاح کی سب کتب ہو چکیں، صرف ابنِ ماجہ شریف رہ گئی ہے۔ یہ حدیث پڑھ کر نہ گئے تھے اس لیے بڑی شرم آئی کہ علامہ ہونے کی اتنی شہرت ہو رہی ہے، انہوں نے ان سے تو معذرت کی کہ میں اپنی بدقسمتی سے حدیث پاک کے سوا سب ہی کچھ پڑھ کر آیا ہوں، مگر میں ایک حدیث کا استاد ہندوستان میں دیکھ کر آیا ہوں۔ انشاء اللہ چند ماہ بعد حدیث پڑھ کر آؤں گا اور تم کو ضرور پڑھاؤں گا۔ شادی ہوگئی۔ شب زفاف میں بیوی سے بہت منت سماجت سے یہ سارا قصہ کہہ کر چند ماہ کی اجازت مانگی اور یہ بھی کہا کہ لوگ تجھے طعن دیں گے۔ کوئی کچھ کہے گا اور کوئی کچھ کہے گا۔ کوئی کہے گا کہ بیوی سے نفرت ہوگئی۔ مجھے اللہ کی قسم تو بہت ہی پسند آئی اور چناں چنیں (مجھے اس میں تردد ہے کہ دوسرے دن بھاگ آئے یا تیسرے دن) اور چپکے سے بلا اطلاع وہاں سے چل کر سیدھے گنگوہ پہنچے اور میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے پورا قصہ سنایا۔

ان کو میں نے بھی دیکھا اور خوب دیکھا۔ میں نے ان کا پڑھنا بھی دیکھا اور مطالعہ بھی، وہ ولایتی تھے۔ قراءت ان سے نہ ہوتی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد والد صاحب کے یہاں سبق شروع ہوتا تھا اور سحر کے وقت ختم ہوتا تھا۔ قرأت کبھی میرے والد صاحب خود فرماتے اور کبھی چچا جان۔ زیادہ تر چچا جان فرماتے اور ان ولایتی مولوی صاحب پر مجھے بہت ہی رشک آتا تھا۔ میں نے ان کو کسی وقت دن میں خالی نہیں دیکھا۔ لال مسجد کی چھت کے اُوپر ایک حجرہ تھا اسی میں ان کا قیام تھا۔ اس میں پڑے رہا کرتے تھے۔ ایک میرے والد صاحب کے شاگرد مولوی سعید گنگوہی مرحوم تھے، ان کے ذمہ ان کا کھانا لانا تھا جو میرے والد صاحب نے کسی کے گھر مقرر کر رکھا تھا۔ مولوی سعید سے مولانا شیر محمد صاحب نے یہ کہہ رکھا تھا کہ کھانا لا کر اس طاق میں رکھ دیا کرو اور سالن تم لے جایا کرو۔ وہ سالن تو دونوں وقت اپنے گھر لے جاتے اور کچھ بڑھیا مال ہوتا تو وہیں صاف کر دیتے۔ ولایتی مولوی ہر وقت چادر اوڑھے رکھتے تھے۔ اس چادر کو پھیلا کر مولوی سعید اس پر رکھ دیتے۔ میں نے ان کو روٹی کھاتے دیکھا ہے کہ مطالعہ بڑے غور سے کرتے رہتے، خوب حاشیہ وغیرہ دیکھتے اور ایک لقمہ توڑ کر بغیر سالن کے منہ میں رکھ لیتے اور پان کی طرح اس کو چبا لیتے اور کھا کر لوٹے میں جو پانی رہتا اس کو پی لیتے، گرم ہوتا یا ٹھنڈا۔

مجھے اس وقت بھی ان کے مطالعہ پر بڑا رشک آتا تھا۔ حالانکہ میں اس وقت بہت ہی بچہ تھا اور اب جب کبھی وہ منظر یاد آتا ہے بڑا لطف آتا ہے اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کا مقولہ یاد آ جاتا ہے کہ ''کام تو یوں ہوا کرے۔'' مگر پڑھنے اور پڑھانے والوں دونوں ہی کا کمال تھا کہ

سار ی رات پڑھنے پڑھانے میں ہی خرچ فرمادیتے تھے۔

مظاہر علوم کی تدریس:

چچا جان قدس سرہٗ ان مجاہدات، عبادات، ریاضات کی وجہ سے کتب خانہ کے کسی کام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ایک منشی محمد حسین صاحب فیض آبادی تھے جو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گویا منیجر تھے اور کتب خانہ کا سارا کام اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے میں بھی اور حضرت کے وصال کے بعد بھی وہی کیا کرتے تھے۔ بڑی محنت اور جانفشانی اور دل سوزی سے کیا کرتے تھے۔ ایک عادت مرحوم کی یہ تھی کہ میرے والد صاحب جب کبھی سفر میں ہوتے تو وہ ان کی آمدہ ڈاک پر پتہ کاٹ کر جہاں ابا جان کا قیام ہوتا وہاں کا پتہ لکھ دیتے اور انہی خطوط پر اپنا مضمون بھی لکھ دیا کرتے تھے جو قانونی جرم تھا۔ مگر اس کی ان کو خبر نہ تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ ان پر مقدمہ قائم ہوگیا اور سنا یہ گیا کہ یہ تو سنگین جرم ہے۔ وہ روپوش ہو کر مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہیں انتقال بھی ہوا۔ منشی صاحب مرحوم نے ایک مرتبہ میرے چچا جان کو ڈانٹ کر یوں ہی پھرتے رہتے ہو کوئی کام کتب خانہ کا بھی کرلیا کرو۔ میرے والد صاحب کو بہت ہی ناگوار ہوا اور منشی جی کو خوب ڈانٹا اور فرمایا کہ منشی جی میں تو یوں سمجھتا ہوں کہ اسی کی برکت سے مجھے روزی مل رہی ہے۔ حدیث پاک میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔ ’’ھل تنصرون و ترزقون الا بضعفائکم‘‘ (کذا فی المشکوٰۃ بروایۃ البخاری) رزق اور تم کو مدد کیا ضعفاء کے علاوہ کسی اور وجہ سے ہوتی؟ گنگوہ سے واپسی پر ۲۸ھ میں جب اکابر مظاہر علوم بہت سے حج کو چلے گئے تو ان کی غیبت میں چچا جان مظاہر علوم کے مدرس بنائے گئے تھے۔ زبان میں کچھ لکنت تھی جو بات چیت میں تو بالکل ظاہر نہ ہوتی تھی۔ مگر تقریر اور سبق میں بھی تقریر زور سے ہوتی تو اس کا اثر ظاہر ہوتا، جس سے بعض طالب علم کبھی شکایت بھی کرتے تھے مگر مجھ سے متعدد لوگوں نے بعد میں بیان کیا کہ ان سے پڑھنے والے علمی حیثیت سے بہت اونچے پہنچے۔

نظام الدین منتقل ہونا اور بیماری کا شدید حملہ:

میرے تایا ابا جان (مولانا محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) کے انتقال کے بعد اہلِ نظام الدین کے اصرار پر نظام الدین کی مسجد میں منتقل ہوئے۔ اتفاق سے اس انتقالی دور میں چچا جان کی طبیعت بہت ہی ناساز ہوگئی۔ مرض سہارنپور سے شروع ہوا۔ راستہ میں کاندھلہ دو تین دن قیام کا ارادہ تھا۔ وہاں پہنچ کر بہت ہی شدت مرض نے اختیار کی۔ حکیموں نے پانی پینے کو منع کردیا اور وہ غصے میں جوش میں پانی پینے کو دوڑتے۔ حالانکہ حرکت بھی دشوار تھی۔ یہ ناکارہ اس پوری بیماری میں ان

کی خدمت میں رہا۔ بڑے وقائع اس میں پیش آئے۔ ایک معمولی سی بات یہ کہ بہت بڑی جماعت جنات کی ان سے بیعت ہوئی۔ ایک دفعہ اصرار ہوا کہ بخار کا علاج چلتے پانی میں نہانا ہے اور حکیم نے وضو کو بھی منع کر رکھا تھا۔ تیمّم سے نماز پڑھتے تھے۔ مجھ پر خفا ہوئے کہ ان حکیموں کی ایسی تیسی۔ تم ان کے مقابلے میں حدیث کے علاج کو انکار کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا حدیث شریف ظنی ہے قطعی نہیں اور پھر یہ علاج جو احادیث میں وارد ہوئے ہیں یہ کلی نہیں۔ ہر شخص کے لیے اور ہر موسم کے لیے نہیں ہوا کرتے۔ طبیب کا علاج بھی مشروع ہے اور وہ احوال کے مناسب ہوتا ہے۔ غرض خوب مناظرہ ہوا اور مجھے خوب ڈانٹا، لیکن ان پر حدیث پاک کے اتباع کا جوش تھا، اس لیے خوب ڈانٹ پلائی کہ حدیث پاک کے مقابلے میں تم کسی حکیم کا نام لیتے ہو۔ یہ ولولہ بعض اوقات زوروں پر آجاتا تھا۔

ماحول کا اثر اور اس کے چند واقعات:

ایک ہمارے مخلص دوست مرحوم نے ان کو ایک خط سہارنپور سے دہلی لکھا۔ جس میں ایک عزیز کی بیماری کی تفصیل لکھ کر ایک تعویذ منگایا تھا اور جواب کے لیے اپنے پتہ کا لفافہ لکھا تھا۔ چچا جان نے ان کے لفافہ پر سے ان کا پتہ کاٹ کر میرا پتہ اور ان ہی کے خط پر یہ مضمون تحریر فرمایا کہ ان سے یہ کہہ دو کہ مغرب اور صبح کی نماز کے بعد بیمار کو مسجد میں لاکر تم سے دم کرائیں اور مجھے ایک دعا لکھی کہ تم یہ دعا پڑھ کر ان پر دم کر دیا کرو اور اگر وہ اس دعا سے اچھے نہ ہو تو ایسے کو زندہ رہنے کی ضرورت نہیں مر جانا اچھا ہے۔

میرا لڑکا عزیز طلحہ غالباً دو ڈھائی برس کا تھا۔ نظام الدین میں اتنا شدید بیمار ہوا کہ مایوسی کی حالت ہوگئی اور ان کو کسی تبلیغی جلسہ میں تشریف لے جانا تھا۔ جاتے ہوئے غالباً قاری داؤد مرحوم سے یا اسی نوع کے کسی اور سے ہمارے مدرسہ کے مدرس حدیث مولوی یونس صاحب کہتے ہیں کہ مجھے مولوی یونس میواتی مرحوم یاد ہیں اور بعض کو میاں جی موسیٰ کا نام یاد ہے کہا کہ دیکھ اگر میری واپسی سے پہلے طلحہ مر گیا تو اتنا ماروں گا کہ یاد رکھو گے۔

ان واقعات میں کچھ اشکال نہیں۔ ممکن ہے کہ چچا جان کو یہ کشف ہوا کہ اس کی صحت فلاں کی زور دار دعا پر موقوف ہے اس لیے سخت لفظ کہے۔ معلوم ہوا کہ عزیز ہارون کی والدہ کی شدت علالت میں بھی عزیزم مولانا یوسف صاحب مرحوم نے بھی اس قسم کا جملہ میاں جی موسیٰ سے کہا تھا۔ حدیث پاک میں ہے "ان من عباد اللّٰہ لو اقسم علی اللّٰہ لأبرہ أو کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام" اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اس کو

ضرور پورا فرمادیں گے۔ یہاں ایک بہت اہم چیز قابلِ لحاظ یہ بھی ہے کہ بعض روایات میں یہ بھی آیا "ومن یتال علی اللہ یکذبہ" جو اللہ تعالیٰ پر بتکلف قسم کھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو جھوٹا کردیں گے۔ اس کے لیے دونوں حدیث بہت ہی غور کی اور اہم ہیں ہر ایک کا مصداق الگ الگ ہے۔

جو حضرات واقعی اہلِ اللہ ہیں وہ اگر جوش میں کوئی بات فرمادیں وہ پہلی حدیث کا مصداق ہے اور جو اپنے آپ کو بزرگ ثابت کرنے کے واسطے پیش گوئیاں کریں وہ دوسری حدیث کے مصداق ہیں۔ میں اپنی کسی تالیف میں اس کو تفصیل سے لکھ بھی چکا ہوں۔ اس ناکارہ کا ذوق والد صاحب قدس سرہٗ کی برکت سے کچھ علمی ہوگیا تھا۔ اگرچہ رسمی بیعت شوال ۳۳ھ میں حضرت قدس سرہٗ کے یکسالہ قیام حجاز کی روانگی کے موقع پر ہوگئی تھی مگر ذکر شغل کی توفیق اب تک بھی نہ ہوئی۔

میرے چچا جان قدس سرہٗ اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات عطاء فرمائے۔ ان کی شفقتیں بچپن سے مجھ بہت بڑھتی رہیں۔ وہ مجھ پر بیعت کے بعد سے بہت ہی اصرار فرماتے رہے کہ تو ذکر کرلیا کر۔ مگر میں ہمیشہ اپنی نالائقی سے یہ جواب دیا کرتا تھا کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" ضربیں آپ لگائیں سبق میں پڑھاؤں۔ یہ لائن میرے بس کی نہیں ہے اور نہ میں اس کا اہل ہوں وغیرہ وغیرہ۔ مگر چچا جان کی شفقتیں ہمیشہ بہت ہی متقاضی رہیں۔ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ بذل کی طباعت کے سلسلے میں جب کبھی تھانہ بھون ہوتی تھی تو وہاں کا ماحول ہر وقت اسی کا تھا اور ماحول کا اثر تو ہوتا ہی ہے۔ اس کے بڑے تجربے ہیں۔ ایک غیر متعلق بات یاد آگئی۔

میرا ایک مخلص دوست لئیق مرحوم مظاہر علوم سے فارغ ہوا۔ استعداد بڑی اچھی تھی۔ میرے بڑے خصوصی تعلق والوں میں تھا۔ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ کی بھی اس پر بڑی شفقتیں تھیں۔ اس لیے فراغ پر میں نے ازخود اس کو مظاہر علوم کی شاخ میں ۲۰ روپے تنخواہ پر مدرس تجویز کیا۔ اس نے بخوشی پسند کیا، مگر دو تین دن بعد آکر اس نے قلت تنخواہ کا عذر کیا اور کہا کہ کم از کم پچیس روپے پر کام کرسکتا ہوں۔ میں نے معذرت کردی کہ بیس بھی تمہاری خصوصیات کی وجہ سے ہیں، ورنہ شاخ کی تنخواہیں پندرہ سے متجاوز نہیں ہیں۔ میں نے اس مرحوم کو تنخواہ کے غیر مقصود اور ناقابل التفات ہونے پر ترغیب اور نصیحت بھی کی۔ مگر اس نے خانگی ضروریات وغیرہ وغیرہ نہ معلوم کیا کیا ضروریات بیان کیں اور اس نے منظور نہ کیا۔ مولوی سعید خاں صاحب کا دور تھا۔ وہ اس کو ترغیب دے کر نظام الدین لے گئے۔ وہاں تدریس اور تبلیغ دونوں کام اس کے حوالے ہوئے اور آٹھ روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ نظام الدین کی حاضری تو میری ہوتی رہتی تھی۔ وہ مرحوم اکثر ملتا رہتا تھا۔ چونکہ چچا جان کے دور میں بھی مدرسہ اور تبلیغ کی سرپرستی اس ناکارہ کے ذمہ تھی۔ ایک سال بعد میرے پاس ایک درخواست وہاں کے مہتمم صاحب کی طرف سے پہنچی کہ مدرسہ کے یہ

مدرسین ہیں جن میں چار پانچ نام تھے ان میں ایک لئیق مرحوم کا بھی تھا۔ مہتمم صاحب نے لکھا تھا کہ ان لوگوں کی آٹھ روپے تنخواہ ہے۔ اگرچہ ان کی طرف سے کوئی درخواست نہیں ہے مگر میری سفارش ہے کہ دوروپے کا اضافہ ہر ایک کی تنخواہ میں کر دیا جائے۔ میں نے لکھا کہ ضرور، بلکہ چارروپے کا۔ مگر چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ ابھی تو دوروپے ہی رہنے دو، ہمارے مدرسین کی عادت نہ بگاڑو۔ میں نے مغرب کے بعد لئیق مرحوم کو بلایا۔ وہ انداز سے یا کسی کی روایت سے سمجھ گیا۔ مجھے اس کا گردن جھکا کر آنا اب تک یاد ہے۔ نہایت شرمندہ، نہایت محجوب، میں نے پوچھا کہ لئیق تو وہی تو ہے وہ خاموش رہا۔ میں نے کہا کہ خاموش رہنے کی ضرورت نہیں، میں تو بات پوچھتا ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ میں نظام الدین کا سرپرست ہوں اور میرا یہاں والوں سے تعلق بھی تجھ کو معلوم تھا۔ تو نے ہمارے بیس روپے پر تو ٹھوکر ماردی اور دو سال سے یہاں آٹھ روپے پر کام کر رہا ہے۔ اس مرحوم نے اللہ تعالیٰ اس کو بہت ہی درجات عطاء فرمائے۔ بہت مخلص اور نیک تھا۔ بہت ہی شرمندگی سے یوں کہا کہ ماحول کا اثر ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ آپ کو تو یاد ہوگا کہ بیس روپے بڑی خوشی سے میں نے قبول کیے تھے۔ مگر شاخ کے سب مدرسوں نے مجبور کیا کہ پچیس سے کم پر راضی نہ ہونا، تیری وجہ سے ہمارا بھی راستہ کھلے گا۔ لئیق مرحوم کے علاوہ اور بھی کئی ساتھ میرے اس نوع کے واقعے پیش آئے کہ یہاں کے ماحول میں اور نظام الدین کے ماحول میں بہت ہی تفاوت خاص طور سے چچا جان کے دور میں پیش آتا رہتا تھا۔

یہاں کئی آدمیوں کو ہم نے دس روپے معین مدرسی پر رکھنا چاہا اور وہاں جا کر وہ بلا تنخواہ محض کھانے پر تبلیغ وتدریس کا کام کرتے رہے۔ اگرچہ اس میں چچا جان کی برکت کو خاص دخل تھا۔ لیکن دوسرے درجے میں ماحول کا بھی اثر تھا اور یہ تو کئی سال ہوئے رمضان کے آنے والوں کے خطوط کئی ماہ تک آتے رہتے ہیں کہ رمضان مبارک میں جو لذت ذوق وشوق ذکر وتلاوت میں محسوس ہوتی تھی، وہ یہاں آکر نہیں رہی اور میں یہی جواب لکھواتا رہتا ہوں کہ یہ ماحول کا اثر ہے۔ آپ لوگ وہاں کا ذکر کا ماحول پیدا کریں تو یہ لذت وہاں بھی محسوس ہونے لگے گی۔ چچا جان کی شفقتیں بہت ہی زیادہ ہیں۔ مگر بعض دفعہ وہ ڈانٹ بھی خوب پلایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ عزیز ان مولانا یوسف مرحوم، مولانا انعام صاحب سلمہٗ یہاں دورہ پڑھتے تھے تو عزیز یوسف مرحوم کے داہنے ہاتھ میں زخم ہو گیا، شگاف آیا اور بہت ہی مرحوم کو تکلیف اُٹھانی پڑی۔ سال کا ختم تھا۔ جمادی الثانیہ آ گیا۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ سال تو قریب الختم ہے۔ کتابیں پوری ہو گئیں، معمولی سی رہ گئی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ لڑکوں کو ساتھ لیتا جاؤں۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ کا شکر ہے عزیز یوسف کو افاقہ ہے۔ دو چار روز میں انشاء

اللہ اچھا ہو جائے گا۔ امتحان قریب ہے۔ اس میں شرکت مناسب ہے۔ چچا جان میری عدم موافقت رائے پر ناراض ہوئے اور خود رائی پر خوب ڈانٹا۔ میں نے عرض کیا جناب نے مشورہ پوچھا تھا۔ مشورے میں تو جو خیر ہو وہی دیانت سے بتانا چاہیے۔ آپ اگر حکم فرماتے کہ میں لے جا رہا ہوں اور میں اس کی مخالفت کرتا تو خود رائی ہوتی۔ اس پر اور بھی ناراض ہوئے۔ حضرت رائے پوری بھی اس مجلس میں اول سے آخر تک شریک تھے اور نہایت ساکت رہے۔ میرے اُٹھنے کے بعد چچا جان نے حضرت رائے پوری سے پوچھا کہ میرا ناراض ہونا آپ کو ناگوار ہوگا۔ حضرت رائے پوری نے فرمایا کہ ہاں حضرت! سمجھ میں نہیں آیا۔ بات تو حضرت شیخ کی صحیح ہے۔ جب آپ نے مشورہ پوچھا تھا تو پھر بات تو وہی کہنی چاہیے تھی جو ان کی رائے تھی۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے بہت سادگی سے یوں فرمایا کہ حضرت! میں آخر چچا بھی تو ہوں۔ اس پر حضرت رائے پوری ہنس پڑے اور فرمایا کہ جناب کے چچا ہونے میں کیا انکار ہے کہ وہ کہیں اپنے آپ کو بڑا آدمی نہ سمجھنے لگے۔ یہاں اپنے بزرگوں کا ایک عجیب قصہ یاد آیا۔

میرے اجداد میں حضرت مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی بڑے مشہور اساتذہ کرام اور درس و تدریس کے امام اور دور دور کے ولایتی ان سے پڑھنے کے لیے آتے تھے اور ان کے والد ماجد مولانا ابوالحسن صاحب علمی درجہ میں ان کے برابر نہیں تھے۔ جنہوں نے کاندھلہ دیکھا وہ اس سے واقف ہیں کہ ہمارا مکان جو بڑا گھر کہلاتا ہے اس پر ایک کمرہ بنگلہ نما جس کی کھڑکیاں مسجد کی طرف باہر کھل رہی ہیں حضرت مولانا نور الحسن صاحب مسجد میں طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے۔ ولایتی قدآور مستعد طلبہ سبق میں شریک تھے۔ مولانا ابوالحسن صاحب نے اوپر کے کمرے سے آواز دے کر کہا کہ نور الحسن تم تو بالکل گدھے ہو۔ ولایتی شاگردوں کو جوش زیادہ آیا اور سب کے چہرے سُرخ ہو گئے۔ مولانا نور الحسن صاحب نے شاگردوں کا تیور دیکھا تو فرمایا کہ کچھ نہیں کچھ نہیں پڑھو۔ وہ یوں فرما رہے ہیں کہ میں باپ ہوں یہ بیٹا ہے۔

ان کا ایک عجیب قصہ ہے۔ میں بھی شتر بے مہار کی طرح کہیں سے کہیں منہ مار دیتا ہوں۔ برسات کا موسم تھا اور دھوپ بہت تیزی پر تھی۔ مولانا نور الحسن صاحب اپنی قلمی کتابوں کو دھوپ میں پھیلا رہے تھے اور پھیلاتے وقت ان کو صاف بھی کرتے تھے۔ مولانا ابوالحسن صاحب (ان کے والد) ان سے بار بار یہ فرماتے تھے کہ میاں نور الحسن دھوپ تیز ہے، وہ فرماتے کہ ابا جی ابھی آتا ہوں اور یہ کہہ کر پھر اپنی کتابوں کے پھیلانے میں لگ جاتے۔ دو تین دفعہ مولانا ابوالحسن صاحب نے ان کو تقاضہ کیا وہ جواب میں یہی کہتے رہے۔ دو تین دفعہ کے بعد مولانا ابوالحسن اُٹھے اور مولانا نور الحسن کے صاحبزادے (اپنے پوتے) خورد سال مولوی ضیاء الحسن صاحب کو اُٹھا کر

باہر چارپائی پر دھوپ میں بٹھادیا۔ مولانا نورالحسن صاحب کہنے لگے۔ اباجی بڑی تیز دھوپ ہورہی ہے۔ مولانا ابوالحسن صاحب نے فرمایا کہ اباجی کے دل پر بھی بڑی دیر سے یہی گزر رہی ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس ناکارہ کے چچاجان قدس سرہٗ کا ایک مشہور مقولہ تھا جو بارہا فرمایا کہ میری تبلیغ کا جتنا یہ (زکریا) مخالف ہے اتنا بڑے سے بڑا مخالف بھی مخالف نہ ہوگا اور میری تبلیغ کی تقویت اور حمایت جتنی اس سے حاصل ہے اتنی میرے کسی موافق سے موافق اور معین وکارکن سے بھی حاصل نہیں ہے اور دونوں ارشادان کے بالکل صحیح تھے۔ پہلے جملہ کی شرح تو یہ ہے کہ یہ ناکارہ سیہ کار نابکار علمی زور پر اشکالات خوب کیا کرتا تھا۔ یہاں بھی ایک جملہ معترضہ آگیا۔ میرے مخلص دوست قاری مفتی سعید مرحوم نے ایک مرتبہ مجھ سے یوں فرمایا کہ حضرت دہلوی کی چیزوں پر جتنا تم اعتراض کرتے تھے، مولوی یوسف مرحوم کی باتوں پر اتنا اعتراض نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ بالکل صحیح کہا۔ چچاجان کے سامنے تو میری حیثیت ایک شاگرد اور خورد کی تھی۔ میرے اعتراض سے نہ تو ان کی شان پر کوئی اثر پڑتا تھا اور نہ کام پر۔ عزیز یوسف کے ساتھ میرا معاملہ بڑائی کا ہے۔ مجمع میں اس پر اعتراض کرنے سے کام پر بھی اثر پڑے گا اور اس کے وقار پر بھی۔ اس لیے مجھے جو کہنا ہوتا ہے، تنہائی میں کہتا ہوں۔

چچاجان نوراللہ مرقدہٗ کے دوسرے جملے کا مطلب یہ تھا جس کو انہوں نے بار بار مجمع میں بھی فرمایا کہ میری بہ نسبت میرے معاصرین خاص طور سے حضرت مدنی، حضرت میرٹھی نوراللہ مرقدہما وغیرہ جتنا اس سے دبتے ہیں، مجھ سے نہیں دبتے۔ یہ میرے لیے وقایہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو وہ مجھے دبالیں اور یہ بالکل صحیح ہے۔ ان دونوں اکابر کے یہاں اس سیہ کار کی بہت ہی شنوائی تھی۔

ایک دفعہ نظام الدین میں یہ ناکارہ اور حضرت رائے پوری تشریف فرما تھے۔ چچاجان قدس سرہٗ نے خواب دیکھا کہ سب سے آگے چچاجان چل رہے ہیں، ان کے پیچھے میں چل رہا ہوں، میرے پیچھے حضرت اقدس مرشدی ومولائی سہارنپوری چل رہے ہیں۔ فرمایا کہ اس کی تعبیر دو۔ حضرت اقدس رائے پوری نے اپنی عادت کے موافق فرمادیا کہ اس کی تعبیر تو شیخ دیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ پہلا جزو تو صاف ہے کہ میں آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں مگر چلا نہیں جاتا مگر دوسرا جزو سمجھ میں نہ آیا۔ فرمانے لگے کہ بس! یہ خواب تو بہت صاف اور واقعہ ہے۔ کسی تعبیر کا محتاج نہیں ہے۔ میری پشت پناہی صرف تم سے ہورہی ہے۔ اگر تم نہ ہوتو میرے معاصرین مجھ کو دبالیں گے اور تمہاری پشت پناہی حضرت نوراللہ مرقدہٗ سے ہورہی ہے کہ حضرت کی وجہ سے یہ حضرات تم سے دب جاتے ہیں اور یہ بالکل صحیح فرمایا۔ بیسیوں واقعات اس قسم کے پیش آئے جن کا لکھوانا اب بے ادبی ہے۔ دو واقعے دونوں بزرگوں کے ایک ایک لکھواتا ہوں۔

تقسیم سے پہلے انگریزوں کے زمانے میں جبریہ تعلیم کا بڑا زور تھا۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ دونوں اس کے سخت مخالف تھے اور حضرت مدنی قدس سرہٗ اس کے موافق تھے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اپنے مدرسہ کے مفتی مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی مرحوم کو اسی کام پر لگا رکھا تھا اور ان کو چچا جان قدس سرہٗ کی ماتحتی میں دے رکھا تھا۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی اپنی مساعی جمیلہ تو ممبران اسمبلی وغیرہ کے نام خطوط اور وفود کی تھی۔ اس زمانے میں ایک رسالہ اس ناکارہ نے قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم تالیف کیا تھا اور چچا جان و مولانا عبدالکریم صاحب کی مساعی اس کے خلاف جلسوں وغیرہ کے کرنے کی تھیں جگہ جگہ جلسے کرایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ دونوں دوپہر کے وقت تشریف لائے کھانے کے لیے دسترخوان بچھ چکا تھا۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے پاس ایک کام کے لیے آئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ارشاد فرمائیں۔ فرمایا کہ دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ جبریہ تعلیم کے خلاف کرنا ہے اور حضرت مدنی کی صدارت میں کرنا ہے تجھے دیو بند جانا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ ضرور لیکن حفظ کا استثناء تو میری سمجھ میں آتا ہے ناظرہ کا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ حفظ پر تو دوسرے کام سے ضرور اثر پڑتا ہے۔ لیکن ناظرہ میں کچھ تاخیر ہو جائے اور اس کے ساتھ وہ لوگ اُردو حساب بھی پڑھ لیں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ چچا جان نے فرمایا کہ مناظرہ مت کرو چلو۔ میں نے عرض کیا کہ وہاں تو مجھے ہی بولنا پڑے گا۔ پہلے کچھ سمجھ تو لوں۔ مولوی عبدالکریم نے فرمایا کہ حضرت تھانوی نے دونوں کا استثناء کرنے کے لیے فرمایا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تھانوی کون بزرگ ہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟۔ یہ سن کر ان کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ یہاں سے اُٹھ کر چچا جان سے کہنے لگے کہ اس کے تو عقائد خراب ہو گئے ہیں۔ چچا جان نے ان ہی کے سامنے مجھ سے یہ فقرہ سنا یا میں نے کہا کہ تعجب ہے کہ مولوی صاحب آپ اتنے اُونچے ہو کر بھی یہ بات نہ سمجھے۔ حضرت تھانوی زادمجدہم کا ارشاد میرے اور آپ کے لیے حجت ہے۔ لیکن جن سے بات کرنے جارہے ہو ان کی حیثیت تو معاصرت کی ہے اور مسلم لیگ و کانگریس کی وجہ سے آپس کے تعلقات جیسے ہیں وہ آپ کو معلوم ہیں اور مجھے بھی۔ ان کے لیے یہ چیز حجت نہیں بنے گی کہ مولانا تھانوی نے فرمایا ہے کوئی دلیل بتلاؤ جوان کو سمجھائی جائے۔ اتنے میں گاڑی کا وقت ہو گیا اور ہم لوگ دو بجے والی سے دیو بند گئے۔ چچا جان آگے آگے ان کے بائیں جانب ذرا پیچھے کو میں اور میری بائیں طرف چچا جان کے پیچھے مولوی عبدالکریم صاحب۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے دروازے پر جب پہنچے تو حضرت اپنے مردانے مکان کی سہ دری سے باہر کو تشریف لارہے تھے۔ ملاقات پر بہت ہی اظہار مسرت کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ دہلی سے آرہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ یہی حضرات

سہارنپور سے آرہے ہیں اسی گاڑی سے دہلی سے آئے تھے اور مجھے ساتھ لے کر بارگاہِ عالی میں حاضر ہوئے ہیں۔ بہت تیز لہجہ میں فرمایا کہ کیا حکم ہے؟ میں نے کہا کہ یہ لوگ دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ حضور کی صدارت میں جبریہ تعلیم کے خلاف کرنا چاہتے ہیں۔ غصہ آگیا فرمایا کہ ہرگز صدارت نہیں کروں گا۔ تم لوگ سب کو جاہل رکھنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا کہ حضرت جی! آپ ساری دنیا کو عالم بنائیں ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ جو قرآن پاک پڑھ رہے ہیں ان کو جبراً نہ لیں۔ حضرت نے کھڑے کھڑے فرمایا کہ قرآن پاک کا انتظام آپ لوگ خارج میں کریں۔ قرآن شریف کا بہانہ کرکے یہ لوگ تعلیم سے ہٹ جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ تشریف تو رکھئے بیٹھ کر بات کریں گے۔ کمرے میں تشریف لے گئے۔ میں نے عرض کیا کہ خارج اوقات میں حفظ قرآن کیسے ہوسکتا ہے سارے دن محنت کرکے بھی مشکل سے ہوتا ہے فرمایا کہ میں نے تو جیل میں یاد کیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہی ریزولیوشن پاس کرادیجئے کہ جس کو قرآن پاک حفظ کرنا ہے وہ جیل چلا جائے۔ اس پر ہنس پڑے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جلسہ تو ہوگا اور جناب کی صدارت میں ہوگا۔ اللہ جل شانہٗ بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ ان کی شفقتیں محبت یاد کرکے رونے کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ ایسا خوشدلی سے استقبال فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ کیا اسی گاڑی سے چلنا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی نہیں۔ ابھی تو دہلی جاکر جلسے کا انتظام کریں گے۔ حضرت نے اپنی ڈائری نکالی اور اس میں مولانا الیاس صاحب کا جلسہ نوٹ فرمالیا اور تاریخ بتلادی اس کے بعد پھر جوش میں فرمانے لگے میں حفظ کے استثناء کو تو کہوں گا مگر ناظرہ کے استثناء کی کوئی وجہ نہیں میں نے عرض کیا کہ مضمون کی آپ پر کوئی پابندی نہیں۔ جو چاہے آپ ارشاد فرمائیں کہ جس کو حفظ کرنا ہے وہ جیل جائے۔ قرار یہ پایا کہ فلاں تاریخ کو چار بجے کے ایکسپریس سے یہ ناکارہ سہارنپور سے سوار ہوگا اور اسی گاڑی سے دیوبند سے حضرت مدنی سوار ہوں گے اور نو بجے کو دہلی میں جلسہ ہوگا۔ جب دہلی پر اسٹیشن پر پہنچے تو سارا پلیٹ فارم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شیخ الاسلام زندہ باد ''جمعیۃ العلماء زندہ باد'' کانگریس زندہ باد کے نعروں سے پورا اسٹیشن گونج رہا تھا اور میں سارے راستے یہ سوچتا چلا گیا کہ اگر حضرت نے ناظرہ کے عدم استثناء کا اعلان کردیا تو اور مصیبت آجائے گی۔ اسٹیشن پر مجمع کے درمیان میں حضرت مولانا الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب بھی موجود تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا دل خوش ہوگیا۔ اس لیے کہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سیہ کار کی بات کی بہت ہی وقعت تھی۔ اس لیے کہ بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں مرتبہ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کی ممبری میں جمعیۃ کے مشوروں میں وقف بل کے مسئلے میں اس کی نوبت آئی کہ جب میری رائے مفتی صاحب کے خلاف ہوئی تو یا تو انہوں نے میری رائے خوشی سے قبول فرمائی

یا بڑی فراخدلی سے یہ لکھ دیتے کہ بعض مخلص اہلِ علم کے رائے یہ ہے۔ وقف بل کے مسودے میں یہ بھی لفظ میری رائے کے ساتھ بغیر نام کے چھپا ہوا ہے۔ اتفاق سے مفتی صاحب اسی ڈبہ کے قریب تھے جس میں یہ ناکارہ اور حضرت مدنی تھے۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ تو استقبال والوں کے مصافحے میں ایسے پھنسے کہ کوئی حد نہیں اور چاروں طرف سے مجمع ان پر گرنے لگا اور میں نے مفتی صاحب کو بہت ہی غنیمت سمجھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور میں نے عرض کیا کہ استثناء ناظرہ اور حفظ دونوں کا کرنا ہے اور یہ حضرت حفظ کے لیے تو تیار ہیں مگر ناظرہ کو نہیں مانتے۔ مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے کہنے لگے کہ نہیں استثناء تو دونوں ہی کا ہونا چاہیے۔ میں نے بھی کہا کہ ہاں بغیر اس کے کام نہیں چلے گا۔ جلسے میں جا کر تقریر شروع ہو جائے گی۔ راستہ میں ہی نمٹ لیں۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ کی عادت شریفہ یہ تھی جس کا بارہا میں نے مشاہدہ خود بھی کیا کہ مفتی صاحب کی بات حضرت کے یہاں بہت وقیع اور اہم سمجھی جاتی تھی۔ بارہا میں نے دیکھا کہ حضرت نے اپنی رائے پر مفتی صاحب کی رائے کو ترجیح دی۔ مفتی صاحب میرے کہنے پر آگے بڑھے اور میں ذرا فصل سے پیچھے پیچھے کہ حضرت کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کہلوا رہا ہے۔ مفتی صاحب نے اسٹیشن کے زینے پر حضرت کے قریب ہو کر کان میں یہ کہا کہ حضرت استثناء حفظ و ناظرہ دونوں کا کرنا ہے۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اگر کسی نے بات کرتے دیکھا ہوگا تو اس کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح گردن ہلا کر بات فرمایا کرتے تھے۔ میرے سامنے تو وہ منظر خوب ہے۔

حضرت نے نہایت جوش میں فرمایا کہ نہیں ناظرہ کے استثناء کی کوئی وجہ نہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ حضرت پہلے چند پارے ناظرہ پڑھ کر ہی تو حفظ میں لگتے ہیں جب وہ ناظرہ میں اور کام میں لگ جائیں گے تو پھر ان کو حفظ کا وقت کب ملے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا۔ سیدھے جلسہ گاہ میں تشریف لے گئے۔ جلسہ کی شروعات بہت پہلے سے ہو چکی تھیں۔ سیدھے ممبر پر تشریف لے گئے اور جاتے ہی زوردار تقریر اپنی ''مہربان گورنمنٹ'' کے خلاف کی کہ لطف آ گیا اور کہا کہ ''ہمارے دین کو برباد کرنا چاہتی ہے اور ہمارے قرآن کو ضائع کرنا چاہتی ہے۔ اس کو ہمارے مذہب میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم اپنے قرآن پاک کی تعلیم کو کسی طرح ضائع نہ ہونے دیں گے۔ ناظرہ کا بھی استثناء کرنا ہوگا اور حفظ کا بھی استثناء کرنا ہوگا۔ چچا جان بہت ہی حیرت اور سوچ میں یہ سمجھے کہ راستہ میں کوئی گفتگو مجھ سے ہوئی ہوگی۔ غرض بہت زوردار جوش و خروش گورنمنٹ برطانیہ کو گالیاں دے کر اور ایک ریزولیشن قرآن پاک کی تعلیم خواہ حفظ کی ہو یا ناظرہ کی ہو جبریہ تعلیم سے مستثنیٰ ہونا نہایت ضروری ہے۔ تقریباً ڈیڑھ بجے تک جلسہ اور اس کے

بعد مختصر سا کھانا نوش فرما کر علی الصباح دیوبند تشریف لے آئے اور آ کر بخاری کا سبق پڑھادیا۔ بعد میں چچا جان نے مجھ سے پوچھا کہ تمہاری کوئی گفتگو ریل میں ہوئی ہوگی۔ میں نے کہا بالکل نہیں۔ دوسرا قصہ دوسرے حضرت کا بھی لکھواہی دوں اگرچہ بڑی گستاخیاں ہیں۔

چچا جان کا اصرار حضرت رائے پوری پر یہ رہتا تھا کہ دہلی تشریف آوری زیادہ ہوا کرے اور کئی دن کے واسطے ہوا کرے ایک دفعہ کچے گھر میں بیٹھے ہوئے حضرت سے چچا جان نے فرمایا کہ حضرت کی تشریف آوری تو دہلی خوب ہوتی ہے مگر جی چاہتا ہے کہ زیادہ دن کے لیے کثرت سے ہوا کرے۔ حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ حضرت میری حاضری تو ان پر موقوف ہے یہ جب آئیں اور جب تک رہیں میں حاضر ہوں اکیلے آنا تو بہت مشکل ہے۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو اپنا چچا جان ہونا یاد آ گیا۔ خوب ناراض ہوئے فرمایا کہ اللہ کے بندے جب حضرت کا آنا اتنا آسان ہے تو پھر بھی اتنی دیر کیوں ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ میرے چچا جان، میرے استاذ، میرے جانشین شیخ اور صنوالاب۔ یہ حضرت جی (حضرت رائے پوری) یوں کیوں نہیں فرماتے کہ جب آپ ارشاد فرمائیں میں حاضر ہوں یہ کیوں فرماتے ہیں کہ یہ جب کہے میں حاضر ہوں۔ اب دونوں بزرگ خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد میں نے یوں کہا اجی چچا جان! بات یوں ہے اگر یہ یوں کہہ دیں کہ جب آپ فرمادیں گے تو آپ ابھی بگل بول دیں گے کہ کل کو چلیں گے اور میرا دستور یوں ہے اور یہ حضرت اس کی شہادت بھی دیں گے کہ جب مجھے دہلی جانا ہوتا ہے تو میں ان حضرات سے یہ عرض کرتا ہوں کہ دہلی کا خیال ہے بشرطیکہ کسی جلسے میں نہ جانا ہو۔ میرے اس کہنے پر اگر یہ حضرت یوں ارشاد فرمائیں کہ جی تو میرا بھی چاہ رہا ہے تب تو میں ان سے عرض کیا کرتا ہوں کہ کب کا ارادہ ہے اور آپس کے صلاح مشورے سے تاریخ مقرر ہو جاتی ہے۔ آپ کو اطلاع دی جاتی ہے اور میرے ارادے کے اظہار پر اگر یہ حضرت ارشاد فرمادیں کہ میرا بھی سلام عرض کر دینا اور دعاء کی درخواست کر دینا تو میں کبھی بھی ان سے چلنے کو نہیں کہتا۔ حضرت رائے پوری بہت ہی ہنسے اور چچا جان سے فرمایا کہ حضرت انہوں نے بالکل سچ سچ فرمایا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں ضعیف آپ کے جنرلی احکام کا متحمل نہیں۔ چچا جان نے فرمایا کہ جلدی ہی تاریخ مقرر کرلو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے سامنے نہیں ہوگی۔ چچا جان تشریف لے گئے میں نے حضرت رائے پوری سے عرض کیا کہ آپ نے تو مجھے پٹوا ہی دیا۔ اب آپ بے تکلف جس وقت راحت ہو اس وقت تجویز فرمادیں۔ چچا جان کے اس ارشاد کی کہ جلدی تاریخ مقرر کرلو کوئی پابندی نہیں ہے۔ الزام میرے اوپر رہے گا اور یاد پڑتا ہے کہ میں نے شعر بھی پڑھا تھا:

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

حضرت نے فرمایا کہ تاریخ جلدی ہی مقرر کرلو حضرت دہلوی کو تو غصہ آرہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تو ایک ہی دن کے لیے تشریف لائے تھے شاید ادھر سے اُدھر جانے میں تکلیف ہو۔ دو چار دن ہفتہ عشرہ بعد جب دل چاہے مقرر فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جزاکم اللہ۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے سہولت شنبہ میں ہے کہ جمعہ یہاں کا ذرا اہم ہوتا ہے۔ فرمایا کہ بہت اچھا میں جمعہ کی شام کو شاہ صاحب کی کار میں آجاؤں گا۔ شنبہ کی تاریخ مقرر کرلو، چچا جان تو منتظر تھے میں نے عرض کیا کہ شنبہ کا دن مقرر ہو گیا۔ چچا جان بہت خوش ہوئے تین چار روز کے بعد واپسی کے وقت چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ میں تم کو سہارنپور تک پہنچانے چلوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے اعزاز کی ضرورت نہیں۔ ریل سیدھی سہارنپور جائے گی، راستہ معلوم ہے تقریباً دس منٹ میں اس پر اُلجھا۔ حضرت رائے پوری نے بھی میری تائید فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو ملاقات ہوگئی۔ پندرہ بیس دن کے بعد تشریف لائیں میں بھی آپ کی ہمرکابی میں رائے پور آؤں گا۔ مگر انہوں نے قبول نہ فرمایا۔ شدید گرمی کا زمانہ تھا طے ہوا کہ صبح کو چھ بجے چلیں گے اور جب طے ہو گیا تو چچا جان نے فرمایا کہ راستہ میں میرٹھ اُترنا ہے۔

اب میں سمجھا کہ ان کے اصرار کا اصل مبنیٰ کیا تھا۔ حضرت اقدس (رائے پوری) نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ واہ واہ ضرور میرا بھی کئی دن سے جانے کو جی چاہ رہا ہے مگر ان کے (ناکارہ) کے بغیر جانے کی ہمت نہ پڑی اور ان سے کہنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ اس وقت بہت اچھا موقع ہے آپ بھی ہوں گے یہ بھی ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو اُتروں گا نہیں سیدھا سہارنپور جاؤں گا۔ آپ دونوں حضرات اس گاڑی سے اُتر کر دوسری گاڑی سے سہارنپور تشریف لے آئیں وہاں استقبال کروں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تم نہیں اُترو گے تو میں بھی نہیں اُتروں گا۔ میں نے عرض کیا کہ چچا جان آپ کے ساتھ ہوں گے۔ چچا جان نے زور سے فرمایا کہ نہیں تم بھی اُترو گے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ حضرات کو میرٹھ گئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں میں تو جاتا ہی رہتا ہوں اور آپ دونوں کے لیے میری کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ مگر چچا جان نے بحق عمومیہ ایک ڈانٹ پلائی کہ نہیں چلنا ہے۔ میں ''قہر درویش بر جان درویش'' چپکا ہو گیا۔

حضرت میرٹھی و حضرت رائے پوری سے میری اور چچا کی تبلیغی سلسلہ میں گفتگو:

آٹھ بجے کے قریب میرٹھ پہنچے۔ حضرت میرٹھی نور اللہ مرقدہٗ اس قدر خوش ہوئے کہ کچھ حد و حساب نہیں اکابر کے ایک دوسرے کے یہاں مہمانی کے جو مناظر اُوپر لکھوا چکا ہوں اس سے بہت

زیادہ خوشی میں اچھل گئے اور دو گھنٹے میں اتنے لوازمات اکٹھے کیے کہ حیرت ہوگئی۔ حضرت رائے پوری کے لیے دو تین طرح کا سالن بے مرچ کا اور اس سیاہ کار کی چونکہ مرچیں اور گوشت ضرب المثل تھا اس لیے سیخ کے کباب گرم گرم دو تین مرتبہ منگائے گئے۔ شامی کباب گھر میں پکوائے گئے۔ میرٹھ کہ نہاری بھی بہت مشہور ہے وہ بازار سے منگا کر اور میری رعایت سے اس میں بہت سے مرچیں اور گھی ڈلوا کر خوب بھنوایا۔ ربڑی، بالائی، فیرنی، پلاؤ یہ سب چیزیں خوب یاد ہیں۔

گرمیوں کا چونکہ موسم تھا اور حضرت میرٹھی قدس سرہٗ کے زنانے مکان کے نیچے ایک تہ خانہ ہے نہایت ٹھنڈا۔ مولانا کو مکان بنانے کا بہت ہی سلیقہ تھا۔ بڑی بڑی جدتیں آتی تھیں۔ اس تہ خانہ کا ایک زینہ زنانے میں اور ایک مردانے میں اگر اس کو زنانہ کرنا ہے تو مردانہ زینہ بند کر دیا جاوے اور اگر مردانہ کرنا ہو تو زنانہ زینہ بند کر دیا جاتا ہے۔ مولانا نے اس میں خوب چھڑکاؤ کرایا تین چار پائیاں بچھوائیں اور خالی جگہ میں بوریا اس پر سیتل پاٹی کا فرش بچھوایا اور کھانے سے فارغ ہو کر بہت خوشی خوشی ہم لوگ آگے آگے اور مولانا میرٹھی ہمارے پیچھے پیچھے تہ خانہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے چار پائیوں کا ارادہ کیا۔

لیکن مولانا نے چچا جان کو خطاب فرما کر کہا کہ حضرت مولانا آپ کی خدمت میں بہت دنوں سے کچھ عرض کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ میری وہاں حاضری نہ ہوئی اور آپ یہاں تشریف نہ لا سکے۔ اس وقت یہ دونوں حضرات بھی تشریف فرما ہیں مجھے کچھ عرض کرنا ہے تھوڑی دیر تکلیف فرما دیں۔ نشست اس طرح کہ میں اور حضرت رائے پوری ایک جانب اور چچا جان و حضرت میرٹھی برابر برابر دوسری جانب۔ حضرت میرٹھی نے عرض کیا کہ تبلیغ تو سر آنکھوں پر اس سے تو کسی کو انکار نہیں اس کے ضروری ہونے میں بھی اور مفید ہونے میں بھی مگر جتنا غلو آپ نے اختیار کر لیا یہ اکابر کے طرز کے بالکل خلاف ہے آپ کا اوڑھنا بچھانا سب تبلیغ ہی بن گیا۔ آپ کے یہاں نہ مدارس کی اہمیت نہ خانقاہوں کی۔ چچا جان کو غصہ آ گیا۔ فرمایا کہ جب ضروری آپ بھی سمجھتے ہیں تو آپ خود کیوں نہیں کرتے اور جب کوئی کرتا نہیں تو مجھے سب کے حصہ میں فرض کفایہ ادا کرنا ہے۔ غرض دونوں بزرگوں میں خوب تیز کلامی ہوگئی اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کو کچھ ایسا رنج و قلق ہوا کہ کانپنے لگے۔

میں نے چپکے سے حضرت رائے پوری کے کہنی مار کر (وہ دونوں اپنی تقریر میں تھے انہوں نے سنا بھی نہیں) کہا کہ "میرٹھ اُتریں گے" "میرٹھ اُتریں گے" دو دو تین تین سانس کے فصل سے یہ جملہ تین مرتبہ کہا۔ میں بھی چار پانچ منٹ خاموش بیٹھا رہا اور جب میں نے دیکھا کہ دونوں اکابر کا جوش ڈھیلا پڑ گیا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت میں بھی کچھ عرض کروں تو تینوں حضرات نے متفق

اللسان ہوکر فرمایا کہ ضرور ضرور۔ حضرت رائے پوری نے فرمایا کہ اتنی دیر سے چپ بیٹھے رہے پہلے ہی سے بولتے۔ میں نے کہا کہ بڑوں کی باتوں میں سب کا چھوٹا کیا بولتا۔

میں نے حضرت میرٹھی کی طرف متوجہ ہوکر عرض کیا کہ حضرت آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں ان سب اشکالات میں آپ کے ساتھ ہی ہوں۔ اس لفظ پر چچا جان کو غصہ آ گیا۔ مگر بولے کچھ نہیں۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ کام کوئی دین کا ہو یا دنیا کا ہو تو چند مطلب بغیر نہیں ہوا کرتا۔ کام تو جو ہوتا ہے، یکسوئی سے اس کے پیچھے پڑ جانے سے ہوتا ہے۔ حضرت رائے پوری نے میری تائید کی کہ سچ فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ ذرا ٹھہر جایئے۔ اسی زمانے میں حضرت مرشدی سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کا ایک عتاب حضرت میرٹھی پر مدرسہ کے سلسلے میں ہو چکا تھا۔ جس کا حال مجھے اور مولانا میرٹھی کو صرف معلوم تھا اور کسی کو نہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت کا یہ ارشاد آپ کو یاد نہیں رہا جو ابھی گزرا ہے کہ میرے ساتھ تعلق تو مدرسہ کے ساتھ تعلق ہے، جس کو میرے مدرسہ کے ساتھ جتنا تعلق ہے اتنا ہی مجھ سے ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ساری دنیا میں ایک ہی مدرسہ ہے مظاہر علوم اس کے علاوہ اور کوئی مدرسہ نہیں؟ اور ابھی جلدی جلدی دو تین واقعے انہماک کے جس میں حضرت امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کے وصال کا حادثہ اور بھی کئی قصے سنائے۔ میں نے کہا کہ حضرت! چچا جان اپنے اس حال میں مغلوب ہیں آپ کو بھی معلوم ہے اور ہم کو بھی اور کوئی کام بغیر غلبۂ حال کے نہیں ہوتا۔ خبر نہیں کیا بات کہ حضرت میرٹھی کو ایک دم ہنسی آ گئی اور میرے چچا جان بھی ہنس پڑے۔ بات کو بھی دونوں ختم کرنا چاہتے تھے۔ حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ اسی وجہ سے تو (ناکارہ) آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کو ہر جگہ لے جانے کی ہم کو اسی وجہ سے تو ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے حضرت میرٹھی سے عرض کیا کہ اتنے تو مال کھلا دیے میرے سے تو بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اب آپ تشریف لے جاویں ہم کو آرام کرنے دیں، چنانچہ مولانا ایک دم اٹھ گئے۔ جب حضرت میرٹھی تشریف لے گئے تو میں نے دونوں بزرگوں سے عرض کیا کہ اسی وجہ سے تو خوشامد کر رہا تھا کہ سیدھے سیدھے چلے جاؤ۔ حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ واقعی اگر آپ کی بات مان لیتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ چچا جان نے فرمایا کہ نہیں بہت اچھا ہوا میں بھی ایک دفعہ کھل کر بات کرنے کو بہت دنوں سے سوچ رہا تھا۔ اس سے اچھا موقعہ نہیں ملتا تھا تمہارے اترنے پر میں نے اسی واسطے اصرار کیا تھا۔

ظہر کے لیے اٹھے تو پھر وہ ملاطفت اور انبساط اور شام کی چائے میں وہی فتوحات اور خندہ پیشانی۔ حضرت میرٹھی نے بھی چلتے وقت فرمایا کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تمہارے سامنے گفتگو ہو گئی کبیدگی پر اگر بات ختم ہوتی مجھے بھی قلق ہوتا۔ تیرے بول پڑنے سے خوشگواری پر ختم ہو گئی۔ یہ دو

نمونے تو میں نے چچا جان کے خواب کے اور ان کے ارشاد بالا کے مثال میں دونوں اکابر حضرت مدنی حضرت رائے پوری کا ایک ایک قصہ لکھوادیا:

ورنہ با تو ماجراہا داشتیم:

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ڈانٹ کے علاوہ شفقتوں کے واقعات بھی لَا تُعَدُّ وَلَا تُحصیٰ ہیں۔ ان کے یہاں تبلیغی سلسلہ میں بھی جب کوئی بات پیش آتی تو وہ بے تکلف فرمادیتے کہ شیخ کے یہاں جب تک پیش نہ ہو اس وقت تک فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میرے دہلی کے ہر سفر میں کئی کئی مسئلے ایسے ہوا کرتے تھے کہ جن کے متعلق میں سنتا تھا کہ وہ میرے مشورے اور منظوری پر رکے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ میں حاضر ہوا تو چچا جان نے فرمایا کہ ہمارے دوستوں کا اصرار یہ ہے کہ تبلیغی جماعت جب گشت کے واسطے جائے تو ایک مختصر سا جھنڈا ان کے پاس ہونا چاہیے میں نے عرض کیا کہ بالکل نہیں۔ فرمایا کہ کیوں؟ میں نے کہا کہ آپ کی جماعتیں تو نماز کے لیے بلانے جاتی ہیں اور مسجد میں جمع کرتی ہیں اور نماز کے لیے جھنڈا نصاریٰ رد ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ جزاکم اللہ بس بھائی ملتوی۔ ایک معمول چچا جان قدس سرہٗ کا مستقل یہ تھا اور بڑی باریک بات ہے کہ وہ جب کسی تبلیغی اجتماع سے واپس آتے تو ایک سفر رائے پور ضرور فرماتے، ورنہ کم از کم سہارنپور کا اور اگر دونوں کا موقع نہ ہوتا تو تین دن اعتکاف اپنی مسجد میں فرمایا کرتے تھے اور یہ ارشاد فرمایا کرتے کہ جلسوں کے زمانے میں ہر وقت مجمع کے درمیان میں رہنے سے طبیعت اور قلب پر ایک تکدر پیدا ہو جاتا ہے، اس کے دھونے کے واسطے یہ کرتا ہوں۔ میں یہ مضمون لکھوا رہا تھا کہ اتفاق سے مولانا منظور نعمانی زادمجدہم دیوبند سے تشریف لائے اور اس وقت تشریف فرما بھی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ مضمون خود حضرت دہلوی کے ملفوظات میں خود ان کا ارشاد بلفظہ منقول ہے۔

چنانچہ چچا جان کے ملفوظات منگوائے گئے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ فرمایا ”مجھے جب میوات بھی جانا ہوتا ہے تو میں ہمیشہ اہلِ خیر اور اہلِ ذکر کے مجمع کے ساتھ جاتا ہوں۔ پھر بھی عمومی اختلاط سے قلب کی حالت اس قدر متغیر ہو جاتی ہے کہ جب تک اعتکاف کے ذریعہ اسے غسل نہ دوں یا چند روز کے لیے سہارنپور یا رائے پور کے خاص مجمع اور خاص ماحول میں جا کر نہ رہوں قلب اپنی حالت پر نہیں آتا۔“

دوسروں سے بھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ ”دین کے کام کے لیے پھرنے والوں کو چاہیے کہ گشت اور چلت پھرت کے طبعی اثرات کو خلوتوں کے ذکر وفکر کے ذریعہ دھویا کریں۔“ انتہیٰ بلفظہ۔ مضمون تو یہ حدیث پاک سے بھی مستنبط ہے کہ مجمع کا اثر بڑوں کے قلب پر بھی پڑ جاتا ہے۔ مشکوٰۃ

شریف کی کتاب الطہارۃ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔ اس میں سورۂ روم تلاوت فرما رہے تھے کہ اس میں متشابہ لگا سلام پھیرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ اچھی طرح وضو نہیں کرتے (نماز میں شریک ہو جاتے ہیں) اور یہ لوگ ہماری قراءت قرآن میں گڑ بڑ پیدا کرتے ہیں۔ کذا فی المشکوٰۃ بروایۃ النسائی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اچھی طرح وضو نہ کرنے والوں کا اثر پڑ جاتا ہے تو پھر مجمع کا اثر جس میں ہر قسم کے فاسق و فاجر بھی موجود ہوں مشائخ کے اوپر کیوں نہ پڑے گا۔ جن اکابر و مشائخ کو مجامع سے کام پڑتا ہو تبلیغ میں ہو جلسوں اور مواعظ میں ہو بلکہ میرے نزدیک تو مدرسین کو بھی۔ کیونکہ طلبہ کی جماعت میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اپنے تزکیۂ قلوب کی طرف بہت توجہ اہتمام اور فکر کرنا چاہیے۔ اعتکاف کا اہتمام تو ہر شخص کو بہت دشوار ہے، لیکن ایسے مجامع کے درمیان میں اور ان کے بعد بھی کچھ وقت مراقبہ اور تسبیح اور درود شریف و استغفار میں کثرت سے خرچ کرنا چاہیے۔

چچا جان کے مرض الوصال کے زمانہ میں یہ ناکارہ کثرت سے حاضر ہوتا تھا اور مدرسہ کے اسباق کی وجہ سے طویل قیام نہ ہوتا تھا۔ اس واسطے بار بار واپسی ہوتی۔ ایک دفعہ چچا جان نے شفقت اور قلق کے ساتھ یوں فرمایا میرے جنۃ کی خاطر اتنی تکلیف کرتے ہو جس سے مجھے بہت ہی ندامت ہوتی ہے۔ اگر میرے کام کی خاطر تم اتنی جلدی جلدی آؤ تو میرا دل کتنا خوش ہو۔ جب حالت مایوسی کی ہو گئی تو اس ناکارہ نے طویل قیام کیا اور یہ میرے رجسٹر میں موجود ہوگا کہ میری آخری حاضری کس تاریخ کو ہوئی اور وصال تک وہیں قیام رہا۔ اس وقت میں حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب بھی موجود تھے۔ جناب الحاج حافظ فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی بھی جو ایک دو دن کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے مگر حالت کو دیکھ کر دو تین ہفتہ وہیں تشریف فرما رہے۔

چچا جان کے مجازین اور عزیز یوسف کی جانشینی:

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے سے مایوسی کی حالت میں وصال سے دو تین دن پہلے اس سیہ کار سے کہا کہ میرے آدمیوں میں چند لوگ صاحبِ نسبت ہیں۔ عزیز مولانا یوسف صاحب، قاری داؤد صاحب، سید رضا صاحب، مولانا انعام صاحب ان کے علاوہ حافظ مقبول صاحب اور مولوی احتشام صاحب کو اس سے پہلے اجازت ہو چکی تھی۔ چچا جان نے فرمایا میرے بعد ان میں سے کسی ایک کو مولانا رائے پوری کے مشورے سے بیعت کے لیے تجویز کر دو۔ میری رائے حافظ مقبول

حسن صاحب کے متعلق تھی کہ ان کو بہت پہلے سے خلافت ملی تھی۔ مدینہ منورہ سے ان کی خلافت کے متعلق مجھے لکھا کہ تیری رائے موافق ہو تو ان کو اجازت دے دو۔ ورنہ میری واپسی کا انتظار کرو۔ مگر حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی رائے عالی عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق تھی۔ میں نے حافظ مقبول کی وجہ ترجیح عرض کی اور یہ بھی کہا کہ عزیز یوسف نے ذکر و اذکار زیادہ نہیں کیے۔ حضرت کا مشہور جملہ جو بارہا انہوں نے فرمایا کہ تم لوگوں کی ابتداء وہاں سے ہوتی ہے جہاں ہم جیسوں کی انتہاء ہوتی ہے۔ اس جملہ کو ارشاد فرما کر ارشاد فرمایا کہا ان کو اذکار ضرورت نہیں۔ میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے پوری بات عرض کر دی۔ چچا جان نے حضرت اقدس رائے پوری کی تصویب کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا بھی یہی خیال تھا کہ میوات والے جتنے یوسف پر جمع ہو سکتے ہیں کسی اور پر نہ ہوں گے۔ میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی طرف سے ایک پرچہ لکھا کہ میں ان لوگوں کو بیعت کی اجازت دیتا ہوں۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے میری تحریر کے بیچ میں ''میں ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اجازت دیتا ہوں'' یہ جملہ بڑھوا دیا۔ مشائخ کے ہاں ایک نسبت خاصہ ہوتی ہے جو شیخ کے انتقال پر کسی ایک کی طرف جو شیخ سے زیادہ نسبت اتحادیہ رکھتا ہو اس کی طرف منتقل ہوا کرتی ہے۔

چچا جان قدس سرہٗ کے انتقال پر مولانا ظفر احمد صاحب نے ارشاد فرمایا کہ حضرت دہلوی کی نسبت خاصہ میری طرف منتقل ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ مبارک فرمائے۔ حضرت حافظ فخر الدین صاحب نے مجھ سے تو نہیں فرمایا مگر سنا کسی سے فرمایا تھا کہ میری طرف منتقل ہوئی۔ جب مجھ تک یہ فقرہ پہنچا تو میں نے کہا کہ اللہ مبارک فرمائے۔ حضرت اقدس رائے پوری کا رمضان مبارک میں یعنی چچا جان کے انتقال سے دو ماہ بعد رائے پور سے ایک والا نامہ آیا، جس میں حضرت قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ حضرت دہلوی کی نسبت خاصہ کے متعلق مختلف روایات سُننے میں آئیں۔ میرا خیال تمہارے متعلق تھا، مگر میری کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ اب حضرت حافظ فخر الدین صاحب کا والا نامہ آیا ہے، جس میں انہوں نے بڑے زور سے میرے خیال کی تائید لکھی ہے۔ اس لیے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، میں نے اسی وقت جواب لکھا کہ ''حضرت آپ حضرات نہ معلوم کہاں ہیں وہ تو لونڈا لے اُڑا۔''

شوال میں جب حسبِ معمول عید کے بعد رائے پور حاضری ہوئی تو عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی میرے ساتھ تھے۔ حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ رمضان میں تو میں نے آپ کے خط کو تواضع پر محمول کیا تھا، لیکن اب تو مولانا یوسف کو دیکھ کر آپ کی بات کی تصدیق کرنی پڑی۔ آپ نے بالکل سچ اور صحیح فرمایا۔ اب اس میں بالکل تردد نہ رہا۔ چچا جان کی

بیماری میں بھی عزیز یوسف مرحوم اکثر نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن چچا جان کے انتقال کے بعد صبح کی نماز جو اس نے پڑھائی ہے میرا دل تو اسی نے کھینچ لیا تھا اور میں اسی وقت سمجھ گیا کہ الوداعی معانقہ بیٹے کو دے گئے۔ ہوا یہ تھا کہ انتقال کے وقت بلکہ نزع شروع ہونے کے وقت چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے عزیز مولانا یوسف صاحب کو بلایا جو سو رہے تھے اور انتقال صبح اذان سے کچھ پہلے ہوا تھا اور بلا کر یوں فرمایا تھا کہ ''آ یوسف لپٹ لے ہم تو جا رہے ہیں۔'' وہ چچا جان کے سینے پر گر گیا اور بندہ کے خیال میں اسی وقت القائی کا القاء ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

تحدیث بالنعمۃ کے سلسلہ میں چند واقعات:

اس باب میں بہت کچھ لکھوانے کو جی چاہتا تھا۔ مگر ان میں خودستائی بھی بہت ہی ہے اور صرف اکابر کی شفقتوں پر ہی قناعت کر لی۔ البتہ دوستوں کا اصرار ہے کہ ایک واقعہ اور تحدیث بالنعمۃ کے ذیل میں لکھوا دوں۔ یہ تو بیسیوں واقعات سے معلوم ہو چکا بالخصوص آپ بیتی نمبر ا میں بھی کہ اس ناکارہ کی زندگی والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی حیات میں سخت ترین مجرم قیدیوں کی سی گزری۔ کہیں آنے جانے کی بغیر والد صاحب یا چچا جان نور اللہ مرقدہما کے اجازت نہ تھی۔

چچا زکریا مرحوم کی شادی اور اس میں بندہ کی شرکت اور وہاں کے دو لطیفے:

قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے سب سے چھوٹے نواسے چچا زکریا مرحوم جو مع اپنے اہل و عیال کے ۴۷ء کے فسادات میں غالباً غازی آباد کے اسٹیشن پر شہید کر دیے گئے تھے۔ ان کا نکاح حافظ ابراہیم صاحب گنگوہی کی صاحبزادی سے تجویز ہوا۔ حافظ ابراہیم صاحب اس وقت میں کھنہ جو سرہند شریف سے آگے ہے وہاں تھانیدار تھے۔ ان کے اہل و عیال بھی سب وہیں رہتے تھے۔ وہاں بارات گئی۔ حضرت قطب عالم کے سب سے بڑے نواسے چچا یعقوب صاحب کا اصرار ہوا کہ وہ مجھے بھی بارات میں ساتھ لے کر جائیں والد صاحب نے بھی تھوڑے سے اصرار کے بعد نواسوں کی خوشنودی کی بناء پر اس شرط پر اجازت دی کہ میں ہر وقت ان کے ساتھ رہوں۔ ان کو میرے والد صاحب کا میرے ساتھ کا برتاؤ پہلے سے معلوم تھا۔ انہوں نے بہت زور سے شرط قبول کر لی اور اس کو بہت اہتمام سے ہر جگہ پر نبھایا بھی۔ وہ ہر وقت مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ ان کو پیدل چلنے کا بہت شوق تھا۔ کھنہ کے اسٹیشن سے سب لوگ تو سواریوں میں گئے اور چچا یعقوب مجھے اپنے ساتھ پیدل لے کر گئے۔

پہلا لطیفہ تو وہاں یہ ہوا کہ ایک جگہ پہنچ کر دو سپاہی بندوق لگائے ہوئے تلوار ہاتھ میں لیے دور کھڑے تھے۔ معمولی سی روشنی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر ان دونوں نے کہا کہ ہُٹ ہُٹ ہُٹ۔ حافظ ابراہیم

صاحب بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے بھی اس طرح جواب دیا۔ اس پر ان دونوں نے جھک کر سلام کیا اور ایک طرف کو ہو گئے۔ میں نے چچا یعقوب صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا بلا تھی؟ انہوں نے کہا کہ یہاں سے تھانہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ پہرے دار ہیں، انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ میں داروغہ ہوں۔ انگریزی تو چچا یعقوب بھی نہیں جانتے تھے۔ بظاہر موقع و محل سے وہ سمجھے۔ حافظ ابراہیم صاحب نے بتایا کہ یہاں رات میں آنے والوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ کون ہے اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے تو دوسری مرتبہ کہا جاتا ہے کہ اپنی جگہ کھڑے رہو۔ اگر وہ کھڑا ہو جائے تو وہ لوگ اس سے تحقیق کرتے ہیں کہ کون ہے، کیوں آیا ہے۔ لیکن اگر دوسری دفعہ بھی جواب نہ دے تو ان لوگوں کو گولی مار دینے کی اجازت ہے۔

سرہند شریف کے مزار پر حاضری:

ہم جب کھنہ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ ان سب لوگوں نے تو کھانا کھایا اور معلوم نہیں کب سوئے۔ مگر میں جاتے ہی بغیر کھائے پڑ کر سو گیا۔ ایک دن دو شب قیام رہا۔ تیسرے دن وہاں سے مع دلہن کے واپسی ہوئی۔ میں تو چچا یعقوب صاحب کے ساتھ لٹکم تھا۔ میرا ٹکٹ بھی ان ہی کے پاس تھا۔ سرہند شریف آنے کے بعد مجھے بالکل خبر نہیں، نہ یاد کہ میں ریل سے کس طرح اُترا۔ بغیر ٹکٹ کے مجھے پلیٹ فارم سے بابو نے کیسے نکلنے دیا۔ میں نے تھوڑی دیر میں اپنے آپ کو روضۂ شریف کے پاس پایا۔ روضہ شریف کے پاس ایک سکھ کی دوکان پر گوشت روٹی فروخت ہو رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ چار پیسے میرے پاس تھے۔ میں نے کھانا خریدنے کا اس سے بہت ہی اصرار کیا۔ مگر جتنا اصرار کیا اتنی ہی شدت سے وہ انکار کرتا رہا۔ چونکہ اس کے منہ پر ڈاڑھی تھی اس لیے مجھے اس پر غیر مسلم ہونے کا شبہ بھی نہ ہوا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ سکھوں کے ڈاڑھی ہوتی ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سکھ تھا اور اس کے پاس جھٹکے کا گوشت تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے احسان سے حفاظت فرمائی۔

دن بھر روضہ کی پشت کی طرف جو جالیاں تھیں وہاں رہا۔ شام کے وقت وہاں سے چل کر اسٹیشن آیا اور اخیر شب میں سہارنپور پہنچا۔ معلوم نہیں کہ روضہ سے اسٹیشن تک بغیر پیسے میں کیسے آیا۔ یکہ (گھوڑا تانگہ) میں آنا تو خوب یاد ہے، نہ تو وہاں کے اسٹیشن پر مجھ سے کسی نے ٹکٹ کا مطالبہ کیا اور نہ سہارنپور کے اسٹیشن پر۔ چچا یعقوب اور سارے ساتھیوں پر میری گمشدگی کی وجہ سے کیا گزری اور یہاں پہنچ کر میرے والدین پر کیا گزری یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ بلکہ ظاہر ہے، یہاں پہنچنے کے بعد میرا خیال تھا کہ خوب پٹائی ہوگی، مگر جب میں والد صاحب کے سامنے آیا اور انہوں نے بہت

غصہ کی آواز سے پوچھا کہ تو کہاں رہ گیا تھا اور میں نے قصہ سنایا کہ مجھے تو خبر نہیں۔ میں تو ریل میں تھا مجھے ریل سے اُترنا یاد ہے اور نہ میں سرہند کے راستوں سے واقف۔ میں نے تو اپنے آپ کو اسٹیشن اور ریل کے بعد مزار پر پایا۔ یہ اس سیہ کار کی سب سے پہلی حاضری تھی اس کے بعد دوسری حاضری غالباً اعلیٰ حضرت رائے پوری کے حالات میں لکھوا چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے احسانات تو لاکھوں ہیں کتنے شمار کرائے جائیں۔

ایک قصہ اور یاد آیا معلوم نہیں کہ پہلے کہیں لکھوا تو نہیں چکا۔ اس لیے کہ بہت سے واقعات تو علی گڑھ میں لکھوائے گئے۔ واپسی کے بعد ان کے سننے میں اور چیزیں بھی اضافہ ہوتی رہیں۔ یہ ناکارہ اپنی نالائقی سے حضرت مرشدی قدس سرہٗ کو لینے کے لیے اسٹیشن نہیں جایا کرتا تھا حرج کا بہانہ نفس وشیطان پڑھاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت رنگون سے تشریف لا رہے تھے۔ یہ ناکارہ ایک ضرورت سے پٹھان پورہ گیا ہوا تھا۔ وہ اسٹیشن کے قریب تھا مجھے یاد آیا کہ حضرت کی تشریف آوری ہو رہی ہے اور کبھی اسٹیشن پر حاضری کی توفیق نہیں ہوتی۔ گاڑی کا وقت قریب تھا اور پیسہ جیب میں ڈالنے کی عادت والد صاحب نے ڈالی ہی نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسٹیشن پر بہت سے خدام ملیں گے کسی سے کہہ دوں گا کہ میرا بھی پلیٹ فارم لے لے۔ مگر جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو گاڑی کا وقت بالکل قریب تھا اور سب خدام استقبال کے لیے اندر پلیٹ فارم پر پہنچ چکے تھے۔

قرض پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنا:

میں ٹکٹ گھر کے قریب پہنچا اور وہاں کے بابو سے کہا کہ پیسہ میرے پاس اس وقت نہیں ہے۔ اگر آپ بطور قرض پلیٹ فارم دے سکتے ہوں تو دے دیں اس نے کھٹک کر کے فوراً ایک پلیٹ فارم میرے حوالہ کر دیا۔ میں اندر جو پہنچا تو سب سے پہلے مولانا منظور احمد خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدرس مدرسہ مظاہر علوم سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ چار پیسے جیب میں ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ بہت۔ میں نے کہا آپ کو تکلیف تو ہوگی آپ بابو صاحب کو چار پیسے دے آئیں اور ان کا شکریہ بھی ادا کر دیں۔ میں پلیٹ فارم قرض لے کر آیا ہوں۔ مولوی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ آپ کیوں میرا مذاق اُڑاتے ہو، کہیں پلیٹ فارم بھی قرض مل سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ ملا تو نہیں کرتا لیکن جس کا سارا کاروبار قرض پر چلتا ہو اس کو مل جاتا ہے۔ انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ تو میں نے کہا کہ لاؤ مجھے چار پیسے دو گاڑی آنے والی ہے۔ کہنے لگے کہ ہاں تم کو دے دوں گا اور جب میں پیسے لے کر ٹکٹ گھر کی طرف چلا تو وہ میرے پیچھے بہت تیزی سے ٹکٹ گھر کی طرف چلے اور جا کر اس سے پوچھا کہ کوئی شخص تم سے قرض پلیٹ فارم لے گیا ہے۔ اس نے کہا

ہاں لے گیا ہے مولوی صاحب نے اس سے پوچھا کہ قرض بھی پلیٹ فارم مل سکتا ہے۔ اس نے کہا ملتا تو نہیں۔ مگر اس کی صورت کہہ رہی تھی وہ دھوکا نہیں کر رہا۔ ہمیں بھی یہ امور اکثر پیش آجاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جیب میں پیسے ہیں۔ مگر جیب میں ہاتھ ڈالیں تو خیال غلط نکلتا ہے۔ لہٰذا یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ میری وجہ سے مولانا مرحوم کی گاڑی بھی چھوٹ جاتی جس کا مجھے قلق ہو رہا تھا۔ کیونکہ جب میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی سامنے آچکی تھی۔ مگر اللہ کے احسانات کا کیا پوچھنا کہ عین اسٹیشن کے قریب آخری سگنل نہیں دیا گیا اور جب مولانا منظور احمد صاحب پل پر پار ہو کر آخری پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تب گاڑی کا سگنل ہوا اور گاڑی اندر آگئی۔

بسم اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحیم

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد! یہ ناکارہ سفرِ حجاز کی وجہ سے رسالہ کو ختم کر چکا تھا اور اس کے بعد اپنا دستی بیگ کہ وہی ہر سال سفر حجاز میں میرے ساتھ رہا کرتا ہے اس نیت سے اُٹھوایا کہ اس میں کوئی چیز رکھنی ہو یا نکالنی ہو۔ کیونکہ گزشتہ سال سفر سے واپسی کے بعد سے اس کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس وقت جو دیکھا تو اس مرتبہ اس میں ایک لفافہ ملا جو ۸۳ھ کے حج میں جاتے ہوئے بندہ نے رکھا تھا۔ اس کے بعد کئی مرتبہ مکہ مکرمہ میں حاضری ہوئی اور ان خطوط کی زیارت بھی ہوئی۔ مگر چونکہ دو سال سے نزولِ آب تھا اس وجہ سے نہ یہ خطوط ذہن میں رہے اور نہ اس کی زیارت ہو سکی۔ اس وقت میرے دوستوں نے جب اس بیگ کو کھولا اور زائد کاغذات نکال کر ضروری کاغذات رکھے تو یہ لفافہ مجھے بتایا گیا اس کو سن کر مجھے بہت قلق ہوا۔ اگر پہلے اس کا علم ہوتا تو ان خطوط کو اپنے مواقع پر درج کراتا۔ اب عجلت میں اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں ان خطوط کی نقل اپنے دوستوں کو دیتا جاؤں کہ ابواب التحدیث بالنعمۃ کے ختم پر ان کو یکجائی نقل کر دیں کہ ہر ایک ان میں سے تحدیث بالنعمۃ ہے۔ گو ہر ایک مختلف ابواب کے ہیں۔ اس لفافہ میں بعض اکابر کے علاوہ ایک خط عزیز ماجد سلمہ کا بھی ملا جو تحدیث بالنعمۃ کا جزء ہے، اس کو بھی آخر میں نقل کر دیا۔

مکتوب نمبرا:

حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ

از مکہ معظمہ حارۃ الباب

مورخہ: ۲۵، جمادی الاول ۱۳۱۱ھ

از فقیر امداد اللہ عفی عنہٗ بخدمت سراپا جود وسخا حامی شریعت وطریقت جناب نواب (نواب چھتاری مرحوم۱۳) محمد محمود علی خان صاحب متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ !

جب سے آپ تشریف لے گئے ہیں دل کو بہت قلق ہے۔ امید ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ مع الخیر والعافیت اپنے وطن پہنچ کر اپنے فرزندان وعزیزان واقارب کے دیدار سے مسرور شادکام ہوئے ہوں گے۔ آپ بہت جلد اپنے مزاج مبارک کی خیریت وحالات سفر ودیگر حالات سے سرفراز فرمائیں۔ چونکہ فقیر کو آپ سے محبت للہ ہے اور (الدین النصیحۃ) بڑی خیرخواہی دین کی ہے۔ اس لیے خیرخواہانہ تحریر ہوتا ہے۔ آپ اپنی ریاست کا انتظام اور حق داروں کے ادائے حقوق کا بندوبست اس طرح سے کر کے یہاں تشریف لائیں کہ آپ کو کچھ تشویش نہ رہے۔ کیونکہ جب تک قلب تعلقات وتشویشاتِ دنیاوی میں مشغول رہے گا عبادت وطاعت کی لذت وحلاوت ہرگز نہ ملے گی۔ بلکہ جب تک دل ماسوا اللہ سے پاک وصاف نہ ہوگا تب تک نہ سچی توحید حاصل ہوگی اور نہ جمالِ مبارک حق آئینہ دل میں مشاہدہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے بندے کو ایک ہی قلب مخصوص اپنے واسطے عطاء کیا ہے کوئی دوسرا دل نہیں ہے کہ اس میں دوسرے تعلقات ومشاغل کو جگہ ہو۔ حرمین شریفین میں دل کو امور ومشاغل ہند میں مشغول رکھنا اس سے بہتر یہ ہے کہ ہند میں رہ کر دل کو حرمین شریفین کی طرف متوجہ رکھنا، کیونکہ حقیقت ہجرۃ قلب سے ہے۔ اگر قلب ہند میں رہا اور صرف ظاہری جسم حرمین شریفین میں رہا تو یہ ہجرۃ حقیقی نہ ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عمل معتبر قلب کا ہے ''ان اللّٰہ تعالیٰ ینظر الیٰ قلوبکم ولا ینظر الیٰ صورکم ''۔ اصلی ہجرت تو یہ ہے کہ اللہ کے واسطے اللہ کے سوا سب کو چھوڑ کر صرف اللہ کا ہو رہے اگر یہ نہ ہو سکے تو اس قدر ضرور ہے کہ آپ کو اور اپنی اولاد واموال وریاست اور سب کاموں کو اللہ کی وکالت کے سپرد کر کے خود تدبیر وبندوبست سے فارغ ہو جائے جب اللہ قادر رحیم وکریم وعلیم کو اپنا وکیل وکارساز بنا دیا تو بندۂ عاجز کسی کا محتاج نہ رہے گا۔ جب تک اللہ ورسول کی محبت سب چیزوں پر غالب نہ ہوگی اور امورِ دینی امورِ دنیا پر یعنی باقی فانی پر غالب نہ ہو جائیں گے تب تک بندہ کا ایمان پورا نہیں ہونے کا۔ مسلمان کو کامل مسلمان ہونے کی کوشش وفکر تو سب پر مقدم وفرض ہے، پس اپنے متعلق کوئی

جھگڑا و تعلق دنیاوی نہ رکھیں۔ جب سب اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیے اور دنیا پر عقبیٰ کو مقدم کر دیا تو سب کام درست وٹھیک ہو گئے۔ دنیا فانی بگڑی تو کیا اور بنی تو کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا تو ہرگز نہ بگڑے گی۔ عقبیٰ و دین کی درستی ہوگی تو ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے نزدیک بے حقیقت ہے۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں:

عشق برمردہ نباشد پائیدار عشق رابر حق وبرقیوم دار

اللہ تعالیٰ کے سوا سب فانی ہے اور عشق باقی باقی ہے۔ یا اللہ فانی کی محبت یعنی اولاد و اموال کی محبت اللہ حی و قیوم کی محبت سے ہم سب کو نہ روکے۔ پس مکہ اور مدینہ میں رہنے کا لطف جب ہی ہے کہ دل سب سے فارغ و خالی ہو۔ بہت علوم پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں جب عمل نہ ہو۔ نقل ہے کہ امام ابو یوسف صاحب نے حضرت ابراہیم قدس سرہٗ سے کہا کہ درویشی کے واسطے علوم کا سیکھنا ضروری ہے تو آپ نے جواب دیا کہ میں نے ایک حدیث سنی ہے (حب الدنیا راس کل خطیئة) جب اس حدیث پر عمل کرلوں تو اور علم سیکھوں۔ ہدایت کے واسطے ایک آیت ایک حدیث کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو توفیق عمل عطاء فرمائیں اور اپنی رضامندی پر چلائیں اور ماریں حقیقت میں اس حدیث پر عمل ہو جائے تو انسان مقبول خدا ہو جائے۔

صفات ذمائم جو مہلکات ہیں مثل طمع، حرص، حسد، کینہ، عداوت، غضب کبر بخل وغیرہ سب حب دنیا سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا ہی صفاتِ حمیدہ مثل صبر و توکل و رضا و قناعت و تواضع و سخاوت و حلم وغیرہ سب ترک حب دنیا سے حاصل ہوتے ہیں۔ اولاد کے برابر عزیز اور والدین کے برابر شفیق و مہربان کوئی نہیں مگر اس حب دنیا کی وجہ سے آپس میں مخالفت و عداوت ہو جاتی ہے اور جب حب دنیا ہی نہیں رہی تو سارے جہاں کے غیر عزیز دوست ہو جاتے ہیں (اللّٰھم اجعلنا منھم)۔ ایک بات ضروری یہ ہے کہ داد و دہش کا جھگڑا بھی اپنے ساتھ نہ ہو تو بہتر ہے۔ بلکہ کل مد صدقات خیرات بھی متعلق ریاست کر دی جائے۔ بندہ کو اپنے آپ کو اپنے جسم و روح کو اللہ تعالیٰ کو دے دینا یہ ہی حقیقی سخاوت و جوادی ہے۔ جب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کو دے دیا تو اب کوئی جود و سخاوت باقی نہ رہی۔ اب اس کو لاکھ و کروڑ روزانہ خرچ کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ اہل اللہ کے برابر کوئی جواد و سخی نہیں ہوسکتا۔ فقیر کی یہ بھی صلاح نہ ہوتی کہ آپ اپنے مصارف کے واسطے کچھ ریاست مقرر کرلیں۔ لیکن چونکہ ساری عمر نظر اسباب پر رہی اس لیے اس بارے میں فقیر کچھ نہیں کہتا آپ اپنے نفس سے زیادہ واقف ہیں کیونکہ درویشی میں یہ بڑا شرک ہے کہ رہے تو باب اللہ و باب الرسول پر اور رزق مانگے ہندوستان سے۔ کسی امیر کے دروازہ پر ہی کسی دوسرے سے مانگ کر کھانا امیر کی غیرت و غصہ کا سبب ہے یہ کوئی بڑے درجات و مراتب کی بات نہیں بلکہ کمال ایمان اور کمال ادب کی بات ہے۔

پس آپ صرف اپنے ضروری خرچ کے سوا زیادہ مقرر نہ کریں کہ لوگ آپ کی تضییع اوقات اور تشویش کے باعث ہوں۔ بڑی خرابی امراء اور رئیسوں کی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نے مشورہ لینے کی سنت کو اپنی کج فہمی سے ترک کر دیا۔ مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ”وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ تاکید فرمائی ہے۔ نصرانیوں نے اس حدیث پر اس درجہ عمل کیا کہ ہزاروں قسم کی مجلسیں مقرر کیں ہر اخبار اور ہر رعیت کو رائے دینے کا مجاز کیا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہے ان کو بھی معلوم ہے۔ مسلمانوں کو خبط ہے کہ جب ہم دوسروں سے رائے لیں گے تو ہم کو لوگ کم عقل سمجھیں گے۔ ہماری حکومت میں شریک ہو جائیں گے یا تکبر سے کسی کو مشورہ کے قابل نہیں سمجھتے۔ غرض کہ اس قسم کے بیسیوں خبط ہیں۔ پس اپنے خیر خواہوں سے مشورہ کر کے اپنے سب کاموں کا انتظام و انصرام بخوبی کر کے تشریف لائیں۔ اگرچہ پانچ چار مہینہ زیادہ ہی توقف کرنا پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ ادھورا کام چھوڑ کر آنے میں پھر ویسے ہی تشویش وتردد رہے گی۔ زمانہ میں عقل کے ساتھ دیانت دار کمیاب ہیں۔ اگر ایسے لوگ مل جائیں تو اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرنا چاہیے اور ایسے آدمی کی بہت قدر کرنی چاہیے ”لا یشکر اللّٰہ من لا یشکر النّاس“ خود اللہ تعالیٰ شاکر و مشکور ہے۔ ہر شخص کی استعداد و اعمال کے مطابق برتاؤ فرماتا ہے۔ نیکوں کو ہر ایک نیکی کے بدلے دس سے کم نہیں زیادہ کہ انتہاء نہیں عنایت کرتا ہے اور برائی کا بدلہ ایک برائی خود فرماتا ہے ”افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا لایستوون“ اس مسئلہ پر بھی فرنگیوں نے ایسا عمل کیا کہ جیسا چاہیں ادنیٰ ملازم یا ادنیٰ رعیت کچھ اچھا کام کرتی ہے تو اس کا کیسا شکر کرتے ہیں۔ اگر ملازم ہے تو ہمیشہ اس کی کارگزاری کی کتاب میں تعریف و توصیف لکھتے ہیں اور اس کی خدمت کے لائق برابر ترقی کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض وقت دس روپیہ والے کی ترقی ہزار دو ہزار تک ہو جاتی ہے ویسا ہی بذریعہ خطاب وغیرہ کے ملازم و رعایا کی عزت کرتے ہیں۔ اس سے اس کی دیانت و ہمت بڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر دیانت دار اور غیر دیانت دار کے ساتھ ایک سا سلوک ہوگا تو دیانت دار کی ہمت اس کی خیر خواہی کی طرف سے سست ہو جائے گی۔ پھر تو سب کام خراب ہو جائیں گے۔

مسلمان رئیسوں کی زیادہ خرابی اس سے ہوئی کہ انہوں نے اہل نا اہل میں تمیز نہ کی اور بہت رئیسوں نے جان بھی لیا کہ فلاں شخص عاقل دیانت دار ہے مگر تکبر یا بدعقلی کی وجہ سے اس کی قدر نہیں کرتے۔

بعضوں کو یہ خبط ہے کہ اگر ہم اس کی تعریف کریں گے یا ترقی کریں گے تو یہ خراب ہو جائیں گے۔ نعوذ باللہ اپنی عقل کو اسرار شریعت سے بھی بڑھ کر سمجھنے لگے۔ فقیر نے بار بار دیکھا کہ دیانت

دار کو خائن خود رئیس کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ملازم نے اپنے اوقات کو تو اپنے آقا کے ہاتھ اپنی رفع حوائج کے واسطے بیچ ڈالا۔ جب آقا کو اپنے ملازم کی حاجات وضروریات کا خیال نہ ہوگا۔ مثلاً اس کی حیثیت کو موافق اس کی رفع حاجت پچاس میں ہو اور وہ پچیس دے تو وہ ملازم اور حاجتوں کو کہاں سے پورا کرے۔ آخر وہ خیانت کی طرف مجبور ہوگا۔ پس اس میں اللہ اور رسول کے قانون کے موافق کاروائی ہونے سے سب امور ٹھیک ہوتے ہیں۔

عزیزم مولوی منور علی صاحب سلمہ کو ان کے مکان پر بتاکید بھیج دیجئے اور عزیز مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ یا دیگر برادران طریقت سے جیسے عزیزم مولوی محمد انوار اللہ صاحب وغیرہ سے آپ ملیں تو بہت خوب ہے۔ آپس میں ملنے سے اپنی جماعت میں محبت واتحاد واتفاق کی ترقی ہوتی ہے۔ آپ بھی کوشش وہمت کریں کہ فقیر کی جماعت علماء میں موافقت واتحاد کی ترقی ہو للہیہ محبت کی فضیلت کا کچھ حد وحساب نہیں۔ آپ کی رباط شامیہ میں چند دنوں سے پانی اور روشنی موقوف ہے۔ حالانکہ آپ کی طرف سے بہت جگہوں پر بڑی فیاضی سے سبیل وغیرہ جاری ہے۔ یہاں پانی دینا اور جگہوں سے افضل ہے۔ انتظام کے وقت قاری احمد صاحب کے مدرسہ کا بھی خیال رہے بلکہ حرمین شریفین میں جن جن کا مقرر ہے ان سب کو متعلق ریاست کر دیجئے کہ سب کو وہیں سے آجائے، آپ کو کوئی طلب وتقاضا کرنے میں تشویش میں نہ ڈالے۔ فقط

مکتوب نمبر۲:

حضرت اقدس قطب عالم مولانا گنگوہی

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہٗ۔ بعد سلام مسنون

آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے خط سے حال دریافت ہوا۔ عرصہ کے بعد آپ کا خط آیا۔ مجھے آپ کے لیے دعائے خیر سے کیا دریغ ہے۔ آپ لکھیں یا نہ لکھیں میں اپنے احباب ومتعلقین کے لیے ہمیشہ دستِ بہ دعا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آپ کو شاید پہلے بھی کسی وقت لکھا گیا ہو اب پھر تحریر ہے کہ آپ بعد نماز عشاء سو بار "**حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل**" پڑھ لیا کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں وہی سب کا کفیل اور کارساز ہے۔ فقط والسلام

از بندہ محمد یحییٰ السلام علیکم

آپ کی تشویش سے تشویش ہے۔ داموں کا کچھ تقاضا نہیں ہے۔ مگر اپنی عملداری میں ان دو پرچوں کی کافی تشہیر فرمادیں۔ فقط والسلام

مکتوب نمبر۳:

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہٗ

بعد سلام مسنون، آنکہ بندہ بخیریت ہے۔

مژدۂ عافیت باعث طمانیت ہوا۔ میں دعاء گو ہوں، دعائے خیر کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ چونکہ نجات اور فلاح بجز اتباع سنت کے میسر و نصیب نہیں ہے۔ اس لیے اتباع سنت سے چارہ نہیں ہے۔ اسی لیے بیعت کی جاتی ہے اور اسی واسطے تحصیل علم ہے۔ جب یہ نہیں ہے تو سب ہیچ اور بے فائدہ ہیں۔ زیادہ اس بارے میں لکھنے کی حاجت نہیں۔ ''**اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول**'' اور ''**فاتبعونی یحببکم اللّٰہ**'' خود وارد ہوا ہے۔ فقط والسلام

از کاتب الحروف یحیٰی عفی عنہٗ بعد سلام مسنون

گزارش آنکہ یہ اشتہار دو چار کی نظر سے گزار دیں۔ اس میں تعلیم الدین، امداد السلوک، اتمام النعم، جزاء الاعمال نہایت مفید ہیں اور ہر شخص کے دیکھنے کے قابل ہے۔ فقط والسلام،

۱۷ر ذو القعدہ ۱۸ھ

مکتوب نمبر۴:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

بسم اللّٰہ الرَّحمن الرَّحیم

کم ترین خلائق محمد قاسم مولوی احمد حسن صاحب کی خدمت میں بعد سلام مسنون عرض پرداز ہے کہ پیر جی مخدوم بخش صاحب کا خط جو آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا حاجی صاحب کے ہاتھ پہنچا۔ پیر جی صاحب کی شدت بیماری سے بہت رنج ہے۔ خداوند کریم ان کو شفاء عنایت فرمائے۔ ان کے اخلاق اور عنایتیں یاد آتی ہیں اور جی کڑھتا رہتا ہے۔ بندہ عجیب ہے۔ (فوٹو پر دھبہ آگیا ہے، جس کی وجہ سے یہ لفظ نہیں پڑھا گیا) ساری بات خدا کے ہاتھ ہے جو چاہے سو کرے اور بیعت کا حال کیا کہوں۔ میں تو بخدا اپنے آپ کو اس کے لائق نہیں سمجھتا۔ پر بزرگوں کے فرمانے کے موافق کرتا ہوں۔ لیکن تاہم اپنی طرف سے بیعت کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صاحب کبھی گرد ہوتے ہیں اور نوبت لاچاری کی پہنچتی ہے تو حضرت پیر و مرشد کی طرف بیعت کر لیتا ہوں۔ مگر ظاہر ہے کہ جیسی بزرگوں کی شان ہوتی ہے انہیں کے موافق اگر کوئی شخص نکلتا ہے تو خیر نہیں تو بزرگوں کے نام پر بٹہ لگتا دیکھ کر جی کو رنج ہوتا ہے۔ سو پورا پورا ہونا اور ظاہر و باطن کے درست ہونا لوگوں کو کہاں میسر۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ظاہر تو موافق شریعت و سنت ہو جائے۔ اس لیے جس سے

یہ امید ہوتی ہے کہ یہ شخص بدعات کے باب میں میرا کہنا مان لے گا تو البتہ میں دریغ کم کرتا ہوں، ورنہ بجز انکار کچھ تدبیر بن نہیں پڑتی اور پیر جی سے یہ توقع مشکل ہے۔ خیر ان کی خدمت میں بعد سلام اور مزاج پُرسی یہ عرض کر دینا اگر وہ منظور فرمائیں تو بندہ غائبانہ حضرت کی طرف سے ان کو بیعت کر چکا ہے اگر انہوں نے اس بیعت کو نبھایا تو موافق حدیث ''**بیعة فمن وفی فاجره علی اللّٰه**'' کے انشاء اللہ ان کو اجر عظیم ہوگا، ورنہ موافق ''**ومن اصاب من ذٰلک شیئاً**'' ان کا اللہ کے ساتھ معاملہ باقی رہے گا۔ مگر اتنا اور بھی عرض کر دینا کہ بیعت کی ایک ظاہر شکل ہے خدا سے دوسروں کو گواہ کر کے اس کا توڑنا سخت بُرا ہے۔ فقط

(۵)...... حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے حالات میں تلبینہ کا ایک قصہ لکھوا چکا ہوں۔ اتفاق سے ان خطوط میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے ساتھ تلبینہ کے قصہ کی وہ مراسلت بھی مل گئی، وہ بھی درج ذیل ہے:

بحضرت اقدس ادام اللہ ظلال برکاتہم۔ بعد ہدیہ سلام نیاز آنکہ یک نہایت مختصر ہدیہ پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ احادیث میں ایک چیز تلبینہ کے نام سے وارد ہوئی ہے، جس کے اجزاء ملا علی قاری نے آٹا، دودھ اور شہد لکھے ہیں۔ ذرا سی زعفران کا خوشبو کی مد میں اضافہ میں نے کر دیا۔ ایک مرتبہ تجربۃً عرصہ ہوا پکوائی تھی تو بہت لذیذ معلوم ہوئی تھی، بے اختیار اس وقت دل چاہا کہ شاید حضرت والا کو بھی پسند آئے اس وقت اس کی کیا صورت ہوگی یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ مگر اجزاء کو جوڑ دیا۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: ''**تقول سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول ان التلبینة تجم فواد المریض و تذهب الحزن وفی اخری للبخاری عن عائشة انها کانت تأمر بالتلبینة و تقول هو البغیض النافع قال الحافظ ابن حجر فی الفتح و قع عند احمد و ابن ماجة عن عائشة مرفوعا علیکم بالبغیض النافع التلبینة یعنی الحساء و اخرجه النسائی من وجه اخر عن عائشة و زاد والذی نفس محمد بیده انها لتغسل بطن احدکم کما یغسل احدکم الوسخ عن وجهه بالماء**'' اس کی اصل روایات سے رقیق ہونا معلوم ہوتا ہے، مگر معلوم ہوا کہ حضرت کو شاید جامد پسند ہو کہ فیرنی کو رغبت سے نوش فرمانا معلوم ہوا اس لیے جامد کرا دیا۔ حکیم خلیل احمد صاحب سے اجزاء لکھ کر اس کا استفسار بھی کر لیا کہ حضرت کے لیے مضر نہیں ہے۔

زکریا کاندھلوی

جواب:

مجی محبوبی دام حبہم ،السلام علیکم

ایسا متبرک ہدیہ کس کونصیب ہوتا ہے،مگر غلبۂ محبت سے اس میں تدبر سے کام نہیں لیا گیا۔جیسا کہ عشق کے لیے لازم ہے،ورنہ عقل کا فتویٰ یہ تھا کہ مجھ کو بتایا نہ جاتا کہ کیا ہے جب خلوئے ذہن کی حالت میں اس کی پسندیدگی ظاہر کرتا،اس وقت اس کی حقیقت ظاہر کردی جاتی۔اب میں اس سوچ میں ہوں کہ استعمال نہ کرنا موہم اعراض ہے استعمال کے بعد رغبت کا نہ ہونا متحمل تو ہے اگر یہ احتمال واقع ہوتو اس سے بے رغبتی کا اظہار موہم اعتراض ہےاور یہ دونوں امر موہم صورۃ نہایت سوءادب ہے۔اب آپ کا تبرک اس انتظار میں رکھ لیا ہے کہ آپ اس مضیق سے مجھ کو نکا لیے۔

فقط والسلام:اشرف علی

بحضرت اقدس ادام اللّٰہ ظلال برکاتکم و متعنا بافاداتکم و فیوضکم

بہت ہی اچھا ہوا کہ حضرت والا نے ایک اشکال کی طرف تنبیہ فرمائی،جس کی طرف اس وقت ذہن کو التفات بھی نہیں ہوا تھا،مگر پہلے بسا اوقات بعض اشیاء کے متعلق اس نوع کے اشکالات پیش آجاتے تھے۔اب انشاء اللہ حضرت کی برکت سے اس کے حقیقی جواب کی طرف رہنمائی ہو جائے گی۔اس لیے اپنا ناقص خیال خدمت والا میں پیش کرکے استصواب اور حضرت والا کے ذہن میں کوئی اور جواب ہوتو استفادہ چاہتا ہوں۔چند امور بندہ کے ناقص خیال میں ہیں۔

(۱)......اس خاص موقعے پر تو خود حدیث کے الفاظ میں ''**البغیض النافع**'' سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے۔جس میں مریض کے ناپسند ہو جانے پر گویا تصریح ہے۔

(۲)......بندۂ ناکارہ نے اپنے پہلے عریضہ میں یہ عرض کیا تھا کہ اس وقت اس کی کیا حقیقت ہوگی،تو یہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کو بعینہ وہ شئی کہنا تو ممکن ہی نہیں اور ترکیب کیفیت کے تغیرات سے لذت وغیرہ امور میں تغیر ہو ہی جاتا ہے۔اس لیے ناپسندیدگی کو اس ترکیب کی طرف منسوب کرنا بہت اقرب معلوم ہوتا ہے۔ایک سالن کو ہم لوگ ہر وقت مشاہدہ کرتے ہیں کہ پکانے والیاں ایک ہی نوع کا مصالحہ سب ڈالتی ہیں،لیکن ایک کا پکا ہوا لذیذ ہوتا ہےاور وہی سالن ان ہی اجزاء سے دوسری کا پکایا ہوا لذیذ نہیں ہوتا اور یہ یقینی چیز ہے کہ صحابیات جیسی پکانے والیاں اب کہاں نصیب ہوسکتی ہیں۔حافظ یعقوب صاحب گنگوہی کی والدہ صاحبہ جیسا سالن پکاتی ہیں ہمیشہ میری اہلیہ مرحومہ نے کوشش کی کہ ویسا پک جائے مگر نہ پک سکا۔

زکریا کاندھلوی

جواب:

السلام علیکم

(۲) تو میرے ذہن میں نہیں تھا۔ مگر (۱) میرے بھی ذہن میں تھا لیکن اپنے ضعف عقل کے سبب اس سے اس لیے شفاء نہ ہوئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تجویز کے بغیض فرمانے کا حق ہے۔ مگر حضور کے غلاموں کی اس کی ہمت نہیں ہوسکتی اور (۲) میں بھی ایک گونہ نسبت پھر بھی ہے اس لیے وہ کم ہمتی مشترک ہے۔ ان سب مقدمات میں غور کرنے سے یہ فیصلہ قرار پاتا ہے کہ اقویاء وسیع النظر کے مناسب آپ کی تحقیق ہے اور ضعفاء قاصر النظر کے لیے میرے احتمالات ''و انا من الضعفاء عسٰی ان اتقوی فیما بعد و حسبنا اللہ و نعم الو کیل''۔

اصل قصہ یہ نارکارہ لکھوا چکا ہے کہ حضرت نے تلبینہ کو رکھ تو لیا تھا پہلے ہی عریضہ پر اور واپس دوسرے پر بھی نہیں کرایا۔ مگر میں تحقیق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت نے نوش فرمایا یا نہیں یاد پڑتا ہے کہ کسی خادم نے یہ کہا تھا کہ حضرت نے نوش فرمایا۔ مگر یہ روایت محقق نہیں۔ فقط

اعلیٰ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی شفقتیں تو اس سیہ کار پر اسی وقت سے روز افزوں تھیں جب یہ ناکارہ بارہ سال کی عمر میں سہارنپور آ گیا تھا اور حکیم الامت قدس سرہ کی آمد اس زمانہ میں حضرت مرشدی قدس سرہ کی وجہ سے بہت ہی کثرت سے ہوتی تھی اور چونکہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کے ساتھ حکیم الامت قدس سرہ کا برتاؤ بہت مساویانہ اور دوستانہ ایسا تھا کہ ہم نوعمر بچے اس سے بہت حیرت کرتے تھے۔ میرے والد صاحب قدس سرہ کا تعلق حضرت سہارنپوری کے ساتھ بہت ہی زیادہ ادب واحترام کا تھا۔ اس لیے والد صاحب قدس سرہ نے حضرت گنگوہی قدس سرہ کے بعد میرے حضرت مرشدی سہارنپوری سے رجوع کر لیا تھا اور حضرت سہارنپوری ہی سے میرے والد صاحب کو بیعت کی اجازت بھی تھی۔ اس لیے مولانا سہارنپوری کا بہت ہی ادب فرمایا کرتے تھے۔

مکتوب نمبر۵:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، رئیس الاحرار بنام زکریا

۱۹ دسمبر ۵۲ء

محترم زید مجدکم، السلام علیکم

آپ کے خطوط نے اور بالخصوص اس خط نے جو عربی کے دو اشعار میں حضرت اقدس کو الوداع کہی جس کے آخر میں یہ ہے کہ اگر مر گئے تو قیامت میں ملاقات ہو جائے گی اور حضرت کا اس خط

کا پڑھ کر آنکھوں پر لگانا اور پھر سر پر رکھنا اور پھر اپنی جیب میں محفوظ کر لینا، اس واقعہ سے خاص لوگوں میں ایک پریشانی سی پیدا ہوگئی ہے۔ مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی نے آج مجھ سے یہ روایت بیان کی کہ آپ نے کسی مجلس میں مولانا علی میاں لکھنوی سے فرمایا کہ میں جس حال میں گزر رہا ہوں، اگر وہ حالت نہ بدلی تو میں چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرے جیسا کندذہن اور بے خبر آدمی ایسی باتوں کے سمجھنے سے قاصر ہے مگر اس دفعہ حضرت کی روانگی کا طریقہ اور آپ کی بے چینی اور حضرت مدنی مدظلہٗ العالی کا یہ فرمانا کہ کیوں جانے دیا۔ ان باتوں سے ایک قسم کی پریشانی مجھ جیسے لوگوں کو ضرور پیدا ہوگئی۔ اس معمہ کا کچھ نہ کچھ حل ضرور معلوم ہونا چاہیے۔ اگر میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو خود حاضر ہو کر تمام حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ میرے لیے دعاء فرمائیں کہ صحت کے ساتھ توجہ الی اللہ بھی نصیب ہو۔

والسلام

مذکورہ بالا خط کا جواب بندہ نے جو دیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آسکتا نہیں

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آپ آیندہ کی باتیں ایسے شخص سے دریافت کرتے ہیں جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ”کما یحب و یرضی“ کے لیے بھی علم غیب کا قائل نہیں۔ اس سلسلہ میں نہ سوچ کیجیے نہ کھوج کی فکر کیجیے۔ صرف دو اشعار اس کا خلاصہ ہیں:

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد

و گردم در کشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

زکریا

۴ ربیع الثانی ۷۲ھ

مکتوب نمبر ۶:

مولانا انعام الحسن صاحب بنام زکریا

مخدوم مکرم معظم محترم مدظلہم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمدللہ خیریت ہے، امید ہے کہ مزاج اقدس بخیر ہوں گے۔ والد صاحب کے ہمراہ عریضہ

ارسال کرنے کا ارادہ تھا، مگر کچھ ایسی صورت ان تین چار ایام میں رہی کہ بیٹھ کر لکھنے کی نوبت نہیں آئی اب اس وقت مولوی عبدالمنان صاحب کا لاہور سے خط آیا جو ارسال ہے۔ الحمد للہ حضرت اقدس بخیریت پہنچ گئے۔ حضرت عالی نے جس بات کے متعلق تحریر فرمایا تھا کہ حضرت اقدس کے بعجلت واپسی کا تذکرہ اگر کسی مجلس میں ہو تو اس کو تحریر کیا جائے۔ اخیر وقت تک نہیں آیا۔ اخیر وقت میں جب کہ حضرت اقدس ہوائی اڈے پر تشریف لے جا رہے تھے اور اس کار میں حضرت اقدس کی معیت میں بندہ و مولانا یوسف صاحب اور حافظ مقبول حسن صاحب تھے۔ راستہ میں ارشاد فرمایا کہ جب بھی سہارنپور جاؤ حضرت شیخ کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض کر دینا۔ پھر مولوی یوسف صاحب سے بھی ارشاد فرمایا کہ دونوں کہہ دینا۔ تھوڑی دیر میں ارشاد فرمایا کہ اب کے واپسی میں سہارنپور قیام نہیں ہوا، اگرچہ جاتے ہوئے دوران قیام رہا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ حضرت شیخ کی طبیعت میں بڑا اضمحل ہے جو کیفیات حضرت اقدس گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کی آخر میں تھیں وہ ہیں اور اس سے رعب ہوتا ہے اور طبیعت مرعوب ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے ڈر لگتا ہے۔ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت ٹکٹ وغیرہ سب چیزیں ہو چکی تھیں۔ رائے پور سے عجلت بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ ارشاد فرمایا کہ جی طبیعت میں گھبراہٹ ہے۔ گھبراتا نہ تو نکلنا نہ ہوتا۔ اسی طرح وہاں جا کر ابھی سے گھبرانا شروع کروں گا۔ انتہی۔ نیز حضرت عالی کا ایک والا نامہ جو حضرت اقدس کی خدمت میں آیا ہے، جس میں صرف دو شعر ہیں اس کے مطلب میں طبیعت بہت زیادہ پریشان ہے۔ امید ہے والد صاحب بخیر پہنچ گئے ہوں گے۔ سلام مسنون

انعام الحسن قبیل جمعہ

مکتوب نمبر۷:

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ

اس تحریک کا خلاصہ یہ ہے کہ مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں جو کچائی باقی رہ گئی ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے کلمہ، نماز، چھوٹے بڑوں کے آداب و باہمی حقوق، درستی، نیت اور لغزشوں کے موقعوں سے بچنے کے علم و عمل سیکھنے کے لیے ان اصول کے ساتھ اپنے بڑوں سے بچا لیتے ہوئے ان لوگوں کے پاس جائیں جو ان سے بالکل مرحوم ہیں تا کہ ان کی کچائی دُور ہو جائے اور ان کو واقفیت حاصل ہو۔

مکتوب نمبر۸:

۴محرم الحرام ۵۲ھ مطابق ۲۹اپریل ۳۳ء یوم شنبہ از مدینہ منودہ

عزیز محترم مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث متعنا اللہ بطول حیاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

آپ کا گرامی نامہ آج ۴ محرم الحرام کو موصول ہوا۔ مدرسہ مظاہر علوم کے بخیر و عافیت جلسہ کے کامیاب ہو جانے کی خبر سے نہایت مسرت ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمارے بزرگوں کو ہمیشہ باہم متالف متعاضد متعاون رکھے۔ بندہ دوسری محرم یوم الخمیس علی الصباح الحمد للہ ثم الحمد للہ زیارت روضہ مطہرہ اور سعادت صلوٰۃ و تسلیم سے شرف اندوز ہوا۔ حق تعالیٰ میرے اور میرے سب دوستوں کے لیے موجب خیر و برکت اور باعث ثبات فرمادیں۔ آپ نے وہاں (نظام الدین) کی بہت سے مشکلات اور روپوں کے مختلف ضرورتوں کے لیے تقاضے کی شکایتیں لکھی ہیں۔ میری حاضری کی وجوہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ حضرات ان ضرورتوں کا احساس فرمادیں اور آنکھوں سے دیکھیں اور اس کی اہمیت اور واقعی اور غیر واقعیت کی تحقیق میں آپ بھی میرے برابر ہوں اور پھر سب مل کر یا تو اس کو کر دیا اس کو سب مل کر چھوڑ دیں۔ ورنہ تم ہی بتاؤ کہ میں تنہا کیا کروں؟ یہی مضمون میری طرف سے شیخ صاحب کی خدمت میں عرض کر دینا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس تبلیغ کی چھیڑ چھاڑ مجھ سے نہ ہو یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکتا اور کسی نظم کا میں اہل نہیں، کوئی نظم میرے قابو کا نہیں، تو اب کیا صورت ہو؟ تین صورتیں ہیں یا یہ کہ میں وہاں کا ارادہ ملتوی کر دوں اور عرب میں قیام کروں اور یا ہندوستان میں آنا ہو تو مستقل توجہ کرنے والی ایک جماعت مستعد ان امور کے نظم کے واسطے مجھے اطمینان دلا دیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ میں اگر ان امور کی طرف نظر نہ رکھوں۔ مجھے تم جیسے دوستوں خصوصاً تمہارے حکم کی تعمیل سے گریز اور انکار نہیں۔ مگر ایسی کوئی صورت ان تین میں سے یا کوئی چوتھی صورت جس کا آپ امر فرمادیں، میں اس کے لیے تیار ہوں۔ رقوم کے متعلق بات یہ ہے کہ میں قرض لینے کو کس بھروسہ پر کہہ دوں، یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ باقی نوح کے مدرسہ کے علاوہ سب ضرورتیں غالب ہے کہ پوری کر دینے کی ہیں۔ یہ اصول البتہ ضروری ہے کہ پہلے خود ان مواضع میں کوشش کرائی جائے۔ پھر بھی ضرورت ہو تو اس کا بندوبست کیا جائے۔

بخدمت جناب شیخ صاحب بعد سلام مسنون مضمون واحد

فقط والسلام

سب بزرگوں اور ملنے والوں کی خدمت میں سلام مسنون، گھر میں اور سب بچوں کو دعوات کہہ دینا۔ مساجد اور تبلیغ کی امداد کے لیے حافظ عبدالحمید صاحب سے بعد سلام مسنون فرمادیں کہ صاحبزادہ کی شادی کی خبر موجب مسرت ہے اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ انشاء اللہ عنقریب میں

حاضر ہو جاؤں گا۔ کوئی خاص تقاضہ نہ ہو تو میرے آنے پر ہی کیجئے گا۔ عزیز یوسف کی محنت کی خبر سے خوشی ہوئی ماشاء اللہ وہ ہمیشہ سے محنتی ہے۔ محنت کے زمانے اس کو محنت سے روکنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے میں بھی دماغ کا کمزور ہوں اور یہ بھی میری طرح بے وقت محنت کر کے دماغ سے بے کار نہ ہو جائے میں نے حافظ مقبول صاحب وغیرہ کو مخصوص (اس تحریر میں حافظ مقبول صاحب اور قاری داؤد صاحب کی اجازت بیعت کو اس ناکارہ اور حضرت اقدس رائے پوری کی اجازت پر مشروط کیا تھا۔ کہ اگر آپ دونوں کی رائے ہو تو ان دونوں کو میری طرف سے بیعت کی اجازت دے دو) تحریریں بھیجنے کے لیے آپ مولانا رائے پوری کے مشورہ کے ساتھ وابستہ کیا تھا اور یہاں مولوی شفیع الدین کے تقاضہ سے روانہ کیا تھا۔ بغیر آپ حضرات کے مشورہ کے میں ایسی بات میں پیش قدمی کی جرأت اور غیرت رکھتا ہوں۔

از ادون خدام احتشام بعد سلام نیز گرامی نامہ عزت بخش ہوا۔ فقط

مکتوب نمبر۹:

آخری تحریر حضرت دہلوی بقلم مولانا ظفر احمد صاحب بسلسلۂ امارت مولانا یوسف صاحب مرحوم وتکملہ آن تحریر از مولوی یوسف۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج صبح حضرت اقدس مولانا محمد الیاس صاحب کا یہ پیغام پہنچا کہ میری جماعت میں بہت سے اہل ہیں۔ شیخ الحدیث اور مولوی ظفر احمد تیسرا نام حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ہے جو غالباً نقل میں رہ گیا جس کو ان میں سے منتخب کریں اس سے ان لوگوں کو بیعت کرا دیں جو مجھ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں۔ پھر یہ پیام پہنچا کہ مجھے چند لوگوں پر (جن کے نام بھی بتلائے تھے) اعتماد ہے۔ بعد ظہر ہم اس ارشاد کی توضیح کے لیے حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ ہمیں یہ پیام پہنچا تھا کہ مجھے اپنے چند لوگوں پر اعتماد کا مفہوم خلافت اور اجازت تھی یا کیا تھا۔ سکوت کے بعد فرمایا کہ مولوی شفیع الدین صاحب (حضرت مولانا شفیع الدین بجنوری مہاجر مکی جو حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب کے اجل خلفاء میں تھے۔ مکہ میں مقیم رہے اور وہیں وصال ہوا۔) صاحب نے قاری داؤد اور حافظ مقبول حسن پر اعتماد ظاہر کیا تھا۔ اس وقت میں نے ان کے احترام کی وجہ سے حرم کے رہنے والے ہیں ان کو اجازت دے دی تھی۔ مگر اب مجھے ان پر پہلے سے بہت زیادہ اعتماد ہے اور ان کے علاوہ اور بھی چند لوگوں پر اعتماد ہے۔ مولوی یوسف میں استعداد بہت ہے۔ میں نے اس کو پاس انفاس بتایا تھا اور بہت دن سے کر رہا تھا۔ سید رضا بھی ذکر و شغل میں لگے

ہوئے ہیں اور سوزش و درد سے کام کرتے ہیں۔ مولوی احتشام کو میں نے اجازت دے دی مگر ایک شرط کے ساتھ جو انہیں سے معلوم کر لینا۔ (مولوی احتشام کو وہ شرط یاد نہ آئی تو ہمارے دریافت کرنے پر) پھر فرمایا کہ وہ شرط یہ ہے کہ علماء کا احترام کریں (از زکریا مجھ سے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ شرط یہ بھی ہے کہ امراء سے تعلق نہ رکھیں) علماء سے نیاز مندی کا تعلق رکھیں۔ ہمارے مزید دریافت کرنے پر فرمایا کہ مولوی انعام بھی بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے ذکر و شغل بھی بہت کیا ہے۔ یہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ البتہ علم کا احترام زیادہ ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم تینوں (تیسرے حضرت رائے پوری) کی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ مولوی محمد یوسف سلمہٗ کو اجازت دے دیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک ان میں شرائط اجازت موجود ہیں۔ عالم ہیں، باعمل ہیں، متورع ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی تکمیل کر لیں گے اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی اس شرط سے اجازت دی جائے کہ وہ اپنی تکمیل سے غافل نہ ہوں۔ فرمایا ہاں جو آپ تینوں کی رائے ہے بہت مبارک ہے اور تکمیل کے لیے تم خود ان سے تاکید کے ساتھ کہہ دینا۔ سلسلہ کا قیام یوں ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ میری طرف سے نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سمجھنا چاہیے۔ پھر دعاء فرمائی کہ اے اللہ ان تینوں صاحبوں نے جو تجویز کیا ہے اس میں برکت فرما اور جو اس میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہو اس کو معاف فرما اور ہمیں خلوص عطاء فرما۔ اس کے بعد ہم نے عرض کیا کہ جو لوگ اس وقت بیعت ہونا چاہتے ہیں، ہماری رائے یہ ہے کہ ان کو آپ ہی بیعت فرمالیں۔ جس کی صورت یہ ہو کہ کپڑے کا ایک سرا حضرت کے ہاتھ میں اور بیعت ہونے والوں کو ایک شخص کلمات بیعت تلقین کرتا رہے۔ فرمایا نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت گر گیا ہوں، مجھے بہت تعجب ہوگا۔ ہم نے عرض کیا کہ پھر اعلان کر دیا جائے کہ جو بیعت چاہیں وہ مولوی یوسف صاحب سے بیعت ہو جائیں، وہ حضرت سے ہی بیعت ہوگی۔ فرمایا ہاں مناسب ہے اور آپ تینوں کا ہاتھ اس پر ہوگا۔

تنبیہ: یہ تحریر بطور اول مسودے کے لکھی گئی اور حضرت کو قبل عصر سنا دی گئی۔ حضرت کی تصدیق کے بعد اس کو صاف کر دیا گیا۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ تھانوی

۲۰ رجب ۶۳ھ مطابق ۱۲ جولائی ۴۴ء بروز چہار شنبہ

مکتوب نمبر ۱۰:

آخری گفتگو چچا جان نور اللہ مرقدہٗ عزیز یوسف مرحوم کے ساتھ

بدھ کے روز چار بجے کے قریب حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ ورفع درجاتہ فی الآخرۃ والدنیا وارزقنا حبہ واتباعہ حق الحب والاتباع۔ بندہ داہنی جانب بیٹھا ہوا تھا۔ آواز دی تو بندہ بائیں جانب چہرۂ انور کے متصل آبیٹھا۔ فرمایا حضرات کہاں ہیں؟ میں نے عرض کیا مولوی احتشام صاحب کے حجرہ میں مشورہ فرمارہے ہیں۔ فرمایا تم اس مشورہ میں شریک نہیں میں نے عرض کیا اگر جناب فرمادیں تو میں جا بیٹھوں۔ فرمایا تمہارے ہی متعلق تو مشورہ ہے اورتم اس میں شریک نہیں۔ خیر جب بلائیں تو چلے جانا۔ پھر فرمایا میرا تمہارا کھیل ہوکر نہ رہ جائے۔ اہل اللہ کی طرف سے جو چیز ملا کرتی ہے وہ حق ہوتی ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا:

دادِ وے را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت داد و یست

پھر ارشاد فرمایا کہ علماء کے لیے قصیدہ بردہ اور شیم الحبیب کا مطالعہ عظمت واحترام کے ساتھ کہ بغیر عظمت وشوق کے بے کار ہے۔ شیم الحبیب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت منکشف ہوگی۔ اس کے بعد غالباً فرمایا قصیدہ سے تعلق پیدا ہوگا۔ پھر فرمایا آخر شب میں قرآن شریف پڑھنے کی دعوت دیتے رہنا اور اپنے لیے اس کی صورت پیدا ہونے تک تمنا رکھنا۔

فقط

مکتوب نمبر ۱۱:

عزیز ماجد علی بنام زکریا

مخدومی و معظمی حضرت اقدس دامت برکاتکم و متعنا اللّٰہ والمسلمین بطول بقائك و برکات انفاسك السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ،

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ دیگر احوال یہ ہیں کہ رمضان المبارک میں اعتکاف کے درمیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بشارت دی تھی، جس کو میں وہاں بیان نہ کرسکا تھا۔ وہ بشارت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''زکریا یعنی (حضرت والا) رسالہ فضائلِ درود کی وجہ سے اپنے معاصرین پر سبقت لے گیا۔''

اس ناکارہ کو اس پر تعجب بھی ہوا کہ حضرت والا کی احادیث کی اور دین کی محنت کی اور بھی خدمات ہیں جو بہت اونچی ہیں۔ لیکن بعد کو اشکال رفع ہوا کہ دل میں یہ بات کہ رسالہ فضائل درود حضرت والا کے عشق نبوی کی دلیل ہے اور اس اعتبار سے بھی حضرت والا دوسروں پر سبقت لے گئے ہیں۔ نیز کافی عرصہ ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی اس ناکارہ کو یہ بشارت بھی ملی تھی کہ جمعہ

کے روز آپ کوئی مخصوص درود یا قصیدہ پڑھتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی پسند ہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ درود یا قصیدہ اس ناکارہ کو بھی بتا دیجئے ممنون ہوں گا۔ نیز یہ بھی دریافت کرنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت زیادہ فضیلت کی بات ہے یا حالت کشف میں اسی طرح خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو زیادہ معتبر ہے یا علم کشف کی گفتگو زیادہ معتبر ہے۔ عید کے بعد علی گڑھ جانا ہوا تو یہاں لوگوں نے اس ناکارہ سے اس بات کی تحقیق چاہی کہ بھائی خالد صاحب کو کیا حضرت والا کی طرف سے اجازت بیعت ہوگئی ہے؟ چونکہ اس ناکارہ کو علم نہیں تھا، اس لیے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اگر حضرت والا نے بھائی خالد صاحب کو اپنی طرف سے بیعت کی اجازت دے دی ہو تو مطلع فرمایئے۔ نیز میرٹھ میں احباب مولانا مسعود الٰہی صاحب کے بارے میں بھی احقر سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کو حضرت والا کی طرف سے اجازت ہے یا نہیں؟ اگر ان کو ہو تب بھی مطلع فرمایئے گا جواب کا انتظار ہے۔ دعاؤں وتوجہات کی عاجزانہ درخواست ہے۔ خصوصاً دورۂ حدیث کی تکمیل کے لیے۔

فقط

ناکارہ ماجد علی خاں جہاں نما جلی کوٹھی

میرٹھ

(موصولہ احبیب عنہ ۲۸ شوال)

اللہ تعالیٰ خواب کو میرے اور تمہارے لیے مبارک کرے۔ پسند آنے کے واسطے اونچی چیز ہونا ضروری نہیں۔ کسی رنڈی کے کتے کو پانی پلانا بھی پسند آ جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں دیکھنا اور اس کا معتبر ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور کشف میں احتمال غلطی کا ہے۔ حدیث میں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں اور اس کا مدار صاحب کشف کی علوشان پر ہے۔ بندہ کا معمول جمعہ کے دن بعد عصر "اللّٰھم صل علی سیدنا محمد النبی الامی و علی آلہٖ وسلم تسلیما" اسّی (۸۰) مرتبہ پڑھنے کا ۲۵، ۳۰ سال سے ہے۔ فضائل درود کی تالیف کے بعد سے اس کے اخیر کے دو قصیدے ملا جامی اور حضرت نانوتوی کا کبھی کبھی سننے کی نوبت آ جاتی ہے۔ خالد کو اجازت نہیں مسعود الٰہی کو ہے۔

والسلام

......☆☆☆☆☆......

باب ششم

جملہ حجوں کی تفصیل

حضرت کی ہمرکابی میں بندہ کا سب سے

پہلا سفرِ حج ۳۸ھ اور ساتھ جانے والے رفقاء:

یہ بات دراصل باب پنجم کا جزو اور تکملہ ہے جو شروع میں تو ایک ہی باب تھا۔ مگر حجوں کی اہمیت اور حج کے زمانے کے واقعات کی خصوصیت کی وجہ سے اس کو مستقل باب بنا کر اس کو گویا باب پنجم کا جزو بنا دیا۔ اس سیہ کار کا سب سے پہلا حج ۳۸ھ میں حضرت اقدس مرشدی ومولائی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ہمرکابی میں ہوا۔ یہ حج اس ناکارہ کا حجۃ الاسلام اور حج فرض تھا۔ ۲، شعبان ۳۸ھ کو سہارنپور سے روانگی ہوئی۔ حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب کے علاوہ حضرت مولانا منظور احمد خاں صاحب سہارنپوری مدرس مظاہر علوم خادم خاص اور حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ کے برادرزادہ حاجی انیس احمد صاحب انبہٹوی اور حضرت کے اخص الخدام مولوی محمد اسحاق صاحب بریلوی جن کا مستقل قیام سہارنپور میں تھا اور ہر سفر میں حضرت کے خصوصی خادم رہتے تھے اور میرے عزیز مولوی لطیف الرحمٰن کاندھلوی جو حضرت قدس سرہٗ کے بعد ہمیشہ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں رہے۔ نیز میرے قریبی رشتہ دار متولی طفیل احمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی خدام سہارنپور سے اور رستہ سے شریک ہوتے رہے۔ بمبئی پہنچنے تک رفقاء کا مجمع دوسو ہو گیا تھا اور ہر شخص حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی کی وجہ سے حضرت جی کے جہاز میں سفر کا متمنی اور مشتاق تھا۔ اس میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جن کی دلداری حضرت کو مقصود تھی۔

حضرت اقدس قدس سرہ کا رفقاء کی وجہ سے جہاز چھوڑ دینا:

جب بمبئی پہنچے ایک جہاز تیار تھا مگر اس میں بیس پچیس ٹکٹوں کی گنجائش تھی اور حضرت قدس سرہ اور ان کے مخصوص رفقاء اس میں آ بھی سکتے تھے۔ مگر حضرت نے رفقاء کی دلداری کی وجہ سے اس کو چھوڑ کر اس کے بعد والے جہاز جس کا نام زیانی تھا کے تین سو ٹکٹ خرید والیے۔ کیونکہ بمبئی کے قیام کے میں مجمع اور بھی بڑھ گیا تھا۔ جو جہاز اس وقت تیار تھا وہ بہت ہی بڑا اور آرام دہ تھا اور زیانی بہت ہی چھوٹا اور تکلیف دہ تھا۔ بمبئی کے احباب نے بہت ہی اصرار بھی فرمایا کہ موجودہ جہاز زیادہ

آرام دہ ہے مگر حضرت نے قبول نہ فرمایا بلکہ رفقاء کی ہی معیت کو ترجیح دی۔

بمبئی میں دیوبندیوں کے داخلوں کی ممانعت:

یہ زمانہ وہ تھا کہ بمبئی میں علی الاعلان دیوبندیوں کا داخلہ سخت خطرناک تھا۔ اس سے پہلے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ پر بمبئی میں حملہ بھی ہو چکا تھا اور حضرت سہارنپوری قدس سرہ کے ساتھ مجمع بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہاں کے غریب میزبانوں نے کہ رؤساء تک ہم غرباء کی رسائی نہ تھی اور آج کل تو اس کا ردعمل مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت سے یہ ہو رہا ہے کہ دیوبندیوں کو ہر وقت اصرار اور تقاضے بمبئی آنے کے ہوتے رہتے ہیں۔ بہرحال وہاں کے غرباء میزبانوں نے حضرت اور ان کے رفقاء کا قیام بمبئی سے پندرہ بیس میل دور ایک قبرستان میں کیا۔ خیمے وغیرہ لگائے گئے اور زیانی جہاز کے انتظار میں بیس روز وہاں قیام ہوا۔ سہارنپور سے بمبئی تک تو فتوحات کا وہ زور رہا کہ لا تعد و لا تحصیٰ مٹھائیاں اور پھل اور قسم قسم کے کھانے۔

سفر حج کے دوران کھانے کا انتظام:

بمبئی پہنچ کر حضرت نے ہم مخصوص رفقاء کو جمع کر کے فرمایا کہ بھائی یہاں سے سفر شروع ہو رہا ہے اور رفقاء نے لکھا ہے کہ دو دو چار چار مل کر اپنا جوڑ ملا لو۔ بھائی طفیل احمد صاحب جن کا اُوپر ذکر آیا وہ سہارنپور ہی سے مجھ سے اصرار فرما رہے تھے کہ میں ان کا پورے سفر میں مہمان بنوں اور ان سے زیادہ اصرار میرے عزیز ماموں لطیف الرحمٰن صاحب کا تھا۔ اس لیے کہ وہ پہلے سے متولی طفیل صاحب کے ساتھ ہو گئے تھے اور ان دونوں سے بڑھ کر متولی صاحب کے ملازم ملا عبدالعزیز جو کاندھلہ کے قریب ایک گاؤں کھندراولی کا رہنے والا تھا اور متولی طفیل صاحب نے سفر کے لیے ملازم رکھ لیا تھا، وہ سہارنپور سے ہی میری خوشامد کر رہا تھا کہ اگر آپ میرے میاں صاحب کے ساتھ آ جائیں تو میرا کھانا پکانے میں بڑا جی لگے گا۔ حضرت کے اس ارشاد پر خوشی حسب مراتب تینوں ہی کو ہوئی عبدالعزیز بچارا کیا بولتا۔ ماموں لطیف نے حضرت سے کہا کہ بھائی طفیل شروع سے کہہ رہے ہیں مولوی زکریا کو کہ میرے ساتھ ہو جا۔ مگر یہ نہیں مانتا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ بھائی میرے ساتھ کوئی نہیں۔ ہر ایک اپنا اپنا انتظام خود کرے۔ اس پر تینوں کے تینوں خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے اور میں چپ سہم گیا۔

اگلے دن صبح کو میں نے حاجی مقبول احمد صاحب کو جو حضرت قدس سرہ کے مدار المہام اور اندرو باہر کے کارکن تھے۔ ان کا تذکرہ پہلے بھی آ چکا ہے جس پر خفا ہوتے تھے اسے جہنم میں پہنچا دیتے تھے اور جس سے راضی ہوتے اسے عرشِ معلیٰ پر پہنچا دیتے۔ راضی اور ناراض بھی بہت جلد ہوتے۔

میں نے ان سے تخلیہ میں کہا کہ حاجی جی میں آپ کے ساتھ رہوں گا اور جیب میں سے چھ سو روپے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔ اس زمانے میں حج کے سلسلہ میں چھ سوایسے تھے جیسے آج کل ڈھائی ہزار کہ چھ سو روپے میں آدمی نہایت راحت سے مکہ، مدینہ، کھجور، زمزم، تسبیح، رومال، مصلٰی وغیرہ سب کام کر لیتا تھا۔ حاجی جی کو اس وقت اللہ کے فضل سے کچھ شفقت آ رہی تھی بہت مسرت سے روپے اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے اور فرمایا کہ تم جیسوں کے لیے مجھے ہرگز انکار نہیں۔ میں نے تو حضرت سے ایسے لوگوں کے متعلق انکار کیا تھا جو یہ کہے کہ میرا تو ایک بکس اور حضرت کے پچیس بکس اور پھر کشتی ومزدوروں کا کرایہ برابر کیوں؟ میں ہر ایک کا سامان الگ الگ کہاں تلواؤں گا۔ کہ کس کا کتنے سیر اور کتنے من ہے اور تیرے متعلق مجھے یقین ہے کہ میں تجھے حساب بتلاؤں گا بھی تو تو سنے گا نہیں اور میں اپنا اور حضرت کا سارا محصول تیرے حساب میں لکھوادوں گا تو تجھے خوشی ہی ہوگی۔ میں نے کہا کہ جناب نے یہ سچ فرمایا حساب وغیرہ مجھے نہیں چاہیے اور مجھے آپ ہرگز نہ دیں۔ مجھے تو سہارنپور جا کر یہ بتلادیں کہ کتنا میرا حساب میں اور چلا اسی دن انشاء اللہ پیش کر دوں گا۔ حاجی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اس کا تو مجھے تیرے کہے بغیر یقین ہے۔

اگلے دن شام کو حضرت قدس سرہٗ نے پوچھا کہ کیوں بھائی کس کا جوڑ کس سے بیٹھا لوگوں نے اپنے اپنے جوڑ بتلائے۔ ماموں لطیف نے کہا میں تو متولی طفیل کے ساتھ ہوں مگر مولوی زکریا نہیں مانتے یہ کہتے ہیں کہ میں تو حضرت ہی کے ساتھ ہوں۔ پہلی رات تو میں سہم گیا تھا آج میں بہت مطمئن تھا کہ قلعہ فتح کر چکا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ نہیں بھائی میرے ساتھ نہیں بھائی طفیل کے ساتھ ہو جاؤ جب یہ کہہ رہے ہیں۔ یہ ناکارہ گستاخ تو ساری عمر کا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں حضرت کے ساتھ نہیں۔ میں تو حاجی مقبول صاحب کے ساتھ ہوں۔ میں نے اپنے سارے پیسے ان کے حوالے کر دیے اور انہوں نے قبول فرمالیے۔ وہ پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے خوب وہ منظر یاد ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا اور فرمایا کہ انہوں نے قبول کر لیا۔ میں نے کہا جی حضرت، حضرت نے فرمایا کہ پھر مجھے کیا انکار ہے میں تو ان ہی کی وجہ سے اصرار کر رہا تھا۔ حاجی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کو مجھے انکار نہیں اور اپنی صبح والی تقریر پھر دہرادی۔ حضرت قدس سرہٗ نے حاجی مقبول صاحب کی تصویب فرمائی کہ یہ تم نے سچ کہا اس کو تو حساب کا خیال بھی نہ آئے گا۔ اب ہم مستقل شریک دسترخوان ہو گئے اور اخیر تک رہے۔

جہاز میں اور جدہ میں اتر کر اور مکہ مکرمہ میں تراویح:

اس دوران میں حضرت قدس سرہٗ راندیر بھی تشریف لے گئے تھے۔ مولوی اسحاق مرحوم ساتھ

تھے۔ ۲۷ یا ۲۸ شعبان کو بمبئی سے جہاز روانہ ہوا اور بارہ دن میں دس رمضان کو جدہ پہنچا۔ دوسرے یا تیسرے دن یکم رمضان جہاز ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ اس سیہ کار کو بھی جہاز میں دورانِ سر اور امتلاء بہت رہتا تھا اُٹھنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بھی امتلاء تو نہیں مگر دورانِ سر خوب رہتا اور پورے جہاز کے سفر میں رہتا۔ ۲۹ شعبان کو حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ کیوں بھائی تراویح کا کیا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ دورانِ سر سے تو نمٹا جا سکتا ہے مگر امتلاء کا درمیان تراویح میں کیا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کی کوئی بات نہیں تے ہوگی وضو کر لینا۔ باوجود دورانِ سر اور ضعف و پیری کے اور زیان جہاز چونکہ چھوٹا تھا خوب حرکت کرتا تھا۔ اس کے باوجود ساری تراویح حضرت نے کھڑے ہو کر پڑھی۔ آٹھ رکعت میں آدھا پارہ حضرت قدس سرہٗ پڑھتے تھے اور اس کے بعد کا پون پارہ بارہ رکعت میں یہ سیہ کار پڑھتا تھا۔

جدہ پہنچ کر سامان اُتارنے میں اور کسٹم وغیرہ کے جھگڑوں میں سب ہی تھک گئے تھے۔ حاجی صاحب مرحوم نے نہایت غصہ میں مجھ سے فرمایا کہ عقیدت میں بڑے میاں کو لے کر کھڑے نہ ہو جانا کچھ ان کے ضعف کا بھی خیال کر لینا۔ کیونکہ اس کا ڈر تھا کہ نہ معلوم سفر میں حاجی جی کہاں میرا پتہ کاٹ دیں۔ ان کا حکم تھا کہ میں حضرت سے درخواست کروں کہ تراویح کی تو آج ہمت نہیں یہ تو مجھ سے نہ ہو سکا۔ لیکن جب حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ کیوں بھائی مولوی زکریا کیا حال ہے۔ میں نے حاجی صاحب کے ڈر کے مارے یوں عرض کر دیا کہ حضرت تھکان تو بہت ہے۔ لیکن میری ندامت اور قلق کی انتہاء نہ رہی کہ جب میں نے دیکھا کہ حضرت قدس سرہٗ نے پوری تراویح خوب اطمینان سے پڑھی۔ میں بار بار حضرت کو دیکھتا رہا اور اپنے اوپر افسوس کرتا رہا کہ کیوں جواب دیا اور کئی بار خیال آیا کہ حضرت سے عرض کروں کہ حاجی صاحب کے حکم سے میں نے معذرت کی تھی۔ مگر مرحوم کے ڈر کے مارے اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ نماز کے دوران دو تین مرتبہ حضرت کے قریب گیا بھی اور یوں عرض کرنے کو جی چاہا کہ حضرت کے ضعف کی وجہ سے عذر کیا تھا مگر حاجی صاحب کا خوف غالب رہا کہ وہ مجھ سے ناراض ہوں گے۔ مگر ندامت اور قلق اب تک بھی ہے۔

جدہ ایک دن قیام کے بعد مکہ مکرمہ پہنچے۔ شریف کا زمانہ تھا نہایت بدنظمی کا۔ ہم لوگوں نے جدہ سے مکہ تک کوئی اونٹ نہیں کیا بلکہ منیٰ، عرفات میں کسی جگہ نہیں کیا۔ بلکہ حضرت قدس سرہٗ کے اونٹ کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے رہے اور بے فکری سے کبھی ادھر اُدھر بھی ہو جاتے تھے۔ میں شوق میں کچھ آگے بڑھ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بلا کر خوب ڈانٹا اور فرمایا کہ اُونٹ کے ساتھ ساتھ رہو، ذرا ادھر اُدھر نہ ہو۔ پیشاب وغیرہ کے واسطے بھی دور نہ جاؤ کہ بدو تم کو مار کر کپڑے وغیرہ سب اُتار لے گا۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مولانا محبّ الدین صاحب خلیفہٗ اجل اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ سے ملاقات فرمائی اور معانقہ کیا۔ حضرت مولانا نے حضرت قدس سرہٗ سے فرمایا اجی مولانا، ارے مولانا! آپ کہاں آ گیا۔ ہمارے یہاں تو قیامت کبریٰ آنے والا ہے۔ عمرہ کر کے گھر واپس چلے جاؤ، ہمارے یہاں تو آگ برسنے والا ہے۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت قدس سرہ نے ایک نہایت عمدہ قاری صاحب کے پیچھے تراویح شروع کی قاری توفیق ان کا نام تھا۔ بہت ہی اچھا پڑھنے والے تھے۔ دو پارے حرم شریف میں روزانہ سناتے تھے۔ ان کے پیچھے جماعت کافی ہوتی۔ حضرت کا مصلیٰ تو امام کے پیچھے ہوتا تھا اور چونکہ تینوں صفیں بہت پہلے سے بھر جاتی تھیں اس لیے ہم لوگوں کو جگہ بہت پیچھے ملتی تھی۔ بالکل میرے پیچھے محاذات میں ایک لڑکا شافعی نہایت عمدہ اور نہایت تیز پڑھتا تھا۔ اس لیے یہ ناکارہ قرآن تو اس کا سنتا تھا کہ وہ میرے بالکل قریب اور جہری الصوت تھا مگر رکوع سجود قاری توفیق کے ساتھ کرتا تھا۔

حرمین شریفین میں تراویح کے واقعات:

اس زمانے میں حرمین شریفین میں عشاء کی نماز بجائے ڈیڑھ کے ڈھائی بجے ہوا کرتی تھی اور حرمین کے حضرات ہندوستان والوں پر بہت خفا ہوا کرتے تھے کہ یہ ہندی لوگ ایسے بیوقوف ہیں کہ سارے سال تو مغرب وعشاء میں ان کے یہاں دو ڈھائی گھنٹے کا فصل ہوتا ہے اور رمضان میں صرف ڈیڑھ گھنٹے کا۔ کھانا کھایا اور تراویح کو چل دو۔ افطار کے بعد کھانا کھانے میں چائے وغیرہ پینے میں دو گھنٹے تو کم از کم چاہئیں۔ اب تو ڈھائی گھنٹہ کا فصل مکہ میں نہیں رہا۔

۸۹ھ کا رمضان شریف بھی اس ناکارہ نے حرمین شریفین میں گزارا۔ اب عشاء کی نماز ۲ بجے ہوتی ہے۔ حضرت قدس سرہ قاری توفیق کے پیچھے تراویح پڑھ کر جو تقریباً ساڑھے چار بجے عربی فارغ ہوتے تھے مکان تشریف لے جاتے تھے۔ ہم خدام مولانا منظور احمد صاحب، حاجی انیس، یہ ناکارہ اور مولوی اسحاق مرحوم حضرت قدس سرہٗ کو مکان پر پہنچا کر کپڑے نکال کر ایک لنگی باندھ کر اور دوسری لنگی کاندھے پر ڈال کر تنعیم عمرے کے احرام کے لیے چلے جاتے۔ سواری پر کبھی نہیں گئے۔

ایک دفعہ عربی گدھے پر سوار ہونے کا شوق ہوا۔ نہایت ہی خوبصورت اور آنکھیں ہرنیوں کی آنکھوں کی مانند نہایت حسین اور اُوپر نہایت خوشنما لال رنگ کی دھاریاں۔ مگر وہاں کا یہ دستور تھا کہ حاجی کو گدھے پر بٹھا کر گدھے کا مالک اس کے ایک ڈنڈا مار دیتا۔ ساتھ جانے کا دستور نہیں تھا۔ نہ اس میں لگام اور نہ چار جامہ وہ گدھے اس قدر سدھے ہوئے سنجیدہ کہ باب العمرہ سے جو ایک دوڑ لگاتے تھے تو مسجد تنعیم پر جا کر سانس لیتے تھے۔ چاہے سوار ان کے اوپر ہو اور چاہے گر جائے۔ آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہر کر وہ گدھے سیدھے باب العمرہ پر واپس آ جاتے تھے۔

ایک دفعہ ان کے حسن و جمال کی وجہ سے ان پر سواری کا شوق ہوا تو پانچ سات منٹ ہم گدھے پر رہے اس کے بعد اس نے تو مسافت پوری کر ہی لی۔ چونکہ لڑکپن تھا۔ بھاگنے دوڑنے کا شوق تھا اس لیے گھنٹے سوا گھنٹے میں واپس آکر طواف وسعی کر کے بال تو روز روز کہاں ہوتے تھے دو چار قرش میں سر پر استرا پھرواتے۔ گھر آکر کپڑے پہنتے سحری کھاتے اور صبح کی نماز پڑھ کر جو سوتے تو قبیل ظہر ہی اٹھتے۔ رمضان کی رات کا جاگنا اسی سال سے شروع ہوا ہے۔ بڑے مزے اور لطف سے رمضان گزرتا رہا۔

ایک عربی کا حضرت کی دعوت کرنا اور اس کا دلچسپ قصہ:

ایک دن ایک مکی عرب کے یہاں حضرت قدس سرہٗ کی دعوت ہوئی ہم لوگ تو یہ سمجھتے رہے کہ ہم سے کیا واسطہ، حاجی صاحب نے گھر میں اطلاع کر دی ہوگی اور حاجی صاحب نے گھر میں اطلاع نہیں کی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ مجھے دعوت ہی کی خبر نہیں ہوئی۔ بہرحال اماں جی نے سب کا کھانا پکوالیا اور قبیل مغرب دعوت کا کھانا۔ ماشاء اللہ عربوں کی دعوت تھی خوان پر خوان گھر آ گئے اور حاجی جی کا غصہ اور پارہ آسمان پر چڑھ گیا۔ خوب ناراض ہوئے۔ کھانے کو تو سب تیار ہو جاتے ہیں اتنی زبان ہلاتے ہوئے بھی بوجھ معلوم ہوتا تھا اور ان سے اماں جی کم خفا ہوئیں۔ ارے مجھ بڑھیا کا خیال کر لیتے۔ گرمی میں روزے میں پکانے میں بھی دقت اور پکوانے میں بھی دقت ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے کچھ نہیں فرمایا۔ حاجی صاحب مرحوم اور اماں جی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے رہے کہ یہ کل کو باسی ہوگا۔ اس کو روزے دار کیسے کل کو کھائیں گے۔ مغرب کے بعد کچھ کھایا اور کچھ دعوت کا حضرت نے دوسرے لوگوں کو دلوایا۔ مگر پھر بھی بہت تھا۔ حسب معمول عمرے سے فراغ پر ہم نے سحری کھائی۔ اماں جی نے معمول کے موافق دے دیا۔ ہم نے کھا لیا میں نے حاجی انیس صاحب سے کہا کہ اور لاؤ۔ وہ اُوپر لینے گئے۔ اماں جی نے کہا کہ دعوت کا کھانا بہت مزے کا لگا۔ انہوں نے اور تھوڑا سا دے دیا۔ ہم نے اس کو ختم کر کے کہا کہ اور لاؤ۔ بھائی انیس محرم تھے وہی لایا کرتے تھے۔ وہ اور لینے گئے۔ اماں جی نے فرمایا کہ آج تو ہاضمہ بہت ہی کھل رہا ہے۔ بھائی انیس نے کہا کہ خالہ جی وقت تھوڑا ہے جلدی دے دو۔ اماں جی نے اور دے دیا۔ بھائی انیس مرحوم بھی ان ہی کے بھانجے تھے۔ کہنے لگے کہ خالہ اچھی طرح سے دے دو بار بار آنا پڑتا ہے وہ زکریا نہیں مانتا، اماں جی نے فرمایا کیا بات ہے تمہارے ساتھ اور کوئی ہے۔ حاجی انیس نے کہا کہ کوئی نہیں ہے۔ وقت تھوڑا ہے جلدی دو، انہوں نے فرمایا کہ یہ رکھا ہے سب لے جاؤ۔ وہ سب لے آئے ہم نے سب کھا لیا۔ میں نے حاجی جی سے کہا کہ اور لے آؤ حاجی پھر اوپر گئے ان کو بھی

کچھ مزہ آرہا تھا اور مجھے سب سے زیادہ کہ مغرب کے وقت ڈانٹ سن رہے تھے۔ اماں جی نے فرمایا کہ یہاں کچھ نہیں رہا اور پکانے کا بھی وقت نہیں۔ اماں جی کی اور بھائی انیس کی اچھی خاصی لڑائی ہوگئی کہ اسی پر خفا ہورہی تھیں لاؤ اب دو۔ صبح کو حاجی مقبول نے مطالبہ کیا کہ ارے رات تم نے کیا کیا کہیں چھپا کر رکھ لیا۔ میں نے کہا کہ چھپا کر کس کے واسطے رکھتے کوئی جورو بیٹھی تھی یہاں۔ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ اماں جی نے فرمایا کہ رات کو لڑکوں نے معلوم نہیں کیا کیا۔ گھر کا اور دعوت کا سب کھالیا۔ انیس اور مانگنے آیا تھا میں نے انکار کردیا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے اپنے قرب خاص سے نوازے بہت ہی شفقت سے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے روز بھوکے ہی رہتے ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بالکل نہیں۔ اللہ کا فضل ہے۔ روزانہ سیر ہوکر کھاتے ہیں۔ ہمارا لڑکپن ہے دو دو وقت کا ایک وقت کھالیں تو بھی گرانی نہیں ہوتی۔ دو وقت نہ بھی ملے تب بھی کوئی بیتابی نہیں ہوتی۔ مگر اماں جی اور حاجی جی کی اخیر تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس رات کو لڑکوں نے کیا کیا۔

ہم لوگوں کی مدینہ پاک حاضری اور سفر کی داستان:

اسی سفر میں مکہ مکرمہ میں عیدالفطر کی صبح کو مولانا محمد حسین حبشی ثم المکی یکے از خلفاء حضرت سیدی و مرشدی قدس سرہٗ کی درخواست پر حدیث مسلسل بیوم العید کی اجازت حضرت قدس سرہٗ نے عطاء فرمائی۔ قراءت اس سیہ کار نے کی تھی۔ رمضان المبارک کے بعد حضرت اقدس نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ میں تو مدینہ منورہ کچھ طویل قیام کے ارادہ سے آیا تھا۔ مگر مولانا محبّ الدین صاحب تو مجھے حج تک قیام کی بھی اجازت نہیں دیتے فوراً واپس جانے کا تقاضہ فرمارہے ہیں۔ میری حاضری تو مدینہ منورہ کئی دفعہ ہوچکی اور قیام کی اب گنجائش نہیں ہے۔ تم لوگوں کا پہلا سفر ہے معلوم نہیں کہ پھر مدینہ حاضری ہو یا نہ ہو تم مدینے ہو آؤ اور حضرت نے ہم چاروں کا سامان اور پیسے وغیرہ تو وہیں الحاج علی جان مرحوم کی دوکان پر جمع کرادیے۔ میرے پیسے تو حاجی مقبول صاحب مرحوم کے پاس تھے اور ہم لوگوں کو بارہ دن جانے کے اور بارہ دن واپسی کے اور تین دن مدینہ پاک قیام کے حساب سے دال چاول ہمارے ساتھ کردیے اور چار آنہ یومیہ کے حساب سے چوبیس یوم کی جمال کی بخشش اور دس روپے مزید دلوادیے۔ میرے پاس کچھ اپنے بھی تھے۔ چونکہ انتہائی بدامنی کا زمانہ تھا۔ راستے نہایت خطرناک اور مخدوش تھے خوب لوٹ مار راستہ میں ہوتی تھی۔ اس لیے بہت ہی قلیل حجاج مدینہ منورہ گئے۔ ہمارے بدو کے تین اونٹ تھے دو ہم چاروں کے اور ایک اونٹ سہارنپور کے پٹھانپورہ محلّہ کی ایک عورت اور اس کے خاوند کا تھا، ہم اس کو شیبہ کے نام سے پکارا

کرتے تھے نام یاد نہیں۔ تین اونٹ آنبھے کے خان صاحبان حاجی رفیق محمد اوران کے رفقاء کے تھے، تین اونٹ حسن پور کے خان صاحبان عبدالوحید خاں وغیرہ کے تھے اور دو یا تین اونٹ حاجی نظام الدین صاحب جاذم والے کانپوری یکے از خدام حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے تھے۔ یہ گیارہ بارہ اونٹوں کا قافلہ ہمارا تھا۔ اسی طرح پندرہ بیس اونٹوں کے قافلے اور بھی دس بارہ تھے۔ چونکہ سلطانی راستہ بہت مخدوش تھا اور لٹیرے اس راستہ پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے پڑے رہتے تھے۔ اس لیے اس سال قافلے بجائے سیدھے راستے کے جدہ ہوکر سمندر کے کنارے جبل غائر کے اُوپر کو گئے تھے۔ یہ پہاڑ نہایت ہی خطرناک اور مخدوش تھا، اب تک اس کے تصور سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ ایک جانب تو اس کے پہاڑ آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ دوسری جانب اس کے غارتحت الثریٰ تک اس میں ایک چھوٹی سی شاہراہ (بٹیا) پر کو ایک ایک اُونٹ جمال نکیل پکڑ کر لے چلتا تھا کہ اگر ذرا اس کا پاؤں لغزش کھائے تو تحت الثریٰ میں گرے اور اُونٹ کا پتہ بھی نہ چلے اور سواریاں ساری پیدل دو دو اونٹوں کے درمیانی فاصلے میں چلتی تھیں۔

یہ حصہ تو بہت ہی خطرناک تھا جو مدینہ پاک سے تین منزلہ پہلے تھا۔ اس پہاڑ سے کچھ پہلے سارے شغدف اُتار دیے گئے تھے۔ اونٹوں کی پشتوں پر سامان باندھ دیا تھا اور اسی پر جہاں کھلا راستہ ملتا حاجی سوار ہو جاتے اور جہاں کوئی چڑھائی وغیرہ آتی اتر جاتے۔ یہ منزل تو بہت ہی دشوار گزار تھی لیکن بہت محفوظ کہ اتنے آدمی خود اس جگہ نہ پہنچے دور سے کسی کو نہ دیکھ سکتا تھا معلوم ہوا کہ حضور اقدس کا سفر ہجرت بھی اسی راستہ سے ہوا تھا۔ غائر کی منزل سے نکلنے کے بعد کھلا میدان آ گیا تھا جس میں اونٹ حسبِ معمول رات کو چلتے تھے مگر چونکہ شغدف وغیرہ پہاڑ سے پہلے اُتار دیے گئے تھے اونٹوں پر سامان کے اُوپر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اسی لیے ذرا سی نیند کے جھونکے میں سواریاں اونٹ پر سے آم کے ٹپکے کی طرح سے خوب گرتی رہتی تھیں۔ یہ ناکارہ تو رات کو اونٹ پر سوار ہی نہ ہوتا تھا مگر دوسروں کے لیے یہ مشکل تھی کہ دن میں دھوپ کی تمازت اور کسی قسم کا سایہ وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے ان بیچاروں کو دن میں بھی سونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اس مجبوری کو اُونٹوں پر بیٹھنا پڑتا تھا اور خوب گرتے تھے۔ اس سیہ کار وہ زمانہ صحت کی عمدگی کے اعتبار سے ایسا تھا کہ گرمی سردی دونوں کا احساس نہ ہوتا تھا۔ میں منزل پر پہنچ کر اول وقت ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ کر ٹھنڈے ریت پر خوب سوتا تھا۔ اس وقت تو سبھی اول وقت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے۔ مگر اوروں کی مصیبت یہ تھی کہ جہاں دھوپ میں تمازت آتی وہ جاگ جاتے اور میں تقریباً ہندوستانی گیارہ بارہ بجے کے درمیان اٹھتا۔ میرے پسینے سے میرے نیچے کا ریت اس قدر بھیگ جاتا کہ لگتا کسی نے پانی ڈال رکھا ہے۔ واپسی پر چونکہ احرام کی وجہ سے بدن پر کپڑا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا اس لیے گرمی

کی وجہ سے ایسے دھاپڑ پڑ گئے تھے جو بلا مبالغہ کبوتر کے انڈوں کے برابر ہوتے تھے۔

میں نے تو اس مدینہ کے سفر میں کسی دن کھچڑی نہیں کھائی۔ مکہ مکرمہ سے نکلتے ہی ہر منزل پر ایک دنبہ خرید لیتے تھے۔ جو ایک یا دو مجیدی کا آجاتا تھا۔ اس زمانہ میں مجیدی وہاں کا ایک عام سکہ تھا جیسے اس زمانے میں ریال ہوتا ہے۔ خریدتے ہی آبجے کے جملہ احباب چونکہ مشاق شکاری تھے وہ اس کو دس پندرہ منٹ میں ذبح کرکے کھال نکال کر بوٹیاں کر لیتے تھے۔ اور کھال کسی بدو کو دے دیتے تھے۔ وہ بدو کھال لے کر اس قدر خوش ہوتا اُچھلتا کودتا لوگوں کو دکھاتا پھرتا اور دنبہ کی بوٹیاں فوراً چار جگہ تقسیم ہو جاتیں۔ چاروں دسترخوان پر جن کا اُوپر ذکر آیا یعنی ہمارا، آبجے والوں کا، حسن پور والوں کا اور کانپور والوں کا اور لوگ تو اُترتے ہی کھچڑی پکاتے اور اس میں سے کھاتے اور دنبہ پکنے کے بعد روٹی پکا کر رات کے واسطے ساتھ لے لیتے۔ لیکن یہ ناکارہ کھچڑی نہ کھاتا تھا۔ اپنے دنبہ میں سے ایک دو بوٹی کھا کر بقیہ تینوں دسترخوان کا دنبہ چکھتا کہ ہر ایک کو اصرار اور اشتیاق تھا۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ نے چلتے وقت مکہ سے اس سیہ کار کو قافلہ کا امیر بنا دیا تھا۔ اس لیے چاروں جماعتوں کے یہاں جاکر ان کی خیر خبر لینا ان کی یا ان سے جمال کو کچھ شکایت ہو اس کو سننا اور اس کا تصفیہ کرنا۔ اسی میں کچھ کھانا پینا اس سیہ کار کا مشغلہ تھا۔ مولوی لطیف الرحمٰن مرحوم میرے عزیز بھی تھے اور ہم عمر بھی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے میرے دونوں ساتھیوں مولانا منظور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور حاجی انیس مرحوم کو بہکایا کہ ہم لوگ تو پکاویں اور یہ امیر صاحب یوں ہی ٹہلتے پھرتے ہیں، ایک دن ان سے بھی پکوانا چاہیے۔ مولانا منظور احمد نے ان کو سمجھایا کہ تمہارا امیر ہے چناں چنیں ہے۔ سب کی خیر خبر لیتا ہے یہ بھی تو ایک کام ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے بہت ہی سمجھایا مگر وہ دونوں راضی نہ ہوئے۔

ایک دن انہوں نے متفقہ طور پر مجھ سے کہا کہ حضرت، امیر صاحب آپ کو بھی تو کچھ پکانا چاہیے، میں نے کہا بڑے شوق سے مگر مجھے پکانا نہیں آتا۔ ماموں لطیف نے کہا کہ ہم نے ساری عمر باورچی گری کی ہے؟ میں نے کہا کہ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ تم سے بہتر پکانے والا اس مجمع میں کوئی نہیں ہے طباخ بھی تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتا اور یہ واقعہ بھی تھا مرحوم کا قیام اس زمانہ میں سہارنپور ہی میں تھا، پکانے کے نہایت شوقین اور نہایت لذیذ کھانے پکاتے تھے۔ مچھلی، کوفتے، پلاؤ۔ سہارنپور میں شوقیہ بہت مرتبہ ان سے پکوائی مگر اس دن ان کو غصہ آرہا تھا کہنے لگے کہ میں نے باورچی کی ملازمت آج تک کہیں نہیں کی۔ تھوڑی سی تو تو میں میں کے بعد میں نے کہا کہ لڑائی کی بات نہیں۔ تم لوگ بتاتے رہو ہم پکائیں گے۔ مرحوم نے کہا ہم نہیں بتائیں گے۔ میں نے کہا کہ جانے دو۔ لکڑیاں بیچنے والی تو ہر قافلہ والوں کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ پتھروں کا چولہا بنا کر اور

لکڑیاں اس میں رکھ کر دیا سلائی اس میں لگائی۔ بھلا دیا سلائی سے لکڑی کیسے جل سکتی ہے۔ ہم نے تین چار دیا سلائیاں پھونک دیں۔

وہ شیبہ جس کا اونٹ ہمارے ساتھ تھا اس کی بڑھیا بیوی اپنے میاں سے کہنے لگی کہ ان مولانا صاحب کو آگ جلانا بالکل نہیں آتی تو جلا دے۔ میرے محترم دونوں بزرگ اس پر بگڑ پڑے کہ تو نے ہماری آگ بھی جلائی؟ اس نے کہا کہ تم کو تو جلانی آتی ہے۔ ہمارے ان مولانا صاحب کو آتی نہیں۔ اس بڑھیا نے اس بوڑھے سے کہا کہ ارے نہیں میرے چولہے کی ساری لکڑیاں ان کے چولہے میں رکھ آ۔ اس کا چولہا خوب جل رہا تھا۔ میں نے اپنے چولہے کی لکڑیاں نکال کر ان کے چولہے کی طرف ڈال دیں اور دیگچی میں پانی خوب بھر کر ہم نے پوچھا کہ کھچڑی کتنی پڑے گی وہ دونوں خوب ناراض ہوئے کہ جان جان کر باؤلا بنتا ہے۔ میں نے کہا کہ تمہارا نقصان ہوگا میں تو پکا دوں گا۔ مولانا منظور احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جلدی سے اٹھ کر میری دیگچی میں سے آدھا پانی لوٹے میں ڈالا۔ میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے اس بھری دیگچی میں کھچڑی ڈالی تو پانی نکل کر آگ بجھا جاوے گی وہ بڈھا اور بڑھیا بھی خوب ہنس رہے تھے اور ان کے ہنسنے پر میرے دونوں محترموں کو خوب غصہ آرہا تھا۔ مولانا منظور احمد صاحب نے فرمایا کہ دو لپیں بھر کر کھچڑی کی ڈال دو اور پھر ایک لپ نمک کی بھر کے اس میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو وہ بوڑھا بولا کہ اجی مولوی صاحب خراب ہو جائے گی۔ ہم نے کہا تو بتا دے۔ اس نے چٹکی نمک لے کر ذرا سا ڈال دیا۔ حاجی انیس صاحب کو زور سے بولنے کی عادت بہت تھی۔ کہنے لگے کہ کبھی تو نے ہماری ہانڈی کی بھی خبر لی۔ بقیہ تینوں دستر خوان بھی قریب قریب تھے۔ پہلے تو آبھے کے پٹھان لمبے لمبے قد آور لمبی لمبی لاٹھیاں لے کر آئے کہ ارے شیخو! تمہارے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ آپس کی بات ہے جاؤ۔ وہ کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ کو ہمارا بھی امیر بنایا ہے ان کا اکیلے کا نہیں۔ دیکھو بھئی شیخو! اگر ہمارے امیر کی شان میں گستاخی کی تو ہم سر پھوڑ دیں گے اور ان لوگوں کو واقعی غصہ آ گیا اور مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھو امیر صاحب، اگر تم نے آج سے ان کے یہاں روٹی کھائی تو آپ کی بھی خیر نہیں۔ اتنے میں یکے بعد دیگرے حسن پور اور کانپور والے بھی آ گئے انہوں نے متانت اور تہذیب سے گفتگو کی۔ مضمون ایک ہی تھا ان سے تو یہ کہا کہ تم نے ہمارے امیر صاحب کو چناں چنیں کہا اور مجھ سے اصرار کیا کہ آج سے کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تو پہلے سے بھی کھانا تمہارے ساتھ ہی کھاتا ہوں، باقی میں اپنے ساتھیوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ان کا مطالبہ صحیح ہے مجھے پکانے میں شریک ہونا چاہیے مگر میں اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ بدوؤں سے لڑنا بھی ان کا کام

ہے وہ میں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ بہر حال بڑی خوشامد کے بعد ان سب کو واپس کیا۔

میرا جمال فرج اللہ نام طائف کا رہنے والا میرے ہم عمر لڑکا تھا۔ پہلے ہی دن سے اس سے دوستی ہوگئی وہ چار آنہ فی نفر بخشش لاتا اور میرے پاس امانت رکھواتا۔ میں اس سے کہتا کہ رکھنے کی جگہ نہیں ہے اس کا جحب (تربوز) خرید لاؤ چونکہ قافلے نہیں تھے اس لیے راستہ کی چیزیں بڑی سستی تھیں اور تربوز خربوزہ راستہ میں خوب ملتے تھے۔ وہ ہر منزل پر کئی کئی تربوز اور خربوزے خرید لاتا اور ہم سب رفقاء اور ادھر ادھر کے آدمی مل کر کھاتے۔ اس جمال کو مجھ سے محبت حد سے زیادہ ہوگئی تھی۔ میں اکثر اخیر کی منزلوں میں پاؤں چلتا تھا۔ ایک مرتبہ پاؤں پر کانٹا چبھ گیا اور وہ ٹوٹ گیا اللہ تعالیٰ اس جمال کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔ وہ رو رہا تھا اور بدوؤں کو نکچنڈی لے کر یکے بعد دیگرے بلاتا اور رو کر یہ کہتا تھا کہ یہ کانٹا اس کے پاؤں میں نہیں بلکہ میرے دل میں چبھ رہا ہے۔ جلدی نکالو۔

سارے سفر میں اس کی امانت جو مجھ پر قرض تھا ۲۷ مجیدی ہوگئے تھے۔ میں تو مطمئن تھا کہ مکہ جا کر ادا کر دوں گا۔ چونکہ لاقانونی دور تھا اور جب حاجی یوں کہتے کہ ہم واپسی پر تمہاری شریف حسین سے شکایت کریں گے تو بدو کہتے کہ "من شریف؟ انا شریف" (شریف کون ہے شریف تو میں ہوں) اس لیے جب واپسی پر مکہ قریب ہوا تو پھر حاجیوں نے زور دکھانا شروع کیا کہ ہم حکومت سے شکایت کریں گے۔ ہندی سفارت خانے میں جاؤ ان سب کو پکڑ واؤ۔ ان سب کو ڈر کے مارے سارے اونٹ والے قافلے کو عشاء کے بعد مکہ پہنچا کر اپنے اپنے اونٹ لے کر ایسے فرار ہوئے کہ کسی کا پتہ ہی نہ چلا۔ میں بھی فرج اللہ کو اس کے قرضہ کی وجہ سے اور انعام دینے کی وجہ سے بہت تلاش کرتا رہا، مگر آج تک اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کا قرضہ مدرسہ میں لقطہ کے نام سے تصدیق بھی کر چکا ہوں اور اس کو اب تک خوب یاد کرتا ہوں۔

مدینہ پاک میں بجائے تین دن کے ایک ماہ قیام کرنا:

پہلے لکھوا چکا ہوں کہ جبل غائر سے پہلے سارے شغدف رکھ دیے تھے۔ مگر جو شخص بدو کو پانچ اشرفی دیتا اس کا شغدف تو وہ لے جانے پر تیار تھے۔ ایک یا دو کے سوا کوئی شخص پانچ اشرفیاں دینے پر تیار نہ ہوا۔ میرا جمال بہت ہی شدید اصرار کرتا رہا ہے تمہارا شغدف بلا معاوضہ جائے گا۔ میں نے زبردستی اُونٹ پر سے اُتار لیا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے اکیلے کا شغدف جائے، مجھے اس میں ساتھیوں سے ندامت ہوتی ہے اور سب کا لے جانا واقعی خطرناک تھا۔ ایک دو شغدف کو اس طرح پر کہ ایک جمال تو اونٹ کو پکڑے اور ایک دو شغدف کو پکڑیں جا سکتا تھا۔ ہم لوگ اوائل شوال میں مکہ سے چل کر بیس شوال کے قریب مدینہ طیبہ پہنچے۔ اس زمانے میں قانون یہ تھا کہ مدینہ پاک

میں قیام کی صرف تین دن کی اجازت تھی۔ اس کے بعد اگر کوئی ٹھہرنا چاہے تو اپنے بدو کو راضی کرے اور ایک اشرفی روزانہ فی نفر جمال کو دے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے احسانات کی کیا انتہا ہے ہمارے مدینہ پہنچنے پر ہمارے قافلہ کا ایک اونٹ مر گیا۔ زمانہ چونکہ بے اطمینانی اور بداعتمادی کا تھا اس لیے بدوؤں کو وہاں قرض نہ مل سکا حکومت بھی اس وقت بدوؤں کی خدمت کرنے سے معذور تھی۔ بدو ہم سے کہتے تھے کہ اگر تم لوگ ہم کو قرض دے دو مکہ جا کر ادا کر دیں گے تو ہم اونٹ خرید لیں گے، ہمارے پاس پیسے نہیں اور میں ان سے یہ کہتا کہ ہمیں تو ہمارے شیخ نے صرف تین دن کے کھانے کا سامان دیا تھا۔ اب یا تو تم لوگ لے چلو یا ہمارے کھانے کا انتظام کرو۔ وہ بے چارے خوشامد کرتے اور ہم اللہ معاف کرے ان کو ڈانٹ دیتے آٹھ دس دن میں ایک مرتبہ امیر مدینہ کے پاس بھی شکایت لے کر پہنچ جاتے وہ ایک بالا خانے پر چار پانچ بدو نہایت عمدہ مشلح پہنے ہوئے برابر برابر بیٹھے تھے اور ہماری شکایت پر معذرت کرتے کہ تمہارے بدو کا اونٹ مر گیا اس کو کہیں قرضہ نہیں ملتا۔ تم کو تکلیف تو ہو رہی ہے مگر مدینہ کی تکلیف اجر سے خالی نہیں۔ اللہ کے احسانات کی کیا انتہا ہے کہ بجائے تین دن کے ایک ماہ کے قریب مدینہ پاک میں قیام رہا اور پانچ گنی روزانہ دینے کے بجائے جمالوں کو خوب ڈانٹ اور امراء مدینہ کی طرف سے خوشامدیں مزید برآں ہوتی رہیں۔

آخر ذی قعدہ میں جب حج کا وقت بہت ہی تنگ رہ گیا تو اس روسیا نے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر واپسی کی اجازت چاہی اور عرض کیا کہ ساتھیوں میں سے بہت سے حج بدل والے ہیں۔ اگر حج نہ مل سکا تو ان ساتھیوں کو بڑی دقت ہوگی۔ روضۂ اقدس پر درخواست پیش کرتے ہی معلوم ہوا کہ بدو کو کہیں سے پیسے قرض مل گئے وہ اونٹ کی تلاش میں ہے۔ کل کو اونٹ مل جائے گا پرسوں کو واپسی ہے۔

بندہ کے پاس مولانا شیر محمد صاحب کا امانت رکھوانا اور اس پر میری شرائط:

اسی وقت مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ مولانا شیر محمد صاحب گھوٹکی (سندھ پاکستان) والے جو آخر میں مہاجر مدینہ بن کر وہیں جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ حضرت حکیم الامت کے مخلص خدام اور میرے والد صاحب کے مخلص دوست مدینہ آئے ہوئے ہیں اور کل سے مجھ کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ مجھ کو دو دن سے تلاش کر رہے ہیں۔ مل کر لپٹ گئے اور فرمایا کہ کل سے تم کو تلاش کر رہا ہوں۔ ہمارا قافلہ پرسوں سے آیا ہوا ہے ہم ایک مصیبت میں پھنس رہے ہیں وہ یہ کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے ہم لوگ اپنے شغدفوں پر قالین بندھوا لائے تاکہ دھوپ کی تمازت سے امن رہے جب سے یہاں آئے ہیں ہمارا قافلہ تو رؤسا کا مشہور ہو رہا ہے اور

تمہارے متعلق پرسوں سے ہر شخص کی زبان سے یہ سن رہا ہوں کہ ایک ہندی قافلہ فقیروں کا پڑا ہوا ہے جن کے پاس کھانے کو نہیں ہے۔ ہر بچہ بڑے کی زبان پر تمہارے متعلق یہی ہے اور ہمارے متعلق ہر شخص کی زبان پر رؤسا کا قافلہ مشہور ہو رہا ہے۔ ہم کو اپنی جانوں کا خطرہ ہے ہمارے پاس بہت سی اشرفیاں ہیں اللہ کے واسطے ان کو تو اپنے پاس رکھ لے مکہ جا کر لے لوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ جیسے خطرہ آپ کے لیے ہے سب ہی کے لیے ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ ان کے پاس کھانے کو بھی نہیں ہے ان کو اپنے تکیہ میں سی لو میں نے کہا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ بدو راستہ کے درمیان میں تکیوں پر کھودا مارتے ہیں اگر ان کو ذرا بھی شبہ ہو گیا تو گنتیوں کی بھی خیر نہیں اور میری بھی خیر نہیں۔ انہوں نے بہت ہی خوشامد کی اللہ کے کس کس احسان کا شکر ادا ہو سکتا ہے کہ اس غربت کی حالت میں مالک نے وہ مدد فرمائی۔ بڑے اصرار کے بعد میں نے تین شرطوں کے ساتھ قبول کر لیا۔

نمبر۱ مکہ میں ادا نہیں کروں گا۔ ہندوستان پہنچ کر چار ماہ میں ادا کروں گا۔

نمبر۲ یہ کہ اشرفیاں نہیں لوں گا ان کے ہندی نوٹ بنا کر آپ مجھے دیجئے۔

نمبر۳ مکہ میں حضرت کو اس کی اطلاع نہ ہونی چاہیے۔ انہوں نے تینوں شرطوں کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا اور مجھے سات آٹھ ہزار کے نوٹ ہندی لا کر دے دیے۔

میں ان کو جیب میں ڈال کر اول اپنے رفقاء کے پاس اور پھر آگے، کان پور، حسن پور والوں کے پاس گیا کہ بھائی دیکھو پرسوں کی روانگی طے ہو گئی۔ تمہیں کھجوریں خریدنے کے واسطے جتنے پیسے چاہئیں لے لو۔ اول تو میرے ساتھیوں نے میرا مذاق اڑایا کہ مدینہ پاک میں بھی ایسی بناوٹی باتیں کرتے ہو۔ مگر جب میں نے نوٹوں کا گٹھا نکال کر سامنے کیا تو ہر شخص پوچھنے لگا کہ یہ کہاں سے آئے۔ میں نے کہا کہ تم کو اگر چاہئیں تو بتاؤ ورنہ میں دوسروں پر احسان رکھوں۔ چنانچہ میں نے اور میرے رفقاء نے چار سو پانچ سو کی کھجوریں خریدیں اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے برادر معظم حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے توسط سے تجار کے اونٹوں پر براہِ راست بھیج دیں اور بقیہ رقم دوسرے رفقاء پر جس نے جو مانگا ہزار دو ہزار دو شرطوں کے ساتھ ان کو قرض دیا۔ ایک تو یہ کہ مکہ میں حضرت قدس سرہٗ کو خبر نہ ہو، دوسرے ہندوستان پہنچ کر تین ماہ کے اندر اندر مجھے ادا کر دیے جائیں۔

مولانا سید احمد صاحب کی فیاضیاں:

حضرت قدس سرہٗ کو حاجی انیس صاحب کے ذریعہ کچھ پتہ چلا۔ تفصیل حاجی انیس کو بھی معلوم نہ تھیں۔ مگر حضرت قدس سرہٗ نے جواب طلب نہ فرمایا۔ ہمارے مدینہ سے چند روز قبل حضرت

مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اپنی طویل جلاوطنی کے بعد جس کا ذکر پہلے آچکا ہے مدینہ پاک آئے تھے۔ ان کی وجہ سے ہم چاروں کا قیام ان کے اس ذاتی مکان میں تھا جس کو انہوں نے اور ان کے والد صاحب اور حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ بہت ہی خوشنما اور پُر فضا کئی کمرے برابر اور ہر کمرے میں مستقل کنواں، اندر کے صحن میں کھجوروں کے درخت جن پر رطب آرہی تھیں۔ حضرت مولانا احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی فیاضی کا تو کیا پوچھنا۔ وہ اپنی بے سروسامانی کی حالت میں علی الصباح ایک رطب کی قرض خرید کر میرے کمرے میں رکھ دیتے اور ہم لوگ شام تک اس کو ختم کر دیتے۔ دونوں وقت نہایت لذیذ کھانے بازار سے خرید کر لاتے اور اپنے دست مبارک سے اس میں مرچیں اور گھی ڈال کر خوب بھونتے، بڑے اصرار سے کھلاتے۔ تازہ پنیر دونوں وقت کی چائے دودھ کی۔ غرض مدینہ پاک کے اس ایک ماہ قیام میں ہم چاروں کو نہ کچھ خریدنا پڑا نہ پکانا پڑا۔ آخر ذیقعدہ میں مدینہ پاک سے چل کر بارہ دن میں جہاں تک یاد ہے ۴ ذی الحجہ کو مکہ پہنچے۔ یہی تاریخ سید الکونین فخر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حجۃ الوداع میں مکہ مکرمہ میں پہنچنے کی ہے۔

حج کے بعد حضرت مولانا محبّ الدین صاحب قدس سرہٗ کے شدید اصرار کے باوجود ایک ماہ کے قریب مکہ میں قیام رہا اور محرم کے دوسرے عشرے میں روانہ ہو کر دو تین دن بمبئی میں قیام کے بعد ۸ صفر ۳۹ھ میں حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں سہارنپور پہنچنا ہوا اور اس کے بعد وہ حرمین شریفین میں شریف حسین کی بغاوت اور سعودی حکومت کا قیام ہوا جس میں بہت قتل عام ہوا۔

اس سفر میں ایک عجوبہ بھی پیش آیا۔ حضرت قدس سرہٗ کو مظاہر علوم کے ساتھ گویا عشق تھا۔ ہر نوع کی فلاح و بہبود ہر وقت ملحوظ خاطر تھی۔ خاص طور سے کتب خانہ کے لیے کوئی نادر کتاب کہیں مل جاتی تو حضرت مدرسہ کے لیے اس کے حصول کی بہت ہی کوشش فرمایا کرتے تھے۔ اسی سفر میں مدرسہ کے لیے صبح الاعشی خرید کر لائے تھے جو اسی زمانے میں چھپی تھی اور مکہ مکرمہ میں تازہ پہنچی تھی اور ہندوستان میں کہیں نہیں آئی تھی۔ اسی سفر میں حضرت قدس سرہٗ الحاج عبداللہ عبید اللہ علی جان والوں کے یہاں تشریف لے گئے۔ ان کے یہاں مصنف عبدالرزاق کا قلمی نسخہ تھا۔ حضرت قدس سرہٗ نے مدرسہ کے لیے اس کے خریدنے کی خواہش فرمائی۔ انہوں نے سو (۱۰۰) گنی اس کی قیمت بتائی۔ حضرت نے فرمایا کہ بہت زیادہ مقدار ہے۔ انہوں نے کہا یہ بھی حضرت کی رعایت سے ہے۔ ان کے پاس سے اٹھ کر جب باہر نکلے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت اس کی اجازت لے لیں کہ ہم لوگ اس کو نقل کر لیں۔ حضرت نے فرمایا کہ واپسی کے چند دن باقی ہیں اتنے میں کیسے نقل ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت انشاء اللہ ضرور ہو جائے گی۔ آپ اجازت تو لے لیں۔ حضرت

نے فرمایا کہ بہت دشوار ہے وقت ہی کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت لے تو لیں۔ حضرت وہیں سے واپس ہوئے اور ان سے نقل کی اجازت مانگی۔ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ دس بارہ دن واپسی کے رہ گئے ہیں کیوں انکار کریں، یہ کہہ دیا کہ بڑے شوق سے نقل کرائیں۔

حضرت نوراللہ مرقدہٗ کا مدرسہ سے تعلق:

میں نے اس کو لا کر جلدی جلد توڑی اور اس کا زیادہ حصہ اپنے ذمہ اور بقیہ متولی طفیل صاحب کاندھلوی، مولانا منظور احمد صاحب، بھائی انیس صاحب اور مولوی اسحاق، مولوی عبدالمجید تھانوی، قاری عبدالعزیز مدرس تجوید مظاہر علوم، مولوی لطیف الرحمٰن، مولوی حبیب احمد نارنولی وغیرہم کے ذمہ تقسیم کر دیا جو اس سفر میں ساتھ تھے۔ صبح سے لے کر ظہر تک ہم لوگ اس کو نقل کرتے اور عصر سے مغرب تک میں اور حضرت قدس سرہٗ اس کا مقابلہ کیا کرتے۔ دس پندرہ دن میں نقل ہو گئی۔ ہندوستان واپسی کے ایک دو دن پہلے اس کی جلد بنوا کر حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ حاجی عبید اللہ صاحب کے مکان پر حاضری ہوئی اور وہ کتاب واپس کی۔ انہوں نے کتاب لے کر کہا کہ حضرت میں تو پہلے ہی عرض کرنے کو تھا وقت بہت تھوڑا ہے اس میں کیسے نقل ہو سکتی ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو جزائے خیر دے، انہوں نے نقل کر لی۔ انہوں نے کہا کہ حضرت پوری نقل ہو گئی۔ حضرت نے فرمایا، جی ہاں اللہ کا شکر ہے ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور ان کو یقین بھی نہیں آیا۔ کہنے لگے کہ حضرت وہ نقل میں ضرور دیکھوں گا۔ میں نے کہا کہ میں ابھی لاتا ہوں۔ میں لے کر ان کو دکھانے لایا۔ اتنا ضرور تھا کہ کئی خط تھے اور عجلت میں خوشخط بھی نہ لکھی جا سکی۔ مگر دس بارہ دن میں دونوں جلدیں پوری ہو گئیں تھیں۔

دوسرا اور تیسرا حج

بندہ کا حضرت قدس سرہ کی ہمرکابی میں دوسرا حج اور واپسی پر تیسرا حج:

اس سیہ کار کا ۴۴، ۴۵ھ میں میرے آقا میرے مرشد حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں ہوا۔ میرے حضرت کی ہمیشہ سے تمنا مدینہ پاک میں موت کی تھی۔ ۳۸ھ میں بھی اسی تمنا میں تشریف لے گئے تھے مگر مولانا محب الدین صاحب کے اصرار سے واپس آنا پڑا۔ اس مرتبہ بھی حضرت قدس سرہٗ طویل قیام کے ارادہ سے تشریف لے گئے اور مدرسہ سے ڈیڑھ سال کی رخصت لی۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا طویل قیام کا ارادہ تھا اور اس سیہ کار کی ملازمت کے علاوہ قرض کا بار بھی تھا

اور دو بچیاں والدہ ہارون اور والدہ زبیر پیدا ہو چکی تھیں۔ ان سب کی خورد ونوش کا بھی انتظام تھا۔ اس لیے میرے اور حضرت قدس سرہٗ دونوں کے ذہن میں اس ناکارہ کا جانا نہیں تھا، اسی لیے میرے اور حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہ اعلی اللہ مراتبہٗ نے اپنی غیبت کے جو انتظامات لکھوائے اس میں حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو ناظم اور اس سیہ کار کو صدر مدرس بنا دیا۔ یہ تحریر میری لکھی ہوئی نہیں تھی۔ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تھی۔ مگر چونکہ ڈاک کا تعلق مجھ ہی سے تھا۔ ہر وقت کے حجرہ کی آمد و رفت بھی تھی اور وہ میرے ہی کاغذات میں رکھی ہوئی بھی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو راز میں بھی نہیں سمجھا اور پڑھ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر کہ مجھے صدر مدرس بنایا گیا ہے میرے ہوش اُڑ گئے۔ حضرت اوپر پیشاب کے لیے تشریف لے گئے اور یہ ناکارہ پیچھے پیچھے لوٹا لے کر پہنچا۔

حضرت کا سفر حیدر آباد اور ایک ہفتہ قیام:

میں نے عرض کیا کہ بذل کا کیا ہوگا۔ حضرت نے بہت ہی فکر اور سوچ سے فرمایا، فکر تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔ تمہارے بغیر تو میں لکھ بھی نہیں سکتا۔ جس کی تفصیل پہلے گزر گئی۔ اس ناکارہ کی ہم رکابی طے ہوگئی اور چونکہ حیدر آباد کے احباب کا حضرت قدس سرہٗ پر بہت دنوں سے اصرار تھا کہ حیدر آباد دو چار دن کے لیے تشریف لے آئیں۔ اس لیے قرار پایا کہ اماں جی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حاجی مقبول اور سب رفقاء سہارنپور سے سیدھے بمبئی جائیں اور حضرت قدس سرہٗ ایک ہفتہ کے لیے حیدر آباد ہو کر جائیں۔

یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ ایک خادم کا حضرت کے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے اور چونکہ فرسٹ کلاس کا سفر تھا۔ اس وقت میں سہارنپور سے بمبئی تک کا کرایہ گیارہ بارہ روپے تھا اور سہارنپور سے حیدر آباد کا کرایہ فرسٹ کلاس چونسٹھ روپے تھا۔ میں جلدی سے بول پڑا کہ حضرت کی ہم کابی میں میرا نام لکھ دو۔ اماں جی وغیرہ سارا قافلہ سہارنپور سے بمبئی ۲۳ شوال پنجشنبہ ۴۴ھ کو روانہ ہوا اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کو حیدر آباد ایک ہفتہ قیام کرنا تھا اس لیے وہ ایک ہفتہ قبل ۱۶ شوال پنجشنبہ مطابق ۲۹ اپریل ۲۶ء کو حیدر آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ حضرت قدس سرہٗ کا اور اس سیہ کار کا ٹکٹ تو فرسٹ کلاس کا تھا اور مولوی زکریا قدوسی مرحوم کا سرونٹ کا۔

اگلے دن اس ناکارہ کی روانگی حیدر آباد اور ریل کے اسٹیشنوں کا فریضہ:

اہل مدرسہ سے خوب الوداعی معانقے ہوئے۔ راستے میں بھی اسٹیشن تک خوب ہوئے اور اسٹیشن کا تو پوچھنا ہی کیا۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ گویا عمر بھر کے واسطے الوداع فرما رہے تھے اس

لیے نہ صرف قرب وجوار بلکہ دُور دُور کا مجمع الوداع کے واسطے آیا ہوا تھا اور سارا اسٹیشن ڈٹ رہا تھا۔ سب سے رخصت ہولیے اور گارڈ نے سیٹی بھی دے دی جب یاد آیا کہ حضرت قدس سرہٗ کا خاص بکس جس میں ساری امانتیں اور سب کے کرائے اور غالباً کچھ خصوصی سامان حیدرآباد لے جانے کا بھی تھا اور وہ عمومی سامان کے ساتھ اسٹیشن پر پہلے سے اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ بہت مہتم بالشان تھا۔ تجویز یہ تھی کہ وہ حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ فٹن میں رکھا جائے گا، اس میں رکھنا بھول گئے۔ عین وقت میں یہ ناکارہ اور مولوی قدوسی مرحوم اُتار دیے گئے کہ کل کو اسی گاڑی سے صندوق لے کر چلیں۔ دہلی تک تو حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ جانے والے بہت ہو گئے تھے۔ فرسٹ میں بھی اور تھرڈ میں بھی لیکن اس کے بعد حیدرآباد تک حضرت کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔

جب میں اسٹیشن سے پیدل مدرسہ آ رہا تھا اور ہزاروں کا مجمع حضرت کو رخصت کر کے واپس آ رہا تھا۔ اسٹیشن سے مدرسہ تک وہ گالیاں سُنیں لا تعد و لا تحصیٰ. ہر ایک کہہ رہا تھا کہ یہ مولوی کیسے مکار ہیں۔ دیکھو یہ ریل پر سب سے معانقہ کر رہا تھا۔ ''جب نہیں کہا گیا کہ میں نہیں جا رہا۔'' ابے فلانے، ابے یہ آگے آگے جو مولوی جا رہا ہے'' دیکھو کیسا دغاباز ہے۔ اس وقت تو ہر ایک سے مصافحہ کر رہا تھا۔'' مجھ سے بھی بیسیوں نے پوچھا کہ ''جی آپ تو حج کو جا رہے تھے؟'' یہ تو میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ صندوق رہ گیا کہ خواہ مخواہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگا تا تھا۔ بعضوں نے تو کہہ دیا کہ بھائی کچھ کام یاد آ گیا۔ بعضوں سے کہا کہ میں نے کب کہا کہ میں حج کو جا رہا ہوں، تو نے کیوں معانقہ کیا؟

غرض مدرسہ تک خوب لتاڑ پڑی اور اگلے دن تک بھی لتاڑ پڑتی رہی۔ اگلے دن یہ ناکارہ صندوق لے کر اسی شام کے چار بجے کے ایکسپریس سے جو اس زمانہ میں بھوپال کو جاتی تھی روانہ ہوا۔ یہ ناکارہ مع بکس کے فرسٹ کلاس میں اور مولوی قدوسی مرحوم سرونٹ میں۔ بکس کی وجہ سے مجھے بھی اکیلے ڈرلگ رہا تھا کہ فرسٹ میں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ منمار تک تو ایکسپریس سے جانا ہوا۔ وہاں سے حیدرآباد تک ریاستی ریل میں جو چھوٹی لائن سہارنپور تا شاہدرہ سے بھی چھوٹی تھی سوار ہوئے، مگر تیز وہ اس سے بہت چلتی تھی۔ میں فرسٹ کلاس میں پاؤں پھیلائے پڑا ہوا تھا اور ہر اسٹیشن پر سر اُٹھا کر اسٹیشن کی سیر کرتا تو عجیب منظر دیکھا۔ ہر اسٹیشن پر پچیس تیس آدمی فرسٹ کلاس کے سامنے رکوع تک جھک کے دونوں ہاتھوں سے سلام کر رہے تھے۔ میں بھی ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ یہاں فرسٹ کلاس کے مسافروں کے ساتھ یہی ہوتا ہوگا۔ گاڑی میں تو میں اکیلا تھا۔ وہاں حضرت مولانا نصر اللہ کے بڑے صاحبزادے مولوی محمود صاحب مرحوم چند رفقاء کے ساتھ مجھے لینے آئے۔ وہاں بھی یہی منظر ہوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ وہ بہت ہنسے، کہنے لگے ایک بہت بڑے افسر کا تبادلہ ہوا ہے اور اس کا اسی گاڑی سے آنا

طے تھا۔ اس کے استقبال کے لیے یہ لوگ آئے تھے اور اس سے واقف نہیں۔ ان میں بھی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کوئی تو کہتا کہ افسر صاحب یہی ہیں اور کوئی کہتا یہ تو مولوی صاحب ہیں افسر ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ممنار تا حیدر آباد کی سلامی کی شرح معلوم ہوئی۔

ایک ہفتہ تک حیدر آباد میں جانی میاں جو حیدر آباد کے معروف لوگوں میں اور ہمارے سب اکابر سے خصوصی تعلق رکھنے والوں میں تھے۔ دار العلوم کی شوریٰ کے ممبر بھی تھے۔ ان کے ہاں قیام رہا۔ حد سے زیادہ حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے انہوں نے مدارات اور خاطریں کیں۔ میرے عزیز مولوی ادریس صاحب کاندھلوی حال شیخ التفسیر جامعہ اشرفیہ لاہور مولوی فیض الدین صاحب وکیل کے یہاں ان کو عربی پڑھانے پر ملازم تھے اور خالی اوقات میں آصفیہ کے کتب خانہ میں اپنی تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔ وکیل صاحب کے یہاں بھی مولوی ادریس کی وجہ سے میرا تقریباً روزانہ ہی جانا ہوتا تھا، وہ بھی بڑی خاطر کرتے تھے۔ وہاں کے احباب کا اصرار حضرت قدس سرہٗ کی نظام صاحب سے ملاقات پر ہوا۔ حضرت قدس سرہٗ نے یہ فرمادیا کہ میرا صرف ایک ہفتہ قیام ہے، اس کے بعد بمبئی جانا ضروری ہے کہ میرے سب رفقاء اس وقت تک بمبئی پہنچ جائیں گے۔ اس میں اشکال یہ ہوا کہ اگر نظام صاحب کے یہاں معروضہ ملاقات کا پیش کیا گیا اور نظام صاحب نے وقت ایک ہفتہ کے بعد کا مقرر کر دیا تو اس کو چھوڑ کر بمبئی جانا مناسب ہوگا۔ اس لیے ملاقات کی درخواست کی رائے تو ملتوی ہوگئی۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ نے بذل المجھود کی جلد اول اور ثانی جن کی نہایت خوبصورت جلدیں سہارنپور میں بنوا رکھی تھیں اور ان کے شروع میں نہایت مطلا حسین مطبوعہ کاغذ نظام صاحب کے نام کا لگوا رکھا تھا بھیجیں۔ اس کی بنا پر نظام صاحب کے یہاں سے دو تین دفعہ خاصا (یعنی دعوتی کھانا) بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ آیا۔ کھانا تو کچھ معمولی ہی سا تھا مگر اس کے برتن وغیرہ خوان اور خوان پوش وغیرہ بہت زریں۔ معلوم ہوا کہ نظام صاحب خود بھی ایسا ہی سادہ کھانا کھاتے ہیں۔

بہر حال ایک ہفتہ قیام کے بعد ۲۵ شوال شنبہ کی صبح ۹ بجے حیدر آباد سے روانہ ہو کر یک شنبہ کی صبح بمبئی پہنچے اور بمبئی سے ۷ ذیقعدہ پنجشنبہ ۴۴ھ مطابق ۲۰ مئی ۲۶ء کو جدہ نامی جہاز سے روانہ ہو کر ۱۷ کو کامران پہنچے جہاں ۲۴ گھنٹے کا قرنطینہ تھا۔ چونکہ کئی دن پانی میں گزرے تھے اس لیے خشکی پر بڑا ہی لطف آیا۔ کھلا میدان سمندر کی ٹھنڈی ہوا۔ ریت پر بڑی میٹھی نیند آئی اور تو کوئی چیز اس وقت یاد نہیں، انڈے مرغیاں بہت ہی کثرت سے تھیں۔ میں نے تو صرف انڈے ہی لے کر اور رفقاء کے یہاں فرائی پان میں کڑکڑا کر خوب انڈے کھائے، انڈے تو ایک پیسے کے کئی آتے تھے، مرغیاں خوب یاد ہیں کہ دو دو آنہ کی آتی تھیں۔ بیس عدد تو حاجی مقبول صاحب نے حضرت قدس سرہٗ کے

دستر خوان کے لیے لیں اور تیس عدد متولی جلیل کاندھلوی مرحوم نے لیں۔ اسی طرح بہت سے رفقاء نے بیس سے کم لینا تو کسی کا یاد نہیں پچاس تک لیں اور ان سب کو ذبح کر کے نمک ڈال کر بغیر پانی کے گھی میں بھون کر رکھ لیں۔ گھی بھی بہت سستا تھا اور جدہ تک اور بعض نے مکہ تک تھوڑی تھوڑی اس میں سے لے کر پانی مصالحہ ڈال کر پکاتے رہے اور کھاتے رہے۔ اس سیہ کار کے فرائض میں سے تو ہر دستر خوان کا نمک چکھنا ضروری تھا۔ ہر ایک دستر خوان پر مرغی کی ایک دو ٹانگیں میرے لیے مخصوص ہوتیں۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ مستقل قیام کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے اس لیے سامان بہت سارا تھا۔ جدہ جا کر بقدر ضرورت مختصر سامان مکہ کے لیے حضرت نے رکھا اور باقی سارا سامان جدہ میں مطوف کے وکیل کے ذریعہ سے جدہ کے تجار کے سامان کے ساتھ براہِ راست مدینہ منورہ بھیج دیا۔

سفر خرچ کی میزان:

اس سیہ کار کی بھی سنو! ۳۸ھ کے سفر میں بہت مختصر سامان تھا یعنی ایک ڈبل زین کا تکیہ کا بہت بڑا غلاف اس میں تین چار جوڑے کپڑے کے ایک چادر دو کپڑے احرام کے ایک دو لنگی زائد بس یہ سامان بجائے روئی کے تکیہ کے غلاف کے اندر تھا لیکن اس مرتبہ چونکہ میں بھی ڈیڑھ سال قیام کے ارادہ سے گیا تھا۔ اس لیے ایک بکس بھی میرے ساتھ تھا جس میں سات آٹھ جوڑے۔ لنگیاں، تولیے اور نہ معلوم کیا کیا۔ میرے سفر حجاز کی کاپی میں بالتفصیل لکھا ہوا ہے۔ ایک بستر ہ بہت بڑا سارا ترپال میں بندھا ہوا۔ جس میں لحاف بچھونا، رضائی، کمبل اور اس میں دو تکیے وہی ۳۸ھ جیسے۔

جب یہ طے ہوا کہ یہ ناکارہ حضرت کے ساتھ ایک ہفتہ کے لیے حیدر آباد جائے گا تو ۳۸ھ کے قاعدہ کے موافق ایک تکیہ کا غلاف جس میں دو جوڑے دو لنگیاں ایک سلی ہوئی اور ایک بغیر سلی ہوئی اور ایک مصلیٰ نما گدیلہ ایک رسی میں باندھ کر یہ سامان تو اپنے ساتھ رکھا اور اپنا بستر ہ اور بکس جانے سے کئی دن قبل بذریعہ بلٹی ریل میں بمبئی بھیج دیا۔ جب یہ ناکارہ حیدر آباد پہنچا تو اس خیال سے کہ جہاز میں کیا ضرورت پیش آئے گی۔ اپنا حیدر آباد والا سامان اپنے ساتھ رکھا اور ان دونوں چیزوں کو بہت زیادہ مضبوط سُتلی کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی تھی جہاز کے گودام (نیچے کے حصے) میں ڈلوا دیئے اور جدہ پہنچنے کے بعد حضرت قدس سرہ کے فالتو سامان کے ساتھ اپنا ٹرنک اور بستر ہ بھی حضرت کے سامان میں رکھوا دیا۔ تاجروں کا حال ایسا ہی ہوتا ہے بالخصوص حج کے زمانے کی مشغولی میں، حضرت قدس سرہٗ کا یہ سامان جس میں ٹرنک اور بستر ہ بھی تھا۔ ربیع الاوّل میں مدینہ پاک پہنچا۔ روز ارادہ کرتا تھا کہ ٹرنک کو اور بستر کو کھولوں۔ مگر کاہلی اور مشغولیت اور سب سے اہم یہ ہے کہ حضرت مولانا سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت سے کہ انہوں نے میرے حجرے میں

بہترین گدے اور لحاف پہلے سے بچھا رکھے تھے کمبل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس ناکارہ کو اپنا سامان کھولنے کی نوبت نہ آئی اور جب ذیقعدہ ۴۵ھ میں اس سیہ کار کی واپسی ہوئی تو میں نے حضرت مولانا سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو دونوں چیزیں یہ کہہ کر حوالے کر آیا تھا کہ جب اس سامان کی اب تک ضرورت پیش نہ آئی تو اب اس بوجھ کو لے جا کر کیا کروں گا۔ آپ ان کو ملاحظہ فرمالیں کوئی چیز آپ کو پسند آئے تو میرے لیے موجب عزت، پسند نہ آئے تو جس کو چاہے تقسیم کر دو۔ یہ تو میں نے نہیں پوچھا کہ انہوں نے کیا کوئی چیز خود بھی رکھی یا دوسروں کو دی۔ البتہ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے مدرسین اور طلبہ کو کچھ دے دیا تھا اور یہ ناکارہ اپنا وہی حیدر آباد والا سامان لے کر ذیقعدہ میں واپس آ گیا۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ ۳۸ھ میں جب یہ ناکارہ روانہ ہوا تو چھ سو روپے میرے پاس تھے اور جب سہارنپور واپس پہنچا تو میرے سفر خرچ کی میزان اٹھارہ سو روپے تھی جو مولانا شیر محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے قرضہ سے ملی تھی اور جب ۴۴ھ میں یہاں سے روانہ ہوا تو میرے پاس سفر خرچ اٹھارہ سو روپے تھا۔ لیکن محرم ۴۶ھ میں واپس ہوا تو میری میزان خرچ اڑتالیس سو روپے تھے جس میں کچھ نذرانے بھی تھے اور کچھ حضرت مولانا سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ نے یہاں دہلی وغیرہ کے بعض احباب کے پاس سامان منگانے کے لیے کچھ رقوم دی تھیں۔ یہ پتہ نہیں یہ سارے پیسے کاہے میں خرچ ہوئے۔ جبکہ اس سارے سال میں مجھے اپنے پاس سے ایک دن بھی کھانا نہیں پڑا اس لیے کہ جاتے ہوئے حضرت قدس سرہٗ کا مہمان تھا اور مدینہ کے قیام میں حضرت کے ساتھ ساتھ مولانا سید احمد صاحب کا بھی مہمان تھا اور دونوں کا مہمان ہونا جب معلوم ہوا جب ایک دن مجھے بخار آیا تو میرے لیے مونگ کی کھچڑی میرے کمرے میں حضرت قدس سرہٗ کے دولت کدہ سے الگ آئی اور حضرت مولانا کے مکان سے الگ آئی۔

کھچڑی پر ایک قصہ یاد آ گیا۔ اماں جی اور حاجی مقبول صاحب کو کھچڑی کا بہت شوق تھا۔ سہارنپور کے قیام میں بھی سردی میں حضرت قدس سرہٗ کے مکان پر اکثر پکتی تھی اور جس دن پکتی حضرت حاجی صاحب کی طرف سے آدمی پر آدمی اُوپر کتب خانہ میں جہاں حضرت بذل لکھوانے جایا کرتے تھے کہ گھر بلایا ہے۔ حضرت فرماتے کہ آ رہا ہوں۔ تیسرے چوتھے تقاضہ پر حضرت یہ کہہ کر اُٹھتے کہ کھچڑی پکی ہوگی اسی کی مصیبت آ رہی ہے۔ میں نے کئی دفعہ کہا کہ کھچڑی پکا کر تم کھالیا کرو میرا حرج نہ کیا کرو۔ میں اپنے وقت پر آ کر روٹی کھالوں گا۔ مدینہ پاک میں بھی سردی میں کھچڑی خوب پکی اور جب کھانے پر کھچڑی آتی تو مولانا سید احمد صاحب جلدی سے اُٹھتے اُوپر کی منزل میں تشریف لے جاتے جہاں ان کا زنانہ مکان تھا اور بہت بڑے پیالہ میں گھی گرم کر کے

لاتے اور ایک دم اس کو کھچڑی کی رکابی میں اُلٹ دیتے اور فرماتے کہ اس کا نام گھی چڑی ہے اور گھی اس میں شوربے کی طرح بہہ جاتا۔ حضرت بھی ناراضی کا اظہار فرماتے اور میں بھی ان کے سر ہوتا کہ آپ نے کھانے کے قابل نہیں چھوڑی۔ اُوپر کے حصہ کو تو ہم کھالیتے اور نیچے کا حصہ جس میں گھی کا شوربا بہتا ہوا ہوتا ملا اللہ بندہ، ملا نذیر کہ یہ دونوں خادم بھی اس وقت میں ساتھ تھے ان کے حوالہ کر دیتے۔ کہ اس میں کھچڑی اور ملا کر کھالیں۔ ان کے تو بہت مزے آتے گھی بہتی کھچڑی کھاتے۔ کھچڑی کا نہ مجھے شوق تھا اور نہ حضرت کو تھا۔

بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے کامران میں ایک شب قیام کے بعد ۱۸ ذیقعدہ کو جدہ کو روانگی ہوئی اور تیسرے دن ۲۱ کو جدہ پہنچے۔ دو شب وہاں قیام رہا اور وہاں سے ۲۵ اونٹوں پر مکہ مکرمہ حاضری ہوئی۔ مکہ مکرمہ میں باب ابراہیم کے سامنے ایک گلی تھی اس گلی میں کئی مکانات بہت بوسیدہ تھے۔ اس زمانے تک مکہ مکرمہ اور مدینہ پاک کے سارے ہی مکانات بوسیدہ خستہ حال پرانی وضع کے تھے۔ باب ابراہیم کی اس گلی میں دو تین مکان تھے۔ اس میں سے ایک مکان جو کسی بیوہ کا تھا ۳۸ھ میں بھی یہی مکان کرایہ کے لیے لیا گیا تھا۔ جو حضرت کے معلم سید مصطفیٰ نے پہلے سے لے رکھا تھا اور اس مرتبہ بھی انہوں نے یہی مکان کرایہ پر لیا۔ اس کی دو منزلیں تھیں نیچے کی منزل میں ہم خدام کا قیام تھا اور اوپر کی منزل میں حضرت اور اماں جی رحمہما اللہ تعالیٰ کا۔ ۳۸ھ اور ۴۴ھ کے دونوں سفروں میں ہم خدام نے نہ تو جدہ سے مکہ تک کوئی اونٹ وغیرہ کیا تھا اور نہ مکہ سے منیٰ عرفات کی آمد و رفت کے لیے۔ حضرت قدس سرہٗ اور اماں جی کے اُونٹ کے ہمراہ ہمارا سفر پیدل ہوتا تھا۔ بڑے لطف کا سفر تھا۔ اب تک خوب یاد آتا ہے۔ عرفات کے میدان میں دو چھوٹے چھوٹے خیمے ایک زیادہ چھوٹا جس کو چھولداری کہتے تھے، جس میں اماں جی اور ان کی خادمہ رحمتی کاندھلوی مُلّا نذیر کی بیوی تھیں اور ایک بڑا خیمہ جس میں حضرت قدس سرہٗ اور ہم سب خدام، حضرت قدس سرہٗ کا عرفات کے میدان میں تن تنہا دعاؤں میں حفظ اور دیکھ کر مشغول رہنا خوب یاد ہے اور ہم خدام بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی سفر میں حضرت کی برکت سے خانہ کعبہ کی داخلی بھی نصیب ہوئی کہ شیبی صاحب نے تعلقات کی وجہ سے مخصوص خدام کے لیے کعبہ شریف کو کھولا تھا۔ ۲۶ ذی الحجہ یوم چہارشنبہ بعد عصر ۹ بجے عربی مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کے لیے روانگی ہوئی۔ اہل عرب اکثر غروب کے تین گھنٹے قبل عصر پڑھ لیتے ہیں۔ کیونکہ غروب بارہ پر ہوتا ہے اس سفر کی تفاصیل یہ ناکارہ اکمال الشیم کے مقدمہ میں تفصیل سے لکھ چکا ہے۔

۸ محرم دوشنبہ ۴۵ھ کو مدینہ پاک میں داخل ہوئے اور مدرسہ شرعیہ قدیم میں (اب تو مدرسہ شرعیہ بالکل بدل گیا) اُترے اور اس کے قریب ہی حضرت مولانا سید احمد صاحب نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا، جس کی تین منزلیں تھیں۔ سب سے تحتانی منزل مولانا سید احمد صاحب کی مردانی منزل تھی اور اُوپر کی دو زنانی۔ لیکن حضرت قدس سرہٗ کی تشریف بری کے بعد دوسری منزل کی حضرت کی تالیف کے لیے خالی کر دی اور اپنی مستورات کو اُوپر پہنچا دیا۔ اسی اُوپر کی منزل میں مولانا مرحوم کا ایک بکری خانہ بھی تھا، جس میں بہت سی بکریاں بندھی رہتی تھی۔ حضرت کے وہاں کے قیام کے تفصیلی حالات اکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھوا چکا ہوں، اس کا اعادہ یہاں تکرار محض ہوگا۔ جس کا دل چاہے اس میں دیکھ لے، میرے چچا جان بھی اس سفر میں حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے اور ان کا ارادہ وہاں طویل قیام کا تھا، مگر روضۂ اقدس سے واپسی کا اشارہ ہوا کہ تم سے کام لینا ہے۔ اس کی تفاصیل علی میاں چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں اس نا کارہ کی روایات سے بہت تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

چچا جان قدس سرہٗ اپنا حج فرض ۳۳ھ میں کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے ۴۴ھ کا حج میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی طرف سے کیا اور یہ نا کارہ اپنا حج فرض ۳۸ھ میں کر چکا تھا اس لیے میں نے ۴۴ھ کا حج اپنی والدہ کی طرف سے کیا اور ۴۵ھ کا مدینہ سے واپسی پر اپنے والد صاحب کی طرف سے کیا۔ وہاں کے قیام میں اشراق کی نماز کے بعد سے ہندوستانی ۱۱ بجے تک حضرت قدس سرہٗ نہایت یکسوئی کے ساتھ بذل المجہود کے املاء میں مشغول رہتے۔

حضرت قدس سرہ کی توجہ اور شفقت کا ایک قصہ:

یہ نا کارہ نابکار لغویات میں بچپن سے لے کر اس پیری تک ہمیشہ ہی مبتلا رہا۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ نہایت توجہ سے املاء کرا رہے تھے اور یہ سیہ کار ہاتھوں سے تو لکھ رہا تھا اور دل سے نہ معلوم کس خرافات میں لگ رہا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ نے املاء کراتے کراتے نہایت جوش سے فرمایا:

”من بتو مشغول و تو باعمرو زید“

اب تک بھی وہ منظر یاد ہے اور ہمیشہ ہی یاد رہے گا کہ حضرت کے اس ارشاد پر مجھے ایک دم پسینہ آ گیا اور بہت ہی سوچنے پر بھی اس وقت یاد نہ آیا کہ میں کس خرافات میں لگ رہا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ یہ الفاظ فرما کر پھر املاء کرانے لگے۔ اس ارشاد مبارک کے فرماتے وقت نہ تو کتاب پر سے سر مبارک اُٹھایا۔ فتح الباری سے عبارت لکھواتے رہے۔ عبارت کے درمیان ہی ارشاد فرمایا۔ اللہ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بہت ہی درجے عطاء فرمائے کہ حضرت نے اپنی توجہ شفقت الطاف

میں کبھی کسر نہ فرمائی۔ کاش کہ یہ سیہ کار کسی قابل ہوتا۔

میرے حضرت قدس سرہٗ کا معمول بلا طلب کسی کو اوراد اشغال کچھ بتانے کا نہیں تھا، جس کی تفصیل بھی اکمال کے مقدمہ میں گزر چکی ہے۔ لیکن یہ سیہ کار مدینہ پاک کے اس قیام میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیچھے پیچھے نماز کے لیے حاضر ہو رہا تھا۔ دکّۂ اغوات کے قریب پہنچ کر حضرت کھڑے ہو گئے اور پیچھے منہ کر کے اس سیہ کار کو بلا طلب ارشاد فرمایا کہ پاس انفاس کر لیا کرو۔ مگر افسوس کہ کبھی کچھ نہ کر کے دیا۔

ہندوستان کے قیام میں نو (۹) سال اور کچھ مہینوں میں بذل المجہود کی ساڑھے تین جلدیں لکھی گئیں اور مدینہ پاک میں ۸ ماہ میں ڈیڑھ جلد پوری ہو گئی اور ۲۱ شعبان ۴۵ھ یوم چہارشنبہ بوقت ۹ بجے ہندی بذل المجہود کا اختتام ہوا اور حضرت کو اتنی مسرت اس کی تھی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور ۲۳ شعبان جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد مدرسہ شرعیہ میں حضرت قدس سرہٗ نے بڑی طویل و عریض دعوت علماء مدینہ کی کی۔ جس کے دعوت نامے بھی طبع کرائے۔ وہ تو دعوت نامہ بھی اکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھوا چکا ہوں مدینہ طیبہ کی برکات کا تو کیا پوچھنا۔ یہ ناکارہ اوجز المسالک کی ڈیڑھ جلد کا مسودہ مدینہ پاک کے چند ماہ کے قیام میں لکھ لایا تھا اور ساڑھے چار جلد ہندوستان میں تیس (۳۰) سال میں پوری ہوئیں۔ مدینہ پاک سے ۱۶ ذیقعدہ ۴۵ھ کو روانگی ہوئی۔ ایک عجیب بات اس وقت پیش آئی۔ معلوم نہیں لکھنے کی ہے یا نہیں۔ روضۂ اقدس پر الوداعی سلام کے وقت بے اختیار بے ارادہ زبان سے یہ لفظ بار بار نکل رہا تھا کہ حضور جلدی بلالیں۔

مدینہ پاک سے واپسی اور اونٹوں کا لاری سے بدکنا:

ظہر کے بعد مدینہ پاک سے روانگی ہوئی۔ اس وقت تک کوئی لاری مدینہ پاک نہیں پہنچی تھی۔ میں اور حضرت اقدس رائے پوری دونوں حضرت مولانا سیّد احمد صاحب کی مدد سے اس تحقیقات میں تھے کہ لاری کب آنے والی ہے۔ جس کی خبر کئی مہینے سے سن رہے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ دریافت فرمایا کہ روانگی کی کوئی تاریخ طے ہوئی میرے منہ سے نکل گیا کہ حضرت لاری کا انتظار ہے، اس کے آنے کی خبریں سن رہے ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا، نہیں جی اونٹوں ہی پر جاؤ سنت ہے۔ اس پر اونٹوں کی تیاری ہوئی۔ اُونٹوں پر ظہر کے بعد چل کر گھنٹہ سوا گھنٹہ میں باب العنبر یہ تک پہنچے تو سامنے سے لاری آرہی تھی۔ غریب اونٹوں نے کبھی اس کو دیکھا نہیں تھا۔ لاری والے نے زور سے ہارن بجایا اور دمادم کئی دفعہ بجایا۔ اس پر اونٹ جو بدکے ہیں اور شتر بے مہار کی مثل صادق آئی ہے کہ کوئی ادھر کو بھاگ رہا ہے کوئی

اُدھر کو۔ اُن کو بھاگتے دیکھ کر لاری والے نے ہارن تیز کر دیا۔ جس پر اونٹوں میں اور بھی ہیجان پیدا ہوا۔ سارے شغدف اُونٹوں پر سے خوب گرے۔

حاجی احمد خاں صاحب راج پوری بھی مع اہلیہ کے ہمارے ساتھ تھے اور انہوں نے اپنے شغدف کو اس قدر بچا رکھا تھا کہ تعزیہ بنا رکھا تھا۔ جگہ جگہ اس میں سامان رکھنے کے بانات کی جیبیں لگا رکھی تھیں، وہ اتنا ٹوٹا کہ اس کی لکڑیاں بھی الگ الگ ہو گئیں۔ سارے قافلہ نے باب العنبر یہ کے باہر پڑاؤ ڈالا اور یہ ناکارہ مغرب کے بعد مدرسہ شرعیہ واپس گیا۔ جس وقت یہ ناکارہ مدرسہ شرعیہ کے سامنے باب المجیدی سے آگے بڑھا تو حضرت قدس سرہٗ عشاء کی نماز کے بعد دولت کدے پر واپس جا رہے تھے۔ مولانا سید احمد لالٹین لیے ہوئے حضرت کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔

اس ناکارہ نے مولانا مرحوم کو زور سے آواز دی۔ ''علی رسلک ایها الشیخ السید احمد'' وہ میری آواز پہچان کر ایک دم کھڑے ہوئے اور حضرت قدس سرہٗ بھی کھڑے ہو گئے۔ میں دوڑ کر حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا خیر تو ہے۔ میں نے سارا قصہ سنایا۔ حضرت تو اندر تشریف لے گئے اور یہ ناکارہ اور مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ ساری رات مدرسہ شرعیہ کی چھت کے اُوپر شبِ عید منانے میں مشغول رہے، نہ خود سویا نہ مولانا کو سونے دیا۔ اگلے دن ظہر کے بعد واپسی ہوئی۔

دوسرے دن بہت ہی کوشش کی کہ روضۂ اقدس پر جلد حاضری کی درخواست کروں مگر آورد تھی آمد نہ تھی۔ میرے حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ ساتھ تھے۔ میرے مرشد حضرت سہارنپوری قدس سرہ نے الائمۃ من قریش کہہ کر اس سیہ کار کو امیر اور اس امارت کو جتنا حضرت اقدس رائے پوری نے نبھایا کسی اور نے نہیں نبھایا اور اس سیہ کار نے بھی اپنی حماقت سے اپنی امارت کا بہت ہی زور دکھلایا۔ حضرت رائے پوری کے ساتھ ان کے خدام بھائی خلیل، محمد علی، وغیرہ مستعد جوان تھے۔ وہ حضرت کا شغدف بدوؤں سے نہیں بندھواتے تھے، خود اس قدر مضبوط باندھتے تھے کہ ذرا حرکت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت کے رفقاء میں ایک رئیس بھی تھے۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ میرا شغدف ایسا نہیں باندھا جاتا جیسا حضرت کا ہوتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ ان کو سمجھایا کہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ خدام کو جتنا اہتمام حضرت کا ہوگا اتنا میرا یا آپ کا ہو سکتا ہے؟ اگرچہ وہ احباب حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے اس ناکارہ کا شغدف تو حضرت جیسا ہی باندھتے تھے مگر ان رئیس صاحب کی خاطر میں نے اپنا نام بھی ان کے ساتھ شامل کر لیا۔ دو تین منزل تو وہ خفا ہوتے رہے اور میں سمجھاتا رہا۔

چوتھی منزل پر میں نے شور مچا کر ''اوگف الاول'' کہا جس کا مطلب تھا کہ سب سے اگلے اونٹ کو روک دو کہ قافلہ جب ہی رک سکتا تھا۔ جب پہلا اونٹ رُکے اور بدوؤں کا یہی جملہ معروف تھا۔ جب قافلہ کھڑا ہو گیا، میں نے کہا بحیثیت امیر میں حکم دیتا ہوں کہ حضرت مولانا عبد القادر

صاحب اپنے اونٹ سے اُتر کر فلاں صاحب کے اونٹ پر سوار ہو جائیں اور فلاں صاحب حضرت کے اونٹ پر۔ حضرت فوراً اپنے اونٹ سے اُتر گئے اور فلاں صاحب نے اُترنے سے انکار کیا۔ اس ناکارہ نے قافلہ کو چلنے کا حکم دے دیا اور حضرت اقدس سے عرض کیا کہ آپ پیدل چلیں۔ حضرت قدس سرہٗ تھوڑی دیر پیدل چلتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان رئیس صاحب نے بڑی خوشامد و منت سماجت کی اور عہد کیا کہ آئندہ بالکل شکایت نہیں کروں گا۔ اس پر اس ناکارہ نے قافلہ رکوا کر حضرت کو سوار کرایا۔ اسی سفر کے منتہا پر دولاکھ مرغیوں کا قصہ پیش آیا جو پہلے گزر چکا ہے اور بھی کئی بڑے واقعات اس مبارک سفر میں پیش آئے، کہاں تک لکھوایا جائے۔

بندہ کی قافلہ امارت:

اس کے بعد ناکارہ کے دو سفر حج باوجود تیاری اور ارادہ کے مقدر نہ تھے۔ پہلا حج تو ۶۹ھ میں حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی معیت میں، حضرت قدس سرہٗ کا یہ سفر اس ناکارہ کی معیت ہی کی وجہ سے طے ہوا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ پاکستان کے طویل سفر سے واپس تشریف لائے اور آنے کے بعد فرمایا کہ اس سفر میں تم بہت یاد آئے، اس لیے کہ اس سفر میں ہوائی جہاز میں کثرت سے بیٹھنا ہوا اور جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھتا تو تم خوب یاد آتے کہ یہ سواری تو تمہارے لیے مناسب ہے، مگر میں سوچتا رہا کہ پاکستان آنا تو تمہارا ناممکن اور ہندوستان میں بھی ہوائی جہاز میں بیٹھنے کی کوئی صورت نہیں۔ تم کو ہوائی جہاز سے مکہ لے چلوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ضرور۔ سامانِ سفر مکمل ہو گیا، تیاری پختہ ہو گئی ہے، لیکن اس زمانے میں بمبئی سے ہوائی جہاز حدود مصر کے اُوپر سے گزرتا تھا اور بمبئی اور کراچی میں انفلوئنزا کی وباء عام پھیل گئی اور خوب شہرت ہو گئی۔ عین جہازوں کی روانگی کے وقت حکومتِ مصر نے اعلان کر دیا کہ بمبئی اور کراچی کا کوئی جہاز ہماری حدود کے اوپر سے پرواز نہیں کر سکتا۔ حضرت قدس سرہٗ کے ارادۂ سفر کی وجہ سے رائے پور اور قریب و جوار کے لوگوں نے بھی حج کا ارادہ کر لیا۔ جب ہوائی جہاز کا التواء ہوا تو اس سیہ کار نے معیت سے عذر کر دیا کہ بحری سفر کا میرا دماغ متحمل نہیں ہے۔ پہلے دو سفروں میں بھی دورانِ سر اور امتلاء بہت زیادہ رہ چکا تھا اور اب تو اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ یہ حج تو تمہاری ہی وجہ سے طے ہوا تھا، ملتوی تو میں بھی کر دیتا، مگر میرے التواء سے ان لوگوں کا بھی ملتوی ہو جائے گا جن پر فرض ہے، اس لیے مجھے تو ان کی مجبوری کی وجہ سے جانا پڑے گا۔ قلق تو اس سیہ کار کو بھی بہت رہا اور حضرت قدس سرہٗ کو خوب رہا۔ مگر بحری سفر کا واقعی مجھے تحمل نہیں ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے علی میاں سے بھی اس سفر میں عین وقت پر یعنی شوال میں معیت کی

خواہش فرمائی اور علی میاں نے کچھ مصارف کی حیثیت سے تامل ظاہر کیا۔ میں نے کہا کہ لاحول ولا قوۃ پیسوں کا خیال نہیں کیا کرتے۔ میں نے تو دونوں حج قرض سے ہی کیے ہیں۔ علی میاں نے کہا قرض میرے بس کا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ:

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

میں تو اپنی ایک لڑکی شاکرہ مرحومہ کا حج بدل تجویز کر دیا اور جب ہی قرض لے کے مولانا کو رقم بھی پیش کر دی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ ان کے احسانات بھی اس سیہ کار پر **لاتعد و لا تحصٰی** ہیں۔ مولانا نے حج بدل تو مرحومہ کا کیا ہی لیکن خطوط سے بھی معلوم ہوا اور زبانی بھی کہا کہ حج سے فراغ کے بعد سے مصر روانگی تک مرحومہ کی طرف سے بہت سے عمرے بھی کیے۔ مگر حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں اس مرتبہ حج نہ کرنے کا قلق اب تک ہے۔ میرے حضرت رائے پوری کے احسانات کا نہ شمار نہ احصار، اللہ تعالیٰ اپنی شایانِ شان ان کا بدلہ مرحمت فرمادے۔

جب حضرت اس سفر حج سے واپس لائے تو ارشاد فرمایا کہ سارے سفر میں یہ سوچتا رہا کہ تمہارے واسطے کوئی ایسی چیز لے کر جاؤں جس سے تمہارا واقعی جی خوش ہو۔ مشلح، مصلیٰ اور کئی چیزیں ذہن میں آئیں، مگر میں ہر چیز کے متعلق یہ سوچتا رہا کہ میری خاطر تم اظہارِ مسرت تو بہت کرو گے مگر تمہارا دل خوش نہ ہوگا۔ بہت غور وخوض کے بعد میں نے مسجد نبوی سے عمرے کا احرام تمہاری طرف سے باندھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت خود ہی ارشاد فرمادیں کہ اس احسانِ عظیم کے برابر کوئی دوسرا ہدیہ ہوسکتا ہے؟ عمرہ اور پھر آپ کا اور وہ بھی مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ انشاء اللہ میرے لیے تو یہی ایک چیز کافی ہے۔

حضرت رائے پوری کا ہدیہ عمرہ بندہ کے لیے:

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے اس احسان اور اخلاص ومحبت کی برکت کہ اس کے بعد سے جو احباب کی طرف سے اس سیہ کار کی جانب سے جو عمروں کا سلسلہ بندھا ہے تو بڑھتا ہی چلا گیا۔ بعض سالوں میں تو مکی مدنی اور آفاقی احباب کی طرف سے سو سو عمروں سے زائد کی اطلاعیں ملیں اور اب تو دس بارہ برس سے عمروں کے ساتھ حج بدل کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا اور بعض سنین میں دس دس بارہ بارہ حج بدل کی اطلاعیں ملیں اور ان سب کا ثواب ”**من سن سنته حسنة فللّٰه اجرها واجر من عمل بها**“ حدیث کی بناء پر حضرت اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کو مل رہا ہے اور میرا بھی حضرت کے عمرے کے بعد یہ مستقل معمول بن گیا کہ جانے والے احباب سے خاص یہ

فرمائش کرتا ہوں کہ میرے لیے کوئی ہدیہ، مصلّٰی، رُومال، مشلح وغیرہ ہرگز نہ لائیں۔ بعض بے تکلف دوستوں کے اس قسم کے ہدایا سختی سے ان کو واپس کر دیے۔ میرا ہدیہ مکہ مکرمہ کا طواف وعمرہ ہے اور مدینہ پاک کا روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام ہے۔ میرے نزدیک اصل ہدایا یہی ہیں اور رُومال و مصلّٰی وغیرہ تو لغو اور بے کار ہیں اور اب تو ہماری بدقسمتی سے اس سے بھی معاملہ اوپر ہو گیا ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہدایا گھڑیاں اور ریڈیو وغیرہ بن گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عرفات کے موقع پر آندھی، طوفانی بارش اور حضرت رائے پوری کی کرامت:

والی اللہ المشتکٰی میں اپنے بعض رسائل میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اب بھی لکھواتا ہوں کہ اس ناکارہ کے لیے اُوپر مذکور شدہ اشیاء ہی ہدایا ہیں، یہ لغویات میرے نزدیک ہدایا نہیں ہیں اور ایک رنج دہ واقعہ بھی اس سال کے حج کے متعلق سوچتا رہا کہ لکھواؤں یا نہیں کہ امسال عرفات کے موقع پر اس زور کی آندھی اور طوفانی بارش ہوئی کہ خیمہ بھی اُکھڑ گئے۔ حجاج کو اولے اور بارش کی بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے تقریباً آدھ گھنٹہ قبل حکماً اپنے رفقاء کو لاریوں میں سوار کرا دیا اور ساتھیوں کو تعجب بھی ہوا کہ ابھی سے لاریوں میں بیٹھنے کا حکم کیوں ہے۔ لیکن جب بارش اور اولوں کی بھرمار اور خیموں کا گرنا دیکھا تب حضرت کی کرامت کا حال معلوم ہوا۔ بعد میں سُننے میں آیا کہ اس دن عرفات میں بھی ریڈیو پر گانا ہوتا رہا۔ ایسی حالت میں اگر آفات نہ آئیں تو کیا آئے۔ آسمانی اور ارضی حوادث کا رونا تو ہم ہر وقت روتے ہیں، مگر یہ کبھی نہ سوچا کہ:

"اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست"

رمضان ۹۰ھ میں مشرقی پاکستان کے طوفانوں سے حالات:

اسی رمضان ۹۰ھ میں مشرقی پاکستان میں جو لرزہ خیز طوفان آیا، جس کے سُننے اور نقل کرنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ اس کا جو پس منظر معلوم ہوا تو بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ اللہ کی رحمت اُمت کے حال پر شامل ہے کہ معمولی عذاب پر قناعت فرما لیتے ہیں۔ ورنہ تو ہم لوگ اپنے آپ کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ پاکستان کے خطوط سے اس وقت طوفان کی جو خبریں معلوم ہوئیں، ان کا لکھوانا اور سننا دونوں بہت مشکل ہے۔ بہت سے خطوط میں سے دو مکتوب عزیزم الحاج مولوی احسان الحق جو تبلیغی جماعت کے ساتھ اس طوفان کی خبر پر مشرقی پاکستان گئے اور الحاج صغیر احمد صاحب لاہوری جنہوں نے مشرقی پاکستان سے آنے والوں کے حالات نقل کیے، ان میں سے چند واقعات نقل کرا رہا ہوں۔

۱۲،۱۱ رمضان کی درمیانی شب میں جو کہ شب جمعہ تھی ۱۲ بجے کے قریب نہایت شدت کی آواز اور اس کے ساتھ سمندر کا پانی بانسوں اُوپر اچھل کر اس زور سے آبادیوں پر سے گزرا کہ کچھ انتہا نہیں۔ پہلے ڈیڑھ سو میل کی رفتار سے تیز آندھی، جس میں خوفناک آوازیں بھی تھیں چلی۔ پانی سمندر کا بعض جگہ پچیس تیس فٹ تک ہو گیا تھا۔ پانی اول تو نمکین پھر سخت گرم اُوپر سے بارش، جس کا ہر قطرہ جسم میں سوئی کی طرح چبھتا تھا۔ آتے وقت پانی کی رفتار کم تھی۔ لیکن جاتے وقت اس میں بلا کی طاقت اور زور تھا۔ سب کچھ ہی بہا کر لے گیا۔ انسان کیا بڑے بڑے درخت بھی بہا کر لے گیا۔ لاکھوں انسان کروڑوں جانور ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہو گئے۔ بچنے والوں میں مرد زیادہ ہیں اور عورتیں کم۔ بچے تو معلوم ہوتا ہے سارے ہی ختم ہو گئے۔ رہ جانے والے بھی ہوش وحواس گم کر بیٹھے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کو پانی میں پھینکنا پڑا۔ نفسا نفسی کا قیامت والا منظر تھا۔ البتہ جن گھروں میں تعلیم وتبلیغ ہوتی تھی یا جو اس وقت ذکر و دعاء میں لگ گئے اور اس افراتفری کے عالم میں بھی سحری اور نماز فجر کا خیال رکھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بچادیا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پڑوس کے گھر میں تیرہ فٹ پانی اور اس گھر میں دو تین فٹ پانی۔ ساری مسجدیں پانی میں ڈوب گئیں، لیکن جس میں ساتھی (یعنی رفقاء جماعت تبلیغ) ذکر و دعاء میں مشغول تھے اس کے اندر پانی گیا ہی نہیں۔ غرض کہ ایسی ایسی غیبی نصرتیں ہوئیں کہ ان کی وجہ سے اس طوفان کے بعد ساتھیوں کے ایمان میں اضافہ ہوا جبکہ اوروں کے تو ہوش وحواس گم اور ان کی زبانوں پر کفریہ کلمات تک آ گئے۔ صرف کام کرنے والے ساتھی ہی لاشوں کو دفن کرنے میں لگے۔

حضرت! ساری اُمت مسلمہ ہی کی بداعمالیوں کی وجہ سے یہ طوفان آیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ ان سیلاب زدہ علاقوں میں پہلے جو کلمات، دینی لباس، علماء، ڈاڑھی، روزہ، شعائر اسلام کا استہزاء و تضحیک کے بارے میں زبانوں پر آئے تھے، ان کو نقل کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ اللہ کی شان کہ جس علاقہ میں حفاظتی بند لگایا تھا، اس علاقہ میں اسی بند سے ٹکرا کر پانی اور علاقوں سے زیادہ اونچا ہو گیا اور اسی میں سب سے زیادہ تباہی آئی۔ زیادہ تر وہ علاقے متاثر ہوئے جہاں زانی، شرابی اور اس سے بڑھ کر بھی جو کچھ اور برائی ہو سکتی تھی اس کے مرتکب رہا کرتے تھے۔ اس بستی میں ایک مؤذن صاحب کا گھرانہ نو (۹) افراد پر مشتمل رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے مکان کی چھت (چھپر) پر بیٹھ گئے۔ پانی آیا اس نے چھپر کو اوپر اُٹھایا اور دو درختوں کی ٹہنیوں کے بیچ میں پھنسا دیا۔ اس طرح سے وہ بالکل محفوظ رہے۔ متاثر ہونے والوں کا بیان بھی مختلف معلوم ہوتا ہے کہ حسبِ حال پانی نے معاملہ کیا۔ کہتے ہیں پانی اس قدر سرد تھا کہ اس کی خنکی نے مار ڈالا۔ کچھ کہتے ہیں، پانی اس قدر گرم تھا کہ اس کی گرمی نے مار ڈالا اور کچھ کہتے ہیں کہ پانی میں چکر یا ایسی قوت تھی

کہ اس نے اپنی لپیٹ میں لے کر اُٹھا اُٹھا کر پٹخا وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا حج جس کے نہ کرنے کا قلق ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ۷۴ھ کا حج ہے۔ عزیزم حضرت الحاج مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت سے کہ وہ میری درخواست پر میری سب بچیوں کو حج کو لے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے اور بلند درجات عطاء فرمائے اور اس سفر میں حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا مدنی بھی تشریف لے گئے تھے اور بمبئی سے ایک ہی جہاز سے حضرت قدس سرہٗ اور مولانا محمد یوسف صاحب کا ساتھ ہوا۔ میں نے بھی اس سفر میں جانے کا ارادہ کر رکھا تھا، لیکن بحری کی تو میری ہمت نہ تھی اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا اس سال ہوائی جہاز سے جانا پہلے سے طے شدہ تھا۔ میں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ ہوائی جہاز سے چلا جاؤں گا اور ہوائی جہاز ہی سے واپس آ جاؤں گا۔ حضرت مدنی کے ساتھ حج میں شریک ہو جاؤں گا۔ وقت بھی زائد خرچ نہ ہوگا اور کچھ دقت بھی نہ ہوگی۔ لیکن حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی طبیعت ناساز تھی اور مستورات کے قافلہ کی روانگی کے بعد اور زیادہ خراب ہوگئی۔ بہٹ میں گانگروالی کوٹھی میں قیام تھا۔ اس سیہ کار کا معمول روزانہ سبق پڑھا کر عصر کے بعد بہٹ جا کر علی الصباح واپسی کا تھا اور حضرت کی طبیعت روز افزوں خراب ہوتی چلی گئی۔ میں نے ایک دن حضرت سے عرض کیا کہ مولوی یوسف صاحب کے بعد سے نظام الدین جانے کی ضرورت ہو رہی ہے۔ اجازت ہو تو ایک دو رات کے لیے نظام الدین ہو آؤں۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے پیچھے مر گیا تو میرے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا۔ اس فقرے پر اس سیہ کار نے حجاز کا تو ارادہ ہی ملتوی کر دیا کہ جب دہلی کی اجازت پر یہ جواب ہے تو حجاز کی اجازت سے طبیعت پر بہت ہی اثر ہوگا۔ اس کے کچھ دن بعد حضرت بہٹ سے سہارنپور منتقل ہوئے اور مدرسہ میں قیام ہوا۔ بقرعید کی نماز بھی یہاں مدرسہ ہی میں پڑھی اور جب یہ قافلہ واپس آیا تو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ نے بہت ہی رنج وقلق کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے جہاز میں بیٹھنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمہارا بھی ارادہ تھا۔ اگر جانے سے پہلے معلوم ہو جاتا تو زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے لیتا۔ میں نے پوری بات عرض کر دی کہ طیارہ سے ارادہ تھا۔ مگر حضرت رائے پوری کی شدتِ علالت اور فقرہ کی وجہ سے حاضری نہ ہو سکی۔ قلق مجھے بھی بہت ہے کہ حضرت کے ساتھ حج نصیب ہو جاتا۔

بندہ کا چوتھا حج اور تیسرا سفر حجاز:

۸۴ھ میں ہے۔ یہ بھی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت سے ہے۔

عزیزم مرحوم رجب سے اس پر مصر تھے کہ میں ان کی ہمرکابی میں حج کو جاؤں اور میں اپنے امراض واعذار اور تالیفی مشاغل کی وجہ سے انکار کرتا رہا۔ جتنا میرا انکار ہوتا اس سے زیادہ عزیز موصوف کا اصرار ہوتا۔ شوال میں میرے ایک دہلوی مخلص محسن نے میرے رفیقِ سفر الحاج ابوالحسن صدیقی سے یہ کہا کہ حضرت دہلوی حج کو جارہے ہیں۔ اگر شیخ بھی ان کے ساتھ جائیں تو تمہارا اور ان کا کرایہ میرے ذمے۔ حالانکہ ان کو مولانا یوسف صاحب کے اصرار اور میرے انکار کی خبر بھی نہ تھی۔ مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان سے زیادہ شدید اصرار کرنے والا ابوالحسن پیدا ہوگیا۔ میں نے بھی اس کو من جانب اللہ سمجھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات پیش آئی کہ میرا پکا پاسپورٹ مولانا یوسف صاحب کے مخلص مہمان نے ایک دن میں بنوادیا اور وہ مقدر سے کچھ دنوں کے بعد کھو بھی گیا۔ مگر مولانا یوسف صاحب کے تصرف سے وہ ایسی جگہ سے ملا جہاں کئی مرتبہ تلاش کیا جاچکا تھا۔ لیکن میں اپنے واقعی اعذار کی بنا پر معذرت ہی کرتا رہا۔ عزیزم مرحوم نے یہ کہا کہ میرا پہلا حج اپنے والد صاحب (میرے چچا جان) کے ساتھ ہوا تھا اور دوسرا حج حضرت مدنی کی معیت میں ہوا۔ مجھے ایک سرپرست کی ضرورت ہے میں نے کہا کہ اب تو تم ماشاء اللہ خود سرپرست ہو۔ مرحوم کے دلائل نے تو مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ لیکن جب ایک مرتبہ اس نے بہت ہی خوشامد سے یہ لفظ کہا کہ: ''بھائی جی میرا دل چاہتا ہے کہ آپ تشریف لے چلیں اور ارادہ فرماہی لیں۔'' میں نے کہا کہ اس کا کوئی جواب نہیں۔ میں نے ان محسن صاحب کے کرایہ کو بھی شدت سے انکار کردیا تھا لیکن وہ اصرار ہی کرتے رہے اور ایک مرتبہ سہارنپور کی آمد پر میرے شدید انکار کے باوجود وہ عشاء کے وقت میرے بستر کے نیچے پانچ ہزار کے نوٹ رکھ گئے اور عزیز ابوالحسن کو اطلاع کرگئے کہ وہ بستر کے نیچے رکھے ہیں۔ وہاں سے اُٹھالینا۔ اب تو متعین ہی ہوگیا۔

چنانچہ ۶ ذیقعدہ مطابق ۲۱ مارچ ۶۳ء شنبہ کی صبح کو حاجی عظیم اللہ نصیرالدین کی کار میں جلال آباد تھانہ بھون جھنجھانہ ہوتے ہوئے بعد مغرب نظام الدین دہلی پہنچے اور وہاں سے ۱۰ ذیقعدہ چہار شنبہ کی صبح کو فرنٹیر میل سے بمبئی روانہ ہوئے۔ جمعرات کی صبح کو بمبئی پہنچے اور بہت سے احباب کے شدید اصرار تھے کہ ہمارے یہاں قیام ہو۔ مگر اس کے باوجود مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سیہ کار کی وجہ سے حاجی دوست محمد صاحب کی کالونی میں قیام تجویز کیا کہ وہ ہوائی اڈہ سے قریب اور شہر سے بارہ میل دور ہے تاکہ ہجوم اس سیہ کار کے اوپر زیادہ نہ رہے۔ موصوف بار بار دن رات شہر جاتے تھے اور وہاں سے طعام ونوم کے لیے میری قیام گاہ پر آتے تھے۔ البتہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد عام اجتماع میں جو جامع مسجد بمبئی میں تھا یہ ناکارہ بھی شریک ہوا اور وہاں سے ۱۴ ذیقعدہ اتوار کی صبح کو آٹھ بجے ہوائی جہاز سے چل کر ہندوستانی ڈیڑھ بجے جدہ پہنچے۔ الحاج

ارشد مرحوم ہم لوگوں کو اپنی کار میں لے کر سیدھے اپنے مکان چلے گئے۔ مکی احباب کسٹم میں پھنسے رہے۔ مگر بحمد اللہ کوئی زیادہ دیر اس میں نہ لگی۔ عزیزم ابو الحسن مولوی ہارون حافظ صدیق، مولوی الیاس مرحوم نیرانوی پہلے سے بحری جہاز سے جدہ پہنچ گئے تھے۔ مطار پر ان سے ملاقات ہوئی۔ عزیز سعدی سلمہ سے اس وقت تک میری جان پہچان نہ تھی ماموں یامین سے خوب تھی۔ مگر عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مولانا یوسف صاحب سے لپٹنے کے بعد تخلیہ میں کچھ گفتگو کر کے بظاہر نظام طے کر کے جلدی ہی مکہ چلے گئے۔ بعد عصر چل کر بعد مغرب مکہ مکرمہ میں داخلہ ہوا۔ مغرب مدرسہ صولتیہ میں پڑھی اور اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ جدہ میں بہت سی کاریں جمع ہو گئی تھیں۔ ہر شخص کا اصرار تھا کہ اس سیہ کار کو اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کو اپنی کار میں لے کر جائے۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو بھائی ارشد صاحب کی کار میں ہوں اور یہ ناکارہ اور عزیزانم مولانا انعام الحسن، مولوی ہارون، بھائی شمیم کی کار میں مولانا سلیم صاحب کے ساتھ ہوں۔ عشاء حرم شریف میں پڑھی۔ اس کے بعد کھانا کھایا یہ پہلے بھی کئی دفعہ لکھ چکا ہوں کہ اس ناکارہ کو لنگی میں سونا مجمع میں بہت مشکل ہے۔ اس لیے جب بھی عمرہ کا احرام باندھا، چاہے کتنی ہی دقت ہوا اور تاخیر ہو سر منڈا کر اور پاجامہ پہن کر جب لیٹتا ہوں حج کی تو البتہ مجبوری ہے۔ بہر حال بڑے مجمع کے ساتھ عمرہ کیا۔ مدرسہ صولتیہ کے حضرات نے اپنی کتب حدیث وتفسیر کا اختتام ہم لوگوں کی آمد پر موقوف کر رکھا تھا، پہنچنے سے دو تین روز بعد اختتام کتب کا جلسہ کیا۔ جس میں ہم لوگوں سے کتب حدیث کی ایک ایک کتاب ختم کرائی۔

منیٰ میں راونگی:

مکہ ۸ ذی الحجہ یوم دوشنبہ کو منیٰ روانگی ہوئی۔ عزیز مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم کے سابق مطوف سید سلیمان ہاشم تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اسی سال سے ہمارے مطوف سید مکی مرزوقی تجویز ہوئے۔ جو اس کے بعد سے اب تک ہر حج وعمرے کے رہے۔ بڑے ہی نیک بزرگ، خدمت گار اور فیاض ہیں۔ ان کی دعوتیں بھی بڑی زوردار ہوتی ہیں۔ ۱۳ ذی الحجہ کو منیٰ سے واپسی ہوئی۔

علماء عرب سے ملاقاتیں:

مدرسہ صولتیہ کے دیوان میں جہاں اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہما کا قیام رہتا تھا، بھائی سلیم کی شفقتوں کی وجہ سے وہاں اس ناکارہ کا قیام تجویز ہوا اور اس کے برابر کے دوسرے دیوان میں عزیزم مولانا محمد یوسف صاحب

اور مولانا انعام ہارون وغیرہ تھے۔ اس سیہ کار کا نام او جزو کوکب کی وجہ سے کافی مشہور ہوگیا تھا اور بہت عرصہ کے بعد جانا ہوا تھا اس لیے مکہ مکرمہ، طائف، نجد، جدہ، مدینہ پاک کے علماء و رؤساء بہت ہی کثرت سے ملاقات کی غرض سے آتے تھے اور یہ ناکارہ بد بیماری اپنے دیوان میں روپوش پڑا رہتا تھا اور ان آنے والوں کو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ خوب وصول فرماتے دوڑھائی گھنٹہ ان کے سامنے خوب زوردار تقریر فرماتے اور جب دیکھتے کہ اب سامعین اُکتانے کو ہیں تو میرے پاس چپکے سے آدمی بھیجتے کہ ان کے انتظار کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے میں لے کر آرہا ہوں، میں اجازت دے دیتا اور دس منٹ میں عزیز مرحوم ان سے فرمادیتے کہ آپ کو بھی بڑی دیر ہوگئی۔ حضرت شیخ کی طبیعت بھی ناساز ہے وہ بے چارے سب چلے جاتے اور رات کو کھانے پر عزیز موصوف مجھے خوب جتایا کرتے کہ بھائی جی میں نے ان لوگوں کی وجہ سے آپ کو تکلیف دی، میں ان کی مجبوریوں کی وجہ سے آپ کو لایا ہوں۔ بھائی جی یہ لوگ کبھی میرے پاس بھی نہ آتے آپ کی برکت سے ہی یہ لوگ میری سن رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مختلف عنوانات سے یہ مضمون بار بار دہراتے تھے اور اس میں مجھے انکار نہیں کہ اس سفر کے دوران بہت ہی خواص کا مجمع آتا رہا۔ نام تو اس ناکارہ کا تھا لیکن حقیقت میں برکت اسی مرحوم کی تھی۔ اس لیے کہ یہ ناکارہ تو اس کے بعد ۸۶ھ میں بھی گیا اور پھر ۸۹ھ میں تو تقریباً سال بھر رہا مگر معدودے چند کے علاوہ ۸۳ھ والوں میں سے شاید ایک دو ہی آئے ہوں گے۔

مدرسہ شرعیہ میں قیام:

۲۷ ذی الحجہ ۹ مئی ۶۴ء شنبہ کی صبح کو مکہ مکرمہ سے چل کر ظہر بدر میں پڑھی۔ ملک عبدالحق صاحب کی پک اپ میں روانگی ہوئی، وہ چلانے کے ماشاء اللہ ضرب المثل ماہر ہیں۔ مکی مرزوقی نے اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے مستورہ میں ہماری دعوت کا بہت زوردار انتظام کر رکھا تھا اور مستورہ سے پہلے یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ میری اور مولانا یوسف کی رائے یہ تھی کہ سیدھے چلیں اور ظہر بدر میں پڑھیں اور بقیہ رفقاء کی رائے یہ تھی کہ مکی مرزوقی کی دعوت کی وجہ سے مستورہ میں کھانا کھا کر ظہر پڑھیں اور پھر آرام کریں اور عصر بدر جا کر پڑھیں۔ جب مستورہ قریب آیا میں نے ملک عبدالحق صاحب سے کہا کہ کسی کی نہ سننا تیز چلاؤ۔ ملک صاحب کی گاڑی میں پیچھے سے خوب شور ہوتا رہا اور مکی مرزوقی بھی سڑک پر دونوں ہاتھوں سے روکنے کا اشارہ کرتے رہے۔ میں نے ہاتھ کے اشارہ سے ان کو بھی آگے چلنے کا اشارہ کردیا۔ وہ بیچارے دعوت کا سارا سامان جس میں بیس پچیس مچھلیاں بھی تلی ہوئی تھیں اور قسم قسم کے پھل کیلا تربوز وغیرہ اپنی کار میں لے کر بدر پہنچے

وہاں ظہر کی نماز ہو چکی تھی۔ اس لیے ہم نے اولاً اپنی ظہر کی نماز پڑھی اور پھر کھانا کھا کر گھوہ خانہ کی چار پائیوں پر آرام کیا عصر کے بعد شہداء بدر کے مزارات کی زیارت کی۔ مغرب کی نماز مسجد عریش میں پڑھی وہاں معلوم ہوا کہ یہ مسجد مغرب کے فوراً بعد بند ہو جاتی ہے، عشاء اور فجر میں نہیں کھلتی۔ مگر مغرب کی نماز پڑھتے ہی جو مولانا یوسف صاحب نے پڑھائی تھی عربی اور اردو میں مولانا موصوف کی تقریر کا اعلان ہوا۔ حجاز میں عام طور پر مغرب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد عشاء ہو جاتی ہے یہ سارے حجاز کا مستقل وقت ہے۔ لیکن مولانا مرحوم نے تین گھنٹہ مسلسل تقریر فرمائی اس کے بعد اسی مسجد میں عشاء پڑھی۔ عشاء کے بعد کچھ لوگ مسجد ہی میں سوئے اور کچھ لوگ گھوہ خانہ میں واپس آ کر مکی مرزوقی کی دوپہر کی دعوت کا بقیہ اور کچھ مزید اضافہ بھی مکی مرزوقی نے کر دیا تھا وہ خوب کھایا اور کچھ مسجد عریش والوں کے لیے بھیج دیا۔ میرے حضرت اقدس قدس سرہٗ کو ہمیشہ بدر جانے کی تمنا رہی، مگر اس وقت تک مدینہ سے بدر تک کوئی راستہ نہ تھا۔ اُونٹوں پر پہاڑوں سے گزرتے ہوئے تین دن میں بدر پہنچنا ہوتا تھا اور اب تو اللہ کے فضل سے صرف دو گھنٹہ میں کار پہنچ جاتی ہے۔

۲۸ ذی الحجہ کی صبح کو مدینہ منورہ حاضری ہوئی۔ عزیز گرامی قدر و منزلت مولانا الحاج محمد اسعد سلمہ مدنی ابن حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ جو اس سال کے حج میں شریک تھے اور اس سیہ کار سے پہلے مدینہ پہنچ چکے تھے، انہوں نے مدرسہ شرعیہ کے تحتانی حصہ میں برابر برابر جو دو کمرے ہیں ان میں سے بڑا کمرہ اس سیہ کار کے لیے اور چھوٹا مولانا یوسف صاحب کے لیے تجویز کر رکھا تھا اور دونوں کو سید حبیب صاحب اور ان کے والد ماجد سید محمود صاحب مدفیوضہم کی سعی و برکت سے عروس بنا رکھا تھا اور عزیز مولانا اسعد سلمہ بہت دیر سے ہمارے انتظار میں بھی تھے۔ حالانکہ بدر سے ہم نے ایک آدمی بھیج دیا تھا کہ قیام مدرسہ شرعیہ میں ہی ہو گا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مکہ ہی سے مدینہ منورہ کے بہت سے احباب نے اپنے اپنے مکان مولانا یوسف صاحب کے لیے خالی کر رکھے تھے اور کئی رباط والوں کا بھی اصرار تھا۔ میں نے مولانا یوسف صاحب سے اپنی راحت کی وجہ سے یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے راحت شرعیہ میں ہے اور تمہارے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو کا مجمع ہے تم اپنا قیام کسی بڑے مکان میں تجویز کر لو۔ مگر مرحوم کو واقعی اس سیہ کار سے محبت اور اس سے زیادہ غلط حسنِ ظن کی وجہ سے بہت عقیدت تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ میرا قیام تو آپ ہی کے ساتھ رہے گا اور مجمع ایک جگہ تو نہیں آ سکتا اس کو تو متفرق ہی کرنا پڑے گا۔ چنانچہ کچھ احباب مدرسہ شرعیہ کی دوسری منزل پر اور کچھ متفرق طور پر دوسرے مکانوں میں ٹھہرائے گئے۔ البتہ عزیزم مولانا اسعد سلمہ سے ان کی رائے کے خلاف میں نے یہ کہہ کر مولانا یوسف کے پاس لوگوں کی آمد زیادہ رہے گی اور بڑا کمرہ دروازہ سے اقرب بھی ہے۔ مجھے بڑے حجرے میں دو دقتیں ہوں گی۔ ایک یہ

کہ بیت الخلاء دور ہوگا اور دوسرے یہ کہ ہر آنے والا پہلے میرے حجرے میں جائے گا اس لیے میں نے اور مولانا یوسف صاحب نے حجروں کا تبادلہ کرلیا۔ میں نے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے کہا کہ تم مواجہہ شریف پر حاضر ہوآؤ۔ میں نابکار کسی وقت اقدام عالیہ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ پہلی دفعہ حاضری تو تیرے ہی ساتھ ہوگی عزیزم مولانا الحاج اسعد سلمہ نے بھی اصرار فرمایا کہ میں صبح سے آپ کے انتظار میں حاضر نہیں ہوسکا۔ اس وجہ سے اس روسیاہ کو بھی مواجہہ شریف پر حاضر ہونا پڑا، ورنہ میں اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے یہ چاہتا تھا کہ اقدام عالیہ ہی کی جانب سے صلوٰۃ وسلام کرلوں گا۔ بیس دن قیام کے بعد مولانا یوسف صاحب نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ اس لیے کہ ان کو مکہ مکرمہ اور طائف کے دو اجتماعوں میں شرکت کرنی تھی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ طائف جانا میرے بس کا نہیں۔ آپ تشریف لے جائیں اور مولانا انعام کریم صاحب مجھ پر اصرار کررہے ہیں کہ میں تجھے جدہ سے ہوائی جہاز کی روانگی سے ایک دن قبل جدہ پہنچادوں گا۔ بھائی سید حبیب صاحب نے بھی اس کی پرزور تائید کی۔ مگر مولانا یوسف صاحب نے اس سیہ کار کے ہمراہ چلنے پر اصرار فرمایا اور یہ قرار پایا کہ کچھ دن وہ اپنی روانگی مؤخر کریں اور کچھ میں مقدم کروں۔ اس لیے یکم صفر ۸۴ھ مطابق ۱۳ جون ۶۴ء شنبہ کو مدینہ پاک سے علی الصباح چل کر ظہر جدہ میں پڑھی اور بعد عصر وہاں سے چل کر مغرب مسجد حدیبیہ میں پڑھی اور عشاء کے قریب مکہ مکرمہ حاضری ہوئی اور اپنی عادت کے موافق رات ہی میں عمرہ سے فراغت ہوئی۔

وہاں پہنچنے کے بعد بھائی سلیم، الحاج ماسٹر محمود اور مکہ کے بہت سے حضرات نے شدید اصرار اس پر کیا کہ زکریا طائف ہرگز نہ جائے گا کہ سڑک اس قدر خراب ہے کہ اس کے جھٹکے کا تحمل زکریا سے نہیں ہوسکتا۔ ان سب نے مجھے براہِ راست بھی سختی سے الگ الگ منع کیا اور مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اور بھی شدید اصرار کیا کہ تم کیسا ظلم کررہے ہو کہ اس کو ایسی حالت میں لے جارہے ہو۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں ظہر کے بعد لیٹا ہوا تھا بھائی سلیم صاحب بہت اہتمام سے مستقل اسی بات کے لیے اترے اور بیٹھتے ہی کہا میں نے سنا آپ بھی طائف تشریف لے جارہے ہیں۔ میں نے کہا ضرور تشریف لے جارہے ہیں۔ فرمانے لگے بھائی جی اس کا بالکل ارادہ نہ کریں۔ بہت ہی خراب راستہ ہے خدانخواستہ کوئی تکلیف ہوگئی تو کیا ہوگا اور حرم شریف کی لاکھوں نمازیں جائیں گی۔ مگر جب مجھ سے وہ مایوس ہوگئے تو باہر جاکر عزیز مولانا یوسف کے سر ہوگئے۔ عزیز موصوف بھی میرے پاس آیا ''بھائی جی طائف کو تو سب ہی منع کررہے ہیں۔'' میں نے کہا پیارے اگر تو مجھے مدینہ چھوڑ آتا تو تیرا احسان ہوتا لیکن مکہ میں نہیں رہنے کا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ

میں ہوگی مجھ پر یورش اور تو ہونے کا نہیں۔ یہ ساری بلا مجھ پر رہے گی۔

بندہ کا طائف میں تبلیغی سفر:

۸ صفر مطابق ۲۰ جون شنبہ کی صبح کو طائف کی روانگی ہوئی دو گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ وہاں بڑے اہتمام اجتماع کے ہو رہے تھے۔ ایک اجتماع مسجد عباس میں ہوا۔ دو اجتماع بخاریوں کی دو مسجد میں ہوئے۔ ۱۰ صفر مطابق ۲۲ جون کی صبح کو واپسی ہوئی۔ واپسی پر تو سب سے پہلے عزیز شمیم نے اظہار مسرت مبارکباد دی۔ پھر بھائی سلیم نے کہا کہ بھائی کرامتوں سے لڑنا ہمارے بس کا نہیں اور پھر ہر شخص نے آ کر بہت ہی تعجب وحیرت کا اظہار کیا۔

جدہ میں تبلیغی اجتماع:

معلوم یہ ہوا کہ امیر فیصل صاحب پہلی دفعہ طائف جانے والے تھے اس واسطے ان کی وجہ سے ڈائنا میٹ کے ذریعہ دن رات پہاڑ توڑے گئے اور سڑک اس قدر تازہ بتازہ تارکول کی تھی اور اس پر ریت بچھا ہوا تھا کہ کہیں اونچ نیچ نہیں تھی۔ واپسی میں مکہ مکرمہ اور جدہ میں بھی اجتماعات ہوئے۔ عزیز مولانا یوسف صاحب کی تو ہر گفتگو تقریر تھی جو مسلسل گھنٹوں ہوتی رہتی تھی۔ جہاں وہ بیٹھتے وہیں اجتماع ہو جاتا۔ ۲۳ جون کو بعد عصر مکہ سے چل کر مغرب مسجد حدیبیہ میں پڑھ کر عشاء کے وقت جدہ پہنچے۔ ایک دن وہاں قیام میں بھی بڑا زوردار اجتماع میمنوں کی مسجد میں ہوا۔ انہیں کے محلّہ میں قیام تھا۔

واپسی از جدہ برائے پاکستان اور وہاں کے اسفار کے مختصر حالات:

۲۵ جون کو جدہ سے بذریعہ طیارہ کراچی پہنچے اور ۲۹ جون کو کراچی سے لائل پور، یکم جولائی بروز بدھ کی شام کو وہاں سے سرگودھا۔ چوبیس گھنٹے میں قیام کے بعد ۲ جولائی کو عصر کی نماز کے بعد ڈھڈیاں حاضری ہوئی۔ ۶ جولائی دوشنبہ کی صبح کو وہاں سے چل کر دوپہر کو تلاگنگ پہنچے، وہاں جنرل حق نواز صاحب نے پہلے سے اونچے حکام اور اونچے طبقے کے احباب کو خاص طور سے مدعو کر رکھا تھا۔ کھانے کے بعد ظہر کی نماز پڑھ کر ہم سب تو سونے کے ارادہ سے لیٹ گئے اور مولانا یوسف صاحب عصر تک اس مجمع سے گفتگو میں مشغول رہے۔ اول وقت عصر پڑھ کر مغرب راولپنڈی میں پڑھی، وہاں سے ۱۰ جولائی کی صبح کو لاہور پہنچے۔ شاہی مسجد میں جمعہ کے بعد پہلے سے اجتماع کا اعلان تھا۔ مولانا یوسف صاحب تو عصر تک وہاں رہے اور یہ ناکارہ شروع ہی سے بلال پارک کی مسجد میں جو لاہور کی تبلیغی جماعت کی مرکزی جگہ ہے پہنچ گیا تھا، وہیں جمعہ پڑھا، وہیں شام تک آرام کیا، وہیں مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی فارغ ہو کر پہنچ گئے۔ شنبہ کی صبح کو لاہور کے

عربی مدارس میں بذریعہ کار ایک گشت کیا۔ احباب سے ملاقاتیں ہوئیں شنبہ کی شام کو رائے ونڈ جو سارے مغربی پاکستان کا تبلیغی مرکز ہے پہنچے اور اگلے دن لاہور واپسی ہوئی۔ جناب الحاج الحافظ صوفی عبدالمجید صاحب کا شروع ہی سے اصرار سرائے مغل لے جانے پر تھا اور احباب ویزا نہ ہونے کا عذر کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت ہی کوشش کر کے ویزا حاصل کیا اور منگل کی صبح کو سرائے مغل گئے عصر کے بعد وہاں سے واپسی ہوئی۔ ۱۶ جولائی پنجشنبہ کو سوا دو بجے لاہور سے چل کر ساڑھے تین پر دہلی پالم کے اڈہ پر پہنچے۔

۱۹ جولائی اتوار کی صبح کو دہلی سے چل کر کاندھلہ میں چائے متولی ریاض الاسلام صاحب کے باغ میں پی اور چونکہ عزیز الیاس صاحب مرحوم جو ہم سے پہلے اپنی بیماری کی وجہ سے حافظ صدیق کے ساتھ مدینہ سے روانہ کیا جا چکا تھا اور دہلی پہنچ کر اس کی علالت کی شدت کی خبر سنی تھی، اس لیے عزیز مولانا انعام الحسن صاحب کی تجویز پر وہ اور مولانا یوسف اور یہ ناکارہ، بھائی شمیم مکی اور اطفال شاہد زبیر وغیرہ جو استقبال کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے دو کاروں میں نیرانہ عزیز الیاس کی عیادت کو گئے۔ متولی ریاض نے کھانا بہت تیار کرا رکھا تھا ان کا اصرار تھا کہ ان کے باغ میں کھانا کھائیں۔ میں نے ان کا کھانا ساتھ لیا اور کچھ عزیز الیاس مرحوم نے جلدی جلدی تیار کرایا کھانا نیرانہ میں کھایا اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے مغرب دار الطلبہ جدید کی مسجد میں پڑھی۔ مغرب کے بعد اول مولانا یوسف نے تقریر کی اور پھر عشاء تک مصافحے ہوئے اور مسجد مذکور میں عشاء پڑھ کر گھر پہنچے اور اگلے دن دوشنبہ کی صبح کو گنگوہ اور شام کو واپسی اور منگل کی صبح کو رائے پور جا کر شام کو واپسی اور دوسرے دن ۲۳ جولائی چہار شنبہ کی صبح کو کاندھلہ جا کر ۲۴ جولائی پنجشنبہ کی دوپہر کو زکریا کی واپسی سہارنپور کو ہوئی اور عزیز مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظام الدین کو۔ مجھے خوب یاد ہے الوداعی معانقے کے وقت عزیز مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت روتے ہوئے آنسو پڑ رہے تھے ہچکی لگ رہی تھی فرمایا کہ چار ماہ کی ہر وقت کی رفاقت کے بعد آج جدائی ہو رہی ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اختتام سفر:

اس سفر میں تبلیغی اجتماع اور تمام اطراف و جوانب کے ممالک کے مبلغین کا اجتماع اور جملہ حجاج کی گرویدگی دیکھ کر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یہ اعلان اور قانون بنا کر آئے تھے کہ ہر تیسرے سال حج پر حاضری ہوگی اور شیخ الحدیث بھی ساتھ ہوا کریں گے اور اس ضابطہ کے موافق ۸۵ھ کو جانا گویا طے شدہ تھا۔ لیکن ۲۹ ذیقعدہ ۸۴ھ جمعہ کو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا

لاہور میں حادثۂ انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ سے ۸۵ھ کا حج ملتوی کرنا پڑا کہ نظام الدین کی ضروریات بہت بڑھ گئیں تھیں اور بجائے اس کے ۸۶ھ میں مولانا انعام الحسن صاحب کی زیر قیادت چوتھا سفرِحجاز ہوا۔

یہ میرا پانچواں حج ہے

احباب کا اصرار سفر حج کا:

اس سیہ کار نے اس سال بالکل ارادہ اپنے امراض واعذار کی وجہ سے نہیں کر رکھا تھا۔ لیکن برادرم الحاج مولانا محمد سلیم مکی نے ماہ مبارک میں خواب دیکھا کہ یہ سیہ کار مکہ پہنچا اور جبل ابی قبیس پر قیام کیا۔ انہوں نے خود ہی تعبیر یہ لے لی کہ چونکہ اس سال مولانا انعام الحسن صاحب اور مولوی ہارون آرہے ہیں اور شیخ پر کوئی تقاضہ یہاں سے نہیں گیا۔ انہوں نے عزیزم الحاج محمد شمیم کو رمضان ہی میں جدہ بھیجا اور اس ناکارہ کا ویزا ٹکٹ وغیرہ سب ایک دو دن میں تیار کرا کر نظام الدین بھیج دیے۔ مجھے اس سے گرانی بھی ہوئی کہ بغیر استفسار محض خواب پر یہ بنیاد قائم کر لی ہے۔ میں نے ان کو بھی معذوری کا خط لکھ دیا اور مولانا انعام صاحب کے اصرار پر تو پہلے سے انکار کر رکھا تھا۔ لیکن چونکہ مولانا یوسف صاحب کے بعد مولانا انعام کا یہ پہلا حج تھا۔ اس لیے مولانا موصوف اور پاکی احباب تبلیغ کا اصرار تھا کہ زکریا کو اس سال ضرور ساتھ لائیں۔

اہل بمبئی نے مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کے پاس دہلی تا بمبئی کے دو ٹکٹ ہوائی جہاز کے میرے اور میرے رفیق سفر الحاج ابوالحسن کے بھیج کر تار اور ٹیلیفون سے شدید اصرار کر رکھا تھا کہ زکریا کو ضرور ساتھ لائیں اس لیے کہ اس کا بمبئی آنا بغیر سفر حج کے دشوار ہے۔ میں نے بمبئی کے ٹکٹ کو واپس کرنے کا بہت تقاضہ لکھا تھا۔ مگر مولانا انعام الحسن نے اس کے واپس کرنے سے انکار کر دیا کہ اگر نہ جانا ہوا تو صرف اتنا ہی ہوگا کہ دو ٹکٹ ضائع ہو جائیں گے۔ یہ ناکارہ چونکہ نہ جانا طے کیے ہوئے تھا اس لیے ۷ ذیقعدہ ۸۶ھ مطابق ۱۸ فروری ۶۷ء شنبہ کی صبح کو بذریعہ کار عزیزان مولانا انعام صاحب اور مولوی ہارون کی مشایعت کے لیے دہلی گیا۔ چونکہ صرف دو دن کے لیے گیا تھا اس لیے نہ تو کوئی سامان ساتھ تھا اور نہ کوئی کپڑا وغیرہ ساتھ تھا، نہ یہاں گھر والوں کو اس ناکارہ کے حج کے لیے جانے کی کوئی اطلاع تھی۔ عزیز ابوالحسن بھی میرے ساتھ دہلی تک گیا تھا۔ وہاں پہنچنے پر اتوار، پیر دو دن سب ہی کے اصرار میرے سفر حجاز پر ہوتے رہے اور میں بھی بار بار استخارہ کرتا رہا۔ مولانا ابوالحسن علی میاں بھی وہاں موجود تھے۔ ان کا بھی شدید اصرار ہوا، مجھے

اطمینان تھا کہ میرا پاسپورٹ بھی گم ہے، لیکن وہاں کے احباب نے ڈاکٹر سید محمود ایم پی کی وساطت سے میرے پاسپورٹ کی گمشدگی کی درخواست اور اس کی جگہ نیا پاسپورٹ بھی ایک ہی دن میں حاصل کر لیا، اس کو بھی تائید غیبی اور طلب سمجھا۔ اس لیے منگل ۱۰ ذیقعدہ کو عین ان حضرات کی روانگی کے وقت میں نے جانے کا ارادہ کر ہی لیا اور کار میں ہوائی اڈے کے لیے بیٹھ گیا اور اڈہ پر میرے محترم عزیز مولانا الحاج سید اسعد مدنی اور جناب الحاج عبدالرشید صاحب خورجوی ایس پی صاحب اپنی کار لے کر پہنچ گئے۔ اس لیے کہ عزیز موصوف کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کو علی الصباح دہلی پہنچ کر میرا بارادہ حج روانہ ہونا معلوم ہوا تو وہ اسی وقت ہوائی اڈے پہنچ گئے اور وہاں عزیز موصوف نے ایس پی صاحب کی وساطت سے اس کی بھی اجازت حاصل کر لی اسی کار میں جہاز پر سوار کرائیں گے۔

چونکہ اس سیہ کار کا یہ سفر بلا ارادہ ہوا اور میرے گھر والوں کو بھی میری روانگی کا حال رات کو ان لوگوں سے معلوم ہوا جو رات کو دہلی تک پہنچا کر واپس آئے تھے۔ اس لیے عزیزم الحاج ابوالحسن سلمہ بھی ساتھ نہ جا سکا۔ دوسرے دن اس نے پاسپورٹ ویزا وغیرہ کی سعی کی اور سفیر سعودی عرب مقیم دہلی کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے انہوں نے یہ کہ ابوالحسن زکریا کا خادم ہے، ساتھ جانے سے رہ گیا۔ فوراً ویزا دے دیا۔ وہ رات کو سہارنپور آیا اور اپنے یہاں سے اپنا سامانِ مختصر سا ساتھ لے کر دوسرے دن بذریعہ ریل بمبئی چلا گیا اور چونکہ ہمارا ہوائی جہاز روانہ ہو چکا تھا اور اس کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی نہ تھا اس لیے وہ بحرین کے راستے سے بھائی جمیل حیدرآبادی رفقاء کے ساتھ بعد میں مکہ مکرمہ پہنچا۔

بمبئی میں مولانا وصی اللہ صاحب کے مستقر پر ان کی زیارت کے لیے حاضری:

ہمارا طیارہ دہلی سے ۲۱ فروری کو ۹½ بجے چل کر ۱۱½ بمبئی پہنچا۔ اُترتے ہی اوّل حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کے مستقر پر ان کی زیارت کے لیے سب گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مولانا آج ہی صبح اس جگہ سے کسی دوسری جگہ ناراض ہو کر منتقل ہو گئے جس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ الیکشن کا زمانہ تھا۔ کسی صاحب نے اخبار میں چھاپ دیا کہ مولانا فلاں صاحب کے حامی ہیں۔ فریق مخالف نے اس کی پرزور تردید کی۔ مولانا مرحوم کو اس پر غصہ آیا کہ غلط طور پر ان کے نام کو الیکشن والے استعمال کر رہے ہیں اس لیے مولانا کے سابقہ مستقر سے دوسرے مستقر پر حاضر ہوئے۔ مولانا مرحوم بہت ہی شفقت اور محبت سے ملے اور باصرار سو روپے ہدیہ سنیہ کے طور پر مرحمت فرمائے۔ ۲۳ فروری جمعرات کی صبح کو ۷ بجے بمبئی سے طیارہ روانہ ہوا۔ کراچی پچاس منٹ اور ظہران آدھ گھنٹہ اور ریاض

پچاس منٹ ٹھہرتے ہوئے ظہر کے بعد عربی ۷ بجے کے قریب جدہ پہنچے۔
قدوائی صاحب سفیر ہند متعین جدہ کو عزیزم بھائی شمیم کے ذریعہ سے زکریا کی آمد کا حال معلوم ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی کار لے کر مطار پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ ان کی وجہ سے اس سفر میں بہت سی راحتیں پہنچیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل وکرم سے راحت وآرام سے رکھے۔ مطار سے ہم سب کو اپنی کار میں بٹھا کر کسٹم کے سامنے روکا۔ یہ ناکارہ کار میں بیٹھا رہا عزیز انم مولانا انعام، ہارون کسٹم میں گئے۔ مگر سفیر صاحب کی وجہ سے ان کو بھی زیادہ دیر نہیں لگی۔ چند منٹ میں فارغ ہو کر آ گئے اور سفیر صاحب کے مکان پر جا کر بعد ظہر کھانا کھایا۔ اس کے بعد عصر حدیبیہ میں پڑھتے ہوئے مغرب کے وقت مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔

روانگی مدینہ طیبہ اور عبدالعزیز ساعاتی کے مکان پر قیام:

رات کو عمرے سے فراغت کے بعد حسبِ سابق شنبہ کے روز صبح کو مدرسہ صولتیہ کی کتب حدیث وتفسیر کا اختتام کرایا۔ ۲۱ ذی الحجہ کو مغرب سے پہلے مکہ سے چل کر مغرب حدیبیہ میں پڑھی، عشاء کی اذان کے قریب جدہ پہنچے اور مسجد بن لادن جو آج کل تبلیغی مرکز ہے اس کے قریب حافظ محمد رمضان صاحب کے مکان میں قیام ہوا۔ پہلے دن مسجد حنفی میں اجتماع ہوا اور دوسرے دن مسجد پٹنی میں بعد مغرب اجتماع ہوا اور یہ مسجد عرصہ سے تبلیغی مرکز تھا۔ ۲۳ ذی الحجہ پیر کے روز شام کو اسی مسجد میں عربوں کا بڑا اجتماع ہوا۔ منگل کے روز اشراق کے وقت مدینہ طیبہ کے لیے روانگی طے تھی۔ مگر ملک عبدالحق صاحب کی گاڑی خراب ہوگئی۔ ایک گھنٹہ انتظار کے بعد دو کاریں فی کار نوے ریال کرایہ کر کے عربی ۳ بجے مدینہ پاک کو روانگی ہوئی۔ ظہر کے وقت بدر پہنچے اور شب کو قیام کے بعد بدھ کی صبح کو عربی ½۱۲ بجے چل کر ۳ بجے مدینہ پاک حاضری ہوئی۔
جدہ سے مدینہ ۴۲۴ کلومیٹر ہے اور بدر سے ۱۴۹ کلومیٹر ہے اور چونکہ مدینہ پاک میں اس سیہ کار کی اطلاع پہلے سے نہیں تھی اور مدرسہ شرعیہ حجاج سے پُر ہوگیا تھا۔ اس لیے مکہ ہی سے عبدالعزیز ساعاتی کے مکان میں قیام طے ہوگیا تھا۔ جو انہوں نے ہم لوگوں کی وجہ سے کرایہ پر نہیں دیا تھا اور بہت بڑا نقصان گوارا کیا تھا۔ یہ مکان صوفی اقبال کی رباط کے بالکل قریب تھا۔ اس لیے ناکارہ کا قیام تو صوفی اقبال صاحب کے مکان میں اور دوسرے حضرات کا جو دو سو کے قریب تھے، الحاج عبدالعزیز ساعاتی کے مکان میں قیام ہوا۔ وہاں پہنچنے کے بعد الحاج سید محمود صاحب کا اور ان سے بڑھ کر مولانا انعام کریم صاحب کا اصرار ہوا کہ مدرسہ شرعیہ خالی ہوگیا۔ وہاں منتقل ہو جائیں۔ مگر ان سے وعدہ ہو چکا تھا۔ اس لیے بڑی ندامت کے ساتھ سید صاحب سے معذرت کر دی جس کا

قلق ہے۔ سید صاحب کے یہاں پہلے سفر میں بھی زوردار دعوتیں ہوئیں۔ پہلے سفر میں بڑے اہتمام سے سید صاحب نے ایک عصرانہ اپنے باغ میں دیا تھا۔ اس مرتبہ بھی اصرار فرمایا مگر معذرت کرنی پڑی کہ مسجد نبوی کی نماز زیادہ اہم ہے۔

۲۲ اپریل ۶۷ء ہندی ۱۱ المحرم ۸۷ھ شنبہ کی صبح کی نماز کے بعد مدینہ پاک سے ملک عبدالحق کی گاڑی میں روانگی ہوئی۔ مگر وہ شروع ہی سے خراب تھی رابغ پہنچ کر اس نے بالکل جواب دے دیا۔ براہِ راست مکہ کی گاڑی کی تلاش میں رہے، نہ ملنے پر مجبوراً مغرب سے ایک گھنٹہ قبل جدہ کی کار کرایہ پر لی۔ مغرب کی نماز راستہ میں پڑھی اور بعد مغرب جدہ پہنچے اور وہاں سے مکہ کے لیے کار کرایہ کر کے وہاں سے چلے اور عشاء کے ایک گھنٹہ بعد مکہ مکرمہ میں حاضری ہوئی۔ رات ہی کو عمرہ ادا کیا۔

یہ عمرہ حضرت مرشدی سہارنپوری قدس سرہٗ کی طرف سے کیا تھا اور اس سے پہلا تمتع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کیا تھا۔ ۲۶ اپریل چہارشنبہ کی صبح کو ملک عبدالحق کی گاڑی میں مکہ سے چل کر جدہ پہنچے۔ چونکہ قدوائی صاحب کا شدید اصرار پہلے سے تھا۔ مکہ میں بھی کئی مرتبہ انہوں نے اصرار فرمایا کہ ہندوستان جاتے ہوئے قیام میرے یہاں ہوگا۔ اس لیے سیدھے ان کے مکان پر گئے کہ ان کو پہلے سے اطلاع تھی۔ مگر وہ کسی ہوائی جہاز کی روانگی کے سلسلہ میں مطار گئے ہوئے تھے۔ ان کے مکان پر جا کر سب سو گئے۔ وہ عربی ۶ بجے کے قریب واپس آئے۔ زکریا سو رہا تھا اور مولوی انعام صاحب جاگ رہے تھے۔ عربی ۷ بجے اُٹھنے پر نماز پڑھی اور کھانا کھایا اور مسجد بن لادن مرکز تبلیغ کے قریب حافظ رمضان کے مکان پر پہنچے۔ جہاں ہم سب رفقاء کا سامان صبح سے جمع ہو رہا تھا۔ وہاں سے قبیل مغرب مطار کی مسجد میں پہنچے۔ قدوائی صاحب کا اصرار تھا کہ میں قیام گاہ ہی پر آرام کروں۔ وہ جہاز کی پرواز سے پانچ منٹ پہلے مجھے وہاں سے سوار کرا کے سیدھے ہوائی جہاز پر پہنچا دیں گے۔ مگر زکریا نے قبول نہیں کیا۔ جملہ رفقاء مع اصحاب صولتیہ مغرب سے قبل مطار کی مسجد میں پہنچ گئے۔ البتہ وہاں سے اور سب رفقاء تو مختصر سنتیں پڑھ کر طیارہ پر پہنچ گئے۔ قدوائی صاحب نے زکریا کو شدت سے منع کر دیا کہ سب کے ساتھ جانے میں بہت دقت ہوگی۔ بڑی دیر لگے گی۔ میں جہاز کی پرواز سے دو تین منٹ پہلے سیدھے یہاں سے سوار کرا کے بالا بالا جہاز پر پہنچا دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ مجھے مسجد سے بٹھا کر ایک منٹ میں ہوائی جہاز کی سیڑھی پر پہنچا دیا۔

واپسی از حجاز پاک براہ پاکستان:

مولانا انعام الحسن صاحب عزیز ہارون ابوالحسن بھی اسی کار میں تھے اور عربی ڈیڑھ بجے یعنی مغرب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد طیارہ نے پرواز کی اور پاکستانی وقت کے مطابق ایک بجے شب کے کراچی کے مطار پر پہنچے۔ اسی وقت حاجی فریدالدین صاحب کی برکت سے کہ وہ کراچی کے ہوائی اڈہ کی بہت اُونچی شخصیت ہیں۔ ان کی برکت سے زکریا اور ابوالحسن بھائی یوسف رنگ والوں کی کار میں مکی مسجد پہنچ گئے۔ بقیہ حضرات دوسری کاروں میں تقریباً ایک گھنٹہ بعد پہنچے۔ زکریا تو پہنچ کر اپنی جماعت کر کے کھانے کو انکار کر کے سو گیا۔ بقیہ نے آ کر نماز پڑھ کر کھانا کھایا۔ جمعرات کا سارا دن ہجوم میں گزرا۔ جمعہ کی صبح کو مفتی شفیع کے مدرسہ میں جا کر ایک گھنٹہ قیام کے بعد مکی مسجد واپس آئے۔ پہلے سے طیارہ کی اطلاع ۱۱½ پر پرواز کی تھی۔ مکی مسجد پہنچ کر اول ۱۱ بجے کی پھر ۱۰½ بجے کی اطلاع ملی، کیونکہ بارش کا سلسلہ خوب تھا جو کراچی میں صبح سے اور دہلی میں دو روز پہلے سے چل رہا تھا اس لیے عام خیال تھا کہ طیارہ ۱۱½ بجے سے بھی زیادہ مؤخر ہوگا اس لیے سب مطمئن تھے۔

مطار سے ٹیلیفون پر معلوم ہوا کہ ۱۰½ بجے جا رہا ہے تو نہایت عجلت میں مطار پر پہنچے۔ زکریا کے متعلق پہلے یہ طے تھا کہ حاجی فریدالدین صاحب عین وقت پر طیارہ پر پہنچا دیں گے۔ مگر طیارہ کی تقدیم کی وجہ سے جنرل صاحب کی کار میں مطار پر پہنچے اور مطار والوں کی کرسی پر ان کے عملہ کی مدد سے طیارہ پر پہنچے۔ زکریا کی کرسی کی وجہ سے طیارہ میں دس منٹ کی تاخیر بھی ہوئی کہ مطار سے سارے بڑے چھوٹے شہرت سن کر جمع ہو گئے۔ پاکستانی دس بج کر چالیس منٹ پر طیارہ نے پرواز کی اور وقت مقررہ سے ۲۰ منٹ پہلے کراچی کے وقت سے ۱۲ بج کر دس منٹ پر اور دہلی کے وقت سے بارہ بج کر چالیس منٹ پر پالم کے اڈہ پر پہنچ گئے۔ زکریا مع اطفال وابوالحسن، حاجی نصیرالدین علی گڑھ کی کار میں ایک بجے نظام الدین مسجد پہنچے۔ مگر ڈرائیور ناواقف تھا۔ اس لیے راستہ میں دیر لگی اور مولانا انعام الحسن صاحب مطار پر دعاء کرا کر زکریا کے ساتھ ہی مسجد میں پہنچے۔ بقیہ رفقاء آہستہ آہستہ ۲ بجے تک پہنچتے رہے۔

واپسی در سہارنپور:

نظام الدین کے احباب نے دو دن پہلے سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جمعہ بجائے ڈیڑھ بجے کے ڈھائی بجے ہوگا۔ اس لیے سب نماز میں شریک ہو گئے اور طے ہوا کہ اتوار کی صبح کو حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر حاضری دیتے عصر سہارنپور دارالطلبہ جدید کی مسجد میں پڑھی جائے، لیکن دونوں مزاروں پر حاضری دیتے ہوئے ۱۱½ بجے سہارنپور پہنچ

گئے۔اس لیے کہ ہجوم کے ڈر سے نظام الدین سے اپنی جماعت علیحدہ کر کے چپکے سے روانہ ہو گئے تھے۔ ½۱۱ بجے دارالطلبہ قدیم میں ناظم صاحب سے ملاقات کے بعد مدرسہ قدیم میں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد مکان آئے اور چونکہ عام اطلاع عصر کے وقت دارالطلبہ جدید کی تھی، اس لیے مخصوص لوگوں سے ملاقات تو ظہر کے بعد ہوتی رہی، لیکن عمومی ملاقات اور مصافحہ دارالطلبہ جدید میں عصر کے بعد سے مغرب تک ہوئے۔ لیکن مغرب کے بعد بھی جدید ہجوم آیا۔ اس لیے مغرب کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک ہوئے۔

پیر کی صبح کو علی گڑھ کی کار میں اول گنگوہ اور وہاں سے واپسی پر ابوالحسن کے اصرار پر اسلامیہ اسکول میں پرنسپل وغیرہ سے مصافحہ کرتے ہوئے سوا گیارہ پر گھر پہنچے، پہلے سے پیر کے دن گنگوہ سے واپسی پر رائے پور کا وعدہ فرمایا تھا مگر کچھ کاروں کی گڑبڑ کی وجہ سے رائے پور کاندھلہ دونوں ملتوی ہوئے اور شام کو ۴ بجے مولانا انعام الحسن صاحب سیدھے دہلی چلے گئے۔ کاندھلہ کے جملہ رجال تو نظام الدین پہنچ گئے تھے اور مستورات ساری سہارنپور آ گئیں۔ اس لیے پیر کی شب زکریا نے بخاری شریف کا سبق شروع کرا دیا۔ جس کی افتتاح ۲۷ شوال چہارشنبہ کو جانے سے پہلے ہو چکی تھی۔

اس کے بعد مجوزہ قانون کے موافق ۸۸ھ کا حج طے تھا۔ اس سیہ کار کا افریقہ کے احباب کے پاس سے ٹکٹ آ گیا جو مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ کے ساتھ آیا تھا۔ معطی صاحب کا نام تو مجھے معلوم نہیں، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے۔ اس مرتبہ بھی اس سیہ کار کی طرف سے تو اپنے امراض کی وجہ سے تکاسل ہی تھا اور چونکہ امراض کی کثرت کی وجہ سے بخاری شریف کا سبق بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے زکریا کا اصرار تھا کہ اگر جائیں تو ایک دو سال قیام کریں جلد واپس نہ آئیں اور میرا یہ مقولہ بہت ہی مشہور ہو گیا کہ "اگر جاؤں تو آؤں کیوں اور آؤں تو جاؤں کیوں"۔ اس لیے کہ اپنی ناکارگی، گندگیوں کی وجہ سے وہاں کے قیام کی اہلیت نہیں اور امراض واعذار کی وجہ سے تدریس و تالیف کا موقع نہیں رہا اور مولانا انعام الحسن صاحب بھی اس خوف سے کہ واپس آنے میں پاؤں نہ ملے، لے جانے میں متأمل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ نظام الدین کے مسائل بھی پیش آئے کہ جن کی وجہ سے وہاں کے احباب مولانا انعام الحسن صاحب کی غیبت میں اس ناکارہ کا قیام سہارنپور اور وقتاً فوقتاً نظام الدین جاتے رہنا ضروری سمجھتے تھے۔ علی میاں بھی ان کے بہت زور کے حامی تھے اور میرے جانے کے مخالف۔ لیکن چونکہ مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ کا جانا طے ہو چکا تھا، اس لیے وہ زکریا سے الوداعی ملاقات کے لیے ۲۳ شوال کو سہارنپور آئے۔ دارالطلبہ جدید کی دارالحدیث جناب الحاج حکیم محمد ایوب صاحب نے اپنے اہتمام سے بہت ہی ذوق وشوق سے بنوائی تھی۔

ان کا اصرار تھا کہ زکریا اس کا افتتاح کرے۔ اس لیے ۲۵ شوال چہار شنبہ کی صبح کو مولوی یونس صاحب سے اول الحدیث المسلسل بالاولیۃ پڑھوائی۔ پھر زکریا نے بخاری شریف کی پہلی حدیث حفظ پڑھی۔ کیونکہ آنکھوں میں نزول آب تھا اور پڑھ کر یہ کہا کہ بھائی تقریر تو اس کی بہت لمبی چوڑی ہے۔ وہ تو مولانا یونس صاحب کریں گے، تبرکاً بسم اللہ میں نے کرادی ہے۔

اس کے بعد مولانا انعام الحسن صاحب نے عزیزان زبیر، شاہد کا نکاح ہر ایک کی بہن سے مہر فاطمی پر پڑھایا اور آدھے گھنٹہ تک خوب دعائیں کرائیں اور نکاح میں بجائے چھوہاروں کے پنڈ کھجوریں تقسیم ہوئیں۔ ظہر کے بعد عزیزان مولانا انعام الحسن و ہارون اپنی گاڑی میں دہلی چلے گئے۔ ۱۳ ذیقعدہ ۸۸ھ مطابق یکم فروری ۶۹ء شنبہ کے دن عزیزان مولانا انعام الحسن و ہارون کے جہاز کی روانگی ۹ بجے طے تھی۔ اس لیے ۸ بجے مطار پر پہنچ گئے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بمبئی جانے والا جہاز ابھی کلکتہ کھڑا ہے۔ وہاں سے آکر پھر بمبئی جائے گا۔ اس واسطے مولانا محمد عمر صاحب نے مطار پر ایک لمبی تقریر شروع کردی۔ جس میں مطار کا عملہ بھی شریک رہا۔ ان کی تقریر پر نقد ایک جماعت مشایعت کرنے والوں میں سے بمبئی پیدل جانے کے لیے تیار ہوگئی جو وہیں سے روانہ ہوئی۔ ½۱۲ پر جہاز آیا اور ۱۲ بج کر ۵۵ منٹ پر پرواز کی اور ۳ بجے بخیریت بمبئی پہنچ گئے۔

عزیزان مطار سے اُتر کر حاجی دوست محمد صاحب کے یہاں گئے اور دوسرے دن شہر میں منتقل ہوگئے۔ بہت زور شور کے اجتماعات جامع مسجد وغیرہ میں ہوتے رہے۔ ان اجتماعات کی نظیر پہلے سفروں میں نہیں ہوئی۔ منگل کی دوپہر کو ½۱۱ بجے چل کر کراچی پہنچے۔ ڈیڑھ گھنٹہ وہاں قیام رہا۔ ظہر پڑھ کر روانہ ہوئے، عصر ریاض میں پڑھی اور مغرب جدہ کے ہوائی اڈہ پر اور سفیر ہند قدوائی صاحب کے ہاں چائے پی۔ وہ بار بار زکریا کے نہ جانے پر اظہار افسوس کرتے رہے اور یہ کہ دل بجھ گیا اور ہمشیرہ سعدی کے یہاں کھانا کھا کر عشاء حدیبیہ میں پڑھ کر سعدی کے گھر ۵ بجے عربی پہنچے۔ اس نے پہلے سے بہت زور باندھ رکھے تھے اور دسترخوان چنا ہوا تھا کہ بھائی سلیم کا ڈانٹ کا ٹیلیفون پہنچا کہ یہاں کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے، لیے بیٹھے ہیں، تم کہاں لیے پھر رہے ہو۔ سعدی تو اللہ اس کو بہت بلند عطاء فرمائے لقمہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ بقیہ سب نے دو دو چار چار لقمے کھائے۔ پھر جا کر سلیم کے یہاں کھانا کھایا۔ لیکن بھائی سلیم صاحب بالکل ساکت رہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ تیرے نہ آنے کی وجہ سے ان کو قلق تھا۔ اگلے دن سے اپنے مشاغل اجتماعات میں مشغول ہوگئے۔ ترکوں، افریقیوں وغیرہ ہر ملک کے الگ الگ اجتماعات ہوئے۔ حج سے فراغ پر ۱۳ مارچ مطابق ۲۳ ذی الحجہ کو مدینہ کے لیے روانہ ہوئے شب کو بدر میں قیام کے بعد صبح جمعہ کو مدینہ پاک پہنچے۔

حجاز پاک میں سیلاب کی تفصیلات:

اس سال مکہ مکرمہ میں انتہائی طوفانی بارش ۳ ذیقعدہ مطابق ۲۲ جنوری چہارشنبہ کی صبح کو ہوئی مکہ مکرمہ پر نہایت ابر مسلط تھا۔ ظہر سے دو گھنٹہ قبل اس زور کی بارش شروع ہوئی کہ راستے سب بند ہوگئے۔ موٹریں سیلاب میں پتوں کی طرح بہہ گئیں۔ کاریں اوپر تلے دھنس گئیں۔ حرم شریف میں باب کعبہ سے دو بالشت اوپر پانی پہنچ گیا اور حرم شریف کی مٹی اور کنکریوں کی وجہ سے پانی کے سب مخرج بند ہوگئے۔ سابق مقام ابراہیم کا صرف چاند نظر آرہا تھا۔ زمزم شریف کا کنواں بالکل اٹ گیا۔ بہت سی لاشیں اس میں گریں۔ زمزمیوں کے جو خلوے حرم جدید کے نیچے تھے لوگوں نے اس کے اندر کے دروازے بند کرر کھے تھے وہ سب انتقال کر گئے تاریخ میں پہلی مرتبہ حرم شریف میں ظہر کی نہ عمومی نماز ہوئی نہ اذان۔ مغرب تک پانی بھر گیا اور مکبرہ پر جو چند آدمی محبوس تھے انہوں نے ہی وہاں اذان کہی اور وہیں نماز پڑھی۔

معلوم ہوا کہ جدہ میں اس سے دگنی بارش رہی۔ مکہ سے آمدہ خطوط بالخصوص عزیز سعدی کے بہت ہی تفصیلات سے اور دردانگیز واقعات سے لبریز آتے رہے۔ معلوم نہیں ان خطوط کے پڑھنے سے علی میاں پر کیا اثر ہوا کہ انہوں نے اس سیہ کار پر جلد مکہ جانے پر تقاضا کیا اور بہت بلبلا کر اس پر اصرار کیا کہ دعاء کرو میرے چلنے کی بھی کوئی صورت پیدا ہوجائے۔ اللہ کے یہاں اضطراری دعاء تو فوراً قبول ہوتی ہے۔ بلا وہم وگمان جامعہ مدینہ پاک کا ایک اجتماع حکومت نے طے کیا۔ جس میں علی میاں کو خاص طور سے مدعو کرنے کے احکام جاری کیے گئے اور ان کے اور ان کے رفیق کے ٹکٹ بھی آگئے اور زکریا پر ساتھ چلنے کا شدید اصرار کیا۔ زکریا نے دو شرطوں سے قبول کیا۔ اول یہ کہ اتنے حضرات نظام الدین واپس نہ آئیں اتنے نہیں جانا۔ دوسرے یہ کہ جس جہاز سے آپ تشریف لے جائیں گے اس میں نہیں جاؤں گا۔ اس لیے کہ وہاں آپ کا زوردار استقبال ہوگا اور آپ ہر ایک سے اس سیاہ کار کا تعارف کرائیں گے۔

واپسی مولانا انعام الحسن صاحب از حجاز:

علی میاں نے پہلی شرط قبول کر لی اور دوسری شرط کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں آپ کا تعارف کسی سے نہیں کراؤں گا۔ عزیزان کی مدینہ واپسی ۱۵ اپریل مطابق ۷ محرم ۸۹ھ ہندی شنبہ کے دن ہو کر دو تین مکہ اور دو دن جدہ قیام کے بعد ۱۱ اپریل کو جدہ سے سعودی جہاز میں جو صرف کراچی تک آتا ہے روانہ ہوئے اور وہاں سے ۱۴ اپریل کو جرمنی جہاز سے ۲ بجے دہلی پہنچے۔ چونکہ زکریا کا مجوزہ سفر ۲۶ اپریل کا ان کی واپسی کی خبر پر طے ہوگیا تھا۔ اس لیے سہارنپور کی جملہ مستورات کو ایک مستقل

لاری دوسو روپے میں نظام الدین تک کرایہ کرکے اس سے یہ بھی شرط کر لی تھی کہ کاندھلہ کی مستورات کومتولی ریاض کے باغ سے بٹھالے۔ یہ مستورات مع اطفال ۲۵ محرم مطابق ۱۳ اپریل یکشنبہ کوسہارنپور سے علی الصباح چل کر کاندھلہ کی مستورات کو لیتی ہوئی شام کو نظام الدین پہنچ گئیں۔ زکریا کا چونکہ مجوزہ سفر قریب تھا اس لیے وہ نہیں گیا۔

بندہ کی روانگی حجاز پاک ۸۹ھ بمعیت علی میاں وغیرہ:

۱۴ اپریل کواڈہ پر اتنا ہجوم تھا کہ نظام الدین کے جو بچے ہوائی جہاز پر استقبال کے لیے گئے ہوئے تھے وہاں نہ مل سکے نظام الدین واپس آ کر ملے۔ عزیزان مولانا انعام و ہارون وغیرہ نظام الدین کے احباب جمعہ ۱۸ اپریل کو جمعہ کے بعد زکریا سے ملنے آئے اور دوشنبہ کو واپس چلے گئے اور ۵ صفر ۸۹ھ مطابق ۲۳ اپریل ۶۹ء چہار شنبہ کی صبح اذان کے بعد اپنی جماعت کرکے بہ نیت صوم علی گڑھ والوں کی کار میں گنگوہ مزار پر حاضر ہوئے نظام الدین پہنچا۔ اللہ سے دعاء کی تھی کہ یہ سفر سہارنپور سے مدینہ کی بہ نیت صوم باوضو پورا ہو جائے۔ اللہ نے اپنے فضل سے پورا فرمادیا۔ ورنہ پیشاب کی کثرت سے ہوائی جہاز میں بہت ہی فکر تھا کہ پیشاب کے بعد معاً وضو کرنے میں بھی نہ معلوم کتنے میل گزر جائیں گے۔ مگر اللہ نے کرم فرمایا۔ انعام فرمایا، احسان فرمایا۔ فللّٰہ الحمد و المنۃ۔

علی میاں بھی روانگی سے ایک دن پہلے مع مولوی سعید الرحمٰن و مولوی معین اللہ دہلی پہنچ گئے تھے۔ ۲۶ اپریل مطابق ۸ صفر ۸۹ھ یوم شنبہ کولکھنوی حضرات کی معیت میں زکریا ابوالحسن ۹ بج کر ۲۰ منٹ پر دہلی سے چل کر ۱۰ بج کر ۵۵ منٹ پر بمبئی کے ہوائی اڈہ پر پہنچے وہاں مطار پر علی میاں نے بہت طویل دعاء کرائی اور مطار پر عزیز عبدالرحیم متالا اور بہت سے احباب سورت و گجرات وغیرہ کے ملے۔ عزیز عبدالرحیم آئندہ مکہ کے سفر میں میرے ساتھ رہا۔ قیام حاجی دوست محمد صاحب کی کالونی میں ہوا۔ زکریا شہر میں نہیں گیا البتہ علی میاں متعدد جگہوں پر احباب کے اصرار پر گئے اور ۲۹ اپریل سہ شنبہ ۱۱½ بجے بمبئی سے چل کر ظہر کراچی کے مطار پر تقریباً ایک ہزار کے مجمع کے ساتھ پڑھی، اس کے بعد چل کر قبیل مغرب جدہ پہنچے اور مطار کی مسجد میں مغرب پڑھ کر حدیبیہ میں عشاء عزیز عبدالرحیم کے اقتداء میں پڑھی اور وہاں سے صولتیہ جا کر کھانے سے فراغ کے بعد عمرہ سے فراغ حاصل کیا اور عمرہ سے فراغ کے بعد مخصوص رفقاء کے ساتھ عزیز سعدی سلمہ کے مکان پر چلا گیا۔

اس پورے آٹھ ماہ قیام میں اس آمد کے علاوہ جو رمضان المبارک میں یا رمضان کے بعد ہندوستان واپسی کے لیے ہوئی مستقل معمول یہی رہا کہ عشاء کے بعد کھانے سے فراغ پر یہ ناکارہ

مع اپنے مخصوص احباب قاضی عبد القادر صاحب، عبد الرحیم، یوسف وغیرہ عمرہ کر کے عزیز سعدی سلمہ کے مکان پر جا کر رات کو سوتے اور وہیں سے حرم شریف میں صبح کی نماز پڑھنے کے بعد واپس سعدی کے یہاں جاتے تھے اور وہاں سے عربی ۲ بجے کے قریب ناشتہ سے فراغ پر مدرسہ صولتیہ آجاتے تھے۔ وہاں آ کر ایک گھنٹہ صلوٰۃ ضحیٰ اور ۵ بجے تک ڈاک اور ملاقات خصوصی اور تخلیہ وغیرہ کے بعد ۵ بجے حرم شریف آتے اور ظہر سے فراغ پر مدرسہ صولتیہ واپس جا کر یہ ناکارہ تو لیٹ جاتا تھا بقیہ جملہ رفقاء کھانے سے فراغ پر لیٹتے تھے اس ناکارہ کا معمول سالہا سال سے ایک وقت کھانے کا ہے جو ہندوستان میں ہمیشہ صبح کا رہا اور حجاز میں ہر سفر میں ہمیشہ عشاء کے بعد کا رہا کہ عشاء پڑھ کر صولتیہ میں کھانے سے فراغ پر عمرہ یا طواف سے فراغ پر سعدی سلمہ کے یہاں جاتے تھے۔ ملک عبد الحق صاحب اور ان کے صاحبزادے عزیزم عبد الحفیظ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ ملک صاحب نے اس سیہ کار کے مکہ پہنچنے سے پہلے ایک پک اپ (گاڑی) مستقل پندرہ ہزار ریال میں خرید کر اس سیہ کار کے حوالہ کر دی تھی۔ جو مکہ مکرمہ میں اور مدینہ منورہ ہر جگہ میرے ساتھ رہتی تھی اور ان کے صاحبزادے بلند اقبال عزیزم مولوی عبد الحفیظ سلمہ دونوں جگہ ہر وقت میرے ساتھ ہی رہے اور نمازوں میں یا کہیں دوسری جگہ جانا ہوتا تو وہ مجھے لیے لیے پھرتے تھے میں نے ہر چند کوشش کی کہ کم از کم پیٹرول کے دام مجھ سے لے لیں۔ مگر ملک صاحب نے اس کو بھی قبول نہ کیا۔ مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے مکہ عموماً اسی گاڑی میں آنا ہوا اور اس راستہ میں ملک صاحب خود چلاتے تھے۔ ان کو اپنی گاڑی کے چلانے میں بہت مشق ہے مکہ سے مدینہ اکثر ساڑھے چار سے پانچ گھنٹہ کے درمیان میں پہنچ جاتے تھے۔

حرمین شریفین کے قیام میں عصر کے بعد سے گیارہ بجے تک عمومی مجلس ہوتی جس میں مقامی اور آفاقی لوگ ملاقات کے لیے کرم فرماتے رہتے تھے۔ گیارہ بجے پیشاب وضو سے فراغ پر ہر دو متبرک مقامین کی مسجد میں حاضری ہوتی تھی اور مغرب سے عشاء تک وہیں مسجد میں قیام ہوتا اور عشاء کے بعد کھانے سے فراغ پر مکہ مکرمہ میں پانچ بجے تک ڈاک یا کسی کتاب کا سننا تھا۔ علی میاں بھی دہلی سے جدہ تک اس سیہ کار کے ساتھ رہے جدہ پہنچ کر یہ ناکارہ مکہ مکرمہ چلا گیا۔ جیسا کہ اوپر نظام گزرا اور علی میاں تو جامعہ مدینہ کے اجتماع میں شرکت کی غرض سے گئے تھے اور اس کا اجلاس ایک دن پہلے سے شروع ہو گیا تھا، اس لیے وہ شب کو جدہ میں الحاج نور ولی صاحب کے مکان پر ٹھہر کر منگل کی صبح کو طیارہ سے آدھ گھنٹہ میں مدینہ پاک پہنچ گئے۔

یہ ناکارہ مع اپنے مخصوص رفقاء کے ۱۵ مئی کی صبح کو ملک عبد الحق صاحب کی گاڑی میں صبح ساڑھے دس بجے عربی چل کر مدینہ پاک ظہر کے وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ وہاں جا کر ظہر سے

پہلے غسل سے فراغ ہوا۔ مسجدِ نبوی میں حاضری ہوئی۔

روزوں کا سلسلہ سہارنپور سے شروع ہو گیا تھا اور باوجود سفر اور گرمی کے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی جو صرف اللہ کا احسان وکرم وفضل تھا۔ اس لیے ۸ مئی سے "صیام شہرین متتابعین توبة من اللّٰہ" کی نیت کرلی اور احباب واکابر کے شدید اصرار کے باوجود خیبر کے سفر تک اس کا سلسلہ رہا۔ چونکہ علی میاں کو اپنی آنکھ دکھانے اور احباب کے اصرار پر لندن جانا تھا اس لیے ۲۵ مئی کو زکریا علی میاں وغیرہ مکہ مکرمہ واپس ہوئے۔ علی میاں صاحب ۶ جون جمعہ کی نماز کے بعد لندن جانے والے تھے۔ اس لیے زکریا مع رفقا کے ۵ جون جمعرات کو مدینہ کے لیے واپس ہوئے اور رات بدر میں گزار کر جمعہ کے دن مدینہ پاک حاضری ہوئی اور ۱۱ جون کو تبلیغ کا ماہانہ اجتماع مدینہ پاک کا پہلے سے طے تھا اور زکریا کی وجہ سے اگلے ماہ جولائی کا اجتماع بھی مدینہ میں طے ہوا۔ زکریا نے اصرار بھی کیا کہ اپنے معمول کے مطابق جہاں کا دستور ہے وہاں طے کرلو یہ ناکارہ وہاں ہی چلا جائے گا مگر ان لوگوں نے مدینہ پاک ہی میں طے کیا کہ ۹ جولائی کو ہوگا۔

تبلیغی سفر:

اللہ تعالیٰ کے احسانات متزایدہ میں جو اس سفر میں روز افزوں رہے ایک فضل واحسان یہ بھی رہا کہ اس سفر کے جملہ تبلیغی اجتماعات میں خیبر، ینبوع، طائف، مکہ، جدہ وغیرہ میں ناکارہ کی شرکت ہوتی تھی۔ سہ روزہ تبلیغی اجتماع خیبر کا طے ہوا اور زکریا نے بھی اپنی شرکت پر اصرار کیا۔ مگر احباب نے شدت سے انکار کیا کہ وہاں بجلی نہیں اور گرمی شدید ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس سفر میں باوجود قدیم وجدید امراض کے صحت بہت اچھی رہی۔ اس لیے ۱۲ جولائی کو حرم شریف میں صبح کی نماز پڑھ کر خیبر کے لیے روانہ ہوئے۔ عربی ڈیڑھ بجے خیبر پہنچے۔ جماعت کا قیام مسجد علی میں طے ہوا اور ناکارہ کے لیے شدید انکار کے باوجود مسجد سوق کے قریب ایک مکان تجویز ہوا جو درحقیقت ایک اسکول تھا اور آج کل گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے خالی تھا۔ بھائی محمد علی صاحب مکہ بجلی والے اور الحاج عبدالحفیظ وغیرہ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ ان لوگوں نے ایک فیکٹری والوں سے بات کرکے تین دن کے لیے ان سے چار سو ریال میں اپنی بنائی ہوئی بجلی مستعار لی جو ان کی فیکٹری میں جارہی تھی اور اس نے یہ کہہ کر جو تار وغیرہ بجلی کا سامان تم لائے ہو وہ کرائے کے بدلہ میں میرے لیے چھوڑ دو۔ مقاصہ کرلیا۔

شہداء خیبر کی زیارت اور وہاں دل بستگی وکشش:

اجتماعات مسجدِ علی اور دوسری مساجد میں ہوتے رہے۔ جن کی تفاصیل میرے روزنامچے میں

ہے۔ ان میں سیہ کار کی بھی شرکت ہوتی رہی۔ مسجد علی کے قریب بلا کسی دیوار وغیرہ کے جنگل میں شہداء خیبر کی قبور تھیں۔ ان پر حاضری ہوئی۔ جتنی کشش اور دل بستگی ان قبور پر تھی اتنی حرمین کے کسی قبرستان میں نہیں ہوئی۔ اس پر بڑی حیرت بھی ہوئی اور کئی دن تک اس کا اثر بھی رہا۔ اکابر ہند علی میاں، مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ سے بندے نے اس کی وجہ دریافت کی کہ بقیع اور جنت المعلیٰ میں اتنی کشش نہیں جتنی یہاں ہوئی۔ مدینہ پاک کے کئی ماہ قیام میں ان قبور پر بار بار جانے کا تقاضہ رہا۔ ان اکابر نے جاذبیت کی وجوہ مختلف بتائیں۔ اس سیہ کار کے خیال میں یہ ہے کہ وہاں کے حاضر ہونے والے بہت کم ہیں، حاضری کی نوبت دور ہونے اور جنگل کی وجہ سے کم آتی ہے۔ اس لیے وہاں کی مقدس ارواح کی توجہ آنے والوں کی طرف زیادہ ہوئی۔ ۱۵ جولائی کو خیبر سے واپسی ہوئی۔ اس کے بعد چونکہ ہر اجتماع میں اور تبلیغی گشت میں یہ ناکارہ شرکت کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے ۲ اگست مطابق ۷ اجمادی الاولیٰ ہندی شنبہ کو بعد عصر زکریا ٹیکسی میں اور بقیہ رفقاء ملک صاحب کی گاڑی میں روانہ ہوئے۔ عزیز یوسف متالا اسی دن صبح کو مع اپنے رفقاء کے لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مدینہ پاک پہنچا تھا۔ حالانکہ ہم نے کوشش کی تھی کہ اس کو جدہ میں ہمارے مکہ آنے کی اطلاع مل جائے مگر اطلاع نہ مل سکی، اس لیے وہ مستقل ٹیکسی کر کے مدینہ سے پھر ہمارے ساتھ مکہ واپس آئے۔ یہ ناکارہ مع رفقاء عربی رات کے سعدی کے مکان پہنچے۔ کھانے سے اور نماز سے فراغ پر ساڑھے چار بجے حرم پہنچے۔

سفر طائف:

عمرے سے فراغ کے بعد سعدی کے گھر واپس ہوئے اور بدھ کی صبح کو بذریعہ ٹیکسی اور ملک صاحب کی گاڑی میں ۲½ بجے عربی مکہ سے چل کر ۴½ بجے طائف پہنچ گئے۔ تین دن وہاں قیام رہا مختلف اجتماعات ہوئے۔ جس میں مولانا سعید خان صاحب الحاج فضل عظیم وغیرہ نے تقاریر کیں اور جمعہ کے دن ۴½ بجے مسجد عباس میں پہنچے چونکہ ملک فیصل صاحب بھی اس زمانے میں طائف تھے اور وہ اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ اس لیے مسجد کے چاروں طرف دور تک سنگین پہرہ رہتا تھا اور کوئی کار مسجد کے دروازہ تک نہیں جا سکتی تھی۔ لیکن یہ ناکارہ اقبال خلجی صاحب کی کار میں تھا۔ انہوں نے فوجیوں سے خوشامد کر کے مسجد تک لے جانے کی اجازت لے لی۔

ملک صاحب کے آتے ہی خطبہ کی اذان شروع ہوگئی۔ ملک صاحب اس دروازہ سے آئے جو امام کے قریب قبلہ کی جانب تھا۔ وہ نماز کا سلام پھیرتے ہی چلے گئے۔ امام نے خطبہ بہت ہی مختصر پڑھا۔ حالانکہ حجاز میں عام طور پر خطبے بہت لمبے ہوتے ہیں اور نمازیں بہت مختصر۔ عزیزم مولوی

اسماعیل بدات نے جو میرے بعد بحرین کے راستہ مکہ پہنچے تھے انہوں نے بیان کیا کہ الخبر میں خطبہ تو ایک گھنٹہ ہوا اور نماز تین منٹ۔

بہر حال ہم لوگ جمعہ کی نماز پڑھ کر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے مزار پر دیر تک حاضری کی اپنے مستقر پر واپس آئے اور عصر کی نماز پڑھ کر جس ٹیکسی میں یہ ناکارہ گیا تھا اس سے حتمی وعدہ عصر طائف میں پڑھنے کا ہو بھی گیا تھا اور بہت ہی گرویدگی کا اس نے اظہار بھی کیا تھا اور موعودہ وقت پر پہنچ بھی گیا۔ لیکن اتنے ہم لوگوں کا مسجد سے سامان ٹیکسی تک آیا اس کو کسی اور نے زیادہ کرایہ دے کر اپنے لیے طے کر لیا۔ ہم نے ہر چند وعدے یاد دلائے لیکن سواق نے صفائی سے کہہ دیا کہ انہوں نے کرایہ زیادہ دے دیا۔ فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکیٰ!

مکہ مکرمہ میں حاضری:

اس لیے جملہ رفقاء ۱۶ نفر ملک عبدالحق کی گاڑی میں بھر گئے اور بہت اندیشہ تھا کہ یہ گاڑی راستہ میں جواب دے گی۔ لیکن اللہ کے فضل سے عصر کے بعد چل کر مغرب میدانِ عرفات جبلِ رحمت پر پڑھی۔ بڑا ہی دل لگا میدان صاف تھا سکون کا وقت تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ دو تین گھنٹے رات کے یہاں گزاروں مگر قاضی عبدالقادر صاحب وغیرہ رفقاء کے اصرار پر پون بجے یہاں سے چل کر ایک بجے مکہ میں داخل ہوئے اور مکہ کے بازاروں میں اتنی دیر لگی کہ 1½ بجے مدرسہ صولتیہ ہوتے ہوئے حرم میں پہنچے اور عمرہ سے فراغ پر عزیز سعدی کے یہاں پہنچے وہاں کھانا وغیرہ کھایا۔

سفرِ ینبوع:

دو دن مکہ میں قیام کے بعد ینبوع کا سہ روزہ اجتماع تجویز تھا چونکہ عزیز عبدالرحیم سلمہ کی طبیعت خیبر سے خراب ہوئی تھی اور علالت بڑھتی ہی چلی گئی۔ طائف میں خاص طور سے خراب رہی۔ طائف میں تو اس سیہ کار کی طبیعت بھی بہت ہی خراب رہی۔ نہ کچھ کھانے کی نوبت آئی نہ نیند اچھی طرح آئی۔ حرارت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہاں کے پھلوں کے بہت سے اصرار ہوئے۔ خاص طور سے برشومی کے متعلق بہت اصرار رہا کہ بہت سے لوگ لے کر آئے۔ مگر ایک بھی چکھنے کی نوبت نہ آئی۔ حالانکہ حجازِ مقدس کے اس آٹھ ماہ قیام میں طبیعت بہت اچھی رہی عزیز عبدالرحیم کی بیماری کی وجہ سے مولانا سعید خان صاحب نے یہ طے کیا کہ وہ مکہ سے جدہ ہو کر ینبوع پہنچیں کہ عزیز عبدالرحیم کو طیارہ پر سوار کرا سکیں۔ چنانچہ یہ حضرات دوشنبہ ۱۱، اگست مطابق ۲۶ جمادی الاولیٰ ہندی کو صبح ملک صاحب کی گاڑی میں روانہ ہو گئے اور ہم لوگ اسی دن مسجد حرام میں عصر پڑھ کر بذریعہ ٹیکسی ینبوع روانہ ہوئے۔ مگر ہمارا سواق بہت ہی حقہ اور چائے کا شوقین تھا۔ اس لیے وہ

آدھ گھنٹہ جدہ کے مفرق پر اور آدھ گھنٹہ بدر کے مفرق پر چائے اور حقہ میں مشغول رہا۔ یہ حضرات مولوی سعید خان صاحب وغیرہ عصر کے وقت ینبوع پہنچ گئے تھے۔ عشاء کے بعد دیر تک انتظار کرکے یہ ہماری تلاش میں چلے۔ مگر جدہ میں ملاقات ہوگئی۔ ینبوع کے امام بہت ہی غلط قرآن پڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمادے۔

یہاں کے قیام میں مچھلیاں بہت ہی ارزاں عجیب لمبی چوڑی ملیں ایک مچھلی غالباً ۱۵ کلو کی تھی۔ جس میں کانٹا بہت کم، سارے مجمع نے صبح وشام دونوں وقت اسی کا شوربا پیا بدھ کی صبح کو زکریا عزیز یوسف متالا کی وجہ سے ٹیکسی میں کہ یوسف کو بدر کی سیر کرانی تھی کہ اس کی پہلی حاضری تھی روانہ ہوئے۔ بقیہ رفقاء ملک صاحب کی گاڑی میں ۱۲½ پر بدر پہنچے۔

جدہ کے اجتماع میں شرکت:

وہاں سے ۲ بجے چل کر ۴½ پر مدرسہ شرعیہ پہنچے۔ طائف میں دمام اور جدہ کے ماہانہ تبلیغی اجتماعات طے ہوگئے تھے اور دونوں جگہ کے احباب نے زکریا سے شرکت کا وعدہ بھی لے لیا تھا۔ لیکن عبدالرحیم تو روانہ ہو چکا تھا اور ابوالحسن کو دمام سے سہارنپور جانا تھا اور اسماعیل یوسف کا ویزا وہاں کا نہیں تھا۔ کسی رفیق کے نہ ہونے کی وجہ سے زکریا کو دمام کا سفر ملتوی کرنا پڑا البتہ جدہ کے ماہانہ اجتماع میں شرکت ہوئی۔

۲۸ ستمبر مطابق ۱۴ رجب یکشنبہ کی صبح کو نماز کے بعد مسجد نبوی سے حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کی طرف سے احرام باندھ کر ملک صاحب کی گاڑی میں مکہ کے لیے روانگی ہوئی۔ مگر اب تک کہ معمول کے خلاف کہ اس سفر میں کئی دفعہ مکہ مدینہ کے درمیان میں آمدورفت ہوئی۔ لیکن دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مگر آج خلاف معمول گاڑی کے چلتے ہی دوران سر شروع ہوا۔ بدر تک پہنچنا مشکل ہوگیا۔ بڑی مشکل سے بدر تک پہنچا گاڑی روک کر تھوڑی دیر زمین پر لیٹا لیموں وغیرہ کھائے لیکن امتلاء اور دورانِ سر گیا نہیں۔ بہت مشقت کے ساتھ ۵ بجے مدرسہ صولتیہ پہنچے دو دن مکہ قیام کے بعد بدھ کی صبح کو جملہ رفقاء اور بعد عصر زکریا جدہ کے لیے روانہ ہوا۔ راستہ میں بیعت الشجرہ کی جگہ پر آدھ گھنٹہ قیام کیا۔ جو مسجد حدیبیہ سے آگے بڑھ کر تقریباً آدھ میل پر بائیں جانب واقع ہے۔ وہاں چل کر جدہ میں مغرب کی نماز مسجد بن لادن میں پڑھی۔ وہاں دو دن اجتماع ہوتے رہے اور جمعہ کی صبح کو شوریٰ سے فراغ پر ۴ بجے عربی چل کر مسجد حرام میں جمعہ کی نماز ادا کی اور شنبہ کو مدینہ پاک واپسی ہوئی۔

حاضری مکہ مکرمہ بمعیت علی میاں:

علی میاں اور منظور صاحب رابطہ کے اجتماع کی شرکت کے لیے ۱۴، اکتوبر یکم شعبان ہندی سہ شنبہ کو مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور ۲۶ اکتوبر مطابق ۳ شعبان کو رابطہ کے اجتماعات سے فارغ ہو کر مدینہ پاک پہنچ گئے تھے اور ۹ نومبر ۲۹ شعبان عربی اور ۲۷ ہندی یکشنبہ کو صبح ۲/۱، ۳ بجے عربی علی میاں کے ساتھ مدینہ پاک سے چلے۔ چونکہ اس مرتبہ رابطہ عالم اسلام کی گاڑی علی میاں کے ساتھ رہی ان کے اصرار پر یہ ناکارہ بھی رابطہ کی گاڑی میں ۲/۱ ۱۰ بجے صولتیہ پہنچے اور اپنی عصر پڑھی۔ بقیہ رفقاء ڈاکٹر اسماعیل اور ملک صاحب کی گاڑی میں مغرب سے عشاء تک حسب معمول حرم میں قیام رہا اور عشاء اطمینان سے پڑھنے کے بعد مدرسہ صولتیہ واپس پہنچے۔

تراویح مکہ مکرمہ:

تو ایک دم گولوں کی آواز شروع ہو گئی، حالانکہ وہاں دستور قدیم کے موافق یہ سنا گیا تھا کہ اگر عشاء کی نماز کے بعد گولوں کی آواز آئے تو آدھ گھنٹہ بعد تراویح کی نماز شروع ہوتی ہے۔ مگر ہم لوگ آواز سنتے ہی پیشاب وضو سے فارغ ہو کر مسجد حرام میں پہنچے تو دو رکعت تراویح کی ہو چکی تھیں۔

حرمین شریفین میں معمول یہ ہے کہ دو حافظ مل کر تراویح پڑھاتے ہیں ہر امام آدھا پارہ پڑھتا ہے۔ اس ناکارہ کا معمول تراویح اور کھانے سے فراغ پر یہ تھا کہ تنعیم جا کر روزانہ عمرہ کرتا۔ علی میاں بھی ساتھ ہوتے اور اکثر وہ دن میں ہی عمرہ سے فارغ ہو جاتے تھے۔ ۱۵ دن مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔

واپسی مدینہ طیبہ از مکہ مکرمہ در رمضان:

۲۴ نومبر مطابق ۱۵ رمضان المبارک چہار شنبہ کو زکریا مکہ مکرمہ سے مدینہ پاک روانہ ہوا اور علی میاں اور مولوی منظور ایک دن پہلے مکہ سے جدہ آ چکے تھے اور اپنا رہا پندرھواں پارہ تراویح میں خود پڑھا اور سفیر ہند کے یہاں دعوت ہوئی اور ۱۵ رمضان ۲۴ نومبر کو ہندوستان واپس ہوئے۔

مکہ مکرمہ میں پندرہویں شب میں پارہ نمبر ۱۵ ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں ہمیشہ ایک ہی پارہ پڑھا جاتا ہے اور رمضان ہمیشہ ۲۹ کا ہوتا ہے لیکن اعلان ہمیشہ چاند کا دیر میں ہوتا ہے تراویح کے بعد پارہ نمبر ۳۰ ہو کر پھر چاند کا اعلان ہوتا ہے لیکن مدینہ پاک میں ۲۹ کو قرآن پاک ختم ہوتا ہے۔ وہاں بھی دو حافظ پڑھتے ہیں۔ لیکن سولہویں شب میں وہاں پارہ نمبر ۱۷ ہوا لہٰذا ہم لوگوں نے اپنا پارہ نمبر ۱۶ اکیسویں شب امام حرم کی تراویح ختم کے بعد (کہ چار رکعت ہم سب نے امام حرم کے پیچھے نفل پڑھی تھی) عزیز یوسف متالا کے اقتداء میں اپنے معتکف میں پڑھیں۔ ۲۰ رمضان کی شام

سے اعتکاف کیا۔ باب عمر رضی اللہ عنہ کے قریب معتکف تھا۔ ۲۹ کا چاند ہوا۔ عشاء کے فرضوں کے بعد قاضی صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا کہ شہادت شرعیہ سے روایت ثابت ہوگئی اور رمضان ختم ہوگیا۔ منگل کو عید ہوئی۔

روانگی از مدینہ طیبہ برائے ہندو پاک:

پہلے سے ۲ شوال کی واپسی تجویز تھی۔ لیکن تبلیغی اجتماع اس ماہ بھی اس ناکارہ کی وجہ سے مدینہ میں ہی رکھا گیا تھا۔ اس وجہ سے تین دن اجتماع میں گزرے اور عربی ۷ شوال مطابق ۱۵ دسمبر کو مدینہ سے مکہ مکرمہ کے لیے واپسی ہوئی۔ اس مرتبہ شب کا قیام بجائے سعدی کے صولتیہ میں ہوا کہ سردی شروع ہوگئی تھی۔ ۲۱ دسمبر یکشنبہ کو بعد عصر مکہ سے جدہ کے لیے روانگی ہوئی۔ عین مغرب کے وقت جدہ پہنچے۔ ۲۲ دسمبر کی صبح کو سعودی جہاز سے ۲ بجے عربی چل کر ۳ بجے دوپہر کو کراچی پہنچے، ائیرپورٹ کی مسجد میں ظہر پڑھی۔ موجودین سے مصافحہ کرکے حاجی فریدالدین کی گاڑی میں مکی مسجد پہنچے۔ ائیرپورٹ کا مجمع جو کئی ہزار تھا عصر تک مکی مسجد پہنچا۔ عصر سے مغرب تک روزانہ مصافحوں کا سلسلہ چلتا جو مغرب کے وقت بغیر تمامی کے بند ہوجاتا۔ مغرب کے بعد بیعت کا سلسلہ رہتا۔

۲۶ دسمبر جمعہ کی شام کو عشاء کے بعد ۸ بجے طیارہ سے چل کر ۹½ بجے لاہور پہنچے۔ بلال پارک کی مسجد میں قیام ہوا۔ اتوار کی صبح کو ۱۱½ بذریعہ کار چل کر ۱۲½ بجے رائیونڈ پہنچے چکر اور امتلاء اور دورانِ سر خوب رہا۔ بھائی افضل کے مکان پر مالٹے کا عرق پینے سے قے ہوئی۔ یہاں بھی مجمع بہت زیادہ رہا۔ ۲ جنوری ۷۰ء جمعہ کے دن مطابق ۲۲ شوال ۸۹ھ جمعہ کی نماز کے بعد گیارہ کاریں اور دولاریوں کے ساتھ لائل پور روانگی ہوئی۔ راستہ میں عصر کی نماز سرائے مغل میں صوفی صاحب کے مزار پر پڑھی۔ وہاں سے فراغ پر مغرب کے وقت لائل پور پہنچے۔ جماعت ہورہی تھی۔ زکریا کو امتلاء اور چکر کی شدت ایسی ہوئی کہ جاتے ہی لیٹ گیا اور آدھ گھنٹہ بعد اپنی جماعت کی۔ شنبہ کو لائل پور میں قیام رہا۔ دوپہر کو جناب الحاج الحافظ مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی سرگودھا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اس ناکارہ نے آمد پر اظہار افسوس بھی کیا کہ کل کو تو میں آپ کے یہاں حاضر ہو ہی رہا تھا۔ عصر کے وقت سرگودھا واپس چلے گئے۔ ۴ جنوری اتوار کو ۱۱ بجے سرگودھا روانہ ہوئے۔ راستے میں زینت مل نیر پہلوان ابراہیم کے کارخانہ پر چند منٹ قیام کے بعد چنیوٹ کے مدرسہ میں ٹھہرتے ہوئے سرگودھا پہنچے۔ مدرسہ کے ناظم ہمارا انتظار کرکے سرگودھا جاچکے تھے۔ اس لیے مدرسہ میں قیام کی نوبت نہیں آئی۔ سرگودھا میں ظہر کے بعد حافظ صاحب کے یہاں کھانا کھایا۔ زکریا نے اس سفر میں دن میں ناشتہ اور کھانے میں شرکت نہیں کی۔ وہاں پہنچ کر بھی چکروں کی وجہ

سے تاخیر سے ظہر پڑھی۔ حافظ صاحب نے بھی زکریا کے ساتھ پانچوں نمازیں گھر ہی پر پڑھیں اور امامت کرائی۔ دوشنبہ کی صبح کو روانگی طے تھی۔ مگر کھانے پر حافظ صاحب نے بہت اصرار کیا اور سارے مجمع کی بہت زوردار دعوت کی۔ جس میں پلاؤ زردہ کے علاوہ خوب مختلف انواع کے کھانے تھے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر سارا مجمع ڈھڈیاں کے لیے روانہ ہوگیا۔ عصر کے قریب وہاں پہنچے۔ زکریا حافظ صاحب کے یہاں سے اپنے ساتھ پلاؤ لایا تھا۔ وہاں جاکر گرم کرکے کھایا۔

۱۰ جنوری کو مولوی عبدالجلیل کے ایک بچہ کا زکریا نے قرآن ختم کرایا۔ شیرینی بھی زکریا نے تقسیم کرائی اور بڑے لڑکے ابراہیم کا نکاح ان کے بھائی رفیق کی لڑکی سے حافظ عبدالعزیز صاحب نے مہر فاطمی پر پڑھایا۔ اسی دن بعد ظہر وہاں سے چل کر عصر جھاوریاں میں (قاضی عبدالقادر صاحب کے مکان پر) پڑھی۔ اتوار کی صبح کو ناشتہ کے بعد وہاں سے چل کر عصر کے وقت راولپنڈی پہنچے۔ قریشی صاحب کی مسجد میں قیام طے تھا۔ لیکن چند وجوہ سے اس مکان میں قیام ہوا، جس میں عزیز مولانا یوسف صاحب کے ساتھ قیام ہوا تھا۔ ۱۷ جنوری ۷۰ء شنبہ کو اپنی ظہر پڑھ کر بذریعہ طیارہ براہِ لاہور عصر کے وقت کراچی پہنچے۔ وہاں سے ۱۹ جنوری دوشنبہ کو طیارہ کے لیے حاجی فرید کی گاڑی میں روانگی ہوئی۔

جہاز بجائے ½۱۰ بجے کے ۱۱ بجے روانہ ہوکر سوا بارہ بجے اور ہندی پون بجے دلی پالم اڈہ پر پہنچے۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ علی میاں، مولانا منظور، یونس سلیم صاحب طیارہ پر موجود تھے۔ حضرات نظام الدین بھوپالی کے اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔ طیارہ پر اول بھائی شفیع صاحب نے مولانا عمران خان صاحب کا شدید اصرار و تقاضا کہ مجھ کو طیارہ سے یا فرسٹ کلاس سے اسی وقت بھوپال بھیج دیں۔ میرا بھی عرصہ سے بہت جی چاہ رہا تھا کہ ہر سال مولانا کا اصرار ہوتا تھا، لیکن اڈہ پر لکھنؤ، علی گڑھ، بہار، بنگال کا تقریباً پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ ان سے بغیر ملے بھی جانا مشکل تھا اور وہ اجتماع کا آخری دن بھی تھا۔ البتہ شاہ یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت ضرور ہو جاتی، مگر مجمع کی کثرت مانع ہوئی۔ مولانا انعام الحسن صاحب نے لوگوں سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر زکریا بھوپال نہ آئے تو بذریعہ تار ٹیلیفون سے اطلاع کردی جائے۔ چنانچہ اسی وقت اطلاع کردی گئی۔ اس کے جواب میں ان کا ٹیلیفون آیا کہ وہ منگل کو بذریعہ طیارہ پہنچ رہے ہیں، چنانچہ وہ منگل کی شام کو عشاء کے قریب پہنچ گئے اور کلکتہ اور بہار کے احباب بدھ کی صبح کو ریل سے۔ منگل کا دن عورتوں کے اجتماع کا تھا۔ جس میں مولوی انعام کی شرکت ضروری تھی، مگر نہ ہوسکی۔ فیالاسف۔

واپسی از دہلی:

۱۲ ذیقعدہ مطابق ۲۱ جنوری بدھ کا دن نظام الدین گزرا۔ جمعرات کی صبح کو ½۸ بجے علی گڑھ والوں کی کار میں نظام الدین سے چل کر حضرت میرٹھی اور حضرت مدنی کے مزار پر حاضر ہوتے ہوئے اسلامیہ اسکول تین بجے پہنچے۔ اس لیے کہ زکریا نے دہلی سے ابوالحسن کو اس کے اسکول کی وجہ سے پیر ہی کو سہارنپور بھیج دیا تھا۔ مگر منیجر صاحب اور پرنسپل صاحب نے بدھ کے دن ابوالحسن کو واپس کر دیا کہ زکریا کو لے کر سیدھا اسکول پہنچے اور یہ دن بکار اسکول شمار ہوگا۔ اس لیے بالا بالا اسکول گیا۔ ½۳ بجے وہاں سے چل کر مدرسہ قدیم کی مسجد میں تحیۃ الشکر کے بعد خصوصی احباب سے ملاقات ہوئی۔ عصر کی نماز حسبِ تجویز و اعلان دارالطلبہ جدید میں پڑھی۔ جمعہ کے دن مولانا صاحب مولوی عبیداللہ، مولوی محمد عمر وغیرہ دس نفر عشاء کے بعد بذریعہ ریل پہنچے کہ ان کی کار میں نظام الدین کی مستورات جمعہ کے وقت پہنچ گئیں تھیں۔ اگلے دن گنگوہ حاضری ہوئی اور عصر کے بعد واپسی ہوئی۔ ظہر کے قریب قاری طیّب صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ مگر اس ناکارہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے سہارنپور پہنچنے سے پہلے ہی واپس چلے گئے۔ اس لیے تجویز ہوا کہ یکشنبہ کو بجائے جھنجھانہ اور لوہاری کے دیوبند چلیں۔ لیکن رات ہی کو بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ کہیں بھی جانا نہ ہو سکا۔ پیر کے دن حضرات نظام الدین بارش ہی میں دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس سفر میں اللہ کے احسانات اتنے **لا تعد و لا تحصٰی** ہوئے کہ اپنی بداعمالیاں ان کو ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ مبشرات اس سیہ کار کو تو کم اور اس سیہ کار کے متعلق مقامی اور دین دار کو بہت ہی کثرت سے ہوئے۔ ایک بات میرا بھی لکھوانے کو جی چاہ گیا۔

۴۲ء میں اس سیہ کار نے اپنی یادداشت کے واسطے ایک رسالہ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کو مسلسل متن کی صورت میں لکھا تھا اور شرح اور بین السطور میں مختلف روایات کے درمیان جمع اور مختلف مذاہب کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ طباعت کا کبھی خیال بھی نہ آیا اور کبھی اگر کسی نے کہا بھی تو اس کو انکار کر دیا۔ مگر مدینہ پاک کی اس حاضری میں شعبان میں بار بار بلا کسی وجہ کے یہ داعیہ پیدا ہوتا رہا کہ ہندوستان واپسی ہو تو اس کو طبع کیا جائے۔ چنانچہ واپسی ہوتے ہی ذیقعدہ میں اس کا سننا شروع کیا۔ اس لیے یہ ناکارہ نزول آب کی وجہ سے خود دیکھنے سے معذور ہو گیا تھا۔ یہاں آ کر احباب نے بھی اس کی طباعت پر اصرار کیا اور ۲۶ ربیع الثانی پنجشنبہ کو اس کا سننا اور تبیض پوری ہوئی۔ میں تو بے فکر ہو گیا تھا۔

اس سفر کے مبشرات میں سے ایک بشارت اور جزء حجۃ الوداع والعمرات کی تالیف:

مگر ۳ جمادی الاول بدھ کی دوپہر کو خواب دیکھا۔ کہ ''کوئی شخص کہہ رہا ہے۔ جس کو میں بصورت رجل سمجھ رہا ہوں کہ حجۃ الوداع کے تکملہ میں حضور کے عمرے ضرور لکھنے چاہئیں اور میں نے خواب ہی میں خود لکھنا شروع کر دیا اور جعرانہ کی دو حدیثیں جامع الطریق طریق مکہ اور اصح بمکہ کبائت پر خواب ہی میں کلام لکھ لیا۔''

جاگنے کے پندرہ دن تک سوچ و فکر میں رہا۔

شوق جاذب اور اعذار مانع اکابر کے اصرار پر ۱۷ جمادی الاولیٰ چہار شنبہ کی صبح کو بسم اللہ کر ہی دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ۱۵ رجب ۹۰ھ کو مکمل ہو گیا اور اس کے اختتام سے قبل الحاج مولوی سلیمان افریقی نے جو گزشتہ سال مدینہ منورہ میں بھی میرے ساتھ رہے یہ خواب دیکھا کہ ''ان کو زیارت مدینہ پاک کا اشتیاق ہو رہا ہے اور وہاں کی حاضری کے شوق میں چل رہے ہیں۔ جب اس سیہ کار کے مکان کے قریب پہنچے تو میرے مخلص مولوی یونس صاحب مدرس حدیث مظاہر علوم میرے گھر سے نکل رہے تھے۔ ان کے دریافت کرنے پر کہ کہاں جا رہے ہو، انہوں نے کہا کہ مدینہ پاک جا رہا ہوں۔ مولوی یونس نے کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچے گھر میں تشریف فرما ہیں۔''

''جب وہ کچے گھر میں آئے تو دیکھا کہ سیّد الکونین فخر الانبیاء والمرسلین اس چارپائی پر لیٹے ہیں جس پر یہ ناکارہ لیٹتا ہے اور یہ سیہ کار چارپائی کے قریب بیٹھا ہوا جزء حجۃ الوداع سنا رہا تھا۔ مولوی سلیمان نے سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور حضور مصافحہ فرما کر بھی جزء حجۃ الوداع سننے میں مشغول ہو گئے ﷺ''

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تسلیما کثیرا۔ فللّٰہ الحمد والمنة۔

آپ بیتی نمبر ۵

یا

یادِ ایام نمبر ۴

جس میں

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی سرہٗ نے تقسیمِ ہند کے اہم واقعات، اکابرِ سلسلہ کے متفرق حالات، نسبت کی اقسام اور خلافت و بیعت سے متعلق اہم مضامین درج کرائے ہیں۔

ناشر

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْم ط

جیسا کہ اس سے پہلے نمبروں میں گزر چکا کہ اس کے ہر حصہ کے اندر دو باب تجویز کیے گئے ہیں، اسی طرح اس حصہ میں بھی دو باب ہیں، پہلے باب میں تقسیم ہند سے متعلق عبرت آموز واقعات اور مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے معمولات اور دوسرے باب میں اکابر مشائخ کے متفرق حالات اور نسبت صوفیہ کی اقسام اور طریق باطن سے متعلق اہم مضامین درج کیے گئے ہیں۔

اس سلسلہ کا آخری مضمون بہت ہی اہم ہے اور نہایت ہی اہتمام سے مطالعہ اور محفوظ رکھنے کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان مضامین کو دوستوں کے لیے خیر و برکت کا سبب بنائے۔

محمد زکریا عفی عنہ،

۲۹ شوال ۹۱ھ

باب ہفتم

تقسیمِ ہند

تقسیم ہند کا زور وشور تو کئی سال سے روز افزوں تھا، دن ورات جلسے جلوس نعرے اور شور و شغب ہروقت رہتا تھا، کانگریس کا پلّہ اس نوع میں زیادہ غالب تھا اور مسلم لیگ کا مغلوب تھا، جو شخص مسلم لیگ سے ذرا بھی تعلق رکھتا یا کانگریس کے ساتھ خصوصی تعلق کا اظہار نہ کرتا تو ٹوڈی، انگریزوں کا نمک خوار اور ان کا پٹھو، غلام کے نعروں سے علی الاعلان مطعون کیا جاتا اور کانگریس والے مسلم لیگ کی نگاہوں میں کانگریس کے غلام اور ان کے زرخرید وغیرہ وغیرہ الفاظ سے یاد کیے جاتے۔ ایک دوسرے کی تفسیق تضلیل ایسی برملا ہورہی تھی کہ کچھ انتہا نہیں۔ اسی سے متاثر ہوکر اس ناکارہ نے رسالہ ''الاعتدال'' لکھا تھا جو دونوں طبقوں میں پسند کیا گیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے سفری بیگ میں تو مستقل رہتا تھا اور حضرت تھانوی قدس سرہ، کی مجلس میں بھی اس کا ذکر تذکرہ میں نے سنا مگر صحیح الفاظ نہیں پہنچے۔ اس لیے نقل نہیں کرتا۔ البتہ دونوں طبقہ کے سنجیدہ حضرات، اکابر سیاستدانوں نے بہت پسندیدگی کا اظہار کیا اور سینکڑوں خطوط اس کے سلسلہ میں آتے رہے۔ یہ ناکارہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد سے عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصرار پر اکثر پورا رمضان نظام الدین اعتکاف میں گزارتا تھا، لیکن ۶۴ھ کے رمضان کا نصف حصہ سہارنپور گزارا۔ لیگیوں کا یہ نعرہ پاکستان لے کر رہیں گے، مر کرلیں گے، مار کرلیں گے، خون سے لیں گے، ہر جلوس کا نعرہ تھا۔ لیکن رمضان کی راتوں میں تراویح کے بعد سے لے کر سحر تک یہ نعرے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ میں نے بہت سے لوگوں سے منع کرایا اور بار بار کہلوایا کہ رمضان مبارک کی یہ راتیں اجابت دعاء کی ہیں، اس کے درمیان میں تم پاکستان ضرور مانگو، مگر مار کر، مر کر خون سے نہ مانگو۔ لیکن ایک جوش اور خمار سوار تھا۔ حدیث پاک میں آتا ہے اپنی اولاد اور مال کو بددعائیں نہ دیا کرو۔ اللہ جل شانہٗ کے لیے بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں جس میں جو مانگو وہ ملتا ہے ''فان للّٰہ ساعات لا یرد فیھن سائلا'' یہ مضمون متعدد الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ مشکوٰۃ شریف میں بروایت مسلم حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا کہ اپنے نفسوں پر بددعائیں نہ کرو اور اپنے مال واولاد پر بددعائیں نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری بددعاء ایسے وقت میں ہو جس میں اللہ جل شانہٗ تمہاری دعائیں قبول فرمالے۔ عورتوں میں یہ مرض بہت ہی زیادہ ہے کہ بچوں کے رونے، پریشان کرنے پر اول تو وہ ان بچوں کو بددعائیں دیتی ہیں کہ تو مرجا، گڑ جا اور

جب وہ بد دعائیں قبول ہو جاتی ہیں تو پھر خود ہی روتی پھرتی ہیں۔

ماثور دعاؤں کی اہمیت:

میں تو دعاؤں میں بھی ہمیشہ اسباق کے اندر اس کی تاکید کرتا رہتا ہوں کہ دعائیں بھی ماثور و منقول مانگا کرو، اس لیے کہ حدیث پاک میں کوئی دین و دنیا کی ضرورت ایسی نہیں چھوڑی جس کو مانگ کر بتایا نہ گیا ہو، ایک قصہ غیر متعلق سا اس کے مناسب لکھواتا ہوں جو بڑوں سے بار بار سنا اور میں بھی اپنے اسباق میں کثرت سے اس کو نقل کرتا ہوں کہ دعائیں اپنے الفاظ میں نہ مانگا کرو، بلکہ آقاء نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ میں مانگا کرو، ایک تو محبوب کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی مالک کے یہاں قدر بہت زیادہ ہے اور وہ الفاظ اس قدر جامع ہوتے ہیں کہ ان میں مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک گاؤں کا کوئی ڈوم تھا، پیدل چلا جا رہا تھا، راستہ میں تھک گیا اور یہ کہتا جا رہا تھا کہ یا اللہ ایک گھوڑا چاہیے اور بے تحاشہ اضطرار کے ساتھ یہی دعاء مانگ رہا تھا اور آخر میں بے وقوف نے غصہ میں آ کر یہ کہہ دیا کہ یا اللہ گھوڑا نہیں تو گھوڑے کا بچہ ہی دے دے، مالک کے یہاں اضطراری دعاء بہت جلد قبول ہوتی ہے، میرا اپنی ذات کے لیے بھی بیسیوں دفعہ کا یہ تجربہ ہے کہ جو دعاء اضطراری طور پر مانگی گئی ہے وہ بہت جلد قبول ہوتی ہے، اس گاؤں کا ججمان اپنی گھوڑی پر سوار آ رہا تھا اس کی گھوڑی راستہ میں بیا گئی اور بچہ کو لے جانا اُس کے لیے مصیبت بن رہا تھا، اُس نے گاؤں کے اس ڈوم کو دیکھ کر آواز دی ''او ڈوم کے'' اس گھوڑی کے بچہ کو اپنے کاندھے پر اُٹھا لے۔ وہ بے چارہ چلنے سے معذور تھکا ہوا تھا، بہت ہی حسرت سے کہنے لگا کہ ''یا اللہ مانگی تھی تلے کو مل گئی اُوپر کو۔''

اس لیے میں اپنے دوستوں سے بہت اہتمام سے اور ان کے توسط سے ان کی مستورات سے تاکید کرتا ہوں کہ غصہ کے اندر اپنی اولاد کو مار تو جتنا چاہے لیں مگر بد دعائیں نہ دیا کریں۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک ہو سکتا ہے ماثور دعاؤں کا اہتمام کیا کریں۔

تقسیم کا اثر دین اور علم پر:

بہر حال لیگیوں کی دعائیں قبول ہوئیں اور ہندوستان تقسیم ہوا، لیکن وہی ہوا جو رمضان المبارک کی راتوں میں مانگا تھا، مار کر، مر کر اور خون بہا کر پاکستان لیا، اس زمانے کے بھی واقعات بڑے اہم اور بہت کثرت سے ہیں، میرے دو اکابر حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نور اللہ مرقدہما مختلف الرائے تھے اور جو لوگ دونوں سے تعلق رکھتے تھے ان کے

لیے مشکل مسئلہ تھا، مولوی منفعت علی صاحب وکیل مرحوم جن کا تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہوکر کراچی میں انتقال ہوا اللّٰھم اغفرہٗ وارحمہ میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے مخصوص شاگرد تھے، ان کا تذکرہ طلب علم کے سلسلہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ ابتداءً میرے والد صاحب کے نہایت معتقد اور مخلص دوست اور اس وجہ سے مجھ سے بھی بے حد بے تکلف اور خصوصی تعلق رکھتے تھے، اس کے بعد حضرت تھانوی سے بیعت ہوئے اور حضرت کے مخصوص خدام میں شامل ہو گئے سہارنپور کی مسلم لیگ کے روح رواں اور غالباً صدر بھی رہے، مسلم لیگ میں بڑا غلو رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک مرتبہ ایک پرچہ لکھا کہ میں کسی اشاعت یا بیان کے واسطے نہیں پوچھتا صرف اپنی طمانیت قلب اور اس تعلق کی وجہ سے جو مولانا مرحوم (میرے والد صاحب) کو مجھ سے رہا ہے تقسیم کے بارے میں تیری رائے پوچھنا چاہتا ہوں۔ بہت راز میں ہے کسی سے کہوں گا نہیں۔ بہت مختصر الفاظ میں تحریر فرمادیں۔ میرا دل تو چاہا کہ ان کو یہ لکھ دوں کہ زبانی گفتگو کرو مگر میں نے سوچا کہ زبانی میں نہ معلوم میری طرف سے کیا سمجھیں اور کیا نقل کریں۔

میں نے ان کو مختصراً الفاظ میں لکھا کہ یہ ناکارہ سیاست سے بالکل واقف نہیں، اس کو سیاسی حضرات جانیں، لیکن اتنا میرے ذہن میں ضرور ہے کہ دوآبہ یعنی گنگا جمنا کا درمیانی حصہ جو حضرت گنگوہی، نانوتوی اور تھانوی کی برکات سے دین اور علم وسلوک وتقویٰ کا مرکز بنا ہوا ہے کہ دنیا میں آج اس کی نظیر نہیں وہاں تو یہ برکات صرف تلوار کے زور سے مٹادی جائیں گی اور جو حصہ پاکستان کا تجویز ہے اس میں ان اکابر کی نہ نظیر ہے نہ پیدا ہو سکتی ہے، جن سے مراکز دینیہ مدارس عربیہ، مکاتب قرآنیہ اس نمونے کے قائم ہو سکیں۔

چنانچہ وہی ہوا کہ اللہ کے فضل وکرم سے دیوبند اور سہارنپور کے مدارس کی صورت تو اگرچہ باقی ہے مگر پنجاب، سندھ، بنگال وغیرہ کے طلبہ کی آمد یہاں بند ہو گئی اور ان کے علاوہ مشرقی پنجاب کے سینکڑوں مدارس جو نہایت ہی اخلاص کے ساتھ یکسوئی کے ساتھ حضرت رائے پوری اور ان کے مرشد اعلیٰ حضرت رائے پوری دونوں کی برکات سے دین کا کام انجام دے رہے تھے وہ سب نیست ونابود ہو گئے۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

دورانِ قیام نظام الدین کے تقسیم کے موقع کے واقعات تلاشی وغیرہ:

اس ناکارہ کا معمول چچا جان نوراللہ مرقدہٗ کے بعد سے اکثر پورا رمضان نظام الدین گزارنے کا تھا۔ جیسا کہ ابھی لکھوا چکا ہوں۔ تقسیم والے سال حسب معمول ۲۹ شعبان ۶۶ھ مطابق ۱۹ جولائی ۴۷ء بروز شنبہ دہلی روانہ ہوا اور بعد ظہر دہلی پہنچا اور عصر کے وقت نظام الدین پہنچا۔ چونکہ

۲۹ تاریخ تھی اس لیے حسبِ معمول عصر کی نماز پڑھ کر ایک ماہ کے لیے اعتکاف کی نیت سے چچا جان کے معتکف میں بیٹھ گیا۔ اسی رمضان المبارک کی ۲۷ شبِ قدر میں ۱۲ بجے ۱۵ اگست کو مجوزہ تقسیم کا اعلان ہوا اور اس شب میں مولانا منظور نعمانی نے خوب زور دار دعائیں رو رو کر کرائیں کہ ان کا قیام بھی اس زمانے میں نظام الدین میں تھا اور بھی بہت سے اہل خیر حضرات کا قیام اس رمضان میں وہاں رہا۔ مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نے بھی یہ رمضان وہیں گزارا۔ کشت و خون، قتل وغارت گری، لوٹ مار کا سلسلہ بنگال، بہار میں تو کئی ماہ پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا اور روز افزوں تھا۔ تقسیم کے بعد ہندو پاک میں وہ خون کی ندیاں بہیں کہ الامان والحفیظ، ان کی تفصیل نہ تو میرا موضوع ہے اور نہ اس کی ہمت ہے۔ قرآن شریف اور احادیث پاک میں قیامت اور حشر کا جو منظر پڑھا تھا:

''یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ''

(ترجمہ) ''یاد کرو اس دن کہ آدمی بھاگے گا اپنے بھائی اور ماں باپ اور بیوی اور اولاد سے اور ہر شخص کے لیے ایک خاص حالت ہوگی، جس کی وجہ سے وہ ہر شخص سے بے تعلق ہوگا۔''

یہ سب منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ نظام الدین سے اسپیشل تبادلۂ آبادی کے سلسلہ میں مغرب کے بعد روانہ ہوا کرتا تھا اور ظہر کے بعد نظام الدین کی مسجد اس قدر بھر جاتی تھی کہ مسجد کے باہر بھی دور دور تک آدمی ہی آدمی ہوتے تھے اور عصر کے بعد بالکل خالی ہو جاتی اور ایک ہُو کا عالم ہوتا تھا۔ اسپیشل کی روانگی کے بعد اسّی (۸۰) اسّی (۸۰) شیر خوار بچے اسٹیشن پر پائے گئے جن کو ان کے ماں باپ اسٹیشن پر چھوڑ کر ریل میں سوار ہو گئے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ ان بچوں کو کہاں چھوڑ رہے ہو تو وہ نہایت بیدردی سے جواب دیتے کہ اگر صحیح سلامت پاکستان پہنچ گئے تو وہاں اور پیدا ہو جائیں گے۔ اس بوجھ کو کہاں اُٹھائیں گے۔ اسپیشل پر فوجی پہرہ بھی ہوتا تھا اور ہتھیاروں سے مسلح ہوتے تھے۔ مگر:

وہی قاتل وہی مخبر وہی منصف
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

دونوں طرف کی ہوا اس قدر خراب تھی کہ جو پولیس والے محافظ بن کر یہاں یا وہاں جاتے تو پیش قدمی نہ سہی مگر چشم پوشی خوب کرتے تھے چنانچہ اسپیشلوں پر خوب حملے، لوٹ مار ہوتی۔ ۲۲ ستمبر کو جانے والا اسپیشل آٹھ دن میں لاہور پہنچا اور اس پر خوب قتل و غارت ہوا۔ گائے، بھینس، بکریاں، مرغیاں اپنے اپنے گھروں میں بلا کسی انتظام کے ویسے ہی چھوڑ جاتے تھے خواہ بھوکے

مریں یا کوئی دوسرا درندہ کھا جائے۔ جو دیندار کہلاتے تھے وہ نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں چھوڑ جاتے تھے۔ چار ماہ تک تقریباً یہ ناکارہ بھی نظام الدین میں گویا محبوس رہا۔ دہلی سے راشن لانا تو مصیبت عظمیٰ تھا۔ یہ جانور کاٹ کاٹ کر بغیر روٹی غلہ کے بقرعید کی طرح سے کھائے۔ کیونکہ دہلی کے راستے بالکل مخدوش اور مسدود تھے اور راشن سبزی منڈی میں ملتا تھا۔ جہاں سکھ ہی سکھ تھے۔ کسی کی بھی ہمت ہم لوگوں میں سے وہاں جانے کی نہیں ہوتی تھی۔ مگر ہمارے الحاج بابو ایاز صاحب اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی ہمت اور قوت عطاء فرمائے وہ اسی حال میں وہاں سے راشن لایا کرتے تھے۔ مگر راشن پندرہ آدمیوں کا اور مستقل رہنے والا مجمع پانچ سو کے قریب تھا۔ لیکن بچوں کے لیے وہ راشن کام دے دیتا تھا۔ ان کے اس طرح جانے پر سب لوگ حیرت کرتے تھے۔

ایک دفعہ وہ سبزی منڈی سے راشن لے کر نظام الدین آرہے تھے وہاں سے ایک تانگہ لیا۔ اس میں ایک بابو جی اور تین سکھ۔ دلی سے نکل کر ان سکھوں نے کہا کہ تو ہمارے بیچ میں کیسے بیٹھ گیا اور اگر ہم تجھ کو ختم کر دیں تو پھر کیا ہو۔ انہوں نے نہایت جوش اور جرأت و بے باکی سے یہ کہا کہ تم مجھے ہرگز نہیں مار سکتے اور ہمت ہو تو مار کر دکھلا دو۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ آپس میں کچھ اشارے کنائے بھی ہوئے اور آستینیں سونت کر کہنے لگے کہ ہم کیوں نہیں مار سکتے؟ انہوں نے اس سے زیادہ جوش سے کہا کہ میرے پاس ایک چیز ہے تم میرے مارنے پر قادر ہی نہیں ہو سکتے۔ وہ اللہ کے فضل و کرم سے کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ نظام الدین تک سوچتے ہی رہے اور اشارے بھی کرتے رہے۔ ان سے اترتے وقت پوچھا کہ تم وہ چیز بتلا دو کیا ہے۔ بابو جی نے کہا وہ چیز بتلانے کی نہیں ہے اور باقی تم دیکھ چکے کہ تم لوگ باوجود ارادے کے مجھے مار نہ سکے اس ناکارہ نے جب ان سے پوچھا کہ وہ کیا بات تھی انہوں نے فرمایا کہ آپ نے ہی تو مجھے ایک دعاء بتلا رکھی ہے۔ ’’اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ‘‘ میں یہ پڑھتا تھا۔ میں یہ سوچتا ہی رہا کہ بتلانے والے پر تو اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور یہ اس سے کس قدر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بہت ہی غیرت آئی۔ اعتقاد کی قوت کی بات ہے۔ واقعی ہے اس میں نہ ذرا تردد ہے اور نہ ذرا شک کہ اللہ تعالیٰ کے پاک کلام میں اس سے زیادہ قدرت اور قوت ہے۔ بشرطیکہ ہم میں جوش ایمانی ہو۔ میں پہلے کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ میرے چچا جان نے ایک بیمار کے لیے ایک دعاء لکھ کر مجھے حکم فرمایا تھا کہ فلاں شخص پر یہ دعاء پڑھ کر دم کر دیا کرو اور اس سے اگر وہ اچھا نہ ہوا تو اس کا مر جانا بہتر ہے۔ اس موقع پر تو واقعی قرآن پاک اور احادیث کی دعاؤں کا اس قدر تجربہ ہوا کہ کوئی حد نہیں۔ اللہ جل شانہٗ اس زمانے کا سا اعتقاد اور دعاؤں پر یقین بغیر فساد و ہنگامہ کے اب بھی نصیب فرما دے تو اس کا کرم ہے۔ میرا اپنا بھی بہت سی چیزوں کا تجربہ ہے۔ تلاشی مکان کی اور

مسجد بنگلہ کی اس زمانے میں خوب ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ بہت بڑی گورکھا فوج ہتھیاروں سے مسلح نہ معلوم ان بیچاروں کو کیا غلط روایات پہنچی تھیں کہ وہ سب آئے یہ سیاہ کار مسجد میں تھا۔ ”وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ“ یہ آیت اتنی کثرت سے زبان پر بے اختیار جاری ہوئی کہ تعجب ہوا۔ دس پندرہ آدمی اور نیچے چھتوں پر تلاشی لیتے رہے۔ مگر کسی چیز کو چھیڑا تک نہیں۔ معلوم نہیں کہ نظر نہیں آئی یا کوئی اور بات پیش آئی۔ کئی مرتبہ نظام الدین کی مسجد بنگلہ (مرکز تبلیغ) پر حملہ کی موثق روایات سننے میں آئیں۔ مگر ہر مرتبہ میں اللہ جل شانہ نے اس قدر مدد فرمائی کہ مغرب کے وقت سے جو بارش اور اولوں کا زور شروع ہوتا تھا تو سارے راستے مسدود ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں ایک عجیب واقعہ سُننے میں آیا تھا۔ اللہ جانے کیا حقیقت تھی۔ ایک فسادیوں کا ہجوم بھوگل کی طرف سے حملہ کے لیے آیا۔ لیکن ایک دم ہی بھاگ گیا لوگوں نے ان سے پوچھا کہ کیا بات پیش آئی انہوں نے کہا کہ یہاں کے زندہ تو زندہ مردے بھی لڑتے رہتے ہیں اور مقابلہ کے لیے تیار ہیں۔ ان لوگوں نے بیان کیا کہ جب ہم مسجد بنگلہ کے قریب پہنچے تو قبروں سے مردے اٹھتے ہوئے نظر آئے اس لیے ہم واپس ہو گئے۔ یہ میں نے ایک ہی قصہ لکھوایا۔ اس قسم کے بہت سے قصے ہیں معلوم نہیں کہ یہ قصے لکھوانے کے بھی ہیں یا نہیں۔

جب یہ ناکارہ اخیر شعبان میں نظام الدین گیا تو گرمی کا زمانہ تھا۔ صرف ایک کرتہ، پائجامہ لنگی ساتھ تھی۔ اس زمانے میں میرا دستور یہی تھا کہ جمعہ کے دن لنگی باندھ کر دھونے والوں کو کپڑے دے دیے اور دھونے والے آپس میں لڑتے بھی خوب تھے کہ کون دھوئے اس لیے بھی کوئی اشکال نہ ہوتا تھا دو تین گھنٹے میں سوکھ گئے تو پہن لیے۔ اس لیے استعمال کا کوئی کپڑا ان تین کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ چار ماہ وہاں محبوس رہنا پڑا۔ اس میں خوب سردی آ گئی، کپڑا خریدنے کا کہاں موقع تھا کہ دہلی آنا تو بہت خطرناک تھا میرے مخلص دوست صوفی اقبال ہوشیار پوری ثم الباکستانی ثم المدنی بھی میرے ساتھ محبوس تھے وہ میری سردی کو محسوس کر کے ایک فوجی سے دو روپے میں ایک سوئٹر خرید کر لائے تھے۔ میں سوئٹر پہننے کا نہایت مخالف تھا، بلکہ مجھے اس سے نفرت تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی نہ پہنا اور نہ اپنے بچوں کو پہنایا۔ مگر مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے۔ میں نے اس کو پندرہ برس تک پہنا۔ اس کے بعد میرے ایک دوست مرحوم وہ کئی سال سے مجھ سے مصر تھے کہ اس سوئٹر کا قصور معاف کر دو اور یہ بطور تبرک مجھے دے دو میں اس کو اپنے کفن میں رکھوالوں گا اور میں ان سے یہ کہتا کہ دو روپے کا جب مجھے اور ملے گا تب دوں گا۔ مگر دو روپے کا کہیں نہیں ملتا تھا۔ پندرہ برس کے بعد انہوں نے ایک نیا سوئٹر مجھے لا کر دیا اور کہا واقعی دو روپے کا لایا ہوں۔ مجھے یقین

تو نہ آیا۔ مگر میں نے دو روپے اور اپنا سوئٹر ان کے حوالے کر دیے۔ اس کے بعد سے اپنا قدیم لباس روئی کی کمری گویا چھوٹ ہی گئی اور پھر تو سوئٹر علماء حضرات کے طبقہ میں بھی استعمال ہونے لگا۔

ایک عجیب واقعہ اس زمانے میں پیش آیا۔ میرا معمول ہمیشہ ۲۹ شعبان کو جا کر پورے ماہ کا اعتکاف کر کے نظام الدین میں عید کی نماز سویرے سے پڑھ کر وہاں چلنے کا تھا اور شام تک سہارنپور پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اس سال کچھ تو ہنگاموں کی خبروں سے اور کچھ عزیز ہارون سلمہٗ کی والدہ کی شدت علالت کی وجہ سے کہ اس کی حالت ایسی تھی کہ ہر روز گویا آخری دن تھا۔ مجھے دو تین دن کی تاخیر ہوئی، یہاں سب کو بہت فکر ہوئی۔ میرے عزیز الحاج ماسٹر محمود الحسن صاحب کاندھلوی جو اس زمانے میں اسلامیہ اسکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے اور کبھی کبھی پرنسپل بھی ہوتے تھے جن کی سفارش کا قصہ امتحان کے سلسلہ میں پہلے بھی لکھوا چکا ہوں وہ بھی میری تاخیر کی وجہ سے میرے حال کی تحقیق کرنے کے لیے نظام الدین پہنچے اور ان کے ساتھ میرا مخلص دوست اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کا جانثار مولوی عبدالمجید مرحوم جلالوی بھی تھا جو میرے یہاں مستقل رہتا تھا۔ بہت ہی محبت و اخلاص والا تھا، اس کی حضرت مدنی کی جانثاری کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ جب وہ افواہاً بھی یہ سن لیتا کہ حضرت دیوبند یا لکھنؤ سے رات کو آنے والے ہیں تو رات بھر اسٹیشن پر گزارتا اور ہر گاڑی دیکھتا اور اللہ تعالیٰ اس کو بہت جزائے خیر دے۔ جب حضرت قدس سرہٗ کے اسٹیشن پر آنے کے بعد اگر دو گاڑیوں میں ایک گھنٹہ کا بھی فصل ہوتا تو وہ واپسی کا تانگہ اسٹیشن سے کر کے مجھے سوتے ہوئے کو اٹھاتا اور یوں کہتا کہ حضرت تشریف لے آئے گاڑی میں اتنی دیر ہے میں واپسی کا تانگہ لے آیا ہوں۔ پھر مجھے نہ جانے کا کیا عذر تھا۔

ایک دفعہ مرحوم کی میں تو حماقت ہی کہوں گا مگر محبت میں حماقتیں ہو ہی جاتی ہیں رات کو حضرت مدنی قدس سرہٗ تشریف لائے اور دوسری گاڑی میں ایک گھنٹہ کا فصل تھا۔ اس نے تانگہ والے سے کہا کہ جلدی چل، آنا جانا ہے، جو تو کہے گا وہ دوں گا۔ تانگہ والے نے ایک روپیہ بتایا، اس نے کہا کہ میں ایک کی جگہ پانچ دوں گا جلدی لے چل۔ وہ تانگے والا پانچ منٹ میں میرے گھر لایا اور گھوڑا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا بلکہ ہونک رہا تھا مجھے بہت ہی غصہ آیا اور غصہ میں جی چاہا کہ جانے سے انکار کر دوں۔ مگر حضرت قدس سرہٗ کو چونکہ وہ لانے کی اطلاع کر کے آیا تھا۔ اس لیے جانا پڑا اور روپے بھی مجھے بھگتنا پڑے۔

بھائی محمود اور مولوی عبدالمجید صاحب ۳ شوال کو میری خبر لینے کے واسطے ساڑھے چار بجے والے ایکسپریس سے دہلی پہنچے۔ گھورا گھاری تو اس گاڑی پر بھی ہوئی اور ان کے ڈبے کو بھی فسادیوں نے گھورا اور نعرے بھی لگائے۔ اس کے بعد جو گاڑی چھ بجے سہارنپور سے چلی اس پر

دورالہ کے اسٹیشن پر قتل عام ہوا اور اس کے بعد سے سہارنپور تا دہلی کا راستہ گویا بالکل بند ہو گیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ جب دیو بند سے دہلی جاتے اور بار بار جانا پڑتا تھا تو دیو بند سے سہارنپور آتے یہاں سے مراد آباد جاتے۔ وہاں سے مختلف راستوں سے دہلی آتے جو راستے فی الجملہ نسبتاً مامون تھے۔ عزیز عبد المجید مرحوم کے نام کے ساتھ اس کا اور قصہ حماقت کا لکھوادوں۔ نظام الدین کے چار ماہہ جس میں پان بالکل نہیں ملتا تھا۔ عزیز ان مولوی یوسف وانعام اور بہت سے مقیمین پان کے مجھ سے بھی زیادہ عادی تھے۔ لیکن پان نہ ملنے کی وجہ سے چھالیہ چونا کتھا کھالیتے تھے۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا اس لیے تقریباً چھوٹ ہی گیا تھا۔ عزیز عبد المجید اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے اور مجھے بھی۔ اس نے پانچ روپے میں ایک دیسی پان ایک سکھ سے دہلی سے منگایا تھا۔ اس پر مجھے تانگہ والے قصے سے بھی زیادہ رنج وقلق ہوا۔ مگر ''حب الشیٔ یعمی و یصم'' جب بھائی محمود صاحب کو اس پان کی خبر ہوئی تو انہوں نے مولوی عبد المجید مرحوم کے ہاتھ سے لے لیا اور ان کو بھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ نہ خود کھایا نہ کسی اور کو دیا۔ میں نے بہت ہی اصرار کیا کہ مولوی یوسف صاحب کو آدھا پان دے دو مگر وہ نہ مانے اور پان کے ذرا ذرا سے تعویز کے سے ٹکڑے کر کے اس پر کتھا چونا لگا کر دو تین ٹکڑی روزانہ مجھے کھلاتے تھے۔ شاید آٹھ دن میں ختم کیا۔ گویا پانچ روپے وصول کرادیے۔ چونکہ ڈاک بھی اس زمانے میں بند ہو گئی تھی، آمد ورفت کا تو ذکر ہی کیا، اس لیے میرے ایک داماد مولوی سعید الرحمٰن مرحوم کا کاندھلہ میں انتقال ہوا۔ اس کی اطلاع مجھے دو ماہ بعد ملی۔

ایک صاحب جن کا نام لکھنا مناسب نہیں، تقسیم سے بہت پہلے حضرت اقدس رائے پوری ثانی قدس سرہٗ سے بیعت تھے اور پٹیالہ میں ملازم تھے۔ ان کی رائے پور کثرت سے حاضری ہوتی تھی اور جب وہ رائے پور جاتے تو راستہ میں ایک شب میرے پاس ضرور قیام فرماتے۔ ایک مرتبہ رائے پور جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں فلاں اسکول میں ملازم تھا۔ تیری ''حکایاتِ صحابہ'' پڑھ کر میں نے اسکول سے استعفاء دے دیا۔ مجھے بہت ہی غصہ آیا، اس لیے کہ میں تاوقتیکہ دوسری صورت معاش کی پیدا نہ ہو استعفاء دینے کا بہت مخالف ہوں، میں نے ان سے کہا کہ ''حکایات صحابہ'' میں کہیں بھی اس قسم کا مضمون نہیں مل سکتا، آپ کتاب لائیے اور مجھے دکھائیے کہ کہاں لکھا ہے۔ جب میں نے زور اور ڈانٹ کر کہا تو انہوں نے کہا کہ اس میں تو نہیں لکھا مگر مجھ پر اس کا یہی اثر ہوا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ جب میری کتاب سے یہ اثر ہوا کم از کم مجھ سے دریافت تو کر لیتے۔ ابھی واپس جاؤ اور استعفاء واپس لو، انہوں نے کہا کہ استعفاء تو منظور ہو چکا ہے اب واپسی کی کوئی شکل نہیں، ان کو چونکہ تبلیغ سے اور نظام الدین سے بھی تعلق تھا اس لیے میں نے ان کو مشورہ دیا کہ رائے پور جاؤ، آٹھ دس دن قیام کے بعد نظام الدین چلے جانا اور وہیں

مستقل قیام کرنا اور ہر ماہ میں چار پانچ یوم کے لیے رائے پورآجایا کرو اور حضرت رائے پوری سے بھی میرا یہ مشورہ نقل کردینا۔ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا زمانہ دیکھنے والے تو ابھی ہزاروں موجود ہیں کہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں اس سیہ کار کی رائے اگر حضرت کی رائے کے خلاف بھی ہوئی تب بھی وہ اس پر اس قدر پسندیدگی کا اظہار فرماتے کہ گویا یہی حضرت کی بھی رائے ہے۔ حضرت نے اس تجویز کو معلوم نہیں دل سے یا میری دلداری سے بہت پسند فرمایا، ان کا عرصہ تک یہی معمول رہا۔ تقسیم کے زمانے میں وہ بھی نظام الدین میں محبوس تھے۔

اس زمانے کا عام دستور یہ تھا الا ماشاء اللہ کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے جو کوئی پاکستان جانے کی اجازت مانگتا تو خود اس پر ناراض ہوتے اور فرماتے کہ تم موت سے ڈرکر جاتے ہو، موت کا وقت مقرر ہے، وہ نہ ہندوستانیوں کو چھوڑے گی نہ پاکستانیوں کو اور اس سیہ کار سے جو اجازت لیتا، میں خوشی سے اس کو اجازت دے دیتا۔ اس زمانے میں نظام الدین کی مسجد جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے ظہر سے بھرنا شروع ہوئی اور عصر تک خالی ہوجاتی کہ اسپیشل مغرب کے بعد روانہ ہوتی تھی۔ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صبح سے شام تک ممبر پر تقریر کرتے رہتے اور اللہ پر اعتماد موت کے ڈر سے فرار کی ندامت وغیرہ اُمور کو بہت ہی جوش سے بیان فرمایا کرتے تھے اور جب کسی ضرورت سے مولانا مرحوم منبر سے اُتر جاتے تو یہ مولوی صاحب موصوف فوراً منبر پر پہنچ جاتے اور مولانا مرحوم سے بھی زیادہ زوردار انداز میں ان کے مضمون کو واضح کرتے اور پاکستان نہ جانے پر زور دیتے اور جب مولانا مرحوم آتے تو یہ صاحب منبر سے اُتر جاتے۔

ایک مرتبہ مولانا یوسف صاحب ظہر کی نماز پڑھتے ہی کسی ضرورت سے گئے اور ان صاحب نے فوراً منبر پر جاکر نہایت شدت سے حسب معمول تقریر شروع کی میں بھی مولوی یوسف مرحوم کے حجرے میں بیٹھا سن رہا تھا اور مولانا یوسف صاحب مرحوم جب منبر پر پہنچ گئے تو یہ صاحب منبر سے اُتر کر فوراً حجرے میں آئے اور آتے ہی مجھ سے کہا کہ آپ مجھے اجازت مرحمت فرمادیں، میں پاکستان جانا چاہتا ہوں، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ابھی تو کتنے زورشور سے تقریر کی اور اب پاکستان جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ میں نے اپنی عادت کے موافق کہہ دیا کہ شوق سے چلے جائیں۔ کہنے لگے میں حضرت جی (مولانا محمد یوسف صاحب) کی زبان سے اجازت چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ میری اجازت حضرت جی ہی کی اجازت ہے۔ شوق سے چلے جاؤ، انہوں نے نہایت زور سے اور بہت گھبرائی ہوئی صورت میں یوں کہا کہ حضرت آج ہی اسپیشل سے جانا ہے اور حضرت جی کی زبان سے اجازت چاہتا ہوں۔ میں نے مولانا یوسف صاحب کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ ایک منٹ کو میری ایک بات سن لیں تقریر ختم نہ کریں۔ وہ مرحوم میرے اس نوع

کے نازیبا احکام کو بہت وقعت اور دل سے قبول کیا کرتے تھے، وہ لوگوں سے کہہ کر بیٹھے رہیں میں ابھی آتا ہوں، بھائی جی نے بلایا ہے ایک دم منبر سے اُتر کر آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی یہ جانا چاہتے ہیں میں نے ان کو اپنی اور تمہاری طرف سے اجازت دے دی۔ مگر یہ تمہاری زبان سے اجازت مانگتے ہیں۔ مرحوم نے بہت ہی غصہ سے کہا کہ بھائی جی کی اجازت کے بعد میری اجازت کی کیا ضرورت ہے شوق سے چلے جاؤ۔ اس کے بعد مرحوم اپنی تقریر میں چلے گئے اور ان صاحب سے میں نے کہا کہ اللہ حافظ!

وہ اسی وقت نظام الدین کے بہت سے خواص کو بہت اہتمام سے جمع کر کے مسجد سے باہر نیم کا درخت ہے اس کے نیچے لے گئے جہاں بابو ایاز صاحب کا ہوٹل ہے اور جا کر بہت زوردار تقریر جتنی اُوپر مسجد میں منبر پر لوگوں کو روکنے کے لیے کر رہے تھے اس سے زیادہ زوردار اب لوگوں کو جانے پر آمادہ کرنے کے لیے کی اور کہا کہ حضرت جی (مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) تو حضرت شیخ کی وجہ سے مجبور ہیں اور حضرت شیخ محض شہادت کے شوق میں یہاں پڑے ہوئے ہیں اور ان کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہاں اب دین کا کام کوئی نہیں ہوسکتا اور ان قبروں کی پرستش یا حفاظت ہمارا کام نہیں ہے۔ بہت ہی انہوں نے ترغیبیں دیں مگر خواص میں سے تو کوئی راضی نہ ہوا، عوام کچھ ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔ یہ مسئلہ بھی تین چار ماہ تک بہت ہی معرکۃ الآراء رہا کہ پاکستان جانے والے احباب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر بہت ہی شدید اصرار کرتے تھے، بعض اکابر تو روزانہ پچیس تیس ہوائی جہاز لے کر آتے کہ مولانا محمد یوسف صاحب کو مع ان کے گھر والوں کے لے جائیں، ان کا اصرار تھا کہ مسلمان بکثرت وہاں منتقل ہوگئے ہیں۔ اس لیے مولانا یوسف صاحب کا وہاں جانا ان کی دینی اصلاح کی خاطر بہت ضروری ہے، نیز اس وقت یہاں کی جو متزلزل حالت تھی اور یوپی و دہلی کا جو عام انخلاء ہو رہا تھا اس کی وجہ سے یہاں دینی کام کی امیدیں کم معلوم ہوتی تھیں، مگر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک جواب تھا کہا اگر بھائی جی تشریف لے جائیں گے تو میں بھی جاؤں گا ورنہ نہیں۔ ان کی وجہ سے اس سیہ کار پر بھی ہر وقت یورش رہتی۔

دہلی اور اس کے علاوہ کے احباب ہر وقت مصر رہتے کہ یہ ناکارہ بھی جلد پاکستان جانے کا فیصلہ کرلے اور میرا صرف ایک جواب تھا کہ میں جب تک اپنے دو بزرگ حضرت اقدس مولانا مدنی و مولانا رائے پوری نور اللہ مرقدہما سے مشورہ نہ کرلوں اس وقت تک کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ ان دوستوں کا اصرار تھا کہ آپ ایک پرچہ لکھ دیں، ہم ان دونوں بزرگوں سے اجازت منگالیں گے۔ میں کہتا تھا کہ میں اجازت کو نہیں کہا مشورے کو کہا ہے اور وہ زبانی ہوسکتا ہے۔ جب بھی مقدر ہوگا

دونوں سے زبانی بات کر کے رائے قائم کر سکتا ہوں۔ میرے بعض اعزہ کا بھی بہت ہی شدت سے میرے اور مولانا محمد یوسف صاحب کے جانے پر اصرار تھا مگر مجھ سے کہنے کی تو ان لوگوں میں ہمت نہیں پڑتی تھی، لیکن ان جانے والے دوستوں کے ذریعہ سے بہت اصرار کراتے تھے۔ یہ بھی ہر وقت کا ایک مستقل معرکہ تھا اور راستے ہر طرف کے مسدود تھے۔ اس لیے حضرات شیخین مولانا مدنی مولانا رائے پوری نور اللہ مرقدہما سے بات کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

محرم ۶۷ھ کے شروع میں میرے مخلص و محسن مولوی نصیر الدین سلمہٗ جو میری دکھتی ہوئی رگ سے خوب واقف تھے، انہوں نے ایک پرچہ مجھے لکھا جو بڑی مشکلات سے دستی پہنچا۔ جس میں انہوں نے لکھا کہ ''اوجز المسالک جلد رابع کے لیے کاتب مل گیا ہے اور میں نے کام شروع کر دیا ہے اور اس میں آپ کی ضرورت ہے۔'' اوجز جلد رابع کی طباعت تقسیم سے پہلے شروع ہو چکی تھی، میرا بہت سا روپیہ اس کی کتابت اور طباعت کے کاغذ میں خرچ ہو چکا تھا، لیکن تقسیم کے ہنگامے نے اس سب کو غتر بود کر دیا تھا جس کا مجھے بہت قلق تھا اور حالات کے پیش نظر یہ امید بھی نہ تھی کہ اس کی طباعت ہو سکے گی۔ مولوی نصیر کے اس خط پر جو انہوں نے محض دھوکے سے صرف میرے بلانے کے لیے لکھا تھا مجھے واپسی کا تقاضا ہو گیا اور میں نے عزیزم مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے واپسی کی اجازت مانگی۔ مجھے ان کے الفاظ جب یاد آتے ہیں جب ہی چبھتے ہیں۔

انہوں نے آبدیدہ ہو کر کہا بھائی جی! آپ اس حال میں مجھے چھوڑ کر جائیں گے۔ اس وقت میں ایک دوسرا مرحلہ نظام الدین سے دہلی منتقل ہونے کا بھی تھا۔ اس میں حضرت الحاج حافظ فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ پیش پیش تھے اور بلّی ماران میں انہوں نے کئی مکان زنانہ، مردانہ، جماعتوں کے قیام کے واسطے تجویز کر رکھے تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے حافظ صاحب موصوف کے خصوصی تعلقات تھے اس لیے وہ ان پر بہت زور دیتے تھے کہ ہم سب کو دہلی منتقل کرا دیں۔ مولانا مرحوم بھی ہم لوگوں کی حفاظت کی خاطر حافظ صاحب کے ہم خیال تھے۔ مگر جتنی شدت حافظ صاحب کو تھی ان کو نہیں تھی، لیکن حافظ صاحب کے شدید اصرار پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات عطاء فرمائے کئی مرتبہ سرکاری ٹرک لے کر ہم لوگوں کو دہلی جانے کے واسطے نظام الدین پہنچے۔ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے منتقل ہونے کی بالکل نہ تھی۔ کہتے تھے کہ اگر اس کو خالی کر دیا اور اس پر پناہ گزینوں نے قبضہ کر لیا تو پھر یہاں سے منتقل ہونا مشکل ہو جائے گا پناہ گزینوں کا بھی ہر وقت وہاں ہجوم رہتا تھا اور وہ بھی وہاں کے رہنے والوں کو خوب ڈراتے دھمکاتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس اشکال میں مولانا یوسف کے ساتھ تھے کہ دوبارہ قبضہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اس

مرحلہ پر بھی یہ ناکارہ عزیز موصوف کی پشت پناہ بنا ہوا تھا اور حضرت الحاج حافظ فخر الدین صاحب تو بہت اصرار سے حکم فرماتے تھے۔ لیکن اس سیہ کار پر زیادہ زور نہیں دیتے تھے۔ عزیز مرحوم نے میری واپسی کے ارادہ پر یہ بھی کہا کہ آپ کی تشریف بری کے بعد ایسا نہ ہو کہ حافظ صاحب دہلی منتقل ہونے پر بھی اصرار فرمادیں۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ تم میری غیبت میں زور سے کہہ سکتے ہو کہ اتنے زکریا اجازت نہ دے، میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ ایک عجیب بات بڑی حیرت کی تھی جو اب تک سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ یہ کہ شوال ذیقعدہ میں اس قدر نحوست درودیوار پر چھارہی تھی کہ ان کو دیکھ کر بھی ڈر لگتا تھا بہت ہی سوچا کرتا تھا کہ یہ سیاہی کس چیز کی ہے۔ وہاں تو میں نے کبھی کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا البتہ حضرت اقدس رائے پوری سے واپسی پر تذکرہ کیا لیکن شروع ذی الحجہ سے وہ سیاہی دفعۃً کم ہونی شروع ہوئی اور بقرعید کے بعد سے انوارات محسوس ہونے لگے۔ میں نے عزیزم مولانا یوسف صاحب مرحوم کو اس کی وجہ سے اطمینان دلایا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں مطمئن رہو۔ ظلمت و نور کا تو میں نے اظہار نہ کیا۔ لیکن مرحوم کو اطمینان خوب دلایا۔

۲۸ ذی الحجہ ۶۶ھ مطابق ۱۲ نومبر ۴۷ء کو حضرت مدنی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ دیوبند سے روانہ ہو کر شب کو مظفر نگر میں قیام فرما کر دو پہر کو بڑی دقت سے دہلی پہنچے۔ وہاں گاندھی جی، جواہر لال نہرو نے اس پر بہت قلق اور اظہار افسوس کیا کہ آپ اس قدر مشقت اور تکلیف اُٹھا کر تشریف لائے ہیں آپ اطلاع کرادیا کریں سرکاری ٹرک آپ کو لایا کرے گا وہی لے جایا کرے گا اور اس وقت بھی ان لوگوں نے حضرت قدس سرہٗ کے لیے ایک سرکاری ٹرک تجویز کیا۔ جو حضرت کو دیوبند لے جائے اور چار فوجی گورکھا اس پر ہتھیاروں سے مسلح حفاظت کے لیے مقرر ہوئے۔

حضرت قدس سرہٗ نے اس ناکارہ کو نظام الدین اطلاع کرائی کہ میں سرکاری ٹرک میں فوجی پہرے کے ساتھ دیوبند جارہا ہوں، تمہاری مستورات (جو سب نظام الدین، والدہ ہارون کی شدت علالت کی وجہ سے ۲۱ شعبان ۶۶ھ گئی ہوئی تھیں اور وہاں ہی محبوس تھیں) کو اس وقت میرے ساتھ جانے میں سہولت رہے گی میں تو پہلے ہی سے آنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ مستورات کی آمد کے لیے اس سے زیادہ آسان صورت کوئی نہ تھی۔ اس لیے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی طیب خاطر سے نہیں بلکہ قلق سے سب کو اجازت دے دی اور ۳ محرم ۶۷ھ مطابق ۱۷ نومبر ۴۷ء دوشنبہ کی صبح کو حضرت نے اپنا ٹرک نظام الدین بھیج دیا اور زکریا مع مستورات مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے طرفین کے آبدیدہ نگاہوں کے ساتھ رخصت ہو کر سوار ہو گئے۔

وہ ٹرک چاروں طرف سے پردوں سے بند تھا اور چاروں کونوں پر چار گورکھا مسلح کھڑے ہوئے تھے۔ آگے کے حصہ میں حضرت اقدس مدنی قدس سرہ اور عزیز مولوی عبد المجید مرحوم اور عالی

جناب محمود علی خاں صاحب رئیس کیلاشپور جو اتفاق سے دہلی گئے ہوئے تھے اپنی ریوالور کے ساتھ آگے بیٹھے تھے اور یہ ناکارہ مستورات کے ساتھ پیچھے تھا۔ نو بجے دہلی سے چل کر بے میل کے قریب پہنچے تھے کہ دفعۃً ٹرک خراب ہو گیا۔ بہت ہی دقت اور مشقت سے اس کو دھکے لگائے۔ مستورات کو اُتارنا مشکل تھا، لیکن حضرت مدنی قدس سرہٗ نے باوجود اپنے ضعف و پیری کے بدنی قوت سے زیادہ اپنی روحانی قوتوں کے ذریعہ اس کو بنفس نفیس دھکیلا۔ حضرت ہی کی برکت سے وہ چل سکا ورنہ اس قدر سخت وزنی تھا کہ ہم چند ضعفاء کے قابو کا نہیں تھا۔ ہم لوگوں کے دھکیلنے سے وہ ذرا بھی جنبش نہ کرتا۔ حضرت قدس سرہٗ کے زور سے ہی وہ حرکت کرتا تھا۔ بہت مشکل سے پانچ چھ گھنٹے میں سونتا تک پہنچا۔ وہاں ایک مدرسہ بچوں کا تھا۔ گاؤں والے اور مدرسہ والے حضرت قدس کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور وہ لوگ اپنے یہاں سے مکئی، چاول، وغیرہ جس قسم کی بھی ان کے یہاں روٹیاں تھیں اور ساگ وغیرہ لے کر آئے، چونکہ میرے ساتھ عورتیں تھیں اس لیے مدرسہ کا ایک حصہ خالی کر کے مستورات کو پہنچایا اور میں اور حضرت قدس سرہٗ مسجد میں چلے گئے اور فوجی ٹرک کو درست کرتے رہے۔ ٹیلیفون تو وہاں کوئی تھا نہیں۔ ایک فوجی گاڑی ادھر سے جاتی ہوئی ملی۔ ان فوجیوں نے ان کے ذریعہ کوئی پیام بھی بھیجا۔ مغرب کے بعد وہ ٹرک درست ہوا۔ انہوں نے چلنے کا تقاضا کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے ساتھ مستورات ہیں بے وقت جانے میں دقت ہے۔ اب صبح کو چلیں گے۔ مگر وہ فوجی گورکھے کہاں مانتے، زیادہ اصرار کیا تو جلدی جلدی عشاء کی نماز پڑھی۔ کھانا کھایا ٹرک میں چونکہ چاروں طرف پردہ تھا اور چاروں کونے پر فوجی تھے۔ اس لیے راستہ بحمد اللہ کسی نے تعرض نہیں کیا۔ مظفر نگر آ کر حضرت قدس سرہٗ نے ایک حکیم صاحب کے مکان پر ٹرک ٹھہرا کر مجھ سے یہ فرمایا کہ دیوبند میرے جانے کے بعد یہ آگے نہیں جائیں گے۔ تم کو مستورات کی وجہ سے دقت ہوگی۔ میں مظفر نگر سے دیوبند دن میں آسانی سے چلا جاؤں گا۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ان حکیم صاحب کے مکان پر خوب زنجیریں بنائیں میرے سامنے تو کواڑ کھلے نہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ تم کو دیر ہو رہی ہے اور فوجی لوگوں کو بھی خوب تقاضا ہو رہا تھا۔ اس لیے مظفر نگر سے براہ رڑکی سہارنپور صبح کے چار بجے پہنچے۔ اس لیے کہ دیوبند تا سہارنپور کی پختہ سڑک اس وقت تک نہیں بنی تھی۔ زکریا، مولوی عبدالمجید مرحوم اور عالی جناب محمود علی خاں صاحب مع اپنے ریوالور کے تھے۔ کیلاش پور پر میں نے عرض کیا کہ آپ اُتر جائیں۔ مگر اللہ ان کو بہت جزائے خیر عطاء فرمائے انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو اس میں یقیناً راحت ہے کہ میں اپنے گھر پر سے گزر رہا ہوں مگر میں آپ کو تنہا نہیں جانے دوں گا۔ وہ میرے ساتھ سہارنپور تشریف لائے۔

کرفیو مظفر نگر میں بھی لگا ہوا تھا اور سہارنپور میں بھی تھا اور مظفر نگر و سہارنپور دونوں جگہ میں بلیک

آؤٹ بھی تھا، کوئی بجلی نہیں چل رہی تھی۔ مکان پر بالکل اندھیرا پایا۔ ٹرک والوں نے اور فوجیوں نے مکان پر پہنچنے کے بعد جلد اُترنے کا تقاضہ کیا۔ مولوی عبدالمجید مرحوم گھر میں آئے تو سب کواڑ مردانہ زنانہ، اندر باہر سے کھلے پڑے تھے۔ وہ یہ سب منظر دیکھ کر بہت حیرت زدہ ہوا اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگا کہ حضرت یہاں تو کوئی نہیں سب پاکستان چلے گئے۔ کیونکہ ڈاک کا سلسلہ بھی تقریباً کئی ماہ سے بند تھا اس لیے ایک کا دوسرے کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ مولوی نصیرالدین کے مکان کے اندر کی طرف زنجیر لگ رہی تھی مولوی عبدالمجید مرحوم نے خوب زنجیر بجائی۔ آوازیں دیں اور میں نے بھی خوب آوازیں دیں۔ مگر وہاں سے زنجیر نہ کھلی اور نہ آواز کا جواب دیا۔ تین چار منٹ ہی اس بھاگ دوڑ میں گزرے ہوں گے کہ ٹرک والوں نے ہمارا سامان اُتار کر نیچے ڈال دیا اور مستورات سے تقاضا کیا کہ جلد اُتر جاؤ۔ میں نے ان کو کتب خانہ کے چبوترے پر بٹھایا۔ اندھیرے میں یہ بھی پتہ نہ چلا کہ کیا اترا کیا رہا اور یہ بھی فکر تھا کہ مقامی پولیس کرفیو کی وجہ سے باہر بیٹھے ہوئے ہونے پر نہ ستائے۔ خان صاحب بھی اسی ٹرک میں سہارنپور والے مکان میں چلے گئے جو بازار میں تھا اور ٹرک والے کا راستہ بھی ادھر ہی کو تھا۔

دس پندرہ منٹ تک میرے اور مولوی عبدالمجید کے شور کرنے پر مولوی نصیر نے اپنے دروازہ کا ذرا سا کواڑ کھول کر اندر جھانکا اور میں نے ڈانٹ کر کہا کہ اللہ کے بندے کواڑ تو کھول میں زکریا ہوں۔ اس پر اس نے دونوں کواڑ کھولے۔ سلام کیا میں نے کہا کہ جلدی لالٹین لاؤ وہ یکے بعد دیگرے دو لالٹین جلا کر لائے۔ ایک لالٹین لے کر مولوی عبدالمجید مرحوم مکان میں آئے اور بہت ڈرتے ڈرتے مکان کو سب کو اندر باہر اوپر نیچے پاخانہ وغیرہ دیکھا کہ کہیں کوئی آدمی تو نہیں۔ دوسری لالٹین سے اوّل مستورات کو میں نے گھر میں پہنچایا پھر میں نے مولوی نصیر نے اور مولوی عبدالمجید مرحوم نے جلدی جلدی وہاں سے سامان اٹھوایا۔ مکان کے دروازے میں سب کو جمع کیا اور مولوی نصیر سے مطالبہ بھی کیا کہ یہ سارے کواڑ کیوں کھلے ہوئے پڑے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ عصر کے بعد لگانا یاد نہیں رہا اور مغرب کے بعد کرفیو ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا یہ تو کوئی عذر نہیں۔ جب یہاں کوئی تھا ہی نہیں تو یہ کیوں کھلے صبح کی نماز میں جب یہ ناکارہ مسجد میں گیا تو اولاً محلّہ میں اور پھر سارے شہر میں میری واپسی کا ایسا شور مچا اور ایسے زوردار اونچے اونچے فقرے سنے کہ مجھے بھی گیدڑ کی طرح سے اپنے پری ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ ہمارے محلّہ کے بہت سے لوگ اور اس کے ساتھ شہر کے بھی بہت سے احباب پاکستان جانے کے لیے ان کیمپوں میں پہنچ چکے تھے جو کچہری کے پل سے اُتر کر کثرت سے لگے ہوئے تھے۔

میری واپسی پر سب سے پہلے شیخ اظہار احمد تاجر چوب جو میرے بہت مخلص دوست اور ان کے

والد جو اس وقت حیات تھے وہ بھی بڑے تاجر چوب تھے اپنے گھر والوں کو مع اپنے سارے سامان کے کیمپ سے واپس لے آئے اور میں نے سنا کہ شام تک دوسو آدمی ایک دوسرے کو دیکھ کر واپس ہو گئے۔ مجھے سفر کی تکان کا مرض تو ساری عمر سے ہے اور یہ سفر تو بڑی مشقت سے گزرا تھا اس لیے یہاں آکر شدید بخار ہوا۔ حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ میری بیماری کی اطلاع سن کر اگلے دن چہار شنبہ کی صبح کو تشریف لائے اور تین دن قیام فرمایا اور شنبہ کی صبح کو واپس تشریف لے گئے۔ ۱۰ محرم ۶۷ھ دوشنبہ کی صبح کو حضرت مدنی قدس سرہٗ ڈیڑھ بجے تشریف لائے اور کار میں گنگوہ تشریف لے گئے۔ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ بھی دوشنبہ کی صبح کو حضرت مدنی کی آمد کی خبر پر دو شنبہ کی صبح کو ہی تشریف لے آئے تھے مگر حضرت مدنی اسٹیشن سے سیدھے گنگوہ تشریف لے گئے۔ اس لیے نظام سفر واپسی کا معلوم نہ ہوسکا۔ اس لیے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ حضرت مدنی کا دن بھر انتظار فرما کر بعد عصر واپس تشریف لے گئے۔ مغرب بعد حضرت واپس تشریف لائے اور حضرت رائے پوری کی آمد وانتظار وواپسی کا حال معلوم ہوا تو علی الصباح بہٹ تشریف لے گئے اور وہاں جاکر جب معلوم ہوا کہ حضرت تو رائے پور جا چکے تو پیچھے پیچھے رائے پور تشریف لے گئے اور دونوں اکابر عصر سے پہلے سہارنپور تشریف لائے اور بعد مغرب وہ معرکۃ الآراء مشورہ ہوا جس کا بہت سی جگہ اس زمانے میں رسائل واخبارات میں ذکر آیا تھا۔ علی میاں نے بھی حضرت رائے پوری کی سوانح میں اس کا ذکر کیا ہے میں دہلی سے واپسی پر حضرت مدنی قدس سرہٗ سے اور سہارنپور آمد پر حضرت رائے پوری سے عرض کر چکا تھا کہ دہلی میں بہت زور اصرار میرے اور عزیز یوسف کے پاکستان چلے جانے پر رہا۔ مگر میں آپ دونوں حضرات کے مشورے پر اپنے سفر کو معلق کیے ہوئے ہوں اور عزیز یوسف کا سفر مجھ پر موقوف ہے۔ رائے پور میں اسی دن حضرت اقدس رائے پوری بھی اشارۃً اس قسم کا ذکر کر چکے تھے۔ کہ پنجاب والوں کا مجھ پر زور رہا مگر میں نے حضرت والا اور حضرت شیخ کے مشورے پر موقوف کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ دونوں حضرات مشترک طور پر واپس تشریف لائے اور بعد مغرب کچے گھر میں یہ سیہ کار اور دونوں اکابر مشورے کے لیے جمع ہوئے اور اس کی ابتداء حضرت رائے پوری نے اس عنوان سے کی کہ حضرت! (خطاب حضرت مدنی کو تھا) اپنے سے تعلق رکھنے والے تو سارے مشرقی اور مغربی پنجاب کے تھے اور حضرت قدس سرہٗ (اعلیٰ حضرت رائے پوری) کے متعلقین بھی زیادہ تر ان ہی دو جگہ کے تھے۔ مشرقی تو سارا مغربی کی طرف منتقل ہو گیا، ان سب حضرات کا بہت اصرار ہو رہا تھا کہ میں بھی پاکستان چلا جاؤں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی حضرت اقدس رائے پوری کو پاکی مسلمانوں کی ضرورتوں کا بار بار احساس دلاتے تھے اور خود اپنا جانا بھی حضرت رائے پوری کی تشریف بری پر محمول کیے ہوئے

تھے اور یہ بھی حضرت نے فرمایا کہ میرا تو مکان بھی مغربی میں ہے اور ان سب مظلومین کی دلداری بھی اسی میں ہے۔ شروع رمضان ہی سے ان کا اصرار ہو رہا ہے مگر آپ دونوں حضرات کے مشورے پر میں نے معلق کر رکھا ہے۔ یہاں تو پھر بھی اللہ کے فضل سے اہل اللہ ہیں مگر وہاں اللہ اللہ کرنے والوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ کچھ شہید ہو گئے، کچھ اُجڑ گئے اور تقریباً حضرت کی گفتگو کا رخ یہ تھا کہ وہاں قیام ضروری ہے۔ اس سب کو سن کر حضرت مدنی قدس سرہٗ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ ہماری اسکیم تو فیل ہو گئی۔ ورنہ نہ تو یہ قتل وغارت ہوتا اور نہ یہ تبادلۂ آبادی ہوتا۔

حضرت مدنی کا فارمولہ یہ تھا کہ صوبے سب آزاد ہوں، داخلی امور میں سب خودمختار، خارجی امور، فوج، ڈاکخانہ وغیرہ سب مرکز کے تحت۔ مرکز میں ہندو مسلم سب برابر ہوں گے۔ ۴۵، ۴۵ اور ۱۰ اجملہ اقلیتیں، گاندھی جی نے اس کو منظور کر لیا تھا مگر مسٹر جناح نے اس کا انکار کر دیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اگر ہماری تجویز مان لیتے تو نہ کشت وخون کی نوبت آتی اور نہ تبادلۂ آبادی کی۔ اب میں تو کسی کو بھی جانے سے نہیں روکتا۔ اگرچہ میرا وطن مدینہ ہے اور محمود وہاں بلانے پر اصرار بھی کر رہا ہے۔ مگر ہندوستانی مسلمانوں کو اس بے سروسامانی اور دہشت اور قتل وغارت گری میں چھوڑ کر میں نہیں جا سکتا۔ اور جسے اپنی جان ومال، عزت وآبرو دین اور دنیا یہاں کے مسلمانوں پر نثار کرنی ہو وہ یہاں ٹھہرے اور جس کو تحمل نہ ہو وہ ضرور جائے۔

حضرت مدنی ورائے پوری کے مشورہ سے ہندوستان سے منتقل قیام کا فیصلہ

حضرت قدس سرہٗ کے اس ارشاد پر میں جلدی سے بول پڑا کہ میں تو حضرت ہی کے ساتھ ہوں۔ حضرت اقدس رائے پوری نے فرمایا کہ تم دونوں کو چھوڑ کر میرا جانا بھی مشکل ہے۔ میں نے تو اس گفتگو کو کسی سے نقل نہیں کیا اور توقع ان حضرات سے بھی معلوم نہیں ہوئی، لیکن عشاء کی نماز پڑھتے ہی عمومی شور ہر شخص کی زبان پر سنا کہ اکابر ثلاثہ کا فیصلہ یہاں رہنے کا ہو گیا ہے اور پھر ان ہی دونوں بزرگوں کی برکت تھی اور اصل تو اللہ ہی کا انعام واحسان تھا کہ ایک دن پہلے جو لوگ تشویش میں تھے وہ اگلے دن اطمینان کی سی باتیں کر رہے تھے۔ یہ زمانہ بھی قیامت کی یاد کو بہت ہی تازہ کر رہا تھا اور دنیا کی بے ثباتی ہر شخص پر ایسی مسلط تھی کہ بڑے بڑے قیمتی برتن تانبے، لوہے کے بہت ہی معمولی پیسوں میں فروخت ہوئے۔ دہلی میں نیلام ہوتے تھے اور تانبہ کے برتن بلا مبالغہ دو ڈھائی آنے سیر فروخت ہوتے۔ رئیس لوگ اپنی کاروں میں نظام الدین اسپیشلوں میں سوار ہونے کے لیے جاتے اور کار اسٹیشن پر چھوڑ کر ریل میں سوار ہو جاتے۔ مولانا حفظ الرحمن نے کئی

مرتبہ افسوس سے فرمایا کہ یہ لوگ سڑکوں پر عمدہ کاریں چھوڑ کر جارہے ہیں، اگر جمعیۃ کو دی جائیں تو ان کو فروخت کر کے جمعیۃ کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اب اس طرح لاوارثی مال کو کیا کام میں لایا جائے۔ لاقانونیت اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ اس کے قصے بھی بہت ہی ناقابلِ تحریر ہیں۔

حضرت الحاج حافظ فخر الدین صاحب کی صاحبزادی اپنے خاوند کے ساتھ روہتک میں رہتی تھیں، حاملہ تھیں، روہتک والوں کا پیدل اخراج وہاں کے حکام نے تجویز کر دیا۔ حضرت حافظ صاحب نے اپنے تعلقات کی وسعت اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی مدد سے جواہر لال سے یہ بھی لکھوادیا کہ ان کی لڑکی کو پیدل والی جماعت سے مستثنیٰ کر دیا جائے، مگر روہتک کے تھانیدار نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہاں کا جواہر لال میں ہوں۔ مجھے اس وقت ۳۸ھ کا حج خوب یاد آتا تھا جس کی تفصیل پہلے گزر چکی کہ جب کوئی حاجی کسی بدو کی شکایت کسی مقوم سے کرتا اور یہ کہتا کہ میں مکہ جا کر شریف سے شکایت کروں گا تو ان کا مقولہ تھا ''من شریف؟ انــا شـریف'' (شریف کون ہے، میں شریف ہوں) اس زمانے میں دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات عطاء فرمائے، سارے دن دہلی کے فساد زدہ علاقوں میں نہایت بے جگری سے پھرتے تھے۔ مسلمانوں کو دلاسہ دیتے اور گالیاں سُنتے، مگر اللہ ان کو مراتب عالیہ نصیب فرمائے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تحمل اور برداشت خوب عطاء فرمایا تھا اور ان سے بڑھ کر میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ تھے۔ سارے ہندوستان کا اس خطرے کے زمانے میں دورہ فرماتے اور مصائب پر ان کا اجر سناتے، بڑے لانبے لانبے دورے حضرت کے مسلمانو ں کو جمانے کے سلسلہ میں ہوئے۔ ایک چیز پر مجھے بہت ہی رشک آیا، نہایت شدید مخالفت معاند لیگی جنہوں نے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو منہ درمنہ بہت کچھ کہا اور سنایا، حضرت ان کو بھی بہت ہی تسلی کے خطوط تحریر فرماتے اور خود جا کر ان کو دلاسہ دیتے اور ایسی گفتگو فرماتے جیسے یہ حضرت کا بہت ہی معین و مددگار ہے۔

مجھے دو آبے کے متشدد لیگیوں کے متعلق خود سننے کی اور حضرت قدس سرہٗ کے گرامی نامے دیکھنے کی نوبت آئی کہ گھبرائیں نہیں انشاء اللہ حالات کسی وقت سازگار ہوں گے، آپ کو جو تکلیف پیش آئے مجھے لکھیں میں انشاء اللہ ہر نوع کی مدد کروں گا، بعض لیگیوں کی سفارش کے لیے ہندو حکام کے پاس بھی تشریف لے گئے، جن کے نام میں لکھوانا نہیں چاہتا، مگر حضرت کے علو شان کی داد ہمیشہ دوں گا کہ جن لوگوں نے حضرت کی شان میں غائبانہ اور منہ در منہ سخت الفاظ کہے حضرت نے ان کی سفارشیں اور اس بات تک کی ضمانتیں لیں کہ اب یہ لوگ آپ کے خلاف کچھ نہیں کہیں گے، مگر لیگی حضرات کو اس پر بھی اعتماد نہ ہوا اور نہ حضرت کی اس سفارش کی قدر فرمائی اور پاکستان چلے

گئے۔ حضرت کواللہ تعالیٰ اعلیٰ درجات سے نوازے اس زمانے میں حضرت قدس سرہٗ پر تاثر بہت تھا بسااوقات تقریروں میں کسی کسی بات پر آبدیدہ بھی ہوجاتے تھے:

وہ محروم تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے
کہ جو منزل بہ منزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ

☆......☆......☆

بابِ ہشتم

متفرقات

یہ بات بہت ہی طویل ہے۔ اگر چہ اس کا اجمال بھی علی گڑھ میں ہو چکا تھا، مگر اس کی تبییض اور تفصیل باقی ہے اور چونکہ اس سیہ کار کے سفرِ حج اور اس سے زیادہ سفرِ ہجرت کی خبریں نا معلوم ہر سال کہاں سے پھیل جاتی ہیں، حالانکہ ہجرت کے متعلق میں ہر سال تحریراً تقریراً اخبارات کے ذریعہ سے بھی لوگوں کو مطلع کرتا رہا ہوں کہ میرا بالکل ہجرت کا ارادہ نہیں ہے اور نہ ہجرت اتنی آسان ہے۔ سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''فان شان الھجرۃ شدید'' الحدیث رواہ ابوداؤد۔ ہجرت کا معاملہ بڑا سخت ہے اور آج کل تو سعودی قوانین ایسے سخت ہیں کہ اگر کوئی ہجرت کرنا بھی چاہے تو بہت دشوار ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ کس بناء پر اس ناکارہ کی ہجرت ہر سال پھیلتی رہتی ہے اور اکثر جمادی الثانی سے، ورنہ شوال سے تو اس قسم کے لوگوں کا ہجوم بڑھتا رہتا ہے جو ملاقات کے لیے آتے ہیں اور آج کل بھی بہت بڑا ہجوم اسی سلسلہ میں ہو رہا ہے، اس لیے توقع نہیں کہ اس سفر سے پہلے یہ باب پورا ہو جائے۔ البتہ واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ میرے عزیز کاتبین میں سے کوئی پورا کر دے تو کرم ہوگا، ورنہ جتنا ہو جائے اس کو طبع کرادوں گا۔ یہ واقعات جو اس باب میں آرہے ہیں وہ سب غیر مرتبط اور مختلف مضامین اور مختلف احباب کے ہیں اس لیے نمبر وار لکھواتا ہوں۔

اکابر مدارس کا اہتمام اور مال وقف کی اہمیت:

(۱)...... مجھے اپنے اکابر کے طرزِ عمل اور ان سے ورثہ میں جو چیز ملی ہے وہ مدارس کا اہتمام، اوقاف کے مال کی اہمیت، جس کے متعلق آپ بیتی نمبر ۱ میں بھی کئی واقعات لکھوا چکا ہوں اور اس تحریر میں بھی اپنے حضرت قدس سرہٗ کا یہ مقولہ لکھوا چکا ہوں کہ مجھ سے تعلق کا مدار تو میرے مدرسہ سے تعلق پر ہے، جس کو میرے مدرسے کے ساتھ جتنا تعلق ہے اتنا ہی مجھ سے ہے اور اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا مقولہ بھی پہلے آچکا ہے کہ مجھے مدارس کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی چیز سے نہیں لگتا، طویل مضمون آپ بیتی نمبر ۱ میں گزر چکا ہے۔ نیز اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کا معمول بھی مدرسہ کے متعلق آپ بیتی نمبر ۱ میں لکھوا چکا ہوں کہ وہ اپنا سالن سردی میں مدرسے کے حمام کے سامنے رکھا کرتے تھے، نہ حمام کے اندر ہوتا نہ اس کی آگ نکال کر اس پر ہوتا اور اس

انتفاع پر چندہ کے نام سے سردی کے مہینے میں دو تین روپے جمع کراتے تھے اور بھی اکابر کے احتیاط کے سلسلہ میں قصے وہاں گزر چکے ہیں اس لیے سب سے اول اپنے عزیزوں کو اپنے دوستوں کو اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو اس کی نصیحت اور اس کی وصیت کرتا ہوں کہ مدرسہ کے مال میں بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے مدرسہ کے اوقات کا بہت ہی اہتمام کریں، یہ نہ سمجھیں کہ مجھے کون ٹوک سکتا ہے۔ یہ اللہ کا مال ہے اور اس کا مطالبہ کرنے والا اور اس پر ٹوکنے والا بڑا سخت ہے جس کے یہاں نہ کوئی سفارش چلے گی نہ کوئی وکالت۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس سیہ کار نے محض مالک کے فضل سے اوقاتِ اسباق کی وہ پابندی کی جس پر سرپرستان نے بھی تحریراً استعجاب لکھا ہے۔

مظاہر علوم کی ماہانہ تقسیم کے نقشہ کی ترتیب:

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی قدس سرہٗ کے ذمہ ان کی سرپرستی کے زمانے میں مدرسین کے اسباق اور خواندگی کے نقشوں کی نگرانی تھی۔ ماہانہ دستخط نگرانی کے تو صدر مدرس کے ہوتے تھے لیکن سال کے درمیان میں اور سال کے ختم پر ایک دو مرتبہ وہ بھی نقشوں کو ملاحظہ کرتے تھے اور ہر مرتبہ اس سیہ کار کے نقشہ پر نصاب کی ماہانہ پابندی پر پسندیدگی اور مبارکباد لکھ کر جایا کرتے تھے۔ اگر وہ نقشے اب بھی دفتر مدرسہ میں ہوں گے تو ان پر تحریر ضرور ملے گی۔ ماہانہ تعلیم کی پابندی بھی بہت اہم ہے۔

مظاہر علوم کا خصوصی امتیاز حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں اور حضرت کے وصال کے چند سال بعد تک یہ رہا کہ تعلیم میں استواری، اعتدال خوب ہوتا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ اس کے شدید مخالف تھے کہ شروع سال میں لمبی لمبی تقریروں میں وقت ضائع کیا جائے اور آخر سال میں رمضانی حافظ کی طرح فرفر ختم کرا دیا جائے۔ اس پر متعدد مرتبہ میرے حضرت نے اکابر مدرسین کو مجمع میں ڈانٹا کہ مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ کتاب کے شروع میں طول دیا جائے اور آخر میں دورہ چلایا جائے۔ حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں کوئی کتاب خارج یارات کو نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بھی حضرت بہت مخالف تھے۔ کہ طلبہ کو مطالعہ کا وقت کب ملے گا؟ مگر اب تو "چشم بد دور" مدرسہ کے گھنٹوں میں سبق کم ہوتے ہیں اور خارج میں زیادہ۔ اگر کسی کتاب کے متعلق اہتمام سے غور کیا جائے گا تو ایک تہائی مدرسہ کے گھنٹوں میں ملے گی اور دو تہائی خارج اوقات میں پڑھا کر پوری کی گئی ہوگی۔ فالی اللہ المشتکی' حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے کئی سال بعد تک حضرت کا اثر باقی رہا۔ لیکن چند سال بعد جب اس میں انحطاط دیکھا گیا تو اس سیہ کار نے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوری سابق صدر مدرسہ نے مل کر اور حضرت قدس سرہٗ کے زمانے کے پانچ سالہ ماہانہ نقشے

سامنے رکھ کر ایک نقشہ مرتب کیا تھا جو اب مدرسہ کے نصاب کے نام سے حالات مدرسہ میں طبع شدہ ہے۔ ہم دونوں نے بہت غور وخوض کے بعد پانچ سالہ نقشوں کو بہت اہتمام سے دیکھنے کے بعد خود بھی حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں کئی سال پڑھایا تھا۔ اس لیے ہر گھنٹے کی کتابوں کو ایک ہوں یا دو، جس طرح حضرت کے زمانے میں پڑھائی جاتی تھی اس کو نو حصوں پر تقسیم کر کے دو حصے پہلی سہ ماہی کے اور تین حصے دوسری سہ ماہی اور چار حصے تیسری سہ ماہی کے اور پھر ہر سہ ماہی کے مقررہ حصوں کو تین تین ماہ پر علی التناسب تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن پہلی سہ ماہی کا حصہ علی التساوی تقسیم کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ ذیقعدہ میں بالکل ابتداء ہونے کی وجہ سے تقریر لمبی ہوتی ہے۔ ذی الحجہ میں عید کی تعطیل آتی ہے اور محرم کا آخری ہفتہ امتحان کے لیے ہوتا ہے۔

بہر حال میں اپنے دوستوں کو اس کی تاکید کرتا ہوں کہ مدرسہ کا کوئی مال، یا تعلیمی حق تم پر باقی نہ رہے اور تمہارے جتنے حقوق بھی مدرسہ پر رہ جائیں ان کو غنیمت سمجھو کیونکہ مدرسہ کے جتنے حقوق تم پر رہ جائیں گے ان کی ادائیگی بڑی مہنگی ہوگی اور تمہارے حقوق جتنے مدرسہ پر رہ جائیں گے اس کا معاوضہ تم کو بڑا قیمتی ملے گا۔ میرے بہت سے مخلص دوست و عزیز جن سے مجھے انتہائی تعلق اور محبت تھی ان سے مدرسہ کے حقوق میں کوتاہی کی وجہ سے مجھے بہت ہی تکدر اور قلق رہا۔ اس کے بالمقابل میرے کئی دوست ایسے ہیں جن سے ابتداء میں مجھے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ بے تعلقی تھی مدرسہ کے کام میں اہتمام اور احتیاط سے وہ میرے محبوب دوست بن گئے۔

قاری سعید مرحوم سے تعلق:

قاری مفتی سعید احمد صاحب جن کی ولادت عید الاضحیٰ کے دن صبح صادق کے وقت، سن میں مرحوم کو تردد تھا کہ ۲۰ھ تھی یا ۲۱ھ تھی کئی دفعہ یہ کہا کہ صحیح سن اجراڑہ میں کہیں لکھا ہوا ہے۔ مگر باوجود تلاش کے ملا نہیں، عزیزم مولوی اطہر نے بتایا کہ مجھ سے انہوں نے ایک وقت اپنی عمر ۵۵ سال بتائی تھی۔ اس لیے اس حساب سے پیدائش ۲۲ھ ہوتی ہے۔ یہی رسم المفتی کے حاشیہ میں انہوں نے لکھا ہے۔ ابتدائی تعلیم قرآن پاک حافظ محمد حسین صاحب سے پڑھا، جس پر ان کو ناز بھی تھا اور ابتدائی فارسی عربی بھی اجراڑہ میں پڑھی۔ شوال ۳۶ھ میں مدرسہ مظاہر علوم میں آئے۔ ابتدائی کتب عربی اس سیہ کار سے پڑھیں اور جملہ کتب کی تکمیل ابتداءً ۴۳ھ میں مدرسہ کے استاذ قراءت ہوئے اور انتہاءً ۴۷ھ میں نائب مفتی مقرر کیے گئے پھر مفتی اعظم بھی ۵۲ھ میں ہو گئے تھے۔ ابتدائے تعلیم میں ان کے متعدد اسباق میرے پاس تھے۔ اجراڑہ کے کئی طلبہ آئے ہوئے تھے، چونکہ قاری صاحب اپنے کو جناب الحاج حافظ محمد حسین صاحب جن کا حال پہلے آ چکا ہے ان کا

خاص شاگرد ہونے کی وجہ سے اُونچا سمجھتے تھے اور صاحبزادگی کی بُو بھی کچھ موجود تھی اور یہ بار ہا میری آپ بیتی نمبر۱ میں اور اس رسالہ میں بھی گزر چکا ہے کہ والد صاحب کے جوتوں کی بدولت مجھے صاحبزادگی سے نفرت ہو گئی تھی، اس لیے مرحوم مجھ سے خفا رہتے تھے اور میں مرحوم سے۔ ۴۷ھ میں جب وہ نائب مفتی ہو گئے اور یہ ناکارہ حجاز سے واپسی پر اپنے خیال میں کچھ اُونچا آدمی بن کر آیا تھا تو میں نے مرحوم سے درخواست کی کہ بعد ظہر میرا ایک سیپارہ قرآن پاک کا رمضان میں سن لیا کریں، اُنہوں نے بہت صفائی سے کہہ دیا کہ وہ مدرسہ کا وقت ہے کہ اس زمانے میں غیر رمضان کی طرح رمضان میں بھی دفتر اور افتاء دونوں کا وقت صبح وشام ہوتا تھا، اگر ناظم صاحب فرما دیں گے تو سنوں گا ورنہ نہیں۔ ناظم صاحب (حضرت مولانا عبداللطیف صاحب) کی جو شفقتیں اس سیہ کار پر تھیں ان کے لحاظ سے اس میں ذرا تأمل نہ تھا کہ میں ان سے عرض کروں اور وہ بہت زور سے حکم نامہ جاری فرما دیں۔ لیکن مجھے مرحوم کا یہ جواب بہت ہی اچھا معلوم ہوا اور میں نے ان سے کہا کہ جزاک اللہ تم نے بہت ہی اچھا جواب دیا۔ اس کے چند ماہ کے بعد ایک قصہ پیش آیا کہ یہ ناکارہ اور ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ عربیہ اجراڑہ کے سرپرست تھے اور سالانہ جلسہ میں بڑے اہتمام سے جایا کرتے تھے۔ اس سال اتفاق سے میں تو پہلے ہی عذر کر چکا تھا، حضرت ناظم صاحب کا ارادہ بہت پختہ تشریف لے جانے کا تھا۔ مگر عین وقت پر ناظم صاحب کو بھی عذر پیش آ گیا، انہوں نے مجھ سے مشورہ فرمایا۔

میں نے کہا کہ قاری سعید احمد وہاں کے حالات سے زیادہ واقف ہیں۔ آپ ان کو ایک تحریر میری اور اپنی طرف سے لکھ دیں میں بھی دستخط کر دوں گا کہ وہ ہم دونوں کی طرف سے نیابۃً وہاں کے امور طے کر آئیں۔ ناظم صاحب نے بہت پسند فرمایا۔ مگر قاری صاحب نے فرمایا کہ میں تو وہاں گھر کا آدمی ہوں کسی دوسرے کو تجویز کر دو۔ میں نے کہا کہ کوئی دوسرا اندرونی حالات سے واقف نہیں۔ نہ معلوم کیا طے کر کے آئے تم حالات سے واقف ہو تم ہی مناسب ہو۔ وہ حکماً چلے گئے اس ناکارہ کی صحت وقوت اس زمانے میں بہت اچھی تھی اور حضرت قدس سرہٗ کے ارشادات کی بنا پر مدرسہ کے ہر کام کا نگراں بھی میں اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ اگرچہ براہِ راست احکام کبھی جاری نہیں کیے۔ بلکہ جس کے متعلق جو کچھ لکھنا یا کہنا ہوتا وہ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے کچھ احمقوں نے یہاں تک بھی لکھا اور شائع کیا کہ ناظم مدرسہ تو یہ ناکارہ ہے، ناظم صاحب میرے کاتب اور میرے منشی ہیں۔ ''معاذ اللہ''۔ بہرحال میں چند ماہ بعد اپنی کسی غرض سے مدرسہ کے کتب خانہ میں گیا اور اپنی عادت کے موافق کہ میں جب بھی کتب خانہ میں جاتا تو مدرسین کی حاضری کا رجسٹر بھی بہت غور سے دیکھ کر آتا اور اس میں کوئی افراط وتفریط

دیکھتا تو اول کتب خانے والوں سے استفسار کرتا اور اگر ضرورت ہوتی تو حضرت ناظم صاحب سے تفریط و تقصیر پر تحریری مطالبہ کراتا۔ اس دن میں نے رجسٹر میں قاری سعید احمد صاحب کی ان ایام کی رخصت دیکھی۔ میں نے کتب خانے والوں سے دریافت کیا کہ قاری سعید احمد مرحوم ہمارے بھیجے ہوئے بکار مدرسہ اجراڑہ گئے ہیں ان کی رخصت کیوں ہے۔ کتب خانے والوں نے کہا کہ انہوں نے خود اپنی رخصت لکھوائی ہے۔ میں نے کتب خانے سے واپسی پر راستہ میں قاری سعید احمد مرحوم سے مطالبہ کیا۔ ان کا مستقل قیام اس زمانے میں اس کمرے میں رہتا تھا جو آج کل مہمان خانہ ہے دفتر مدرسہ کے دروازے کی چھت پر ہے اور وہی اس زمانے میں دارالافتاء بھی تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ بکار مدرسہ گئے تھے آپ نے رخصت کیوں لکھوائی۔

مجھے اپنا مطالبہ اور ان کا جواب اور اپنا جواب الجواب خوب یاد ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میرا گھر بھی تو وہیں ہے، بہر حال میں اپنے گھر بھی گیا تھا۔ مجھے اپنے الفاظ خوب یاد ہیں۔ میں نے کہا کہ تُو تو بڑا اچھا لونڈا نکلا۔ کل سے دوپہر کی روٹی میرے ساتھ کھایا کر۔ اللہ اس مرحوم کو بہت ہی بلند مراتب عطاء فرمائے ترقیات سے نوازے میری اس پیشکش کو ایسا نبھایا کہ جب تک وہ اپنے مرض الوصال میں چارپائی پر سے اٹھنے سے معذور نہ ہوگئے کبھی بھی دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کا نہ چھوڑا بلکہ ان کے ذاتی مہمان بھی اگر آجاتے ان کا بھی کھانا گھر سے منگا کر میرے ساتھ ہی ان کو کھلاتے تھے اور میرے جو مہمان خصوصی آتے تھے ان کے ساتھ شام کو بھی بجائے میرے وہ ہی میزبانی کرتے تھے اور تعلق دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا اور پھر تو میرے سفر و حضر کے مصاحب بن گئے اور انہوں نے بہت ہی حق دوستی ادا کیا مرحوم کے لیے بہت ہی دعائیں کرتا ہوں۔ مرحوم بہت عرصہ تک شدید بیمار رہے۔ تقریباً ایک سال تک مختلف امراض اور سحر بھی تجویز کیا گیا اور ۲ صفر ۷۷ھ بروز پنجشنبہ بوقت نماز فجر کو انتقال فرمایا۔ اللّٰھم اغفر لهٗ وارحمهٗ واعلیٰ درجاته

مرحوم کا ایک معمول بہت اہتمام کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عید الفطر کی صبح کو مدرسہ قدیم سے صبح کی نماز پڑھا کر پہلے اس ناکارہ کے مکان پر آتے اور وہاں کھجور سے افطار اور چائے وغیرہ پینے کے بعد اور اسی دوران میں ان کے گھر سے بہت مزیدار پلاؤ بھی آجاتی تھی۔ اس کو بھی اسی مجلس میں ہم لوگ لقمہ لقمہ کر کے ختم کر دیتے اس سے نمٹ کر وہ اپنے گھر جاتے تھے۔ یکم شوال ۷۶ھ کو مرحوم کا ایک دستی پرچہ میرے نام آیا کہ ۴۸ھ سے اب تک ۲۸ سال کے عرصہ میں کوئی عید ایسی نہیں گزری کہ میں نے نماز صبح کے بعد آپ کے یہاں حاضری نہ دی، افسوس ہوا کہ آج میں اپنی شدید بیماری کی وجہ سے حاضری سے محروم ہوں، مجھے اس کا جس قدر افسوس ہے اس کا آپ کو بھی علم ہوگا۔ میں اس پرچہ کو پڑھ کر بیتاب ہوگیا اور اسی وقت عید سے پہلے مرحوم سے مل کر آیا اور مرحوم خوب مل کر

رویا اور مجھے بھی رُلایا۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ اس کی خوبیاں اگر لکھوں تو مستقل ایک دفتر چاہیے۔ میرے رائے پور کے سفر کا تو آخر زمانہ میں مستقل رفیق بن گیا تھا اور حضرت اقدس رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ کی بہت ہی شفقت ہوگئی تھی۔ اگر مرحوم کے بغیر جانا ہوتا تو حضرت دریافت فرماتے کہ تمہارے دوست نہیں آئے۔ جب حضرت مولانا اشفاق احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد حضرت رائے پوری نے اپنے مدرسہ کے لیے ایک مستقل نظام بنانا چاہا اور اس کے سرپرستوں کی ایک کمیٹی مستقل بنائی اس میں قاری صاحب مرحوم کو بھی سرپرستوں میں لکھا تھا۔ مگر وہ نظام نہ چل سکا۔

مولانا عبداللطیف سے تعلق اور ان کے چند واقعات:

(۲)......اسی طرح سے حضرت الحاج استاذی المکرّم حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نوراللہ مرقدہٗ ناظم مدرسہ جن کا ذکرِ خیر میرے اساتذہ میں بھی گزر چکا ہے مجھے ان سے ابتدائی محبت تعلق تو اپنے ابتدائی شاگردی کے زمانے میں ہوگیا تھا مگر ۴۵ھ کے بعد جب یہ ناکارہ مشیر ناظم بنا اس وقت سے حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال تک بڑھتا ہی رہا۔ حتیٰ کہ انتقال کے قریب جب حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے قاری سعید مرحوم سے خانگی امور میں ایک وصیت نامہ لکھوایا تو قاری صاحب کے ہاتھ میرے پاس بھیجا کہ اس کو میری زندگی میں کسی پر ظاہر نہ کریں میرے بعد اس وصیت پر عمل کرنا اور کرانا آپ کے ذمہ ہے۔ خانگی امور میں بھی بہت کثرت سے مشورہ فرمایا کرتے تھے اور اہلیہ محترمہ کو بعض مرتبہ اس سیہ کار کی وساطت سے تنبیہ فرمایا کرتے تھے اور اہلیہ محترمہ بھی بعض مرتبہ اس سیہ کار کے واسطے سے بعض امور ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے منوایا کرتی تھیں۔ چنانچہ عبدالرؤف سلمہٗ کے نکاح کے موقعے پر کئی امور اس قسم کے پیش آئے جو اہلیہ محترمہ کو بھی خوب یاد ہوں گے اور اس ناکارہ کے تعلق کا اضافہ مدرسہ ہی کے تعلق کی وجہ سے ہوا تھا کہ ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو کبھی یہ خیال نہ ہوا کہ میں ناظم مدرسہ ہوں یا محصل چندہ ہوں، یا دربان، نہ اس کا خیال کبھی ہوا کہ یہ مدرسہ کا وقت ہے یا نہیں۔ طالب علم دوپہر میں عصر کے بعد مغرب کے بعد، عشاء کے بعد جب بھی درخواست لے جاتا فوراً اس کو ملاحظہ فرماتے اور حکم تحریر فرماتے۔ میں اپنی بدخلقی سے بسا اوقات طالب علم سے لڑ پڑتا کہ درخواست کا کوئی وقت بھی ہوتا ہے مگر وہ کبھی نہیں فرماتے تھے۔ نہایت اہتمام سے مطبخ میں بہت کثرت سے تشریف لے جاتے اور اکثر ایک خوراک معائنہ کے لیے خرید فرماتے اور وہیں آدھی چوتھائی روٹی کھا کر روٹی سالن کا معائنہ فرمانے کے بعد بقیہ وہیں کسی منشی یا طباخ کو دے دیتے۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ کام

ناظم مطبخ کا ہے روٹی سالن بغیر قیمت کے کبھی نہ چکھتے حالانکہ وہ چکھنا بضرورت مدرسہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی نانوں پر کلونجی اور گڑ کی چاشنی کبھی اپنے پاس سے اور کبھی کسی کو ترغیب دے کر ڈلواتے تھے۔

ڈپٹی عبدالرحیم صاحب ڈپٹی نہر جمن شرقی بڑے ہی مخلص اور بڑے نیک بزرگ حضرت مرشدی قدس سرہٗ کی تعمیل حکم میں وہ ہمارے مطبخ کے آنریری نگراں بھی رہے۔ دونوں وقت مدرسہ میں جا کر حساب کی جانچ کیا کرتے تھے۔ ہر ماہ کے شروع میں جنس اپنے سامنے تلواتے تھے، ذرا سی کمی، زیادتی پر سخت مطالبہ فرماتے۔ مجال نہ تھی کہ گوشوارہ میں دو دن کی تاخیر ہو لے۔ مطبخ کا حساب ان کی نگرانی کے زمانے میں جتنا صاف قابلِ رشک رہا نہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ ان کے بعد اور نہ آیندہ کی امید۔ اس مکان میں کرایہ پر رہتے تھے جو میرے مکان کے متصل ہے اور اب گاڑہ بورڈنگ کے نام سے مشہور ہے، مجھ پر بھی بہت ہی شفیق اور مہربان تھے اور بہت محبت فرمایا کرتے تھے حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ان سے فرمائش کر کے من دو من مچھلیاں منگوایا کرتے تھے اور اس دن مطبخ میں مچھلی اور چاول پکتے تھے۔ حضرت ناظم صاحب کی عادت شریفہ یہ بھی تھی کہ سردی کے موسم میں شلجم کا میٹھا اچار ڈالتے تھے بار بار خود ڈالتے تھے اور سب مدرسین کے ہاں تقسیم فرماتے تھے اور کبھی کبھی اس سیہ کار کو بھی حکم فرماتے تھے کہ تمہارے لیے میٹھا اچار ڈالنا ہے۔ میں اس زمانے میں میٹھا اچار بالکل نہیں کھاتا تھا۔ پانی کا ترش اچار کھاتا تھا ان کی خوشنودی کی وجہ سے میں بھی عرض کرتا کہ پانچ سات دھڑی شلجم کا مصالحہ لکھوا دیجئے اور مولوی نصیر کو پرچہ دے دیا کرتا۔ حضرت ناظم صاحب بہت ہی شوق سے بناتے تھے میں ایک چوتھائی ان کی خدمت میں پیش کرتا اور کچھ گھر بھیجتا تھا اور باقی میرے دوست بھی کچھ کم نہ تھے۔ اس جگہ تو یہ لکھوانا تھا کہ کبھی کبھی سردی کے موسم میں ایک دو دفعہ بلکہ زائد بھی دوستوں سے تحریک کر کے کئی کئی من شلجم منگا کر کئی کئی مٹکوں میں اچار ڈالتے اور جب دس بارہ دن میں تیار ہو جاتا تو سارا دارالطلبہ مہک جاتا تھا اور اس کی تیاری پر مطبخ سے کھچڑی پکواتے اور سب طلبہ کو کھچڑی کے ساتھ دو دو تین تین قتلے اچار کے دیتے۔ مرحوم کو بھنگی کی نگرانی کرنے میں بھی کبھی عار نہ آیا۔ بھنگی کے ساتھ جا کر پاخانہ کماتے وقت ڈانٹ پلاتے کہ یہاں پانی نہیں ڈالا، یہاں فنائل نہیں ڈالا، کبھی یہ خیال نہیں فرمایا کہ یہ کام درباں کا ہے۔ بھنگی کی نگرانی دربان کے ذمے ہے میرا کام نہیں۔ لوٹے جو مدرسہ میں آتے ان کو اپنے سامنے گنواتے۔ کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ لوٹے گنوانا میرا کام نہیں، ناظم صاحب کو کبھی اس کا واہمہ بھی نہیں گزرا کہ مدرسہ کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم۔ صبح کی نماز کے بعد سے رات کو دس گیارہ بجے تک وہ گویا ہر وقت مدرسہ کے ملازم تھے۔ جہاں تعمیر ہوتی روزانہ وہاں تشریف لے جاتے، کبھی بھی یہ واہمہ نہیں گزرا کہ یہ کام ناظم مالیات کا ہے، جب کبھی اپنی ذاتی ضرورت کی وجہ

سے کہیں کا سفر فرماتے بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ ''رسید بہی'' مدرسہ کے اشتہارات، معائنہ جات، ساتھ لے کر جاتے، کبھی یہ واہمہ بھی نہیں ہوا کہ میں محصل چندہ نہیں ہوں اور نہ اس کا خیال آیا کہ میں تو رخصت پر جارہا ہوں۔ جب کہ کسی دعوت یا تقریب میں جاتے تو میرے حضرت مرشدی کے اتباع میں ان کو متوجہ فرماتے کہ بھائی اپنی تقریب میں ہمارے مدرسے کو ضرور یاد رکھنا۔ حضرت ناظم صاحب کی ان ہی اداؤں نے مجھے زمانہ طالب علمی ہی سے اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ کہ وہ اپنے باضابطہ مدرسہ کے ناظم ہونے سے پہلے ہی سے مدرسہ کی خیر خواہی میں منہمک تھے۔

ایک مرتبہ حاجی مقبول احمد صاحب نے جن کا ذکر خیر پہلے بھی آچکا مجھ سے محبت بھی فرماتے تھے اور بلا وجہ خفا بھی ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے (میری طرف اشارہ کرکے) کہ مجھ کو اس سے بڑی محبت ہے مگر مجھے اس کی اس بات پر غصہ آوے کہ یہ مولوی عبداللطیف کے ساتھ یوں کیوں ہو گیا ''لحمہ لحمی دمہ دمی'' بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ میرے خلاف ناظم صاحب کو ان کے عزیزوں نے بہت سخت خط لکھے۔ ناظم صاحب نے بھی ان کا سخت جواب لکھا اور پھر لکھ کر اصل خط مع اپنے جواب کے لے کر میرے پاس آئے کہ فلاں نے خط لکھا تھا میں نے یہ جواب دیا۔ میں عرض کرتا حضرت آپ کا جواب زیادہ سخت ہے فرمانے لگے کہ تم نے اس کی بدتمیزی نہیں دیکھی کہ یہ لفظ اس نے تمہارے متعلق لکھ دیا۔ کیا لکھوں جس کا حال بھی شروع کرتا ہوں تعلق اور محبتوں کے سینکڑوں واقعات ذہن میں آجاتے ہیں۔ میں تو نہایت عجلت میں چند نمونے لکھوا رہا ہوں۔

مدرسہ کی رخصت کا قانون:

(۳)...... مدرسہ کے معاملات میں ایک چیز بڑے تجربے میں آئی۔ اب تو اس میں کمی ہے جس کی وجہ میں اکابر مدرسہ اور کام کرنے والوں میں اخلاص کی کمی سمجھ رہا ہوں۔ لیکن میری ابتدائی مدرسی بلکہ انتہائی طالب علمی کے زمانے میں ایک چیز کا خوب تجربہ ہوا اور ایسا کہ حد نہیں۔ مدرسہ کا قانون یہ ہے کہ بیماری کی چھٹی اس وقت لی جاتی ہے جب مدرسہ کا کام کرنے کی طاقت و وسعت نہ رہے اور مدرسہ کے کام میں دقت زیادہ ہونے لگے۔ میں نے دیکھا کہ جب کسی بھی ملازم نے معمولی سی بیماری میں چھٹی لی مثلاً سر میں معمولی سا درد یا طبیعت میں کچھ اضمحلال ہوا تو پھر وہ شخص اچھی طرح سے بیمار ہوئے بغیر نہیں رہا۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا کہ یہ مدرسہ کی حق تلفی کی سزا ہے یا ''لا تتمارضوا فتمرضوا'' کا مظہر ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''بتکلف بیمار نہ بنو ورنہ حقیقتاً بیمار بن جاؤ گے۔'' الحدیث۔ اس قسم کے واقعات بہت مشاہدہ میں آئے، نام تو لکھواتا نہیں، لیکن میں نے اپنے بے تکلف دوستوں کو ہمیشہ معمولی بیماری میں چھٹی لینے پر بھی ڈانٹا

اور بعض مرتبہ پیشن گوئی بھی کر دی کہ یہ بیمار ہوگا تیار رہو۔ اسی طرح مدرسہ کے سلسلے میں ایک تجربہ اور ہوا جس کے واقعات تو اس ۶۲ سالہ قیام مدرسہ میں کہ میں رجب ۲۸ ھ میں آیا اور اب شوال ۹۰ ھ ہے بہت کثرت سے دیکھے۔

مدرسہ کی حق تلفی کا خمیازہ:

جن لوگوں نے مدرسہ کے مال میں کوئی خیانت کی یا کوئی مدرسہ کے حقوق میں زیادہ کوتاہی کی وہ یا تو بیماری میں مبتلا ہوا یا کسی مقدمہ میں پھنسا۔ یا پھر اس کے یہاں چوری ہوئی۔ میرے ایک بہت ہی مخلص اور بزرگ ایک جگہ ملازم تھے اور ڈیڑھ سو روپے تنخواہ تھی وہ پانچ سو یا سات سو تنخواہ پر بہت دور دراز تشریف لے گئے۔ ان کی تشریف بری کے تقریباً سال بھر بعد ان کے مکان پر چوری ہوئی اور زبردست نقصان ہوا اللہ مجھے معاف فرمائے میں تو گستاخ ہوں ہی۔ میں نے ان کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ حادثہ سے رنج ایک فطری چیز ہے مگر اس حادثہ پر بجائے تعزیت کے مبارکباد دوں گا کہ یہ ضرورت سے زیادہ تحصیل مال کے لیے اتنی دور کا سفر کرنا آپ کی شان کے مناسب نہ تھا۔ آپ دینی حیثیت سے بہت اونچی جگہ تھے۔ جس کی موجودہ جگہ ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان کا میرے پاس بڑے عتاب کا خط آیا کہ اس حادثہ فاجعہ پر ہر ایک نے رنج وغم تعزیت اظہار ہمدردی اور غم میں شرکت لکھی، مگر آپ نے مبارک باد لکھی میں نے پھر لکھا کہ میں نے تو خط کے شروع میں ہی لکھ دیا تھا۔ کہ رنج فطری چیز ہے ہونا ہی چاہیے۔ مگر آپ کی شان کے مناسب نہ تھا کہ اہم دینی خدمت کو آپ نے چھوڑا اور بڑی تنخواہ پر دوسری جگہ تشریف لے گئے۔ اس قصہ کو اگرچہ نمبر کے شروع حصے سے زیادہ تناسب نہیں مگر قریب ہی قریب ہے۔

(۴)......اللہ تعالیٰ کے انعامات تو **لا تعد ولا تحصیٰ** ہیں ان کا احصاء وشمار تو کسی طاقت بشری سے بھی ممکن نہیں۔ ایک واقعہ اور یاد آ گیا جو تحدیث بالنعمۃ کے ذیل میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہاں ذہن میں نہیں رہا۔ سہارنپور کے قیام میں مالک نے ہمیشہ ہی دوستوں کو مجھ پر ایسا مسلط کر رکھا کہ اس ناکارہ کے نہلانے کے وقت بھی ابتدائے مدرسی سے ہی یا ایک دو سال بعد اتنے احباب جمع ہو جاتے ہیں، میں ان کو منع کرتا ہوں، روکتا ہوں اور خفا بھی ہوتا ہوں مگر غسل جمعہ میرا غسل میت ہی ہوتا ہے۔ بدن کو ملنے والے ہاتھ، کمر، پاؤں کو رگڑنے والے ہر ایک الگ الگ بہت سے ہو جاتے ہیں۔ ۴۴ ھ میں جب یہ ناکارہ حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ ایک سالہ قیام کے لیے گیا تو مدینہ منورہ حاضری پر ابتداءً کچھ اجنبیت سی تھی۔ مقامی احباب سے تعلقات زیادہ وسیع نہیں تھے۔

مدینہ منورہ میں ایک ڈاکو کا مجھ سے تعلق:

میرے مدینہ منورہ پہنچنے پر ایک نہایت پہلوان لحیم شحیم آدمی نہ معلوم مجھ پر کیوں مسلط ہو گیا۔ اجنبی آدمی جان نہ پہچان۔ مگر جمعہ کے دن زبردستی وہ میرے کپڑے لے کر دھوتا اور جمعہ کے روز اس قدر بے دردی سے غسل کے وقت بدن رگڑتا کہ ایک بھی دس پر غالب تھا۔ میں نے اس سے بارہا پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ ہمیشہ اس نے یہی جواب دیا کہ مستقل قیام کے لیے مدینہ پاک آیا ہوں۔ اللہ نے مجھ پر کرم کیا، احسان کیا، اپنے حبیب پاک کے دربار میں قیام کی توفیق دی، لیکن جب میں ذیقعدہ میں واپس ہونے لگا تو ایک دو دن پہلے اس نے بھی کہا کہ میں بھی ہندوستان جا رہا ہوں۔ میں نے بہت استعجاب سے پوچھا کہ تو تو مستقل قیام کے لیے کہہ رہا تھا اب واپس جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے آپ کو کبھی اپنا قصہ ہی نہیں سنایا، آپ نے کئی دفعہ پوچھا بھی، مگر مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں آپ مجھ سے زیادہ نہ ڈر جائیں۔ مجھے نکال نہ دیں۔

میں ریاست رام پور کا ایک مشہور ڈاکو ہوں کئی قتل کر چکا ہوں۔ مجھ پر قتل کا مقدمہ ہو گیا اور وارنٹ میرے نام جاری ہو گیا۔ میں وہاں سے روپوش ہو کر یہاں آ گیا۔ اللہ نے میری سچی توبہ قبول کر لی اور اپنے فضل سے آپ تک پہنچا دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ واپسی کی کوئی صورت نہیں، اس لیے کہتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے آ گیا ہوں۔ کل میرے گھر سے خط آ گیا کہ تیرا مقدمہ ختم ہو گیا اب شوق سے آ جا، اس لیے جا رہا ہوں۔ تم ہی سوچو کہ اس قصہ میں بھی مالک کا مجھ پر کتنا احسان تھا کہ میری خدمت کے لیے ایک ڈاکو مدینہ میں ہی پہنچا دیا اور جب آنے لگا تو اس کو معافی بھی مل گئی۔

"اللّٰھم لا أحصی ثناءً علیک انت کما أثنیت علیٰ نفسک رب أعنی علیٰ ذکرک و شکرک و حسن عبادتک."

ماموں عثمان مرحوم کا ایک دلچسپ واقعہ:

(۵)......اسی کے مناسب ایک قصہ یاد آیا۔ میرے ایک ماموں تھے، پروفیسر حافظ محمد عثمان، میری والدہ کے حقیقی چچازاد بھائی، علی گڑھ میں پروفیسر تھے، غالباً ڈیڑھ ہزار تنخواہ تھی یا کچھ کم ہو گی۔ اس کے بعد پشاور منتقل ہو گئے تھے اور ریٹائر ہونے تک وہیں مقیم رہے، مرحوم کو مجھ سے بڑی ہی محبت تھی اور ان کے دو چھوٹے بھائی الحاج ماموں داؤد صاحب جو آج کل ایبٹ آباد کے مشہور وکلاء میں ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی الحاج ماموں حکیم یامین صاحب جو آج کل مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے ناظم مالیات ہیں۔ یکے بعد دیگرے ہر ایک مظاہر علوم کے فارغ التحصیل ہیں۔ ماموں عثمان صاحب مرحوم اس سیہ کار اور اپنے بھائیوں کی وجہ سے علی گڑھ کے قیام میں بھی اور

پشاور کے قیام میں بھی تقسیم سے پہلے تک کاندھلہ آتے جاتے سہارنپور ضرور آتے اور چونکہ واقعی مجھ سے بہت محبت وشفقت فرمایا کرتے تھے، اس لیے گھنٹوں مجھ سے مناظرے بھی کرتے تھے، ان کا اصرار تھا کہ عربی طلبہ کو عربی کے ساتھ انگریزی ضرور پڑھائی جائے تاکہ معاشی مشکلات سے بے فکری رہے، صرف عربی پڑھنے سے جو تنخواہیں ملتی ہیں وہ ناکافی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کہ ناکارہ اس وقت بھی اور اب تک بھی عربی کے ساتھ انگریزی یا کسی دوسری تعلیم یا دستکاری وصنعت کا بہت سخت مخالف ہے۔ اس لیے کہ تجربہ یہ ہے کہ دوسری چیزوں میں اشتغال کے بعد عربی تعلیم میں بہت نقصان پہنچتا ہے۔ مگر مرحوم عربی پڑھنے والوں کی مالی بدحالی اور انگریزی پڑھنے والوں کی خوشحالی کو خوب بیان کرتے تھے، اسی بناء پر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی ماموں داؤد کو جس کی عربی علمی استعداد بہت عمدہ تھی اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب سابق صدر مدرس مظاہر علوم نے بھی ۴۵ھ میں مجھے مدینہ پاک ان کے متعلق لکھا تھا کہ مولوی داؤد بہت ذی استعداد ہیں چناں چنیں ہیں ان کو مدرسہ میں ضرور رکھا جائے۔ مگر عثمان مرحوم نے ان کو اپنے نظریہ کے موافق انگریزی پڑھا کر ہم سے کھو دیا، ماموں عثمان مرحوم ایک مرتبہ جمعہ کے دن تشریف لائے۔ بارہ بجے کے قریب مجھے غسل کرانے کے لیے ایک فوج مجھ پر مسلط ہوگئی، وہ بہت غور سے دیکھتے رہے، غسل کے بعد کہنے لگے کہ یہ ٹھاٹ ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم فقیروں کے کیا ٹھاٹ ہیں، ٹھاٹ تو آپ رئیسوں کے ہیں جن کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ہے، کہنے لگے کہ ہم کو نہلانے والے دو بھی نہیں ملتے یہاں دس لپٹ رہے ہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد کھانے میں شرکت ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانے میں میرے بائیں ہاتھ کی انگلی میں کچھ نکل رہا تھا، اس پر پایہ تو لگا ہوا نہیں تھا البتہ مرہم لگا ہوا تھا۔ اس لیے اس زمانے میں میرے دوست احباب کھانے سے فارغ ہوتے ہی پانی کا لوٹا سلفچی وغیرہ لے کر آتے اور میں ہاتھ پھیلا دیتا۔ ایک آدمی پانی ڈال دیتا اور دوسرا شخص صابن سے ہاتھ دھو دیتا اور تیسرا جلدی سے تولیہ سے ہاتھ پونچھ دیتا۔ کہنے لگے کہ مولوی زکریا! خدا کی قسم تنعم کی بھی کوئی حد ہو، تم سے اپنا ہاتھ بھی نہیں دھلتا، وہ بھی خدام ہی دھوتے ہیں۔ میں نے کہا، ماموں جی! میں تو فقیر آدمی ہوں، میری تو ڈیڑھ ہزار تنخواہ بھی نہیں۔ آپ انگریزی پڑھے ہوئے ہیں ڈیڑھ ہزار تنخواہ ہے، میں انگریزی سے ناواقف ہوں، بھلا میں آپ کی کیا حرص کرسکتا ہوں، فرمانے لگے کہ ایسی تیسی ڈیڑھ ہزار کی یہاں تو دو آدمی بھی ہاتھ دھلانے کے لیے نہیں ملتے۔ کہنے لگے مجھے تخلیہ میں کچھ بات کرنی ہے۔ میں نے کہا کہ آج تو موقعہ نہیں ملے گا، کل صبح کو اوپر کمرہ میں چلیں وہاں بات ہوجائے گی۔

وہاں کمرے میں پہنچتے ہی ایک پنجہ لٹکا ہوا ملا۔ جو لکڑی کا بھی ہوتا ہے اور تانبے پیتل کا بھی ہوتا ہے۔ ایک لانبی سی ڈنڈی اور اس کی جڑ میں ہاتھ کی اُنگلیوں جیسے نشان ہوتے ہیں۔ کمر وغیرہ

کھجانے کے کام آتا ہے۔ حدیث پاک میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہے، ''ومع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدری یحک به راسه کذا فی المشکوٰۃ عن الصحیحن'' کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مدری (پنجہ) تھا جس سے سر مبارک کو کھجا رہے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی ماموں عثمان کہنے لگے کہ یہ کیا چیز ہے؟ میں نے کہا کہ یہ کمر کھجانے کے لیے ہے، اگر کوئی خادم نہ ہو اور خود ہی کھجانا پڑ جائے تو اس سے مدد ملتی ہے۔ انہوں نے بہت غور سے اس کو اٹھا کر دیکھا۔ میں نے کہا کہ پسند ہو تو آپ کی نذر ہے کہنے لگے کہ پسند تو ہے واقعی بڑی اچھی چیز ہے اور ہم جیسوں کے لیے تو بہت ضروری جن کے پاس خدام نہ ہوں، مگر تم سے لیتے ہوئے غیرت آتی ہے۔ میں نے کہا غیرت کی کوئی بات نہیں۔ میری ڈیڑھ ہزار روپے تنخواہ نہیں ہے جس پر میں یہ کہوں کہ میں دوسری خرید لوں گا۔ لیکن قوی امید ہے کہ جس مالک نے یہ دی ہے وہ اور بھی دے دے گا۔ آپ اسے شوق سے لے جائیں۔ میں نے بہت ہی اصرار کیا مگر اپنا دل چاہنے کے باوجود نہ لے گئے، نہ معلوم کیا غیرت آئی۔ لیکن مرحوم کا یہ مناظرہ آخر تک رہا۔ ان کا وہی فقرہ مختلف عنوانات سے کہ دنیا دارالاسباب ہے اور میرا وہی جواب کہ مقدر سے زیادہ کہیں نہیں مل سکتا۔ جس کی کچھ تفصیل آپ بیتی نمبر۱ میں لکھوا چکا ہوں میں نے ان سے بارہا یہ بھی کہا آپ سے کہنے کی تو بات نہیں اللہ تعالیٰ معاف فرمادے، تمہاری ڈیڑھ ہزار اور میری ضابطہ میں صرف ۳۵ روپے تنخواہ ہے وہ بھی کبھی ملتی ہے اور کبھی نہیں، مگر آپ خود ہی ملاحظہ فرمالیں کہ الحمد للہ یہ ناکارہ مالی حیثیت اور راحت و آرام کے اعتبار سے آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ کہنے لگے کہ تمہاری اور بات ہے، اس پر ہر ایک کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کہا اور بات ہے، اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ یہ بھی کہا کہ آپ ہی سوچئے کہ ایک کتا آپ کے دروازے پر پڑ جائے، آپ کے مکان کی حفاظت کرے اور ہر آنے والے پر بھونک کر متنبہ کرے تو کیا آپ کی غیرت تقاضہ کرے گی کہ اس کو کوئی ٹکڑا نہ ڈالیں۔ آپ مجبور ہوں گے کہ دستر خوان کی بچی ہوئی روٹی، ہڈی اس کو ضرور ڈالیں۔ تو مالک الملک رب العالمین جس کے ایک لفظ ''کُن'' میں دنیا کے سارے خزانے ہیں، اس کے دروازے پر کوئی شخص اس کے کام کی نیت سے اخلاص سے بغیر خود غرضی کے اس کے دین کی خدمت کے واسطے پڑ جائے، کیا وہ اپنے خدمت گاروں کو بھوکا ننگا رکھ سکتا ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ساری دنیا سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ کی غیرت تو تقاضہ نہ کرے کہ وہ کتا بھوکا رہ جائے اور اللہ جل جلالہٗ کی غیرت اس کا تقاضہ کر سکتی ہے کہ اس کے دین کی خدمت کرنے والا بھوکا رہ جائے یہ ناممکن ہے اور جن اکابر کے یا

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر وفاقہ کے واقعات ہوئے ہیں وہ اختیاری خود مانگے ہوئے ہیں اور عین محبوب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تو خود مصرح ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں ترمذی شریف مسند احمد کے حوالے سے حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے واسطے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے مجھ سے یہ پیش کش فرمائی کہ ''اگر تم چاہو تو مکہ کے سارے جنگلوں، سنگستانوں کو سونا بنا دیا جائے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''یا اللہ مجھے نہیں چاہیے، میں چاہتا ہوں کہ ایک دن شکم سیر ہو کر کھاؤں اور ایک دن فاقہ کروں، تاکہ جس دن بھوکا رہوں آپ کے سامنے دست سوال پھیلاؤں، عاجزی کروں اور آپ کو یاد کروں اور جس دن پیٹ بھر کر کھاؤں، اس دن تیرا شکر ادا کروں اور حمد وثنا کروں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور دعاء ہے ''اللّٰھم اجعل رزق اٰل محمد قوتاً'' اے اللہ میری اولاد کی روزی بقدر کفایت عطاء فرما۔ اسی دعاء کی وجہ سے سادات عموماً مالدار نہیں ہوتے، الا ماشاء اللہ۔ مشکوٰۃ شریف کی دوسری طویل روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ ''اگر میں چاہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ ہر جگہ پھرا کریں۔'' اللہ تعالیٰ کی اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔

ایک قصہ میں نے پہلے بھی لکھوایا، جو میں نے اپنے والد صاحب سے بیسیوں مرتبہ سنا ہے مگر باوجود تتبع کے مجھے اب تک نہیں ملا، فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اماں جی کو (یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) جزائے خیر عطاء فرمادے وہ ہمارا تو ناس مار گئیں لیکن اُمت کا بھلا کر گئیں۔ وہ یہ بددعاء دے کر گئیں کہ ''اللہ ان علماء کی روزی پریشان کردے'' اور اُمت کے لیے یقیناً بڑی خیر کی دعاء ہے۔ ہم مولویوں کو بے فکری اور اچھی طرح کھانے کو مل جائے تو ہم سیدھے منہ کسی سے بات بھی نہ کریں۔ ان مدرسوں کے چندوں کی بدولت ہر ایک سے خوشامد کرنی پڑتی ہے، فاسق و فاجر، ڈاڑھی منڈوں کے سامنے بھی جھکنا پڑتا ہے۔

حافظ یوسف رائپوری نور اللہ مرقدہ کا عجیب واقعہ:

(۶)...... یہ واقعات کسی خاص شخصیت سے متعلق یا کسی خاص مضمون کے ساتھ مرتبط نہیں۔ کیف ما اتفق جو علی گڑھ میں چارپائی پر پڑے پڑے یاد آتے رہے نوٹ کراتا رہا۔ حضرت الحاج حافظ محمد یوسف صاحب رامپوری قدس سرہٗ ابن قطب الاقطاب سید شہداء زمانہ حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ جن کے مختصر حالات یہ ناکارہ ارشاد الملوک کی تمہید میں لکھوا چکا ہے۔ حافظ محمد یوسف صاحب بڑے اونچے لوگوں میں تھے۔ ''الولد سرّ لابیہ'' کے سچے مصداق تھے۔ اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کی طرح سے بڑے ظریف خوش طبع، بھوپال میں تحصیل دار

رہے آخر میں رامپور تشریف لے آئے تھے۔ ایک دن میرے ماموں مولانا حافظ محمود صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے جو قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کے خسر تھے، ان کے لڑکپن میں فرمایا کرتے تھے کہ محمود ہمارے پاس کچھ چٹکلے ہیں ہم سے پوچھ لینا، گھر بیٹھے دو سو روپے ملا کریں گے۔ اس زمانے کے دو سو آج کل کے دس ہزار کے بقدر تھے۔ مجھے اپنے بچپن کا خوب یاد ہے کہ ایک پیسے کا سولہ گنڈے کوڑیوں کے آتے تھے یعنی ۶۴ عدد، کیونکہ ایک گنڈا چار عدد کوڑیوں کا ہوتا تھا۔ معمولی گھرانے والی عورتیں بچے کو ایک پیسہ دے کر یوں کہا کرتی تھیں کہ دو کوڑی کا نمک، دو کوڑی کی مرچیں، دو کا دھنیہ، ایک کی ہلدی اور چار کوڑی کا گوشت۔ سولہ سترہ کوڑیوں میں یعنی ایک پیسہ کے چوتھائی حصہ میں گھر کی یہ سب چیزیں آجاتی تھیں۔ حافظ محمود صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

عصر کی نماز میں تکبیر ہو رہی تھی، صف سے آگے کو منہ نکال کر فرمایا کہ ارے محمود ہماری بات یاد رکھنا کل کو ہمیں سفر میں جانا ہے۔ وہ سمجھے کہ گنگوہ یا جھنجھانہ وغیرہ جانا ہوگا کہ اس زمانے میں یہ اکابر کچھ سواریوں کے محتاج نہ تھے۔ لنگی کاندھے پر اور لکڑی ہاتھ میں بس چلے جا رہے ہیں۔ لمبے لمبے سفر اسی طرح پیدل طے فرمایا کرتے تھے۔ تذکرۃ الخلیل میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اس قسم کے واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ اگلے روز حافظ صاحب نے گنگوہ، تھانہ بھون، جھنجھانہ، دیوبند وغیرہ خطوط تحریر فرمائے کہ آج سفر کا ارادہ ہے، لوگ سمجھے کہ اکثر قرب وجوار میں بھی جاتے رہتے ہیں ممکن ہے کہ بھوپال کا ارادہ ہوگا یا کسی قریب جگہ کا۔ دوسرے دن عصر کی نماز جماعت سے پڑھی اور مسجد کے صحن کے سامنے ایک چارپائی پڑی تھی اور اس پر اکثر لیٹا بھی کرتے تھے، وہاں پہنچ کر کرتہ نکالا، صرف لنگی بندھی ہوئی تھی قبلہ کی طرف منہ کر کے لیٹ گئے اور یہ جا وہ جا۔ نمازی مسجد سے نکل کر محل (حویلی) جو مسجد کے قریب بہت مشہور ومعروف مکان اعزہ کے ہیں وہاں تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ مسجد کا مؤذن بھاگا ہوا گیا کہ چلو حافظ جی کو دیکھو کیا ہوا۔ جب سب واپس آئے تو دیکھا کہ حضرت حافظ صاحب ابدی سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔

جس زمانے میں حضرت حافظ صاحب نور اللہ مرقدہٗ بھوپال میں تشریف فرما تھے اس زمانے کے تصرفات کے قصے بھی بہت مشہور ہیں۔ اخفاء حال بہت تھا، دوسروں کے سامنے تہجد بھی نہیں پڑھتے تھے، ایک تقریب میں تشریف لے گئے بعض اعزہ کو خیال ہوا کہ آج حافظ صاحب کے معمولات دیکھنے کا موقع ملے گا، جب سب لیٹ گئے اور حافظ صاحب نے اندازہ کیا کہ یہ سب سو گئے ہوں گے تو چپکے سے اُٹھے، لوٹا اُٹھانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ایک صاحب جلدی سے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ حافظ صاحب جلدی سے اپنی چارپائی پر لیٹ گئے، آدھے پون گھنٹے بعد یہی صورت

پیش آئی۔ حافظ صاحب پھر لیٹ گئے، تیسری دفعہ جب یہ قصہ پیش آیا تو ان صاحب کے پیٹ میں درد اس قدر شدید ہوا کہ تڑپ گئے۔ حافظ صاحب سے معافی مانگی اور جب وہ بہت بے قرار ہوا اور حافظ کو ترس آیا تو فرمایا کہ دوسروں کو ستانے کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ جب حافظ صاحب بھوپال میں تحصیل دار تھے تو میرے نانا نور اللہ مرقدہٗ ان کا نام بھی حافظ محمد یوسف صاحب ہی تھا اپنے بچپن میں ان کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ بڑے قصے حضرت حافظ کے سنایا کرتے تھے اور بے تکلف بھی بہت تھے۔

ایک مجذوب بھوپال میں آیا، بڑی اس کی شہرت اور خوارق وکشوف میں مشہور اور ہر شخص سے اس نے تمنا ظاہر کی کہ میں حضرت حافظ صاحب سے تخلیہ میں دو بات کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ حافظ محمد یوسف صاحب کاندھلوی تو ان سے کہہ سکتے ہیں اور کسی کو جرأت نہیں ہے۔ وہ نانا ابا کے پاس آئے، انہوں نے اپنے زور تعلق میں وعدہ فرمالیا اور حضرت حافظ صاحب سے آکر کہا کہ ایک مجذوب صاحب چناں ہیں اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں ان کو کس وقت بلاؤں۔ حضرت حافظ صاحب نے فرمایا کہ میں اس نالائق سے نہیں ملنا چاہتا۔ نانا ابا نے کہا کہ حضرت وہ تو اتنے پہنچے ہوئے ہیں کہ وہیں بیٹھے ہوئے آپ سے مل لیں گے۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس کے باپ کو بھی نظر نہیں آسکتا جا بھاگ جا۔ نانا ابا نے معذرت کر دی، اس نے سب کی خوشامد بہت کی مگر حافظ صاحب نے قبول نہیں فرمائی۔

سنا ہے کہ میرے نانے ابا کو اللہ معاف فرمائے کہ بچپن میں ناچ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ حافظ صاحب کو خبر نہیں تھی اتفاق سے کسی نے شکایت کر دی۔ حضرت حافظ صاحب نے میرے نانا صاحب کو بُلایا کہ میاں یوسف! ہم نے سنا ہے کہ تم کو ناچ دیکھنے کا بہت شوق ہے اور آج تو سنا ہے کہ بہت ہی عمدہ ناچنے والی آئی ہے، دیکھو ناچ یوں نہیں دیکھا کرتے کہ فقیروں کی طرح منہ الال کر دیکھنے کھڑے ہوگئے اور اپنی جیب سے پانچ روپے نئے نکال کر ان کو دیے اور فرمایا کہ ناچ دیکھنے کا دستور یہ کہ وہ جب سامنے آکر ٹھمری لگا دے تو ایک روپیہ اس کی طرف پھینکو، پھر دیکھو کہ وہ کیسا تم کو گھورے گی اور جب تمہاری طرف آئے گی تو پھر تمہاری طرف ہی دیکھے گی۔ نانا ابا اس قدر خوش ہوئے کہ اجازت بھی ملی اور روپے بھی اور نماز عشاء کے بعد پہلے ہی سے جا کر اگلی صف میں کھڑے ہوگئے۔ سارا میدان مجمع سے لبریز اور اس کی آمد کا مشتاق تھا، تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ اس ناچنے والی کے پیٹ میں سخت درد ہے، حکیم، ڈاکٹر لیجیو دیجیو خوب شروع ہوئی، رات بارہ بجے تک سراپا اشتیاق اور دست بہ دعاء۔ مگر ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔'' رات کو جب نانا ابا واپس لوٹے تو حضرت آرام فرمانے چلے گئے تھے۔ صبح کو وہ روپے حضرت حافظ صاحب کے

پیروں میں پھینکے اور عرض کیا کہ مجھے ویسے ہی منع فرمادیتے، آپ نے اس بیچاری کو کیوں مارا۔ حضرت حافظ صاحب نے بطور تجاہل عارفانہ کے پوچھا کہ کیا ہوا؟ عرض کیا کہ آپ کو خبر نہیں کیا ہوا؟ آپ ہی نے تو اس غریب کو مارا۔ نانا ابا فرمایا کرتے تھے کہ اس دن سے ناچ سے ایسی وحشت ہوئی کہ ناچ کے نام سے بھی قے ہوتی تھی۔ قصے تو بچپن میں ماموں محمود صاحب رامپوری سے اور نانا ابا سے خوب ہی سنے۔ اس وقت کچھ اچھی طرح یاد بھی نہیں آرہے اور طول بھی ہوتا جارہا ہے۔

نانا ابا اور ان کے تعویذ

(۷)...... میرے نانا صاحب کو تعویذ کا بہت ہی شوق تھا۔ حضرت حاجی صاحب گنگوہی قدس سرہٗ، حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی اور نہ معلوم کتنے نام بتایا کرتے تھے محض تعویذ سیکھنے کے لیے۔ ان اکابر کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ بعض تعویذ کی زکوٰۃ انہوں نے ساری رات دریا میں ایک پاؤں سے کھڑا ہوکر ادا کی اور بعض جگہ صرف ایک سیکھنے کے لیے کئی کئی دن سفر بھی اختیار کیے۔ ان کے تعویذ اور وظیفے بھی بڑے زوردار تھے۔ جو بیمار ایسا ہوتا کہ سارے تیماردار اس سے عاجز آچکے ہوں تو تیماردار کہتے کہ نانا ابا، بڑے ابا، دادا ابا، مختلف خطابات دے کر کہتے کہ اب تو وظیفہ پڑھ دو باقی سب عاجز آچکے ہیں۔ اول تو وہ ٹال مٹول کرتے اور پھر سختی سے ڈانٹتے اور پھر جب بہت ہی اصرار ہوتا تو مریض کے قریبی رشتہ داروں سے اجازت لیتے کہ پڑھ دوں؟ اور جب سب متفق اللسان ہوکر کہتے کہ پڑھ دیجئے تو بیٹھ کر پڑھتے، اس میں عجیب تاثیر میں نے خود دیکھی۔ یہ وظیفہ تقریباً تین گھنٹے کا ہوا کرتا تھا۔ لیکن عموماً دو گھنٹے بعد یا تو گھر والے کفن کے لیے آدمی بھیج دیتے یا مریض اپنے سہارے سے بیٹھ کر یہ کہتا کہ بھوک لگ رہی ہے کچھ کھانے کو دے دو، ایک خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

ایک معرکۃ الآراء وظیفہ چوری کے لیے بھی تھا۔ ہر چوری پر تو کبھی نہیں پڑھتے تھے خواہ کوئی کتنا ہی اصرار کرے۔ بعض دفعہ تو درخواست کرنے والوں کو ڈانٹتے کہ اللہ نے اس کی روزی اسی میں رکھی تھی تو زبردستی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جس چوری کے متعلق ان کو بھی اہمیت پیدا ہو جاتی تو اس کے واسطے وہ بھی پڑھا کرتے تھے اور آس پاس جہاں شبہ ہوتا تو جاسوس مقرر کرتے کہ کسی کو دست جاری ہوئے یا نہیں اور جہاں معلوم ہوتا کہ فلانے کو دست لگ گئے وہاں چپکے سے پیام بھیجتے کہ اگر تو نے واقعی چوری کی ہے تو وہ چیز چپکے سے میرے پاس دے جا میں نام ظاہر نہیں کروں گا ورنہ جتنی چاہے دوائیاں اور دعائیں کرلے یاڑی دستوں سے مرجائے گا۔ وہ شخص چپکے سے بھیج دیتا اور دست بند ہو جاتے اور مالک کو بُلا کر وہ چیز اس کو دے دیتے تھے اور وہ لوگ جتنا چاہے

اصرار کر لیتے کہ اس کا نام بتا دو، مگر وہ نام نہیں بتاتے تھے۔

ان کے اور بھی معرکۃ الآراء تعویذوں کے قصے ہیں۔ بیماری چونکہ کئی سال رہی اس لیے انہوں نے اپنی بیماری کے زمانے میں جب تین سال تقریباً ان کی بیماری کو گزر گئے میں اتفاق سے کاندھلہ گیا ہوا تھا۔ میری مستقل عادت ہمیشہ رہی کہ ایک ہی رات جاتا ہوا ایک ایک چکر اپنے سب رشتہ داروں کے یہاں حسب مراتب ضرور کیا کرتا۔ حسب مراتب کا مطلب یہ ہے کہ کہیں تو ایک دو منٹ اور کہیں پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ بیٹھتا۔ میں جب نانا ابا کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے فرمایا میں تو تجھے بہت دنوں سے بہت ہی یاد کر رہا ہوں تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ تعویذ کس محنت سے حاصل کیے اور کتنے مفید اور مجرب اور کارآمد ہیں۔ تیرے سوا تو میرا کسی کو دینے کو دل چاہتا نہیں۔ میرا یوں جی چاہتا ہے کہ تو ایک دو دن ٹھہر کر میری بیاض مجھے سنا دے، میں اس میں جو تجھے بتانا ہوگا بتا دوں گا۔ میں نے عرض کیا، جی نانا ابا میں حضرت سے ایک ہی دن کی اجازت لے کر آیا تھا۔ اس لیے اب تو نہیں ٹھہر سکتا آیندہ سفر میں انشاءاللہ دو دن کی اجازت لے کر آؤں گا۔

مجھے تعویذوں کا شوق اس وقت تو کیا اب تک بھی نہیں ہوا۔ وہ تو زمانہ میرے طلب علم کا تھا، مجھے نانا صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے کہنے پر اس قدر بوجھ پڑا کہ اب تک بھی یاد ہے۔ میرا خیال تھا کہ طبیعت ناساز ہے، اگلے پھیرے تک چل دیں گے۔ میں تقریباً چھ سات مہینے کے بعد گیا وہ حیات تھے، میں اس ڈر کے مارے ملنے بھی نہیں گیا۔ آٹھ، نو مہینے کے بعد پھر دوبارہ کاندھلہ جانا ہوا اور انہیں خبر ہوگئی کہ وہ بار بار پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بلایا اور قلق کا اظہار کیا اور کہا کہ تو پہلے پھیرے میں مجھ سے مل کر بھی نہیں گیا۔ میں نے کہا بہت عجلت میں آنا ہوا تھا اور اب بھی بہت جلدی میں آنا ہوا ہے اور اس واسطے دو تین دن قیام ضروری ہے۔ میں انشاءاللہ مستقل وقت لے کر واپس آؤں گا۔ ان کو اپنی اس بیاض کا بہت ہی اہتمام تھا۔ مجھے تو قلق اب بھی نہیں ہوا، اس لیے کہ مجھے تعویذوں سے بالکل ہی مناسبت نہیں۔ میرے تعویذوں کی ابتداء تو یہ ہے کہ میرے حضرت قدس سرہٗ کے ہاتھ میں رعشہ تھا، جب حضرت قدس سرہٗ سے کوئی شخص تعویذ مانگتا میں ہر وقت حاضر رہتا ہی تھا۔ حضرت ارشاد فرما دیتے، اس مرض کے مناسب کوئی قرآن کی آیت یا دعا یاد ہو تو لکھ دو میں لکھ دیتا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ حضرت کی برکت سے اس میں فائدہ دے دیتے۔ ابتداءً تو یہی معمول رہا۔ مگر جب تعویذوں کی بھرمار ہوگئی تو بجائے قرآن پاک کی آیت یا حدیث پاک کی دعاء کے کوئی اللہ کا پاک نام لکھ دیتا اور اللہ جل شانہٗ اپنے پاک ارشاد ''انا عند ظن عبدی بی'' یعنی میں بندہ کے ساتھ ہوں اس کے حسن ظن کا معاملہ کرتا ہوں، کی بنا پر اللہ تعالیٰ اس میں بھی فائدہ دے دیتے تھے اور اب تو کئی سال سے یہ سلسلہ بھی نزول آب کی وجہ سے بند ہو گیا۔ دوسرے

احباب ہی جو میں بتا دیتا ہوں لکھ دیتے ہیں۔ مجھے نانا ابا کے زمانے میں خبر نہیں تھی کہ یہ تعویذوں والا مسئلہ بھی میرے پیچھے اس بُری طرح پڑے گا، ورنہ دو چار اہم تعویذ سیکھ ہی لیتا۔

ایک بادشاہ اور کیمیا کا ایک عجیب قصہ:

(۸) ......ایک عجیب قصہ بڑی عبرت کا میں نے اپنے والد صاحب سے کئی مرتبہ سنا، ایک بادشاہ تھا۔ اس کو کیمیا کی دھت تھی اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جس کو کیمیا کا مرض پڑ جاتا ہے۔ اس کی عقل و ہوش شطرنج کے کھلاڑی سے بھی زیادہ کھو جاتا ہے۔ میں نے اپنے کئی دوستوں کو دیکھا جن کو اس کا چسکا تھا۔ جب ان کا راستے میں کہیں ساتھ ہو جاتا وہ قدموں پر نگاہ جمائے کبھی ادھر کبھی اُدھر دیکھتے جایا کرتے اور جہاں کہیں شبہ ہو جاتا وہاں کھڑے ہو کر اور بوٹوں کو دیر تک مل مل کر سونگھتے تھے۔ بادشاہ بھی اسی فکر میں ہر وقت رہتا۔ وزراء کا ناطقہ بند رکھتا۔ ایک وزیر نے کہا کہ حضور اتنے متفکر رہتے ہیں، حضور کی سلطنت میں تو فلاں سُقّہ فلاں جگہ رہتا ہے بڑا ماہر ہے اسے خوب بنانی آتی ہے۔ بادشاہ کو بڑی حیرت ہوئی، کہنے لگا ہماری سلطنت میں اس کا جاننے والا ہے اور ہم اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ چار سنتری بھیج دیے کہ اس سقے کو پکڑ لاؤ۔ سقہ پیش ہوا، کپڑے پھٹے ہوئے، لنگوٹا بندھا ہوا بدن پر، بجائے کرتے کے ایک گاڑھے کی کمری بہت پھٹی ہوئی۔ بادشاہ کو اس کی صورت دیکھتے ہی بہت نفرت ہوئی۔ اس سے پوچھا کہ تجھے کیمیا بنانی آتی ہے؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''حضور تو بادشاہ ہیں، سمجھ دار ہیں، دنیا کے حاکم ہیں، اگر مجھے کیمیا آتی تو میرا یہ حال ہوتا جو حضور دیکھ رہے ہیں۔ میں بھی کوئی محل ایسا ہی بناتا جیسا حضور کا ہے۔'' بات معقول تھی بادشاہ کی بھی سمجھ میں آ گئی، چھوڑ دیا اور اس وزیر کو بُلا کر ڈانٹا۔ وزیر نے قسم کھائی کہ حضور مجھے تو خوب تجربہ ہے، اسے خوب آتی ہے۔ بادشاہ نے سلطنت کا انتظام ولی عہد کے سپرد کیا، بدن پر بھبھوت ملا تاکہ پہچانا نہ جائے اور اس وزیر کو ساتھ لے کر سقہ کے گھر پہنچا، جب اس نے گھر کا نشان بتایا وزیر کو چلتا کر دیا۔ ''حب الشئ يعمي ويصم'' چیز کی محبت آدمی کو اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ جب وہ سقہ گھر سے نکلا یہ بیٹھا رہا۔ جب وہ شام کو پانی ڈالنے جانے لگا تو اس کے ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا بڑے میاں آپ تو بہت بوڑھے ہو گئے ہیں، آپ کو تو بڑی دِقت ہو گی، میں تو گھر سے فالتو مارا مارا پھرتا ہوں، اگر آپ مجھے ٹھکانے بتا دیں تو میں ہی گھروں میں پانی ڈال آیا کروں، سقہ نے کہا نہیں بھائی میری تو روزی اسی میں ہے تو اپنا کام کر۔ کہنے لگا بڑے میاں تم مجھے کچھ اچھے ہی بہت لگے ہو، میں تو تمہاری خدمت میں رہنا چاہتا ہوں، تم سے کچھ مانگنے کا نہیں، نہ مجھے روٹی چاہیے اور نہ کچھ۔

شام کو سقہ نے جب وہ روٹیاں مانگ کر لایا، بادشاہ کی تواضع کی مگر اس نے انکار کر دیا کہ مجھے بالکل بھوک نہیں، غمزدہ ہوں، پریشان ہوں، میں تو کئی کئی دن کا فاقہ کرتا ہوں، سقّہ نے بڑے اصرار سے دو چار لقمہ کھلائے۔ (یہاں پھر میں وہی کہوں گا جو ابھی ماموں عثمان کے قصہ میں کہہ کے آیا، ایک سقّہ کی غیرت نے تو تقاضہ نہ کیا کہ ایک آدمی اس کا کام کرے اور وہ بغیر اس کے روٹی کھالے، مگر ہم لوگوں کو اس کا بالکل یقین نہیں آتا کہ ہم اخلاص سے اللہ کا کام کریں اور وہ ہمیں بھوکا مار دے، البتہ اتنا فرق ہے سقہ عالم الغیب نہیں تھا، اس لیے دھوکہ میں آگیا۔ مالک عالم الغیب ہے اسے حقیقت حال معلوم ہے کون واقعی اخلاص سے مالک کا کام کر رہا ہے اور کون دھوکہ کر رہا ہے۔)

غرض بادشاہ نے سقہ کی بہت ہی خدمت کی۔ دن بھر اس کا پانی بھرتا، رات کو جب سقہ لیٹتا اس کا خوب بدن دباتا، ہٹا کٹا جوان، قوی، سقّے کو بھی پانچ سات دن میں وہ مزا آیا کہ لطف ہی آگیا۔ دو تین مہینے سقّے نے خوب ٹٹولا خوشامد کی کچھ کھالے، کچھ پیسے مقرر کر لے۔ بادشاہ نے کہا۔ اجی میاں مجھے مزدوری کرنی ہوتی تو دنیا میں بہت مزدوریاں، مجھے تو تم اچھے لگتے ہو۔ میں تو راستے میں بیٹھ گیا تھا، تمہاری صورت مجھے کچھ اچھی لگی۔ اگلا شعر تو میں نے اپنے والد سے نہیں سنا۔ مگر واقعے کے مناسب تھا یاد آگیا:

گرے میری نظروں سے خوبانِ عالم
پسند آگئی تیری صورت کچھ ایسی
دیر وحرم میں روشنی شمس و قمر سے ہو تو کیا
مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں
گورے کالے پر نہیں موقوف
دل کے آنے کے طریقے نرالے ہیں
دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشہ ان کا

غرض بادشاہ نے وہ محبت کے جذبے دکھائے کہ سقہ بھی سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بڑھاپے میں عاشق زار کہاں سے پیدا ہو گیا۔ کبھی کہتا، ابا جی لنگی باندھ کے کپڑے دے دو میں دھولاؤں، ارے بھائی میں تو خود دھولوں گا، اجی تم بڑھاپے میں کہاں تکلیف اٹھاؤ گے، ان میں جوئیں ڈھونڈتا۔ خوب پڑے پڑے چھیت چھیت کر صاف کرتا۔ کچھ پیسے تو ضرور ساتھ ہوں گے۔ بڈھے کو جھانسہ دے کر کچھ اِدھر اُدھر سے کھالیتا مگر بڈھے کے سامنے اپنے فقر و فاقہ اور زہد کا زور دکھاتا۔ چار پانچ

مہینے بعد بڈھے نے کہا۔ ''ارے لونڈے مجھے کیمیا آتا ہے، بادشاہ نے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔ میں (سخت گالی دے کر) اس کو بھی انکار کر آیا۔ تجھے ضرور بتاؤں گا'' بادشاہ کی جان میں جان تو آ گئی۔ مگر زبان سے اتنی سختی سے انکار کیا کہ کیمیاء کی ایسی کی تیسی، مجھے تو تمہاری محبت نے مار رکھا ہے۔

آٹھ دس دن تک سقہ اصرار کرتا رہا۔ بادشاہ انکار کرتا رہا۔ ایک دن بڈھے نے کہا، میں بڈھا ہو گیا ہوں یہ اِلم (علم) میرے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ کسی اور کو تو میں بتانے کا نہیں تجھے ضرور بتاؤں گا۔ بھائی محبت سے محبت ہوتی ہے مجھے بھی تجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ اگر چہ تو نے مجھے اپنا حال تو بتایا نہیں، کون ہے کہاں سے آیا ہے؟

ابا جی کیا اپنا حال بتاؤں۔ لاوارثی ہوں، یونہی مارا مارا پھرتا ہوں، گھر بھی بھول بھال گیا کہ کہاں تھا، اب تو تم ہی اپنا بیٹا بنالو (غرض میں تو آدمی گدھے کو بھی باپ بنالیتا ہے یہ تو بہر حال آدمی تھا) ایک صبح ہی صبح سقہ بادشاہ کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف گیا اور پچیس تیس بوٹیاں اس کو دکھائیں اور اسی سے توڑوائیں اور گھر آ کر اسی سے کیمیا بنوائی۔ بادشاہ تو اس پر مر ہی رہا تھا، خوب غور سے دیکھا اور رات ہی کو بھاگ گیا۔ اگلے دن سقہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ ''کمبخت بہت ہی دھوکہ باز تھا، بے ایمان، یوں کہے تھا مجھے تجھ سے محبت ہے۔ انجان آدمی سے تو کبھی منہ نہ لگائے۔''

اپنے تخت پر پہنچ کر ان ہی سنتریوں کو بھیجا وہ پکڑ لائے بادشاہ نے پوچھا ارے سقے سنا تجھے کیمیا آتی ہے۔ اجی میاں آپ نے تو پہلے بھی پوچھا تھا، مجھے کیمیا آتی تو میں یوں مارا مارا پھرتا۔ مگر پانچ چھ مہینے جس نے پاؤں دبائے ہوں وہ کہاں چھپ سکے تھا۔ سقہ اس کے منہ کو گھورتا رہا۔ بادشاہ نے کہا مجھے بھی پہچان لیا۔ سقہ نے کہا میاں خوب پہچان لیا۔ بادشاہ نے کہا، تو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ سقہ نے کہا میاں کیمیا تو پاؤں دبانے سے آتی ہے بادشاہ بن کر نہیں آتی، میاں کیمیا کے واسطے تو سقہ بننا ضروری ہے۔ سنا ہے بادشاہ بہت ہی خوش ہوا اور اسے بہت ہی انعام دیا۔ اگلا شعر بھی میرا سنا ہوا نہیں، میری ہی طرف سے اضافہ ہے۔

تمنا درد دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
سُرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر سے پس جانے کے بعد

سقے نے بات تو بہت ہی صحیح اور پتہ کی کہی، خاکساری، تواضع اور خوشامد سے جو ملتا ہے وہ بڑائی اور تکبر سے نہیں ملتا۔ اس قسم کے قصے تو اپنے بڑوں سے بہت سُن رکھے ہیں۔ مگر رسالے میں نمونے ہی لکھوائے ہیں۔

مپند ار جانِ پدر گر کسی
کہ بے سعی ہر گز بجائے رسی

میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ محنت، جفا کاری، پستی کے بڑے قصے سنایا کرتے تھے۔ اللہ انہیں بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ او کما قال صلی اللّٰہ علیه وسلم.''

(ترجمہ) ''جو اللہ کے لیے تواضع کرے اللہ اس کو بلند درجے عطاء فرماتے ہیں۔''

یہاں تو تواضع بھی اللہ کے لیے نہیں تھی غرض کے واسطے تھی۔ مگر تواضع اور سقہ کے پاؤں دبانے نے کیمیا سکھادی۔

ایک نابینا اہل حدیث کا قصہ:

(۹)......ابتدائی مدرسی میں ایک اہلِ حدیث نابینا جس کا نام تو مجھ کو یاد نہیں مگر میرے کمرے میں ان کی تالیف ''میزان الشریعۃ'' کے بہت سے حصے رکھے ہیں، وہ نابینا تھے اور اہلِ حدیث میں سے تھے۔ وہ مشکوٰۃ کی احادیث کے (جو مسلک اہلِ حدیث کے موافق ہوں) چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیا کرتے تھے۔ ایک باب الوضو، ایک میں باب التیمم، ایک میں باب الحیض وغیرہ خود ہی تالیف کرتے اور خود ہی طبع کرایا کرتے تھے۔ سہارنپور میں ہمیشہ اس ناکارہ کے مہمان رہتے اور دیوبند میں حضرت مولانا الحاج سید انور شاہ صاحب کے مہمان رہتے تھے۔ ان کا دستور یہ تھا کہ درس گاہوں میں جاتے، مدرس کو ایک نسخہ پیش کرتے۔ میری اور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وجہ سے اکثر مدرسین بھی ان سے واقف تھے اکثر مدرسین نذرانہ لینے کے بعد اس کی قیمت تین آنہ یا کم وبیش دے دیا کرتے تھے اور ان کی درخواست پر طلبہ سے بھی کلمۃ الخیر کہہ دیا کرتے تھے۔ لیکن بعض لوگ اس وجہ سے کہ کوئی خاص مضمون ان کے اندر نہیں ہوتا تھا بجز روایات معروفہ مطابق اہلِ حدیث کا ترجمہ دیکھ کر معذرت کر دیا کرتے تھے۔

یہ ناکارہ ان کی آمد پر بیس پچیس نسخے ہمیشہ خریدتا۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سو ڈیڑھ سو نسخے ہمیشہ خریدتے اور ہم دونوں مشتہرہ قیمت سے زیادہ ہی دیا کرتے تھے۔ ان کی معذوری اور حدیث پاک کی خدمت اور حق مہمانی کی بناء پر اور ان کے جانے کے بعد ان کے رسالوں کو طلبہ حدیث میں یہ کہہ کر تقسیم کر دیتے تھے کہ رسائل گو مسلکِ اہل حدیث کے ہیں مگر ان احادیث کا ترجمہ تو بہرحال ہے ہی۔ ان کے سامنے اس وجہ سے نہیں دیا کرتے تھے کہ اس مفت کی وجہ سے ان کی خریداری پر اثر نہ پڑے، ان کے رسالے اب بھی میرے کتب خانہ میں اوپر کمرے

میں ہوں گے۔ جن پر ان کا نام و پتہ چھپا ہوا ہوگا۔ وہ نابینا اور ایک کم عمر سا لڑکا ان کے ساتھ ہوتا تھا، جو ان کو سب جگہ لیے لیے پھرتا۔ رات کو مغرب کے بعد وہ میرے قریب بیٹھ کر اپنا حساب لکھوایا کرتے تھے۔ مجھے ان کے حساب میں بڑا لطف آیا کرتا تھا۔ رسالوں پر قیمت تو طبع شدہ ہوتی تھی، مگر وہ کسی شخص کو قیمت نہیں بتایا کرتے تھے، جس کا جو جی چاہے دے دے وہ خوشی سے قبول کر لیتے تھے اور جو قیمت نہ دے بلکہ جزاک اللہ کہہ کر نمٹا دے تو وہ اس سے مطالبہ بھی نہیں کرتے تھے۔

شام کو جب حساب لکھواتے تو اس میں اس طرح لکھواتے ''دو نسخے فی دو آنہ، تین نسخے فی ڈھائی آنہ، چار نسخے فی تین آنہ، آٹھ نسخے فی جزاک اللہ۔'' بہت ہی سیدھے بھولے بھالے آدمی تھے۔ اس زمانے میں اہلِ حدیث احباب سے اس ناکارہ کے تعلقات بڑی کثرت سے رہتے تھے۔ اس زمانے میں دیوبند، سہارنپور میں اہل حدیث طلبہ بہت کثرت سے پڑھتے تھے۔ مگر وہ اہلِ حدیث ہونا ظاہر نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس ناکارہ نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ مجھ سے اخفاء نہ کریں، بے تکلف گھر پر آکر اپنے اشکال حل کیا کریں، بہت سے طلبہ آتے تھے۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے اور ان میں سے بعض بیعت بھی ہوئے، بعض ان میں سے یہ بھی کہتے کہ اگر آپ حکماً کہیں تو ہم رفع یدین، آمین وغیرہ چھوڑ دیں۔ میں ان کو منع کر دیتا کہ جب تم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد کے ذوق شوق میں کر رہے ہو تو میں کیسے حکم دے سکتا ہوں؟

مولوی عبدالجبار اہل حدیث:

(۱۰) ......ایک بزرگ تھے مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی پہلے جے پور میں شیخ الحدیث تھے، اس کے بعد پھر مختلف مدارس میں شیخ الحدیث رہے اور تقسیم کے بعد اکوڑہ خٹک میں شیخ الحدیث رہے، میری ابتداء مدرسی میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مرحوم سے انہوں نے کوئی حدیث کا سوال کیا مولانا مرحوم بھی اکثر حدیث پاک کے اشکالات لکھتے رہتے تھے۔ مولانا نے ان کو اس سیہ کار کا پتہ بتا دیا۔ پھر تو انہوں نے اپنے انتقال تک خوب سلسلہ رکھا۔ میرا خیال یہ ہے خود مولانا مرحوم کے یہاں بھی اور اس ناکارہ کے یہاں بھی ان کے خطوط مع مسودہ جوابات محفوظ ہیں کئی دفعہ مرحوم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ہماری خط و کتابت شائع ہو جائے، بہت مفید ہے، میں نے ہمیشہ یہ لکھ دیا کہ کوئی تالیفی چیز تو ہے نہیں۔ اس میں چھاپنے کے واسطے غور و خوض اور نظر ثانی کی ضرورت ہوگی۔ مرحوم نے کئی دفعہ اصرار کیا کہ بہت مفید ہے ان کو شائع کر دیا جائے یا پھر مجھے اجازت دو میں چھاپ دوں گا۔ مگر میں نے نہ خود چھاپے اور نہ اجازت دی، کیونکہ خطوط

وقتی چیز ہوتی ہے اوران میں اکثر ماحول اور تخاطب کے مطابق مضامین ہوتے ہیں، اگر میرے دوستوں میں سے کوئی نظر ثانی کے بعد بالخصوص عزیزان مولوی عاقل، مولوی سلمان شاہد اس کو چھاپنا چاہیں تو شوق سے، ان میں کوئی مسئلہ اختلافی نہیں بلکہ صحاح کی مختلف احادیث پر اشکال اور ان کے جوابات ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے قراءت خلف الامام کی حدیث پر بھی ایک اشکال لکھا تھا جس پر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ یہ مسائل تو برسہا برس سے چلے آرہے ہیں، ختم ہونے والے نہیں۔ حدیث پاک کے متعلق جو اشکالات ہیں وہ شوق سے فرما دیں، میری اوجز المسالک پر مرحوم نے ایک بہت ہی مفصل تبصرہ پاکستان کے کسی اخبار میں شائع کرایا تھا۔ جس پر ان کے بعض دوستوں نے ان کو سخت ملامت لکھی، مرحوم نے ان کو لکھا کہ محض مقلد ہونے کی وجہ سے کتاب سے نفرت نہ کرو، اس کو دیکھو بڑا خزینہ ہے، میں نے جو کچھ تبصرہ کیا ہے بہت غور و خوض اور بہت تفصیل سے دیکھنے کے بعد کیا ہے۔

ایک اہل حدیث کا قومہ میں ہاتھ نہ چھوڑنا:

(۱۱)......میرے ایک مخلص دوست رفیق درس مظاہر علوم میں ملازم تھے۔ قلت تنخواہ کی وجہ سے چھوڑ کر دوسری جگہ جا کر ملازم ہو گئے، جن کے یہاں ملازم تھے وہ ایک بڑے ڈاکٹر اور زوردار اہلِ حدیث تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ جب رکوع سے اُٹھ کر رفع یدین کیا کرتے تو ہاتھوں کو گراتے نہیں تھے بلکہ کانوں تک اُٹھائے اُٹھائے سجدہ میں چلے جاتے۔ میرے ان دوست نے لکھا کہ وہ تو عادی ہیں ان کو اس کی بڑی مشق ہے۔ لیکن میں جب رکوع سے اُٹھنے کے بعد ہاتھ اُٹھائے اُٹھائے سجدہ میں جاتا ہوں تو میں گر جاتا ہوں، بہت ہی جلد از جلد کوئی صورت میرے لیے نکالو، میری تازہ تازہ ملازمت ہے، جب میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ یہ تو مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، علامہ شوکانی اور بڑے بڑے اکابر اہل حدیث کا بھی مسلک نہیں، تو ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ تقلید کے واسطے تو امام ابوحنیفہ، امام شافعی رحمہما اللہ کیا کم ہیں جو میں کسی کی تقلید کروں مجھے تو حدیث پاک دکھاؤ۔

اللہ کا انعام واحسان کہ ان کا خط پڑھتے ہی مجھے حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت یاد آئی جو صحاح کی کتب میں مختلف الفاظ سے ہے، مجھے یاد ہے کہ اس روایت کے اندر رکوع سے اُٹھنے کے بعد یہ الفاظ ہیں ”حتی استقر کل عضو فی موضعه“ مگر اس وقت ابوحمید کی روایت کے اندر ابوداؤد میں معتدلاً کا لفظ ملا ہے جس کا مفہوم یہی ہے۔ ابوداؤد کے اندر حضرت ابو مسعود انصاری کی روایت میں یہ لفظ ہیں ”ثم قال سمع اللّٰه لمن حمده فقام حتی استقر

کل شئی منه" (الحدیث) اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ابوداؤد میں ہے"لم یسجد حتی یستوی قائما" (الحدیث) اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث نسائی میں ہے جس کے الفاظ ہیں"ثم رفع راسه فقام حتی استوی کل شئی منه" (الحدیث) اور بھی متعدد روایات میں نے لکھوائی تھیں۔ ممکن ہے کہ مکتوب الیہ کے پاس وہ خط اب بھی محفوظ ہو۔ میں نے ان کو لکھا کہ رکوع کے بعد رفع یدین کرکے"استقر کل عضو فی موضع" جب ہی ہوسکتا ہے جب ہاتھ نیچے چھوڑ دیے جائیں۔ ان کے ڈاکٹر نے میرے اس جواب کو بہت پسند کیا اور ہاتھ چھوڑنا شروع کردیا۔ میرے ان رفیق نے بہت شکریہ کا خط لکھا کہ میں تو بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

مجھے اہل حدیث سے مخالفت نہیں:

(۱۲)...... مجھے اہل حدیث سے ذاتی عداوت تو ہے نہیں، جب تک کہ وہ اکابر ائمہ کی شان میں بے ادبی نہ کریں، میرے ذہن میں یہ ہے کہ شریعت تو صرف اللہ اور اس کے پاک رسول ہی کا کلام ہے، لیکن اس پر عمل کرنے میں اور روایات کی صحیح جرح وتعدیل میں ائمہ مجتہدین اور ائمہ اربعہ کا قول مجھ جیسے نابلد کی تحقیق پر بہت مقدم ہے۔ بلکہ ان حضرات کے ارشادات ائمہ محدثین سے بھی مقدم ہیں۔ اس لیے کہ یہ حضرات ائمہ بخاری ومسلم کے اساتذہ یا استاذ الاستاذ ہیں اور زمانۂ نبوت سے بہ نسبت ائمہ محدثین کے زیادہ قریب ہیں اس لیے روایات کے قبول اور رد میں ان حضرات کا مرتبہ اور ہم پایہ لوگوں سے کیا بلکہ ائمہ محدثین سے بھی کہیں زیادہ اونچا ہے، اس لیے کہ حضرت امام احمد بن حنبل جو امام بخاری کے مشہور استاذ ہیں وہ امام شافعی کے شاگرد ہیں اور امام شافعی امام محمد کے مشہور شاگرد ہیں جن کا مشہور مقولہ ہے کہ میں امام محمد کی کتابیں دیکھ کر فقیہ ہوا ہوں اور امام محمد امام اعظم کے مشہور شاگردوں میں ہیں اور امام بخاری کی ثلاثیات جن میں امام بخاری سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک تین واسطے ہیں۔ بخاری میں کل بائیس ہیں اس میں امام بخاری کی بیس روایات امام اعظم کے شاگرد یا شاگردوں سے ہیں، ہماری مثال اس بندر کی سی ہے جو ایک گرہ ہلدی کی لے کر ڈگڈگی بجانے لگا کہ میں بھی پنساری ہوں۔

احکام شرعیہ پر بغیر مصلحت سمجھے عمل کرنا ضروری ہے:

(۱۳)...... میرا ہمیشہ خیال یہ بھی ہے اور اس پر میرے یہاں بہت اہتمام رہا کہ اپنے عمل اور دوستوں سے نصیحت میں بھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے اتباع میں جتنا ہو سکے غلو اور اہتمام کریں تاوقتیکہ اپنے مذہب کے خلاف نہ ہو جیسا کہ اس سے پہلے نمبر میں بھی اشارہ

کر چکا ہوں۔ اس ناکارہ نے بہت عرصہ ہوا ایک رسالہ اختلاف ائمہ لکھا تھا جو رسالہ ''المظاہر'' میں شائع ہوتا تھا، جس کا ذکر تالیفات میں بھی گزر چکا ہے۔ اس میں اس سیہ کار نے بہت تفصیل سے ائمہ مجتہدین کے اختلاف کی وجوہ اور اسباب مع امثلہ بہت کثرت سے لکھے تھے۔ جب تک رسالہ جاری رہا میرا مضمون بھی جاری رہا۔ اس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشادات اگر سمجھ میں نہ آئیں تب بھی ان پر عمل ضروری ہے، اگر اپنی سمجھ میں نہ آئے تو اپنی فہم کا قصور تصور کرے۔ میں غالباً یہ قصہ لکھوا چکا ہوں کہ میری ایک چھوٹی بچی جب اس نے قاعدہ بغدادی شروع کیا اور ''آنَ بانَ'' کی تختی شروع کی تو اپنی والدہ مرحومہ کے سر ہوگئی، چار پانچ سال کی عمر تھی، چھوٹی سی بچی اس کا مناظرہ اور ضد، مجھے بھی بڑا اچھا لگا۔ اس نے کہا کہ الف زبر آ، نون زبرنَ آنَ، ب الف زبر با نون زبرنَ بانَ، تانَ، ثانَ اخیر تختی تک پڑھ کر جب اس کا نمبر آیا کہ ہمزہ الف زبر آ، نون زبرنَ آنَ، تو وہ اپنی والدہ سے اُلجھ پڑی اور بھولی بھالی زبان اب تک یاد ہے وہ بار بار الف با کی تختی شروع سے پڑھتی اور حجت قائم کرتی اور اخیر میں ہمزہ پر آ کر پھر جرح شروع کرتی کہ یہ آنَ کیوں ہے، ہمزانَ ہونا چاہیے۔ بہت ہی صبح سے دوپہر تک اپنی ماں سے لڑتی کہ یہ ہمزان کیوں نہیں بنتا۔ ماں کے پاس تو کوئی جواب نہیں تھا، اس نے تو اپنی جان بچالی کہ جب تیرے ابا آئیں گے ان سے پوچھئے۔ کہنے لگی کہ میں تو ہمزان ہی یاد کروں گی۔ دوپہر کو مقدمہ پیش ہوا۔ جواب میرے پاس بھی بجز اس کے کیا تھا کہ ابھی تو تو بچی ہے جب بڑی ہوگی تب پوچھنا۔

دوسرا قصہ بھی اسی کا یا اس سے چھوٹی بہن کا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ماں سے اس پر جرح کرتی تھی کہ جب دودھ کو آگ پر گرم کرتے ہیں تو اس پر ملائی کہاں سے آتی ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ احکام شرعیہ میں ہم لوگ اپنے آپ کو محقق اعلیٰ کیوں سمجھ جاتے ہیں، جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کو سوچ لینا چاہیے کہ نبوت کا درجہ ہم سے بڑھا ہوا ہے، ہم ناسمجھ ہیں، وہاں تک رسائی نہیں۔ مثال کے طور پر غسل جنابت ہی کو لے لو ساری عمر فقہاء اس کو غسل تعبدی لکھتے چلے آئے، کہ منی نکلتی تو ہے پیشاب گاہ کے چھوٹے سے سوراخ سے اور غسل سارے بدن کا فرض ہے، اس کو جملہ علماء نے فقہاء نے تعبدی لکھ کر چھوڑ دیا یعنی خلاف قیاس حکم شرعی یہی ہے۔ مگر چند سال ہوئے اس ناکارہ کو ہر چیز کے پڑھنے کا مرض تھا اور صحت و بصارت بھی قوی تھی۔ چند ڈاکٹروں کی تحقیق نظر سے گزری تھی، انہوں نے لکھا کہ جب آدمی کو شہوت کے ساتھ انزال ہوتا ہے تو بدن کے مسامات سے ایک سمیت باہر ظاہر ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی۔ اگر اس کو نہایت اہتمام سے رگڑ کر جلدی صاف نہ کیا جائے تو دو چار گھنٹے کے بعد وہ سمی مادہ مسامات کے ذریعہ اندر چلا جاتا ہے اور بہت سے

امراض پیدا کرتا ہے۔ اس لیے بہت اہتمام سے صابن کے ساتھ غسل کرنا چاہیے، اس میں مجھے تو بہت ہی لطف آیا، اس لیے کہ خروج منی سے سارے بدن کے دھونے کی مصلحت بھی سمجھ میں آئی۔ جس کی احادیث میں تاکید آئی ہے۔ حتیٰ کہ امام مالک کے نزدیک رگڑ کر دھونا غسل جنابت میں فرض ہے اور غسل کی جلدی کی تاکید کی مصلحت بھی معلوم ہوگئی۔ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کی سہولت کے لیے تاخیر بھی قولاً عملاً کر کے دکھلا دی۔ اسی طرح سے مردوں کی داڑھی اور عورتوں کی چوٹی کا مسئلہ یہ تو عرصہ سے سننے میں آ رہا تھا کہ انگلستان میں پائیریا کا مرض اتنا عام ہے کہ جوان لڑکیاں بھی اپنے سارے دانت نکلوا دیتی ہیں اور پھر مصنوعی بنواتی ہیں۔ کئی سال ہوئے وہاں کے ڈاکٹروں کی ایک تحقیق نظر سے گزری کہ دانتوں کی رطوبت کے لیے مردوں کی داڑھی اور عورتوں کی چوٹی کے بال جاذب ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے امراض میں بالخصوص جریان، آتشک وغیرہ میں انگریز ڈاکٹر ختنہ کو بہت ضروری بتاتے ہیں۔

شب معراج میں حضور کے قلب اطہر میں ایمان وحکمت بھرنا:

(۱۴)......اس سلسلہ کا ایک مسئلہ شب معراج میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شق الصدر کے بعد ایمان وحکمت کا بھرنا تھا۔ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ شبِ معراج میں حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور سینہ مبارک چاک کر کے قلب اطہر کو نکالا، اس کو زمزم شریف کے پانی سے دھویا اور سینے مبارک میں ایمان وحکمت بھر دیا۔ اپنی ابتداء طالب علمی میں اس حدیث پاک پر احمق لوگوں کے بہت اعتراضات سنے کہ ایمان وحکمت ایسی چیز ہے جس کو بھر دیا جائے۔ اخبارات میں بھی اس حدیث پاک پر اعتراضات پڑھے اور نیچری لوگوں کے اشکال بھی خوب پڑھے۔ مگر اللہ پاک کا ارشاد حدیث قدسی میں ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ لوگوں کے عذر زائل نہ کر دیے جائیں یعنی جب تک احمق لوگوں کے مہمل اشکالات کا جواب دُنیا میں نہیں دکھایا جائے گا۔ جب سے بجلی کا علاج جاری ہوا ہے نہ کوئی چیز بوتل میں نظر آتی ہے اور نہ کسی طرح سے محسوس ہوتی ہے، مگر علاج والے کارنامے سناتے ہیں کہ چالیس (۴۰) گھوڑوں کی طاقت بھر دی، اسی (۸۰) گھوڑوں کی طاقت بھر دی وغیرہ وغیرہ۔ معلوم نہیں وہ کیا چیز بھری جاتی ہے بجلی کی قوت ایمان کی قوت کا کب مقابلہ کر سکتی ہے۔ قیامت والی احادیث میں کثرت سے اس قسم کے مضامین آئے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ اولین وآخرین کو ایک زمین پر جو میدانِ حشر ہے جمع فرمائیں گے اور آواز دینے والے کی آواز سب سنیں گے اور مجمع کو ہر شخص دیکھے گا، اس پر بڑے اعتراضات لوگوں کے سنے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر

قیامت تک کی بے شمار مخلوق کس طرح سب ایک شخص کی آواز سن سکتے ہیں اور کس طرح مجمع کو سب دیکھ سکتے ہیں، لیکن اب لاؤڈ اسپیکر، ٹیلیفون اور اس سے بڑھ کر ٹیلی ویژن نے سارے اشکالات کو ''هَبَاءً مَّنثُورًا'' کر دیا ہے۔ چاند پر چڑھنے کا واقعہ آج کل معرکۃ الآراء مسئلہ بن رہا ہے، بندہ کے خیال میں تو یہ یاجوج و ماجوج کی احادیث کا مشاہدہ ہے، اس میں ہے کہ وہ فساد برپا کرنے کے بعد آسمان والوں کو قتل کرنے کے لیے آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے اور وہاں سے حکم ہوگا کہ ان کے تیروں کو خون میں رنگ دو، اس کو دیکھ کر وہ بے وقوف کہیں گے کہ ہم نے آسمان والوں کو بھی قتل کر دیا، جن جن چیزوں پر ان احمقوں کے اشکالات ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان سب کا جواب مشاہدہ کے طور پر قیامت سے پہلے ہی دکھا دیا اور جو اشکالات رہ گئے ہیں ان کے جوابات بھی ان لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لیے قیامت سے پہلے ظہور پذیر ہو جائیں گے۔

(۱۵)......حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو نہاوند کی جنگ میں امیر بنا کر بھیجا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ مدینہ منورہ میں خطبہ پڑھتے ہوئے یا خطبہ کے بعد زور سے ''یا ساریة الجبل'' فرمایا۔ یعنی ''اے ساریہ! پہاڑ کو اپنی پشت کے پیچھے کر لو اور اس سے آگے بڑھ جاؤ۔'' مدینہ والے بھی حیرت میں رہ گئے کہ یہ خطبہ کے درمیان میں غیر متعلق بات کیوں فرمائی اور نہاوند میں حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ بھی حیرت میں رہ گئے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہاں سے بول رہے ہیں۔ اس کے بعد نہاوند سے ایک قاصد آیا، اس نے بیان کیا کہ جب ہمارا مقابلہ دشمن سے ہوا اور انہوں نے ہم کو مغلوب کر لیا تو ہم کو ایک آواز آئی کہ ''یا سارية الجبل'' (جس کا ترجمہ گزر چکا ہے) تو ہم نے اپنی پشتوں کو پہاڑ سے چپکا لیا۔ اللہ جل شانہ نے دشمنوں کو مغلوب کر دیا۔ ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کئی کرامتیں ہیں۔ مدینہ میں بیٹھے ہوئے نہاوند کے معرکہ کا معائنہ کرنا اور ان کی آواز کا سینکڑوں میل پہنچ جانا اور پورے لشکر کا ان کی آواز کا سن لینا اور ان کی تجویز سے معرکہ پر غالب آ جانا وغیرہ وغیرہ، پھر اس واقعہ کو بھی وائرلیس اور لاسلکی نے سچا کر دکھایا۔ (مرقات طبع جدید)

صحابہ کرام کی کرامات کے واقعات:

(۱۶)......اکابر صوفیاء کے خوارق و کرامات پر بھی اس قسم کے احمق لوگ اعتراض ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں، لیکن احادیث پاک میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں اس قسم کی نظیریں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر ہم لوگوں کو لغویات اخبارات اور ناولوں سے فرصت ہو تو؟

احادیث پاک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہوں میں اس قسم کے واقعات کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اس لیے ان کو اہمیت سے ذکر نہیں فرمایا کرتے تھے۔ مشکوٰۃ شریف میں بخاری کی روایت سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ہم کھانا کھایا کرتے تھے اور اس کھانے سے تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔ اسی طرح مشکوٰۃ شریف کی دوسری روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت سفینہ کا ایک قصہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ نصاریٰ کے ساتھ لڑائی میں ملک روم کے اندر ایک مرتبہ راستہ بھول گئے یا کافروں نے قید کرلیا۔ پریشان حال تھے کہ ایک شیر سامنے آیا، انہوں نے اس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور اس کو اپنی سرگزشت سنائی، وہ شیر ان کی طرف متوجہ ہوا اور قریب آیا اور دُم ہلاتا ہوا آگے آگے ہولیا، یہ اس کے پیچھے پیچھے چل دیے اور لشکر تک پہنچ گئے اور ان کے پہنچنے کے بعد وہ شیر واپس گیا۔

حج کے موقع پر دو آدمیوں کی دعائیں:

(۱۷)...... مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے زمانے میں ایک قصہ مجھے تو یاد ہے کہ میں نے مرقاۃ میں دیکھا تھا، مگر میں تو لکھنے پڑھنے سے بھی معذور ہوگیا اور اب دوستوں سے کہا تو ان کو ملا نہیں۔ مگر قصہ بہت عجیب اور اہم ہے اور جو مضمون میں اس رسالے میں بار بار لکھوا رہا ہوں کہ اللہ کے یہاں اصل قیمت اخلاص کی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج کو گیا۔ میں نے کعبہ میں دیکھا کہ ایک شخص کعبہ شریف کا پردہ پکڑ کر اتنے زور سے رو رو کر دعائیں مانگ رہا ہے کہ اس کے شور سے کعبہ کا طواف کرنے والے بھی پریشان ہو رہے ہیں مگر ایک منٹ کو بھی اس کا قلب خدا کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

اس کے بعد میں منیٰ گیا، اس کے بازار میں میں نے اس شخص کو دیکھا کہ اس نے ایک ہزار دینار کا کپڑا فروخت کیا، مگر ایک منٹ کو بھی اس کا دل غافل نہ ہوا۔ بالکل صحیح ہے ہم لوگوں کی یہی حالت ہے، ہماری نمازیں دعائیں سب رسمی ہیں۔ طوطے کی طرح سے رٹے ہوئے الفاظ کہتے رہتے ہیں اور ہم کو ذرا پتہ نہیں چلتا کہ کیا کہہ رہے ہیں، اللہ کے ہاں اخلاص کی قدر ہے شور شغب مقبول نہیں ہے۔

ایک آرہ کش کا ایک عجیب واقعہ:

(۱۸)...... ہمارے مدرسہ کے ناظم حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے والد بزرگوار حضرت مولانا جمعیت علی صاحب بہاولپور میں مدرس تھے۔ ایک دفعہ کتاب دیکھ رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک وہ اہتمام سے مطالعہ کرتے رہے۔ ایک آراکش (لکڑہارا) ان کے قریب اپنے آرے

سے لکڑی کاٹ رہا تھا۔ جب ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو وہ مولانا مرحوم سے کہنے لگا کہ اجی مولوی جی! تم اتنی دیر سے کتاب کو گھور رہے ہو تم کو کیا ملا؟ اور دیکھو میں نے اتنی دیر میں اتنے تختے کاٹ دیے۔ مولانا مرحوم کو خوب ہنسی آئی۔ فرمانے لگے کہ اپنا اپنا ذوق ہے، میں یہ کہوں گا کہ تم نے اتنی دیر میں کیا کیا۔ اچھا یہ بتا تیری تمنا اور ذوق کیا ہے۔ کہنے لگا اجی مولانا صاحب کیا پوچھو، میری تمنا تو یہ ہے کہ چارپائی پر گاؤ تکیہ لگائے پڑا رہوں اور حقہ برابر میں رکھا ہوا ہو اور چاروں طرف سے کھیڑ کھیڑ آواز آرا چلنے کی میرے کان میں پڑتی رہے، فقط۔ مجھے اس قصہ میں ہمیشہ بڑا لطف آیا اور ذوق والوں کے مناظر بھی سامنے آگئے۔ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا کہ جن کی زندگی ہی اس پر ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ مراقب ہوں اور چاروں طرف ذاکرین کی آواز ان کے کان میں پڑتی ہو۔ اس میں کوئی تصنع نہیں کہ میں نے ایسوں کو دیکھا کہ جن کی صحت کا مدار ہی ذاکرین کی آواز پر ہے۔ جب یہ ہو تو ان کو طاقت کے انجکشن کا کام دیتا رہتا ہے اور جب یہ نہ ہو تو ان کو اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔

مولوی نصیر الدین ناظم کتب خانہ یحیوی:

(۱۹)......مولوی نصیر الدین ناظم کتب خانہ یحیوی میرے بہت ہی شدید ترین محسن ہیں۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے اور ان کے احسانات کا اپنی شایانِ شان دین و دنیا میں بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔ میں اپنی عمومی دعاؤں کے ساتھ جو سارے محسنوں کے لیے کرتا ہوں، ان کے لیے خصوصی دعائیں بھی کرتا ہوں مگر میں اپنے متعلق اپنے چچا جان قدس سرہٗ کا یہ مقولہ پہلے نقل کر چکا ہوں کہ میری تبلیغ کو جتنا نفع زکریا سے ہے اتنا مجھے اپنے معاون کارکنوں سے بھی نہیں اور میری تبلیغ کا جتنا مخالف یہ ہے اتنا کوئی مخالف سے مخالف بھی نہیں۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے اس مقولہ کو اگر میں مولوی نصیر الدین کے متعلق دہراؤں تو بالکل بجا ہے کہ جتنی اعانت انہوں نے میری علمی، عملی، بدنی کی ہے اتنی نہ کسی رشتہ دار نے کہ نہ اہل وعیال نے کی۔ ستاون (۵۷) برس ان کو میرے پاس رہتے ہوئے ہوگئے۔ اس مدت میں مجھ سے ذرا بھی مناسبت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ہر چیز میں میری ضد اور مخالف ہیں۔ جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

یہ موضع جلالیہ قصبہ بہٹ کے رہنے والے ہیں۔ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے زمانے میں رائے پور میں حافظ یوسف علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی اعلیٰ حضرت کے زمانے میں رائے پور کی آمد ورفت کثرت سے ہوا کرتی تھی، بالخصوص اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی طویل بیماری میں اعلیٰ حضرت کو میرے والد کے بُلانے پر اصرار رہتا تھا، اس لیے کثرت سے تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کے دورانِ قیام میں

حافظ یوسف صاحب کے مکتب میں ایک چھپر کی جھونپڑی میں ان اوقات کے علاوہ جو اعلیٰ حضرت کے پاس رہنے کے تھے والد صاحب کا وہاں وقت گزرتا تھا۔ بالخصوص گرمیوں کا دوپہر وہاں گزرتا۔ اس زمانے میں مکتب کے بعض طلبہ بڑے ذوق وشوق سے والد صاحب کی خدمت کیا کرتے تھے۔ جن میں مولوی نصیر الدین صاحب بھی تھے۔ جن کو اپنی پیدائش صحیح قمری تو یاد نہیں البتہ ۱۹۰۱ عیسوی بتاتے ہیں۔ ۱۹۰۱ عیسوی ۱۳۱۸ ہجری کا آخر اور ۱۳۱۹ھ اوائل ہے۔ قرآن شریف حفظ اور ابتدائی اُردو حساب وغیرہ رائے پور کے مدرسہ میں پڑھا۔ ذی الحجہ ۳۰ھ میں حافظ یوسف جو حضرت رائے پوری کے مدرسہ میں اول استاد تھے، ان کے یہاں کوئی شکایت پہنچی، جس پر پٹائی کے ڈر سے بھاگ کر سہارنپور والد صاحب کے پاس آئے کہ ان سے خوب تعارف تھا، لیکن والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس زمانے میں کئی دن کے لیے نظام الدین گئے ہوئے تھے، مجھ سے کچھ شناسائی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت مولانا (میرے والد صاحب) نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب تیرا قرآن شریف پورا ہو جائے تو میرے پاس آنا میں تجھے عربی پڑھاؤں گا۔ مجھے چونکہ واقفیت نہیں تھی اس لیے میں نے مسجد بہادران متصل مظاہر علوم کے ایک حجرے میں جہاں اور طلبہ بھی رہتے تھے ان کو والد صاحب کے آنے تک رکھوا دیا اور کہہ دیا کہ کھانا دونوں وقت میرے گھر سے لے جایا کرو اور والد صاحب کی تشریف آوری پر انہوں نے ان کو مسجد بہادران سے منتقل کر کے مسجد موچیاں جو حکیم محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکان کے قریب ہے اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اکثر قیام اوقاتِ درس کے علاوہ کثرت سے وہاں رہا کرتا تھا۔ اس میں منتقل کر دیا، اس مسجد میں دو حجرے تھے، جس میں مدرسہ کے طلبہ رہتے تھے، خاص طور سے وہ جن کو والد صاحب سے خصوصی تعلق ہو، دو تین سال اسی مسجد میں قیام رہا۔

۳۳ھ میں جب میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے میرا موجودہ مکان کرایہ پر لیا تو اس میں زنانہ اور مردانہ دو حصے تھے۔ اس میں یہ اور قاری معین الدین آروی جو آج کل مولوی قاری حافظ ہیں اور ان کے بیان کے موافق بیس پچیس دن میں انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا تھا اور مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد چچا جان کے ارشاد سے ان کو نظام الدین کے مدرسہ میں مدرس تحت بنایا گیا تھا اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن صاحب دونوں ان کے شاگردوں میں ہیں اور ان کے لڑکے بھی آج کل علماء بن کر متفرق شہروں میں مقیم ہیں خود ضلع آرہ کے ایک قصبہ میں کسی مدرسہ کے ناظم ہیں لیکن ابتداء میں جب وہ یہاں آتے تھے تو اردو بھی نہ جانتے تھے۔ لیکن میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی برکت اور بقول مولوی شبیر علی تھانوی مرحوم کے جس کو انہوں نے اپنے اس خط میں لکھا ہے جو اکمال الشیم کے مقدمہ میں طبع شدہ ہے کہ میرے

والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو پڑھانا نہیں بلکہ گھول کر پلانا آتا تھا۔ چند سال میں اردو، فارسی، ابتدائی عربی سب کچھ پڑھادیا اوران کے انتقال کے بعد میں نے مدرسہ میں داخل کرادیا تھا مگر آخر تک میرے ہی مکان پر رہا اور ۴۱ھ میں دورہ شریف سے فارغ بھی ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ علم وعمل میں برکت عطاء فرمائے۔

اس جگہ تو مولوی نصیر الدین کا حال لکھنا شروع کیا تھا کہ میرے والد صاحب کے انتقال تک مولوی نصیر کے مراسم مجھ سے بھی ہوگئے اور میری خارش کے زمانے میں مجھ سے مقامات بھی پڑھی، اس کا ذکر پہلے گزر چکا اور میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد اسباق تو مدرسہ میں ہوگئے تھے، مگر قیام ان کا بھی میرے مکان (کچے گھر) میں ہی رہا اور میرے تجارتی کتب خانہ میں معمولی کام پیکٹ وغیرہ بنانا باندھنا ان کے حوالہ تھا اور فرمائشوں کی تعمیل میں خود کرتا تھا اور ۳۸ھ کے پہلے سفرِ حج میں کتب خانہ کا کام ان کے اور حکیم ایوب صاحب سلمہٗ کے حوالہ کر کے گیا تھا اور حج سے واپسی کے بعد کچھ نہ کچھ دیکھ بھال اس سیہ کار کی ہوتی تھی، لیکن شوال ۴۴ھ میں جب دوسری مرتبہ اس سیہ کار کی حج کو روانگی ہوئی تو تقریباً سولہ ماہ میں واپسی ہوئی۔ اس وقت ہمہ تن کتب خانہ مولوی نصیر کے حوالہ کر کے گیا تھا، عزیز موصوف کو ہمیشہ یہ گھمنڈ اور مجھ پر یہ الزام رہا کہ یہ تجارت سے بڑا ناواقف ہے اور بہت ہی اس کی کوشش بوسائط کرتا رہا کہ یہ کتب خانہ کلی طور پر میرے انتظام میں دے دے اور میں اس پر چار چاند لگادوں۔

یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ میرے والد صاحب کے انتقال کے وقت ان کے ذمہ آٹھ ہزار روپے قرض تھا۔ جو محض اللہ کے لطف وکرم اور احسان سے شوال ۴۴ھ میں صرف ایک ہزار رہ گیا تھا۔ جو یہ ناکارہ حجاز کو جاتے وقت مولوی نصیر کے حوالہ کر گیا تھا اور ان کو ایک ہزار کی وہ رقوم بھی بتا گیا تھا جو اس ناکارہ کی دوسرے لوگوں کے ذمہ تھی لیکن جب یہ ناکارہ سولہ ماہ بعد واپس آیا تو انہوں نے کتب خانہ کو چار چاند نہیں بلکہ آٹھ چاند لگا رکھے تھے، یعنی میرے کتب خانہ کے ذمے آٹھ ہزار روپیہ مزید قرض کر رکھا تھا اور ایسے اجنبی لوگوں سے قرض لیا تھا۔ جنہوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اس ناکارہ نے اپنے دوستوں سے قرض لے کر اس کو ادا کرایا اور ان کو ہمیشہ سمجھایا اور اب تک باوجود اس کے کہ ہمیشہ ہی اللہ جل شانہ کے احسانات اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے، مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مالک کا معاملہ ہر شخص کے ساتھ علیحدہ ہے، تجارتی اصول والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تجارتی ہی اصول کا ہے اور بے اصولوں کے ساتھ معاملہ کرم واحسان کا ہے، باوجودیکہ میں ان کا احسان مند ہوں اور ہمیشہ ان کے لیے دل سے دعائیں بھی کرتا رہتا ہوں مگر طبیعت کا جوڑ آج تک نہیں لگ سکا، میں ہمیشہ کتابوں کے حق تالیف کو رجسٹرڈ کرانے کا شدید

مخالف ہوں اور اس کو شرعاً جائز بھی نہیں سمجھتا۔ اختری بہشتی کا تحشیہ یحیوی کتب خانے نے کرایا تھا اور اجرت تحشیہ اور طباعت بھی کتب خانہ یحیوی کی طرف سے ہی ہوئی۔ مولانا نصیر الدین صاحب نے اس کو رجسٹرڈ کرالیا اور میرے ایک مخدوم زادے نے جب اس کو طبع کرالیا یہ سمجھ کر کہ میں ان سے کیا تعرض کروں گا اور ان کا خیال بھی بالکل صحیح تھا۔ تو مولانا نصیر الدین صاحب نے ان پر دعویٰ بھی کرا دیا۔

مجھے نہ ان کے رجسٹرڈ کرانے کی خبر اور نہ دعویٰ دائر کرنے کی، شیخ رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس زمانے میں دہلی میں ان سر برآوردہ لوگوں میں تھے کہ حکام ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اس لیے ان کے ذریعہ سے مقدمہ میں فوری کامیابی ہوئی اور کتابیں ضبط ہو گئیں اور شیخ رشید احمد صاحب نے مجھے مژدہ کی اطلاع کر دی میں حیرت میں پڑ گیا کہ کیسا مقدمہ اور کیسی کتابوں کی ضبطی، میں نے جب تحقیق کیا تو سارا قصہ معلوم ہوا۔ میرے رنج وقلق اور غصہ کی انتہا نہ رہی، میں نے منت، خوشامد، ڈانٹ ڈپٹ سبھی کچھ کیا، مگر انہوں نے بجائے درخواست قبول کرنے کے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو میرے خلاف ایک بہت سخت خط لکھا کہ ان کو کتب خانے کی آمدنی سے تو کوئی تعلق نہیں، کھانے کے وقت جتنے مہمان ہوتے ہیں ان کے علاوہ رستہ چلتے لوگوں کو بھی دعوت دے دیتے ہیں اور تجارت کا جو حال ہے وہ بھی آپ کو معلوم ہے، میں نے ایک کتاب کو رجسٹرڈ کرا لیا تھا جس کی وجہ سے مجھ پر سخت عتاب ہے۔ میں نے تین دن سے نہ کچھ کھایا اور نہ سویا، دن رات روتے گزر گئے ہیں۔ یہ خط انہوں نے رجسٹری بھیجا، مجھے اس خط کی بھی کوئی خبر نہ ہوئی۔

ایک دن دوپہر کے وقت دستر خوان بچھ چکا تھا چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور جناب الحاج الحافظ فخر الدین صاحب تشریف لائے اور چہرہ پر غصہ نمایاں بلکہ چہرہ سرخ ہو رہا۔ میں چچا جان کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا، مگر چہرہ پر غصہ بہت ہی ظاہر ہو رہا تھا چچا جان نے تشریف لاتے ہی سلام و مصافحہ سے پہلے ہی فرمایا کہ تم نے تو پریشان کر دیا۔ اس وقت تمہاری وجہ سے آنا پڑا۔ تم سے تخلیہ میں کچھ کہنا ہے۔ میں کانپ گیا اور میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے ''ماحدث و ماقدم'' مجھے بھی سب یاد آ گیا نہ معلوم کس نے کیا شکایت لکھ دی ہو گی۔ اس وقت کھانا چچا جان نے اور حافظ صاحب نے تو غصہ میں نہیں کھایا اور میں نے فکر میں نہیں کھایا۔ کھانے کے بعد مجھے چونکہ یہ فکر تھا کہ نہ معلوم کیا شکایت پہنچی ہو گی اس لیے میں ان دونوں حضرات کو حکیم ایوب صاحب کی بیٹھک میں لے گیا اور سب دروازے لگا لیے اور چچا جان نے بیٹھتے ہی غصہ میں فرمایا کہ تمہیں آمدنی کا کوئی فکر نہیں ہے، خرچ کی تم کو کوئی خبر نہیں وہ نصیر الدین بیچارہ دن رات فکر میں رہتا ہے یہاں تک کہنے پر میری جان میں جان آ گئی اور ہوش و حواس بھی

درست ہوئے، مجھے اس کا اندازہ ہو جاتا تو اتنی دور بھی نہ لے جاتا۔ بلکہ کھلے کواڑ ان سے تخلیہ کرتا پھر انہوں نے فرمایا کہ مولوی نصیر نے مجبور ہو کر ایک کتاب کو رجسٹرڈ کرایا تو تم اس پر خفا ہونے لگے، کئی دن سے نہ اس نے کچھ کھایا اور نہ وہ سویا۔ میں نے عرض کیا حضرت چچا جان! کتابوں کی رجسٹری تو جائز بھی نہیں، مولوی نصیر الدین نے جناب الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب سے رجسٹری کے جواز کا فتویٰ بھی منگا رکھا تھا۔ جس کی نقل بھی انہوں نے چچا جان کے پاس بھیجی تھی۔ چچا جان نے فرمایا کہ اس کے پاس مفتی کفایت اللہ کا فتویٰ ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت! میرے پاس حضرت گنگوہی کا فتویٰ ہے۔ مولوی نصیر اگر حضرت گنگوہی کے مقابلہ میں مفتی صاحب کا فتویٰ پیش کرے تو تعجب نہیں، مگر میں یا آپ حضرت گنگوہی کے مقابلہ میں مفتی صاحب کا فتویٰ قبول کر سکتے ہیں، چچا جان تو میری گفتگو کے بعد بالکل خاموش ہو گئے اور خفگی بالکل زائل ہو گئی۔ البتہ یہ فرمایا کہ اتنی ناراضگی نہیں چاہیے تھی اس کی محنت اور جانفشانی کی رعایت ضرور چاہیے۔ لیکن میرے محترم حضرت حافظ فخر الدین صاحب کا غصہ بالکل کم نہ ہوا۔ انہوں نے واپسی تک نہ تو مجھ سے بات کی اور نہ چلتے وقت مصافحہ کیا۔ چچا جان بھی دوسری گاڑی سے یہ فرما کر چلے گئے کہ میں تو بہت مشغولی میں آیا ہوں قیام کا وقت بالکل نہیں تمہارے مولوی نصیر نے اپنی پریشانی کا ایسا سخت خط لکھا کہ مجھے فوراً آنا پڑا۔

ان کے تشریف لے جانے کے بعد میں نے مولوی نصیر الدین سے کہہ دیا کہ میری کتاب کی تو رجسٹری رہ نہیں سکتی، آج سے یہ ''اختری بہشتی زیور'' تمہاری ملک میں ہے تمہاری نذر ہے۔ اس کے سب مطبوعہ نسخے اور اس کی پلیٹیں وغیرہ سب تمہاری نذر ہیں اور اس دن سے یہ کتاب مولوی نصیر الدین کی ملک ہو گئی اور میں نے اخبارات میں بھی اس کا اعلان کرا دیا تھا۔ وہ اخبارات بھی اب تک میرے کمرے میں ہوں گے۔ تین چار سال بعد یہ ناکارہ ایک مرتبہ نظام الدین حاضر ہوا۔ تو چچا جان نے فرمایا کہ ارے بھائی تمہارے نصیر کی خود غرضی اور یہ کہ وہ تمہارے مال کو اپنے نام سے بنک میں جمع کرتا ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کی شکایات تو بہت ہی آرہی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ وہی مولوی نصیر ہیں جن کی بدولت مجھ پر عتاب ہوا تھا۔ فرمایا کہ ہاں! ہیں تو وہی، مگر اب تو اس قدر ان کی شکایات آرہی ہیں کہ حد نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جب آپ تک اتنی شکایات باوجود دور ہونے کے آرہی ہیں تو مجھ تک کتنی پہنچتی ہوں گی۔ مگر میرے ذہن میں ایک بات ہے کہ ابا جان کے انتقال کے بعد قرضہ تو آٹھ ہزار کا تھا اور کتب خانہ نیلام کی حیثیت سے پانچ ہزار کا تجویز کیا جا رہا تھا۔ میں نے دو حج بھی کر لیے اگرچہ میرے اخراجات میں کتب کو دخل کم ہے۔ محض اللہ کے فضل و کرم کو دخل ہے ظاہری اسباب میں کتب خانہ ہی ذریعہ تھا ہدایا وغیرہ کا

سلسلہ اس وقت تک شروع نہ ہوا تھا اور جو ہوتا بھی تو مجھے اس سے وحشت بھی بہت ہوتی تھی اپنی شادی کی اور اپنی ہمشیرہ کی بھی کی، مہمانوں کا سلسلہ بھی رہتا ہی ہے اور یہ تو آپ کو مولوی نصیر نے اسی وقت لکھ دیا تھا کہ کتب خانہ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں سب کچھ میں ہی کرتا ہوں اور اب تو اس میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ کہ میں واقعی کتب خانہ میں جا کر قدم نہیں رکھتا اور مجھے اپنی تصنیف وتالیف وتدریس سے اتنی فرصت بھی نہیں، اگر میں یہ سمجھوں کہ وہ محنت کر رہا ہے اور مضاربہ کے طریق پر آدھا تہائی مجھے بھی دے دیتا ہے تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے۔

میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اس جواب پر بہت ہی خوش ہوئے اور اتنی دعائیں ذوق وشوق سے دیں کہ مجھے بھی لطف آگیا۔ اللہ تم کو بہت ہی خوش وخرم رکھے، بہت ہی برکت عطاء فرمادے، اللہ کا بہت ہی احسان ہے کہ اس سیہ کار کے اُوپر ابتداءً اکابر کی اور اب دوستوں کی دعاؤں کی وہ بھرمار ہے کہ کم کسی کو نصیب ہوتی ہوں گی سب سے ابتدائی دعائیں تو اعلیٰ حضرت رائے پوری کی جو میرے والد صاحب کے انتقال کے فوراً بعد ہی میرٹھ تجارتی کتب خانہ منتقل نہ کرنے پر ملیں تھیں کہ اصل ثمرہ تو میں ان ہی دعاؤں کا سمجھ رہا ہوں اور اس کے بعد میرے حضرت قدس سرہٗ اور حضرت تھانوی اور جملہ اکابر کی دعائیں شامل حال رہیں اللہ تعالیٰ سب کو قبول فرمادے۔ اس کے تھوڑے دن بعد مولوی نصیر الدین صاحب نے ہم کو لال جھنڈی دکھلائی کہ تمہارے مہمانوں کا خرچ میرے بس کا نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میری اور میرے مہمانوں کی روزی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے تیرے ذمہ نہیں۔ اس کے بعد سے اگر میں یہ کہوں کہ مالی احسان تو ان کا مجھ پر نہیں رہا بلکہ اس کا عکس ہی ہوا تو بے محل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اب چند سال سے میری کتابوں کی طباعت کا سلسلہ بھی بجائے ان کے میرے مخلص عزیز داماد مولوی حکیم الیاس کے ذمہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی اور جملہ میرے محسنوں کو اپنی شایانِ شان بدلہ عطاء فرمادے۔ مگر وہ بھی مسلسل امراض کا شکار رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو صحت عطاء فرمادے۔ میں یہ لکھ رہا تھا کہ عزیز مولوی نصیر الدین کے ابتداءً مالی بھی اور انتہاءً جانی احسانات بہت بڑھ گئے۔ مہمانوں کا ہجوم اور بہت سے حضرات بے وقت دن میں ظہر کے بعد اور رات کو عشاء کے بعد بے اطلاع آتے ہیں، مجھے تو بعض مرتبہ بڑی کلفت پہنچتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ مولوی نصیر کو جزائے خیر عطاء فرمادے کہ وہی ان لوگوں کے کھانے کا انتظام کرتے ہیں اس کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام اور قرآن پاک کے مکاتب کے جاری کرنے کا بھی اس کو بہت شوق ہے اور انشاء اللہ اس کی مغفرت کے لیے یہ چیزیں کافی سمجھتا ہوں، لیکن اس کے بالمقابل مقدمات اور ان کی پیروی سے بھی اس کو عشق ہے جس سے مجھے انتہائی نفرت ہے، اپنا نہ ہو تو دوسروں کے مقدمہ میں دلچسپی لینا اس کے لیے کھانا ہضم کرنے کا بہترین چورن ہے۔

اللہ تعالیٰ معاف فرمادے۔اس ناکارہ کوتو مقدمہ کے لفظ سے اتنی نفرت ہے کہ کھانا کھائے کے بعد اگر کسی مقدمہ کا ذکر آجاتا ہے تو امتلا ہوجاتا ہے اور اس کا کھانا ہضم ہوجاتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کو بھی اس بلا سے نجات عطاء فرمادے۔اس ناکارہ کوتو مقدمات سے اتنی نفرت ہے کہ ہماری جدی جائداد جھنجھانہ میں ایک لاکھ روپے سے زائد بتلائی جاتی ہے۔میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد ۳۶ھ میں جھنجھانہ کے چند نوجوان شرفاء میرے پاس آئے،انہوں نے کہا کہ تمہاری جائداد کی ہم نے تحقیق کرالی ہے وہ اسی ہزار ۸۰،۰۰۰ روپے کی ہے،ہم لوگ اس کے خریدار ہیں۔بالمقطع تیس ہزار ۳۰،۰۰۰ میں اس کو خریدنا چاہتے ہیں،روپیہ نقد دیں گے اور ضمانت کے لیے ہم کوئی دھوکہ نہیں کررہے اور آپ کے اطمینان کے لیے میرے والد کے حقیقی ماموں مولانا رؤف الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وکیل مظفرنگر،میرے حقیقی پھوپھا مولانا رضی الحسن صاحب کاندھلوی (مولانا انعام الحسن صاحب امیر التبلیغ نظام الدین دہلی کے حقیقی جدامجد) اور میرے رشتہ کے دوسرے پھوپھا حکیم عبدالحمید صاحب رئیس بڈ ولی اور میرے بعض اعزہ کا بھی نام لیا کہ اپنے تعارف اور توثیق کے لیے ان سب کی تحریرات بھی آپ کو لادیں گے۔آپ سہارنپور ہی میں رہیں گے صرف ایک بیعنامہ تیس ہزار نقد میں اس مضمون کا لکھنا ہوگا کہ میں نے اپنی جائداد جو جھنجھانہ میں ہے بعوض تیس ہزار فلاں فلاں کے ہاتھ فروخت کی اور پھر انہوں نے کہا کہ آگے مقدمات کرنا اور ان کے قبضہ سے چھڑانا یہ سب کام ہم خود کریں گے۔تیرا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔تم اکابر ثلاثہ مذکورہ سے اس سلسلہ میں مشورہ کرلو۔ہم ان کے پاس گئے تھے انہوں نے کہا کہ اس کا تعلق مولوی زکریا کی ذات سے ہے وہ ہر قسم کی توثیق اور ہم لوگوں کے متعلق اطمینان دلانے کو تیار ہیں میں نے شدت سے انکار کر دیا۔ان کو بڑی حیرت ہوئی اور بار بار تعجب سے سوال بھی کرتے رہے کہ تم کو اتنی بڑی رقم نقد مل رہی ہے پھر کیوں انکار کرتے ہو،تمہارا اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا،میں نے ان سے کہا کہ میری یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں جب بائع ہوں گا تو مدعا علیہ میں کیوں نہیں بنوں گا،مقدمات کی لغویت میرے بس کی نہیں،میں طالب علم آدمی ہوں مجھے طلب علم میں جو مل رہا ہے اس پر تیس ہزار نہیں اس پر تیس لاکھ بھی قربان ہوسکتے ہیں اللہ ان دوستوں کو جزائے خیر عطاء فرمادے کہ وہ بھی میری مدد کے واسطے آئے تھے،مگر ان مقدمات کی وحشت نے مجھے ذرا بھی ان کی بات کی طرف متوجہ نہ کیا۔

حضرت سہانپوری کا دب کر مصالحت کی کوشش کرنا:

اس وقت ایک لطیفہ اور یاد آگیا معلوم نہیں کہ اپنے حضرت مرشدی سہارنپوری کے حالات میں لکھوا چکا ہوں یا نہیں،حضرت قدس سرہٗ کا انبہٹہ میں کسی عزیز سے کوئی نزاع ہوا۔جس میں حضرت

اقدس نے دب کر صلح اور فیصلہ کرنا چاہا اور ان کے مطالبہ کے حق میں کچھ رقم دینی چاہی۔ ان صاحب نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے ایک دفعہ اضافہ فرمایا، دوسری مرتبہ فرمایا اور پھر تیسری مرتبہ بھی کچھ اضافہ کیا مگر وہ صاحب ہر مرتبہ صلح سے انکار کرتے رہے۔

تیسری مرتبہ کے بعد حضرت نے ان کو پیام بھیجا کہ اب مصالحت ختم ہے دعویٰ کر دیا جائے۔ اس پر ان صاحب کا پیام آیا کہ میں مصالحت آخری نمبر پر تیار ہوں، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ اب تو نمبر ایک پر بھی صلح نہیں ہوسکتی۔ اب جو کچھ ہوگا عدالت میں ہوگا۔ تم نے یہ سمجھا ہوگا کہ مولوی ہے مقدمہ کے لفظ سے ڈر جائے گا اور میں عزیز داری اور آپس میں نزاع کم کرنے کے واسطے دیتا چلا گیا۔ مگر تم نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ میں جہاں ایک طرف مولوی ہوں، دوسری طرف انبہٹہ کا شیخ زادہ بھی ہوں، اب کسی حال میں صلح نہیں ہے۔ انہوں نے کئی صاحب کے ذریعہ ابتدائی درجہ پر صلح کرنی چاہی، مگر حضرت نے انکار فرما دیا پھر انہوں نے دعویٰ کیا اور وہ نا کام ہوئے، ان نا کامی کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے ان سے کہلوایا کہ یہ تو میں نے آپ کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کیا، اب بھی جتنا آپ کا حق شرعی ہے وہ میں دوں گا۔ چنانچہ حضرت نے وہ ان کو مرحمت فرما دیا۔

(۲۰)......ایک نہایت اہم اور ضروری امر جو میں آپ بیتی نمبر ا میں غالباً کئی جگہ لکھوا چکا ہوں اور آپ بیتی نمبر ۲ و نمبر ۳ میں بھی اس کا کچھ مضمون گزرا ہے کہ میں مدرسہ کے مسئلہ میں وقف کے مال میں اپنے بڑوں سے اور اپنے دوستوں سے کبھی لڑنے میں نہیں چوکا اور چھوٹوں سے تو پوچھنا ہی کیا۔ اس وجہ سے کہ میں نے اپنے اکابر کے اکابر کو اس میں بہت ہی محتاط پایا۔

اس سلسلے میں کئی قصے آپ بیتی نمبر ا میں لکھوا چکا ہوں کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ مدرسہ کے اسباق کے وقت میں اگر کوئی شخص کسی ذاتی بات کے لیے آتا تو وہ گھنٹہ دیکھ لیا کرتے تھے اور اتنے منٹ نوٹ کر لیتے تھے جتنے بات میں خرچ ہوئے اور مہینہ کے ختم پر ان کے گھنٹہ بنا کر اگر آدھے دن سے کم ہوتے تو آدھے دن کی رخصت درج کراتے اور آدھے دن سے زائد ہوتا تو پورے دن کی رخصت فرماتے تھے۔

میں یہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ وہ مہتمم مدرسہ بھی تھے اور مفتی مدرسہ بھی اور عدالتی کاروبار کے لیے کوئی مستقل شخص نہیں تھا۔ سب مقدمات کی خود ہی پیروی کرتے تھے اور ان کے لیے دہرہ دون بھی اکثر جانا ہوتا تھا۔ لاریاں اس زمانے میں نہیں تھیں، ریل سے یا ایک منزل بیچ میں رُک کر گھوڑے تانگے سے جانا ہوتا تھا محرر کو ساتھ لے کر خود تشریف لے جاتے تھے۔ محصل چندہ شہر جب یہ شکایت کرتا کہ فلاں فلاں شخص نے چندہ نہیں دیا تو وہ ایک کاغذ پر ان کا نام و پتہ لکھ لیتے اور ان کے مکان پر خود تشریف لے جاتے۔ اس کو میں پہلے

تفصیل سے لکھوا چکا ہوں اور وہ اپنی معذوری کی وجہ سے عموماً صبح کو اپنی ڈولی میں تشریف لاتے۔ ساری دوپہر گرمی میں بھی مدرسہ کا کام کرتے رہتے تھے۔ ظہر کی اذان سے آدھ گھنٹہ پہلے دفتر میں ہی زمین پر لیٹ کر آرام فرماتے۔ اس کے باوجود ۴۴ھ میں حضرت قدس سرہٗ جب طویل قیام کے لیے حجاز تشریف لے جا رہے تھے اور غیبت کے انتظامات کا پرچہ لکھوایا تو حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب کے متعلق لکھوایا کہ وہ اپنی ضعف و پیری کی وجہ سے مدرسہ کے اوقات کی پابندی نہیں کر سکتے، اس لیے آیندہ ہر قسم کے گریڈ اور ترقی سے مستثنیٰ رکھے جائیں۔

میں بہت ہی گستاخ تھا اور حد سے زیادہ بے ادب۔ میں نے بارہا سفارش کی کہ حضرت دو تین آدمیوں سے زیادہ کام کرتے ہیں اور ان کے کام بھی گنوائے، حضرت نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے مگر ان کے دفتر میں دیر سے آنے سے سارے ماتحتوں پر اثر پڑتا ہے اور ماتحت بھی وقت کی پابندی میں سستی کرتے ہیں۔ اس کے بعد سے جب بھی میں کسی مدرسہ کے ناظم یا مہتمم یا کسی بھی ذمہ دار کو مدرسہ کے اوقات میں تاخیر کرتے دیکھتا ہوں تو "من رأی منکم منکراً" الحدیث کی بنا پر ہاتھ سے روکنے کی تو کہیں بھی قدرت نہیں ہے لیکن زبان سے جہاں کہہ سکتا ہوں وہاں کسر نہیں چھوڑتا ہوں اور جہاں اس کی بھی قدرت نہ ہو وہاں قلبی تعلقات پر تو بے اختیار اثر پڑتا ہے۔

میرے بہت سے مخلص دوست ایسے جن سے مجھے بہت ہی قلبی محبت تھی مدرسہ کے قصوں نے مجھے ان سے یا ان کو مجھ سے بہت ہی دور کر دیا، میں شاید یہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ اب کی تو خبر نہیں کہ مجھے حالات کا علم نہیں رہا مگر جب حالات کا علم ہوتا رہتا تھا تو میں نے کثرت سے اس کا تجربہ کیا کہ جس نے بے وجہ کسی ذاتی ضرورت کی وجہ سے رخصت اتفاقیہ کے بجائے رخصت بیماری کی، وہ یا تو واقعی بیمار ہوا اور یا کوئی مالی نقصان پہنچا، دسیوں واقعات مجھے خوب یاد ہیں،

ایک صاحب کسی گاؤں کے رہنے والے جمعرات کے دن کچھ وقت سے پہلے چلے جاتے اور شنبہ کے دن گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد آیا کرتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ ناصحانہ سمجھایا اور تنبیہ بھی کی لیکن انہوں نے التفات نہیں کیا۔ ان کے یہاں اتنی زوردار چوری ہوئی کہ بہت ہی رنج و قلق ہوا اور یہ تو اکثر دیکھنے میں آیا کہ کوئی بیماری یا ناحق کا مقدمہ ایسا پیچھے لگتا ہے جو بہت ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہم سب کو سمجھ عطاء فرمائے اور اللہ تعالیٰ مجھے ہی معاف فرمائے اور میرے اکابر کو میری گستاخیوں اور بے ادبیوں پر بہت ہی بہتر سے بہتر بدلہ عطاء فرمائے۔

میں نے ایک دفعہ اپنے مخدوم سیدی وسندی حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ حضرت کی علوشان کی وجہ سے کوئی کہہ سکے یا نہ کہہ سکے مگر حضرت کے اسفار کی کثرت تنخواہ کے ساتھ بہت دل میں کھٹکتی ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ملازمت کے

وقت ان سب چیزوں کو ممبران مدرسہ سے طے کرلیا تھا کہ میں ان وجوہ سے اسفار پر مجبور ہوں اور پھر حضرت نے وہ شرائط نامہ بھی مجھے دکھایا جو ہر وقت حضرت کے بیگ میں رہتا تھا۔اس میں واقعی اس سے بہت زیادہ کی گنجائش دی ہوئی تھی جتنے حضرت اسفار فرمایا کرتے تھے اور اہلِ مدرسہ بھی مجبور تھے کہ جن حالات میں انہوں نے حضرت شیخ الاسلام کے پاؤں پکڑ کر بلکہ اقدام پر ٹوپی رکھ کر مدرسہ میں قیام کی درخواست کی تھی، اس وقت میں حضرت مدنی قدس سرہٗ کے علاوہ دارالعلوم کو سنبھالنے والا کوئی اور نہیں تھا ایک مرتبہ اس ناکارہ نے اپنے چچا جان سے بھی عرض کیا تھا کہ آپ مبلغین کو جو کچھ عطاء فرماتے ہیں اس کا کوئی ضابطہ اور قانون ضرور ہونا چاہیے۔قصہ تو بہت لمبا ہے۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ میں تبلیغ کی مد میں کسی شخص کا چندہ قبول نہیں کرتا۔میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے ہاتھ سے خود خرچ کریں اور مجھ سے مشورہ کریں، لیکن جو شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ آپ کی ملک ہے آپ کو کلی اختیار ہے کہ اپنے اوپر خرچ کریں یا کسی دوسرے پر، وہ میں لے لیتا ہوں۔

جب یہ ناکارہ ۴۶ھ میں ایک سالہ قیام کے بعد حجاز سے ہندوستان واپس آیا اور مستقل طور پر تنخواہ نہ لینے کا ارادہ سرپرستان سے ظاہر کیا کہ میں مدرسہ میں شام کے دو گھنٹے کے علاوہ نہیں دے سکتا کہ صبح کا وقت میری تالیف وتصنیف کا ہے تو حضرات سرپرستان نے یہ کہا کہ ہم شام کے دو گھنٹے کے لیے تجھے پوری تنخواہ دیں گے۔اس ناکارہ نے کہا کہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے۔ایک تہائی وقت میں آپ پوری تنخواہ کیسے دے سکتے ہیں؟ سرپرستان حضرات نے فرمایا کہ مدرسہ کی مصالح اور ضرورت کو ہم سمجھتے ہیں کہ ایک شخص کو کتنی تنخواہ دینی چاہیے۔میں نے کہا کہ آپ حضرات اپنے پاس سے مرحمت فرمادیں تو سرآنکھوں پر لیکن مدرسہ کے مال سے مجھے خود بھی سوچنا چاہیے کہ میں اتنی تنخواہ کا مستحق ہوں یا نہیں؟ ان حضرات نے بہت اصرار فرمایا مگر اس ناکارہ نے قبول نہیں کیا۔ اس لیے میرے اکابر نے ہمیشہ بالخصوص میرے حضرت قدس سرہٗ نے ترقی کو یہ کہہ کر انکار کیا کہ میری حیثیت کے موافق یہ موجودہ تنخواہ بہت ہے۔

بلکہ ذیقعدہ ۳۴ھ میں جب حضرت قدس سرہٗ کی حجاز کے طویل سفر سے واپسی ہوئی اور میرے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا تو حضرت نے تنخواہ لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اب تک مولانا یحییٰ صاحب میری جگہ سبق پڑھاتے تھے اور میں اور وہ دونوں مل کر ایک مدرس سے زیادہ کا کام کرتے تھے، لیکن مولانا کے انتقال کے بعد میں ایک تنہا ایک مدرس کا کام نہیں کر سکتا، اس لیے مدرسہ کی تنخواہ لینی مجھے جائز نہیں۔

غالباً پہلے بھی یہ قصہ لکھا جا چکا ہے، بہت طویل قصہ ہے، اسی بناء پر اس ناکارہ کو اس مسئلہ پر

بہت ہی خوف رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی میری لغزشوں کو معاف فرمادے۔ میں اپنے دوستوں میں جب کسی شخص کے متعلق مدرسہ کے اوقات میں یا معاملات میں تساہل دیکھتا ہوں تو بہت ہی طبیعت کو تکدر رہتا ہے۔ میں چاہے اس کوٹوک سکوں یا نہیں، لیکن طبیعت اندر سے بہت مکدر رہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل مدرسہ کے معاملات میں جس کو محتاط دیکھتا ہوں اس سے اگر میرا کوئی تکدر پہلے سے ہوتو وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ غالباً قاری سعید مرحوم کا قصہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ ابتداءً ان سے تعلقات کچھ کشیدہ ہی رہے مگر صرف دو باتوں نے ابتداءً میرا قرآن پاک سُننے سے مدرسہ کے وقت میں انکار کیا اور اس کے بعد انہوں نے اجراڑہ کے مدرسہ میں بکار مدرسہ جانے کو باوجود محض اس وجہ سے کہ وہاں ان کا گھر تھا انہوں نے رخصت لکھوائی۔ ان کو ایسا محبوب بنایا کہ ’’ندمانی جزیمۃ‘‘ بنادیا۔ گو موجودہ مدرسہ کے عملے میں بہت سے لوگوں کی تحقیقات بھی کرارہتا ہوں کہ کون کون وقت پر مدرسہ کے دفاتر میں آیا اور آنے کے بعد مدرسہ کے کام میں مشغول ہے یا لغویات میں، اسی طرح سے مدرسین میں بھی باوجودیکہ میں اب اپنے اعذار وامراض کی وجہ سے تقریباً دو سال سے مدرسہ کے انتظامات سے غیر متعلق ہوں، پھر بھی اکثر آدمی بھیج کر یا آنے والے دوستوں سے تحقیق کرتارہتا ہوں کہ کس مدرس نے وقت پر سبق شروع کرایا اور وقت پر ختم کرایا اور کس نے اول یا آخر میں زیادتی کی۔ ادل الذکر لوگوں کی دعوت کرنے کا بھی مجھ پر تقاضہ رہتا ہے اور ان کی مدارات کا بھی اور ثانی الذکر اشخاص کے متعلق طبیعت میں تکدر بڑھتا رہتا ہے۔

علی گڑھ کے اندر جو مواد ذہن میں تھا وہ سب ختم ہو گیا اور ان واقعات کے لکھوانے میں مزید مضامین بھی ذہن میں آئے، مگر ایک تو رمضان کے بعد سے طبیعت بہت ہی خراب چل رہی ہے۔ کچھ دنوں تک میں رمضان کے بعد کا تکان سمجھتا رہا۔ مگر طبیعت روز افزوں گرتی جارہی ہے ادھر ماہ رمضان المبارک سے سفر حجاز کا بھی ذکر و تذکرہ زوروں پر ہے، اگرچہ اپنے امراض ظاہرہ و باطنہ کی بناء پر امید تو نہیں کہ حاضری میسر ہوگی، مگر جیسا کہ پہلے بھی متفرق جگہ لکھ چکا ہوں کہ مجھے معمولی سفر کا بھی سہم بہت سوار ہوتا ہے، دہلی تک کے سفر میں کئی دن پہلے سے دورانِ سر اور حرارت شروع ہو جاتی ہے اور سفر سے واپسی کے بعد کئی دن تک اثر رہتا ہے اور یہ تو بہت طویل سفر ہے اور بیماری کی وجہ سے اس کا اثر بھی بہت ہو رہا ہے۔ اس لیے اب تو دوستوں سے رخصت ہوتا ہوں:

پھر بھی آئیں گے گر خدا لایا

اگر موقع ہوا تو ممکن ہے کہ اس سلسلہ کا پانچواں اور چھٹا حصہ بھی مکمل ہوگا۔ انشاء اللہ اکابر و احباب کے بہت ہی قصے یاد آتے چلے گئے اور لکھنے کے دوران میں اس خیال سے بہت سے قصے اس لیے بھی چھوڑ دیے کہ اس تحریر سے کوئی دینی یا دنیاوی نفع سمجھنے میں نہیں آیا، مگر بار بار چھوڑ نے کے بعد دوستوں کے اصرار پر کہ علی گڑھ میں جو کچھ مسودہ کی شکل میں لکھا جا چکا ہے اس کی تبیض ضروری ہے اس کو پورا کرا دیا۔

واللّٰہ الموافق لما یحب و یرضیٰ و صلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیّدنا و مولانا محمد و اٰلہٖ وصحبہٖ و بارک وسلم تسلیماً کثیراً.

زکریا کاندھلوی
۹ ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ
صبیحۃ یوم الخمیس

......☆☆☆☆☆......

ضمائم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْم

یہ ناکارہ اوائل ذیقعدہ ۹۰ھ میں حج کو جاتے ہوئے یہ مسودات اپنے دوستوں کو جو طباعت کا کام کر رہے ہیں حوالہ کر گیا تھا۔ واپسی پر ۴ جون ۷۱ء مطابق ۹ ربیع الثانی ۹۱ھ کو دہلی پہنچا، وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ آپ بیتی نمبر ۳ کی طباعت ہو چکی، جس کے چند نسخے مجھے دہلی میں ملے اور میں نے اسی وقت وہیں سے اپنے ایک مخلص دوست کے ہاتھ چھ (۶) نسخے حجاز مقدس بھیج دیے کہ میری ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ جو کتاب بھی طبع ہوتی ہے اس کا پہلا نسخہ ہمیشہ مدینہ پاک کسی دوست کے پاس بھیجنے کا اہتمام رہا۔ عربی ہو تو سید محمود صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں بھیجتا تھا یا مدرسہ شرعیہ میں اور اب سید صاحب کے وصال کے بعد سے ان کے صاحبزادے سید حبیب صاحب کے پاس بھیجتا ہوں اور اگر اردو میں ہو تو اردو داں دوستوں میں سے کسی کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ ان چھ نسخوں میں سے دو مدینہ پاک کے احباب کے تھے اور چار مکی احباب کے۔ چند ہی دنوں میں اس کے بہت سے نسخے مفت یا قیمتاً ختم ہو گئے۔ اتفاق سے میرے مخلص دوست مولانا عبدالحکیم جونپوری مظاہری جن سے ان کے دورہ شریف پڑھنے کے زمانے میں بہت ہی خصوصی تعلقات ہو گئے تھے، چونکہ خوش قلم تھے اس لیے میری بہت سی چیزوں کی نقل کرنے کی بیگار بھی مولانا موصوف کے ذمہ تھی اور اب تو وہ مدرسہ ضیاء العلوم جونپور کے ناظم ہونے کے علاوہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی کے اجل خلفاء میں ہیں، مجھ سے ملنے کے واسطے آئے۔ میں نے آپ بیتی نمبر ۳ ان کو دی اور میرے ہی پاس بیٹھ کر انہوں نے دیکھنا شروع کیا، دیکھتے ہی دیکھتے فرمایا کہ دوسرے صاحبزادے کی پیدائش تو اس زمانے میں تھی جس زمانہ میں میں دورہ میں تھا۔ ہم لوگوں نے دورہ کی جماعت کی طرف سے متفقہ شیرینی کا مطالبہ بھی کیا تھا اور بہت زوردار شیرینی بھی آپ سے وصول کی تھی، غور سے دیکھنے سے مجھے بھی معلوم ہوا کہ یہاں دو لڑکوں کے دو قصے غلط ہو گئے۔

اس کے علاوہ عزیزم الحاج محمد شمیم بن برادرم الحاج محمد سلیم مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے خط آنے شروع ہوئے، اس میں آپ بیتی نمبر ۳ پر کچھ اشکال اور کچھ اضافوں کے اصرار کیے۔ میں نے ان کو لکھ دیا کہ اصلاحات تو جب بھی سمجھ میں آئیں ضرور لکھیں مگر اضافوں کی گنجائش نہیں۔ اس وقت چونکہ آپ بیتی نمبر ۵ کی کتابت قریب الختم ہے، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آج ۲۲ جمادی الثانیہ ۹۱ھ مطابق ۱۵ اگست ۷۱ء تک اصلاحات و اضافات جو موصول ہوئے ہیں انہیں نقل

کرادوں کہ اس وقت یہ حصہ کتابت کے بعد پریس میں جارہا ہے۔ آئندہ بھی کوئی چیز حصہ پنجم کی طباعت سے پہلے ملی تو اس میں شامل کردی جائے گی اور اس کے بعد ملی تو احباب اصلاح کرتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ رسالے میں نے جبکہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بیماری کی حالت میں علی گڑھ کے شفاخانے میں لکھوائے تھے اس لیے املاء میں کچھ تسامح بھی ہوا ہے۔

اصلاح متعلقہ تولد ولد اوّل:

(۱)......آپ بیتی نمبر ۳ پر دولڑکوں کا قصہ غلط ہوگیا ہے۔ صحیح عبارت یہ ہے کہ ''میری سابقہ اہلیہ سے ایک لڑکا محمد موسیٰ نام رمضان ۴۳ھ میں سہارنپور میں پیدا ہوا، چند ماہ بعد نظام الدین میں انتقال ہوگیا۔ اس وقت تو اس کے انتقال کا قصہ لکھا تھا۔'' یہاں سے لے کر آخر تک کی عبارت صحیح ہے اور اس سے اُوپر کی چند سطریں ''میری اہلیہ سے ایک لڑکا طلحہ کا بڑا بھائی پیدا ہوا جس کا نام عبدالحیٔ تھا۔'' یہ دوسرے لڑکے کا قصہ ہے۔ پہلے لڑکے کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ چچا جان کے خط سے اس کے انتقال کی اطلاع ہوئی میں اس وقت بذل المجہود لکھوا رہا تھا، اخیر تک عبارت صحیح ہے اور دوسرے صفحہ پر دوسرے دن ڈاک سے عزیز یوسف کا خط آیا، یہاں سے لے کر اخیر تک کا واقعہ دوسرے لڑکے عبدالحیٔ کا واقعہ ہے اور یہ واقعہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے۔ اس بچہ کی پیدائش ۱۸ ربیع الثانی ۵۸ھ نظام الدین میں پنجشنبہ کو ہوئی۔ اسی کا نام عبدالحیٔ تھا۔ مجھے اس معصوم کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے انتقال کے بعد اگلے دن کی ڈاک سے الخ یہ عبارت صحیح ہے، آگے کے اشکالات عزیزم الحاج شمیم مکی کے خطوط سے منقول ہیں۔

اصلاح بسلسلہ نکاح ماموں یامین:

(۲)......میں نے آپ بیتی نمبر ۳ پر ماموں یامین کی شادی کا قصہ نقل کیا ہے اس پر عزیزم الحاج محمد شمیم مکی کا خط پہنچا، جس میں لکھا کہ ماموں عثمان کی عدم شرکت میں آپ سے سہو ہوا۔ وہ تو شریک تھے اور ان کی شرکت میں بڑے لطائف گزرے۔ ان کا خط بعینہٖ نقل کراتا ہوں، نیز میں نے ان کو جواب لکھوادیا کہ میرا مناظرہ یا حکم عدولی دادا رؤف الحسن مرحوم سے جو ہوئی تھی وہ ولیمہ میں شرکت کے متعلق تھی۔ ولیمہ میں ان کی شرکت قطعاً نہیں تھی، اسی پر میرا مناظرہ تھا۔ اب یاد آیا کہ نکاح میں شرکت کے بعد ماموں عثمان صاحب ولیمہ میں شرکت سے معذرت کر کے میری طرح پہلے ہی چلے گئے تھے۔ چونکہ یہ ساری بحث ولیمہ ہی کے متعلق تھی میں سمجھا کہ شاید نکاح میں بھی وہ شریک نہ ہوسکے تھے نیز بھائی اکرام کے کارڈ سے ایک شعر میں نے لکھا ہے (آپ بیتی نمبر ۳ پر) اب رسالہ طبع ہونے پر بھائی اکرام صاحب نے بقیہ اشعار بھی سنادیے، وہ یہ ہیں:

جانتا نہیں میں قبلہ قبلی بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف فرماؤ آج کی رات کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیہ سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

نقل مکتوب بھائی شمیم سلمہٗ:

بعد سلام مسنون! آپ نے آپ بیتی نمبر۳ پر پھوپھا یامین صاحب کی شادی کے مضمون میں ابا رؤف الحسن صاحب مرحوم کے تذکرہ کے ساتھ خالو عثمان صاحب مرحوم کا پھوپھا یامین صاحب کی شادی میں شریک نہ ہو سکنے کا ذکر فرمایا ہے۔ بھائی ابا (جناب الحاج محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ) کو اور پھوپھا یامین کو اس پر حیرت ہے کہ شاید خالو عثمان مرحوم کا نام لکھنے میں سہو ہو گیا اول تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خالو عثمان شریک نہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ شادی کے کرتا دھرتا وہی تھے۔ دوسرے یہ دلچسپ واقعہ خالو عثمان صاحب ہی کے ساتھ پیش آیا تھا کہ پھوپا کی شادی میں رات کو خوب زور دار بارش ہوئی، بارات کو مولوی بدر الاسلام صاحب کے وسیع مکان میں ٹھہرایا گیا تھا جس کے بے حد وسیع صحن اور چبوترے پر شامیانہ لگایا گیا تھا اور یہ شامیانہ خصوصی طور پر مظفر نگر سے نواب لیاقت علی خاں (وزیر اعظم پاکستان) یا ان کے والد کے یہاں سے آیا تھا اور انہوں نے ہی بڑے شوق سے بھیجا تھا۔ شادی میں کنور عنایت علی خان بھی مع اپنے لنگاڑوں کے شریک تھے اور بار بار کہہ رہے تھے کہ کیا مولوی کی بے مزہ شادی ہے، سارے مُردے آکر جمع ہو گئے ہیں۔ رات کو عشاء کے بعد زوردار بارش شروع ہوئی، سینکڑوں آدمی شامیانے کے نیچے سو رہے تھے کہ ایک دم قیامت کا شور اٹھا اور یہ جب جنگم شامیانہ ٹوٹ کر اس طرف جھک گیا جدھر سب سے الگ خالو عثمان صاحب کا پلنگ تھا۔ شامیانے پر جتنا پانی تھا وہ سارا ڈھل کر خالو عثمان پر گرا، وہ اور ان کے ساتھ ۵، ۱۰ آدمی ہزاروں مشک ٹھنڈے پانی میں نہا گئے۔ لوگوں کے بستر بھیگے، شامیانہ کے ڈنڈے اور لکڑیاں لوگوں کے سروں میں لگیں۔ لوگ اندھیرے میں اُٹھ کر بھاگے تو کسی کا پاؤں کسی کے چہرے پر تو کسی کے پیٹ پر۔ رات کے اندھیرے میں اور بارش میں وہ افراتفری مچی کہ لطف ہی آ گیا۔ سب سے زیادہ خالو عثمان کی بنی۔ صبح کو ناشتہ پر کنور صاحب مرحوم نے اعلان فرمایا کہ رات والا کارنامہ ان کا تھا اور انہوں نے اپنے ایک نوکر کو چھت پر چڑھا کر شامیانے کی رسیاں کٹوا دی تھیں اور بار بار یہ کہتے تھے کہ مکہ کی لونڈیا ہے (اس لیے کہ تائے سعید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کیرانوی مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کا قیام مکہ مکرمہ میں رہتا تھا اور ان کی صاحبزادی سے یہ نکاح ہوا تھا) اور کاندھلہ کے مولویوں کا لونڈا۔ ان دونوں کی شادی میں تفریح نہ ہوئی تو کیا میری شادی

میں ہوگی اور اپنے تکیہ کلام گالی دے کر کہنے لگے کہ شامیانہ میں نے کٹوایا ہے، جس ماں کے پوت میں ہمت ہو سامنے آجائے۔ الغرض کنور صاحب نے اس شادی کو باغ و بہار بنا دیا۔ خالو عثمان صاحب کے پاس دوسرا جوڑا نہیں تھا تو کنور صاحب نے زبردستی اپنا جوڑا ان کو پہنایا۔ بھائی ابا کا خیال ہے کہ کنور صاحب کے ہنسی مذاق اور پھکڑ پن پر شاید کوئی فقرہ خالو عثمان صاحب نے کہہ دیا تھا جس کا انتقام کنور صاحب نے اس طرح لیا کہ شامیانے کی تین طرف کی رسیاں اس طرح کٹوائیں کہ سارا پانی آدھی رات کو بے چارے خالو عثمان پر گرا۔ فقط

الجواب:

عزیزم شمیم نے جو قصہ بارش وغیرہ کا لکھوایا وہ تو مجھے یاد نہیں کہ میں تو اپنے ہم عمروں کے ساتھ ایک مستقل مکان میں تھا، لیکن میں نے جو واقعہ ولیمہ کے سلسلہ میں لکھوایا اس میں کوئی تردد نہیں اور میرے دادا رؤف الحسن صاحب مرحوم سے یہ کہنا کہ ماموں عثمان صاحب کی کیا مجبوری ہے ملازمت ہی تو ہے چھوٹ جائے گی تو اور کہیں مل جائے گی۔ مگر میں حضرت (قدس سرہٗ) سے ایک دن کی اجازت لے کر آیا ہوں، خوب یاد ہے اور دادا رؤف الحسن صاحب کا انتہائی غصہ کی وجہ سے سکوت کا منظر اور چہرہ کا تغیر بھی میرے سامنے ہے، اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ میری طرح ماموں عثمان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی صرف نکاح میں شریک ہوئے ہوں گے ولیمہ میں نہیں شریک ہوں گے، جس کو میں نے دلیل بنایا۔ عزیزم الحاج محمد شمیم سلمہٗ ہی نے کنور صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا، اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ اللہ ان کو معاف فرمائے، مرحوم کے کارنامے اس سے بہت اونچے اُونچے ہیں۔ میرے کاندھلوی اکابر اقارب سے بہت ہی خصوصی دوستانہ سے بھی بڑھ کر تعلقات تھے۔ ۱۵، ۱۵، ۲۰، ۲۰ دن کاندھلہ میں مستقل قیام کرتے تھے۔ قصبہ لوئی ضلع مظفر نگر کے مشہور رئیس تھے۔ اس واقعہ کے ساتھ مرحوم کے بیسیوں واقعات دل و دماغ میں گھوم گئے۔ میرے بچپن میں ان کا بڑھاپا تھا۔ نمونہ کے طور پر دو تین واقعات ان کے بھی لکھوا دیتا ہوں۔

(الف)...... میری عمر آٹھ سال سے زائد نہ تھی۔ اپنی والدہ کے ساتھ ایک آدھ روز کے لیے کاندھلہ جانا ہوتا تھا۔ ہمارے مکان کے قریب مظہر الحق مرحوم کا مکان تھا، اس زمانہ کے آپس کے تعلقات کا تو اگر اب ذکر بھی کیا جائے تو شاید یقین نہ آئے۔ آپس میں اتنی محبتیں تھیں کہ جنت کے تعلقات کا جو منظر احادیث میں پڑھا ہے: ''قلوبهم على قلب رجل واحد لا اختلاف بينهم ولا تباغض '' یہ اپنے اکابر و اقارب میں بہت دیکھا کنور صاحب ڈپٹی صاحب کے چبوترے پر ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نانی اماں کے مکان سے نکل کر مسجد کی طرف جا رہا

تھا۔ مجھے آواز دی بیٹا یہاں آنا۔ میں چبوترہ پر چڑھ کر ان کی کرسی کے پاس گیا، انہوں نے اپنی دونوں باہیں میری گردن میں ڈالیں اور میرے سر پر بڑی محبت سے دونوں ہاتھ پھیرے اور کہا کہ بیٹا دیکھ! او بیٹا! مرنے کے بعد تو تو جنت میں ضرور جائے گا اور دادا دوزخ میں پڑا ہوا ہوگا۔ بس دیکھ دادا کا ہاتھ پکڑ کر دوزخ سے کھینچ کر اپنے پاس لے جائیے۔

(ب)......ایک مرتبہ مجھے کہنے لگے بیٹا! قرض حسنہ جانے کسے کہتے ہیں؟ ہم حقیقت تو اب تک بھی نہیں جانتے مگر جو سنا تھا کہ ثواب کی نیت سے بغیر سود کے اللہ کے واسطے قرض دے اپنی کوئی غرض نہ ہو، اس قسم کی کوئی بات میں نے کہی، کہنے لگا بیٹا یوں نہیں۔ تو نہیں جانتا یہ قرض حسنہ نہیں قرض ہنسنا ہے کہ کسی سے بڑے پکے وعدے پر قرض لے اور جب وہ غریب وعدہ پر مانگنے آئے تو ایک قہقہہ مار کر ہنس دے۔ وہ یوں تو منت سماجت ہر موقعہ پر کرلے اور تو ہر موقعہ پر ہنس دے، یہ دو واقعے تو مجھے پیش آئے اور ان کے علاوہ اور بھی بیسیوں واقعات سنے ہیں۔

(ج)......یہ میرا اسی وقت کا سنا ہوا ہے کہ مظفر نگر میں ایک غیر مسلم ڈپٹی صاحب نوجوان تھے، ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ کنور صاحب مرحوم ایک بہت موٹا سا لٹھ اپنے ہاتھ میں رکھا کرتے تھے جو ان کے سر سے بھی اونچا تھا۔ اس کو درمیان میں پکڑ کر چلا کرتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کی تعزیت کے لیے ہندو مسلمانوں کا بہت اجتماع تھا۔ ان کے مکان پر آدمیوں کا بڑا ہجوم تھا۔ کنور صاحب بھی اپنا لٹھ لے کر نہایت رنجیدہ منہ بنا کر کراہتے ہوئے، کھانستے ہوئے پہنچے، کیونکہ ہمیشہ مظفر نگر کے مجسٹریٹ رہے اس لیے ہندو مسلمان سب ہی باطن سے نہ سہی ظاہر سے ان کی بہت ہی عزت کیا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر سب مجمع اُٹھ گیا۔ ڈپٹی صاحب کی برابر کی کرسی ان کے لیے خالی ہو گئی، بیٹھ کر کہنے لگے ڈپٹی صاحب جب سے سنا ہے، بہت ہی رنج وقلق ہے ماں کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ آدمی ہمیشہ روئے ہی (یہ تمسخر تھا، انہیں معلوم تھا کہ ڈپٹی صاحب کی بیوی کا انتقال ہوا ہے) ارے بھائی ڈپٹی پیارے مرنا تو سب کو ہے مگر ماں باپ کا بدل کہاں مل سکے۔ ماں کی محبت تو کبھی بھی بھلائی نہیں جاسکتی، سنا ہے کہ فرضی آنسو بھی گرائے۔ کسی صاحب نے جن کی کرسی ان کے برابر تھی اُٹھ کر کان میں کہا کہ کنور صاحب ڈپٹی صاحب کی والدہ کا انتقال نہیں ہوا اہلیہ محترمہ کا ہوا ہے۔ زور سے کہنے لگے ”لاحول ولا قوۃ“ ارے میں نے تو ماں کی خبر سُنی تھی اسی واسطے تو میں صبح سے رو رہا ہوں، بیوی کا کیا رونا، پُرانی گئی نئی آئے گی، تم چلو ابھی میرے ساتھ کنواری کہے کنواری، رانڈ کہے رانڈ، جیسی کہے ویسے کرادوں، تو ہندو ہے اس واسطے ایک ہی ہوسکتی ہے مسلمان ہوتا تو چار کرادیتا۔ ارے پیارے ڈپٹی (ڈپٹی صاحب نوعمر تھے) بیوی کو رویا نہیں کرتے، تو دیکھ اب تجھے نئی مل جائے گی۔ دو چار دن میں تو اس کے ساتھ لگ جائے گا۔ مجمع میں تو کھلکھلا کر کوئی

نہیں ہنسا مگر چپکے چپکے مجلس عزاء مجلس مزاح بن گئی۔

(۵) حضرت مولانا الحاج الحافظ قاری محمد طیب صاحب دام مجدہم کے چھوٹے بھائی قاری محمد طاہر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دیو بند سے ایک اخبار نکالا کرتے تھے۔ غالباً ''الانصار'' اس میں کوئی مضمون کسی اعلیٰ افسر کے خلاف شائع ہوگیا۔ ان صاحب نے ہتک عزت کا دعویٰ کردیا وہ چونکہ بڑے آدمی تھے، اس لیے وکلاء سے مشورے سے ان کے جواب دعویٰ کی تجویزیں کئی دن تک خوب ہوتی رہیں۔ مدعی کی کوشش تھی کہ وارنٹ بلا ضمانت کسی طرح سے جلدی جاری ہوجائے، جس کی وجہ سے سب ہی بڑوں چھوٹوں کو فکر تھی، کنور صاحب مظفر نگر سے دیو بند پہنچے، کہنے لگے طاہر بیٹا! اتنی سی چیز سے گھبرا گئے۔ جوابِ دعویٰ لکھ دو کہ میں تو ایک مہینہ سے کنور صاحب کے یہاں لوئی شکار کھیلنے کے واسطے گیا ہوا تھا۔ میری غیبت میں یہ مضمون لکھا گیا۔ مدعی کو بھی عزیز طاہر مرحوم ہی سے کچھ عداوت تھی۔ عزیز مرحوم نے کہا، تایاجی آپ عدالت میں کس طرح کی جھوٹی قسم کھائیں گے کہ یہ میرے ساتھ شکار میں تھے۔ کہنے لگے کہ اپنے مقدمے میں ہزار قسمیں جھوٹی کھائی ہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پوتے کے لیے اگر ایک جھوٹی قسم کھالوں گا تو خدا کی قسم میری ساری جھوٹی قسموں کا کفارہ ہوجائے گا، چنانچہ جوابِ دعویٰ میں یہی لکھا گیا کہ میں اس زمانے میں کنور صاحب کے ساتھ لوئی شکار کے لیے گیا ہوا تھا اور کنور صاحب کی تصدیق پر مقدمہ خارج ہوگیا اور نئے مدیر پر دعویٰ کرنا مدعی کا بھی مقصود نہیں تھا۔ ان ستر سالوں میں کیا کیا مناظر اہل دنیا کے ان آنکھوں نے دیکھے، ان سب کو لکھا جائے تو کم از کم آدھی عمر پینتیس سال اور چاہئیں۔

(۳)......عزیزم الحاج شمیم مکی نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا کہ آپ بیتی نمبر۳ میں آپ کے والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ کی علالت اور وفات کی تفصیلات نہیں ہیں، جب کہ والدہ صاحب اور اہلیہ کے حالات وفات درج ہیں۔

الجواب:

یہ صحیح ہے کہ یہ آپ بیتی جیسا کہ بار بار لکھا جاچکا ہے کوئی مستقل تالیف مسلسل نہیں ہے علی گڑھ کے دوسفروں میں جب کہ علمی کاموں سے روک دیا گیا تھا۔ پڑے پڑے کیف ما اتفق جو واقعات یاد آتے رہے لکھواتا رہا۔ بہت سے اہم واقعات چھوٹ گئے اور بہت سے واقعات بے ترتیب بھی آگئے اور بہت سے مکرر بھی ہوگئے۔ اس وقت تک یہ واہمہ بھی نہیں تھا کہ یہ طبع بھی ہوں گے۔ لکھنے کے بعد دوستوں کے اصرار اور اپنے شدید انکار کے باوجود طباعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی علالت بھی کچھ طویل نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن سے بھی کم

علالت رہی۔ ۹ ذیقعدہ جمعہ کی صبح سے طبیعت میں اضمحلال اور افسردگی تھی، عزیز مولوی حکیم مولوی محمد ایوب سلمہٗ سے فرمایا کہ کوئی کتاب دیکھنے کے واسطے لا۔ کچے مکان میں تشریف فرما تھے۔ عزیز حکیم ایوب مدرسہ میں والد صاحب کے کتب خانہ میں گئے اور وہ دو تین مختلف کتابیں عربی اشعار کی کہ اس کا ذوق تھا لائے مگر اس کو ناپسند کر دیا، وہ پھر دوبارہ گئے اور سلوک کی کتابیں لائے۔ مگر اسے بھی پسند نہیں کیا۔ جمعہ کی نماز دارالطلبہ میں اطمینان سے پڑھائی۔ جمعہ کے بعد حسب معمول کھانا کھا کر لیٹ گئے تو کچھ اسہال کا سلسلہ معمولی شروع ہوا۔ جو عشاء تک بڑھتا رہا۔ عشاء کے بعد یوں فرمایا کہ مولوی عبداللہ جان صاحب وکیل (مشہور بیرسٹر جو میرے حضرت قدس سرہٗ کے جانثاروں میں تھے تذکرۃ الخلیل میں بھی ذکر ان کا کہیں کہیں آیا ہے اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خاص دوستوں میں تھے) کے یہاں جانا ہے، انوار کی والدہ کے مقدمہ کی سفارش کرنا ہے۔ شیخ ابرار رئیس محلہ چوب فروشان کے بڑے بھائی کا نام انوار ہے، جو اس وقت میرے والد صاحب کے پاس حکیم ایوب مولوی نصیر کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ ان کا کوئی مقدمہ تھا، وہ مرحومہ میرے حضرت قدس سرہٗ اور میرے والد صاحب کے ساتھ بہت ہی محبت رکھتی تھی، ان کا اصرار تھا کہ اگر آپ مولوی عبداللہ جان صاحب سے کچھ فرما دیں تو میرے لیے بہت مفید ہوگا۔ تاریخ مقدمہ کے قریب تھی۔ عشاء کے بعد ان کے یہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان جو اس زمانے میں مظاہر علوم میں مدرس تھے اور میرے والد صاحب سے بہت ہی اخص الخصوص تعلق تھا، ان سے اور میرے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے فرمایا کہ تم دونوں بھی میرے ساتھ چلو، ایک لوٹا ساتھ لے لینا کہ اگر استنجا کی ضرورت ہوئی تو نالہ کی پڑی پر فارغ ہو جاؤں گا۔ یہ نالہ جو کھالہ پار کے داہنی جانب میں ہے اس وقت میں بہت ہی ویران تھا۔ اب تو عمارتوں کی اتنی بھرمار ہے کہ آباد شہر بن گیا۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کا پیغام پہنچا دیں گے آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ فرمایا اچھا زکریا کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ ہم تینوں مولوی عبداللہ جان وکیل کی کوٹھی پر گئے جو اسٹیشن کے قریب رہتے تھے۔ راستے میں یہ دونوں حضرات کچھ ایسی گفتگو کرتے گئے اور آئے تو میں تو کچھ سمجھ نہ سکا، بچپن تھا خلاصہ یہ تھا کہ ہم نے مولانا (یعنی والد صاحب) کی نہ تو کبھی قدر کی نہ ان کے رتبہ کو پہچانا۔ مولانا کے بے تکلفانہ طرز سے جو ہر چھوٹے کے ساتھ رہا کرتا تھا ہم بھی ساری عمر گستاخ بنے رہے۔

یہ دونوں ایسے ہی گفتگو کرتے چلے گئے اور آئے۔ میں سوچتا رہا کہ معمولی اسہال ہیں، یہ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں جیسے سخت بیمار ہوں، واپسی پر معلوم ہوا کہ دستوں میں اضافہ ہو گیا۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور میرے سب گھر والوں کا علاج حکیم محمد ایوب صاحب سرپرست مدرسہ

مظاہر علوم کے والد حکیم محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا رہا اور میرے حضرت قدس سرہٗ اور ان کے سب گھر والوں کا علاج حکیم صاحب کے بڑے بھائی حکیم ایوب کے تایا حکیم محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا رہا کرتا تھا، حکیم محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بڑے ہی حاذق طبیب ہندوستان میں شاید ہی دو چار آدمی ان کے ہم پلہ ہوں، مگر علاج میں باہر بہت کم جاتے تھے اور یہاں بھی بہت ہی استغناء کے ساتھ علاج کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی طرف رجوعات بہت کم تھیں اور چھوٹے بھائی حکیم محمد یعقوب صاحب فنی حیثیت سے تو بڑے بھائی کا مقابلہ بالکل نہیں کر سکتے تھے لیکن اللہ جل شانہٗ نے ہاتھ میں شفا عطاء فرما رکھی تھی، ان کی طرف رجوعات اتنی کثرت سے ہوتی تھیں کہ شاید شہر میں کسی طرف ہوتی ہوں۔ حکیم صاحب کو اطلاع دی گئی اور انہوں نے گھنٹہ گھنٹہ بھر کے فصل سے کئی دوائیں دیں مگر دست بجائے کم ہونے کے بڑھتے گئے۔ اخیر میں حکیم صاحب مرحوم نے اسہال بند کرنے کی کوئی سخت دوا دے دی، معلوم نہیں کیا تھی مگر صبح کو جب حکیم اسحاق صاحب نے ان سے دریافت فرمایا اور انہوں نے بتایا تو وہ اپنے چھوٹے بھائی حکیم یعقوب صاحب پر مجمع میں ہی ناراض ہوگئے کہ کیا ستم کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس دوا سے اسہال تو بند ہوگئے اور ایسے بند ہوئے کہ بند پڑ گیا۔ دونوں بھائیوں نے مختلف دوائیں دیں، پیٹ پر بہت سی ادویہ کو پیس کر گہرا لیپ بھی کرایا، حکیم یعقوب صاحب نے صابن کی ایک قاش کاٹ کر اس پر بہت سے دوائیں مل کر اپنے ہی ہاتھ سے انیمہ بھی کیا حکیم اسحاق صاحب خود اس وقت وہیں کھڑے تھے اس انیمہ کو دیکھ کر فرمایا کہ اب کیا ہو؟ یہ دونوں حضرات انیمہ کے بعد اپنے اپنے گھر کسی دوائی کی تجویز کے لیے گئے، یہ ہمارے مکان کے دروازے سے چند ہی قدم آگے نکلے ہوں گے اور ہم سب اجابت کے منتظر انیمہ کے اثر کے امیدوار کہ اتنے میں ہمارے مدرسہ کے مہتمم صاحب گھر سے مدرسہ آتے ہوئے علالت کی خبر سن کر عیادت کی نیت سے ہمارے گھر پہنچے کہ اس سے پہلے جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے اور یہ کہ رات تک علالت کا شدت سے اثر نہیں تھا، عام طور سے علالت کی شہرت بھی نہیں تھی۔

مہتمم صاحب نے مردانہ مکان میں گھستے ہی نہایت حزین آواز میں کہا کہ ارے چارپائی کا رُخ جلدی بدلو، اسی وقت فوراً چارپائی کا رُخ بدلا گیا۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ چارپائی کے غربی جانب کھڑے ہوئے یٰسین شریف پڑھ رہے تھے اور والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زبان پر نہایت سرعت کے ساتھ ضرب کے ساتھ بغیر جہر اسمِ ذات کا ذکر شدت سے جاری تھا، بار بار جیب تالو کو لگتی ہوئی نظر آتی تھی اور ان کی اس ضرب کے ساتھ یہ ناکارہ بھی اسمِ ذات کا ذکر نہایت شدت جہر کے ساتھ بغیر اختیار کر رہا تھا۔ ان کی اللہ کے ساتھ میری اللہ بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی، جو لطف،

لذت اس وقت کے ذکر بالجہر میں آ رہی تھی وہ آج تک کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد وصال ہو گیا۔ حکیم اسحاق و یعقوب صاحب کو اطلاع دی گئی وہ اتنے واپس آئے روح پرواز کر چکی تھی۔ عزیز حکیم محمد ایوب سلمہٗ صبح سے تو یہیں تھے اور والد اور تایا کے ساتھ چند منٹ پہلے واپس گئے تھے، ان ہی کے ساتھ واپس آئے اور دروازے میں آ کر چکر کھا کر بیہوش ہو کر گر گئے والد صاحب کے ساتھ ان کے بھی لینے کے دینے پڑ گئے۔ ان کے بھائی وغیرہ ایک کھٹولے پر لٹا کر ان کو گھر لے گئے، وہاں ہوش میں لانے کی دوائیں استعمال کرائیں اور یہاں بجلی کی طرح سے شہر بھر میں شور مچ گیا۔ ہمارے کچے گھر میں تو اتنی جگہ نہیں تھی جو آ رہے تھے مدرسہ میں جمع ہو رہے تھے کہ اتنے میں تدفین کا مسئلہ معرکۃ الآراء بن گیا، حکیم صاحبان کی رائے تمنا اصرار کے ساتھ یہ تھی کہ ان کے باغ میں ان کے جدی قبرستان کے اندر تدفین عمل میں آئے اور ہمارے محلّہ کے چند احباب جن میں جناب الحاج شیخ حبیب احمد صاحب ولد اکبر جناب الحاج فضل حق صاحب جو اعلیٰ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے خادم خاص اور مظاہر علوم کے محسنِ اعلیٰ تھے ان کا اور ان کے چند دوستوں کا اصرار یہ تھا کہ محلّہ کے قبرستان حاجی شاہ میں تدفین عمل میں آئے گی۔ حکیم صاحبان متین صاحب وقار لوگ تھے اور شیخ حبیب احمد صاحب مع اپنے رفقاء کے لمبی لمبی لاٹھیاں لے کر مکان کے دروازے پر آ گئے کہ تدفین حاجی شاہ میں ہو گی ورنہ لٹھ بازی ہو جائے گی۔ چونکہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب قدس سرہٗ بانی مظاہر علوم کا مزار مبارک بھی وہیں ہے اس لیے ان حضرات کو اصرار کا اور بھی زیادہ موقع تھا، بالآخر وہیں تدفین عمل میں آئی۔ انتقال ۸ بجے ہوا اور ۱۰ بجے تدفین سے فراغ پر میں گھر واپس آ گیا اور تعزیت کرنے والوں کا ہجوم رات دیر تک روز افزوں رہا جیسا کہ حوادث کے ذیل میں والد صاحب کے حادثہ میں ذکر کر چکا ہوں، جس وقت بھائی شمیم مکی کا یہ خط پڑھا جا رہا تھا اور میں یہ سطور لکھوا رہا تھا میرے مخلص دوست الحاج مفتی محمود حسن گنگوہی مفتی دار العلوم دیو بند بھی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے دو واقعات اپنے سنے ہوئے بیان کیے جن کو میں نے انہی کے الفاظ میں یہاں لکھوا دیا ہے۔

(الف)...... مفتی صاحب نے کہا کہ مجھ سے حضرت صاحبزادی صاحبہ یعنی اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی صاحبزادی جناب الحاج چچا محمد یعقوب صاحب کی والدہ محترمہ نے خود سنایا کہ ایک دن مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے گھر کی ضروریات کا سامان منگایا۔ گھر میں سے دریافت کیا کہ خلاف عادت یہ سامان کیوں منگایا۔ کیا سفر میں جانے کا ارادہ ہے؟ پھر وضو کرتے ہوئے ایک آواز آئی کہ مولانا آ رہے ہیں۔ (حضرت مولانا سہارنپوری کا تار عدن سے آ چکا تھا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچ رہا ہوں) اس پر مولانا یحییٰ صاحب نے فرمایا کہ پھر ہم بھی جا رہے ہیں۔

اہلیہ نے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں، جواب دیا جہاں سے مولانا آ رہے ہیں (یعنی حجاز مقدس) گھر میں سے کہا کہ میں بھی چلوں گی، جواب دیا کہ تم میرے ساتھ نہیں جا سکتی تم کو زکریا پہنچائے گا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو تنہا کیسے جانے دوں گی۔ فرمایا کہ میں تو کندھے پر لنگی ڈالی لاٹھی ساتھ میں لے کر چل دوں گا اسی روز شام کو طبیعت خراب ہوئی اور اگلے روز صبح کو انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ فقط

اززکریا

حضرت قدس سرہٗ کے عدن کے تار پر شہر اور مدرسہ میں خوشی کی جولہریں دوڑ رہی تھیں وہ تو ظاہر ہے۔ بہت سے تو بمبئی جانے کا ارادہ کر رہے تھے اور دہلی کا ارادہ کرنے والے تو بہت تھے۔ حاجی حبیب احمد صاحب جن کا اوپر دفن کے سلسلہ میں ذکر آ چکا ہے میرے والد صاحب کے بے تکلف دوستوں میں تھے اور مرحوم کی مجھ پر بھی بعد میں بہت شفقتیں رہیں۔ صبح کی چائے عموماً میرے ساتھ پیا کرتے تھے ان کے ایک صاحبزادہ نے ایک دفعہ کہا کہ بہت بری بات ہے کہ آپ ہمیشہ صبح کی چائے میں وہاں پہنچ جاتے ہیں ہمیں بہت غیرت آتی ہے کہنے لگے جا بیوقوف وہ تو میرے لیے تم بیٹوں سے بھی زیادہ بڑھ کر ہے مرحوم نے میرے حضرت کے تار کے آنے پر میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے پوچھا اجی مولانا آپ کہاں تک جائیں گے بمبئی یا دہلی، والد صاحب نے فرمایا میں تو اسٹیشن تک بھی نہیں جانے کا، اپنی جگہ پڑا پڑا ہی زیارت کرلوں گا، اس وقت تو لوگ اس کو مذاق کا فقرہ سمجھے کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی مزاح کی عادت بہت تھی، لیکن شنبہ کی صبح کو میرے والد صاحب کا وصال ہوا اور شنبہ کی دوپہر کو حضرت قدس سرہٗ کا جہاز بمبئی پہنچا اور والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حاجی شاہ قبرستان میں پڑے پڑے ہی زیارت کی ہوگی۔

(ب)...... دوسرا واقعہ مفتی محمود صاحب نے یہ لکھوایا کہ پیر جی جعفر صاحب ساڈھوڑی (اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے مشہور خادم تذکرۃ الرشید میں بھی جن کا بار بار ذکر آیا ہے) نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے (یعنی پیر جی ظفر نے) سہارنپور مولانا یحییٰ صاحب کی ملاقات کے لیے آنے کا ارادہ کیا۔ انبالہ میں ایک مجذوبہ عورت انگریزی ٹوپ اوڑھتی اور ہاتھ میں بید رکھتی تھی اور سب صیغے مذکر کے اپنے لیے بولا کرتی تھی، لوگ اس کو خان صاحب کہا کرتے تھے میں (پیر جی جعفر صاحب) اس کی طرف سے گزرا تو اس نے کہا کہ سہارنپور جا رہا ہے۔ مولوی صاحب (مولانا یحییٰ صاحب) سے یوں کہنا کہ:

ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر گر دربار میں آئے

میں سہارنپور آ گیا۔ مولانا سے یہ مصرع بیان کیا کہ یہ اس مجذوبہ نے کہا ہے، اس پر مولانا کے

چہرہ کا رنگ زرد ہوگیا۔ میں سہارنپور سے جب انبالہ واپس ہو رہا تھا کہ مولانا کا انتقال ہوگیا۔ میں نے غور کیا تو دوسرا مصرع ذہن میں آیا وہ یہ تھا:

عدم کے جانے والو کوچۂ جاناں میں جب پہنچو
ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر گر دربار میں آئے

(۴)......عزیزم الحاج شمیم مکی نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا کہ میری ایک خصوصی درخواست یہ ہے کہ اگر آپ قبول فرمائیں کہ آپ بیتی کے اختتام پر ایک نقشہ بالتفصیل یا تذکرہ اپنے خاندان کے تمام افراد بزرگوں، اعزہ، مستورات اور احباب ومتعلقین وبچگان کی پیدائش ووفات کی تواریخ اور مقام دفن وغیرہ جو آپ کے علم میں ہوں یا تاریخ کبیر میں درج ہو یا احباب سے لکھ کر معلوم کرلیا جائے حسب سہولت اور میرے خیال میں اس کی ابتداء حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہو۔ الحمدللہ آپ کے ہاں تو اکثر مواد موجود ہے، تمام اعزہ کے نام تین چار صفحات پر مع تواریخ آجائیں گے۔ اسی کے ساتھ ایک خانہ میں یہ بھی آجائے کہ کس کی شادی کس سے ہوئی ہے۔ بہر حال اس کی ترتیب تو آپ ہی زیادہ عمدگی سے فرماسکتے ہیں۔ خاندان پر آپ کا یہ بڑا احسان ہوگا۔ خاندان واحباب ومتعلقین کو آپ ذکر بدوام بخشیں گے۔

فقط

اس کا جواب میں نے بھائی شمیم کو لکھوادیا کہ نسب نامہ تو میری تارخ کبیر میں حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی بارہویں پشت جناب شیخ قطب شاہ نوراللہ مرقدہٗ سے موجود ہے اور بارہویں پشت میں حضرت مفتی صاحب آتے ہیں۔ ان کے اُوپر کے انساب اور ان کے اجزاء بھی درج ہیں اور مفتی صاحب سے لے کر عزیز سلمان، عاقل سلمہما کی اولاد تک بھی درج ہیں، لیکن یہ کام ایسا نہیں ہے کہ آپ بیتی کا جزء بن سکے یا دو چار صفحوں میں آسکے۔ چھ صفحے میری تاریخ کبیر کے اس کی تقطیع ہدایہ کے برابر ہے بھرے ہوئے ہیں۔ کبھی ہندوستان آؤ تو زیارت کرلینا۔ نقل تمہارے بس کی بھی نہیں، بھائی شمیم! جب میں زندہ تھا تو بہت کچھ کرڈالا۔ علی میاں زادمجدہم تو اپنی تالیف میں میری تاریخ کبیر سے بہت کچھ نقل کراتے ہیں۔ ان کا کئی دفعہ یہ بھی خیال ہوا کہ ان کے پاس کوئی مشین ہے جس میں ہر تحریر کا فوٹو آجاتا ہے۔ میری اس تاریخ کبیر کا فوٹو لیا جائے۔ بہرحال تمہاری اس فرمائش کا مواد تو میرے یہاں بہت کچھ ہے مگر اس کی تعمیل سے معذوری ہے۔ میرے بچوں میں تو کوئی اس قابل نہیں کہ اس کی تکمیل یا طباعت کراسکے۔ اللہ جل شانہٗ خاندان میں سے کسی کو توفیق عطاء فرمائے تو نقل دینے میں مجھے بھی انکار نہیں۔

(۵)......بھائی شمیم نے لکھا کہ آپ بیتی نمبر ۱۔۲۔۳ پڑھنے کے بعد بہت سی چیزیں ذہن میں

آرہی ہیں۔ مگر بے ادبی اور دخل در معقولات کے خیال سے لکھنے کی ہمت نہیں ہورہی۔ فقط

الجواب:

نہ تو اس میں بے ادبی ہے نہ دخل در معقولات۔ تمہارے ذہن میں بہت سی باتیں آرہی ہیں اور میری ستر سالہ عمر میں تو لاکھوں واقعات ہیں۔ لیکن مستقل وقت تو اس معذوری میں بھی اگر خرچ کیا جا سکتا ہے تو حدیث پاک کی خدمت میں ہوسکتا ہے، تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ آپ بیتی حصہ اول تو صرف عزیزم مولانا یوسف صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی سوانح مؤلفہ عزیزم الحاج مولوی محمد ثانی کے ایک باب پر استدراک تھا اور بقیہ چار حصہ آنکھ بنوانے کے زمانے کی اوقات گزاری تھی۔ اگر دوسری آنکھ بنوانے کی نوبت آئی، جس میں کئی سال سے نزول ماء بھی ہے اور احباب کا تقاضہ بھی ہے تو ممکن ہے کہ اس میں کوئی اضافہ ہوسکے۔ البتہ مطبوعہ میں کوئی چیز قابل اصلاح ہو تو ضرور درج کردیں، اس کو دوبارہ سن لوں گا لیکن جدید واقعات کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ واقعات تو لاکھوں ہیں اور آپ بیتی نمبر۴ کی کتابت ہوچکی ہے زیر طباعت ہے۔ یہ اضافے بھی جو تم نے لکھوائے ضمیمہ کے طور پر ۵ کے ختم پر لکھوانے کو کہہ دیا اس لیے کہ ۵ کی بھی کتابت قریب الختم ہے۔

(۶)...... بھائی شمیم نے لکھا کہ آپ بیتی کے سبق آموز عبرت انگیز اور بے حد دلچسپ اور دینی اور دنیوی اعتبار سے مفید حالات و واقعات کو بار بار پڑھتے رہنے کو دل چاہتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عرض ہے کہ مجھے کاندھلہ میں آپ کے والد مرحوم کے متعلق ایک عجیب قصہ سننے میں آیا تھا کہ کاندھلہ میں بڑا زبردست ہیضہ یا طاعون پھیلا اور اس شدت کے ساتھ کہ گھروں اور راستوں سے مُردے اُٹھانے والا تک نہیں رہا تھا اور برسات کا زمانہ تھا۔ جبکہ امرود کی خوب ریل پیل بھی تھی۔ برسات میں ویسے بھی سنا ہے امرود سخت مضر اور ہیضہ و بدہضمی کا گھر ہے کوئی شخص مُردہ کو ہاتھ لگانے کا روادار نہیں تھا۔ ایسے سخت حالات میں آپ کے والد صاحب اور ان کے ساتھ ایک صاحب اور تھے جن کو اللہ نے مسخر کردیا تھا۔ یہ دونوں قصبہ کے اموات کو نہلاتے، نماز پڑھتے اور خود ہی قبریں کھود کر دفن کرتے، سارے دن یہی معمول تھا۔ بھائی تک بھائی کی نعش کے پاس جانے کا روادار نہیں تھا۔ مگر حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ نے ایسی ہمت عطاء دی تھی کہ سینکڑوں مسلمان اموات عزت و احترام کے ساتھ ان کے ہاتھ سنگوائی گئیں اور اس قصہ میں سب سے دلچسپ پہلو اور قدرت الٰہی کا مشاہدہ یہ تھا کہ یہ دونوں حضرات سارے دن امرود کھاتے تھے، جس کے متعلق یہ یقین تھا کہ جس نے امرود کھایا اس کو ہیضہ ہوا۔ یہ بھی سنا ہے کہ یہ دونوں حضرات جنازہ لے جارہے ہیں جیبوں میں امرود پڑے ہوئے ہیں اور واپسی میں امرود کھارہے

ہیں۔ واپسی میں بڑے گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر دوپہر کے کھانے کی بجائے امرود کھاتے رہتے اور پھر قصبہ میں اموات کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ جس گھر میں رونا پیٹنا سنا وہاں جا کر تسلی تشفی کی احادیث سنائیں، عمل صالح کی تلقین کی اور خود تجہیز و تکفین کے انتظام میں لگ گئے۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس کو ضرور آپ بیتی میں شامل فرمادیں اور ایسے نہ معلوم کتنے واقعات ہوں گے۔ شیخ ابا جی! گزارش ہے کہ آپ بیتی کو آپ ہرگز مختصر نہ فرمائیں۔ ''نحن نقص علیک احسن القصص'' اللہ تک نے فرمایا ہے، پھر آپ کی نیت تو عبرت اور اصلاح کی ہے۔ ان واقعات سے لوگوں کے قلوب نرم ہوں گے۔ فقط

الجواب:

بھائی شمیم یہ واقعہ مختصر تو میرا سنا ہوا ہے، اس تفصیل سے نہیں جو تم نے بیان کیا۔ اموات کی کثرت میرے والد صاحب کا ہرمیت کی تجہیز و تکفین کرنا اور کھانے کی جگہ امرود کھانا لیکن نہ تو متصل سند سے سنا اور نہ میرے زمانہ ہوش کا قصہ ہے۔ میری تو شاید پیدائش سے پہلے کا قصہ ہے، اس لیے تمہارے خط کی عبارت نقل کرادی ہے اور اجمالی تصدیق اپنی بھی۔ مگر تفصیلات مجھے یاد نہیں۔ البتہ اس نوع کے واقعے میرے والد صاحب کی زندگی کے بہت ہیں تم نے لکھا کہ آپ بیتی کو مختصر نہ کرنا، میرے پیارے یہ کوئی مقصود چیز نہیں۔ علم حدیث کو چھوڑ کر اس میں لگنا کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔

(۷)...... بھائی شمیم نے یہ بھی لکھا حضرت قبلہ مولانا یحییٰ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق مجھ سے بھائی افتخار صاحب نے سنایا تھا کہ حدیث پر ان کو اس قدر عبور تھا اور ہزار ہا احادیث ان کو اس طرح ازبر تھیں کہ جمعہ کی نماز وہ گنگوہ کی مسجد میں پڑھایا کرتے تھے اور اس سے قبل حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس غسل کر کے جب مسجد کے لیے روانہ ہوتے تو راستہ میں زبانی بغیر لکھے ہی احادیث سے اپنے ذہن میں خطبہ تیار کر لیتے۔ برسوں یہی معمول رہا۔ آپ بیتی کے مطالعہ سے ان کا حدیث سے تعلق اور تعمق کا تو بخوبی علم ہو جاتا ہے اگر اس قسم کے واقعات آپ کے علم میں ہوں تو ضرور اضافہ فرمادیں۔ فقط

الجواب:

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے میں میرے والد صاحب کو حضرت کی حیات میں ایک آدھ دفعہ امامت کی نوبت آئی ہوگی۔ اس لیے کہ حضرت قدس سرہٗ خود ہی امامت فرمادیا کرتے تھے، البتہ حضرت قدس سرہٗ کی بیماری کے زمانے میں کبھی پڑھانے کی نوبت آئی اور جس جمعہ کو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا وصال ہوا وہ جمعہ بھی سب اکابر کی موجودگی میں میرے والد صاحب

نے ہی پڑھایا تھا۔ مفتی محمود صاحب نے جو اس وقت میرے پاس اس واقعہ کی تسوید کے وقت موجود ہیں یہ واقعہ سنایا۔ جس سے بھائی شمیم کے واقعہ کی تائید ہوتی ہے کہ یہ واقعہ خانقاہ شریف کی مسجد کا نہیں بلکہ گنگوہ کی جامع مسجد کا ہے کہ اس کی ابتدائی تعمیر کے زمانے میں حضرت اقدس گنگوہی قدس سرہٗ کو اس کی تعمیر کا بہت اہتمام تھا۔ اس لیے کہ غیر مسلم علاقہ تھا اور جامع مسجد کی جگہ وہاں پر ایک ٹیلہ تھا اس میں سے ایک پتھر نکلا تھا جس پر جامع مسجد لکھا ہوا تھا، اس لیے اس جگہ پر جامع مسجد بنوانا حضرت نے تجویز فرمایا اور ابتداء تعمیر کے بعد مولانا یحییٰ صاحب ہر جمعہ کو وہاں جمعہ پڑھانے جایا کرتے تھے اور ہر جمعہ کو نماز کے بعد اور نماز سے پہلے جامع مسجد کے لیے چندہ کی تحریک فرمایا کرتے تھے اور ہر اعلان کی ابتداء میں اپنی طرف سے پانچ روپے کا چندہ دیا کرتے تھے۔ جس کے لیے نہ معلوم کہاں سے بہت ہی سفید چاندی کے روپے نئے نئے لایا کرتے تھے۔ فقط

غالبًا صوفی افتخار نے جس خطبہ کا واقعہ ذکر کیا وہ اس جامع مسجد کے راستہ کا ہوگا کہ یہ خانقاہ شریف سے بہت دور ہے۔ خانقاہ کی مسجد تو حضرت کے حجرے کے برابر ہی ہے۔ اپنے ہی آپ سے خطبہ تصنیف کر کے پڑھا دینا ان کے یہاں کوئی اہم چیز نہیں تھی۔ سہارنپور کے زمانہ تدریس میں وصال تک حدیث کی بہت سی کتابیں بالخصوص جس زمانہ میں نزول آب ہو گیا تھا، بغیر دیکھے ہی حفظ پڑھانے کی نوبت آتی تھی اور جس زمانہ میں آنکھ کا آپریشن ہوا اس زمانہ میں بھی تقریباً چھ (۶) ماہ تک بغیر کتاب دیکھے بغیر مطالعہ کے سبق پڑھانے کی نوبت آئی۔ عزیز مولوی عاقل سلمہٗ، مولانا صدیق احمد صاحب جمودی مرحوم سابق مدرس مظاہر علوم کے حوالہ سے واقعہ نقل کیا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب کی آنکھیں جس زمانے میں بنی ہوئی تھیں اور آنکھ پر سبز پٹی بندھی ہوئی تھی تو حدیث کا سبق پڑھاتے وقت ایک گاؤں کا آدمی آیا۔ سلام کیا اور کہا کہ رائے پور اعلیٰ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب کی خدمت میں جا رہا ہوں، اس پر مولانا یحییٰ صاحب نے فرمایا کہ حضرت سے کہنا کہ مظاہر علوم کے ایک اندھے مدرس نے سلام کہا ہے۔

(۸)...... از مکتوب بھائی شمیم سلمہٗ آپ بیتی میں حج اور سفر حرمین کے متعلق ہے۔ اس میں گزارش ہے کہ آپ نے ۸۳ھ میں جو بخاری شریف اور اس کے بعد کے حج میں نسائی شریف مدرسہ میں ختم کرائی تھی اور گزشتہ سفر میں بابرکت دیوان میں صبح کو عزیزان زعیم و حشیم کی جلالین شروع کرا کر دعاء فرمائی تھی اور اس سفر میں بروز بدھ ۵ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کو بعد نماز ظہر آپ نے اسی دن دیوان میں ان کی مشکوٰۃ شریف شروع کرائی تھی اور بھائی انعام صاحب نے دعاء کرائی تھی اور آپ نے اپنے پاس سے گاجر کا حلوہ تقسیم کیا تھا، منجملہ اور باتوں کے اگر ان چاروں کا بھی آپ اضافہ فرما دیں تو عین کرم ہوگا۔ فقط

الجواب:

بھائی شمیم! تمہاری محبت اور تمہارے احسانات کی وجہ سے میں نے تمہارے خط کے یہ سب اجزاء ضمیمہ میں نقل کرا دیے ہیں، لیکن اس نوع کے واقعات تو آپ بیتی کا مقصد نہیں، اگر اس نوع کا واقعہ کہیں آ گیا تو مجھے یاد نہیں، کسی اور سلسلہ میں تبعاً آ گیا ہوگا۔ ورنہ کتب احادیث کا افتتاح بخاری شریف کا افتتاح و اختتام تو نہ معلوم کتنے مدارس کا ہوا ہوگا۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ عزیزان مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن صاحب سلمہٗ کی مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کئی ماہ تک مؤخر کی کہ مجھے اتفاقیہ حاضری میں دیر ہوتی رہی اور پھر اپنی موجودگی میں باوجود میرے شدید انکار کے خود پاس بیٹھ کر مجھ سے کرائی اور ترمذی شریف کی بسم اللہ قبل از وقت یہ کہہ کر اس سیہ کار سے کرائی کہ تمہارے دوبارہ آنے کا انتظار نہ کرنا پڑے ترمذی شریف کی بسم اللہ کراتے جاؤ۔ عزیزان کو صرف ابوداؤد پڑھنے کے لیے ایک سال کے لیے سہارنپور بھیجا، جس میں انہوں نے ابو داؤد کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابیں بھی دوسرے اکابر حدیث سے پڑھیں یا سُنیں۔ یہ واقعات تو بہت **لا تعد ولا تحصیٰ** ہیں مگر آپ بیتی کی لائن اس کی نہیں، تمہارے جملہ خطوط کا جواب ہو گیا۔ آیندہ اس نوع کے واقعے یا کسی نوع کے اضافے کی تو گنجائش نہیں البتہ چونکہ آپ بیتی علی گڑھ میں معذوری کی حالت میں لکھوائی گئی ہے اس لیے کسی واقعہ کی اصلاح کی ضرورت ہو تو فوراً لکھ دیں کہ نمبر ۵ کی طباعت ابھی باقی ہے۔ باقی اضافے تو ستر سالہ زندگی میں ہر نوع کے لاکھوں ذہن میں ہیں۔

(۹) ...... یہ کتاب طبع ہو ہی رہی تھی کہ بعض ضروری باتیں خیال میں آتی رہیں اور اپنی عادت کے مطابق دوستوں سے اکابر کے قصے اور اکابر کی یادگاریں تذکرہ کرنے کا معمول ہی ہے۔ جس بات کے متعلق دوستوں نے اصرار کیا کہ یہ واقعہ ضرور آپ بیتی میں آنا ہے، میں نے کہہ دیا کہ نقل کر دو۔ اسی سلسلہ میں میں نے ایک واقعہ سنایا دوستوں کا اصرار تھا کہ یہ تو بہت اہم ہے ضرور لکھوا دیں۔ میں نے کہا طبع ہونے تک جو چاہے لکھوا لو، جب طباعت ہو جائے گی تو سلسلہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔

فتویٰ پر بغیر تحقیق دستخط نہ کرنا:

وہ واقعہ یہ ہے۔ ۳۵ھ میں ابتدائی مدرسی میں مدرسہ کے دستور کے مطابق جو فتاویٰ آتے اس پر دیگر مدرسین کی طرح یہ ناکارہ بھی سرسری دیکھ کر اکابر کے دستخطوں پر اعتماد کرتے ہوئے دستخط کر دیا کرتا تھا، ایک فتویٰ اکابر مدرسین میں سے ایک بزرگ کا لکھا ہوا تھا۔ ان کے لکھنے پر اعتماد اور

سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد دیگر مدرسین کی طرح اس پر میں نے بھی دستخط کر دیے۔ یہ فتاویٰ ابتداء میں یا دیگر مدرسین کے دستخط کے بعد میرے بعد میرے حضرت میرے مرشد حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پیش کیے جایا کرتے تھے اور حضرت قدس سرہٗ کے دستخط بغیر باہر نہیں جایا کرتے تھے۔ یہ فتویٰ جب حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش ہوا تو حضرت نے فتویٰ پر یہ لکھ کر اس میں یہ غلطی ہے دوبارہ درست کرو۔ اس کو واپس کر دیا اور کسی مدرس سے بھی مطالبہ نہیں کیا۔ لیکن ازراہِ شفقت اللہ جل شانہ میرے جملہ اکابر کو ان کی شفقتوں کا بہت ہی بہتر سے بہتر بدلہ عطاء فرمائے، مجھ سے دریافت کی کہ اس فتویٰ پر پڑھ کر دستخط کیے یا بغیر پڑھے ہی دستخط کر دیے، میں نے کہا کہ سرسری دیکھا تھا مگر فلاں حضرت کا لکھا ہوا تھا اور سب مدرسین کے دستخط ہونے کی وجہ سے زیادہ غور کی ضرورت نہ سمجھی۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ نے ایک ڈانٹ پلائی کہ دستخط فتوؤں کی تصدیق اور اس کی شہادت ہے۔ بغیر تحقیق کے کیوں دستخط کیے۔ وہ ڈانٹ مجھ پر ایسی مؤثر ہوئی کہ اس کے بعد کسی ایسے مسئلہ کے علاوہ جو بندہ کے خیال میں بالکل کھلا ہوا نہ ہو اور اس پر اس ناکارہ کے دستخط کی خاص وجہ بھی نہ ہو دستخط بھی نہیں کرتا بلکہ اس ناکارہ کے نام جو فتاویٰ ڈاک سے آتے ہیں وہ بھی جواب کے کاغذ پر یہ لکھوا کر ''یہ ناکارہ مفتی نہیں ہے اس لیے فتاویٰ ہمیشہ مفتی مدرسہ سے دریافت کرنا چاہئیں۔ آپ کا خط مع جوابی لفافہ کے مفتی صاحب کے حوالہ کر رہا ہوں، دارالافتاء میں بھیج دیتا ہوں۔''

(۱۰)......اس ناکارہ کے دفتر میں میرے اکابر حضرت اقدس گنگوہی سے لے کر جملہ اکابر کے سینکڑوں خطوط محفوظ ہیں۔

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

خطوط کا انبار تو اتنا ہے کہ اگر ان کو شائع کیا جائے تو کئی ہزار صفحات چاہئیں، مگر میرے بچے آج کل میرے اکابر کے خطوط پر بہت مسلط ہیں، جب میری آنکھیں کام دیتی رہیں میں نے اس خزانے کی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی، مگر اپنی معذوری کی بدولت اور اس وجہ سے کہ میں تو لبِ گور ہوں اور یہ میرے بچے اللہ ان کو بہت ہی خوش رکھے ہر نوع کی ترقیات سے نوازے، کوئی خط لا کر پھر اصرار کریں کہ اس کو ضرور لکھوا دیں تو باوجودیکہ بعض خطوط کے متعلق میرا جی نہیں چاہتا کہ معلوم نہیں عوام کی عقول ان کی متحمل بھی ہوگی یا نہیں، مگر میرے دوست مدرسین مظاہر علوم خاص طور سے مفتی محمود صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند جب اس کو ضروری مفید اور غیر مضر بتاتے ہیں تو میں اجازت دے دیتا ہوں کہ لکھوا دو۔

صرات کے ترکِ طعام کی ابتداء:

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصول وضوابط اور جواب طلبی سے ابھی تک بہت سے احباب واقف ہیں۔ بہت سوں پر یہ گزری ہوگی اور بہت سوں نے سنا ہوگا۔ غالباً میں لکھوا چکا ہوں کہ حضرت قدس سرہٗ کو بہت ہی ضرورت سے زیادہ میرے والد صاحب کی وجہ سے مجھ پر شفقت تھی۔ چنانچہ حضرت قدس سرہٗ نے زبانی بھی اور تحریری بھی مجھ سے کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ تُو میرے یہاں قواعد سے مستثنیٰ ہے لیکن اس کے باوجود یہ ناکارہ حضرت کے قواعد کا بہت اہتمام کرتا تھا۔ اگر بے وقت گاڑی کے پہنچنے کا اندازہ ہوتو بغیر بھوک بھی اپنے گھر سے کچھ کھا کر جاتا تھا اور حضرت بعض مرتبہ استفسار بھی فرماتے کہ کھانے کا ابھی وقت بھی نہیں ہوا تھا آپ نے کیوں کھالیا، تو عرض کرتا کہ حضرت رات کھانے کی نوبت نہیں آتی تھی، اس لیے چائے کے ساتھ تھوڑی سی کھالی اور یہ جھوٹ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس ناکارہ کا معمول اپنی ابتدائی مدرسی یعنی ۳۵ھ سے ایک وقت کھانے کا ہوگیا تھا۔ جس کی ابتداء تو حرج سے ہوئی تھی کہ رات کے کھانے میں مطالعہ کا بھی حرج ہوتا تھا، نیند بھی جلدی آتی تھی، پانی بھی زیادہ پیا جاتا تھا، ابتداء میری ایک چھوٹی بہن مرحومہ (معلوم نہیں واقعہ کہیں لکھوا چکا ہوں یا نہیں) کھانا لے کر اُوپر میری کوٹھڑی میں پہنچ جاتی اور لقمہ بنا کر میرے منہ میں دیتی رہتی اور دیکھتی رہتی کہ جب منہ چلنا بند ہوجاتا تو دوسرا لقمہ دے دیا کرتی تھی، اس ناکارہ کو التفات بھی نہ ہوتا تھا کہ کیا کھلایا۔ ایک یا دو سال بعد اس کو بھی بند کردیا، اس زمانے میں بھوک تو خوب لگتی تھی مگر حرج کا اثر بھوک پر غالب تھا، چند سال بعد بھوک تو جاتی رہی، لیکن میرے اکابر حضرت مدنی، حضرت رائے پوری ثانی اور چچا جان نوراللہ مراقدہم میں سے کسی کی آمد ہوتی تو بڑے شوق اور رغبت سے ان کے ساتھ کھانے میں شرکت کرتا، لیکن ان حضرات قدس اللہ اسرارہم کے انتقال کے بعد تو بھوک ایسی گئی کہ اگر دوسرے وقت کھاتا ہوں تو پیٹ میں گرانی ہوتی ہے۔ اب تو صرف ایک ہی وقت کھانے کا معمول بن گیا۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ ہندوستان کے قیام میں وہ ایک وقت دن کا ہوتا ہے اور حجاز مقدس کے قیام میں وہ ایک وقت شام کا ہوتا ہے کہ مشاغل کے اعتبار سے دونوں جگہ کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔

لکھوا تو یہ رہا تھا کہ حضرت تھانوی سے مجھے اس بات کے کہنے میں کہ رات نہیں کھائی تھی اس لیے صبح کھالی تھی، کوئی جھجک نہیں محسوس ہوتی تھی۔ یہ بھی غالباً پہلے لکھوا چکا ہوں کہ میرے چچا جان نوراللہ مرقدہٗ کا یہ معمول تھا کہ وہ جب بھی سہارنپور تشریف لاتے اور وقت میں ذرا بھی گنجائش ہوتی تو وہ اس ناکارہ کو ساتھ لے کر تھانہ بھون یا دیوبند یا گنگوہ یا رائے پور ضرور تشریف لے جایا

کرتے ہر سفر میں چاروں جگہ میں سے کسی ایک یا دو جگہ جانے کا خاص معمول تھا۔ ایک مرتبہ تشریف آوری پر چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ تھانہ بھون حاضری کو زیادہ دن ہو گئے، صبح کو تھانہ بھون چلنا ہے۔ میں نے عرض کیا بہت اچھا اور اپنے معمول کے مطابق خود بھی ایک آدھ لقمہ کھایا، اس لیے کہ صبح کی چائے میں ناشتہ کی اس ناکارہ کو کبھی بچپن سے عادت نہیں۔ مفت کے ایک دو بیضے مل جائیں تو اس سے انکار نہیں لیکن مول کے وہ بھی پسند نہیں۔

بہر حال اس ناکارہ نے بھی بلا رغبت ایک دو لقمے کھائے اور چچا جان کو بھی کھلائے اور حسبِ دستور تھانہ بھون حاضری پر حضرت کے استفسار پر عرض کر دیا کہ کھالیا۔ حضرت نے فرمایا کیوں؟ میرا وہی جواب۔ حضرت قدس سرہٗ کی مجلس ختم ہونے کے بعد ہمارے ایک عزیز بھائی ظریف صاحب مرحوم کا تقریباً ۱۵، ۲۰ یوم پہلے انتقال ہو چکا تھا، ان کے یہاں تعزیت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور میری بھی رائے تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کے مکان پر تشریف لے جانے کے بعد ہم لوگ ان کے یہاں گئے۔ ان کے لڑکے بھائی اختر مرحوم نے اصرار کیا کہ ہم لوگوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا، آپ بھی شرکت فرمالیں۔ میں نے شدت سے انکار کر دیا کیونکہ ہم حضرت کے یہاں یہ کہہ چکے تھے کہ کھالیا، یہی عذر میں نے بھائی اختر سے بیان کر دیا۔ لیکن چچا جان نے فرمایا کہ حضرت ضرور لاؤ اور مجھ سے فرمایا کہ ایسے موقعہ پر دلداری ضرور کرنی چاہیے۔ میں نے عرض کیا اگر حضرت کے یہاں رپورٹ پہنچ گئی تو جواب طلبی ہو جائے گی کہ میرے یہاں انکار کر دیا اور وہاں کھالیا۔ چچا جان کو اس کا واہمہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے بھائی اختر سے کہا کہ ضرور لاؤ، آنے پر میں نے بھی چند لقمے کھائے۔ میں ڈر رہا تھا کہ نہ معلوم حضرت کے یہاں یہ کس عنوان سے پہنچے گا وہی خطرہ سامنے آیا۔ ایک صاحب نے جن کا نام میں لکھوانا نہیں چاہتا، حضرت قدس سرہٗ کے یہاں یہ شکایت کر دی کہ یہ دونوں تعزیت میں آئے تھے وہیں کھانا کھایا اور ان لوگوں نے حضرت سے یہ جھوٹ بولا کہ حضرت کی خدمت میں آئے ہیں۔

خط و کتابت از حکیم الامت قدس سرہ برائے دفع ابہام گرامی گرانی طبع:

حضرت قدس سرہٗ کا ایک عتاب نامہ بذریعہ ڈاک پہنچا۔ وہ مکتوب مبارک اور اس پر میرا جواب، میرا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اس کو طبع کرایا جائے مگر دوستوں کا اصرار ہے کہ اس میں تنبیہ ہے اور اصلاح ہے، اگر چہ تیرے متعلق شکایت غلط تھی مگر اکابر کے یہاں ان چیزوں میں احتیاط رکھنی چاہیے اور یہ صحیح بھی ہے، مجھے تو اس سے روزانہ ہی سابقہ پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے مقدموں میں آتے ہیں اور شام کو جب واپسی کا وقت نہیں رہتا یا دوسرے دن کی تاریخ ہو جاتی ہے

تو اس قدر بے تکلف اور بلا جھجک آکر کہتے ہیں کہ حضرت کی زیارت کو آئے ہیں صبح کو چائے کے بعد مصافحہ کر کے رخصت ہوتے ہیں اور پھر شام کو جب کاروائی مکمل نہیں ہوتی تو پھر آکر ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت آج مقدمہ کی تاریخ تھی کام ہوا ہی نہیں۔ اس پر مجھے تھانہ بھون بہت یاد آجاتا ہے۔ بہر حال اس سلسلہ کی حضرت قدس سرہٗ کی خط وکتابت بھی ایسے لوگوں کے لیے تنبیہ ضرور ہے جو مشائخ کے یہاں جا کر جھوٹ بولتے ہیں، بھائی ظریف تھانوی کے قصے کے سلسلہ میں حضرت قدس سرہٗ سے جو خط وکتابت ہوئی وہ حسب ذیل ہے:

(مکتوب حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ بنام ناکارہ وچچا جان قدس سرہٗ)

''مکرمانم سلمہٗ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ کل کے واقعہ سے تجربہ ہوا کہ بعض اوقات متحمل الاشتراک حضرات اضیاف سے پوچھنے پر بھی صاف نہیں معلوم ہوتا کہ کس کے مہمان ہیں اور اس معلوم نہ ہونے سے ضروری انتظام میں جو خلل واقع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس لیے آئندہ کے لیے احقر نے یہ معمول مقرر کر لیا کہ جب پوچھنا غیر کافی ہے تو پوچھنا نہ چاہیے، ایسے حضرات بے تکلف خود فرمادیا کریں کہ ہم تیرے یا فلاں شخص کے مہمان ہیں، اس کے بعد خدمت سے عذر نہیں اور اس فرمانے کو میں اپنا فخر سمجھوں گا، ایسے حضرات کو اس معمول کی اطلاع کر دی ہے، اسی سلسلہ میں آپ دونوں حضرات کی خدمت میں بھی بے تکلف عرض کرنے کی جسارت کی۔

والسلام

اشرف علی از تھانہ بھون

(جواب: از زکریا):

''مخدوم ومطاع بندہ ادام اللہ ظلال برکاتکم، بعد ہدیہ سلام نیاز آنکہ۔''

گرامی نامہ نے مفتخر فرمایا، حقیقۃً اس گڑبڑ سے خود اپنے ہی کو کلفت ہوئی تھی مگر اتفاق بے مقصد پیش آیا۔ حضرت تک چونکہ یہ قصہ پہنچ گیا اس لیے تفصیل کی ضرورت پیش آئی ورنہ میں اپنے اکابر تک ایسی معمولی باتیں پیش کرنے کا عادی نہیں۔ میری عادت اول سے یہ ہے کہ بے وقت جب کہیں پہنچنا ہو تو گھر سے خواہ بھوک نہ ہو کچھ کھا کر جاتا ہوں، لیکن اس کے بعد بھی اگر میزبان کی خوشی ہو تو دوبارہ کھانے میں تامل نہیں کرتا۔ چنانچہ تھانہ بھون حاضری میں بھی بسا اوقات یہاں سے کھا لینے کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب کے ارشاد پر مکرران کے ساتھ شرکت کی نوبت آئی۔ میں حسب معمول اس مرتبہ بھی کھا کر گیا تھا، اس لیے بے تکلف عذر کر دیا تھا۔ وہاں پہنچ کر چچا جان سے اس کا تذکرہ آیا، انہوں نے ارشاد فرمایا کہ آج بھائی ظریف کے یہاں کھانا چاہیے کہ انہیں

ملال نہ ہو، میں نے اس کو رسم سمجھ کر عذر کر دیا اور بالآخر مولانا ظفر احمد صاحب پر اس کا فیصلہ ٹھہرا، انہوں نے بھی چچا جان کی تائید فرمائی، لیکن ابتداءً حضرت کے سوال پر چونکہ وہ اپنے خیال کو عرض نہ کر سکے اور میں نے اپنے خیال کو گستاخانہ عرض کر دیا، اس لیے بھی طے شدہ امر ہو گیا۔ مگر وہاں پہنچ کر ان کے گھر والوں کا زیادہ اصرار ہوا اور باوجود ہمارے یہ عرض کر دینے کے کہ مولانا ظفر احمد صاحب کے یہاں طے ہو چکا، ان کی خواہش ہوئی کہ تھوڑی سی شرکت کر لی جائے۔ اس لیے ان کی دلداری کہ مصدومہ تھیں، مقدم سمجھی گئی اور وہاں بھی شرکت کی کہ ان کی دلداری اہم خیال کی گئی۔ اس کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب کے پورا قصہ بھی مع اپنے چچا جان کے اختلاف رائے کے سنا دیا تھا اور اب حضرت سے بھی مفصل عرض کر دیا۔ اس میں جو امر اصلاح کے قابل ہو حضرت ضرور ارشاد فرما دیں، انشاء اللہ اس پر عمل ہوگا۔ نیز حضرت ہی اس کا تصفیہ فرما دیں کہ اس سفر میں وہاں کا کھانا رسم تھا یا نہیں۔ باقی حضرت کا اصول سر آنکھوں پر، میں تو اس سے قبل بھی حضرت کے یہاں بے تکلف مانگ کر کھا چکا ہوں، بے وقت حاضری پر گھر والوں کو تکلیف دینا خلافِ ادب سمجھتا ہوں اور اطلاع کی اس لیے ہمت نہیں ہوتی کہ متعدد مرتبہ باوجود پختہ قصد کے عوارض سے ٹل گیا۔ دوسری جگہ تو بعد میں عذر کا لکھ دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حضرت کے یہاں اس کو بھی دل گوارا نہیں کرتا۔

از چچا جان بعد سلام نیاز مضمون واحد وہ اسی وقت دہلی تشریف لے جا رہے ہیں، اس لیے خود عریضہ لکھنے کا وقت نہیں ملا۔ فقط محتاج، عفو گستاخ

زکریا

(جواب: از حضرت اقدس حکیم الامۃ قدس سرہٗ)

مشفق مکرم دام فیضہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

آپ کے کریمانہ جواب سے جس قدر مسرور و مطمئن ہوا اس سے زیادہ خجل ہوں، بارک اللہ تعالیٰ فی مکارمکم اگر میرے نیاز نامہ میں دوبارہ نظر غائر فرما لی جائے تو واضح ہوگا کہ مجھ پر کھانے کے اختلال نظام سے اثر نہیں ہوا، اس کا تعلق مولوی ظفر احمد صاحب سے ہے اور تعلقات کے تفاوت سے احکام متفاوت ہو جاتے ہیں۔ میں زیادہ اس سے متاثر ہوا کہ جو امر بعد میں معلوم ہوا کہ آپ میاں ظریف والوں کے مہمان تھے وہ میرے استفسار پر ظاہر نہیں فرمایا گیا، اس کو ظاہر نہ کرنے کی کوئی مصلحت سمجھ میں نہیں آئی اور اس ظاہر نہ کرنے میں ظاہر ہے کہ مصالح مختل ہو جاتے ہیں۔ کم سے کم تشویش اس کا اثر لازمی ہے، نیز تعلق خصوصیت اس سے بالکل آبی ہے، مقصود اس توضیح سے اپنے کلام کی تفسیر ہے نہ کوئی شکوہ، وہ تو ختم ہو چکا اور اس کے ختم کے ساتھ اس عزم جدید

کو بھی ختم کرتا ہوں یعنی اب خود بھی پوچھ لیا کروں گا۔

میری اس جسارت سے جس کا نام میں نے صفائی رکھا ہے طبع لطیف پر جو اثر ہوا ہو اس کی معافی چاہتا ہوں اور رسم ہونے نہ ہونے کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے بفضلہٖ تعالیٰ اس کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ باقی میرا معمول اب تک جب تعزیت کے لیے سفر کرتا تھا کھالینا تھا۔ اگر اس کے خلاف تحقیق ہو تو آئندہ احتیاط رکھوں گا۔ فقط والسلام

اشرف علی

(جواب: از زکریا عفی عنہٗ)

''مخدومی ومخدوم العالم ادام اللہ ظلال برکاتکم، بعد ہدیہ سلام نیاز آنکہ''۔

گرامی نامہ اقدس عین انتظار وتشویش میں پہنچا، حضرت کی گرانی کی بڑی فکر تھی، الحمد للہ کہ بے حد مسرت واطمینان بخش ہوا۔ مگر چونکہ اس میں ایک لفظ تھا جو کسی درجہ تاثر کو مشعر ہے اور میں اپنی طرف سے حضرت کے قلبِ مبارک پر ذرا سا بھی تاثر نہیں چاہتا۔ اس لیے مکرر عریضہ کی جرأت کرتا ہوں، میرے والد صاحب کی بڑی تربیت وتنبیہ تھی کہ بزرگوں کے قلب میں کسی قسم کا میل نہ ہو اور اللہ کا انعام ہے کہ اس کے بہت سے فوائد مجھے محسوس بھی ہوئے اور حدیث ''من عادی لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب'' سے مستانس بھی ہے۔ اس لیے ایک مرتبہ اور حضرت کی خدمت اقدس میں درخواست کرتا ہوں کہ جو تأثر الفاظ ذیل سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی حضرت زائل فرمادیں۔ حضرت کا ارشاد ہے کہ ''میں زیادہ اس سے متاثر ہوا کہ جو امر بعد میں معلوم ہوا کہ آپ میاں ظریف والوں کے مہمان تھے۔'' الخ

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ وہ اپنے خیال میں اصل نہ تھا بلکہ تبعاً تھا اس لیے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی۔ درحقیقت حاضری کی اصل یہ تھی کہ چچا جان کی جب بھی دہلی سے کسی ضرورت سے تشریف آوری ہوتی ہے۔ ان کی تمنا واصرار تین جگہ حاضری کی ہوتی ہے۔ گنگوہ، تھانہ بھون اور رائے پور مولانا عبدالقادر صاحب سے ملنے کے لیے۔ مگر ان تینوں جگہ کے لیے میری ہمرکابی شرط ہوتی ہے، مجھے مدرسہ کی اور اپنی ضروریات کی وجہ سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ تینوں جگہ حاضر ہوسکوں اس لیے ان تینوں جگہ میں سے کبھی صرف کوئی سی ایک کی نوبت آتی ہے اور کبھی دو کی، چنانچہ اس مرتبہ گنگوہ حاضری نہ ہوسکی، البتہ تھانہ بھون اور رائے پور کی حاضری ہوگئی۔

ان کا ارشاد حادثہ کے معلوم ہونے سے پہلے مجھ سے ہوچکا تھا کہ تھانہ بھون حاضری کو زیادہ دن ہوگئے رائے پور سے واپسی پر وہاں بھی چلنا۔ مگر میں ہفتہ کا درمیان ہونے کی وجہ سے متامل تھا۔ لیکن جب یہ دوسرا محرک پیدا ہوگیا تو حاضری کا قصد پختہ کرلیا۔ بالجملہ حضرت کے قلب مبارک

میں جتنا خفیف بھی اثر ہے اس کے ازالہ کا متمنی و مستدعی ہوں کہ اکابر کی گرانی کو میں اسباب ہلاکت سمجھتا ہوں۔فقط

محتاج کرم زکریا سہارنپور

(جواب: از حضرت اقدس قدس سرہٗ)

''مکرمی السلام علیکم ورحمتہ اللہ''

مجھ کو وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ ان الفاظ کی دلالت بقائے تأثر پر ہوسکتی ہے۔نہ میرا قصد تھا اور نہ اب تاثر باقی ہے بہرحال اب تو الٹا میں ہی شرمندہ ہوں کہ میں نے لکھا ہی کیوں تھا۔مگر ہمیشہ سے یہی عادت رہی اور پختہ ہوگئی کہ دوستوں سے معاملہ صاف رہے، اب کچھ اثر باقی نہیں بالکل مطمئن رہئے اور مجھ کو اپنا مخلص سمجھئے۔اگر یہی معلوم ہو جاتا کہ اصالۃً یہاں آنا ہوا ہے اور تبعاً ظریف کے یہاں تو مجھ کو ابہام نہ ہوتا۔خصوصاً وہاں کھانا کھانا اس ابہام کا اور مؤید ہوگیا۔توبہ توبہ کہاں اکابر اور کہاں اصغر الاصاغر، صلاح کار کجا و من خراب کجا، احسن اللہ تعالیٰ عاقبتاً۔فقط

ماہ مبارک میں اس ناکارہ کا اکابر سے خط وکتابت

(۱۱)......اس ناکارہ کا معمول ماہِ مبارک میں تقریباً چالیس سال سے خط وکتابت کا بالکل نہیں مگر یہ کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے جو مدرسہ سے تعلق رکھتی ہیں یا اور کوئی خاص مجبوری ہو تو لکھنے پڑتے ہیں۔لیکن اس ضابطہ میں ایک استثناء ہمیشہ سے رہا وہ یہ کہ اکابر کی خدمت میں ایک دو خط اس تشریح کے ساتھ کہ اس کے جواب کی ہرگز ضرورت نہیں صرف دعاء کی یاد دہانی ہے، لکھنے کا ہمیشہ سے رہا۔اس سلسلہ میں اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعدد خطوط باوجود میرے اس لکھنے کے کہ جواب کی ضرورت نہیں اور باوجود اس اہتمام کے کہ اعلیٰ حضرت رائے پوری اول اور حضرت اقدس رائے پوری ثانی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے میرے انبار میں متعدد موجود ہیں اور حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کا تو یہ بھی اہتمام تھا کہ حضرت اقدس باوجود اپنے مشاغل اور ماہِ مبارک کے اہتمام کے ایک دو کارڈ ماہِ مبارک میں اگر میں نہ لکھوں تب بھی حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ تحریر فرمایا کرتے تھے۔عموماً اس میں ایک یا دو شعر ہوا کرتے تھے۔یہ سارے کارڈ کہیں محفوظ ہیں اور وہ اشعار اتنے اونچے ہوتے تھے کہ یہ ناکارہ ان کا مصداق نہیں بن سکتا۔مگر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے تعلق کے اظہار اور شفقت کو یاد کرکے رونے کے سوا اب کچھ نہیں رہا۔ایک کارڈ کا مضمون جو حضرت نے متعدد رمضانوں میں لکھا تھا یہ تھا:

آنا نکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

ایک ماہِ مبارک کے کارڈ کا شعر یہ تھا۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے ابرِ کرم، بحر سخا، کچھ تو ادھر بھی

مجھے یہ شعر اسی طرح یاد ہے، کارڈ سامنے نہیں بعض خطوط میں عربی کے اشعار بھی تحریر فرمائے۔ اسی طرح اس سیہ کار کا بھی معمول ہر ماہِ مبارک میں ایک دو کارڈ حضرت مدنی کو لکھنے کا تھا اس میں بھی ایک دو شعر ہوا کرتے تھے یہ دونوں شعر مجھے بھی اپنے مختلف کارڈوں پر رمضان میں لکھنا بہت یاد ہے چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا اہتمام اور معمول مجھے معلوم تھا اس لیے حضرت کی روانگی کے بعد جہاں کہیں بھی حضرت قدس سرہٗ کا رمضان گزرتا میں انتیس شعبان یا یکم رمضان کو کارڈ لکھ دیتا تا کہ میرا کارڈ جوابی نہ بنے بلکہ ابتدائی درخواست بنے اس واقعہ کی تسوید کے وقت بھی مفتی محمود صاحب میرے پاس ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کا ایک کارڈ حضرت مدنی کے نام ان کے کسی خلیفہ کے پاس دیکھا جس میں صرف یہ مصرعہ تھا۔

"چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی"

فقط

اس کا دوسرا مصرعہ یہ ہے۔

"بیاد آرا محبان بادہ پیمارا"

اسی طرح ہر دو شیخین رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطوط بھی میرے خزانے میں محفوظ ہیں، یہ چیزیں اکابر کے حالات میں آنا چاہئیں تھیں مگر چونکہ اس وقت ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا اس لیے میرے بچوں نے اعلیٰ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کا ایک کارڈ یہ کہہ کر دکھلایا کہ اس کو تو ضرور نقل کرنا ہے۔ میں نے منع بھی کیا کہ اس قسم کے کارڈ نقل کرنا مناسب نہیں ہیں مگر جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا ان بچوں کا اصرار ہے کہ یہ تبرکات ہیں اور ان سے اپنے اکابر کی تواضع معلوم ہوتی ہے۔ میری درخواست دعاء پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا کارڈ حسب ذیل ہے:

"مکرمی دام فیضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ"

محبت نامہ نے مسرور فرمایا صحیح جواب تو یہ ہے کہ:

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

لیکن چونکہ دعاء کے لیے صلاح شرط نہیں بلا صلاح بھی عبادت ہے اس لیے دل سے دعاء کرتا ہوں اور خود بھی اس کا متمنی ہوں۔ والسلام

اشرف علی

ایک صاحب کے کارڈ پر حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا یہ ارشاد ملا۔

''بخدمت مولوی محمد زکریا صاحب، السلام علیکم۔ میرے چھوٹے بھائی کا خط شاید آپ کے پاس اس مضمون کا آیا ہو کہ کوئی شوہر اپنی بی بی پر ظلم کرتا ہے اول انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ساڈھوڑہ کا قصہ ہے۔ اگر کوئی مخلص دوست وہاں ایسا ہو کہ کوئی شوہر کو فہمائش کر دے تو اچھا ہے ان کو آپ کا پتہ میں نے ہی بتایا تھا کہ شاید ان کا کوئی ذی اثر ملنے والا وہاں ہو سو میں بھی ثواب کے لیے لکھتا ہوں کہ اگر کسی مصلحت کے منافی نہ ہو تو اس کا خیال رکھئے۔ (آگے اس شوہر اور بیوی کا نام بھی تحریر فرمایا ہے)۔ فقط

رمضان المبارک حضرت تھانوی وحضرت سہارنپوری رحمہا اللہ کے معمولات:

(۱۲)......اس ناکارہ نے جب فضائل رمضان لکھا تو اس میں اپنے اکابر کے کچھ معمولات لکھے تھے، تھانہ بھون مجھے رمضان گزارنے کی نوبت کبھی نہیں آئی اور اس سیہ کار کو خواجہ عزیز الحسن مجذوب سے بڑی بے تکلفی تھی کہ وہ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ اور میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد بھی ہمیشہ تھانہ بھون کی حاضری میں جاتے ہوئے اور واپسی میں ایک دو شب سہارنپور قیام فرمایا کرتے تھے، اس لیے میں نے حضرت حکیم الامت کے رمضان کے معمولات بہت اہتمام سے دریافت کیے۔ اس خط میں حضرت کے تو معلوم نہ ہو سکے مگر بعض دوستوں کا اصرار ہے کہ اکابر کے معمولات میں تیرے اس استفسار کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس لیے ان کی خواہش ان کے درج کرنے کی ہے۔

''مکتوب زکریا بنام خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمہ اللہ تعالیٰ''

مخدومی حضرت خواجہ صاحب زاد مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، یہ سن کر کہ آپ کچھ طویل مدت کے لیے تھانہ بھون مقیم ہیں، بے حد مسرت ہوئی، حق تعالیٰ شانہٗ ترقیات سے نوازیں، اس وقت باعثِ تکلیف دہی ایک خاص امر ہے جس کے لیے بڑے غور کے بعد جناب ہی کی خدمت میں عرض کرنا مناسب معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کے یہاں آپ سے زیادہ بے تکلف شاید کوئی نہ ہو۔ اس لیے جناب کو اس میں سہولت ہوگی۔ مجھے حضرت کے معمولاتِ رمضان شریف معلوم کرنے کا اشتیاق ہے خود حضرت سے پوچھتے ہوئے تو ادب مانع ہے اور خود حاضر ہو کر دیکھوں تو ایک دو روز

میں معلوم کرنا مشکل ہے۔اس لیے جناب کوواسطہ بناتا ہوں۔امید ہے کہ تکلیف کوگوارا فرمائیں گے۔سوالات سہولت کے لیے میں خود ہی عرض کرتا ہوں۔

(۱) وقتِ افطار کا کیا معمول ہے۔یعنی جنتریوں میں جواوقات لکھے جاتے ہیں ان کا لحاظ فرمایا جاتا ہے یا چاند وغیرہ کی روشنی کا۔(۲) اگر جنتری پر مدار ہے تو تقریباً کتنے منٹ احتیاط ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔(۳) افطار میں کسی خاص چیز کا اہتمام ہوتا ہے یا ''کل ما تیسر'' اگر اہتمام ہوتا ہے تو کس چیز کا۔(۴) افطار اور نماز میں کتنا فصل ہوتا ہے۔(۵) افطار مکان پر ہوتا ہے یا مدرسہ میں۔(۶) مجمع کے ساتھ افطار فرماتے ہیں یا تنہا۔(۷) افطار کے لیے کھجور یا زمزم کا اہتمام فرمایا جاتا ہے یا نہیں۔(۸) مغرب کے بعد نوافل میں کمّاً یا کیفاً کوئی خاص تغیر ہوتا ہے یا نہیں، اگر ہوتا ہے تو کیا۔(۹) اوّابین میں تلاوت کا کیا معمول ہے۔رمضان اور غیر رمضان دونوں کا معمول ہے۔(۱۰) غذا کا کیا معمول ہے، یعنی کیا کیا اوقات غذا کے ہیں، نیز رمضان اور غیر رمضان میں کوئی خاص اہتمام کی کمی زیادتی کے اعتبار سے معتاد ہے یا نہیں۔(۱۱) تراویح میں امسال تو معلوم ہوا ہے کہ علالت کی وجہ سے مدرسہ میں سُنتے ہیں مگر مستقل عادت شریفہ کیا ہے، خود تلاوت یا سماع اور کتنا روزانہ۔(۱۲) ختم کلام مجید کا کوئی خاص معمول مثلاً ستائیس (۲۷) شب یا اُنتیس (۲۹) شب یا کوئی اور شب ہے یا نہیں۔(۱۳) تراویح کے بعد خدام کے پاس تشریف فرما ہونے کی عادت شریفہ ہے یا نہیں، فوراً مکان تشریف لے جاتے ہیں یا کچھ دیر کے بعد تشریف لے جاتے ہیں تو یہ وقت کس کام میں صرف ہوتا ہے۔(۱۴) مکان تشریف لے جاکر آرام فرماتے ہیں یا کوئی خاص معمول ہے، اگر آرام فرماتے ہیں تو کس وقت سے کس وقت تک۔(۱۵) تہجد میں تلاوت کا کیا معمول ہے، یعنی کتنے پارے کس وقت سے کس وقت تک۔(۱۶) سحر کا کیا معمول ہے یعنی کس وقت تناول فرماتے ہیں اور طلوع فجر سے کتنا قبل فارغ ہو جاتے ہیں۔(۱۷) سحر میں دودھ وغیرہ کسی چیز کا اہتمام ہے یا نہیں، روٹی تازی پکتی ہے یا رات کی رکھی ہوئی۔(۱۸) صبح کی نماز معمول کے وقت اسفار میں ہوتی ہے یا کچھ مقدم۔(۱۹) دن میں سونے کا وقت ہے یا نہیں، اگر ہے تو صبح کو یا دوپہر کو۔(۲۰) روزانہ تلاوت کا کوئی خاص معمول ہے یا نہیں یعنی کوئی خاص مقدار تلاوت کی رمضان میں مقرر فرمائی جاتی ہے یا نہیں۔(۲۱) کسی دوسرے شخص کے ساتھ دَور کا یا سنانے کا معمول ہے یا نہیں۔(۲۲) تلاوت حفظ اکثر فرمائی جاتی ہے یا دیکھ کر۔(۲۳) اعتکاف کا معمول ہمیشہ کیا رہا اور اعتکاف عشرہ سے زیادہ کا مثلاً اربعینہ کا کبھی حضرت نے فرمایا یا نہیں۔(۲۴) اخیر عشرہ میں اور بقیہ حصۂ رمضان میں کوئی فرق ہوتا ہے یا نہیں۔(۲۵) ان کے علاوہ کوئی خاص عادت شریفہ آپ لکھ سکیں گے، بہت ہی کرم ہوگا۔اگر مفصل جواب تحریر

فرمائیں گے اور اگر حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے معمولات کا پتہ لگا سکیں تو کیا ہی کہنا کہ حضرت مولانا ہی کی ذات اب ایسی ہے جو حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مفصل معمولات کچھ بتا سکتی ہے۔ جناب کو بہت ہی تکلیف تو ضرور ہوگی۔ مگر مشائخ کے معمولات خدام کے لیے اسوہ ہو کر انشاء اللہ بہتوں کو نفع ہوگا۔ دعاء کا متمنی اور مستدعی۔ فقط السلام

زکریا عفی عنہٗ

الجواب:

مخدوم ومکرم ومعظم مدفیوضکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ چونکہ حضرت اقدس کے بعض بلکہ اکثر معمولات رمضان المبارک پر میں خود ہی مطلع نہ تھا، اس لیے بضرورت جناب کا والا نامہ خدمت اقدس میں پیش کیا تو حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ صرف یہ لکھ دیا جائے کہ اگر چاہیں وہ براہِ راست خود مجھ سے دریافت کرلیں۔ جواباً اطلاعاً عرض ہے، چونکہ اعتکاف میں ہوں، اس لیے پنسل سے لکھ رہا ہوں، گستاخی معاف ہو۔ والسلام

طالب دعائے خیر عزیز الحسن عفی عنہٗ (اس خط پر کوئی تاریخ نہیں)

اس خط کے نقل کرانے پر بعض دوستوں کو خواہش ہوئی اور خود میرا بھی جی چاہا کہ ان سوالات کے جواب میں سیّدی وسندی ومرشدی حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کے معمولات نقل کراؤں، اگرچہ اجمالی طور پر فضائل رمضان میں اور تذکرۃ الخلیل میں گزر چکے ہیں، لیکن ان مسلسل سوالات کے جواب میں مسلسل جواب لکھواؤں کہ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں ۲۸ھ سے ۴۵ھ تک رمضان گزارنے کی نوبت آئی۔ بجز ۳۴ھ کے کہ اس رمضان المبارک میں حضرت قدس سرہٗ مکہ مکرمہ میں تھے اور یہ ناکارہ سہارنپور میں تھا۔

(۱) حضرت قدس سرہٗ کے یہاں گھڑی کا اہتمام اور اس کے ملانے کے واسطے مستقل آدمی تو تمام سال رہتا تھا، لیکن خاص طور سے رمضان المبارک میں گھڑیوں کے ڈاک خانے اور ٹیلیفون وغیرہ سے ملوانے کا بہت اہتمام رہتا تھا۔ افطار جنتریوں کے موافق ۲۔۳ منٹ کے احتیاط پر ہوتا تھا۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ، رائے پور میں چونکہ طلوع آفتاب اور غروب بالکل سامنے صاف نظر آتا تھا۔ اس لیے دونوں وقت گھڑیوں کے ملانے کا اہتمام طلوع وغروب سے بہت تھا۔ میرے والد صاحب اور چچا جان نور اللہ مرقدہما کے یہاں جنتریوں پر زیادہ مدار نہیں تھا نہ گھڑیوں پر۔ بلکہ ”اذا أقبل الليل من ههنا وأدبر النهار

من ھھنا" آسمان پر زیادہ نگاہ رہتی تھی۔

(۲) اُوپر گزر چکا کہ جنتری کے اعتبار سے ۲۔۳ منٹ کی تاخیر ہوتی تھی۔

(۳) کھجور اور زمزم شریف کا بہت اہتمام ہوتا تھا۔ سال کے دوران میں جو حجاج کرام زمزم اور کھجور ہدایا لاتے تھے وہ خاص طور سے رمضان شریف کے لیے رکھ دیا جاتا تھا۔ زمزم شریف تو خاصی مقدار میں رمضان تک محفوظ رہتا۔ لیکن کھجوریں اگر خراب ہونے لگتیں تو رمضان سے پہلے تقسیم کردی جاتیں۔ البتہ افطار کے وقت آدھی یا پون پیالی دودھ کی چائے کا معمول تھا اور بقیہ اس سیہ کار کو عطاء ہوتا تھا۔

(۴) حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے زمانے میں تقریباً دس منٹ کا فصل ہوتا تھا، تاکہ اپنے گھروں سے افطار کر کے آنے والے اپنے گھر سے افطار کر کے نماز میں شریک ہوسکیں۔

(۵) حضرت کا معمول مدرسہ میں افطار کا رہا۔ چند خدام یا مہمان ۱۵۔۲۰ کے درمیان ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ میں مدرسہ شرعیہ میں افطار کا معمول تھا۔

(۶) گزر چکا۔ (۷) نمبر ۳ میں گزر چکا۔

(۸) مغرب کے بعد کے نوافل میں کماً کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا، کیفاً ضرور ہوتا تھا کہ معمول سے زیادہ دیر لگتی تھی۔ عموماً سوا پارہ پڑھنے کا معمول تھا اور ماہِ مبارک میں جو پارہ تراویح میں حضرت سناتے وہی مغرب کے بعد پڑھتے۔

(۹) سابقہ میں گزر چکا۔

(۱۰) اوابین کے بعد مکان تشریف لے جا کر کھانا نوش فرماتے تھے۔ تقریباً ۲۰۔۲۵ منٹ اس میں لگتے تھے۔ کماً اس وقت کی غذا میں بہت تقلیل ہوتی تھی۔ ہم لوگوں کے یہاں یعنی کاندھلہ اور گنگوہ میں سحر میں پلاؤ کھانے کا بالکل معمول نہیں تھا بلکہ سخت خلاف تھا کہ اس کو موجب پیاس خیال کرتے تھے، سحر میں پلاؤ سب سے پہلی مرتبہ سہارنپور میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں کھائی، اس سیہ کار کا معمول ہمیشہ سے افطار میں کھانے کا کبھی نہیں ہوا۔ اس لیے کہ تراویح میں قرآن شریف سنانے میں دقت ہوتی تھی۔ البتہ جب تک صحت رہی سحر میں اناڑی کی بندوق بھرنے کا دستور رہا۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ مجلس میں اس کا ذکر آگیا کہ یہ ناکارہ افطار میں نہیں کھاتا، تو حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ افطار میں کس طرح کھایا جائے، جو کھاتے ہیں وہ بھی ضابطہ ہی پورا کرتے ہیں۔

(۱۱) میرے حضرت قدس سرہٗ کے اخیر کے دو سالوں کے علاوہ کہ ضعف و نقاہت بہت بڑھ گیا تھا، ہمیشہ تراویح میں خود سنانے کا معمول رہا۔ دار الطلبہ بننے سے پہلے مدرسہ قدیم میں تراویح

پڑھایا کرتے تھے۔ دار الطلبہ قدیم بن جانے کے بعد پہلے سال میں تو حضرت کی تعمیل حکم میں میرے والد صاحب نے قرآن پاک سنایا تھا۔ اس کے بعد ہمیشہ حضرت قدس سرہٗ کا وہاں قرآن پاک سنانے کا معمول رہا۔

(۱۲) اکثر ۲۹ کی شب میں ختم قرآن کا معمول تھا۔ چند روز تک شروع میں سوا پارہ اور اس کے بعد اخیر تک ایک پارہ کا معمول تھا۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب قصہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی قدس سرہٗ کا معروف ہے کہ اگر رمضان مبارک ۲۹ کا ہوتا تو حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا معمول یکم رمضان کو دو پارے پڑھنے کا تھا اور ۳۰ کا ہوتا تو یکم رمضان کو ایک پارہ پڑھا کرتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ یکم رمضان کو اپنی مسجد میں تراویح پڑھانے کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب کی مسجد میں تحقیق کے لیے آدمی بھیجا کرتے کہ بھائی نے آج ایک پارہ پڑھایا دو۔ اگر معلوم ہوتا کہ دو پڑھے تو شاہ صاحب فرمایا کرتے، اب کے رمضان ۲۹ کا ہوگا، یہ علمِ غیب نہیں کہلاتا بلکہ علمِ کشف کہلاتا ہے۔

(۱۳) تراویح کے بعد ۱۵۔ ۲۰ منٹ حضرت قدس سرہٗ مدرسہ میں آرام فرماتے تھے۔ جس میں چند خدام پاؤں بھی دباتے اور قرآن پاک کے سلسلے میں کوئی گفتگو بھی رہتی مثلاً کسی نے غلط لقمہ دے دیا یا تراویح میں اور کوئی بات پیش آئی ہو اس پر تبصرہ، تفریح چند منٹ تک ہوتی۔ حضرت قدس سرہٗ کے پیچھے تراویح پڑھنے کے لیے دور دور سے حفاظ آتے۔ یہ ناکارہ اپنی تراویح پڑھانے کے بعد جو اکثر حکیم اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مسجد میں اور کبھی کبھی اماں جی کے اصرار وارشاد پر حضرت قدس سرہٗ کے مکان پر پڑھانے جاتا تھا۔ جلد جلد فراغت کے بعد حضرت قدس سرہٗ کے یہاں پہنچ جاتا۔ اس وقت تک حضرت قدس سرہٗ کے یہاں ۴۔ ۶ رکعتیں ہوتیں۔ اس لیے کہ حکیم صاحب مرحوم کی مسجد میں نماز سویرے ہوتی تھی اور مدرسہ دار الطلبہ کی مسجد میں تاخیر سے اور یہ ناکارہ اپنی نااہلیت سے پڑھتا بھی بہت جلدی تھا۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ نے سورۂ طلاق شروع کی اور ''یاایها النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن الآیه'' آیۃ شریفہ شروع کی اور اس نابکار نے جلدی سے لقمہ دیا۔ ''یا ایها الذین آمنوا اذا طلقتم النساء'' حضرت حافظ محمد حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو حضرت قدس سرہٗ کے مستقل سامع تھے۔ ہر سال اجراڑہ سے سہارنپور رمضان گزارنے تشریف لایا کرتے تھے۔ نیز حضرت مولانا عبداللطیف صاحب اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہما اقتداء میں تھے، تینوں ایک دم بول ''یا ایها النبی'' تراویح کے بعد حسبِ معمول لیٹنے کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا۔ مولوی زکریا سو رہے تھے، میں نے عرض کیا حضرت بالکل نہیں، مگر ''اذا طلقتم النساء فطلقوهن واحصوا العدة، و اتقوا

اللّٰہ ربکم و لا تخرجو ھن" سارے جمع کے صیغے تھے، مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ "یا ایھاالذین آمنوا" ہوگا۔ "یا ایھاالنبی" مفرد کیوں ہوگا۔

حضرت اقدس سہارنپوری نے ارشاد فرمایا، قرآن شریف میں بھی قیاس چلاتے ہو۔ میں نے عرض کیا، حضرت یہ تو قیاس نہیں، یہ تو قواعد نحو یہ کی بات تھی ایک مرتبہ حافظ محمد حسین صاحب نے غلط لقمہ دے دیا۔ میں نے ایک دم صحیح لقمہ دیا۔ حضرت حافظ صاحب کی زبان سے بے اختیار نکل گیا نماز ہی میں "ہاں" اور پھر جو میں نے بتایا تھا وہی حافظ صاحب نے بتایا۔ تراویح کے بعد کے وقفے میں میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت میرا لقمہ لیا یا حافظ کا، میرا مطلب یہ تھا کہ حافظ صاحب کی نماز تو "ہاں" کہنے سے ٹوٹ گئی اور حضرت نے اگر ان کا لقمہ لیا ہوگا تو میں عرض کروں گا کہ سب کی ٹوٹ گئی۔ حضرت قدس سرہٗ میری حماقت کو سمجھ گئے، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میں باؤلا تھا جو ان کا لقمہ لیتا۔ اس قسم کے تفریحی فقرے یا کسی آیت شریفہ کے متعلق کوئی تفسیری نکتہ ہوتا تو اس پر بھی گفتگو فرماتے رہتے، ایک مرتبہ "وان تعدّو ا نعمة اللّٰہ" کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت میں ہزاروں نعمتیں شامل ہیں۔ اس لیے تعداد ارشاد فرمایا گیا۔

(۱۴) تراویح کے بعد چند منٹ قیام کے بعد جیسا کہ اوپر لکھا مکان تشریف لے جا کر ۱۵۔۲۰ منٹ گھر والوں سے کلام فرماتے اور محلّہ کی کچھ مستورات اس وقت آ جاتیں ان سے بھی کچھ ارشاد فرماتے، اس کے بعد ڈھائی تین گھنٹے سونے کا معمول تھا۔

(۱۵) تہجد میں عموماً دو پارے پڑھنے کا معمول تھا کبھی کم وبیش حسبِ گنجائش اوقات۔ بذل المجہود میں جب نظائر والی حدیث آئی جو مصحف عثمانی کی ترتیب کے خلاف ہے تو حضرت قدس سرہٗ نے اس ناکارہ سے فرمایا تھا کہ اس حدیث کو ایک پرچہ پر نقل کر دینا، آج تہجد اسی ترتیب سے پڑھیں گے۔ یہ فرطِ محبت اور فرطِ عشق کی باتیں:

"محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی"

سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کا معمول وتروں کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کا تھا، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آدھا ثواب آیا ہے، حضرت نے فرمایا ہاں بھئی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع میں جی زیادہ لگے ہے، بڑا ثواب زیادہ نہ ہو۔ میرا خیال یہ ہے کہ ضابطہ میں تو آدھا ہی ثواب ہے مگر یہ جذبۂ عشق شاید پورے حصہ سے بھی بڑھ جائے۔ مشہور ہے کہ مجنوں لیلیٰ کے شہر کے کتوں کو پیار کرتا تھا۔

(۱۶) تقریباً صبح صادق سے باختلاف موسم دو یا تین گھنٹے پہلے اُٹھنے کا معمول تھا اور صبح صادق سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے سحر کا معمول تھا ۱۵۔۲۰ منٹ میں فراغت ہو جاتی تھی۔ یعنی

طلوع فجر سے ۱۵۔۲۰ منٹ پہلے۔

(۱۷) سحر میں دودھ وغیرہ کسی چیز کا اہتمام نہیں تھا، کبھی ہدایا میں پھینیاں آجاتیں تو بلا اہتمام سب گھر والوں کے لیے بھگودی جاتیں ایک آدھ چمچہ حضرت قدس سرہٗ بھی نوش فرمالیتے، البتہ پلاؤ کبھی کبھی سحر میں حضرت کے یہاں پکائی جاتی تھی، البتہ افطار میں کبھی نہیں پکا کرتی تھی شاید میں پہلے کہیں لکھوا چکا ہوں حضرت قدس سرہٗ کے یہاں سے قبل کاندھلہ یا گنگوہ میں سحر میں پلاؤ کھانا جرم تھا۔ مشہور یہ تھا کہ اس سے پیاس لگتی ہے مگر حضرت قدس سرہٗ کے یہاں کھانے کے بعد سے جب تک اس ناکارہ کی صحت رہی اور سحور کا اہتمام رہا اس وقت تک تو میرا معمول سحر میں پلاؤ کھانے کا رہا اور اب تو دس بارہ سال سے جب سے مہمانوں کا ہجوم بڑھ گیا۔ افطار میں پلاؤ اور گوشت روٹی کے علاوہ سحر میں میٹھے چاولوں کا بھی ہوگیا، حضرت قدس سرہٗ کے یہاں سحر میں تازی روٹی پکتی تھی۔ البتہ سحر میں چائے کا معمول حضرت کے یہاں تھا، اس ناکارہ کا اپنا سحر میں کبھی چائے پینا یاد نہیں، کیونکہ رمضان میں نماز فجر کے بعد سونے کا معمول ہے ۳۸ھ یعنی پہلے سفر حج سے رمضان میں رات کو نہ سونے کا معمول شروع ہوا تھا جواب سے ۷، ۸ سال پہلے تک بہت اہتمام سے رہا۔ لیکن اب تو امراض نے سارے ہی معمولات چھڑادیے۔

(۱۸) حضرت قدس سرہٗ کے یہاں رمضان میں اسفار میں نماز پڑھنے کا معمول تھا، البتہ غیر رمضان سے دس بارہ منٹ قبل۔

(۱۹) حضرت قدس سرہٗ کا معمول بارہ مہینے صبح کی نماز کے بعد سے تقریباً اشراق تک سردیوں میں حجرے کے کواڑ بند کرکے اور شدید گرمی میں مدرسہ قدیم کے صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر اوراد کا معمول تھا اس میں مراقبہ بھی ہوتا تھا۔ بارہ مہینے اشراق کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ۳۵ھ سے پہلے بخاری اور ترمذی شریف کے سبق کا وقت تھا۔ لیکن ۳۵ھ کے بعد بذل کی تالیف کا وقت ہوگیا تھا جو ہر موسم میں ۱۱، ۱۲ بجے تک رہتا۔ لیکن ماہ رمضان مبارک میں اشراق کی نماز پڑھنے کے بعد ایک گھنٹہ آرام فرماتے۔ اس کے بعد گرمی میں ایک بجے تک بذل لکھواتے اور سردی میں ۱۲ بجے تک اس کے بعد ظہر کی اذان تک قیلولہ کا معمول تھا۔

(۲۰) رمضان میں حضرت قدس سرہٗ کا معمول ہمیشہ وصال سے دو سال قبل تک خود تراویح پڑھانے کا تھا، ظہر کی نماز کے بعد تراویح کے پارے کو ہمیشہ حافظ محمد حسین صاحب اجراڑوی کو سنایا کرتے تھے کہ وہ اسی واسطے رمضان المبارک ہمیشہ سہارنپور کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی غیبت میں اس سیہ کار کو بھی سننے کی نوبت آئی، البتہ مدینہ پاک میں ظہر کے بعد پارہ سننا اس ناکارہ کے متعلق تھا اور میرے سفر حجاز سے واپسی پر چونکہ بذل بھی ختم ہوگئی تھی، اس لیے ظہر کی نماز کے بعد

مستقل ایک پارہ اہلیہ محترمہ کو سنانے کا دستور تھا اسی پارہ کے جو ظہر کے بعد سنانے کا معمول تھا۔ مغرب کے بعد اوابین میں اور رات کو تراویح میں پڑھتے تھے۔

(۲۱) ۳۳ھ کے سفر حج سے پہلے عصر کے بعد میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے دَور کا معمول تھا جو اسی پارہ کا ہوتا تھا۔ جو تراویح میں سناتے، میں نے اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کے علاوہ کسی اور سے دور کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(۲۲) حضرت قدس سرہٗ کو دیکھ کر تلاوت کرتے ہوئے کم دیکھا ہے البتہ کبھی کبھی ضرور دیکھا ہے۔

(۲۳) حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو وصال سے دوسال قبل کہ ان دوسالوں میں امراض کا جو اضافہ ہو گیا تھا ان میں سے قبل میں نے کبھی آخری عشرے کا اعتکاف ترک فرماتے نہیں دیکھا اور دار الطلبہ بننے سے قبل مدرسہ قدیم کی مسجد میں کرتے تھے اور دار الطلبہ بننے کے بعد یعنی ۳۵ھ سے دار الطلبہ میں فرماتے تھے اور اس عشرہ میں بھی بذل کی تالیف ملتوی نہیں ہوتی تھی بلکہ مسجد کلثومیہ کی غربی جانب جو حجرہ ہے اس میں بیس تاریخ کو تالیف سے متعلقہ سب کتابیں جاتیں تھی جو صبح کی نماز کے بعد یہ ناکارہ اٹھا کر مسجد میں رکھ دیتا اور تالیف کے ختم پر پھر اسی حجرہ میں منتقل کر دی جاتیں۔ عشرہ اخیر کے علاوہ میں نے کبھی اعتکاف کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(۲۴) میں نے کوئی خاص فرق نہیں دیکھا۔ بجز اس کے کہ اٹھنے میں کچھ تقدیم ہو جاتی۔ اگرچہ میں اجمالی طور پر فضائل رمضان میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت قدس سرہٗ اور حضرت حکیم الامت کے یہاں رمضان اور غیر رمضان میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا بخلاف حضرت شیخ الہند اور اعلیٰ حضرت رائے پوری نوّر اللہ مرقدہما کے کہ ان دونوں کے یہاں رمضان اور غیر رمضان میں بہت فرق ہوتا تھا جیسا کہ میں نے فضائل رمضان میں لکھ چکا ہوں۔

(۲۵) اس کے علاوہ کہ اخبار دیکھنے کا جو معمول کسی کسی وقت غیر رمضان میں ہوتا تھا وہ رمضان میں نہیں ہوتا تھا بلکہ رمضان میں ان دوسالوں کے علاوہ جن میں میرے والد صاحب کے ساتھ دور ہوا۔ تسبیح ہاتھ میں ہوتی تھی اور زبان پر اوراد آہستہ آہستہ، کوئی خادم بات دریافت کرتا تو اس کا جواب مرحمت فرما دیتے کچھ لوگ دس پندرہ کے درمیان میں جیسے متولی جلیل صاحب، متولی ریاض الاسلام صاحب کاندھلہ سے اور میرٹھ سے رمضان کا کچھ حصہ گزارنے کے لیے حضرت کے پاس آجایا کرتے تھے، مگر اعتکاف نہیں کیا کرتے تھے اس لیے کہ عید سے ایک دن پہلے گھر واپس جانا چاہتے تھے۔

مکتوبات حضرت تھانوی بسلسلہ لفظ ''امام'' نام نامی حضرت حسین رضی اللہ عنہ

(۱۳) مکتوب زکریا بنام حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ

بحضرت اقدس ادام اللہ ظلال برکاتکم ونورنا بانورا فیوضکم ، بعد سلام مسنون آنکہ۔ ایک امر میں حضرت اقدس کا ذوق اپنے عمل کے لیے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے نام پر امام کا لفظ تحریر وتقریر میں استعمال کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ استعمال میں تشبہ بالرفض کا شبہ ہے کہ اصل اطلاق اس کا شیعہ کے یہاں سے ہے۔ عدم استعمال میں تشبہ بالخروج کا شبہ ہے کہ اب یہ لفظ اہل سنت کے کلاموں میں اتنی کثرت سے استعمال ہونے لگا کہ گویا جزونام بن گیا۔ اپنے اکابر کی کلامیں دونوں طرح کی ملتی ہیں فتاویٰ مولانا عبدالحیٔ صاحب ماثبت بالسنہ للشیخ عبدالحق وغیرہ میں سید حسن وسید حسین کو لفظ امام کے ساتھ متعدد جگہ استعمال کیا گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطبہ میں عن الامامین الھمامین ہے، حضرت گنگوہی کے رسائل ردشیعہ میں نہیں ہے۔ جناب حسن جناب حسین اور حضرت حسن وغیرہ کے الفاظ ہیں۔

دعاء کا محتاج: زکریا کاندھلوی مظاہر علوم سہارنپور ۲۰۔

ذیقعدہ ۵۷ھ

الجواب:

(۱۴) ’’میرا ذوق ہی کیا۔ مگر میرے اعتقاد میں یہ تشبہ اس لیے نہیں کہ اس کا شیوع اس قدر ہو گیا کہ خصوصیت کا شائبہ نہیں رہا البتہ اگر اطلاق کے وقت اس کا خیال آجاتا ہے تو بجائے امام کے حضرت کا لفظ استعمال کرتا ہوں اور اولیٰ سمجھتا ہوں۔‘‘

اس ناکارہ زکریا کا معمول ایک عرصہ سے یہ ہے کہ حضرت قطب الارشاد حکیم الاسلام حضرت اقدس شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ کو مسند الہند کہا کرتا ہوں اور لکھا کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ناکارہ نے ۴۰ھ سے حدیث شریف پڑھانی شروع کی تھی۔ اس وقت میں دیکھا کہ اپنے سلسلہ کی ساری اسانید حضرت مسند الہند پر جمع ہو جاتی ہیں۔ تو میں نے یہ سوچا کہ دوسرے مسالک والوں کی سندیں بھی تحقیق کروں۔ چنانچہ میں نے اس وقت میں ہر مدرسہ چھوٹا ہو یا بڑا اہل حدیث کا ہو یا اہلِ بدعت کا ہو یا کسی بھی مسلک کا ہو اور وہاں حدیث پڑھائی جاتی ہو ان کو ایک ایک جوابی کارڈ لکھا جس میں یہ لکھا کہ آپ کی سند حدیث میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا سلسلہ ہے یا نہیں؟ مجھے کسی مسلک والوں کے خط سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کوئی بھی حدیث پڑھانے والا ہندوستان میں ایسا ہے جس کا سلسلہ سند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے واسطہ سے بچ گیا ہو، ایسا تو ضرور ہوا کہ بہت سے مشائخ حدیث کی ایک سند ولی اللہ واسطہ سے اور اس کے علاوہ دوسری سندیں بھی ان کو حاصل ہیں، چنانچہ خود میرے حضرت قدس

سرہٗ کی سند ولی اللہ خاندان کے علاوہ مکہ مکرمہ مدینہ منورہ کے مشائخ سے ہے جیسا کہ مقدمہ بذل المجہود، لامع الدراری، مقدمہ اوجز میں تفصیل سے مذکور ہے اس لیے میں حضرت قطب عالم شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کو مسند ہند کہا کرتا ہوں، حضرت مسند الہند قدس سرہٗ کے تین رسالے ''الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین'' دوسرا رسالہ ''الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین'' اور تیسرا ''النوادر فی حدیث سید الاوائل والاواخر'' ان میں دوسرا رسالہ الدر الثمین تو مطبع مجتبائی میں ترجمہ کے ساتھ چھپا ہوا ملتا تھا۔ لیکن پہلا اور تیسرا نایاب قلمی میرے حضرت قدس سرہٗ کے پاس تھا۔ ان تینوں رسالوں کو حضرت یکجائی ۱۳۳۰ھ میں چھپوایا تھا اور اس وقت سے حضرت قدس سرہٗ کا معمول یہ تھا کہ اگر کوئی سمجھ دار ذی علم اس کی سند اور اجازت کی درخواست کرتا تو حضرت اس کو انفراداً یا اجتماعاً پوری سن کر یا اوائل سن کر اجازت فرما دیا کرتے۔ اس سیہ کار کو سب سے پہلے اس کی اجازت شوال ۱۳۳۳ھ میں، جبکہ حضرت قدس سرہٗ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کی معیت میں طویل قیام بلکہ براہ حجاز قسطنطنیہ کابل وغیرہ سے ہندوستان پر حملہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ کی مشایعت کے لیے اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ تشریف لائے تھے۔ لیکن اللہ والوں کی مخالفت تو سنت قدیمہ ہے۔ انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین بھی مشرکین اور منافقین کی ایذاء رسانی سے نہ چھوٹے۔ بعض مفسدوں کو یہ خیال ہوا اور سنا یہ تھا کہ محض تفریحاً کہ حضرت سہارنپوری کا سفر حجاز روکا جائے اور اس کے لیے ایک جھوٹا مقدمہ قائم کر کے حضرت قدس سرہٗ پر دعویٰ کر دیا کہ عین وقت پر سمن کی تعمیل کرا کر سفر کو روک دیا جائے۔ حضرت قدس سرہٗ اس کی وجہ سے دو دن تک اہلِ رائپور کے اس مکان میں جو دار الطلبہ قدیم کی برابر میں ہے روپوش رہے۔ اسی مکان میں اعلیٰ حضرت رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کا قیام تھا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے درخواست کی یا حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے از خود ارشاد فرمایا ہوگا۔

مسلسلات کی پہلی اجازت:

غرض اس وقت حضرت کے سفر حجاز سے دو تین روز قبل اس مکان میں اس سیہ کار کی مسلسلات کی پہلی اجازت ہے جس میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مدرسہ مظاہر علوم، میرے چچا جان حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی حال شیخ الاسلام پاکستان شریک تھے اور بہت ہی لذائذ سے یہ اجازت ہوئی تھی جس کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے اس کے بعد سے چونکہ حضرت قدس

سرہٗ کی حجاز واپسی کے بعد سے آخر ۴۵ھ تک یہ سیہ کار سفراً وحضراً حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کا ہم رکاب رہا اس لیے عموماً کوئی شخص اجازت لینے کے لیے آتا تو یہ ناکارہ بھی اس میں شریک رہتا، بلکہ اکثر قراءت بھی میں ہی کرتا، مگر یہ اجازت عموماً انفراداً ہوتی۔ اس ناکارہ کی سفر حجاز سے واپسی ۴۶ھ کے بعد سے ابو داؤد شریف کا سبق مستقل طور پر میرے متعلق ہو گیا اور ابو داؤد شریف کے ختم پر طلبہ کے اصرار پر اول مخصوص طلبہ کو اس کے بعد رفتہ رفتہ ابوداؤد کی پوری جماعت اور اس کے بعد سے قرب و جوار کے مدارس کے طلبہ نے بھی شرکت کرنی شروع کی اور اس ناکارہ نے بھی ان تینوں رسائل کا مطالعہ کئی سال تک مسلسل اجازت کے موقعوں پر کیا۔ ان میں سے دو رسالے درثمین اور نوادر کے اندر تو زیادہ تحقیق کی بات نہیں تھی۔ بجز اس کے کہ النوادر میں بعض معمر صحابہ کی روایات ذکر کی گئی تھیں۔ جن پر محدثین نے بڑے سخت کلام کیے ہیں اور مسلسلات کے بعض رواۃ پر بھی سخت کلام کیا۔ جس کے متعلق مجھے یہ اشکال پیدا ہوا کہ ان رسائل کی اجازت دینا جائز ہے یا نہیں، حضرت مسند ہند کی تالیف اور میرے حضرت قدس سرہٗ کا ان کو طبع کرانا اور مسلسل اجازت دینا تو محرک تھا لیکن محدثین کا کلام موجب اشکال تھا۔ اس لیے ۵۲ھ میں اس ناکارہ نے جملہ اکابر حضرت شیخ الاسلام مدنی، حضرت حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی شاگرد حضرت قطب عالم گنگوہی، مولانا کفایت اللہ صاحب دہلی مفتی اعظم ہند اور بیسیوں اکابر اور معاصرین کو جوابی کارڈ لکھے، میری عادت ہمیشہ اپنی زندگی یا صحت کے زمانے میں یہ رہی کہ جب مجھے مسئلہ میں اشکال پیش آتا تھا تو اپنے اکابر اور معاصرین اور بعد میں شاگردوں سے بھی جو استفسار میں عار نہیں ہوا، جن جن کو مناسب سمجھتا ایک ایک جوابی کارڈ لکھوا دیتا کہ مجھے اس مسئلہ میں اشکال ہے اس کے متعلق تمہاری معلومات کیا ہیں، اسی سلسلہ میں ۵۲ھ میں تقریباً پچاس خطوط لکھے جن کے جواب میں اکثریت تو ایسے حضرات کی تھی جنہوں نے اس کتاب سے لاعلمیت ظاہر کی اور بعض نے لکھا کہ محدثانہ کلام کی طرف التفات نہیں ہوا۔ اسی سلسلہ میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کو بھی ایک عریضہ لکھا تھا۔ جس کا جواب حضرت قدس سرہٗ نے جوار شاد فرمایا وہ دونوں یہاں درج کراتا ہوں۔

خلاصہ استفسار از:

حضرت اقدس حکیم الامۃ کا مسلسلات کے سلسلہ میں ایک مکتوب

حضرت اقدس حکیم الامۃ مولانا تھانوی ادام اللہ ظلال برکاتکم

مجدد عصر حضرت مسند ہند شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے رسائل ثلثہ میں بہت سی روایات

محدثین کے قاعدہ کے موافق متکلم فیہ بلکہ بعض کو موضوع بھی کہا گیا ہے۔ بالخصوص رتن ہندی اور ابوالدنیا وغیرہ سے جو روایات منقول ہیں کہ رتن ہندی کی صحابیت محدثین کے نزدیک ثابت نہیں، اصابہ میں ان کے متعلق طویل کلام کیا ہے اور ابوالدنیا کو لسان المیز ان میں سخت الفاظ سے تعبیر کیا ہے ایسے حالات میں ان روایات کا معمول شاہ صاحب کے زمانے سے متداول ہے مجھے حضرت مولانا سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ سے اجازت ہے۔ اب بھی بعض طلبہ کے اصرار پر بندہ کبھی کبھی روایت کرتا ہے، امسال یہ خلجان درپیش ہے کہ حسب قاعدۂ محدثین یہ موضوعات کی روایت ہے اور شاہ صاحب کی تالیف ہونا اور اپنے اکابر کی روایت یہ دونوں امر اس کے معارض ہیں اکابر کے ساتھ حسن ظن ان پر اعتماد ان کی چھان بین اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس طرف التفات نہ ہو اور محدثین کی تحقیق فن رجال ائمہ کا فیصلہ اس سے مانع ہے کہ ان کی روایت کی اجازت دی جائے۔ ایسی حالت میں خلجان ہے کہ ہم لوگوں کے لیے کون سی تحقیق راجح ہے، حجاز میں بعض مشائخ کے یہاں متداول ہے اگر اجازت نہ دی جائے تو اس تسلسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے جو تیرہ سو برس سے باقی ہے اور اجازت دی جائے تو وعید دخول فی الکذب کا اندیشہ ہے اھ مختصراً۔

الجواب:

مکرمی السلام علیکم آپ نے غایت ورع واحتیاط سے اس کو ضرورت سے زیادہ اہم ٹھہرالیا۔ آخر ابن ماجہ وغیرہ میں بھی بعض احادیث موضوع کہی گئیں۔ مگر ان کی روایت بلانکیر برابر ہوتی ہے۔ اکابر کا روایت کرنا دلیل ثبوت کسی حال نہیں۔ ان کو جو پہنچا روایت کر دیا۔ روایت کرنا اور بات ہے اور ثبوت کا حکم کرنا اور بات ہے۔ البتہ روایت کر کے اس کے عدم ثبوت کو مع درجۂ عدم ثبوت کے ظاہر کر دینا ضروری ہے اس طرح سے موضوعات کی روایت بالاجماع جائز ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بات ذہن میں نہیں باقی دوسرے علماء سے مراجعت کرنے سے شاید اس سے زیادہ تحقیق ہو سکے۔

والسلام اشرف علی

۲۳ رجب ۱۳۵۲ھ اھ بلفظہ

(یہ مضمون رسالہ النور رمضان ۱۳۵۳ھ میں شائع بھی ہو چکا)

مکتوب زکریا بنام حضرت سہانپوری بسلسلہ ذکر

(۱۵) خلاصہ مکتوب زکریا بنام:

حضرت اقدس سیدی سندی ومرشدی سہارنپوری قدس سرہٗ

(۱) ذکر میں بعض وقت وساوس سے لذت وتوجہ نہیں رہتی ذکر کے وقت کوئی تصور ارشاد فرمادیں

کہ جس سے طبیعت کو اس کی طرف متوجہ کرلینے کی وجہ سے انتشار خیال نہ رہے۔

(۲) بعض وقت عجلت کی وجہ سے اور بعض وقت بلاتنگی وقت بھی اطمینان سے ذکر پورا نہیں ہوتا۔ ایسے وقت میں تعداد کا پورا ہونا ضروری ہے اگرچہ جلدی جلدی ہو یا اتنے وقت میں جس قدر ہو سکے اتنا کرلیا جائے ضحیٰ کی نماز کے علاوہ بقیہ ارشادات کی تعمیل حضرت کی توجہ سے ہو رہی ہے۔ ضحیٰ کا وقت مشین چلنے کا ہے اس میں فراغت نہیں ہوتی۔ حضرت والا سے توجہاتِ عالیہ کی استدعا ہے۔

الجواب:

(۱) ذکر کیے جایئے ذوق شوق کے پیدا ہونے کی فکر نہ کیجئے۔ توجہ کے لیے حدیث ''تعبد اللّٰہ کانک تراہ'' کے مضمون کو پیش رکھئے۔

(۲) رات دن کے چوبیس گھنٹے میں معینہ ذکر کی تعداد کو پورا کرلیا کیجئے۔

(۳) ضحیٰ کا وقت ارتفاع شمس سے زوال تک ہے۔ محدثین کے نزدیک ضحیٰ اور اشراق ایک چیز ہے اور جو نوافل مشین سے پہلے پڑھے جائیں گے وہ ضحیٰ ہی ہیں۔ فقط والسلام

''مشین کا مطلب یہ ہے کہ یہ ناکارہ بذل المجہود کی طباعت کے سلسلہ میں تھانہ بھون اور دہلی آتا جاتا رہتا تھا اور تین چار دن بسا اوقات وہاں قیام رہتا تھا یہ خط تھانہ بھون کی حاضری کے موقع کا بظاہر ہے۔''

وصیت نامہ سہانپوری رحمہ اللہ تعالیٰ

(۱۶) حضرت قدس سرہ کی عادت شریفہ اکثر یہ رہی کہ بیماری کے زمانے میں وصیت نامہ تحریر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سہارنپور میں طبیعت بہت ناساز رہی۔ ایک ہفتہ تک باہر بھی تشریف نہ لاسکے۔ یہ سیہ کار ہر نماز کے وقت نماز پڑھانے کے لیے مکان پر جایا کرتا تھا۔ حالت کچھ مایوسی کی ہو چکی تھی۔ اس وقت میں حضرت قدس سرہٗ نے یہ وصیت نامہ مجھ سے ہی تحریر کرایا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامدا او مصلیا و مسلما. هذه وصية من المدبر عن الدنيا المقبل الى الأخرة خليل احمد وفقه الله للتز و دلغد امليها علىٰ حسب ماقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ما حق امرى مسلم يبيت ليلتين وله شئى يوصى فيه الا و وصية مكتوبة عنده أو كما قال رواه البخارى و غيره من ارباب الصحاح فاوصى بامور أحدها أن أدفن عند قبر استاذى مولانا محمد مظهر النانوتوى رحمه الله بعدالاستيذان

من أصحاب المقبرة و ملاكها و ان يحفر الحصة الاولىٰ من القبر علىٰ قدر نصف قامة الانسان الىٰ السرة و هى أدنى مرتبة الحفرأو إلى الصدر و هى أعلاها و يحفرون الحصة الثانية منها التى تسمى بالشق و يجعل عمقها علىٰ قدر ذراع او قريباً من ذلك بحيث تنفصل اللبنات أو القصب عن الجسد ويكتفى علىٰ هذا علىٰ خلاف ماهو معمول فى السهار نفور فانهم يحفرون الحصة الاولىٰ من القبر علىٰ قد رالشبرين أو قريباً و يحفرون الحصةالثانية التى تسمى بالشق و يعمقونها كثيرا و هى خلاف السنة ثانيها ليس على فيما احفظ من الدين و ثالثها ان مالى على الناس من الديون فتفصيله ان مائة روبية علىٰ مولوى انوار احمد ورقعة مكتوبة موجودة و خمس عشرة روبية على العزيز محمد صالح وعدة ربابى على العزيز لطيف احمد ابن اخى رشيد احمد و هى من دين مولوى فيض احسن على لطيف احمد و يعلم هو مقدارها و مكتوب عنده. خمس و عشرون روبية علىٰ مولوى اسحٰق البريلوى واما الودائع والا مانات فالعدد الكثير منه عند الحافظ الحاج محمد اسمٰعيل و حافظ محمد عثمان و ما أتذكر تعداد ها و هى عند هما محفوظة مكتوبة فاما الرقوم التى عند الحافظ محمد اسمٰعيل و محمد عثمان ففيها خمس مائة روبية لزوجتى والدة ام هانئ و هى ملكها ليس لى فيها حق حصل لها من تركة ام هانئ المرحومة بنتها و ما بقى من الرقوم فاوصى فيه إلاأن يعطى منه الف روبية بنت بنتى عطية و اربعمائة لبنت "اخى فاطمة بنت مولوى نذير احمد المرحوم و ما بقى منها فيقسم على حسب امر الشريعة بين مستحقى التركة و أوصى ايضا ان لا تكشف زوجتى والدة ام هانئ عما أغلقت عليت بابها فانما في البيت حوائج البيت أو ماكان عندها من الحلى و الثياب والظروف والسرر فكلها لها تتصرف فيها كيف تشاء و تعطى من تشاء الاأن المنا سب لها أن تعطى بعض الظروف والسرروغير ذلك من الحوائج عطيه و امها و أماما كان لى من الثياب والحوائج المختصة فكلها تدخل فى المدرسة غير الساعةالكبيرة وواحدة من الساعة الصغير تختاز ها فتكون عندها فى البيت و أوصى من الرقوم المذكورة أن تكون منها بعدى مأتى روبية عند زوجتى لتكون للصرف على احبابى الواردين بعد ى للتعزية وغير ها نعم بقى لى من الدين بان لى على

اولاد حافظ احمد جان الف و أربعمائة روبية و قدصار القضاء بها من الحكومة فالورثة لو شاوء ا ان يسعوا في و صولها فعلوا. فقط

جمادی الاخری سنہ ۴۰

ایک ضروری تنبیہ:

(۱۷) (ایک ضروری تنبیہ) بڑی فحش غلطی آپ بیتی نمبر۳ صفحہ ۲۳۶ پر حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کے پاکستان سے واپسی کے سلسلہ میں یہ لفظ لکھا گیا کہ اگر میرا وہاں انتقال ہو جائے تو میری نعش کو روکا نہ جائے۔ اصل ارشاد حضرت کا یہ تھا کہ مجھے روکا نہ جائے یہ ارشاد تو تقریباً ہر سفر میں ہوتا تھا۔ اس لیے کہ اہلِ پاکستان کی ہمیشہ یہ عادت تھی کہ وہ یہاں سے تو بہت وعدے مواعید صرف ایک ماہ دو ماہ کے کر کے لے جاتے تھے اور وہاں جانے کے بعد مختلف جہات سے اتنا زور حضرت قدس سرہٗ پر ڈالتے تھے کہ واپسی مشکل ہو جاتی تھی اور کئی کئی ماہ لگ جاتے تھے بار بار تشریف آوری میں ناسخ و منسوخ بھی ہوتا تھا اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ کسی سفر میں رہ چکا ہو، یا وہاں کے قیام میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ ان دوستوں کی محبت کی کشاکشی دیکھی ہو، وہاں جانے کے بعد لاہور لائل پور کی کشاکشی مستقل مرحلہ ہوتا تھا اس میں بہت وقت لگتا۔ اس لیے حضرت کو ہر مرتبہ روانگی کے وقت اس کے عہد و مواثیق لینے پڑتے کہ مجھے روکا نہ جائے۔ آخری مرتبہ حضرت نے بہت زائد مواثیق لیے اور حضرت حافظ عبد العزیز کو واپسی کا ذمہ دار بنایا۔ اس وقت تو ہر شخص کے ذہن میں حسبِ معمول زندگی میں واپس لانے کا مطلب تھا۔ لیکن وصال کے بعد عام طور سے زبانوں پر نعش کی واپسی کا لفظ چل پڑا۔ اسی مغالطے کی بناء پر آپ بیتی نمبر۳ میں املا کی غلطی یا کاتب کے سہو کی وجہ سے یہ لکھا گیا کہ ''اگر میرا انتقال ہو جائے تو میری نعش کو نہ روکا جائے۔'' یہ فحش غلطی ہے بلکہ ارشاد عالی یہ تھا کہ میری واپسی میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے، جو احباب حضرت قدس سرہٗ کے ارشادات سنتے رہتے تھے ان کا بیان تو یہ ہے کہ حضرت اپنے وجود کو نعش فرمایا کرتے تھے کہ اس نعش کو کہاں کہاں اٹھائے پھرتے ہو، بہت سوں نے سنا ہوگا۔ میں نے بھی بارہا یہ لفظ سنا۔ لہٰذا آپ بیتی میں جہاں جہاں لفظ نعش ہو اس کی اصلاح کر لی جائے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ صفحہ ۹۹ پر بھی یہی لفظ ہے اس کے علاوہ جہاں ملے ضرور تصحیح کریں، ان دونوں مواقع کی تصحیح تو میں نے طبع ثانی کے لیے پلیٹوں پر کرنے کو کہہ دیا ہے، لیکن جن کے پاس طبع سابق کے نسخے پہنچ گئے ہوں وہ اس کی اصلاح کر لیں کہ یہ غلطی ہے۔

ایک اہم مضمون متعلق خلفاء:

(۱۸) ایک نہایت اہم مضمون جو دس بارہ سال سے یہ ناپاک ہر رمضان میں کئی کئی مرتبہ اور بغیر رمضان کے بھی اپنے خصوصی احباب سے کہتا رہا اور کہتا رہتا ہے اور مفصل و مختصر تقریریں کرتا رہتا ہے وہ یہ کہ بیعت کی اجازت دراصل بمنزلہ مدارس کی سند کے ہے، جو تعلیم کی تکمیل یا اہلیت کی سند ہوتی ہے اس کے بعد اگر کوئی شخص علم سے فراغ کے بعد پڑھنے پڑھانے کے مشغلہ میں مشغول رہے تو علوم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اگر پڑھنے پڑھانے کے سلسلہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے سلسلہ میں مثلاً زراعت، تجارت وغیرہ میں لگ جائے تو علم سے مناسبت جاتی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اقدس حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کو اپنی سالانہ وصیت بسلسلہ خلفاء میں یہ لکھنا پڑتا تھا کہ فلاں صاحب دوسرے مشغلہ میں لگ گئے ہیں اور اس مشغلہ کو چھوڑ دیا۔ اس لیے ان کا نام خارج کرتا ہوں، چنانچہ انفاس عیسیٰ ص ۱۴۳ میں حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔ ''اجازت شیخ دلیل کمال نہیں بلکہ دلیل مناسبت ہے۔''

(حال):

از تحریر مجازیت خود شرم می آید خود بخود خیال کمال می آید

(تحقیق):

ایں اعتقاد کمال نیست کہ مضر باشد وسوسہ است کہ مضر نیست درچنیں اوقات استحضار عیوب کنند و بدل آرند کہ اجازت دلیل کمال نیست بلکہ دلیل مناسبت است۔ چنانچہ دستار فضیلت بعد فراغ کتب می بندند اگرچہ عالم کامل نہ باشد صرف مناسبت مدار ایں رسم باشد کمال بفراسخ دور است اھ، ایک دوسرے مقام پر انفاس عیسیٰ میں حضرت حکیم الامت کا ارشاد ہے کہ جیسے علوم درسیہ میں سند فراغ دی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ابھی اسی وقت کو ان علوم میں کمال کا درجہ حاصل ہو گیا۔ بلکہ محض اس ظن غالب پر سند دی جاتی ہے کہ اس کو ان علوم سے ایسی مناسبت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر وہ برابر درس و مطالعہ میں مشغول ہے تو قوی امید ہے کہ رفتہ رفتہ اس کو کمال کا درجہ بھی حاصل ہوجائے گا، پھر اگر وہ اپنی غفلت اور ناقدری سے خود ہی مناسبت اور استعداد کو ضائع کردے تو اس کا الزام سند دینے والوں پر ہرگز نہیں بلکہ خود اسی پر ہے۔ اسی طرح جو کسی کو اجازت دی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فی الحال ہی اس کو ان اوصاف میں کمال کا درجہ حاصل ہو گیا ہے، بلکہ محض اس ظن غالب پر اجازت دی جاتی ہے کہ اس کو فی الحال تو ان اوصاف میں درجہ ضروریہ حاصل ہوگیا اور اگر وہ برابر اس کی تکمیل کی فکر اور کوشش میں رہا تو قوی امید ہے کہ رفتہ رفتہ

اس کو آیندہ ان اوصاف میں کمال کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا ارشاد تو یہاں تک ہے کہ مشائخ بسا اوقات نااہل کو بھی اجازت دے دیتے ہیں۔ چنانچہ انفاس عیسیٰ میں لکھا ہے کہ ”مشائخ بعض دفعہ کسی نااہل میں شرم وحیا کا مادہ دیکھ کر اس اُمید پر اس کو مجاز کر دیتے ہیں کہ جب وہ دوسروں کی تربیت کرے گا تو اس کی لاج وشرم سے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دن کامل ہو جائے گا۔“ اسی طرح دوسرا ارشاد ہے ”بعض دفعہ غیر کامل کو مشائخ اجازت دیتے ہیں کہ شاید کسی طالب مخلص کی برکت سے اس کی بھی اصلاح ہو جائے۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پیر نااہل ہے اور اس کا مرید کوئی مخلص ہے تو طالب صادق کو تو حق تعالیٰ اس کے صدق وخلوص کی برکت سے نواز ہی دیتے ہیں، جب وہ کامل ہو جاتا ہے تو پھر حق تعالیٰ پیر کو بھی کامل کر دیتے ہیں کیونکہ یہ اس کی تکمیل کا ذریعہ بنا تھا۔“

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے نااہل کی اجازت کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے وہ بہت دقیق ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسباب بالا کی بناء پر ہر نااہل کو اجازت دی جا سکتی ہے۔ بلکہ مشائخ کے حالات میں اس قسم کی چیزیں پائی گئیں ہیں کہ بعض اوقات کسی مرید کی وجہ سے شیخ کی ترقی ہوئی اور خوب ہوئی اس کے واقعات تو متعدد مشہور ہیں۔ ایک ڈاکو تھا وہ اپنی ضعف و پیری میں شیخ بن گیا اور لوگوں کو بیعت بھی کرنا شروع کر دیا۔ اللہ کے یہاں تو اخلاص کی قدر ہے۔ یہ تو طے شدہ اور اصول موضوعہ ہے طالبین کو ان کے اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نوازا اور خوب نوازا۔ ایک مرتبہ ان طالبین کی جماعت نے شیخ سے عرض کیا کہ ہم لوگوں نے مشائخ کے مقامات کو دیکھنا شروع کیا اور سب اکابر کے مقامات معلوم ہو گئے۔ مگر حضرت کا مقام اتنا عالی ہے کہ ہم سب مل کر بھی اس کو نہیں پہچان سکے۔ اللہ تعالیٰ کے نام میں برکت تو ہوتی ہی ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا یہ مقولہ کہیں لکھوا چکا ہوں کہ اللہ کا نام چاہے کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس مصنوعی پیر پر بھی اللہ کے نام کا آخر اثر ہو کر رہا۔ وہ مریدوں کی یہ بات سُن کر رو دیا اور اس نے پھر اپنی حقیقت بیان کی اور مریدوں سے درخواست کی کہ اب تم میری مدد کرو۔ ان سب نے مل کر توجہ کی تو اللہ نے اس پیر کو بھی نواز دیا۔ اللہ والوں کی توجہ رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔ اصل چیز اخلاص ہے۔ جس کی وجہ سے پیر کا نااہل ہونا بھی مرید کے اخلاص کی بدولت اس کو مضر نہیں ہوتا۔

چنانچہ میں نے اپنے والد صاحب سے ایک قصہ سنا تھا کہ ایک ڈاکو تھا۔ جب تک شباب وقوت رہی خوب ڈاکے مارے لیکن جب ضعف وپیری لاحق ہوئی اور اعضاء نے جواب دے دیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا پیشہ اختیار کیا جائے۔ ساتھیوں نے بتلایا کہ پیری

مریدی ایک ایسا پیشہ ہے جس میں بے محنت مشقت خوب مزے اُڑتے ہیں۔ قصہ تو طویل ہے اور شاید میں اسے اور اس قسم کے بعض اور قصے اپنے رسائل میں لکھ بھی چکا ہوں۔ اس مصنوعی پیر کی لغویات کے ساتھ ساتھ ایک سچا طالب اس کے پاس پہنچا۔ یہ اپنے لغویات میں مشغول تھا۔ مگر اس کی طلب اور صدق نیت نے پیر کی خرافات کی طرف توجہ بھی نہ ہونے دی۔ اس نے جا کر بہت ادب سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں آپ سے اللہ کا راستہ سیکھنے آیا ہوں، وہ چونکہ غلطی سے ناوقت پہنچ گیا تھا اس لیے وہ اس کے بے وقت آنے پر بہت ناراض ہوا اور کہا کہ اللہ کا راستہ یوں نہیں آتا۔ یہ کہہ کر اس کو ایک پھاوڑا دیا اور کہا کہ فلاں باغ میں اس کی گولوں کو صاف کرو۔ اس کی ڈولیں بناؤ اور نالیاں درست کرو۔

وہ اسی وقت پھاوڑا لے کر تحقیق کرتا ہوا اس باغ میں پہنچا اور اس کی مرمت شروع کر دی باغ والے مزاحم ہوئے کہ تو ہمارے باغ میں کیوں دخل دیتا ہے اس نے بہت منت خوشامد کر کے کہا کہ مجھے تمہارے باغ سے کچھ لینا نہیں ہے مجھے میرے پیر نے اس باغ کے صاف کرنے کو اور مرمت کرنے کو کہا ہے۔ اول اول تو وہ لوگ بہت ڈرتے رہے اس کو مارا پیٹا بھی۔ مگر یہ دیکھ کر یہ نہ کھانے کو مانگتا ہے نہ اور کچھ جو کچھ روکھی سوکھی ہوتی ہے وہ کھالیتا ہے۔ تین مہینے اسی حال میں گزر گئے۔
مشہور یہ ہے کہ ابدال میں سے جب کسی کا انتقال ہوتا ہے تو غوث وقت کی مجلس میں اس کا بدل منتخب ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی ابدال کا انتقال ہوا اور غوث کی مجلس میں انتخاب کے لیے ابدال حضرات نے اپنی اپنی رائے سے لوگوں کے نام بتلائے حضرت غوث نے سب کے نام سن کر یہ کہا کہ ایک نام ہمارے ذہن میں بھی ہے اگر تم پسند کرو۔ سب نے عرض کیا ضرور ارشاد فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ فلاں فلاں مالی بڑا مخلص ہے سچی طلب رکھتا ہے۔ بہت اخلاص سے مجاہدہ میں مشغول ہے۔ سب نے اس رائے کو بہت پسند کیا۔ پھر سب نے مع حضرت غوث اس پر توجہ ڈالی۔ جس کی وجہ سے اسی وقت اس پر انکشافات ہوئے اور طی الارض کرتا ہوا اور پھاوڑا باغ والوں کے یہ کہہ کر حوالہ کر دیا کہ یہ فلاں پیر صاحب کا ہے جو فلاں گاؤں میں رہتے ہیں اور میں جا رہا ہوں ہر چندان لوگوں نے خوشامد منت سماجت کی کہ ذرا اپنا حال تو بتلا دے مگر اس نے کچھ نہیں بتلایا اور کہا سنا معاف کرا کر وہیں سے غائب ہو گیا۔

یہی مطلب ہے اس مشہور مقولہ کا کہ ''پیر من خس است اعتقاد من بس است۔'' اللہ تعالیٰ کے یہاں اخلاص کی قدر ہے۔ خود اس سیہ کار کو میرے حضرت مرشدی قدس سرہٗ نے میرے ایک عریضہ کے جواب میں لکھا تھا کہ میری کوئی حقیقت نہیں میری مثال نل کی سی ہے جتنی طلب ہو گی اتنا ہی مبدا فیاض سے عطاء ہو گا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آئے گا نل ہی کے ذریعہ، یہ مضمون لطیف

بھی ہے اور دقیق بھی بعض لوگوں کو مشائخ حقہ کے بعض خلفاء پر بھی اشکال ہوتا ہے کہ اس کو کیوں اجازت مل گئی۔ مشائخ حقہ کے خلفاء پر اعتراض نہ کرنا چاہیے کہ یہ درحقیقت مشائخ حقہ ہی پر اعتراض ہے۔ ہمیں اور تمہیں کیا معلوم مشائخ نے کس باریک بینی اور دور اندیشی سے اس کو اجازت دی ہے۔ تم زائد سے زائد یہ تو کر سکتے ہو کہ اگر تم کو ان سے اعتقاد نہیں تو مرید نہ ہونا۔ نیز اس کے ساتھ یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ مشائخ کے یہاں اجازت کے بھی مختلف طرق ہوتے ہیں۔

شیخ الطائفہ قطب الاقطاب شیخ المشائخ حضرت الحاج امداد اللہ صاحب کا ارشاد ہے کہ میرے خلفاء دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کو میں نے از خود بلایا درخواست اجازت دی ہے وہی اصل خلفاء ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے درخواست کی کہ اللہ کا نام بتلا دوں؟ میں نے کہا بتلا دیا کرو، یہ اجازت پہلے درجہ کی نہیں ہے۔ اھ ہمارے حضرت مولانا الحاج الشاہ عبد القادر صاحب کے یہاں بھی یہ دونوں طریقے رائج تھے کہ بعض کو بیعت کی اجازت دے دیا کرتے تھے اور بعض کو یہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا نام بتلا دیا کرو۔

میرے سامنے ایک واقعہ پیش آیا میں اس وقت حضرت کی خدمت میں حاضر تھا ایک جگہ کے چند معزز حضرات تشریف لائے ان میں سے ایک صاحب کے متعلق انہیں کے ساتھیوں نے پوچھا کہ یہ حضرت کے خلیفہ ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے صفائی سے ارشاد فرمایا کہ نہیں، میں نے اجازت نہیں دی۔ ان صاحب نے کہا کہ حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی اللہ کا نام پوچھے تو بتلا دینا حضرت نے فرمایا کہ یہ خلافت یا اجازت ہوئی؟ اور حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو باقاعدہ مجازین کے دو طبقے تھے۔ ایک مجازین بالبیعت دوسرے مجاز بالصحبۃ مضمون تو یہ بہت طویل ہے اور شاید میرے دوستوں کے پاس اس قسم کے مضامین جو میں نے مختلف مجالس میں کہے ہیں، کچھ اضافہ کے ساتھ لکھے ہوئے بھی ہوں۔ بہر حال مقصود یہ تھا کہ اجازت کا نہ تو گھمنڈ ہونا چاہیے نہ اس کو دلیل کمال یا دلیل تکمیل سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اجازت کے بعد تو محنت و مشقت میں اور اضافہ ہونا چاہیے۔ حضرت قطب الارشاد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کو اعلیٰ حضرت نے بیعت کرنے کے آٹھویں روز خلافت و اجازت عطاء فرما دی تھی اور فرمایا تھا کہ میاں مولوی رشید احمد جو نعمت حق تعالیٰ نے مجھے دی تھی وہ آپ کو دے دی آئندہ اس کو بڑھانا آپ کا کام ہے۔ حضرت قطب العالم قدس سرہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں اس وقت بہت ہی متعجب ہوا کہ حضرت کیا فرماتے ہیں وہ کون سی چیز ہے جو اعلیٰ حضرت کو حق تعالیٰ نے دی تھی اور مجھے عطاء ہوئی۔ آخر پندرہ برس کے بعد معلوم ہوا کہ کیا تھا۔ (تذکرۃ الرشید جلد اول)

تذکرۃ الرشید یہ میں لکھا ہے کہ بیعت کے وقت حضرت قدس سرہٗ نے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا کہ مجھ سے ذکر وشغل اور محنت ومجاہدہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ اعلیٰ حضرت نے تبسم کے ساتھ فرمایا ''اچھا کیا مضائقہ ہے۔'' اس تذکرہ پر کسی خادم نے دریافت کیا کہ حضرت پھر کیا ہوا؟ آپ نے جواب دیا اور عجیب ہی جواب دیا کہ ''پھر تو مرمٹا'' فقط حضرت نے بالکل صحیح فرمایا شیخ المشائخ ہونے کے بعد آخر زمانے تک سنا ہے کہ ذکر بالجہر نہیں چھوڑا۔ میں نے اپنے اکابر میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو شدید بیماری سے کچھ پہلے تک اور حضرت شیخ الاسلام اور اپنے چچا جان کو دیکھا کہ بہت اہتمام سے ذکر بالجہر کرتے رہے اور مشائخ سلوک کا تو یہ مقولہ مشہور ہے کہ ''جس چیز کی برکت سے یہاں پہنچے اب اس کو چھوڑتے ہوئے شرم آتی ہے''۔ بہرحال خلافت واجازت نہ تو کسی عُجب اور بڑائی کا سبب ہونا چاہیے اور نہ اس کے بعد تساہل یا تغافل ہونا چاہیے کہ اس سے یہ دولت جاتی رہتی ہے۔ اکابر کے یہاں اجازت کے بارے میں مَیں نے اپنے مشائخ کو دوطریقوں پر پایا ہے۔ بعض اکابر کے یہاں تسہیل پائی جیسے کہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب کے یہاں اور حضرت حکیم الامت کے کلام میں بھی گزر چکی ہے اور بعض حضرات کے یہاں تشدد تھا۔ چنانچہ حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ کے یہاں، حضرت کے بعض خدام نے عرض کیا کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے بیعت کی اجازت فرمادی۔ لیکن حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ میرے یہاں تو ابھی کچھ کام کرنا پڑے گا۔ حضرت گنگوہی کے خلفاء میں بھی حضرت سہارنپوری وحضرت شیخ الہند کے یہاں بہت تشدد تھا۔ حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کے یہاں اولاً گو تشدد تھا، لیکن پھر آخر میں تسہیل پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ اس ناکارہ کے ذہن میں یہ ہے کہ صوفیہ کے یہاں نسبت کے چار درجے ہیں، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

سلوک کی نسبت چار قسمیں:

لیکن نسبت کی حقیقت کے متعلق حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد عام فہم ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''نسبت کے لغوی معنی ہیں لگاؤ وتعلق کے اور اصطلاحی معنی ہیں بندہ کا حق تعالیٰ سے خاص تعلق، اطاعت دائمہ وذکر غالب اور حق تعالیٰ کا بندہ سے خاص قسم کا تعلق یعنی قبول و رضا۔ جیسا عاشق مطیع اور وقار معشوق میں ہوتا ہے اور صاحب نسبت ہونے کی یہ علامت تحریر فرمائی کہ اس شخص کی صحبت میں رغبت ''الی الآخرہ'' اور ''نفرۃ عن الدنیا'' کا اثر ہو اور اس کی طرف دینداروں کی زیادہ توجہ ہو اور دنیاداروں کی کم۔ مگر یہ پہچان خصوصاً اس کا جزء اول عوام میں مجوبین

کو کم ہوتی ہے اہلِ طریق کو زیادہ جب نسبت کے معنی معلوم ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ فاسق و کافر صاحبِ نسبت نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ غلطی سے نسبت کے معنی خاص کیفیات کو (جو ثمرہ ہوتا ہے ریاضت ومجاہدہ کا) سمجھتے ہیں۔ یہ کیفیت ہر مرتاض میں ہو سکتی ہے۔ مگر یہ اصطلاح جہلاء کی ہے۔ فقط (انفاس عیسیٰ) اس سے معلوم ہوا کہ نسبت ایک خاص نوع کے تعلق کا نام ہے اور جس قدر تعلق قوی ہوگا اسی قدر نسبت بھی قوی ہوگی۔ عمومی نسبت تو ہر مسلمان کو اللہ جل شانہ سے ہے، لیکن یہ نسبت خاص قسم کی محبت اور خصوصی تعلق کا ثمرہ ہوتا ہے اور جیسا کہ محبت کے مراتب اور عشق کے درجات ہوتے ہیں ایسے ہی اس نسبت کے درجات بھی نہایت متفاوت اور کم وبیش ہوتے رہتے ہیں اس کا منتہیٰ تو دریائے عشق میں ڈوب جانا ہے۔

عبث ہے جستجو بحر محبت کے کنارے کی
بس اس میں ڈوب ہی جانا ہے اے دل پار ہو جانا

لیکن شیخ المشائخ حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں نسبت کی چار قسمیں فرمائی ہیں۔ جو سمجھنے کے اعتبار سے اور ایک دوسرے کو ممیّز کرنے کے واسطے بہت مفید ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد تو فارسی میں ہے اور اس مضمون کو یہ ناکارہ لامع الدراری کے حاشیہ پر عربی میں لکھ چکا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ صوفیاء کی اصطلاح میں نسبت کی چار قسمیں ہیں۔

اول نسبت انعکاس:

سب سے ابتدائی تو انعکاسی کہلاتی ہے یعنی ذکر وشغل کی کثرت سے دل کا زنگ دور کرنے کے بعد اس میں آئینہ کی طرح سے ایسی صفائی اور شفافی پیدا ہو جائے کہ اس میں ہر چیز کا عکس آئینہ کی طرح ظاہر ہو جاتا ہو۔ یہ شخص جب شیخ کی خدمت میں جاتا ہے تو شیخ کے قلبی انوار اور اثرات کا عکس اس کے قلب پر پڑتا ہے اس کو نسبت انعکاسی کہتے ہیں۔ اس کا اثر سالک کے قلب پر اس وقت تک رہتا ہے جب تک شیخ کے پاس رہے یا اس ماحول میں رہے۔ لیکن جب شیخ کی مجلس یا وہ ماحول ختم ہو جاتا ہے تو یہ اثر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بندہ کے خیال میں اس کی مثال فوٹو کی سی ہے کہ اس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے ہو اور جب اس کو ہٹا لیا جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے لیکن فوٹو کی طرح سے اس کو مصالحہ وغیرہ کے ذریعہ سے پختہ کرایا جائے تو وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس نسبت پر بھی بعض مشائخ اجازت دے دیتے ہیں جس کے متعلق حضرت تھانوی کے کلام سے اوپر گزر چکا ہے کہ اگر مجاہدہ وریاضت سے اس کو باقی رکھا جائے تو باقی رہتا ہے بلکہ مزید پختہ

ہو جاتا ہے بندہ کے خیال میں یہی وہ درجہ ہے جس کو حضرت تھانوی نے بایں مضمون لکھا ہے کہ "بعض مرتبہ غیر کامل کو بھی مجاز بنادیا جاتا ہے۔ اس کو جو ناقص یا نااہل کہا گیا ہے وہ کمال کے اعتبار سے ہے اس درجہ کی اجازت جس کو حاصل ہوتی ہے اس کو بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ یہ باقی رہے بلکہ ترقی کر سکے۔

دوسری نسبت القائی:

دوسرا درجہ جس کو حضرت شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے وہ نسبت القائیہ جس کی مثال حضرت نے لکھی ہے کہ کوئی شخص چراغ لے کر اس میں تیل اور بتی ڈال کر شیخ کے پاس لے جائے اور اس کے عشق کی آگ سے لو لگائے۔ حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ درجہ پہلے سے زیادہ قوی ہے اور اس درجہ والے کے واسطے شیخ کی مجلس میں رہنے کی شرط نہیں بلکہ شیخ کی مجلس سے غائب بھی ہو جائے تو یہ نسبت باقی رہتی ہے اور جب تک تیل اور بتی رہے گی یعنی اوراد و اشغال کا اہتمام رہے گا کہ یہی چیزیں اس مشعل ہدایت کی تیل اور بتیاں ہیں اس وقت تک یہ نسبت باقی رہے گی۔ اس نسبت کے لیے تیل بتی تو اذکار و اشغال ہیں اور بادِ مخالف یعنی معاصی وغیرہ سے حفاظت بھی ضروری ہے۔ کہ بادِ مخالف سے چراغ گل ہو جایا کرتا ہے۔ یہاں ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ جس درجہ کی تیل بتی میں قوت ہوگی اتنے ہی درجہ کی مخالف ہوا کو برداشت کر سکے گی۔ یعنی اگر معمولی سا چراغ ہے تو ہوا کے ذرا سے جھونکے سے بجھ جائے گا گویا ذرا سی معصیت سے ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر چراغ قوی ہے تو معمولی ہوا اس کو گل نہیں سکتی۔ بندہ کے خیال میں اس جگہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہر شخص کو اپنی حفاظت تو نہایت اہتمام سے کرنی چاہیے۔ مبادا کسی معصیت کے سرزد ہونے سے یہ بجھ جائے، لیکن اگر کسی دوسرے صاحب نسبت کے متعلق کسی واقعی یا غیر واقعی معصیت کی خبر سُنی تو ہرگز اس کی فکر میں نہ رہے، نہ اس کے شیخ پر اعتراض کی فکر کرے، نہ معلوم اس کی مشعل کس قدر تیز ہو، بندہ کے خیال میں میرے اکابر کی اکثر اجازتیں اسی نسبت القائی پر ہیں۔ چنانچہ بہت سے اکابر اور ان کے مجازین کے حالات میں یہ دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ جب ان کو اجازت دی گئی تو ایک بجلی سی ان میں کوند گئی، جس کے اثرات مختلف ظاہر ہوئے۔ بندہ کے خیال میں یہ بجلی کی سی جو کیفیت کوندتی ہے، یہ شیخ کی نسبت کا القا ہوتا ہے، جس کے بہت سے مظاہر دیکھے اور سنے ہیں یہ نسبت پہلی نسبت کے بمقابل زیادہ قوی ہوتی ہے۔ لیکن دو چیزوں کی اس میں بہت ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تیل بتی کے بقا اور اس کے اہتمام کی یعنی اوراد و اشغال کی دوسرے بادِ صرصر سے حفاظت کی اگرچہ معمولی سی ہوا اس کو ضائع نہیں کرتی، لیکن معمولی ہوا بھی ایک دم تیز ہو جاتی ہے اور معمولی معصیت بھی ایک دم کبیرہ بن جاتی ہے۔

تیسری نسبت اصلاحی:

تیسرا درجہ جو حضرت شیخ المشائخ نے لکھا ہے وہ نسبت اصلاحی کا ہے۔ حضرت نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ یہ نسبت دونوں سے بہت قوی ہے۔ حضرت نے اس کی مثال لکھی ہے کہ ایک شخص نہر کھودے اور اس کو خوبصورت بنائے اور اس کی ڈولیں درست کرے اور اس کو کھود کر اس کا دہانہ کسی دریا سے ملا دے۔ اس دریا سے پانی کا دھارا زور شور سے اس نہر میں آجائے کہ معمولی عارض بھی پتے ٹہنیاں معمولی اینٹ روڑے اس کے پانی سے سیل کو نہیں روک سکتے بلکہ اس کے ساتھ بہتے چلے جائیں گے، الا یہ کہ کوئی نقب اس نہر میں لگ جائے یا کوئی چٹان اس نہر میں آکر حائل ہو جائے۔ بندہ کا خیال ہے کہ قدماء کی اجازتیں زیادہ تر اسی پر ہوتی تھیں کہ وہ اولاً تزکیہ نفوس واخلاق پر بہت زور لگاتے تھے اور جب نفس مزکی ہو جاتا تھا اس کے بعد اوراد و اذکار کی تلقین کے بعد اجازت مرحمت فرمایا کرتے تھے۔ اکابر کے مجاہدات اور تزکیہ کے قصے اگر لکھے جائیں تو بڑا دفتر چاہیے اور وہ آپ بیتی بھی نہیں ہے۔ صرف مثال کے لیے شاہ ابوسعید صاحب گنگوہی قدس سرہٗ جو مشائخ چشتیہ کے مشاہیر مشائخ میں سے ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کے پوتے ہیں، جن کا مزار شریف گنگوہ شریف میں موجود ہے کا واقعہ مختصر طور پر لکھواتا ہوں۔ واقعہ تو جیسا اکابر سے سنا اور کتب تواریخ میں پڑھا بھی زیادہ طویل ہے، لیکن ارواح ثلٰثہ میں اس کو حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی روایت سے مختصر نقل کیا ہے، اس کو بعینہٖ نقل کراتا ہوں۔

ایک روز فرمایا کہ شاہ ابوسعید گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ بغرض بیعت شاہ نظام الدین بلخی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بلخ تشریف لے گئے۔ شاہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہوئی کہ صاحبزادہ تشریف لاتے ہیں تو ایک منزل پر آکر استقبال کیا اور بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ لے کر بلخ پہنچے وہاں پہنچ کر صاحبزادہ صاحب کی خوب خاطریں کیں۔ ہر روز نئے نئے اور لذیذ سے لذیذ کھانے پکوا کر کھلائے، ان کو مسند پر بٹھاتے خود خادموں کی جگہ بیٹھتے۔ آخر شاہ ابوسعید نے اجازت چاہی کہ وطن واپس ہوں تو شاہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے اشرفیاں بطور نذر پیش کیں، اس وقت شاہ ابوسعید نے عرض کیا کہ حضرت اس دنیوی دولت کی مجھے ضرورت نہیں ہے نہ اس کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے تو وہ دولت چاہیے جو آپ ہمارے یہاں سے لے کر آئے ہیں۔

بس اتنا سننا تھا کہ شاہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ آنکھ بدل گئے اور جھڑک کر فرمایا کہ جاؤ طویلہ میں جا کر بیٹھو اور کتوں کے دانہ راتب کی فکر رکھو۔ غرض یہ طویلہ میں آئے، شکاری کتے ان کی تحویل

میں دے دیئے گئے کہ روز نہلائیں دھلائیں اور صاف ستھرا رکھیں، کبھی حمام جھکوایا جاتا اور کبھی شکار کے وقت شیخ گھوڑے پر سوار ہوتے اور یہ کتوں کی زنجیر تھام کر ہمراہ چلتے۔ آدمی سے کہہ دیا گیا کہ یہ شخص جو طویلہ میں رہتا ہے اس کو دو روٹیاں جو کی دونوں وقت گھر سے لا کر دیا کرو۔ اب شاہ ابوسعید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جب کبھی حاضر خدمت ہوتے تو شیخ نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے، چماروں کی طرح دور بیٹھنے کا حکم فرماتے اور التفات بھی نہ فرماتے تھے کہ کون آیا اور کہاں بیٹھا۔ تین چار ماہ بعد ایک روز حضرت شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ آج طویلہ کی لید جمع کر کے لے جائے تو اس دیوانے کے پاس سے گزرے جو طویلہ میں بیٹھا رہتا ہے۔ چنانچہ شیخ کے ارشاد کے بموجب بھنگن نے ایسا ہی کیا۔ پاس سے گزری کہ کچھ نجاست شاہ ابوسعید پر پڑی۔ شاہ ابوسعید کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ تیوری چڑھا کر بولے، ''نہ ہوا گنگوہ ورنہ اچھی طرح مزا چکھاتا۔'' غیر ملک ہے شیخ کے گھر کی بھنگن ہے اس لیے کچھ نہیں کر سکتا''۔

بھنگن نے قصہ حضرت شیخ سے عرض کر دیا۔ حضرت نے فرمایا، ہاں ابھی بو ہے صاحبزادگی کی۔ پھر دو ماہ تک خبر نہ لی۔ اس کے بعد بھنگن کو حکم ہوا کہ آج پھر ویسا ہی کر، بلکہ قصداً کچھ غلاظت شاہ ابوسعید پر ڈال کر جواب سنے کہ کیا ملتا ہے۔ چنانچہ بھنگن نے پھر ارشاد کی تعمیل کی۔ اس مرتبہ شاہ ابو سعید نے کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا، ہاں تیز اور ترچھی نگاہ سے اس کو دیکھا اور گردن جھکا کر خاموش ہو رہے۔ بھنگن نے آکر حضرت شیخ سے عرض کیا کہ آج تو میاں کچھ بولے نہیں، تیز نظروں سے دیکھ کر چپ ہو رہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا، ابھی بُو باقی ہے۔ پھر دو چار ماہ کے بعد بھنگن کو حکم دیا کہ ''اس مرتبہ لید گوبر کا بھرا ٹوکرا سر پر پھینک ہی دینا کہ پاؤں تک بھر جائیں۔'' چنانچہ بھنگن نے ایسا ہی کیا۔ مگر اب شاہ ابوسعید بن چکے تھے جو کچھ بننا تھا۔ اس لیے گھبرا گئے اور گڑگڑا کر کہنے لگے، ''مجھ سے ٹھوکر کھا کر بیچاری گر گئی کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟'' یہ فرما کر گری ہوئی لید جلدی جلدی اُٹھا کر ٹوکرہ میں ڈالنی شروع کی کہ لا میں بھر دوں۔''

بھنگن نے قصہ حضرت شیخ سے آ کر کہا کہ آج تو میاں جی غصہ کی جگہ اُلٹے مجھ پر ترس کھانے لگے اور لید بھر کر میرے ٹوکرے میں ڈال دی، شیخ نے فرمایا، ''بس اب کام ہو گیا۔'' اسی دن شیخ نے خادم کی زبانی کہلا بھیجا کہ آج شکار کو چلیں گے۔ کتوں کو تیار کر کے ہمراہ ہونا۔ شام کو شیخ گھوڑے پر سوار خدام کا مجمع جنگل کی طرف چلے۔ شاہ ابوسعید کتوں کی زنجیر تھامے پا بہ رکاب ہمراہ ہو لیے۔ کتے تھے زبردست شکاری کھاتے پیتے توانا اور ابوسعید بے چارے سوکھے بدن کمزور، اس لیے کتے ان سے سنبھالے سنبھلتے نہ تھے۔ بہتیرا کھینچتے روکتے مگر وہ قابو سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ آخر انہوں نے زنجیر اپنی کمر سے باندھ لی، شکار جو نظر پڑا تو کتے اس پر لپکے۔ اب شاہ ابوسعید بے

چارے گر گئے اور زمین پر گھسٹتے کتوں کے کھنچے کھنچے چلے جاتے تھے۔ کہیں اینٹ لگی کہیں کنکر چبھی، بدن سارا لہولہان ہوگیا۔ مگر انہوں نے اُف نہ کی۔ جب دوسرے خادم نے کتوں کو روکا اور ان کو اُٹھایا تو یہ تھر تھر کانپے کہ حضرت خفا ہوں گے اور فرمائیں گے حکم کی تعمیل نہ کی، کتوں کو روکا کیوں نہیں؟ شیخ کو تو امتحان منظور تھا سو ہولیا۔

اسی شب شیخ نے اپنے مرشد قطب العالم شیخ عبدالقدوس کو خواب میں دیکھا کہ رنج کے ساتھ فرماتے ہیں، ''نظام الدین میں نے تجھ سے اتنی کڑی محنت نہ لی تھی جتنی تو نے میری اولاد سے لی۔'' صبح ہوتے ہی شاہ نظام الدین نے شاہ ابوسعید رحمہما اللہ کو طویلہ سے بلا کر چھاتی سے لگایا اور فرمایا کہ خاندانِ چشتیہ کا فیضان میں ہندوستان سے لے کر آیا تھا۔ تم ہی ہو جو میرے پاس سے اس فیضان کو ہندوستان لیے جاتے ہو۔ مبارک ہو وطن جاؤ۔ غرض مجازِ حقیقت بنا کر ہندوستان واپس فرمایا۔

ارشاد الملوک میں لکھا ہے کہ جب مرید توبہ کے مقام کو صحیح کر چکے اور ورع وتقویٰ کے مقام میں قدم مضبوط جما کر زہد کے مقام میں قدم رکھے اور اپنے نفس کو ریاضت و مجاہدات سے ادب دے چکے تو اس کو خرقہ پہننا جائز ہوجاتا ہے فقط۔ اسی وجہ سے وہ حضرات اپنے خلفاء کو اجازت دینے کے بعد مختلف اقالیم میں منتقل کر دیا کرتے تھے اور وہاں کی اصلاح ان کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ ایسے درجہ کے لوگوں کو مشائخ کی خدمت میں کثرت سے حاضری کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''شیخ کے ہوتے ہوئے اس سے استغناء بعد تکمیل بھی نہ چاہیے۔ کیونکہ گو مجاز ہوجانے کے بعد شیخ سے سلسلۂ استفادہ جاری رکھنا درجہ ضرورت میں نہ رہے، لیکن ترقیات کے لیے تو پھر بھی اس کی حاجت رہتی ہے بلکہ اکثر احوال میں یہ افادہ درجۂ ضرورت میں بھی رہتا ہے۔ لہٰذا شیخ حق سے استغناء کسی حال میں بھی نہ چاہیے اور جنہوں نے اپنے کو مستقل سمجھ لیا ان کی حالت ہی متغیر ہوگئی۔ اھ (انفاس عیسیٰ)

مطلب یہ ہے کہ ضرورت استفادہ دوسری چیز ہے اور استغناء دوسری چیز ہے یعنی اپنے کو شیخ سے مستغنی اور اپنے کو مستقل سمجھے تو یہ یقیناً مضر ہے، بلکہ بعض اوقات کمال کے بعد بھی کبھی کبھی احتیاج پیش آجاتی ہے۔ اسی بنا پر میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کو بارہا کہتے ہوئے سنا اور بعض خطوط میں خود ہی اس ناکارہ سے لکھوایا کہ میرے بعد اگر کہیں مشورہ کی نوبت آجائے تو فلاں فلاں سے کرتے رہیں۔ البتہ یہاں ایک نہایت اہم بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ شیخ سے یا جن لوگوں کا شیخ نے نام بتایا ہے یا جو شیخ کے مسلک پر ہوں اور دلالۃ حال سے ان سے رجوع و مشورہ شیخ سے رجوع و مشورہ کے خلاف نہ ہو ایسے لوگوں کی طرف رجوع کیا جائے اور مشورہ لیا جائے

اور جن کا مسلک شیخ کے مسلک کے خلاف ہو اندازہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ شیخ ان سے رجوع یا مشورہ کو پسند نہ کریں گے تو ان سے رجوع نہ کرنا چاہیے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی انفاس عیسیٰ میں تحریر فرمایا ہے کہ شیخ کے ماسوا دوسرے شیخ کی خدمت میں دو شرط سے جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کا مذاق شیخ کے مذاق کے خلاف نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس سے تعلیم وتربیت میں سوال نہ کرے فقط اور عوام کے لیے اس سے بھی زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ شیخ کی زندگی میں سلوک اور احوال کے متعلق کسی دوسرے سے رجوع نہ کرے۔ بجز اس کے کہ خود شیخ سے قولاً یا دلالۃً ان سے رجوع کرنے کی اجازت ہو اور بعض جاہل جو اس فن سے بالکل ہی نابلد ہیں اور بالکل ہی احمق ہیں وہ یہ ظلم کرتے ہیں، جس کا آج کل بہت زور ہو رہا ہے کہ بیک وقت کئی کئی مشائخ سے بیعت ہو جاتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں وہیں بیعت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس زمانہ میں مشائخ کو بھی اس پر تنبیہ کر دینی چاہیے کہ جو شخص اہلِ حق میں سے کسی ایسے شخص سے مرید ہو کہ وہ ابھی حیات ہے تو دوسرے سے بیعت نہ ہو۔ اس مرتبہ میں حضرت شاہ صاحب نے جو تحریر فرمایا ہے کہ معمولی عارض پتے ٹہنیاں معمولی اینٹ روڑے اس کے پانی کے سیل کو نہیں روک سکتے، بندہ کے خیال میں اس سے مراد حیوانی تقاصیر ہیں۔ شیطانی تقاصیر بہت سخت ہیں، وہ بمنزلہ چٹان کے ہیں۔ جس کو میں اپنے رسالے، اسٹرائک میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور اسی درجہ میں شیخ کی ناراضی اور اس کا تکدر بھی داخل ہے۔ میں رسالہ اسٹرائک میں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ ہمارے سلسلہ کا مدار عقیدت اور محبت پر ہے یعنی شیخ کی طرف سے محبت اور مرید کی طرف سے عقیدت ہو۔ مشائخ سلوک کا مشہور مقولہ ہے کہ شیخ کی معمولی ناراضی اتنی مضر نہیں ہوتی جتنی مرید کی طرف سے عقیدت میں کوتاہی مضر ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ نے انفاس عیسیٰ میں تحریر فرمایا ہے کہ طریق باطن میں اعتراض اس قدر برا ہے کہ بعض اوقات کبائر سے برکات منقطع نہیں ہوتے، مگر اعتراض سے فوراً منقطع ہو جاتے ہیں، اس طریق میں یا تو کامل اتباع کرے ورنہ علیحدگی اختیار کرے:

از خدا خواہیم توفیق ادب ادب محروم گشت از فضل رب

بے ادب تنہا نہ خود را وشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

دوسری جگہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے والا برکات باطنی سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ شیخ کے ساتھ جو نسبت ہوتی ہے کیا وہ بھی قطع ہو جاتی ہے، فرمایا کہ ہاں! شیخ کے ساتھ جو نسبت ہوتی ہے وہ بھی قطع ہو جاتی ہے۔ گستاخی بڑی خطرناک چیز ہے گو معصیت نہیں ہے مگر خاص اثر اس کا معصیت سے بھی زیادہ ہے اس طریق میں سب

کوتاہیوں کا تحمل ہو جاتا ہے، مگر اعتراض اور گستاخ کا نہیں ہوتا:

ہر کہ گستاخی کند اندر طریق گردد اندر وادی حسرت غیرق

لہر کہ بیباکی کند در راہ و دوست رہزن مرداں شد و نامرد اوست

اس نسبت والے اکابر مشائخ سے اگر کوئی لغزش عوام کی نگاہ میں محسوس ہو تو اس پر اعتراض ہرگز نہ کریں، کیا بعید ہے کہ اس لغزش کو ان کی نسبت کا سیلاب بہائے لیے چلا جائے اور تم اس کی عیب جوئی اور لغزشوں پر نگاہ کر کے اپنے کو ہلاکت میں ڈال دو۔ چنانچہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تو ایک اہم وصیت فرمائی ہے جو ابوداؤد شریف میں بہت تفصیل سے ہے۔ اس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ حکیم سے بھی بعض باتیں گمراہی کی نکل جاتی ہیں اور منافق بھی بعض مرتبہ کلمۃ الحق کہہ دیتا ہے۔ شاگرد نے عرض کیا اللہ آپ پر رحم کرے ہمیں کس طرح معلوم ہو کہ یہ حکیم کی بات گمراہی کی ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ حکیم کی ایسی باتوں سے اجتناب کرو جس کو لوگ (علماء حق) یوں کہیں کہ فلاں نے یہ بات کیسے کہہ دی۔ لیکن یہ بات تجھ کو اس حکیم سے دُور نہ کر دے۔ کیا بعید ہے کہ وہ حکیم تو عنقریب اپنی بات سے رجوع کر لے (یا اپنے فعل سے توبہ کر لے) اور تو ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو جائے، مطلب یہ کہ علماء حقہ کی غلط بات میں پیروی تو نہ کی جائے اور نہ ہی ان کے اس قسم کے قول وفعل کا اتباع کیا جائے لیکن ان پر سب وشتم نہ کیا جائے۔ اس میں بڑے مضرات ہیں جن کو یہ ناکارہ اپنے رسالہ الاعتدال میں بہت تفصیل سے لکھ چکا ہے۔

ایک اہم اور ضروری وصیت:

یہاں نہایت ہی اہم اور نہایت ہی ضروری امر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس نسبت والے اکابر کے کسی نامناسب فعل میں اتباع ہرگز نہ کیا جائے اگرچہ یہ مضمون اُوپر بھی آچکا ہے مگر اہتمام کی وجہ سے میں دوبارہ لکھتا ہوں۔ مثلاً نسبت القائی والے ان حضرات کی کسی لغزش میں یہ سمجھ کر اتباع کریں کہ یہ امر فلاں حضرت نے بھی کیا ہے یا کہا ہے تو ان کے لیے سخت مضر ہے۔ اس لیے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ نسبت القائی والوں کے لیے ذرا سا مانع بھی ان کی نسبت کے زوال کا سبب ہوتا ہے اور اس کی نسبت والے حضرات کی لغزشیں سیلاب میں بہہ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا راتوں کے چپکے چپکے رونا صرف کفارہ بلکہ بسا اوقات "فاولئک یبدل اللہ سیاٰتھم حسنات" کا مصداق بن جاتا ہے اور نسبت القائی والا ان کی حرص کر کے اپنے کو نیچے گرا دے گا اور جب نسبت القائی والے کا یہ حال ہے تو انعکاسی والے کا تو پوچھنا ہی کیا۔ یہ بہت ہی اہم اور

قابل لحاظ بات ہے۔ میں بسا اوقات بعض مبتدیوں کو بعض منتہیوں کی لغزشوں میں حرص کر کے اپنی جگہ سے بہت دُور گرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

حضرت شاہ صاحب نے نسبت کی چوتھی قسم اتحادی بتائی ہے۔ جو سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ اپنی نسبت روحانیہ کو جو حامل کمالات عالیہ ہے۔ مرید کی رُوح کے ساتھ قوت سے متصل کر دے اور اپنی نسبت کو قوت کے ساتھ دبوچ کر یا اور کسی طرح سے مرید کے قلب میں پیوست کر دے اور گویا شیخ و مرید میں روحانی اعتبار سے کوئی فرق نہ رہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

چوتھی نسبت اتحادی:

حضرت شاہ صاحب نے اس چوتھی نسبت کی مثال میں ایک عجیب قصہ حضرت خواجہ باقی اللہ کا جو حضرت مجدد الف ثانی کے شیخ تھے ان کا مزار مقدس دہلی میں ہے، ان کے متعلق لکھا ہے، ان حضرات کو کوئی شخص ہدایا دے تو بعض اوقات بڑی گرانی سے محض ہدیہ دینے والے کی دلداری کی بنا پر قبول کرتے ہیں، لیکن جو ہدیہ غایت احتیاج کے وقت آئے اس کو بہت ہی قدر سے قبول کرتے ہیں۔ اس وقت کی دعاء بہت دل سے نکلتی ہے۔ ایسے وقت کی دعاؤں میں معطی کے لیے یہ حضرات جو کچھ مانگتے ہیں اللہ اپنے فضل سے عطاء فرما دیتے ہیں۔ ایسے وقت کی دعائیں ہر وقت نہیں ہوتیں۔ لیکن جب ہوتی ہیں تو تیر بہدف ہوتی ہیں اور بہت جلد پوری ہوتی ہیں۔ ایسی ہی دعاؤں کو دیکھ کر بعض لوگوں کو مشائخ کے متعلق یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ حضرت کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے حالانکہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اہم وقت ان حضرات کے یہاں وہ ہوتا ہے جب ان کے ہاں کوئی مہمان اللہ والا آجائے اور پاس کچھ نہ ہو اس وقت کا ہدیہ ان کے یہاں بہت قیمتی ہوتا ہے، یہ میں پہلے اکابر کے حالات میں لکھوا چکا ہوں کہ جب میرے اکابر میں سے کوئی ایک دوسرے کے یہاں مہمان ہوتا تو میزبان کی یہ خواہش ہوتی کہ جو خاطر ہو سکے کر دوں۔

بہر حال اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کے یہاں کچھ مہمان اہم آگئے، ایک بھٹیارے کی دکان حضرت کی قیام گاہ کے قریب تھی، اس بھٹیارے نے دیکھا کہ کچھ نیک قسم کے مہمان بے وقت آئے ہیں۔ اس نے بہت بڑا خوان لگا کر اور اس میں مختلف قسم کے کھانے رکھ کر حضرت خواجہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت خواجہ صاحب

نے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضرت کے یہاں کچھ مہمان آئے ہیں، میں ان کے لیے کچھ لایا ہوں قبول فرمالیں۔ حضرت کو بہت ہی مسرت ہوئی اور وہی بے اختیاری شان کے ساتھ فرمایا ''مانگ کیا مانگتا ہے''۔ اس نے عرض کیا کہ مجھے اپنے جیسا بنادو۔

حضرت نے تھوڑی دیر تامل کر کے فرمایا کہ کچھ اور مانگ لے، طباخ نے کہا کہ بس یہی چاہیے۔ چونکہ حضرت زبانِ مبارک سے یہ فرما چکے تھے کہ مانگ کیا مانگتا ہے اس لیے اس کے تین مرتبہ کے اصرار پر اس کے حجرۂ مبارکہ میں لے گئے، اندر سے زنجیر لگالی۔ اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرح سے کہ انہوں نے نزول وحی کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین مرتبہ دبوچا تھا اور ہر مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ پڑھو، دو مرتبہ کے دبوچنے میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ میں قاری نہیں اور تیسری دفعہ میں دبا کر جو حضرت جبرئیل نے بتایا وہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یا حضرت خواجہ صاحب نے کوئی اور توجہ فرمائی ہوگی آدھ گھنٹہ بعد جب حجرہ کھول کر باہر تشریف لائے تو دونوں کی صورت تک بھی ایک ہوگئی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت خواجہ صاحب تو جیسے حجرہ میں گئے تھے ویسے ہی باہر تشریف لے آئے۔ لیکن وہ طباخ سُکر (بے خودی) کی حالت میں تھا اور کچھ دیر بعد اسی حالت میں انتقال ہوگیا اللہ بلند درجے عطاء فرمائے۔ موت تو آنی ہی تھی اور اس کا جو وقت مقرر تھا اس میں تقدم وتاخر نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن اس کی خوش قسمتی کہ ساری عمر تو طباخی کی اور موت کے وقت خواجہ جیسا بن کر آخرت کے بھی مزے لوٹے۔

شاہ غلام بھیک کا واقعہ:

اسی نوع کا ایک قصہ حضرت شاہ غلام بھیک نور اللہ مرقدہٗ کا مشہور ہے کہ وہ اپنے شیخ شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ کے عاشق تھے اور جب حضرت شیخ سفر میں جاتے تو یہ بھی ہمرکاب ہوتے۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ قدس سرہٗ سہارنپور خدام کے اصرار پر تشریف لائے اور شاہ غلام بھیک بھی ہمرکاب تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ شیخ کے یہاں آج کل فاقوں پر فاقے چل رہے ہیں۔ اس لیے حضرت شیخ قدس سرہٗ کی جہاں دعوت ہوتی شاہ غلام بھیک دعوت کرنے والے سے یہ طے کر لیتے کہ دو آدمیوں کا مزید کھانا دینا پڑے گا اور روزانہ عشاء کی نماز کے ساتھ حضرت کو لٹا کر دونفر کا کھانا لے کر پاپیادہ انبہٹہ جو سہارنپور سے ۱۶ میل ہے تشریف لے جاتے اور اہلیہ کو کھانا دے کر فوراً واپس آتے اور تہجد کے وقت حضرت کی خدمت میں آجاتے۔ چندروز بعد حضرت انبہٹہ پہنچے تو اہلیہ سے پوچھا کہ کس طرح گزری تو ان کو اس سوال پر بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس مرتبہ تو آپ روزانہ کھانا بھیجا کرتے تھے پھر گزر کا سوال کیسا اور بیان کیا کہ دو گھڑی رات گزرنے پر شاہ بھیک

روزانہ کھانا دے جایا کرتے تھے۔ شیخ یہ سُن کر خاموش ہوگئے اور باہر آکر شاہ بھیک سے پوچھا تو انہوں نے صورتِ حال عرض کردی اور کہا کہ اماں جی اور صاحبزادی صاحبہ تو فاقہ کرتے اور بھیک اپنا پیٹ بھرتا، اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا، شیخ کو اس جواب پر مسرت ہوئی اور یہ فرمایا کہ تونے میرے توکل میں تو ضرور فرق ڈالا مگر خدمت کا حق ادا کردیا اور اپنی چھاتی سے لگالیا اور روحانی نعمت جو کچھ دینی تھی وہ عطاء فرمادی۔ شاہ بھیک نے اپنے قلب کو نورِ معرفت سے معمور دیکھا تو شیخ کے قدم چوم لیے اور مستانہ وار شوق میں یہ دوہا زبان سے نکلا:

بھیکا مالی پرواریاں پل میں سو سو بار
کاگا سے ہنس کیا اور کرت نہ لاگی بار

یعنی بھیک (اپنے مرشد) ابوالمعالی پر ہر آن سو سو دفعہ قربان ہو کہ انہوں نے اس کو زاغ سے ہنس بنادیا۔ (یعنی ناکارہ و نااہل سے اہل بنادیا اور ایسی جلدی بنایا کہ دیر بھی نہ لگی) ادھر سینہ سے سینہ لگا اور ادھر ولایت و معرفت الٰہیہ نصیب ہوگئی۔ اس قصہ میں دعوت میں شرط کرنے میں کوئی اشکال نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعوت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی بھی شرط فرمائی تھی۔ (تذکرۃ الخلیل جدید صفحہ ۲۹)

حضرت جبرائیل کا حضور کو دبوچنا:

سینہ سے سینہ ملا کر سب کچھ ملنے کے واقعات مشائخ کے کثرت سے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی رائے مبارک یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء وحی کے وقت تین مرتبہ دبوچنا نسبت اتحادیہ پیدا کرنے کے لیے ہے اور جس مقدس ہستی کی ابتداء ترقی حضرت جبرئیل سے اتحاد کے ساتھ شروع ہوئی ہو اس نے ۲۳ سالہ زندگی میں کہاں تک ترقی کی ہوگی اس کو تو اللہ ہی جانے یا وہ جانے جس نے یہ مراتب حاصل کیے۔ لیکن اتنا ضرور ہر آدمی بھی جانتا ہے کہ جس نے ابتداء میں تین مرتبہ دبوچ کر ابتدا کرائی تھی، تیرہ برس بعد شب معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہہ کر پیچھے رہ گئے کہ

اگر یک سرِ موئے برتر پرم فروغِ تجلی بسوزد پرم

کہ میری تو پرواز کی انتہا ہوچکی۔ اگر ایک بال برابر بھی آگے بڑھوں تو تجلی باری سے جل جاؤں گا اور پھر سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کو چھوڑ کر قاب قوسین تک پہنچ گئے اور پھر اس کے بعد زندگی کے دس سال تک کیا کیا ترقیاں کی ہوں گی اس کو وہی جانتے ہیں جن پر حقیقت محمدیہ کی حقیقت منکشف ہوگئی ہو۔ حضرت شاہ صاحب کا ارشاد تو اتنا ہی ہے کہ حضرت

جبرئیلؑ کے دبوچنے سے نسبت اتحادیہ حاصل ہوئی لیکن اس سیہ کار کا خیال یہ ہے کہ یہ سلوک تفصیلی تھا۔ غارِ حرا میں چھ ماہ تک انقطاع عن الدنیا و توجہ الی اللہ کے ساتھ قلب اطہر میں وہ صفائی اور نور تو پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا جو نسبت انعکاسی کا محل ہوتا ہے اور حضرت جبرئیل علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت دیکھ کر صفاتِ ملوکیت کا انعکاس تو شروع ہی ہو گیا تھا اور پہلی مرتبہ دبوچنے میں نسبت القائی اور دوسری مرتبہ میں نسبت اصلاحی اور تیسری مرتبہ میں نسبت اتحادی پیدا ہو کر وہ صفات ملوکیت جس کا انعکاس ابتداء وہلہ میں حاصل ہوا تھا وہ تیسری مرتبہ دبوچنے میں طبیعت ثانیہ بن گیا اور جس کی ابتداء میں فرشتوں کے خصائل بلکہ سیّد الملائکہ جبرئیلؑ کے خصائل طبیعت ثانیہ بن گئے ہوں اس کے ۲۳ سالہ مجاہدات اور تعلق مع اللہ میں کتنی ترقیات ہوئی ہوں گی۔ اگر اس کی کوئی مثال کہی جا سکتی ہے تو بس یہی ہے کہ:

میان عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبیں راہم خبر نیست

میں نے اپنے اکابر کے بعض خدام میں بھی اس نسبت اتحاد کی جھلک پائی کہ گفتگو میں، طرز کلام میں، رفتار میں، کھانے پینے کی اداؤں میں اپنے شیخ کی بہت ہی مناسبت تھی۔ مگر خود نابلد ہوں، نابالغ بلوغ کی لذتوں سے کب واقف ہوتا ہے۔ میری مثال اس شعر کی سی ہے:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ماہ مبارک قریب آ رہا ہے اور میرا کاتب آپ بیتی نمبر ۵ ختم کرنے کے واسطے مضمون مانگ رہا ہے۔ اس لیے آج ۸ شعبان ۹۱ھ کو یہ مضمون ختم کر کے کاتب کے حوالے کر رہا ہوں جو لغزشیں اس ناکارہ سے اپنی سوءِ فہم سوءِ حافظہ سے اس میں ہوئی ہوں ان کو اللہ ہی معاف فرمائے۔ دوستوں کو بہت ہی شدید اصرار بلکہ اکابر کے تقاضہ بھی اس سلسلہ کو باقی رکھنے کے ہیں کہ خالی اوقات میں کیف ما اتفق اکابر کے احوال جو بھی یاد آ جایا کریں لکھوا دیا کروں۔ مگر ضعف پیری اور امراض کی کثرت میں دل یہ چاہتا ہے کہ حدیث پاک کی کوئی خدمت بقیہ زندگی میں ہو جائے تو مالک کا احسان ہے۔ اس رسالہ کی ابتداء کیا تھی؟ عزیز مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح میں علی میاں کے ایک باب پر تنقید تھی۔ لیکن پھر اس کشکول میں نہ معلوم کیا کیا آ گیا اور اکابر کے حالات شروع میں تو مجھے بھی نہ معلوم کیا کیا یاد آتے چلے گئے ان کا حصار بھی طاقت سے باہر ہے۔ اللہ والوں کے حالات بالخصوص میرے اکابر کے حالات کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

دامان نگہ تنگ و گل حُسن تو بسیار
گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

میرے اکابر کے احوال اور ان سب گلدستوں کے مختلف پھول کو کوئی غور سے دیکھے تو تخلق باخلاق اللہ کا منظر اس گلدستہ میں خوب پائے گا بشرطیکہ اللہ نے دیدۂ عبرت عطاء فرمایا ہو:

دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا ان کا

وَمَا تَوْ فِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْب

اللّٰھم اغفرلی مَا وقع فیہ من الخطاء والزلل و ما لا ترضیٰ بہٖ من العمل فانک عفو کریم. غفو ر حلیم، رؤف الرحیم و صلی اللہ علی سیّد الاولین والاٰخرین سیّد الانبیاء والمرسلین صاحب المقام المحمود والحوض المورود والشفاعۃ الکبریٰ و من دنی فتدلّٰی و کان قاب قوسین أو أدنی و علیٰ اٰلہٖ و أصحابہٖ و أتباعہٖ حملۃ الدین المتین الیٰ یوم الدین.

و اٰخر دعونا ان الحمد لِلّٰہ ربّ العالمین

۸شعبان المکرم ۱۳۹۱ھ

......☆☆☆☆☆......

تکملہ

یہ رسالہ ماہ مبارک کے قرب کی وجہ سے اوائل شعبان میں ختم کر دیا تھا، اس ناکارہ کا معمول ماہِ مبارک میں مغرب عشاء کے درمیان مہمانوں کے کھانے سے فراغ کے بعد دوستوں سے خصوصی ملاقات کا وقت ہے۔ اس میں احباب سے خصوصی درخواستیں اہتمام سے عمل کرنے کے لیے کہتا رہتا ہوں۔ یہ نسبتوں والا مضمون بھی مختصر و مفصل ہر رمضان میں سنانے کی نوبت آتی رہتی ہے کہ ذاکرین بالخصوص جن کو اس سیہ کار نے اجازت دی ہے۔ ان کا خصوصی اجتماع ہوتا ہے۔ اس لیے خاص طور سے ان کو تنبیہ کرتا رہتا ہوں کہ اجازت سے مغرور نہ ہوں بلکہ اس کی وجہ سے ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ جس سے بہت فکر چاہیے، اس سال چونکہ اس ناکارہ کی طبیعت زیادہ ناساز تھی، بولنا دشوار تھا۔ اس وقت کچھ بجائے زبانی کہنے کے اکابر کے مضامین سے کچھ سنواتا رہا۔ انفاس عیسیٰ کے خاتمہ پر ایک نہایت اہم عبرت آموز واقعہ ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ ''حیٰوۃ الحیوان دمیری'' سے مفتی محمد شفیع صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حال ناظم دارالعلوم کراچی نے محرم ۴۰ھ میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ جو انفاس عیسیٰ سے زیادہ مفصل ہے اور اس سیہ کار نے بھی اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بارہا اس کو سنا جو دونوں سے زیادہ مفصل تھا اور نہایت ہی اہم سبق آموز عبرت انگیز ہے کہ آدمی کو بالخصوص جو کسی دینی منصب میں علمی ہو یا سلوکی یا اور کوئی دینی خدمت میں قدم رکھتا ہو اس کو اس قصہ سے زیادہ عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص عجب و گھمنڈ اور کسی دوسرے کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے اور حضرت شیخ سعدی نور اللہ مرقدہٗ کے پیر و مرشد شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ کی نصیحت کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بہت ہی جامع اور اہم ہے، وہ فرماتے ہیں:

مرا پیر دانائے روشن شہاب
دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بین مباش
دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

فرماتے ہیں کہ مجھے میرے روشن ضمیر شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے کشتی میں بیٹھے ہوئے دو نصیحتیں فرمائی تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے اُوپر کبھی خود بینی میں مبتلا نہ ہونا۔ دوسرے یہ کہ

دوسرے کے اوپر بدبینی تحقیر نہ کرنا۔ بہت اہم نصیحت ہے۔ یہ قصہ بھی جو آگے آرہا ہے خود بینی اور بدبینی کا نہایت عبرت آموز سبق ہے۔ اس سے بہت عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ حضرت تھانوی نے تو بہت مختصر لکھا جس کی ابتداء یہ ہے کہ آدمی کو ہرگز زیبا نہیں کہ آدمی اپنی حالت پر ناز کرے اور دوسروں کو حقیر سمجھے، خود نفسِ ایمان بھی اپنے اختیار میں نہیں، بس حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہم کو یہ دولت عطاء فرما رکھی ہے۔ لیکن وہ جب چاہیں سلب کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ابوعبداللہ ایک بزرگ تھے۔ بغداد میں ان کی وجہ سے تیس (۳۰) خانقاہیں آباد تھیں۔ وہ ایک بار مع اپنے مجمع کے چلے جا رہے تھے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس قصہ کو ذرا زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

شیخ اندلسی کا عبرت آموز قصہ:

ذیل کا مضمون عبرت آموز واقعہ علامہ دمیری کی ''حیٰوۃ الحیوان'' مطبوعہ مصر سے نقل کیا جاتا ہے سن ہجری کی دوسری صدی ختم پر ہے، آفتابِ نبوت غروب ہوئے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری۔ لوگوں میں امانت دیانت اور تدین وتقویٰ کا عنصر غالب ہے۔ اسلام کے ہونہار فرزند جن کے ہاتھ پر اس کو فروغ ہونے والا ہے کچھ برسرکار ہیں اور کچھ ابھی تربیت پا رہے ہیں۔ ائمہ دین کا زمانہ ہے، ہر ایک شہر علماء دین وصلحاء متقین سے آباد نظر آتا ہے۔ خصوصاً مدینۃ الاسلام (بغداد) جو اس وقت مسلمانوں کا دارالسلطنت ہے۔ اپنی ظاہری اور باطنی آرائشوں سے آراستہ گلزار بنا ہوا ہے۔ ایک طرف اگر اس کی دلفریب عمارتیں اور ان میں گزرنے والی نہریں دل لبھانے والی ہیں تو دوسری طرف علماء اور صلحاء کی مجلسیں، درس وتدریس کے حلقے ذکر وتلاوت کی دلکش آوازیں خدائے تعالیٰ کے نیک بندوں کی دلجمعی کا ایک کافی سامان ہے۔ فقہاء ومحدثین اور عُبّاد وزہاد کا ایک عجیب وغریب مجمع ہے۔ اس مبارک مجمع میں ایک بزرگ ابوعبداللہ اندلسی کے نام سے مشہور ہیں جو اکثر اہل عراق کے پیر ومرشد اور استاذ محدث ہیں۔ آپ کے مریدین کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ چکی ہے، جن کا ایک عبرتناک واقعہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کرنا ہے۔

یہ بزرگ علاوہ زاہد وعابد اور عارف باللہ ہونے کے حدیث وتفسیر میں بھی ایک جلیل القدر امام ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو تیس (۳۰) ہزار حدیثیں حفظ تھیں اور قرآن شریف کو تمام روایات قراءت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے سفر کا ارادہ کیا، تلامذہ اور مریدین کی جماعت میں سے بہت سے آدمی آپ کے ساتھ ہو لیے، جن میں حضرت جنید بغدادی اور حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہیں۔ حضرت شبلی قدس سرہٗ کا بیان ہے کہ ہمارا قافلہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے

نہایت امن و امان اور آرام و اطمینان منزل بہ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ہمارا گزر عیسائیوں کی ایک بستی پر ہوا۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ لیکن پانی موجود نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ادا نہ کر سکے تھے۔ بستی میں پہنچ کر پانی کی تلاش ہوئی۔ ہم نے بستی کا چکر لگایا۔ اس دوران میں ہم چند مندروں اور گرجا گھروں پر پہنچے جن میں آفتاب پرستوں، یہودیوں اور صلیب پرست نصرانیوں کے رہبان اور پادریوں کا مجمع تھا۔ کوئی آفتاب کو پوجتا اور کوئی آگ کو ڈنڈوت کرتا تھا اور کوئی صلیب کو اپنا قبلہ حاجات بنائے ہوئے تھا۔ ہم یہ دیکھ کر متعجب ہوئے اور ان لوگوں کی کم عقلی اور گمراہی پر حیرت کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ آخر گھومتے گھومتے بستی کے کنارے پر ہم ایک کنوئیں پر پہنچے جس پر چند نوجوان لڑکیاں پانی پلا رہی تھیں۔ اتفاق سے شیخ مرشد ابوعبداللہ اندلسی کی نظر ان میں سے ایک لڑکی پر پڑی جو خداداد حسن و جمال میں سب ہمجولیوں سے ممتاز ہونے کے ساتھ زیور اور لباس سے آراستہ تھی، شیخ کی اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ چہرہ بدلنے لگا، اس انتشار طبع کی حالت میں شیخ اس کی ہمجولیوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگے یہ کس کی لڑکی ہے؟

لڑکیاں: ''یہ اس بستی کے سردار کی لڑکی ہے۔''

شیخ: ''پھر اس کے باپ نے اس کو اتنا ذلیل کیوں بنا رکھا ہے، کنویں سے خود ہی پانی بھرتی ہے۔ کیا وہ اس کے لیے کوئی ماما نوکر نہیں رکھ سکتا جو اس کی خدمت کرے۔''

لڑکیاں: ''کیوں نہیں مگر اس کا باپ ایک نہایت عقیل اور فہیم آدمی ہے۔ اس کا مقصود یہ کہ لڑکی اپنے باپ کے مال و متاع حشم خدم پر غرہ ہو کر کہیں اپنے فطری اخلاق خراب نہ کر بیٹھے اور نکاح کے بعد شوہر کے یہاں جا کر اس کی خدمت میں کوئی قصور نہ کرے۔''

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شیخ اس کے بعد سر جھکا کر بیٹھ گئے اور تین دن کامل اس پر گزر گئے کہ نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ کسی سے کلام کرتے ہیں۔ البتہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو نماز ادا کر لیتے ہیں۔ مریدین اور تلامذہ کی کثیر التعداد جماعت ان کے ساتھ ہے، لیکن سخت ضیق میں ہیں، کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیسرے دن میں نے یہ حالت دیکھ کر پیش قدمی کی اور عرض کیا کہ ''اے شیخ! آپ کے مریدین آپ کے اس مستمر سکوت سے متعجب اور پریشان ہیں، کچھ تو فرمائیے کیا حال ہے؟''

شیخ: ''(قوم کی طرف متوجہ ہو کر) میرے عزیزو! میں اپنی حالت تم سے کب تک چھپاؤں۔ پرسوں میں نے جس لڑکی کو دیکھا ہے، اس کی محبت مجھ پر اتنی غالب آچکی ہے کہ میرے تمام اعضاء

وجوارح پر اس کا تسلط ہے۔ اب کسی طرح ممکن نہیں کہ اس سرزمین کو چھوڑ دوں۔"

حضرت شبلی: اے ہمارے سردار آپ اہلِ عراق کے پیرومرشد علم وفضل اور زہد وعبادت میں شہرۂ آفاق ہیں۔ آپ کے مریدین کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو چکی ہے، بطفیل قرآن عزیز ہمیں اور ان سب کو رسوا نہ کیجئے۔

شیخ: "میرے عزیزو! میرا اور تمہارا نصیب، تقدیر خداوندی ہو چکی ہے، مجھ سے ولایت کا لباس سلب کر لیا گیا اور ہدایت کی علامات اُٹھالی گئیں۔" یہ کہہ کر رونا شروع کر دیا اور کہا:

"اے میری قوم! قضاوقدر نافذ ہو چکی ہے۔ اب کام میرے بس کا نہیں ہے۔"

حضرت شبلی فرماتے ہیں کہ ہمیں اس عجیب واقعہ پر سخت تعجب ہوا اور حسرت سے رونا شروع کیا شیخ بھی ہمارے ساتھ رو رہے تھے، یہاں تک کہ زمین آنسوؤں کے اُمنڈ آنے والے سیلاب سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد ہم مجبور ہو کر اپنے وطن بغداد کی طرف لوٹے۔ لوگ ہمارے آنے کی خبر سُن کر شیخ کی زیارت کے لیے شہر سے باہر آئے اور شیخ کو ہمارے ساتھ نہ دیکھ کر سبب دریافت کیا۔ ہم نے سارا واقعہ بیان کیا۔

واقعہ سن کر لوگوں میں کہرام مچ گیا۔ شیخ کے مریدوں میں سے کثیر التعداد جماعت تو اسی غم و حسرت میں اسی وقت عالم آخرت کو سدھار گئی اور باقی لوگ گڑگڑا کر خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں دعائیں کر رہے کہ اے مقلب القلوب! شیخ کو ہدایت کر اور پھر اپنے مرتبہ کو لوٹا دے۔ اس کے بعد تمام خانقاہیں بند ہو گئیں اور ہم ایک سال تک ایسی حسرت و افسوس میں شیخ کے فراق میں لوٹتے رہے، ایک سال کے بعد جب ہم مریدوں نے ارادہ کیا کہ چل کر شیخ کی خبر لیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں، تو ہماری جماعت نے سفر کیا اور اس گاؤں میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں سے شیخ کا حال دریافت کیا۔

گاؤں والے: "وہ جنگل میں سور چرا رہا ہے۔"

ہم: "خدا کی پناہ یہ کیا ہوا؟"

گاؤں والے: "اس نے سردار کی لڑکی سے منگنی کی تھی۔ اس کے باپ نے اس شرط پر منظور کر لیا اور وہ جنگل میں سور چرانے کی خدمت پر مامور ہے۔"

ہم: "یہ سُن کر ششدر رہ گئے اور غم سے ہمارے کلیجے پھٹنے لگے، آنکھوں سے بے ساختہ آنسوؤں کا طوفان اُمنڈنے لگا، بمشکل تمام دل تھام کر اس جنگل میں پہنچے جہاں وہ سور چرا رہے تھے۔ دیکھا تو شیخ کے سر پر نصاریٰ کی ٹوپی ہے اور کمر میں زنار باندھی ہوئی ہے اور اس عصا پر ٹیک لگائے ہوئے خنزیروں کے سامنے کھڑے ہیں جس سے وعظ اور خطبے کے وقت سہارا لیا کرتے

تھے۔ جس نے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ شیخ نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ہم نے قریب پہنچ کر السلام علیکم کہا۔

شیخ: ''(کسی قدر دبی زبان سے) وعلیکم السلام۔''

حضرت شبلی: ''اے شیخ! اس علم و فضل اور حدیث و تفسیر کے ہوتے ہوئے آج تمہارا کیا حال ہے؟''

شیخ: ''میرے بھائیو! میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ میرے مولا نے جیسا چاہا مجھے ویسا کر دیا اور اس قدر مقرب بنانے کے بعد جب چاہا کہ مجھے اپنے دروازے سے دور پھینک دے تو پھر اس کی قضا کو کون ٹالنے والا تھا۔'' اے عزیزو! خدائے بے نیاز کے قہر و غضب سے ڈرو، اپنے علم و فضل پر مغرور نہ ہو۔ اس کے بعد آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر کہا، اے میرے مولا! گمان تو تیرے بارے میں ایسا نہ تھا کہ تو مجھ کو ذلیل و خوار کر کے اپنے دروازے سے نکال دے گا۔ یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ سے استغاثہ کرنا اور رونا شروع کر دیا۔

(میرے والد صاحب اس قصہ کو سناتے وقت یہ شعر بھی شیخ کی طرف پڑھا کرتے تھے)

بے نیازی نے تری اے کبریا
مجھ غریب و خستہ کو کیا کیا کیا؟

(غالباً یہ کسی عربی شعر کا ترجمہ کسی اردو داں شاعر نے کیا ہوگا)

اور شیخ نے آواز دے کر کہا: ''اے شبلی اپنے غیر کو دیکھ کر عبرت حاصل کر۔''

(حدیث میں ہے ''السعید من وعظ بغیرہ'' یعنی نیک بخت وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

حضرت شبلی رونے کی وجہ سے لکنت کرتی ہوئی آواز سے نہایت دردناک لہجے میں:

''اے ہمارے پروردگار ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں اور تجھ ہی سے استغاثہ کرتے ہیں۔ ہر کام میں ہم کو تیرا ہی بھروسہ ہے، ہم سے یہ مصیبت دور کر دے کہ تیرے سوا کوئی دفعہ کرنے والا نہیں۔''

خنزیران کا رونا اور ان کی دردناک آواز سنتے ہی سب کے سب وہیں جمع ہو گئے اور زمین پر مرغ بسمل کی طرح لوٹنا، تڑپنا اور چلانا شروع کر دیا اور اس زور سے چیخے کہ ان کی آواز سے جنگل اور پہاڑ گونج اٹھے۔ یہ میدان میدانِ حشر کا نمونہ بن گیا۔ ادھر شیخ حسرت کے عالم میں زار زار رو رہے تھے۔

حضرت شبلی: ''شیخ! آپ حافظ قرآن تھے اور قرآن کو ساتوں قراءت سے پڑھا کرتے تھے، اب بھی اس کی کوئی آیت یاد ہے؟''

شیخ: ''اے عزیز مجھے قرآن میں دو آیت کے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔''

حضرت شبلی: ''وہ دو آیتیں کون سی ہیں؟''

شیخ: ''ایک تو یہ ہے ''وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ. اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ'' (جس کو اللہ ذلیل کرتا ہے اس کو کوئی عزت دینے والے نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا اور دوسری یہ ہے ''وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ''۔ (جس نے ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کیا تحقیق وسیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا۔)

شبلی: ''اے شیخ! آپ کو تیس ہزار حدیثیں مع اسناد کے بر زبان یاد تھیں اب ان میں سے بھی کوئی یاد ہے۔''

شیخ: ''صرف ایک حدیث یاد ہے'' یعنی من بدل دینه فاقتلوه (جو شخص اپنا دین بدل ڈالے اس کو قتل کر ڈالو)

ہم یہ حال دیکھ کر بصد حسرت و یاس شیخ کو وہیں چھوڑ کر واپس ہوئے اور بغداد کا قصد کیا۔ ابھی تین منزل طے کرنے پائے تھے کہ تیسرے روز اچانک شیخ کو اپنے آگے دیکھا کہ نہر سے غسل کر کے نکل رہے ہیں اور با آواز بلند شہادتین ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔ پڑھتے جاتے تھے۔ اس وقت ہماری مسرت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کو اس سے پہلے ہماری مصیبت اور حسرت و یاس کا اندازہ ہو۔

شیخ: (قریب پہنچ کر) ''مجھے ایک پاک کپڑا دو اور کپڑا لے کر سب سے پہلے نماز کی نیت باندھی، ہم منتظر ہیں کہ شیخ نماز سے فارغ ہوں تو مفصّل واقعہ سنیں تھوڑی دیر کے بعد شیخ نماز سے فارغ ہوئے اور ہماری طرف متوجہ ہو کر بیٹھ گئے۔''

ہم: ''اس خدائے قدیر و علیم کا ہزار ہزار شکر، جس نے آپ کو ہم سے ملایا اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد پھر درست فرما دیا، مگر ذرا بیان تو فرمائیے کہ اس انکار شدید کے بعد پھر آپ کا آنا کیسے ہوا۔''

شیخ: ''میرے دوستو! جب تم مجھے چھوڑ کر واپس ہوئے میں نے گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ خداوندا مجھے اس جنجال سے نجات دے میں تیرا خطا کار بندہ ہوں اس سمیع الدعاء نے بایں ہمہ میری آواز سن لی اور میرے سارے گناہ محو کر دیے۔''

ہم: ''شیخ! کیا آپ کے اس ابتلا (آزمائش) کا کوئی سبب تھا؟''

شیخ: ”ہاں جب ہم گاؤں میں اُترے اور بت خانوں اور گرجا گھروں پر ہمارا گزر ہوا۔ آتش پرستوں اور صلیب پرستوں کو غیر اللہ کی عبادت میں مشغول دیکھ کر میرے دل میں تکبر اور بڑائی پیدا ہوئی کہ ہم مومن موحد ہیں اور یہ کمبخت کیسے جاہل واحمق ہیں کہ بے حس و بے شعور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، مجھے اس وقت ایک غیبی آواز دی گئی:

”یہ ایمان وتوحید کچھ تمہارا ذاتی کمال نہیں کہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے۔ کیا تم اپنے ایمان کو اپنے اختیار میں سمجھتے ہو جوان کو حقیر سمجھتے ہو۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں ابھی بتلادیں۔“

اور مجھے اسی وقت یہ احساس ہوا کہ گویا کوئی جانور میرے قلب سے نکل کر اُڑ گیا ہے۔ جو درحقیقت ایمان تھا۔

حضرت شبلی: ”اس کے بعد ہمارا قافلہ نہایت خوشی اور کامیابی کے ساتھ بغداد پہنچا۔ سب مریدین شیخ کی زیارت اوران کے دوبارہ قبول اسلام سے خوشیاں منارہے ہیں۔ خانقاہیں اور حجرے کھول دیے گئے۔ بادشاہِ وقت شیخ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا اور کچھ ہدایہ پیش کیے۔ شیخ پھر اپنے قدیم شغل میں مشغول ہوگئے اور پھر وہی حدیث وتفسیر، وعظ وتذکیر تعلیم وتربیت کا دور شروع ہوگیا۔ خداوند عالی نے شیخ کا بھولا ہوا علم پھر ان کو عطاء فرمادیا۔ بلکہ اب نسبتاً پہلے سے ہر علم وفن میں ترقی ہے۔ تلامذہ کی تعداد چالیس ہزار اور اسی حالت میں ایک مدت گزر گئی ایک روز ہم صبح کی نماز پڑھ کر شیخ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک کسی شخص نے حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں دروازہ پر گیا تو دیکھا کہ ایک شخص سیاہ کپڑوں میں لپٹا ہوا کھڑا ہے۔“

میں: ”آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا مقصود ہے؟“

آنے والا: ”اپنے شیخ سے کہہ دو کہ وہ لڑکی جس کو آپ فلاں گاؤں میں (اس گاؤں کا نام لے کر جس میں شیخ مبتلا ہوئے تھے) چھوڑ کر آئے تھے آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔“

سچ ہے کہ جب کوئی خدا تعالیٰ کا ہوکر رہتا ہے تو سارا جہاں اس کا ہوجاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ لیتا ہے تو ہر چیز اس سے منہ موڑ لیتی ہے:

”چواز دگشتی ہمہ چیز از تو گشت“

میں شیخ کے پاس گیا۔ واقعہ بیان کیا۔ شیخ سنتے ہی زرد ہوگئے اور خوف سے کانپنے لگے، اس کے بعد اس کو اندر آنے کی اجازت دی۔

لڑکی دیکھتے ہی زار زار رو رہی ہے۔ شدتِ گریہ دم لینے کی اجازت نہیں دیتا کہ کچھ کلام کرے۔

شیخ: ”(لڑکی سے خطاب کرکے) تمہارا یہاں آنا کیسے ہوا؟ اور یہاں تک تمہیں کس نے پہنچایا۔“

لڑکی: ’’اے میرے سردار! جب آپ ہمارے گاؤں سے رخصت ہوئے اور مجھے خبر ملی، میری بے چینی اور بے قراری جس حد کو پہنچی اس کو کچھ میرا دل ہی جانتا ہے، نہ بھوک رہی نہ پیاس، نیند تو کہاں آتی، میں رات بھر اسی اضطراب میں رہ کر صبح کے قریب ذرا لیٹ گئی اور اس وقت مجھ پر کچھ غنودگی سی غالب ہوئی، اسی غنودگی میں مَیں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ اگر تو مؤمنات میں داخل ہونا چاہتی ہے تو بتوں کی عبادت چھوڑ دے اور شیخ کا اتباع کر اور اپنے دین سے توبہ کر کے شیخ کے دین میں داخل ہو جا۔‘‘

میں: ’’(اسی خواب کے عالم میں اس شخص کو خطاب کر کے) شیخ کا دین کیا ہے؟‘‘

شخص: ’’اس کا دین اسلام ہے۔‘‘

میں: ’’اسلام کیا چیز ہے؟‘‘

شخص: ’’اس بات کی دل اور زبان سے گواہی دینا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برحق رسول و پیغمبر ہیں۔‘‘

میں: ’’تو اچھا میں شیخ کے پاس کس طرح پہنچ سکتی ہوں۔‘‘

شخص: ’’ذرا آنکھیں بند کر لو اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔‘‘

میں: ’’بہت اچھا، یہ کہا اور کھڑی ہوگئی اور ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔‘‘

شخص: ’’میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھوڑی دور چل کر بولے بس آنکھیں کھول دو۔‘‘

میں نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے کو دجلہ (ایک نہر ہے جو بغداد کے نیچے بہتی ہے) کے کنارے پایا۔ اب میں متحیر ہوں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں کہ میں چند منٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

اس شخص نے آپ کے حجرہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ سامنے شیخ کا حجرہ ہے وہاں چلی جاؤ اور شیخ سے کہہ دو کہ آپ کا بھائی خضر (علیہ السلام) آپ کو سلام کہتا ہے۔ میں اس شخص کے ارشاد کے موافق یہاں پہنچ گئی اور اب آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں، مجھے مسلمان کر لیجئے۔ شیخ نے اس کو مسلمان کر کے اپنے پڑوس کے ایک حجرہ میں ٹھہرا دیا کہ یہاں عبادت کرتی رہو۔ لڑکی عبادت میں مشغول ہوگئی اور زہد و عبادت میں اپنے اکثر اقران سے سبقت لے گئی۔ دن بھر روزہ رکھتی ہے اور رات بھر اپنے مالک بے نیاز کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ محبت سے بدن ڈھل گیا۔ ہڈی اور چمڑے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ آخر اسی میں مریض ہوگئی اور مرض اتنا ممتد ہوا کہ موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور اب اس مسافر آخرت کے دل میں اس کے سوا کوئی حسرت باقی نہیں کہ ایک مرتبہ شیخ کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ کیونکہ جس وقت

سے اس حجرے میں مقیم ہے نہ شیخ نے اس کو دیکھا ہے اور نہ یہی شیخ کی زیارت کر سکی۔ جس سے آپ چند گھڑی کے مہمان کی حسرت و یاس کا اندازہ کر سکتے ہیں، آخر شیخ کو کہلا بھیجا کہ موت سے پہلے ایک مرتبہ میرے پاس ہو جائیں۔ شیخ یہ سن کر فوراً تشریف لائے، جاں بلب لڑکی حسرت بھری نگاہوں سے شیخ کی طرف دیکھنا چاہتی ہے مگر آنسوؤں میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اسے ایک نظر بھر کر دیکھنے کی مہلت نہیں دیتیں۔ آنسوؤں کا ایک تار بندھا ہوا ہے مگر ضعف سے بولنے کی اجازت نہیں۔ لیکن اس کی زبان بے زبانی یہ کہہ رہی ہے۔

دم آخر ہے ظالم دیکھ لینے دے نظر بھر کر
سدا پھر دیدۂ تر کرتے رہنا اشک فشانی

آخر لڑکھڑائی ہوئی زبان اور بیٹھی ہوئی آواز سے اتنا لفظ کہا۔ السلام علیکم۔ شیخ (شفقت آمیز آواز سے) تم گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب ہماری ملاقات جنت میں ہونے والی ہے۔ لڑکی شیخ کے ناصحانہ کلمات سے متاثر ہو کر خاموش ہو گئی اور اب یہ خاموشی ممتد ہوئی یہ مہر سکوت صبح قیامت سے پہلے نہ ٹوٹے گی۔ اس پر کچھ دیر نہیں گزری تھی مسافر آخرت نے اس دار فانی کو خیر آباد کیا۔

شیخ اس کی وفات پر آبدیدہ ہیں۔ مگر ان کی حیات بھی دنیا میں چند روز سے زائد نہیں رہی۔ حضرت شبلی کا بیان ہے کہ چند ہی روز کے بعد شیخ اس عالم فانی سے رخصت ہوئے کچھ دنوں کے بعد میں نے شیخ کو خواب میں دیکھا کہ جنت کے ایک پُر فضا باغ میں مقیم ہیں اور ستر حوروں سے آپ کا نکاح ہوا ہے جن میں پہلی وہ عورت جس کے ساتھ نکاح ہوا وہ لڑکی اور اب وہ دونوں ابدالآباد کے لیے جنت کی بیش قیمت نعمتوں میں خوش وخرم ہیں۔

”ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ“

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد انفاس عیسیٰ میں نقل کیا ہے کہ جب یہ حال ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جو ہماری حالت درست ہے وہ ہمارے مستقل اختیار سے ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی تو سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص بہت حسین ہو مگر وہ اپنے چہرے پر کالک مل لے تو اس کا قدرتی حسن حقیقتہً زائل نہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی بدشکل ہو مگر وہ پاؤڈر مل لے تو کیا وہ حسین ہو جائے گا۔ تو بعض لوگوں کا ایمان ایسا ہی ہوتا ہے جیسا پاؤڈر۔ ایسے ہی بعض لوگوں کا کفر ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کالک۔ جب ذرا ہٹا تو اصل رنگ عود کر آیا اور اس کا ہٹ جانا اپنے مستقل اختیار میں نہیں ہے یہ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے تو پھر کیا زیبا ہے کہ آدمی اپنی حالت پر ناز کرے

اور دوسروں کو حقیر سمجھے۔ فقط یہ قصہ میں نے اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بھی سنا تھا۔ اس میں ایک شعر جو اُوپر گزر چکا وہ فرماتے تھے کہ اس شعر کو شیخ ابو عبداللہ اندلسی کثرت سے پڑھا کرتے تھے، غالباً عربی کا کوئی شعر ہوگا جس کا اردو میں کسی نے ترجمہ کیا۔ اس کے ساتھ اس قصہ کی ابتداء میں میرے والد صاحب نے جو سنایا تھا وہ یہ تھا کہ اس زمانے کے ایک بزرگ نے غلبۂ حال میں یہ فرمایا ''قدمی علی رقبۃ کل ولی'' (ترجمہ) کہ ''میرا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے''۔ ان اندلسی بزرگ نے جب یہ مقولہ سنا تو فرمادیا ''الا انـــا'' وہ بزرگ نہ معلوم اس وقت کہاں تھے، انہوں نے ان کا انکار سن کر یہ فرمادیا کہ ''جس کی گردن پر میرا قدم نہیں اس کی گردن پر سور کا قدم ہے''۔ مگر یہ واقعہ مجھے اس وقت کسی جگہ نہیں ملا۔ مولانا الحاج ابوالحسن علی نے سن کر فرمایا کہ یہ واقعہ میں نے کسی کتاب میں اسی طرح دیکھا جس طرح آپ نے اپنے والد صاحب سے سنا مگر اس وقت حوالہ یاد نہیں۔

یہاں ایک ضروری بات یہ قابلِ لحاظ ہے کہ اس قسم کا واقعہ حضرت پیران پیر کا بھی ہے نور اللہ مرقدہم جس کو امداد المشتاق میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے نقل فرمایا ہے، فرمایا کہ ایک روز دو آدمی آپس میں بحث کرتے تھے ایک کہتا تھا کہ حضرت شیخ معین الدین چشتی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی سے افضل ہیں اور دوسرا حضرت شاہ عبدالقادر کو شیخ پر فضیلت دیتا تھا۔ میں نے کہا کہ ہم کو نہ چاہیے کہ بزرگوں کی ایک دوسرے پر فضیلت بیان کریں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ'' جس سے معلوم ہوا کہ واقع میں تفاضل ہے لیکن ہم دیدۂ بصارت نہیں رکھتے۔ اس واسطے مناسب شان ہماری نہیں ہے کہ محض رائے سے ایسی جرأت کریں، البتہ مرشد کو تمام اس کے معاصرین پر فضیلت باعتبار محبت کے دینا مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اپنے باپ کی محبت چچا سے زیادہ ہوتی ہے اور اس میں آدمی معذور ہے۔ اس نے یعنی قادری نے دلیل پیش کی کہ جس وقت حضرت شاہ عبدالقادر نے ''قدمی علیٰ رقاب اولیاء اللّٰہ'' فرمایا تو حضرت معین الدین نے فرمایا ''بل علی عینی'' یہ ثبوت افضلیت حضرت شاہ عبدالقادر کا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے تو فضیلت حضرت معین الدین صاحب کی حضرت غوث پر ثابت ہوسکتی ہے نہ برخلاف اس کے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر اس وقت مرتبہ الوہیت یعنی عروج میں تھے اور حضرت شیخ مرتبۂ عبدیت یعنی نزول میں اور نزول کا افضل ہونا عروج سے مسلم ہے۔

(امداد المشتاق)

قدمی علیٰ رقبۃ کل ولی اور اکابر کے اس نوع کے اقوال کا صحیح محمل:

یہ قصہ شیخ اندلسی کا دوسری صدی کے ختم کا ہے اور حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات ۵۶۱ھ میں ہے۔ یعنی چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ یہ میں نے اس لیے متنبہ کر دیا کہ ایک قصہ کا دوسرے سے خلط نہ ہو۔ اصل قصہ شیخ اندلسی کے متعلق یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ میں آپ بیتی میں کسی جگہ اپنے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی یہ وصیت نقل کرا چکا ہوں کہ ان اللہ والوں سے بہت ڈرتے رہنا چاہیے۔ ان کی الٹی بھی سیدھی ہو جاتی ہے اور اس کلام کی شرح بھی حضرت اقدس رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ سے نقل کر چکا ہوں۔ اس لیے ان اکابر کے ایسے جملوں پر جو اُوپر نقل کیے گئے ''قدمی علی رقبة کل ولی'' یا اس نوع کے بعض دوسرے اکابر کے جملے مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے متعدد ارشادات جن میں سے بعض اوجز کے مقدمہ میں بھی نقل کر چکا ہوں، جس میں ان کی کتاب تفہیمات سے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔

''ومن نعم اللّٰہ علی ولا فخر ان جعلنی ناطق ھذہ الدورة و حکیمھا و قائد ھذہ الطبقة و زعیمھا فنطق علیٰ لسانی و نفث فی نفسی فان نطقت باذکار القوم و أشغالھم نطقت بجوا معھا الیٰ اٰخر ما بسط فیه.''

اس قسم کے الفاظ حضرت شاہ صاحب کے کلام میں بھی اور حضرت پیرانِ پیر اور دیگر اکابر کے کلام میں پائے جاتے ہیں، ان الفاظوں پر ناسمجھوں کو چیں بجبیں نہ ہونا چاہیے۔ اس قسم کی چیزیں اکابر کو بعض اوقات میں اکراماً اور اعزازاً وقتی طور پر عطاء ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ ارواحِ ثلاثہ میں بروایت حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھا ہے کہ ایک بزرگ خواجہ احمد جام مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ ایک عورت ان کی خدمت میں اپنے ایک نابینا بچے کو لائی اور عرض کیا کہ اپنا ہاتھ اس کے منہ پر پھیر دیجیے اور اس کی آنکھیں اچھی کر دیجیے۔ اس وقت آپ پر شان عبدیت غالب تھی۔ اس لیے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں، اس نے اصرار کیا مگر پھر آپ نے وہی جواب دیا۔ غرض کہ تین چار مرتبہ یوں ہی ردّ و بدل ہوئی۔ جب آپ نے دیکھا کہ وہ مانتی ہی نہیں تو آپ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہتے ہوئے چل دیے کہ یہ کام تو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھا۔ وہ اندھوں اور مبروصوں کو اچھا کرتے تھے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ الہام ہوا کہ تو کون، عیسیٰ کون اور موسیٰ کون؟ پیچھے لوٹ اور اس کے منہ پر ہاتھ پھیر، نہ تم اچھا کر سکتے ہو نہ عیسیٰ ''ما می کنیم'' (ہم کرتے ہیں) آپ یہ سن کر لوٹے اور ''ما می کنیم، مامی کنیم'' فرماتے جاتے تھے اور جا کر اس کے منہ پر ہاتھ پھیر دیا اور آنکھیں اچھی ہو

گئیں۔ یہ قصہ بیان فرما کر حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ احمق لوگ یوں سمجھ جایا کرتے ہیں کہ یہ "مامی کنیم" خود کہہ رہے ہیں، حالانکہ ان کا قول نہیں ہوتا بلکہ وہ حق تعالیٰ کا قول ہوتا ہے۔ جب کوئی کسی گویئے سے عمدہ شعر سنتا ہے تو اس کو اپنی زبان سے بار بار دہراتا ہے اور مزے لیتا ہے۔ اسی طرح وہ اس الہام کی لذت سے حق تعالیٰ کا ارشاد "مامی کنیم" بار بار دہراتے تھے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ اس حکایت کے اندر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ قولہ وہ حق تعالیٰ کا قول ہوتا ہے۔ اقول منصور حلاج (کے قول انا الحق) کی سب سے اچھی تاویل یہی ہے اور یہ حکایت حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس احقر نے بھی سُنی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ مجھ کو ان بزرگ کا نام لینا یاد نہیں اور اوّل بار جو اس عورت کو جواب دیا اس کا لہجہ جوش کا یاد ہے۔ وہ یہ کہ میں عیسیٰ ہوں جو اندھوں کو اچھا کروں اور "مامی کنیم" کی جگہ "ما کنیم" یاد ہے۔

مقصد اس ساری تحریر سے یہ ہے کہ آدمی کو اپنی فکر میں ہر وقت مشغول رہنا چاہیے۔ دوسروں کی تنقید یا عیب جوئی کی فکر میں نہ پڑنا چاہیے، خاص طور سے اکابر کے جو کہ معتمد، مقتدیٰ وعلماء ہوں ان کے اقوال وافعال کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ خلافِ شرع میں اتباع کسی کا نہیں، لیکن ان کے اقوال وافعال کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ مجھ سے چند سالوں سے ایک لغو سوال کثرت سے خطوط میں کیا جا رہا ہے کہ فلاں حضرت نے فلاں کو کیوں اجازتِ بیعت دے دی۔ میں تو ان لغویات کا جواب اکثر یہ دیا کرتا ہوں کہ جب قبر میں منکر نکیر تم سے یہ سوال کریں گے تو تم بے تکلف کہہ دینا مجھے خبر نہیں۔ آخرت کا معاملہ بڑا سخت ہے اور عجب پندار اور دوسروں کی تحقیر تنقیص یہ نہایت خطرناک امور ہیں۔ جیسا کہ اُوپر کے سور کے قصہ سے معلوم ہو گیا۔ اللہ ہی محفوظ رکھے، ان سے بھی بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے دوستوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ

محمد زکریا عفی عنہٗ
۳ شوال ۱۳۹۱ھ

فن، زبان اور امتحان کی ضرورت کو پورا کرنے والی
اساس الحکمۃ
اردو شرح
ہدایۃ الحکمۃ
جسے ڈاکٹر شیر علی صاحب مدظلہم نے طلبۂ کرام کے لیے "غسلِ مصفی" قرار دیا
خصوصیات:
☆ دقیق عبارت کا شستہ اور عام فہم حل
☆ مغلق مقامات کی توضیح بذریعہ تمہیدات
☆ پیچیدہ مباحث کی تشریح بذریعہ نقشہ جات
ہر بحث سے متعلق خاکے (ڈائیاگرام)
تقاریظ:
حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب
شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب
استاذ حدیث دارالعلوم کراچی
تالیف:
محمد طفیل قاسمی
مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ
شاہ فیصل کالونی 4 کراچی

جدید کتابت

اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ

احاطۂ دار العلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن

تصنیف

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ترتیب

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

ناشر

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ شاہ فیصل کالونی 4 کراچی